DUE DATE

*Cl. No.*____________ *Acc. No.*____________

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1 per day, Over night book Re. 1 per day.


"مرد کے لیے عمر کی
کوئی قید نہیں ہوتی
زلیخا بیگم جی!
جب بھی شادی کرے
وہی وقت مناسب اور
درست ہوتا ہے!"

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرہ وطن ہے فیاض تجلیات
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

فون نمبر ۲۷۵۶۰۲

شانِ ہند دہلی

جنوری سنہ ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹
شمارہ ۱

جشن جمہوریت ایڈیشن

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر
وگیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت۔ خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقام اشاعت۔ دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"
منزل ۳ انصاری مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خطاط
سبطین حیدر
محمد عمران

حسن کار
مصطفیٰ آرٹسٹ

غزل

حافظ [illegible] مصطفیٰ غازی پوری

تلاشِ حسن میں جب مسلکِ بے راہ رو یاد آیا
نہ کعبہ یاد پھر آیا نہ پھر بت خانہ یاد آیا

مجھے جب کیف تیرا نرگسِ مستانہ کا یاد آیا
وہی ساغر وہی مینا وہی پیمانہ یاد آیا

بقدرِ ظرف تھی ذوقِ طلب کی بادہ آشامی
اُسے پیمانہ یاد آیا مجھے میخانہ یاد آیا

فضائے قربِ منزل میں بھی ہم گم کردہ منزل ہیں
کہاں لا کر مآلِ لغزشِ مستانہ یاد آیا

اسے عرفاں سمجھئے یا مآلِ جہل و خود کامی
حرم کی یاد آئی تھی کہ پھر بت خانہ یاد آیا

"نیستاں" پر ہمارا حق کبھی تھا مطربِ رنگیں
ذرا لَے چھیڑ دی تو نے کہ وہ افسانہ یاد آیا

ازل سے میری قسمت میں ہے اک [illegible] ساقی
ذرا چھیڑا کسی نے اور پھر میخانہ یاد آیا

نوائے درد سے بے چین ہو کر رہ گئی فطرت
شکستِ سازِ دل کا جب اسے افسانہ یاد آیا

زہے بیداریٔ ہمت خوشا واماندگی میری
تھکا جس وقت غربت میں وہیں کاشانہ یاد آیا

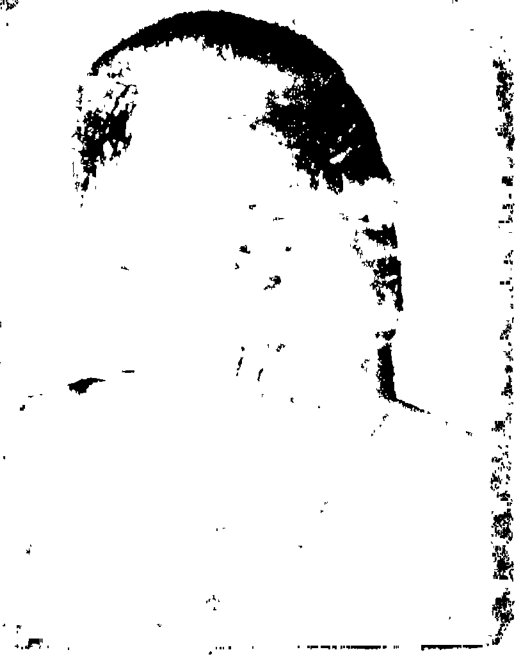
وہ "دورِ نیم شب" میں حسن [illegible]
اچھلتا جوشِ مستی میں کوئی پیمانہ یاد آیا

کہیں نہ محو تھی سے حافظ شعر و فطرت مشتغل ہوکر
تجلی جو [illegible] یاد آیا

بلبل چہ گفت ... کرد؟

سیاسی تبصرے | الکرو واقعات

. اڈی ... سبل



خان عبدالغفار خان

ایڈیٹر شانِ ہند علیل ہیں اسی وجہ سے پڑ ننگ آرٹیکل نہ دیکھ سکے
جناب دشوا ناتھ داس کا حسب ذیل مضمون مرحوم بادشاہ خان کی یاد میں شائع کیا جا رہا ہے (ادارہ)

۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آل انڈیا ریڈیو پر ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنے منصوبے کا اعلان کیا اور ریڈیو پر ہی اپنی تقاریر کے دوران پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح اور سردار بلدیو سنگھ نے اس کی تائید کر دی تو صوبہ سرحد کے خان برادران کو سب سے زیادہ دھکا لگا۔ ماؤنٹ بیٹن پلان میں اگرچہ صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کرانے کا ذکر تھا لیکن خان برادران نے اس کے بائیکاٹ کا اعلان کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز ریفرنڈم میں بددیانتی سے کام لے گا۔ اگر انگریز ایماندار ہوتا تو پٹھانستان کے سوال پر ریفرنڈم کراتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ خان برادران نہیں چاہتے تھے کہ ریفرنڈم کے نام پر صوبہ سرحد میں جھگڑا ہو اور پٹھان پٹھان کا لہو بہائے۔

خان عبدالغفار خان گاندھی جی کے پاس گئے اور شکایت کی کہ آپ نے ہمیں مسلم لیگ والوں کے آگے پھینک دیا ہے۔ بادشاہ خان نے مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تو مولانا نے کہا "خان صاحب! حالات اس موڑ پر آگئے ہیں کہ آپ مسلم لیگ میں چلے جائیں" مولانا نے اس خیال سے یہ بات کہی تھی کہ پاکستان ناگزیر ہو چکا ہے اور اب نیشنلسٹ مسلمانوں کے متروک ہونے سے بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ وہ مسلم لیگ سے مصالحت یا مفاہمت کر لیں اور اس طرح نئے ملک میں اپنے لئے جگہ بنا کر آزادی کا ثمر چکھیں۔ بادشاہ خان نے مولانا کے اس جواب کا برا منایا اور فرمایا۔

"مولانا! افسوس ہے کہ آپ مجھے اب تک سمجھے ہی نہیں" انھوں نے وضاحت کی کہ مسلم لیگ دو قومی نظریے کی حامی ہے اور میں شروع سے اس کے خلاف ہوں اس لئے میں کیونکر اس میں شامل ہو سکتا ہوں۔ یہ بات مہاتما گاندھی تک بھی پہنچی اور ایک ثقہ روایت کے مطابق انھوں نے مولانا آزاد سے کہا کہ اگر آپ کا انداز فکر یہی ہے تو پھر آپ کا بھی [illegible] مسلم لیگ میں ہے

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے خان عبدالغفار خان اور محمد علی جناح کے مابین ملاقات کا انتظام کیا اور ان سے [illegible] جناح نے وعدہ کیا کہ وہ خدائی خدمت گاروں کے مرکز سردریاب کا دورہ کریں گے اور بادشاہ خان نے یہ یقین دہانی کرائی کہ وہاں ان کا شاندار خیر مقدم کیا جائے گا لیکن صوبہ سرحد کے مسلم لیگی رہنما عبدالقیوم خان نے انگریز گورنر کنگھم سے مل کر جناح کو بدظن کیا۔ مسلم لیگی یہ نہیں چاہتے تھے کہ قیام پاکستان کے بعد اس کے حریف بنے رہیں۔ سرحد کا گورنر کنگھم لیگی لیڈروں کے ہتھے چڑھا ہوا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر کانگریسی وزارت توڑنے کی سفارش کر دی کہ وہ نظم و نسق اور امن و امان برقرار نہیں رکھ سکتی اور وہ عوام کے اعتماد سے محروم ہو چکی ہے۔ اُدھر عبدالقیوم خان نے جناح کے ذہن کو یہ کہہ کر پراگندہ کر دیا کہ خان برادران نے دل سے پاکستان کو قبول نہیں کیا ہے اور جناح حسب وعدہ خدائی خدمتگاروں کے مرکز سردریاب کا دورہ کرنے جائیں گے تو وہ انھیں قتل کر دیں گے۔

جناح نے اسمبلی میں کانگریس کی اکثریت کے باوجود ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برطرف کر دیا اور اس کی جگہ اقلیتی مسلم لیگی لیڈر عبدالقیوم خان کو وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ پاکستان کے آئینی حکمراں محمد علی جناح کا بہ طور گورنر جنرل یہ پہلا غیر آئینی قدم تھا۔ خدائی خدمتگاروں یعنی سرخ پوشوں نے سردریاب میں محمد علی جناح کے استقبال کی شاندار تیاریاں کی ہوئی تھیں مگر ان کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔

عبدالقیوم خان نے خان عبدالغفار خان کو ہندوستان و ہندوؤں کا ایجنٹ اور پاکستان کا مخالف قرار دے کر زندان میں ڈال دیا اور سرخ پوشوں پر مظالم شروع کر دیئے۔ نظریات کے اختلاف کی جو سزا بادشاہ خان اور ان کے پیرووں کو ملی وہ ضرورت سے زیادہ تھی۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں بھی لاکھوں ایسے افراد حاسنے کیسے رہ گئے تھے جو قیام پاکستان کے حامی تھے۔ لیکن اس پاداش میں ہندسرکار

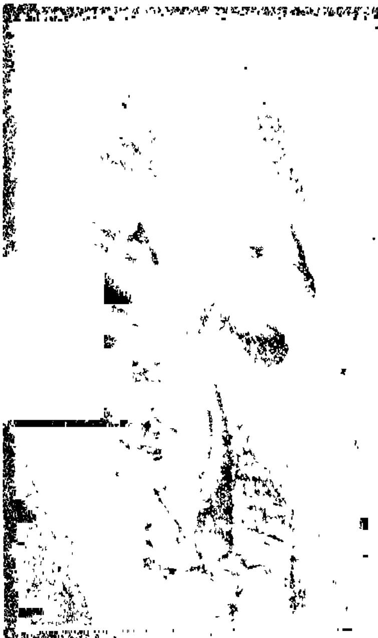


سے انھیں جیلوں میں بھی ڈال دیا گیا۔ عبدالقیوم خان نے سُرخ پوشوں کو غدّار قرار دے کر قہر برپا کر دیا اُن پر ایسے مظالم ڈھائے کہ چنگیز اور ہلاکو کی روحیں بھی شرما گئیں۔ اس نیت سے کہ سُرخ پوش پھر پاکستان میں سر نہ اُٹھا سکیں سرحد کے سفّاک مُسلم لیگی وزیرِ اعلیٰ نے اُن کے مرکز سرور باب پر یلغار کر دی اور اُس کو مسمار کر کے اُس کا ملبہ تک نیلام کروا ڈالا پولیس نے کئی سُرخ پوشوں کے خصیے کھینچ کر اُنھیں جان سے مار ڈالا۔ اپنے بے رحمانہ اقتدار قائم رکھنے کے لئے عبدالقیوم خان نے چارسدہ کے مقام پر سُرخ پوشوں کے نہتے اور پُرامن اجتماع پر اندھا دھند گولیاں چلوائیں۔ بیسیوں پٹھان جاں بحق ہو گئے۔ فائرنگ کے بعد سُرخ پوشوں کو پکڑ کر اُن کے مُنہ کالے کئے گئے اور گدھوں پر بٹھا کر جلوس نکالا گیا۔ پورے صوبے میں خان برادران کے حامیوں کا جینا مُشکل کر دیا گیا۔ اُنھیں زندانوں میں ڈال دیا گیا اور بے پناہ مظالم توڑے گئے۔ بعض کو اتنا ستایا گیا کہ وہ گھُل گھُل کر ختم ہو گئے۔ عبدالقیوم خان یہاں تک جابر و قہار ہو گیا کہ اُس نے سُرخ پوشوں کے گھروں میں پولیس داخل کروا کر خواتین کی بے حُرمتی کرائی۔ جو لوگ خدائی خدمتگار تحریک کے ساتھ وابستہ تھے اُن کی جائیدادیں ضبط کر لیں اور اُنھیں ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا۔

خان عبدالغفار خان اور اُن کے پورے کنبہ کو رشتہ داروں سمیت جیل کی کال کوٹھریوں میں ڈال دیا گیا۔ اُن کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا گیا۔ اُنھیں اُن سہولتوں سے محروم رکھا گیا جو جیل مینول کے مُطابق ملنی چاہیئے تھیں۔ عبدالغفار خان کے داماد قاضی عطاء اللہ خان کے ساتھ انتہائی سوءِ سلوک کیا گیا۔ وہ جیل کے جس تنگ و تاریک کمرے میں بند تھے وہ سیل زدہ تھا۔ وہاں تازہ ہوا اور روشنی کا گزر نہیں تھا۔ وہ بیمار پڑ گئے تو اُنھیں مُعالج مہیا نہیں کیا گیا اور نہ کوئی دوا ہی دی گئی۔ جو خوراک دی جاتی تھی وہ جانوروں کے کھانے کے لائق نہیں تھی۔ سخت بیماری کی حالت میں بھی رشتہ داروں کو اُن سے نہیں ملنے دیا گیا۔ خان عبدالغفار خان کو اپنے داماد کی عیادت کی اجازت نہیں ملی۔ قاضی عطاء اللہ خان جیل میں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ وقتِ آخر وہ جیل کی چھت کو تک رہے تھے اور اُن کے لبوں پر یہ صدا تھی

ع "الٰہی جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے؟"

پٹھان فطرتاً صاف گو ہوتا ہے لہٰذا بادشاہ خان بھی کھرے آدمی تھے اور اُنھیں حق گوئی کی سزا بھگتنی پڑی۔ انگریز سرکار نے اُنھیں بیس سال جیل میں بند رکھا۔ آزادی کے بعد بھی اُنھیں پاکستان میں اپنے نظریات پر کاربند رہنے کی پاداش میں سولہ سال قید اور دس سالوں تک جلاوطنی برداشت کرنی پڑی۔ پاکستان میں لگاتار چالیس برس تک اُن کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھا گیا، وہ برِّصغیر کی سیاسی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ بادشاہ خان پاکستانی حکمرانوں سے اس قدر بیزار ہو گئے تھے کہ انھوں نے دفن کے لئے پاکستان میں دو گز زمین لینا بھی گوارہ نہ کیا۔ اُن کی میت دیارِ غیر افغانستان کے مقام جلال آباد میں اس بنگلے کے [illegible] دفنائی گئی جہاں انھوں نے جلاوطنی کے [illegible] بسر کئے تھے۔



خوشتر گرامی کا انتقال

شانِ ہند کی گزشتہ اشاعت میں خوشتر گرامی صاحب کی دِلّی واپسی کی اطلاع دی گئی تھی۔ چنانچہ 'شانِ ہند' میں یہ اطلاع پڑھنے کے بعد خوشتر گرامی صاحب کے اکثر احباب اُن سے مُلاقات کے لئے ارادے باندھ ہی رہے تھے کہ ۱۵ جنوری ۱۹۸۸ء کو ہولی فیملی ہسپتال میں خوشتر گرامی صاحب کا انتقال ہو گیا۔

۱۶ جنوری کو ۱۱ بجے لودھی ہوٹل کے سامنے والی شمشان بھومی میں اُن کے سینکڑوں مدّاحوں، رشتہ داروں، اخبار نویسوں اور دیگر معزّزین کی موجودگی میں اُنھیں سپردِ آتش کر دیا گیا۔

ادارہ "بیسویں صدی" کی طرف سے غالب اکادمی میں خوشتر گرامی صاحب کا ماتمی جلسہ عالی جناب گیانی ذیل سنگھ صاحب [illegible] صدرِ جمہوریۂ ہند کی صدارت میں ہوا [illegible] جناب مالک رام، ڈاکٹر ہیرالال صاحب [illegible] جناب جمنا داس اختر، جناب اندر کمار [illegible] ڈاکٹر عنوان چشتی، جناب انور [illegible] خلیق انجم، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی [illegible] جناب کشمیری لال ذاکر، جناب دیوندر ناتھ ظفر پیامی، اور صاحبِ صدر نے [illegible] گرامی کو خراجِ عقیدت پیش کیا [illegible] اُردو خدمات کو سراہا۔ جلسہ کی نظامت [illegible] ذہین نقوی نے فرمائی۔ جناب ظفر پیامی [illegible] محترم صدر صاحب نے اِس صداقت پر [illegible] افسوس فرمایا کہ کسی بھی اُردو ادارے [illegible] حکومت نے خوشتر گرامی صاحب کو اُن [illegible] اُردو خدمات پر کسی ایوارڈ سے [illegible]

پوسٹ ماسٹر جنرل دہلی کا احمقانہ حکم

کیا وزیر مواصلات اور وزیر اعظم، دلی کے عوام کو اس احمقانہ حکم سے نجات دلائیں گے

محکمۂ ڈاک میں جب بھی کسی قانون، قاعدے میں تبدیلی کی جاتی ہے تو اس کے لئے پارلیمنٹ سے وزیر مواصلات کو اسے منظور کرانا پڑتا ہے۔ مگر ایک سال ہوا کہ دلی کے پوسٹ ماسٹر جنرل نے ہٹلرانہ انداز میں یہ حکم جاری کر دیا کہ ایسے تجارتی ادارے جن کے پارسل، وی، پی، یا پیکٹ زیادہ تعداد میں بذریعۂ ڈاک بھجوائے جاتے ہیں، وہ صرف دلی کے تین ڈاک خانوں، کشمیری گیٹ جی، پی، او، اور اندر پرستھ ہیڈ پوسٹ آفس وغیرہ میں ہی جمع ہو سکیں گے اور دلی کے سینکڑوں دوسرے آفس انھیں بک نہیں کریں گے۔ ہاں، غیر تجارتی لوگ فرداً فرداً ایک یا دو پیکٹ، وی، پی یا پارسل وغیرہ، دلی کے سب پوسٹ آفسوں سے بک کرا سکتے ہیں۔

چونکہ اکثر تجارتی ادارے اپنی نزدیکی پوسٹ آفسوں میں بلک بکنگ کے لئے بکنگ کلرکوں کو فی پیکٹ یا پارسل کم سے کم دس پیسے دیتے تھے جس سے ان بکنگ کلرکوں کو اچھی بھلی بالائی آمدنی ہو جاتی تھی۔ مگر پوسٹ ماسٹر جنرل کے اس حکم سے ان بکنگ کلرکوں کی یہ بالائی آمدنی ختم ہو گئی تو ان بکنگ کلرکوں نے عام پبلک کے انفرادی ایک دو آرٹیکلز کی بکنگ کرنا بھی بند کر دیا۔ اور جو بھی شخص انفرادی طور پر کوئی وی، پی پیکٹ یا پارسل رجسٹری سے بک کرانا چاہتا ہے تو یہ کلرک صاف جواب دے دیتے ہیں کہ پی۔ ایم۔ جی کے حکم سے اب یہ بکنگ کشمیری گیٹ یا اندر پرستھ وغیرہ ڈاک خانوں میں ہی ہو سکتی ہے، وہاں جائیے۔ جو لوگ بضد ہو کر اور پی۔ ایم۔ جی کے حکم کا حوالہ دے کر بکنگ کرنے کے لئے ان کلرکوں کو مجبور کرتے ہیں تو یہ کلرک پیکٹوں کا اس بری طرح سے پوسٹ مارٹم کرتے ہیں کہ سب پیکنگ وغیرہ پھاڑ دیتے ہیں جس سے متعلقہ شخص دوبارہ ان کلرکوں کے پاس آنے کی جرأت نہیں کرتا۔

محکمۂ ڈاک نے عوام کی سہولیت کے لئے اکثر محلوں میں کثرت سے ڈاکخانے کھولے اور تو اور ایسے تجارتی ادارے جن کی بکنگ بہت زیادہ ہوتی تھی اُن کے لئے اُن کے دفاتر میں ہی ڈاک خانے کھول دیئے مگر ہمارے پی۔ ایم۔ جی نے اخبارات و رسائل کی پوسٹنگ بھی عام سب آفسوں میں بند کر دی اور اب ساری دلی اور نئی دہلی کے اخبارات و رسائل کی پوسٹنگ صرف پی۔ ایس۔ او، دہلی اور پی۔ ایس۔ او، نئی دہلی میں ہی ہو سکتی ہے۔

یعنی عوام اور تجارتی اداروں نیز رسائل و اخبارات کے دفاتر کے لئے ہر ممکن طور پر مشکلات پیدا کر دی ہیں اور ہر سب آفس میں ایسے لگتا ہے جیسے دیو پھر گیا ہے۔ عام طور پر ڈاک خانے اُجاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر کلرک بیکار بیٹھے ہیں اور مفت کی تنخواہ لے رہے ہیں چونکہ شہر کے جملہ تجارتی اداروں کو صرف تین ڈاک خانوں میں اپنے پارسل، پیکٹ اور وی، پی وغیرہ کی بکنگ کرانی ہوتی ہے لہٰذا ان تین ڈاک خانوں میں جمِ غفیر ہوتا ہے اور بعض اوقات تو گھنٹوں وقت ضائع ہوتا ہے۔

اور یہ سب کچھ پارلیمنٹ سے لی گئی کسی منظوری کے بغیر ہو رہا ہے۔ پوسٹ ماسٹر جنرل کا یہ کہنا ہے کہ یہ ہم نے مقامی طور پر اپنا انتظام دُرست کرنے کے لئے کیا ہے اور دوسرے ہر سب آفس میں ڈاک خانے کی موٹر گاڑی دن میں دو وقت بھجوانی پڑتی تھی، اب نئے انتظام کی وجہ سے پٹرول کی بچت ہو گئی ہے۔ حالانکہ ہر ڈاک خانہ میں گاڑیاں دونوں وقت اب بھی جاتی ہیں اور پٹرول کی بچت ہوئی یا نہ، وہ تو محکمۂ ڈاک کے ریکارڈ سے دیکھا جا سکتا ہے کہ اس نئے انتظام سے پہلے کتنا پٹرول لگتا تھا اور اب کس قدر لگتا ہے۔

ہمارے وزیر اعظم ملک کو اکیسویں صدی میں بہ انداز تمام لے جانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں مگر انھیں یہ معلوم نہیں کہ ان کے سرکاری افسران ہندوستان کو اٹھارویں صدی میں لے جا چکے ہیں۔

ہم وزیر مواصلات سے پوچھتے ہیں کہ آخر اس احمقانہ فیصلہ سے محکمۂ ڈاک کو کیا فائدہ ہوا بجائے اس کے کہ محکمۂ ڈاک عوام کو راحت پہنچانے کے ذرائع اختیار کرتا، اُلٹا عوام کے لئے دردِ سری پیدا کر دی گئی ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ اگر وزیر مواصلات اس احمقانہ فیصلہ کو منسوخ نہیں کرتے تو تجارتی اداروں اور اخبارات و رسائل کے مالکان کو مشترکہ طور پر اس فیصلہ کے خلاف عدالت سے رجوع کرنا چاہئے تاکہ عدالت سے محکمۂ ڈاک کی اس حماقت کو دور کرایا جا سکے۔

> "دُوردرشن یا ہندودرشن" آئندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمائیں۔



غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

محفلِ خاص میں خاص و عام آ گئے
جو تھے ممنوع وُہ بھی سلام آ گئے

ہر قدم ہر گھڑی وہ پرکھنے لگے
اس بہانے سے ہم اُن کے کام آ گئے

خود معرّی ملی، خود شناسی ملی
راستے میں کچھ ایسے مقام آ گئے

اُس کا رحم و کرم، اُس کی فیاضیاں
ہم نے تشنہ کہا، اور جام آ گئے

وُہ تو حیران تھے، وُہ پریشان تھے
کیوں فسانے میں بے ربط نام آ گئے

اُن کو ٹھکرا نہ پاتے بھی کس منہ سے ہم
ہو کے اُن سے وہیں ہمکلام آ گئے

کیا کہیں گے حقیر زبوں حال کو
قبلہ تو وہ تھے مگر، زیرِ دام آ گئے

702, Gold Crown
J. P. Road
Andheri (W)
Bombay-400 061

نالۂ اردو

یوگیندر بہل تشنہ

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

یہ کس دہانے پہ لے کے پہنچے ہو مجھ کو آخر؟
تو جیوں کی جا تو پہنی ہوئی ہے میں نے
ہے میرے آگے عمیق خندق
جو میری بربادیوں کا ساماں لئے ہوئے ہے
یہی ہے شاید مرے مقدر میں اب عجائب گھروں کی زینت!!!

مگر تمہاری یہ خامشی بھی عجیب شے ہے
تمہاری یہ مصلحت ہے شاید!
کہ تم مرے نام کے وظیفوں کو ہضم کرنے کی فکر میں ہو
تمہیں یہ پرواہ نہیں ہے ہرگز
کہ میں جو تھی ایکتا کی ضامن
سمٹ سمٹ کر
بس ایک فرقے تلک ہی محدود ہو رہی ہوں

اگرچہ میرے روز و شب ہیں
جو میری زلفیں سنوارنے کو کہاں سے آئے گا کوئی ناداں[1]
کہاں اٹھائیں گے ناز میرے خیال[2] و ذاکر[3]
نہ کرشن موہن[4]، نہ کوئی راہی[5]، نہ کوئی کھلر[6]، راز[7] و تنہا[8]
نہ کوئی آزاد[9] اور سرور[10] میری خاطر
اپنے دل کا خون جلا کر
جہاں کو درس خلوص دے گا
نہ پھر مرے گلشن خیالی کے پھول ہوں گے

۱ اندر سروپ دت ناداں
۲ چندر بھان خیال
۳ کشمیری لال ذاکر ۴ کرشن موہن
۵ رام پرکاش راہی ۶ کے کے کھلر
۷ راج نرائن راز ۸ رمیش تنہا
۹ جگن ناتھ آزاد
۱۰ ودیا پرکاش سرور تونسوی
۱۱ جاوید وششٹ ۱۲ بلراج حیدر
۱۳ ظفر پیامی ۱۴ ستیش بترا
۱۵ پرتپال سنگھ بے تاب
۱۶ دھرم پال عاقل
۱۷ کرشن کمار طور ۱۸ بلراج کومل
۱۹ مالک رام ۲۰ حکم چند نیر
۲۱ گیان چند جین
۲۲ دیوندر اسر

وشِشٹ[10] وحیرتؔ[11] ناظرؔ[12] پیامی ستیش[14] بترا
کہاں سے لاؤں گی ڈھونڈ کر میں
بےتابؔ[15] دعاؔ[16] قتیلؔ، طورؔ[17] و کومل[18] ماہر غالبیات مالک[19]
ادب کے نیّرؔ[20] گیان[21] اور دیوندر اِسرؔ[22]
کنول[23] بھی کوئی نہیں کھلے گا
اُفق پہ میرے قمرؔ[24] بھی کوئی نہیں رہے گا
بُھلا چُکے ہوں گے مجھ کو
گلزار[25] و سوزؔ[26] و ورما[27]، پرکاش[28] و راہیؔ[29]، کمار[30] پاشی
نہ کوئی خنداںؔ[31] نہ اشکؔ[32] و گپتا[33]، نہ کوئی کومل[34]، نہ پھر گلاٹی[35]
مرے خیالوں میں گُم رہے گا
نہ ہوگا رقصاں طاؤسؔ[36] کوئی، نہ کوئی کرتار[37] ہی رہے گا
ریڈیو پہ نشر کرے گا نہ رشکؔ[38] کوئی
نہ کوئی ہادیؔ[39] نہ کوئی راہیؔ[40] نہ کوئی رہبرؔ[41]
مرے لئے شبوں میں جگے گا
وہ شخص جو تھا ازل سے تشنہؔ[42] کہاں مرے دل کا حال لے گا
نہ آئے گا رام لال[43] کوئی مری حفاظت کو تیغ لے کر
نہ ہوگی مُلّاؔ[44] کی سرپرستی بھی مجھ کو حاصل
نہ گوڑ[45] و گوپی[46] دکھا سکیں گے قلم کے جوہر
نہ آئے گا پھر کوئی جگندر[47] مرے فسانے سنوارنے کو
نہ جگمگائے گا کوئی مہتاب[48] میری شب کو
نہ پھر مرے آسماں کی زینت بنے گا تارا[49]
مشاعروں میں دکھائی دے گا سحرؔ[50] نہ کوئی
نہ نورؔ[51] و ناصرؔ[52] سنائی دیں گے
کہانیوں کے رتن[53] بھی ڈھونڈے نہیں ملیں گے
دکن سے اُٹھے گا پھر نہ کوئی شری نواس[54] اور اس کے ساتھی
جو اپنی شعلہ نوائیوں سے مجھے بقائے دوام دیں گے
میرے گلشن کے اَن گنت اور بھی کئی پھول تہِ خاک ہوں گے
دو دہائی میں کھیل سارا یہ ختم ہوگا
نہ ہوگی گجرال[55] کی محبت بھی مجھ کو حاصل
کہ میرے قاتل
اُسے کبھی راستہ نہ دیں گے
نہ پھر کوئی تم سے کہہ سکے گا
کہ تم ہو میری بقا کے دُشمن
ہو میرے قاتل
کہ تم مرے نام کے وظیفوں پہ پَل رہے ہو!

۲۳ اوم پرکاش بجاتیہ کنول
۲۴ دیپک قمر
۲۵ آنند موہن زتشی گلزار
۲۶ ہیرانند سوز ۲۷ بلراج ورما
۲۸ پرکاش تیواڑی ۲۹ رشمی کانت راہی
۳۰ کمار پاشی ۳۱ خنداں دہلوی
۳۲ پریم پال اشک ۳۳ کالی داس گپتا رضا
۳۴ کرشن موہن ۳۵ آزاد گلاٹی
۳۶ وشوا ناتھ درآ ہوجہ طاؤس
۳۷ کرتار سنگھ دگل ۳۸ سکھدیو سنگھ رشک
۳۹ منوہر لال ہادی ۴۰ راہی
۴۱ ہنس راج رہبر ۴۲ یوگندر بہل تشنہ
۴۳ رام لال ۴۴ آنند نرائن ملّا
۴۵ راج بہادر گوڑ ۴۶ گوپی چند نارنگ
۴۷ جوگندر پال ۴۸ م۔ک۔ مہتاب
۴۹ تارا چند رستوگی ۵۰ کنور مہندر سنگھ سحر
۵۱ کرشن بہاری نور ۵۲ ناصر
۵۳ رتن سنگھ ۵۴ شری نواس لاہوٹی
۵۵ اندر کمار گجرال

غالبیات میں عظیم اضافے

دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے

کی اشاعت سے پہلے

جناب کالی داس گپتا رضا کی ایک انمول پیشکش

دیوانِ غالب

مطبوعہ اکتوبر ۱۸۴۱ء عکسی

رضا صاحب کے تحقیقی پیش لفظ کے ساتھ

لائبریریوں، یونیورسٹیوں، کالجوں، تحقیقی اداروں، اور غالبیات کے شیدائیوں کے لئے تقریباً نایاب اس ایڈیشن کا

عکس اب دستیاب ہے۔

خوب صورت جِلد — اعلیٰ طباعت — پلاسٹک کور

قیمت ۲۰۰ (دوصد) روپے فی جلد

نوٹ: صرف ۲۰۰ نسخے ہی شائع کئے گئے ہیں۔

VIMAL PUBLICATIONS
107 JOLLY BHAWAN-1,
NEW MARINE LINES, BOMBAY-400020

Telephones 291302
252949
290087



مشاعرہ

رسمِ اجراء "نمودِ سحر"

کریمی الاحسانی

یہ وہ مشاعرہ ہے جو گنگوہ (سہارنپور) کے بجائے پیارے لال بھون (گاندھی میموریل ہال) نزد 5 ٹی. جی. بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی میں منعقد ہو رہا ہے۔

یہ وہ مشاعرہ ہے کہ جس کے اراکین اور مشاعرہ نے دہلی کے عوام اور خصوصاً اہلِ علم و ادب و شعرائے کرام کو نہ جانے کیوں دعوت نامے نہیں بھیجے اگر وہ اس طرف توجہ دیتے تو یہ دہلی کا عظیم اور تاریخی مشاعرہ بن جاتا۔

یہ وہ مشاعرہ ہے جس میں نوجوان اور نئی غزل کی نمائندگی کرنے والے شعراء نے اس تقریب کو کامیاب کرانے میں بڑی لگن اور خلوص سے کام کیا۔

یہ وہ مشاعرہ ہے جس میں نئی دلی اور پرانی دلی کا نمایاں طور پر اثر پڑا۔ نئی دلی کے مشاعرے مختصر ہوتے ہیں اور وہ عوامی مشاعرے بھی نہیں ہوتے۔ یہ مشاعرے نہایت شستہ اور کامیاب ہوتے ہیں۔ پرانی دلی کے مشاعرے خالص عوامی بن کر رہ جاتے ہیں، جو ہلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی کی نذر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس ہال میں جتنے موجود تھے وہ سب اردو کے بہی خواہ اور ہمدرد تھے۔ اس پر فیلی، است، میں کوئی اپنے گھر سے نکلتا ہے، یہاں تو باہر سے آئے ہوئے صاحبِ ذوق زیادہ نظر آرہے تھے۔

دیکھئے یہ دہلی کی وہ شاہراہ ہے جو لال قلعہ کے روبرو ہو کر گزرتی ہے، اسے بہادر شاہ ظفر مارگ کہتے ہیں۔ فصیل شہر سے کسی قدر دور جانب جنوب اور مشرق متصل مسجد عبد النبی پیارے لال بھون تک چلئے اور "نمودِ سحر" (سعید نیّر گنگوہی) کے رسمِ اجراء کی تقریب اور مشاعرہ ملاحظہ فرمایئے۔

۱۶ جنوری ۱۹۸۸ء ہے۔ پونے چھ ہو چکے ہیں ڈاکٹر عنوان چشتی جناب حنیف نظامی دہلوی سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ محترمہ شیلا ڈکشٹ منسٹر آف پارلیمنٹری امور کا پھولوں سے استقبال فرمائیں۔ لیجئے پیر حنیف صاحب نے یہ گل پوشی کی ہے، کیمرے والے بھی حرکت میں آگئے ہیں اور پھر یہ گلپوشی عنوان چشتی، چودھری بشیال سنگھ ایم۔ پی۔ اور اس مشاعرہ کے دولہا سعید نیّر قریشی وغیرہ تک کی ہوتی رہی۔ اس رسم سے فراغت ہوئی تو ابرار کرتپوری اس تقریب کا آغاز حمد سے فرما رہے ہیں۔

(اسی ہال میں نمازِ مغرب بھی ادا کی گئی ہے۔ جمہوریہ ہند زندہ باد، پیارے لال بھون اور نماز کی ادائیگی اور حمدِ خدا سے ایک ادبی تقریب کی بسم اللہ۔ سرحد پار کے فرزندان توحید دیکھیں کہ اس کفرستان میں مذہب کی اتنی آزادی بھی ہے)

ابرار صاحب حمد سنا کر آئے تو عنوان صاحب شستہ اور ٹکسالی زبان میں اردو کی اہمیت اور قومی یکجہتی پر گل افشانی فرما رہے ہیں:-

دس پندرہ سال سے ہندوستان کی راجدھانی میں اردو کی تقاریب خصوصاً اردو کی کتابوں کی رسمِ اجرا بھی ہو رہی ہے سعید نیّر گنگوہی کے فرزندِ ارجمند عمران عظیم علیگ نے اس تقریب کا اہتمام کیا، ہم سبھی نے اس کو کامیاب بنانے کا وعدہ کیا جہاں تک نیتہ

صاحب کی کتاب کے دیکھنے کا تعلق ہے اس کا جستہ جستہ دیکھا خوب ہے۔ مصروفیات کے باوجود انھوں نے گیسوئے سخن کو سنوارنے میں بھی کوشش کی۔ ہم بھی تبریک و تحسین پیش کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اُن کی کتاب شرفِ قبولیت حاصل کرے۔

چودھری یشپال سنگھ ایم۔پی خالص اُردو میں فرمارہے ہیں:۔

"اس کتاب کے مصنف میرے عزیز سعید نیّر قریشی گنگوہی اور دوسرے حضرات ڈائس پر تشریف فرما سامعین اور شائقینِ اُردو ادب۔! آج اپنی خوشیوں کا اندازہ شاید میں بھی نہیں لگا پارہا ہوں۔ اس کتاب کا اجرا بہن شیلا جی کے دستِ مبارک سے ہورہا ہے۔ نیّر میری آغوش میں پلا ہے اور اس کے ذہن اور دل و دماغ کا پروان قوم پرست لوگوں اور ملک پرست لوگوں کے بیچ ہوا ہے۔ ہم سبھی اُن کی کتاب سے فیضیاب ہوں گے"۔

اُردو ملک سے باہر کی زبان نہیں ہے۔ (ان دنوں اسے باہر ہی کی زبان کہا جارہا ہے اور اسے جلاوطنی دی جارہی ہے) اس کی پرورش ہندوستان میں ہوئی ـــ تالیاں ـــ ہمارے قانون بنانے والوں نے ہندی کو قومی زبان کا درجہ دیا لیکن اُنھوں نے گنجائش رکھی کہ اُردو بھی اس ملک میں پھلے پھولے' اس کا بھی ایک مقام رکھا (اُن کی نیت اور ارادے صاف تھے۔ آج تو یہ قانون صرف کاغذ تک محدود ہے) میرے جیسے لوگ جن کی زبان اُردو ہی ہو' وہ تو چاہتے ہیں کہ اُردو پھلے پھولے' اس کو خصوصی درجہ دیا جائے (لیکن حضور والا دس بیس کے چاہنے سے ہوتا بھی کیا ہے' وہ چاہا کریں) چودھری صاحب کے لب و لہجہ پر ذرا بھی ہندی کا اثر نہیں ہے۔ 'جئے ہند' کہہ کر تالیوں کی جھنکاریں جارہے ہیں اور ذہین نقوی محترمہ شیلا صاحبہ سے "نمودِ سحر" کے اجراء کی درخواست کررہے ہیں۔ تالیوں سے آپ کا خیر مقدم ہورہا ہے۔ فرمارہی ہیں:۔

"نیّر قریشی' چودھری یشپال جی' کمیٹی کے ممبران اور اس ہال میں بیٹھے ہوئے بہت ہی عزیز بھائیوں! میں سوبھاگیہ سمجھتی ہوں کہ اس کتاب کی رسمِ اجراء کا مجھے موقعہ دیا گیا میں اُردو سے اِس درجہ تعلق رکھتی ہوں کہ کانوں کو بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مجھے اُس کو سیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اُردو زبان کی مٹھاس ضرور رہتی ہے۔ تالیاں ـــ یہ زبان سیکھی جائے یا نہ سیکھی جائے پھر بھی یہ ہمارے دل کو چھوتی ہے ـــ تالیاں ـــ پہلی پیڑھی کے لوگ اسے پڑھتے سیکھتے تھے اور اُن کے بعد کے لوگ اُسے سیکھتے تھے۔ اگر اسے پڑھیں گے تو یہ ترقی کرے گی۔ نیّر صاحب کے قومی ایکتا کے بارے میں جذبات ہمارے دلوں کو چھوتے ہیں۔ آپ لوگوں کو بدھائی دیتی ہوں کہ آپ لوگوں نے ایسا سمارنگ رکھا۔ میری شبھ کامنائیں ہیں کہ یہ کتاب خوب ملک کے کونے کونے میں پھیلے

تالیاں

ڈاکٹر آتما رام کی طرف سے ایک ہزار روپے سعید نیّر صاحب کو پیش کئے جارہے ہیں جو شیلا صاحبہ عطا کررہی ہیں اور عنوان صاحب فرمارہے ہیں" میرے لئے یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس موقعہ پر ایسی عظیم تقریب کی صدارت مجھے بخشی گئی ہے۔ میں بیحد شکر گزار ہوں'

دیکھا تو شیلا صاحبہ اور چودھری یشپال سنگھ جی پونے سات بجے رُخصت ہورہے ہیں اُدھر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اُردو اور اُردو غزل سے لیکر سعید نیّر کی نشاطیہ اور جمالیاتی شاعری تک' نہایت جامع اور مختصر تقریر فرما کر جارہے ہیں اور اس مشاعرہ کے مجوزہ صدر الحاج ہیکل اُتسا ہی ایم۔پی تشریف لائے ہیں۔ پھولوں سے آپ کا استقبال کیا جارہا ہے اُدھر پروفیسر تنویر چشتی نظامت کے فرائض ادا کررہے ہیں آپ دہلی کے نوجوان شاعر واجد سحری کو دعوتِ سخن دے رہے ہیں۔ واجد صاحب فرمارہے ہیں۔

برسوں اُسے دیکھا ہے پرکھا ہے تو سمجھا ہے
دل شیشہ نہیں اُس کا چہرہ تو سنہرا ہے
اک اجنبی انساں ہے جو دوست نہ دشمن ہے
وہ پیار سے ملتا ہے دل پھر بھی لرزتا ہے

داد و تحسین کا شور خوشگوار کم ہوا تو مائک سے جدا ہورہے ہیں۔ دیکھا تو مخمور سعیدی اپنے مخصوص انداز سے عطا کررہے ہیں ؎

"کتنی دیواریں اُٹھی ہیں ایک گھر کے درمیاں
گھر کہیں گم ہوگیا دیوار و در کے درمیاں

داد مطلع ہی سے شباب پر ہے۔ اور آپ فرمارہے ہیں ؎

" منتظر اس کا کوئی اس کے گھر میں رہ گیا
وہ مسافر تھا کسی لمبے سفر میں رہ گیا
یوں تو جو پایا سفر میں سب سفر میں رہ گیا
راستے کا آخری منظر نظر میں رہ گیا
رنگ سب اُس کی نظر کے آنسوؤں میں بہہ گئے
لیکن اک خوشبو کا چہرہ چشمِ تر میں رہ گیا "

اب داد دینے والے بھی بے حال سے ہوچکے ہیں اور آپ محفل کو گرمارہے ہیں ؎

" جا بسا جو پرندوں کا تو اب جانے کہاں
گھونسلہ اُلجھا ہوا شاخِ شجر میں رہ گیا "

ہال میں" واہ' واہ" " پھر عطا فرمائیے' "سبحان اللہ" "کیا کہنا" کا ایک دھماکہ ہوا' کئی بار دُہرا کر اسی طرح محفل پر چھارہے ہیں۔ مخمور صاحب سامعین کو سرشار کرکے 'داد و تحفہ' لُوٹ' مائک سے جُدا ہورہے ہیں' اور کمال جعفری فرمارہے ہیں ؎

" مری نظر میں ہے محفوظ ہر سفر اُس کا
کہ میں ہی دُنیا میں ہوں دستِ ہنر اُس کا
وہ مجھ پہ سنگِ ملامت تو پھینک سکتا ہے
کسے خبر کہ سلامت رہے گا سر اُس کا "

داد اس شعر کا حق ہے' لہٰذا داد دئے جارہے ہیں اور گنگوہ کے اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعر عمران عظیم باصرار تمام آکررہے ہیں ؎

" گھر سے رُخصت ہوتا ہے کوئی بیٹا

ماں کی آنکھوں میں کچھ تارے جھڑتے ہیں
چادر سے آگے پھیلاتے ہیں پاؤں
مجبوری میں زیور گروی دھرتے ہیں
لُو کا موسم ہو یا سردی کی شدت
مفلس بچے دن بھر محنت کرتے ہیں "

عمران عظیم صاحب داد و تحسین وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ اس تقریب کا اہتمام آپ ہی نے کیا ہے۔ عمران صاحب لائق تحسین کہ انھوں نے اپنے والد سعید نیّر صاحب کی کتاب "نمودِ سحر" چھپوا کر اس کے لئے یہ تقریب بھی منعقد کرائی۔ لیجئے محمد احمد رمز فرما رہے ہیں ؎

" وہ جاتے جاتے بہت دُور تک دکھائی دیا
زمیں پہ جیسے مجھے اک فلک دکھائی دیا
عجیب لہریں تھیں اُس کے بدن میں چاہت کی
فریب رنگ تھا لیکن دھنک دکھائی دیا "

دوسرے مصرعہ پر داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا۔ کئی بار دُہرا کر ارشاد ہُوا ہے ؎

" وفا کے نام کی کوئی سپر نہ کام آئی
جفا کی طرز پہ دم بے جھجک دکھائی دیا "

رمز صاحب مائک سے نہایت کامراں پلٹ رہے ہیں اور شکیل جمالی لُٹا رہے ہیں ؎

" اب کے بھی میرے ہاتھ سے جنت نکل گئی
اب کے بھی ساری نیکیاں شیطان کھا گیا "

داد وصول کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے ؎

" تسلیوں سے فریضہ ادا نہیں ہوتا
جڑیں کٹی ہوں تو پودا ہرا نہیں ہوتا
رعایتوں کی دلآویز تختیوں پہ نہ جا
دوکاندار کسی کا سگا نہیں ہوتا
کسی کی موت پہ رومال نم نہیں ہوتے
اب انتقال کوئی سانحہ نہیں ہوتا "

شکیل صاحب بھی داد میں ڈوبے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب عطا کر رہے ہیں ؎

" تعصّب کی فضا میں طعنۂ کردار کیا دیتا
منافق دوستوں کے ہاتھ میں تلوار کیا دیتا
امیرِ شہر خود ہی زرد رُو ہے ایک مدت سے
جھرد کے سے وہ اہلِ شہر کو دیدار کیا دیتا
کہیں کوئی کمیں کا نئی محبت سے مرا دل خالی
خبر یہ تھی تو پھر بچوں کو میں اخبار کیا دیتا
ہمارے دل کو جو دیتا نہیں اِک دھوپ کا ٹکڑا
ہماری رات کو وہ چاند کا معیار کیا دیتا "

عنوان صاحب خوب خوب داد و تحسین سے نوازے جا رہے ہیں۔ آپ "ایک اور" "ایک اور" کے شور کو نظر انداز کر کے اپنی جگہ آ گئے ہیں اور ڈاکٹر سجاد حیدر پُر وقار انداز سے عنایت کر رہے ہیں ؎

" دل کی ہر اُمنگ کو لفظ دو بیان دو
عشق کو حجاب کیوں، عشق کو زبان دو
آج دل کی تتلیاں جسم میں ہوں قید کیوں
طائرِ قفس کو بھی تھوڑی سی اڑان دو
فکر کو کی روشنی ذہن میں ہو بند کیوں
طائرِ خیال کو سات آسمان دو

سجاد صاحب بھی داد پا کر مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور اب آ رہے ہیں گنگوہ کے ایک کہنہ مشق بزرگ شاعر حضرت غلام محمد زائر چونکہ آپ مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں، لہٰذا مشاعروں سے دُور ہی رہتے ہیں۔ بڑے اصرار کے بعد تشریف لا کر کلامِ بلاغت نظام عطا کر رہے ہیں ؎

" یہ ہزار فتنہ ساماں، یہ ہزار فتنہ جُو ہے
مری آرزو کا حاصل تری زلفِ مشکبو ہے
یہ حجابِ ناز کیسا؟ یہ حجابِ ناز اُٹھا دے
مرا ذوق با ادب ہے مری چشم با وضو ہے
مری وادیٔ تخیل سے ابھی ابھی جو گذرا
کوئی کتنا خوش ادا ہے کوئی کتنا خوب رُو ہے
وہ یہیں حریمِ دل میں کہیں چھپ رہا ہو شاید
کہ جہت جہت میں زائر تجھے جس کی جستجو ہے "

قبلہ زائر صاحب کے شایانِ شان داد دی گئی ہے۔ اور اب ایک نیا لب و لہجہ، نئی آہنگ کی منفرد غزل کے تین شعر سنیئے۔ شہپر رسول پھلاوی نے ارشاد ہوا ہے ؎

" تعصب یہ ہے کہ وہ دُشمن کو کم نسب نہ کہے
عجب یہ ہے کہ یہ دُنیا اُسے عجب نہ کہے
مری نگاہ لبوں میں یہ بات پھیل گئی
کہ کب کہیں مرے جذبات اور کب نہ کہے
وہ بے زبان نہیں ہے تو کم نظر ہوگا
جو چشم و لب ترے دیکھے مگر غضب نہ کہے "

شہپر صاحب نہ جانے کیوں بخل سے کام لے کر گلو خلاصی کر کے چلتے بنے حالانکہ اہلِ ذوق ابھی آپ سے بہت کچھ سننا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ



...نت کی وجہ سے اب تین شعر سُنانے کی قید
...ہے۔ لیکن لوگ اس قانون کو نظرانداز کر کے
...صاحب سے کچھ اور بھی سُننا چاہتے ہیں' اور
...بھی اَن سُنی کر گئے۔ تو آئیے تو اب گنگوہ کے
...اور بزرگ شاعر نسیم الوزرا ایوبی سے شگفتہ
...مگر اُن کے معصوم چہرے اور ریشِ مُبارک
...جیے' یہ تو دل کے معاملات ہیں ؎

" ٹوٹنے لمحات میں پختہ ارادہ چاہیئے
ڈوبنے کو صرف تنکے کا سہارا چاہیئے
شام کو گھر کی طرف جاتے پرندے دیکھ کر
ہم نے بھی سوچا ہے اور گھر بنانا چاہیئے
کوئی دستک کوئی آہٹ تک نہیں احساس کی
اونگھتی بستی ہے بیدار لمحہ چاہیئے "

قبلہ الوزرا صاحب اس محفلِ رنگ و نور میں
...و شاداں اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ اور اب گنگوہ
...اور نوجوان شاعر راشد کمال یوں اپنے فن
...مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

" کچھ چاہت' سوندھی خوشبو لیکن رشتہ پکا ہو
بارش بھی ہو دھوپ بھی نکلے اک ایسا بھی قصہ ہو
...بیٹھے اب سامنے بیٹھے ہوئے من چلے بال کو
...سنوار رہے ہیں۔ ایک ہنگامہ سا ہنگامہ ہے
...اسی متانت سے فرما رہے ہیں ؎

" آوازوں کے اس جنگل میں کون کسی کی سنتا ہے
یا تو کوئی بات نئی ہو یا پھر جیب میں پیسہ ہو "

پھر گنگوہ کے نوجوان زیادہ اُچھل کود رہے
...کمال صاحب غزل سرا ہیں ؎

روز آتا ہوں تیرے کمرے میں
اپنی تنہائی سے بتیا کرنا
تیری تصویر سامنے رکھ کر
خود پہ ہنسنا' تجھے تکا کرنا "

اب داد دینے والے تالیوں پر اُتر آئے ہیں۔
...ل صاحب محفل کو گرما رہے ہیں ؎

" کوششیں ہیں تجھے بھلانے کی
تو بھی میرے لئے دُعا کرنا "

کمال صاحب داد لوٹتے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور
...یس الدین رئیس آ کر فرما رہے ہیں ؎

" ہر اک اقرار کی جگہ اگر میں مُنتقل ہو گا
تو پھر ماں کا تاثر کیا مگر میں منتقل ہو گا
کھلے گی آنکھ تو ہر خواب کر دے گا ہمیں زخمی
حویلی کا مکیں کیونکر کھنڈر میں منتقل ہو گا "

رئیس صاحب بھی داد وصول کئے آ رہے ہیں۔ اور اب یونس کوثر گنگوہی اس وقت جبکہ ہر شاعر گلو خلاصی کرنے پر آمادہ ہے۔ آپ ترنم سے غزل الاپ رہے ہیں۔ سماعت فرمائیے ؎

جدید عہد کی تاریخ کے وَرَق ہم ہیں
ہماری فکر ہی نسلوں کے درمیاں ہوگی
ہزار کوششیں آقائے مغربی کر لیں
نمودِ صبح تو مشرق ہی سے عیاں ہوگی

پھر گنگوہ کے منچلے تالیوں سے داد دے رہے ہیں۔ یہ قصبات کا طریقہ ہے لہٰذا یہ وہاں کی روایت یہاں بھی لے آئے۔ بعض قصبات میں جس شاعر کو تالیوں سے داد دی جاتی ہے اُسے نہایت کامیاب شاعر سمجھا جاتا ہے۔ دیکھا تو اُسی ہنسی مذاق اور تفریح میں ایک نو عمر شاعرہ گلابی اور آسمانی لباس زیبِ تن کئے جونہی مائک پر آئیں تو تالیوں سے خیر مقدم ہُوا' اور یہ ہیں زُہرہ جبیں' نہایت متانت اور سنجیدگی سے فرما رہی ہیں ؎

" کیا کہوں کیسے کہوں' کہنے سے کچھ حاصل نہیں
اک سفینہ ہوں بھنور میں دُور تک ساحل نہیں
یوں تو دُنیا نے بہت ڈھارس بندھائی ہے مگر
کھیلنے سے آگ کے شعلوں میں کچھ حاصل نہیں
شبنمی قطرے نہ پلکوں سے گرا نا اب کبھی
اور جس دل کو بنا دے گُل وہ میرا دل نہیں "

جبیں صاحبہ بھی داد لوٹتے اپنی جگہ آ رہی ہیں۔ اب کوئی فضا آ کر فرما رہے ہیں چار لائن سُنیئے۔ ان کی شاعری کا حدود اربعہ معلوم ہو گیا۔ ارشاد ہُوا ہے ؎

" دل میں مرے مُقیم ہیں بس میری حسرتیں
جلتے ہوئے مکان میں رہتا بھی اور کون "

پھر سامنے والے نوجوان خرمستی پر اُتر آئے ہیں اور آپ فرما رہے ہیں ؎

" درسِ اُلفت پڑھا دیا کس نے
تجھ کو مجھ سے ملا دیا کس نے
لوگ کہتے ہیں تیرا دیوانہ
میرا رُتبہ بڑھا دیا کس نے "

پھر تالیاں شباب پر ہیں اور اس عالم میں تنویر چشتی عنایت کر رہے ہیں ؎

" غمِ حیات اٹھا تو جس پہ وہ آنسو
ہماری آنکھ سے ٹپکا تو کیا کیا تپا
نظر سے چھو لیا جس نے تمہاری نظروں کو
وہ ایک لمحہ ہی جان کا عذاب ہے "

تنویر صاحب اپنی جگہ آ کر نیاز احمد حیدرآبادی کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں اور نیاز صاحب بے نیازی سے سُنا کر یہ جا وہ جا۔ اور اب محبوب ظفر سُنا رہے ہیں ؎

" مسائل میں اضافہ ہو گیا ہے
مرا قد اور اونچا ہو گیا ہے
میں کیسے وقت کے ساتھ چلتا ہوں
مرا آنگن ہی ٹیڑھا ہو گیا ہے "

اس شعر پر شاعرانہ داد دی جا رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

" زمانے بھر میں اک ست دوستی تھی
مگر اُس سے بھی جھگڑا ہو گیا ہے "

ظفر صاحب بھی داد کی جھولیاں بھرتے جا رہے ہیں اور نمودِ سحر کے مصنف سعید نیّر گنگوہی عنایت کر رہے ہیں ؎

" دیدہ وری کا خاص ہُنر چھوڑ جاؤں گا
جرأت کی ہم مزاج نظر چھوڑ جاؤں گا
تاریک راستوں میں جلا کر چراغِ دل
ہر سمت اک نئی سحر چھوڑ جاؤں گا
تنہائیوں سے جن کے جینے کی ہر ادا
جس کی نہ شام ہو وہ سحر چھوڑ جاؤں گا
نیّر جنونِ شوق میں منزل سے ماورا
رہبر کو پیچھے جستِ نظر چھوڑ جاؤں گا "

نیّر صاحب شگفتہ غزل بڑی سنگلاخ زمین میں سُنا کر شاداں مائک سے پلٹ رہے ہیں اور اب جدیدیت کے علمبردار اور نئے لب و لہجہ کے نوجوان شاعر اسعد بدایونی آ گئے ہیں۔ محفل

کا جائزہ لے کر عنایت کر رہے ہیں سے
" گاؤں کی آنکھ سے بستی کی نظر سے دیکھا
ایک ہی رنگ سے دُنیا کو جدھر سے دیکھا

وہ شہر سے گزرا تھا فقط یاد ہے اتنا
پھر کوئی بھی دستار سلامت نہیں دیکھی

خود اپنی راہ میں پہاڑ اگاتا رہتا ہوں
خود اپنی راہ کو آسان کرتا رہتا ہوں "
اسعد صاحب ہر شعر پر داد سمیٹے مائک سے کھسک رہے ہیں۔ اور اب شہباز ندیم یوں گلو خلاصی کر کے چلتے بنے سے
" بہتے دریا کی روانی ہو گئے
خون کے رشتے بھی پانی ہو گئے "

غموں کی دھوپ میں دارالامان جیسا ہے
ترا خیال بھی اک سائبان جیسا ہے "
وہ دیکھیے ضمیر درویش مُرادآبادی فرمارہے ہیں سے
" دوست اپنے بھی ہیں کچھ دشمن کے بازو کی طرح
ہم بھی مارے جائیں گے سلطان ٹیپو کی طرح "
مطلع کی اس انفرادیت پر ہال میں پہلی بار بھونچال سا آیا ہے۔ کئی بار دُہرا کر ارشاد ہوا ہے سے
" بیٹھ پر وار کیا تھا تو نے
ہم تعاقب بھی ترا کیا کرتے "
پھر داد شباب پر ہے۔ اور اب فریاد آزر وقت کی نزاکت دیکھ کر ایک شعر پیش کر رہے ہیں سے
" سب کی آنکھیں رہن رکھی تھیں مرے دشمن کے پاس
کون میرے گھر کی بربادی کا منظر دیکھتا "
آپ گلو خلاصی کر کے چلتے بنے اور ڈاکٹر نسیم صدیقی فرمارہے ہیں سے
" اگاتا رہتا ہوں پھول سرسوں کے
میں تتلیوں کو پریشان کرتا رہتا ہوں "

آ کہ دونوں ساتھ مل کر طے کریں یہ راستہ
اے ہوا تجھ کو بھی کوئی ہم سفر ملتا نہیں

کیا لے کے ترے سامنے آؤں کہ مرے پاس
اک جسم ہے کہ جو ناپاک بہت ہے "
نسیم صاحب بھی واہ واہ کرا کے کھسک گئے
اور اب فیاض ندیم یوں رواں دواں سُنا رہے ہیں سے
" پختہ ذہنوں کی بھی بنیاد اکھڑ جاتی ہے
جب کسی قوم کی تہذیب بگڑ جاتی ہے "
لیجیے اب مُرادآباد کے ایک نوجوان باشعور شاعر منصور عثمانی پُر وقار انداز سے عنایت کر رہے ہیں سے
عشق اُن کو عطا نہیں ہوتا
جن کے دل میں خُدا نہیں ہوتا
لوگ عمریں گزار دیتے ہیں
پھر بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
میکشی، قتل، لغزشیں، سجدے
بند کمروں میں کیا نہیں ہوتا "
پھر داد نے ہال میں ہنگامے کو جنم دیا ہے کئی بار دُہرا کر منصور صاحب خوب داد لوٹ کے شاداں پلٹ رہے ہیں۔ دیکھا تو پایتن بجار تے ہندی نُما غزل کے دو تین شعر سُنا کر چلتے بنے۔ اور ڈاکٹر منور نعیم غزل سرا ہیں سے
" کیوں فرقتِ غم پر مسکرا نہیں دیتے
تیر جتنے چھوٹے ہیں کیا مزا نہیں دیتے
میرے دل کی باتوں کو اپنے دل کے شیشے میں
آپ دیکھ لیتے ہیں راستہ نہیں دیتے "
نعیم صاحب بھی داد پا کر آرہے ہیں، اور وحید عازم فرمارہے ہیں سے
" مغرب کے افکار مسلط ہیں ذہنوں پر
ہم اپنی تہذیب سے کتنے دُور ہوئے "
آپ گئے تو واصف نظامی فرمارہے ہیں سے
" تھے پیش پیش ہمیں تیرگی مٹانے میں
اب اک کرن کو ترستے ہیں ہم زمانے میں
جو گاہ گاہ کے ملنے میں قدر ہے واصف
کہاں وہ بات ہے ہر روز آنے جانے میں "
واصف صاحب بھی بخیریت واہ واہ کرا کر مائک چھوڑ رہے ہیں اور اب محترم گوہر عثمانی مرادآبادی تشریف لا کر کلام بلاغت نظام عطا کر رہے ہیں سے
" کیسے پتہ چلے کہ گنہ گار کون ہے
سب بے قصور ہیں تو خطاوار کون ہے
یہ فیصلہ بھی آج مؤرخ پہ چھوڑ دیجیے
تاریخ خود بتائے گی غدار کون ہے "
داد کا سابقہ ریکارڈ بھی چپ ہے کہ دھماکہ ہُوا ہے۔ اِس شعر کو کئی بار دُہرا کر عطا کر رہے ہیں سے
" اگر جنوں کے مقابل شعور نکلے گا
تو سادگی کا رُخ بھی ضرور نکلے گا
کھنڈرِ دیارِ وفا کے کُرید کر دیکھو
ہمارے نام کا پتھر ضرور نکلے گا "
پھر اس شعر پر داد نے ہنگامے کا رُوپ دھار لیا ہے اور قبلہ گوہر صاحب پابندی کے تحت، فرمائشوں کو نظر انداز کر کے کامران لوٹ رہے ہیں۔ اور اب معذرت خواہی کے باوجود کریم الاحسانی کو بھی سُنانے پر مجبور کیا گیا۔ آئیے تو سماعت فرمائیے گا سے
" فصیلِ شہر سے کیوں رہبروں پہ پتھر آؤ
یہ راہزن تو نہیں، اِن پہ پھول برساؤ

امیر ہو تو طوائف بھی سب کی سالی ہے
وگرنہ مفلسی گندی سی ایک گالی ہے

جنوری کا دوسرا ہفتہ ہے سردی پر شباب
ایسے عالم میں الاؤ پر ہیں یوں کچھ خستہ حال
ایک ٹولی رہزنوں کی دُور جنگل میں کہیں
چھپ چھپکے بانٹتی ہو جس طرح چوری کا مال
وہ دیکھیے، الحاج تبسم اُنساہی اب
تالیوں کی جھنکار میں، فرمائشوں کو نظر انداز کر
یوں محفل کو نغمگی میں ڈبونے کی ٹھان رہے ہیں
" تمام رنج و الم گھر پہ چھوڑ کر اکثر
سفر کو جب بھی میں نکلا خوشی خوشی نکلا
جلایا شہر بھی اور کھیتیوں کو پھونک چلا
یہ آدمی کہ جو خاکی تھا آتشی نکلا
داد اور تبسم، لازم و ملزوم عجب چاپ سُنتے ہیں
" تم اب تمہارا ہیں بن جاؤں تم میرے سدا ہی بن جاؤ
آج کی رات میں ٹوٹ کے برسوں تم جھوم کے ساون بن جاؤ

تم نے جوانی کے موسم میں جانے کتنے کھیل رچائے
آج کھلونا میں بن جاؤں تم اپنا بچپن بن جاؤ

جب چاہے روپ بدل لے موسم کو دشوار ہی کیا
پھولوں کے قاتل کو یارو جنگل کیا پھلواری کیا
خاک ہی اپنا گھر آنگن ہے شہر ہو یا ویرانہ ہو
بنجاروں کو چل دینا ہے، چلنے کی تیاری کیا "

اب یار لوگ جم کر بیٹھ گئے ہیں اور سننے کے موڈ میں ہیں، اور بیکل صاحب " ایک اور، ایک اور " کو سنی ان سنی کرتے ہوئے چلتے بنے بیکل صاحب کے ساتھ ہی یہ نشست اور یادگاری محفلِ شعر و سخن سوا ۲ بجے، نہایت کامیابی کے ساتھ برخاست ہو رہی ہے۔ اس تقریب کو کامیاب کرانے میں عمران عظیم، شہپر رسول، ڈاکٹر عنوان چشتی اور ان کے رفقاءِ کار، سعید نیر قریشی، ظہیر اختر اور نسیم انور ایوبی وغیرہ نے بڑی جد و جہد کی۔ یہ سب حضرات لائقِ صد تحسین اور قابلِ مبارکباد ہیں، اور میں بھی داد و واہ اور تعریف تو نہیں چاہوں گا صرف دعائے صحت کی ضرورت ہے۔ میں نے بھی اِس مشاعرہ کے لئے حسن پور لوہاری سے لکھنؤ کا سفر کیا اور اس شام کو لکھنؤ سے دہلی کے لئے روانہ ہو کر مشاعرہ میں شرکت کی، کیونکہ برادرم سعید نیر صاحب غریب خانہ پر تشریف لا کر اس مشاعرے میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر مدعو کر گئے تھے حالانکہ میں مشاعروں میں اب شرکت برائے نام ہی کرتا ہوں لیکن اُن کے خلوص اور حکم کے سامنے مجبور ہونا پڑا اور کہنا پڑا ع

" سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی "

اور اب کیا عرض کروں۔ نیر صاحب کے اِس شعر پر رخصت ہوتا ہوں ؎

" اِک بار کہا جس نے ہمیں جانِ تمنا
بے بات کبھی اُس کو خفا بھی نہ کریں گے "

غزل

عروج نفیسی جھانسوی

اُنھیں کی آنکھ بس پُرنم نہیں ہے
مِرے مٹنے کا جن کو غم نہیں ہے
مرے آگے سے ہٹ جا ابرِ باراں
مری آنکھوں میں پانی کم نہیں ہے
وہی تکتے ہیں اوروں کا سہارا
کہ جن کے بازوؤں میں دم نہیں ہے
یہ زخمِ دل ہے کیا تجھ سے ہو اس کو
تمہارے پاس وہ مرہم نہیں ہے
خدارا آج تو دیکھو نہ ایسے
مریضِ ناتواں میں دم نہیں ہے
وہ پائیں گے بھلا کیا اپنی منزل
کہ جن کا عزم خود محکم نہیں ہے
عروجؔ اُس بزم سے مجھ کو غرض کیا
جہاں عشرت ہے کوئی غم نہیں ہے

غزل

کندن لعل گرداھر

اللہ تیری شان! ہوئے وہ غرقِ جام
کہتے رہے جو مے کشی کو برملا حرام
اللہ تیری شان! ہوا خوب فیصلہ
سب حق ملیں خواص کو سب فرض لیں عوام
اللہ تیری شان! ملے خواجگی اُنہیں
جن کے ضمیر رہن ہیں جن کی زباں غلام
اللہ تیری شان! قفس میں ہے عندلیب
پھرتے ہیں بوم زاغ گلستاں میں خوش خرام
اللہ تیری شان! یہ جوہر کی قدر ہے
لعل و گہر سے بڑھ کے ہیں سنگ و خزف کے دام
اللہ تیری شان! وہ قسائی ہیں آجکل
چھریاں بغل میں جن کی ہیں لب پر ہے رام رام
اللہ تیری شان! یہ گردھر کا ہے مزاج
ناکام و نامراد ہے پھر بھی ہے شاد کام

غزل

شوق جالندھری

زندگی سے تنگ تھا حالات سے بیزار تھا
کیا سنبھلتا میں کہ اِک گرتی ہوئی دیوار تھا
اوڑھ کر چادر غریبی کی میں سوتا ہی رہا
لوگ مجھ کو پڑھ رہے تھے جیسے میں اخبار تھا
زندگی کا درد میں بھی بانٹ سکتا تھا مگر
اس کو کیا کیجئے کہ میرا ذہن ہی بیمار تھا
گھر غریبوں کے جلے کیسے جلے کیونکر جلے
لوگ کہتے ہیں محافظ شہر کا بیدار تھا
جھیل سی آنکھوں میں اُنکی ڈوب ہی جانا پڑا
دوستوں کا مشورہ بے سود تھا بیکار تھا
میں یہاں کس طرح پہنچا ہوں یہ مجھ سے پوچھئے
آپ تو کہتے ہیں میرا راستہ ہموار تھا
شہرِ دل میں شوقؔ پھر مجھ پر ہی یہ الزام کیوں
جب تمہارے سامنے ہر شخص کا کردار تھا

آزادی سے متعلق
اتر پردیش اردو اکادمی کی مطبوعات

مشاعرۂ زنداں	————	۴/۵۰
خطباتِ آزادی	————	۱۸/-
نیا ساز نیا انداز	نازش پرتاب گڑھی	۱۸/۳۵
اردو میں قومی شاعری کے سو سال	علی جواد زیدی	۱۷/-
آزادی کی نظمیں	سبطِ حسن	۱۰/-
کراچی کا تاریخی مقدمہ	میرزا عبدالقادر بیگ	۲۰/۵۰
انقلاب ۱۸۵۷ء	حسام الدین	۶/-
اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر	سید مجاور حسین	۲۰/-
اپنی دھرتی اپنی بات	نازش پرتاب گڑھی	۴/-
رپورٹ تیسری انڈین نیشنل کانگریس	پنڈت سندر لعل	۲۴/-

بچوں کا ادب

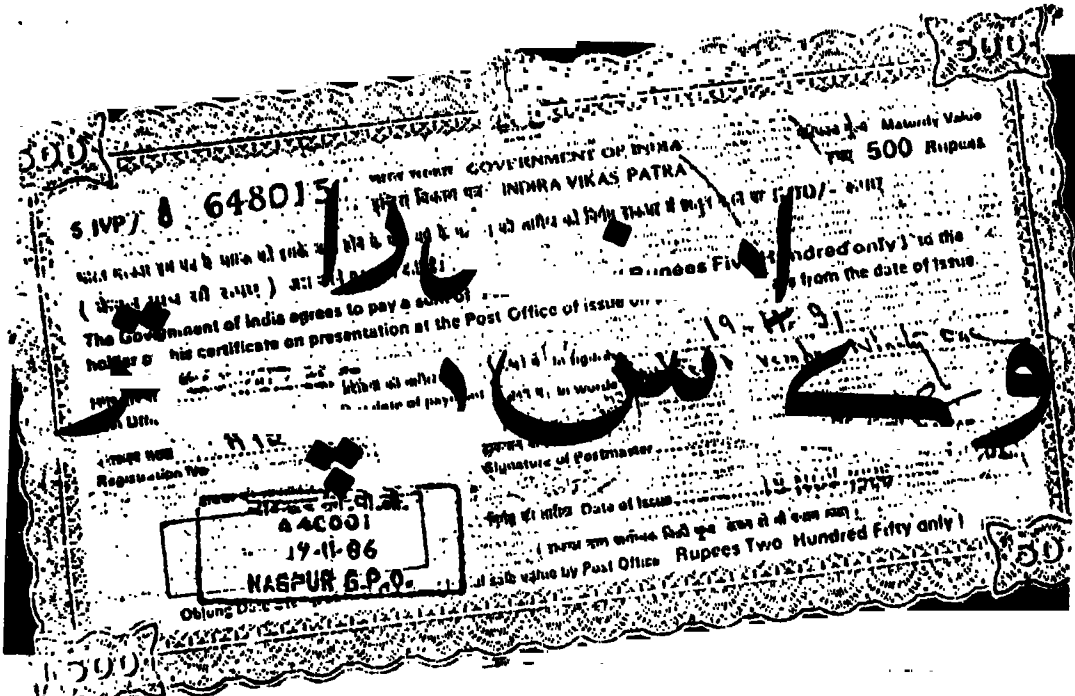
دوستی کا جشن	محسن خان	۳/۵۰
منسارام کا گدھا		۴/-
سرخ گلاب	بشیشر پردیپ	۴/-
کھلتی کلیاں	محمد اطہر مسعود خاں	۴/۵۰

فہرستِ کتب اور دیگر تفصیلات کے لئے رجوع کریں

آر۔ کے۔ ورما

سکریٹری:۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔

مختصر ترین مدت میں اپنی آمدنی دوگنی کیجئے



صرف 5½ برسوں میں

250 روپے ہو جاتے ہیں 500 روپے
500 روپے ہو جاتے ہیں 1000 روپے
2500 روپے ہو جاتے ہیں 5,000 روپے

خصوصی کشش

* کوئی درخواست فارم نہیں چاہئے۔
* خریداری کی کوئی بالائی حد نہیں۔
* آسانی سے تبدیل کئے جاسکتے ہیں۔
* خراب یا پھٹ جانے کی صورت میں دوسرے سرٹیفکیٹ کا اجرا

دیہی افراد اور دیگر انکم ٹیکس ادا نہ کرنے والوں کے لئے سرکاری بچت اسکیموں میں سب سے آسان

کسی بھی ڈاک گھر سے خریدئیے

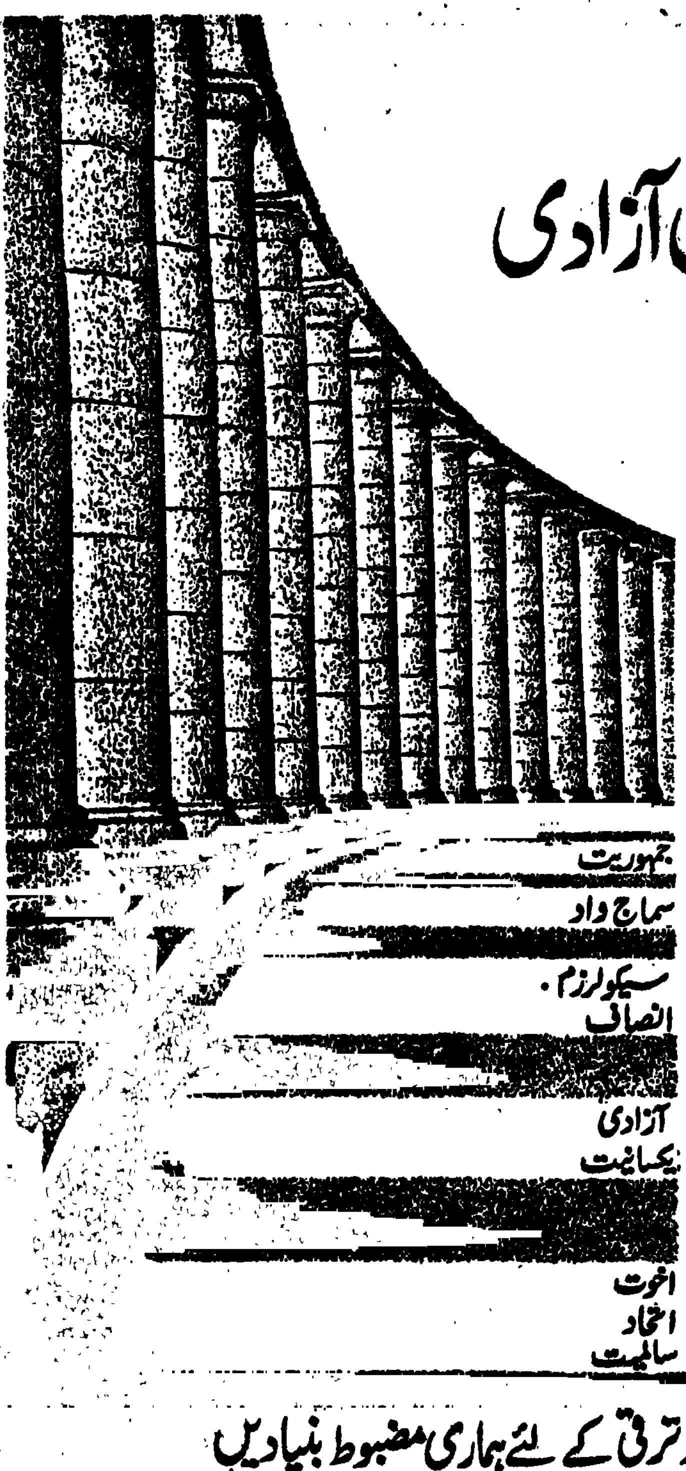
قومی بچت ادارہ

بھارت سرکار

ناگپور

davp 87/322

ہماری جمہوری آزادی



"ہمیں اس آزادی کے حصول کے لئے کیا کرنا ہے
ان کا انحصار بہت کچھ اُن بنیادی وجوہات پر ہے
جن پر گاندھی جی تمام عمر زور دیتے رہے ہیں ——
جیسے کہ اعلیٰ اخلاق، صدق دلی اور مقصد میں
ثابت قدمی، قوتِ برداشت، تعاون اور محنت —
میں عوام کو فقط اتنا ہی تجویز کر سکتا ہوں کہ ہم ان
بنیادی خصوصیات کی بنا پر اپنی جمہوری آزادی کی
بنیاد رکھیں اور ڈر اور نفرت کو اپنے دل و دماغ
سے نکال کر ہمیشہ اپنے لاکھوں کروڑوں لوگوں
کی بہتری کا خیال کریں"

جواہر لال نہرو

امن و امان اور ترقی کے لئے ہماری مضبوط بنیادیں

davp 87/60

پہلی کونپل



فاطمہ زہرہ جبیں

زندگی کے اس موڑ پر جہاں میں ایک گھنا اور درخت کی طرح لباسِ برگ و بار سے آراستہ کھڑا ہوں، میرا سر غرور سے بلند ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے میرے عنفوانِ شباب کا وہ سنہرا دور پھیلا ہوا ہے جس پر میری محبتوں کی کثرت کے علاوہ دولت کی فراوانی کا غلغلہ بھی ہے۔ میری جوانی کی عجز سرکشی بھی ہے اور میرے وجود کا اعتماد بھی ہے۔

میں ان سیاہ مدہوش کن آنکھوں میں اپنی دہکتی ہوئی جوانی تلاش کر رہا ہوں، جن کی محبت کی خود فراموشی نے مجھے اپنی ذات کی قید سے نکال کر ایک کائناتی وسعت دی۔ عنفوانِ شباب کی ابتدائی منزلیں مجھے اب بھی گرماتی ہیں جہاں میں قبل از وقت بلوغ کو پہنچنے والا مرد تھا جو شکست کا تصور بھی نہیں رکھتا تھا۔ اور میں نے بہرحال اسے حاصل کر لیا جسے کہ میں حاصل کرنا اپنی زندگی کا اولین مقصد سمجھتا تھا اس کے حصول کے لئے مجھے اپنے باپ کو ناراض کرنا پڑا تھا۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کا ناراض ہونا منصفانہ نہیں تھا کیوں کہ اُسے حاصل کرنے سے نہ تو میرے وقار پر حرف آتا تھا اور نہ میرے باپ کا سر شرم سے جھک سکتا تھا۔

میرے نفیس اور آرام دہ محل نما بنگلہ میں میری ماں ہی وہ واحد ہستی تھی جسے میرے دلائل نے اور میرے شفاف جذبوں نے قائل کر دیا تھا۔ کیونکہ میرا سر میری ماں کے قدموں میں تھا اور پھر میری ماں نے جنت کے دروازے وا کر دیے۔

میرے خیال میں میرا باپ میری شادی سے صرف اس لئے بہت زیادہ ناراض تھا کہ مجھے میری ماں کی حمایت حاصل تھی۔ بہرحال میں نے اپنے باپ کو آخری مرتبہ وارننگ دے دی کہ آپ اُن کے گھر جائیں اور اس کو میرے لئے مانگیں، ورنہ میں خود اسے حاصل کر لوں گا، پھر وقت گزر جائے گا لیکن بات کی تلخی رہ جائے گی۔

بہرطور مجھے یقین تھا کہ وہ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا کیونکہ میں اس کا واحد بیٹا تھا اور جانتا تھا کہ وہ اندھا دھند مجھے چاہتا ہے اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کبھی نہیں کھو سکتا۔

شادی تو ہو گئی لیکن ایک چھوٹی سی خلش میرے اور میرے باپ کے درمیان باقی رہ گئی۔ محبتوں کی شدت کے باوجود ایک سرحد سی قائم ہو گئی جس کا نام محبت نہیں تو نفرت بھی نہیں تھا، اس سرحد کے دونوں طرف ایک ہی خون دو جسموں میں دوڑ رہا تھا۔ ایک روز اچانک بیٹھے بیٹھے میرے باپ کو دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

اس روز میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ میں اپنے باپ کو کس قدر چاہتا ہوں۔ وہ میرے لئے کس قدر ناگزیر تھا۔ رات دن، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ہر ہر لمحہ میرے دل کی پرتوں سے ایک آواز باپ کو پکارتی رہتی تھی۔ جو اپنی چھوٹی سی خلش، جو میرے سبب تھی، دور کئے بغیر، مجھ سے کچھ کہے بغیر، اپنی شکست کی شرمساری کو چھپائے ہوئے چلا گیا۔

میں آہستہ آہستہ اپنی شریکِ حیات، رافعہ سے دور ہو رہا تھا اور بہت ہی غیر محسوس طریقہ سے اپنے باپ کے قریب ہو رہا تھا۔ اکثر مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میرا احساس میرے باپ کی روح سے ہمکلام ہو... اور جیسے میرا وجود اس کی روح کے سامنے شرمسار ہو۔ اس سے پہلے کہ میری شرمساری مجھے رافعہ سے مکمل طور پر چھین لیتی، رافعہ نے راحیل کو جنم دیا۔

راحیل، میرا بیٹا، جسے میں نے گود میں لیتے ہی نرس کی گود میں واپس دے دیا... اور بھاگتا ہوا ڈریسنگ روم میں پہنچا۔

"واقعی کیا میں باپ بن گیا ہوں؟ ایک خوبصورت بیٹے کا باپ" میں نے سر سے پیر تک آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔

"شکیل" ماں نے پکارا "تم بچے کو پھینک کر یہاں کیوں بھاگ آئے؟"

"اوہ... کچھ نہیں... میں دراصل یہ دیکھنے آیا تھا کہ کیا میں واقعی باپ نظر آتا ہوں!"

"شکیل، میرے بیٹے! حقیقت کو تسلیم کرنا ہی حقیقت ہے"۔ ماں مسکرا رہی تھی۔

"آپ بتائیے نا پیاری ممی! کیا میں واقعی باپ نظر آتا ہوں"۔

"تم جس طبقے سے تعلق رکھتے ہو بیٹا! اس طبقے کے لوگ تیس برس سے پہلے بیاہ نہیں کرتے تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ جب تک راحیل جوان ہوگا، تم بھری بہاریں جوان درخت کی طرح سربلند کھڑے ہوگے"۔ ماں نے محبت سے کہا۔

"تو ممی"۔

"ہاں بیٹا، تم اپنے باپ کی مثال لے لو، تم ابھی پورے بیس برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ یتیم ہو گئے"۔ ماں اداس ہو گئی۔

"ہاں ممی! اپنے بچوں کی خوشی دیکھنا واقعی بڑی خوش نصیبی کی بات ہے"۔

"میرے والد نے پچاس پچپن کی عمر میں میری ماں سے بیاہ کیا تھا۔ عمروں کے اس غیر معمولی تضاد نے انھیں ہم آہنگ ازدواجی زندگی سے محروم رکھا تھا۔ میرا باپ میری ماں کو ناقص العقل عورت قرار دیتے ہوئے یہ بھول جاتا تھا کہ اُن دونوں کے درمیان تیس سال کا فاصلہ ہے اور ذہنوں کے درمیان تیس سال کا فاصلہ زبردست فرق پیدا کر دیتا ہے"۔

اور پھر راحیل کے بعد میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا باپ بن گیا۔ میری نرم و نازک بیٹی مدیحہ میرے اور رافعہ کے علاوہ اپنی دادی کی بھی آنکھوں کا تارا تھی۔ میں نے اپنے بچوں کی تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر کی۔

میرے بچے جوانی کی منزل میں قدم رکھ چکے تھے لیکن میں ہنوز بھرپور جوان تھا۔

میرا کاروبار وسیع تر ہوتا رہا۔ اس وسعت میں اُلجھ کر مجھے اپنے بچوں سے کسی قدر دور رہنا پڑتا تھا۔ تاہم میں مطمئن تھا کہ میرے بچے بہترین استاد کے علاوہ میری ماں کی مقدس شفقتوں اور رافعہ کی پاکیزہ محبتوں سے معمور فضا میں پرورش پا رہے ہیں، پھر بھی ہر شب میں ان کے درمیان کم از کم ایک گھنٹہ میں اُن کے درمیان رہتا۔ ان سے محبت کرتا میں اُن کے مستقبل کے اُفق کو آراستہ کرنے کے لئے انتھک کوشش کر رہا تھا۔

اچانک ایک روز راحیل نے اپنی ماں سے کہا۔

"ممی! آپ پروفیسر حیدر کی بیٹی نازآفرین کے سلسلہ میں ابّو سے میرے لئے بات کریں"۔

"بیٹے تم ابھی کم سن ہو"۔ رافعہ نے کہا۔

"ممی! میری پیاری ممی..." راحیل نے لاڈ سے اپنی ماں کے گلے میں بازو ڈال دیئے۔

پروفیسر حیدر یونیورسٹی کیمپس میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ معمولی گھرانے سے ترقی پاکر پروفیسر بننے والے اس فرد کے خاندان کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جو متوسط طبقہ سے آگے بڑھ سکا ہو۔ یہ شادی یقیناً بے جوڑ تھی کیونکہ میرا بیٹا راحیل ایک خوبرو نوجوان تھا جبکہ نازآفرین ایک سانولی سلونی درمیانی شکل کی لڑکی تھی۔ پھر کیا بات تھی کہ وہ راحیل کے لئے ناگزیر تھی۔ کیا وجہ تھی جس نے نازآفرین کو راحیل کے قریب لا کھڑا کیا تھا۔

میں شش و پنج میں مبتلا تھا۔ میرا تجربہ کہہ رہا تھا شکیل تو بڑھ کر اپنے لختِ جگر کو تھام لے۔ سنِ بلوغت کے ابتدائی کئی سال نوجوانوں کے قدم بہکائے رکھتے ہیں۔ یہ وہ عمر ہے جب نئے نئے جذبے بل کر جوان ہوتے ہیں اور تکمیل چاہتے ہیں۔ اگر زندگی کا یہ نہایت گرمجوش دور اعتدال پسندی سے گزر جائے تو دنیا کی کوئی طاقت انسان کے کردار میں دراڑ نہیں ڈال سکتی۔

لیکن میرا بیٹا کہہ رہا تھا کہ "نازآفرین میرا دل ہے... میرے جذبے کی پہلی کونپل ہے۔ اس کونپل کو اس کی ڈال سے جدا مت کیجئے۔ یہ فطرت ہے اور میں صرف فطرت کی تکمیل کا خواہش مند ہوں"۔

میں نے مخالفت کی، استدلال سے سمجھایا، دھمکی دی، عاجزی کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ جتنا میں اس کو سمجھاتا تھا اتنا ہی وہ سخت ہوتا جاتا تھا۔

"ابّو جان! مجھے نازآفرین چاہیئے۔ میں نے زندگی کی نوید کی پہلی گھنٹی کی صدا کو سن لیا ہے مجھے وہی گھنٹی درکار ہے۔ میں نے بہار کے پہلے جھونکے کی مہک سونگھ لی ہے... مجھے بہار کا وہی جھونکا چاہیئے"۔

ایک جوان بیٹا، سرو قامت اولاد سامنے کھڑی مطالبہ کر رہی تھی۔ میں چڑ سا گیا۔ میں نے غصے میں اسے بری طرح پیٹ ڈالا، وہ پٹتا رہا۔ روتا رہا... کس کے لئے! صرف اس ایک لڑکی کے لئے جو اچانک ہمارے درمیان آکھڑی ہوئی تھی۔

ہاں وہ لڑکی نازآفرین ہی تو تھی جس میں شاید حقیقتاً کوئی برائی نہ ہو... لیکن یہی برائی کیا کم تھی کہ وہ ہماری پسند نہ تھی۔ اس کا باپ خاندانی شرافت کے علاوہ کسی اور سرمائے کا مالک نہ تھا جو میرے برابر بیٹھ کر اچھا لگے۔

"ابّو جان! میں کم عمر ضرور ہوں لیکن میرا جذبہ میری عمر سے زیادہ پختہ ہے۔ آپ چاہے مجھے کتنا ہی ماریں لیکن میں نازآفرین کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتا۔ میں نے حدودِ شرافت میں رہ کر، آدابِ معاشرت کے تمام تقاضوں کے ساتھ آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے"۔

"تو میرا بیٹا ہے اور میرا رہے گا" میں نے ہاتھ روک کر اسے گلے سے لگایا لیکن پھر بھی وہ اپنے مطالبے سے دستبردار نہ ہوا۔

آخر میں نے اس کو گھر سے نکال دیا۔ وہ

خاموشی سے۔ بغیر کوئی احتجاج کئے۔۔
وہ جانے کی تیاریاں کرتا رہا۔۔ میں ٹہل
سے ڈراتا رہا۔۔۔ برا بھلا کہتا رہا۔ ناز آفرین
تنقید بناتا رہا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ چپ
تا رہا۔

پھر جانے وقت وہ میرے قریب آیا۔ اس
ہو سے ملے۔ میرا دل کٹ رہا تھا۔ اس
سے ہاتھ ملایا، اپنی ماں اور دادی کو خدا
ا۔۔۔ اور پھر وہ میرا گھر سونا کر گیا۔

گھر سے نکلنے کے بعد اسی ہفتے اس نے
حیدر کی بیٹی سے نکاح کر لیا اور میرے
تھور سے رہ گئے ان تھک جذبوں سے
جب جوان ہوتا ہے تو یہ کس قدر تکلیف
دکھ جھیلنے والا باپ حقِ ملکیت سے خارج
تا ہے۔ بیشک ناز آفرین نے میرے دل
چھٹے کو غضب کر لیا تھا۔۔ میرے خزانے
تھی وہ۔۔ لیکن میں اپنا خزانہ بچانے کے
جا نہ کر سکا۔

ایک بنگلہ خریدا۔ اسے فرنش کروایا، اس
ح میں ایک کار کھڑی کی اور پانچ لاکھ کی رقم
نا راحیل کے نام ڈالی، پھر پاس بک اور چابی
و فیسر حیدر کے فلیٹ پر گیا۔ پروفیسر خوفزدہ
مالدار آدمی جھگڑا کرنے آیا ہے۔

میں کوئی بے وقوف آدمی نہیں ہوں پروفیسر
میں ان لوگوں میں سے ہوں جو زندگی کا حق
کرتے ہیں تو ادائیگی کا حوصلہ رکھ کر وصول
میرے بیٹے کے دل میں میری محبت کے سوتے
ہو چکے ہیں تو یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جواب
ں اس کے دل کے چشموں کو خشک کر کے بنجر
ں۔ میں اس سے ناراض ہوں اور اس کے
کے لئے اس کو اپنے آپ سے مستقل طور پر
رنے آیا ہوں۔ اسی لئے پروفیسر حیدر آئیں
حساب بیباق کرنے آیا ہوں۔

میں نے سب کچھ اسے دے دیا۔ بہت
بشی کے ساتھ۔۔ اس کی دلہن نظریں جھکائے
طرف بڑھی تو میں نے اوپری دل سے اس

کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔۔ اور بولا۔

"تم میرے بیٹے کی دلہن ہو، لیکن میں تم
سے خوش نہیں ہوں اور نہ ہو سکتا ہوں مگر اس
کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہاری یا راحیل کی خوشی
میں دخل اندازی کروں گا۔ تم لوگ اپنی خوشیوں
میں اور زندگی میں آزاد ہو"۔ پھر میں نے راحیل
سے کہا۔

"تم جب چاہو اپنے بہن بھائیوں، ماں
اور دادی سے ملنے آ سکتے ہو۔ مگر یہ توقع نہ رکھنا
کہ پہل ہماری طرف سے ہوگی"۔

پھر میں چلا آیا۔

آکر سیدھا ڈرائنگ روم میں گیا۔

"کیا دیکھ رہے ہو ڈارلنگ؟" رافعہ نے
میرے کندھے پر ہاتھ رکھ پوچھا۔

"کیا میں واقعی اس قابل ہوں کہ سسر
لگ جاؤں؟" میں نے اضطراری کیفیت میں کہا۔

"اور میں ساس"۔ رافعہ نے میرے کندھے
پر اپنا سر رکھ دیا۔

"ارے یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے!
دروازے میں کھڑی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

"ممی ڈیئر! سچ بتلائیں، کیا ہم دونوں ساس
سسر نظر آتے ہیں"۔ ہم دونوں رو رہے تھے "ممی
کیا ہم اتنے عمر رسیدہ ہو گئے ہیں! ابھی تو ہم بھری
بہار میں کھڑے تھے"۔

ممی حیرت سے ہم دونوں کی طرف دیکھتے
ہوئے بولیں "میرے بچو دنیا میں ایسا کون سا
درخت ہے جو اپنی پھلوں سے لدی ہوئی شاخوں
کو دیکھ کر روتا ہے"۔ ممی نے ہم دونوں کے سروں
کو سینے سے لگا لیا "بچو! حقیقت کو تسلیم کر لو،
دیکھو میں بھی کیسی شاندار دادی لگتی ہوں جس
کے سر کے بال ہنوز کالے ہیں۔ اور پھر بیٹا تم، میں
اور رافعہ۔۔۔ ہم تینوں کتنے خوش نصیب لوگ ہیں
کہ خدا نے ہمیں اپنے بچوں کی خوشیاں اس قدر
کم عمری میں دیکھنے کے قابل بنا دیا۔۔۔ اور ہو سکتا
ہے کہ ہم اگلی نسل یا اگلی دو نسلوں کو پھلتا پھولتا
دیکھ سکیں"۔

"میری ممی!" میں دوڑ کر ممی سے لپٹ گیا۔

"تم خدا کا وہ لازوال نور ہو ماں جو صبح کی سنہری سیڑھی
سے آسمان سے زمین پر اترتا ہے۔ میری ماں! تم
میری زندگی کا لازوال حوصلہ ہو جو ہر دکھ میں مجھے حیات
بخشتا ہے"۔

اب میں اپنے بچوں کے بہت قریب رہنا
چاہتا تھا تاکہ پھر کوئی بچہ میری محبت کو جھٹکا کر اپنی
محبت کا تاج محل نہ بنائے، بلکہ مجھے موقع دے کہ میں
اس کے مستقبل کے افق پر اپنے ہاتھوں سے کہکشاں
سجاؤں۔ اب میرا تمام وقت میرے اپنے بچوں کے
لئے تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا جیسے میں کچھ کھو چکا
ہوں اور شاید سب۔۔۔ یہی محسوس کر رہے ہوں۔
اس دوران میں راحیل کبھی کبھار آتا تھا۔ اسے معلوم
تھا کہ ہم اس کے راستوں پر اس کے انتظار میں
کھڑے ہوں گے تاہم ناز آفرین کے لئے ہمارے
دل کے دروازوں پر کوئی دستک نہیں تھی۔

میں اس رات نیند میں مست سو رہا تھا کہ
کسی نے دروازہ پیٹ کر رکھ دیا۔

"کون ہے؟" میں جھنجھلا گیا۔

"مم۔۔۔ میں۔ راحیل ہوں۔۔۔ ابو جان!"
میں نے دروازہ کھول دیا۔ بدحواسی اور
گھبراہٹ والے جھٹکے سے راحیل دھڑام سے نیچے گر پڑا
اور کپڑوں میں لپٹی ہوئی کوئی چیز میرے قدموں میں آ گری۔
"یہ کیا ہے؟" میں جھکا تو تولئے کے بنڈل سے
ایک ہلکی سی چیخ ابھری۔

"اوہ میرے خدا"۔ راحیل چلایا۔ "میرا بچہ۔۔"
"اوہ"۔ میں لہرا کر نیچے بیٹھ گیا۔ میری بیوی نے
جلدی سے بنڈل جھپٹ لیا۔

"اوہ بے وقوف، کیا بچوں کو اتنی رات گئے
اس طرح لے کر آتے ہیں"۔ میں راحیل پر ٹوٹ پڑا
اور بے تحاشا اسے پیٹنے لگا۔

"مر جاتا میرا بچہ۔۔" رافعہ بچے کو سینے سے
لگا کر چلائی "راحیل! تو واقعی بے وقوف ہے"۔

"واہ یہ اچھی رہی۔۔۔ پہلے مجھے گھر سے نکالا
دھتکار دیا۔۔۔ اور اب ایک بچے کے لئے مجھے مار
رہے ہیں۔۔۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے"۔ راحیل

دروازے میں ہی اکڑوں بیٹھ گیا۔

"او بے وقوف، تجھے اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ بچے کو راتوں رات لئے مارا مارا پھرے۔" میں آگ بگولا ہو گیا۔

"آپ کے قدموں میں ڈالنے کے لئے ہی تو لایا تھا۔" وہ باقاعدہ رونے لگا۔

"او نامعقول، پھر سے کہنا" میں آگے بڑھا۔

"چھوڑ دو اسے شکیل، اب یہ ایک بچے کا باپ ہے۔" رافعہ بیچ میں آ گئی۔

"کیا...؟ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی.... میں دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹا اور دوڑ کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

"دادا...؟ ارے کیا مجھ سا جوان بھی کبھی دادا ہوا ہے۔" میں نے اپنے سراپا کا قدِ آدم آئینے میں جائزہ لیا... اور پھر میں نے پرفیوم اسپرے کی بھاری بوتل اٹھا کر آئینے پر دے ماری۔ بوتل کے ٹوٹنے سے سارا ماحول مہک اٹھا۔

"ارے یہ کیا ہو رہا ہے ابو جان!" راحیل چلّایا۔

"وہی ہو رہا ہے جو ہونا چاہیئے۔" میں نے دوسری بوتل شیشے پر دے ماری۔

"ارے یہ کیا قیامت ہے!" رافعہ چیخی۔

"شکیل!" ممی بھی کہیں سے نکل آئی۔

"ممی! میں دادا بن گیا ہوں۔" میں نے ماں کو بھینچ لیا۔

دادا...؟ ماں نے حیرت سے دہرایا۔

"کیا مطلب!"

"یہ دیکھیے، یہ رہا۔ رافعہ کی آواز مارے خوشی کے کانپ رہی تھی۔

"میرا بچہ ہے۔" راحیل پکارا۔

"جھوٹا کہیں کا" میں نے تیسری بوتل بھی بچے ہوئے آئینے پر دے ماری اور پورا آئینہ چیخ اٹھا۔" اب میں دادا بن گیا ہوں۔ اسی لئے تو تجھے توڑ رہا ہوں اے آئینے۔ تاکہ میں محسوس نہ کر سکوں کہ میں دادا بن گیا ہوں"

"ارے خدایا" ممی کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ یہ تو شکیل ہے!۔ میرا اپنا شکیل۔" ممی نے بچے کا منہ چوم لیا۔

"یہ تو راحیل ہے۔" میں نے منہ چڑایا۔ میرا اپنا راحیل۔"

"اور میں..... راحیل چھلانگ لگا کر میرے پاس پہنچ گیا۔

"چل، تو میرا نہیں۔" میں نے اسے دھکیل دیا۔ "بے وفا کہیں کا، غدار، باغی، نامعقول، احمق!

"تو میرے ہے راحیل" رافعہ راحیل سے لپٹ گئی۔

"سچ ممی!" راحیل رو پڑا۔ اور میں حیران سا اس نئے راحیل کو دیکھتا رہ گیا۔

اس رات ہم سب جاگتے رہے اور یہ بھول گئے کہ بچے کی ماں اسپتال میں جانے کس حال میں ہو گی۔

"اسے یہیں رہنے دو.... اور جا کر نازآفرین کو اسپتال سے لے آؤ۔" ممی نے حکم دیا۔

"نہیں! اسے یہاں مت لانا۔ میں اس سے ناراض ہوں۔" میں نے کہا۔

"اور ننھے سے...؟ راحیل نے جھٹ سے پوچھا۔

"یہ میرا ہے، میں اسے تم سے چھین لوں گا کیونکہ اس کی ماں نے میرے بیٹے کو مجھ سے چھین لیا۔

"تو چھین لیں ابو جان" راحیل نے کہا۔ "میں بہت جلد....."

"نہیں، اسے لے جاؤ راحیل۔ ہم اب اس سے اسپتال میں ملاقات کریں گے" ممی نے کہا

"نہیں! اسے کوئی نہیں لے جا سکتا۔" میں اڑ گیا۔

"تو پھر اس کی ماں کو یہاں لے آؤں؟ راحیل مسکرا رہا تھا۔

"اس کو یہاں کوئی نہیں لا سکتا، سمجھے! میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

آخر کار ممی نے فیصلہ کر دیا کہ ابھی بچے کو اسپتال بھیج دیا جائے پھر ماں باپ کے ساتھ بچے کو گھر لایا جائے۔"

اگلے روز میرے ڈریسنگ روم میں نئی ڈریسنگ ٹیبل آ گئی۔ میں نے پھر نئی ڈریسنگ ٹیبل میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔

"میں دادا بن جانے کے باوجود اس قابل ہوں کہ کم از کم دو نسلوں کو جوان ہوتا دیکھ سکوں۔" میں نے خود سے کہا۔ اس دن میں وقت سے پہلے گھر آ گیا تھا۔ میرے ساتھ نیا قیمتی آٹومیٹک کیمرہ تھا۔

میں جو ساری زندگی گذارنے کے بعد فوٹوگرافی سیکھنے چلا تھا اب کس قدر عجیب لگتا ہوں گا کہ صرف اپنے ایسے پوتے کی تصویریں اتارنے کے لئے یہ سب گورکھ دھندہ کر رہا تھا جسے ایک ناپسندیدہ عورت نے جنم دیا تھا اور جس کے طفیل ایک دیوانے سے آدمی نے اس ناپسندیدہ عورت کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

یہ کیسی خوشی تھی....

دیوانی دیوانی سی خوشی.....

جو مجھ جیسے مضبوط آدمی کو ہوا کے آوارہ جھونکے کی طرح اڑا اُسے لئے جا رہی تھی۔

یہ بچہ.... یہ بچہ.... اوہ خدایا یہ کونسی کمزوری ہے جو جنم لے کر اس قدر طاقتور ہو چکی ہے۔ بہر حال میں اس کو کھونا نہیں چاہتا.... میں جانتا ہوں کہ گم شدہ چیزوں کی بازیابی ایک امرِ محال ہے، اور اگر میری یہ کمزوری کھو گئی تو شاید میری زندگی کا لمحہ لمحہ گم ہو جائے۔

وہ نئی کونپل جو میرے دل کے اندر سے پھوٹی تھی، میرے لئے اس قدر اہم تھی کہ میں اُسے اپنے جذبوں کی حیات آفریں گرمی سے سینچ کر جوان کرنا چاہتا تھا۔

میں چیخ چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ میں جنم لیتا رہوں گا اپنی نسل کی ہر زمین سے، اور زندہ ہوں گا ہر نسل کی زرخیزی میں.....

کیوں کہ میں ایک باپ ہوں..... اور باپ ہر نسل میں ہمیشہ ہمیشہ جنم لیتا رہے گا..... اپنے پُرجوش جذبوں کے ساتھ میں نے فیصلہ کر لیا۔

آج صبح ہی صبح میں نے سارے شہر کو حیران مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا لہٰذا کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

وا پسی پر میں نے ایک خوبصورت، قیمتی
ہی اور گھر آ گیا۔ میں نے لان میں ننھے کو
ڈال کر، قدم قدم، سہج سہج کر چاہتا
کہ میرا بچپن پرام میں سوتے سوتے گھبرا
ب نہ اُٹھے۔

اوہ.... میں کیسے عجیب موڑ پر آ کھڑا ہوا
۔ کیا دادا بن جانا اس قدر عجیب دعزیب
ہے جو اپنے مقدس دوشالے میں ننھی ننھی
لوں کے لئے بے حساب مشغلے اور بے حساب
یات سلئے آتا ہے۔ انسان کو بچپن کس قدر
عزیز ہوتا ہے کہ وہ قدم قدم پر اپنے آپ کو معصوم بچہ تصور کرتا ہے۔

میں دیوانہ وار لان میں ٹہلتا رہا۔ دھوپ میں کھڑا پسینے سے شرابور ہوتا رہا۔ کیونکہ مجھے اُس کا انتظار تھا.... ہاں اُس کا انتظار تھا جس کے لئے میں نے ایک قیمتی پرام خریدی تھی.... اور اُس کا بھی انتظار تھا جو اُس کی ماں تھی.... اب وہ بھی مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔

سانولی سلونی سی نازآفرین.... میری بہو.... جو میرے پوتے کی ماں ہے.... اوہ لیجئے شاید وہ لوگ آ گئے کیونکہ گاڑی کا ہارن بار بار بج رہا تھا.... میرا اپنا بچپن اب میرے سامنے ہے ایک تازہ دم نئی کونپل کی طرح۔

اب میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ آپ سے گفتگو کر سکوں، مزید کچھ کہہ سکوں۔ کیونکہ میرے لئے اب بہت ساری مصروفیات موجود ہیں۔ آخر میں ایک ذمّہ دار دادا ہوں۔

اچھا دوستو!

خدا حافظ....

سانپ

روی بھاردواج



پُورب، پچھم، اُتر، دکھن، ہر جانب سے آئے سانپ
یوں میری بانہوں سے لپٹے جیسے ہوں ماں جائے سانپ
پُروائی جب لے انگڑائی جھومے ناچے گائے سانپ
آسمان میں شور سُنے تو دھرتی میں چھپ جائے سانپ

مرے بدن کے روم روم سے اِک زہریلی مہک اُٹھی
تری یاد کے سائے بن کر مَن میں جب لہرائے سانپ
مَیں صندل کا پیڑ ہوں یا اِک رات کی رانی کا پودا
ساری دُنیا چھوڑ کے آخر میرے گھر کیوں آئے سانپ
سُکھ دُکھ کی پوشاک پہن کر رہتے ہیں انسان کے ساتھ
سانپوں کا ہمسایہ انساں، انساں کے ہمسائے سانپ
اِن کی صُورت اور سیرت کو کیسے کوئی پہچانے
گلی گلی میں گھوم رہے ہیں چہرے نئے لگائے سانپ
کہیں مزائل کی صُورت میں کہیں ایٹومک بھیس بھرے
آج خلاؤں میں اُڑتے ہیں اپنے پر پھیلائے سانپ
کاش کبھی اپنے جیون میں ایسا دِن آئے محبُوب!
مری چاہ بن جائے تیرا، تری چاہ بن جائے سانپ
روی ہمیشہ خوابوں کے سنسار میں کھوئے رہتے ہو
اُن خوابوں سے بچ کر چلنا جِن خوابوں کے سائے سانپ



ہلا پتھر

روبیہ شکیل

سَرد کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی زلیخا ...ب بھی شادی کرے وہی وقت مناسب ...ہوتا ہے" سیٹھ فضل دین نے جاپانی [illegible]

[illegible]

[illegible] شہاب [illegible] سے تیس برس [illegible]

[illegible]

...ب کچھ ہو جائے گا سب کچھ [illegible] ...ہی سب سے بڑی شے ہے زندگی میں ...ہمارے پاس اتنی ہے کہ فکر کی ضرورت ...پھر اپنا شہاب تو ویسے بھی پیسے کما رہا ہے۔ اسی ہزار روپیہ مہینہ تنخواہ کم ...۔ عیش کر رہی ہے کہ نہیں"۔ سیٹھ فضل ...س کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے کہا۔ ...ہائے جی! کہیں ایسا نہ ہو بہو ہمارے بیٹے ...کچھو ہو جائے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں"۔ ...نے خدشہ کا اظہار کیا۔

...لوٹے جائے' آخر اس کی نوکری باہر کی ہے' ہمارے گھٹنے سے تو لگا نہیں رہے گا نا۔ ظاہر ہے بیوی اس کی ہوئی' اس کے ساتھ جائے گی' وہ پیسے بھیجے گا ہم عیش کریں گے۔ میں نے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ اس معاملے میں آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے زلیخا بیگم جی"۔ فضل دین نے ایک آنکھ ٹکٹے سے بند کرتے ہوئے ہنس کر کہا تو زلیخا بھی شوہر کا اشارہ پا کر ساتھ دینے لگی۔

پیچھے نے اپنی عملی زندگی کا آغاز چھابڑی لگا کر کیا تھا۔ ابھی کوئی دس بارہ برس کی عمر سے۔ اسکول کے سامنے آلو چھولے بیچا کرتا تھا ابھی بمشکل انیس بیس برس کا ہوا تھا کہ ماں نے اس کی شادی کر دی۔ اس نے واویلا تو بہت مچایا تھا" اماں اس کمائی سے ہم دو جی کا پیٹ نہیں بھرتا' تیسری کو کہاں سے کھلائے گی تو وہ تو شکر کر ابا مر گیا ورنہ پوری کیسے پڑتی؟"

"اچھا تو شکر کروں تیرا ابا مر گیا' ارے بدنصیب تیرا ابا نہ مرتا تو ابھی تک پڑھ لکھ کر کسی دفتر میں بابو نہ لگ گیا ہوتا۔ وہ مرا تو تجھے پانچویں جماعت سے ہٹانا پڑا۔" ماں کی آنکھوں سے آنسو آ گئے۔

"چل چل اب رونے نہ بیٹھ جا۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔ پیسہ ہو تو سب کچھ ہے۔ بابو بن کر میں نے کیا کمائی کر لینی تھی۔ یہی روٹی کے لالے پڑے رہتے۔ پیسے سے بنتی ہے زندگی' ورنہ تو کیڑے کی مانند انسان پیدا ہو کر مر جاتا ہے" وہ بولا۔

"پیسہ... پیسہ... تجھے تو بخار چڑھا ہے پیسے کا۔ نہیں ہوتا سب کچھ پیسہ' انسان زیادہ بڑا ہے اس سے"۔

"رہنے دے تو یہ بڑی بڑی باتیں۔ ہم غریب ہیں نا کوئی پاس نہیں بیٹھنے دیتا سب دھتکارتے ہیں۔ یہی سب کچھ ہے اور میں وہ سب کچھ حاصل کر کے رہوں گا جس سے زندگی بنتی ہے' عزت بنتی ہے"۔

"اچھا اچھا! کر لینا جمع پیسہ بھی' یہ سب تو نصیب کی بات ہے اور پھر سچی بات کہوں دولت میاں کے نہیں بیوی کے نصیب کی ہوتی ہے" ماں نے اپنی بات منوانے کا ڈھنگ نکالا۔

"سچ کہہ رہی ہے؟" اس کی آنکھیں چمکیں۔

"ہاں! بالکل سچ۔ کیا پتہ آنے والی اتنے نصیب والی ہو کہ تیرے سارے خواب ایک ایک کر کے پورے ہو جائیں" ماں نے دلاسہ دیا۔

"اچھا تو پھر کر ڈال یہ کام بھی۔" اور یوں اس کی شادی ہو گئی۔ اب پجے نے دوپہر تک جھاڑو لگانے کے بعد ایک ہوٹل میں بھی کام شروع کر دیا تھا۔ اس سے دو فائدے ہوئے تھے۔ ایک تو آمدنی بڑھ گئی تھی، دوسرا کھانے کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ پجا رات ہوٹل سے واپسی پر بچا کھچا اتنا کھانا لے آتا تھا کہ اگلے روز تک کے لئے کافی ہوتا۔

ادھر زلیخا بھی اچھا کھانے پینے کی شوقین تھی اور کچھ ہنر بھی جانتی تھی۔ اس نے بھی پجے کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ صفائی ستھرائی سے فارغ ہو کر محلے والوں کے کپڑے سینے بیٹھ جاتی۔ ساس کو اس نے کروشیہ بننا سکھا دیا تھا اور ادھر سے بھی کمائی ہونے لگی۔ تینوں فرد کام کرنے لگے تو گھر میں خوش حالی سی آ گئی۔ مگر پجا بلا کا کنجوس تھا بڑی مشکل سے گرہ ڈھیلی کرتا۔ اپنی کمائی کا ایک ایک پیسہ وہ بنک میں جمع کرواتا۔ کپڑا لتہ، دوا دارو کا خرچہ زلیخا اور ماں کے ذمہ تھا۔ وہ بھی جب کپڑے پھٹ جاتے یا بیماری سے جان جانے کا خدشہ ہوتا تب۔ ایسے حالات میں ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ خدا کا شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ پجے کو کوفت بھی خاصی ہوئی۔ ایک تو زلیخا پورا عرصہ خاصی بیمار رہی۔ اچھا خاصہ خرچ ہو گیا۔ اس پر ایک مستقل کھانے والے کا اضافہ ہو گیا تھا۔

"ہر آنے والا اپنا نصیب ساتھ لے کر آتا ہے" ماں اس کی بات سُن کر اس سے زیادہ ایک دم سے کچھ نہ کہہ سکی۔ "دیکھو نا زلیخا آئی تو اپنے ساتھ اپنا نصیب لائی۔ تیرے ہاتھ میں پہلے سے زیادہ رقم آنے لگی۔ اب یہ آیا ہے تو دینے والا اس کا بندوبست بھی کرے گا۔ تجھے اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"اچھا۔ اب کے بھی تیری بات مان لیتا ہوں، مگر ایک بات سُن لے" پجا ایک دم بولا "یہ ایک ہی بچہ رہے گا۔ اسی سے دل بہلا، کہیں فرمائشی پروگرام شروع کر کے بیٹھی ہو۔ دادی بنا دیا تجھے بس!" اور ماں اس کی بے تکی بات پر ہکا بکا رہ گئی۔ وہ بھی اپنی بات کا دھنی نکلا۔ ماں اور زلیخا کو بیٹی کی بڑی خواہش تھی مگر پجا کی بس ایک ہی 'نہ' تھی، سو وہ ناچار چپ رہ گئیں۔

چھابا چھ سال کا تھا جب ماں چل بسی۔ ایک دن تو ماں کے مرنے پر پجا خوب رویا، پھر ایک بات ذہن میں آ گئی کہ جو پیسہ ماں پر خرچ ہوتا تھا وہ تو بچے گا نا! اس سوچ نے اس کے آنسو خشک کر دیئے۔

زلیخا نے چھابے کو اسکول داخل کروا دیا تھا۔ ابتدا میں تو اس بات کی مخالفت کی تھی پجے نے مگر پھر یہ سوچ کر چپ کر گیا کہ جتنا خرچ کروں گا اتنا ہی وصول بھی کروں گا۔

اور جب چھابے نے پانچویں جماعت میں وظیفہ کا امتحان اوّل پوزیشن میں پاس کیا تو پجا پھولے نہ سمایا۔

"زلیخا دیکھ! سالا اپنا خرچہ ابھی سے خود نکالنے لگا ہے۔ جا او میرے شیر بیٹے۔ پڑھ جتنا مرضی پڑھ۔ بس اسی طرح وظیفہ کے ساتھ۔" اس نے چھابے کو گلے سے لگا لیا۔

چھابا بلا کا ذہین اور لائق لڑکا تھا۔ ہر امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کرتا اور وظیفے کا مستحق ٹھہرتا۔ اس کی ذہانت اور تعلیم کا شوق دیکھتے ہوئے حکومت کے علاوہ کچھ نجی اداروں کی طرف سے بھی اسے وظیفہ ملتا۔ جس سے ہر ماہ ایک اچھی خاصی رقم جمع ہو جاتی۔ بیٹے کے کہنے سننے پر پجے نے جھاڑو لگانا تو چھوڑ دیا تھا مگر ہوٹل کا کام اب فل ٹائم کرتا تھا۔ زلیخا بھی اپنی سلائی کڑھائی میں مصروف رہتی۔ اب انھوں نے نسبتاً بہتر علاقہ میں دو کمروں کا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔

"اتنا کرایہ؟" پجے کو تین سو روپے سُن کر غش آنے کو تھا

"ابا دیکھ میں تیری طرح ہوں، تجھ سے الگ نہیں، مگر اچھا بننے کے لئے اچھا دکھنا بھی پڑتا ہے نا۔ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔ ایک عالیشان کوٹھی تجھے بنوا کر دوں گا۔ یہاں سے تو کوٹھی ہی میں جائے گا۔ میرا انجینیئرنگ کا یہ کورس ختم ہو جائے گا نا تو باہر چلا جاؤں گا۔ ڈھیر سارے پیسے بھیجوں گا تب تو آرام سے بیٹھ کر خوب آرام کرنا، عیش کی زندگی گزارنا۔ محلہ گندہ تھا نا، یہ آبادی اچھی ہے۔ یہاں رہنے سے عزت بنتی ہے۔ کسی کو بتاتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی۔"

چھابا بھی آخر اسی کا بیٹا تھا، پیسے پیسے پر جان دیتا تھا مگر باپ کی نسبت کچھ سمجھدار بھی تھا۔ تھوڑا سا بھرم رکھنا اُسے آتا تھا۔ دُنیاداری بھی کوئی چیز ہے یہ وہ جانتا تھا۔

دن، مہینے، سال گزرتے گئے۔ چھابا انجینیئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے حکومت کے خرچے پر باہر چلا گیا۔ باپ کی طرح پیسے کا جنون تو پڑھائی کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری کر کے خاصی رقم کما لیتا۔ کچھ ماں باپ کو بھیج دیتا، باقی جمع کر لیتا۔ کورس مکمل ہوا۔ اس نے سول انجینیئرنگ میں اعزازی ڈگری حاصل کی مگر وطن واپس آنے سے انکار کر دیا اور وہ رقم جو اس نے اتنے برس محنت سے جمع کی تھی، حکومت کو ادا کی اور سعودی عرب چلا گیا جہاں اُسے ایک بہت بڑی امریکن فرم نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بھاری تنخواہ اور بے شمار سہولیات والی اس نوکری کو پا کر تو وہ گویا پاگل سا ہو گیا، وہ چھابا نہیں، شہاب دین تھا۔ مسٹر شہاب دین جس نے پجے اور زلیخا کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ پجا، جو اب سیٹھ فضل دین تھا ایک بڑی سی عالیشان کوٹھی اور خوبصورت گاڑی کا مالک، کئی نوکر چاکر اب اس کے حکم کو بجا لانے کو اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ زلیخا ہاتھ بھر بھر سونے کی چوڑیاں پہنے ہیرے کی لونگ سے سجی ناک کو چڑھا چڑھا کر بڑے نخرے سے باتیں کرنے لگی تھی۔ جس دن شہاب دین کا ڈرافٹ آتا، دونوں جی بھر کے شاپنگ کرتے۔ بے شمار الٹی سیدھی ڈھیروں چیزیں۔ یوں وہ اپنی ان دنوں کی بھوک مٹاتے مگر نہ نظر بھرتی، نہ نیت۔

اب جو پانچ برس کی ملازمت کے بعد شہاب دین واپس لوٹا تو اس کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔

جب سے انھوں نے شہر کی مہنگی ترین آبادی میں گھر بنایا تھا، زلیخا سینکڑوں گھر دیکھ چکی تھی۔ فضل دین کو کوئی گھرانہ پسند نہیں آ رہا تھا۔ اس

ہیں وہ ایک گھر دیکھ کر آئے تھے۔ لڑکی بھی خوبصورت تھی، مال و دولت بھی اچھا خاصا تھا، مگر فضل دین وہاں سے بھی کچھ خوش نہیں لوٹا تھا، جب کہ زلیخا اس کو مناسب سمجھ رہی تھی۔ یوں بھی اس بار شہاب دین کے آنے پر اس کی شادی کر دینا چاہتی تھی۔

"مزا نہیں آیا زلیخا بیگم جی۔" وہ صوفے پر لیٹتا ہوا بولا۔

"میرا تو خیال ہے یہ گھرانا خاصا مناسب ہے۔" زلیخا نے کہا۔

"واہ — واہ — میری بھولی شہزادی۔ کیا مناسب بات نظر آئی تمہیں اس میں۔ باپ، بھائی سرکاری ملازم، بڑے آفیسر ہیں تو کیا ہوا۔ یہ ٹھاٹ باٹ ان کی نوکریوں تک ہی ہے۔ صرف دو گاڑیاں ان کی ذاتی ہیں باقی سب سرکاری کھڑی ہیں پورچ میں — اور یہ کوٹھی۔ بس۔ اور نہ کوئی زمین نہ جائیداد — اس پر چار بیٹیاں۔ نہ بھئی! مجھے تو یہ سودا منظور نہیں۔ میرا خرچہ نہیں پورا ہونے کا یہاں سے۔" سیٹھ فضل دین نے کچھ اس طرح میں کہا کہ زلیخا چپ کی چپ رہ گئی۔ پھر دوسرے تیسرے روز دونوں میاں بیوی کہیں نہ کہیں جاتے اور اسی طرح منہ لٹکا کر واپس آجاتے۔ اسی دوران میں شہاب کا خط بھی آگیا کہ وہ تین ماہ کی چھٹی لے رہا ہے۔ اب ماں کو کوئی نہ کوئی لڑکی ڈھونڈ ہی لینی چاہیئے۔ چنانچہ خط پاتے ہی زور و شور سے ایک عدد لڑکی کی تلاش شروع ہو گئی۔

"زلیخا بیگم جی آج تمہارا مسئلہ حل ہو ہی گیا" سیٹھ فضل دین نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"سچی! — کیسے؟" وہ ایک دم کھل اٹھی۔

"میری مرضی کے لوگ مل گئے مجھے، خاندانی نسب اور بیٹی بھی اکلوتی۔ آج اپنے مینجر نے ملاقات کروادی ہے۔" فضل دین نے ساری عمر ہوٹل میں برتن دھوتے، بیرا گیری کرتے گزاری تھی مگر اب شہر کے بڑے اور مہنگے ترین ہوٹل کا مالک تھا۔ "کل ان کے گھر جانا ہے، لڑکی بھی دیکھ لیں گے اور بات بھی شروع کر آئیں گے۔" اگلے روز میاں بیوی بڑے کرّوفر سے تیار ہو کر نواب وجاہت علی خاں کے گھر گئے۔ اپنے خاندانی ہونے کے بے شمار ڈھونگ اور لچّے دار باتوں سے انھوں نے نواب وجاہت علی خاں جیسے خاندانی آدمی کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور شہاب دین کے آنے سے پہلے اُنھوں نے ساری راہیں ہموار کر لیں۔ زلیخا اکثر نادیہ کو اپنے ساتھ لے آتی۔ سو طرح سے اس کے لاڈ اٹھاتی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پڑھی لکھی، ناز و نعم میں پلی۔ اسے بھی ہونے والی سسرال کا ماحول اور ساس سسر بیحد پسند آئے تھے۔ شادی شہاب کے آنے پر طے تھی۔ نواب وجاہت علی خاں نے اپنے طور پر شہاب دین کے بارے میں باہر سے سب کچھ معلوم کروا لیا۔ انہیں تسلی تھی کہ ان کی نازوں پلی بیٹی خوب عیش و آرام میں رہے گی۔

شہاب دین پاکستان آچکا تھا۔ دونوں گھروں میں دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں باتوں باتوں میں جہیز میں دی جانے والی چیزوں کا ذکر بھی آجاتا تھا۔ فضل دین کی آنکھوں کی چمک اس وقت دوچند ہو جاتی جب وہ کسی بڑی اور قیمتی چیز کا ذکر نواب صاحب کی زبان سے سنتا۔ زلیخا اور شہاب دین کے سمجھاتے پر انہوں نے اشیا کی لسٹ نواب صاحب کو بھجوائی تھی، حالانکہ اس کا شدّت سے جی چاہ رہا تھا کہ وہ اُن کے گوش گزار کر دے کہ وہ کیا کیا چاہتا ہے۔

"ڈیڈی جی!" ابّا اب ڈیڈی بن گیا تھا۔ جیسے چچا بہ شہاب دین۔ "بڑے لوگ ہیں اس لئے ہمیں چھوٹی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ اور پھر نادیہ اُن کی ایک ہی بیٹی ہے، جو کچھ بھی ہے اسی کا تو ہے کمی بیشی ہوگی تو بعد میں کہہ دیں گے۔"

"ارے بیٹا جی وہ تو ان کے مرنے کے بعد ملے گا نا اس بیٹی کو۔ یہ نہ ہو کہ وہ بھی اس خیال میں کر دے تو سارا کچھ اسی کا، خالی ہاتھ بیاہ دیں، ہم تو مارے گئے نا بیٹے جی۔" فضل دین کا خدشہ زبان پر آگیا۔

"پھر بھی ذرا سا انتظار کرنے میں حرج ہی کیا ہے ڈیڈی جی۔" شہاب نے پھر کہا۔ "صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور انشاء اللہ یہ پھل تو شہد سے بھی میٹھا ہوگا۔"

شہاب دین کی بارات بڑی دھوم سے نواب وجاہت علی خاں کے گھر اُتری۔ دونوں طرف سے شہر کی مقتدر شخصیات شادی میں شامل تھیں۔ جو حق مہر نواب صاحب نے لکھوایا وہ شہاب دین نے بلا چون و چرا لکھ دیا۔ بھلا اتنی بڑی آسامی کے سامنے پانچ لاکھ کی کیا حیثیت تھی! ہاں فضل کے دل پر ہاتھ ضرور پڑا تھا۔ بہت بڑی رقم تھی۔ خدانخواستہ نبھاؤ نہ ہوا تو پڑ گیا تھا جرمانہ مگر بولنے کی جگہ یوں بھی نہ تھی کہ شہاب دین سائن کر چکا تھا، اور پھر کچھ بھرم بھی تو رکھنا تھا۔

"ڈیڈی جی" جیسے ہی دونوں باپ بیٹا ذرا تنہا ہوئے تو وہ بولا "اپنا موڈ ٹھیک رکھیں کئی پانچ لاکھ اس لڑکی کے ساتھ آئیں گے، دیکھیں تو سہی ہوتا کیا ہے آگے آگے۔" وہ باپ کا ہاتھ دبائے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولا اور سیٹھ فضل دین کچھ بہل گیا۔ کھانے اور مختلف رسوم کی ادائیگی کے بعد رخصتی کے مراحل سے گزرتے ہوئے وہ گھر تک آگئے چلتے چلتے سامان کی لسٹ نواب صاحب نے سیٹھ فضل دین کے ہاتھ میں پکڑا دی کہ سامان اچھی طرح چیک کرلیں کوئی چیز رہ نہ گئی ہو۔ سیٹھ فضل دین اپنی بیقراری دبا نہ سکا اور کار میں بیٹھتے ہی اس کی بے چین نظریں کاغذ پر دوڑنے لگیں۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ سجے سجائے کمرے میں نادیہ تنہا بیٹھی شہاب کا انتظار کر رہی تھی "آخر وہ اب تک آیا کیوں نہیں!" کیا اُسے کوئی بیقراری نہیں مجھ سے ملنے کی۔ اب اسے اپنے دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا" نادیہ نے انگڑائی لیتے ہوئے سوچا۔ پھر اُٹھ کر پچھلے چمن کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ باہر رات کا فسوں جاگ رہا تھا۔ چاند بھی پورا تھا۔ درختوں پر اُترتی ہوئی چاندنی کی کرنیں ماحول کو اور بھی دلکش بنا رہی تھیں۔ وہ دیر تک باغ کے منظر میں کھوئی رہی اچانک دروازے پر آہٹ نے اُسے چونکا دیا۔ اس وقت شہاب کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ کمرے

سے ٹیک لگا کر دروازے کی سمت منہ کرکے کھڑی ہوگئی۔ آنے والا شہاب ہی تھا۔ مگر وہ حیران سی رہ گئی کہ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ نہ کوئی خوشی نہ کوئی تمنا کا رنگ، نہ وہ پہلے سی بے قراری۔

"شہاب" وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے کے وسط میں کھڑے شہاب کے قریب آگئی۔ "کیا تم کچھ ناراض ہو؟ کیا کوتاہی، کیا غلطی ہوگئی مجھ سے؟"

"غلطی، کوتاہی۔ جہ خوب" وہ طنزیہ ہنسا۔ "یہ پلنگ، صوفے، کرسیاں، رنگین ٹی وی تمہیں ہمارے ہاں پہلے دکھائی نہیں دے رہے تھے کہ یہ واہیات اور معمولی سی چیزیں لے آئی ہو۔"

"میں مانتی ہوں شہاب تمہارے پیار اور محبت کے سامنے یہ چیزیں بالکل معمولی اور بے حقیقت ہیں مگر چیزیں تو دنیاداری کے لئے ضروری ہیں ماں باپ بیٹیاں خالی ہاتھ گھر سے نہیں نکالتے" وہ نرمی سے بولی۔ اس کی نظروں میں شہاب عرش پر اُڑ رہا تھا۔ اس کی عزت اور عظمت دوچند ہوگئی تھی۔ کتنا عظیم ہے اس کا شوہر، نہ لالچ، نہ طلب، وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"شہاب یہ رات یوں بے حقیقت سی بات پر ناراض ہوکر غارت کرنے کی تو نہیں" اس نے ادا سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے تمہارے ماں باپ خالی ہاتھ بھیج دیتے وہ مجھے کسی نہ کسی طرح گوارا ہو جاتا مگر کم از کم یہ کمینگی تو نہ کرتے۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔ بے عزتی کروادی پگڑا کر میری سارے دوستوں میں عزیزوں میں۔ ڈیڈی اور امی کی کرکری الگ ہوئی، کیا کیا سوچا تھا، نام کی نواب زادی، چار ٹھیکرے اُٹھا کر چلی آئی بھوکے نواب"۔ نادیہ اب چونکی۔

"کیا چاہیئے تھا آپ کو؟ کیا اُمیدیں لگا لی تھیں آپ نے۔ کیا نہیں ملا آپ کو۔ لوگوں سے کیا کہہ دیا تھا جو پورا نہیں ہوا"۔ شہاب جواب سے پہلے بلندیوں پر اُڑ رہا تھا، مُنہ کے بل پستیوں میں آرہا۔

"ارے ڈیڈی نے سب دوستوں کو کہہ رکھا تھا کہ نواب صاحب اپنی بیٹی کو فرنشڈ کوٹھی دے رہے ہیں۔ میں نے دوستوں کو کہہ دیا تھا سلامی میں ہونڈا اکارڈ تو کہیں نہیں گئی اگر ملا کیا"

"ہونہہ، اونچی دوکان پھیکا پکوان۔ حق مہر لکھاتے ہوئے تو تمہارا باپ آگے آگے ہو رہا تھا پانچ لاکھ لکھوا لئے اور جہیز دو لاکھ میں نمٹا دیا، تمہارا خالی خولی وجود میرے کس کام کا۔ باہر بہت لڑکیاں دیکھی ہیں میں نے۔ تم کیا ہو اُن کے سامنے"۔

شہاب دیر تک بکتا جھکتا رہا، اور آخر دل کی ساری بھڑاس نکال کر اور اپنی ذات کی پوری کمینگی دکھانے کے بعد وہ نادیہ کے وجود کو بری طرح جھنجھوڑ کر پلنگ پر دھکا دیتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ڈیڈی جی آپ فکر نہ کریں، اب وہ سب کچھ آئے گا جو ہم نے سوچا تھا۔ شادی کی پہلی رات بیٹی گھر بیٹھ جائے، کوئی برداشت نہیں کرسکتا۔ اور پھر وہ تو خاندانی لوگ ہیں۔ نواب ہماری ہر شرط پوری کرے گا اور آپ پوری دلچسپی اور بھرپور خوشی کے ساتھ ولیمے کی دعوت کا لطف اٹھائیں گے کیونکہ اُس وقت ہماری تمنا پوری ہوچکی ہوگی" شہاب اپنی جواں مردی کا کارنامہ بڑے زور شور سے باپ کو سنا رہا تھا۔

"جی اوئے، میں تو ایسے ہی ڈر رہا تھا کہیں تو بات بھی کرپائے گا یا نہیں۔ کمبخت بے بھی کافی خوبصورت خوبصورت عورت کے سامنے بولنا ذرا مشکل ہوتا ہے نا" فضل دین بیٹے کی پیٹھ ٹھونک کر بولا۔

"نہیں ڈیڈی جی یہ کیا چیز ہے۔ اس سے حسین اور خوبصورت عورت میں ہر روز وہاں دیکھتا ہوں" شہاب نے کہا۔ اور پھر وہ تینوں دیر تک اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے سو گئے۔

صبح ہوئی تو نواب صاحب کے گھر سے نہایت پُرتکلف ناشتہ آگیا۔ نادیہ کی خالہ اور اس کی دو بے تکلف سہیلیاں بھی ساتھ تھیں۔ نادیہ اُن سے نہایت خوشدلی سے ملی۔ ہنستے مُسکراتے، شرماتے ناشتہ ہوا۔ اور پھر اُس کی خالہ یہ کہہ کر نادیہ کو ساتھ لے گئی کہ شام کو بیوٹی پارلر سے تیار کروا کر اسے ہوٹل پہنچا دیا جائے گا۔

"میری باتیں یاد ہیں نا!۔ دروازہ بند کرتے کرتے شہاب نے ہولے سے کہا۔

"جی"۔ نادیہ نے نہایت سعادتمندی سے جواب دیا۔ اور گیٹ سے آہستہ خرامی سے نکلی گاڑی کو وہ دیر تک خوشدلی سے ہاتھ ہلاتا رہا۔

ساڑھے سات بج رہے تھے۔ شہر کے بزنس مین، بڑے صنعت کار، چند ایک اسمبلی اور ایک آدھ صوبائی وزیر بھی آنے والے مہمانوں میں شامل تھے۔ ولیمے کی دعوت کا اہتمام فضل دین نے ہوٹل میں کیا تھا۔ تقریباً سارے مہمان اور میزبان موجود مگر دلہن غائب! تھی نا اچنبھے کی بات۔ اب تو چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔ آخر دلہن کیوں، کہاں گئی؟ ایسا کیا ہوا ایک رات کی بیاہی ساتھ کہ وہ عین ولیمے کے روز سٹیج سے غائب

غزل

زہرہ نگاہ

کوشش جو آئے تھے پشیمان گئے
اے تغافل تجھے پہچان گئے

خوب ہے صاحبِ محفل کی ادا
کوئی بولا تو بُرا مان گئے

کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ اُمنگ
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے

اُس کو سمجھے کہ نہ سمجھے کوئی
گردشِ دہر تجھے جان گئے

تیری ایک ایک ادا پہچانی
اپنی ایک ایک خطا مان گئے

محمد عثمان عارف

اک چیز ہو گئی تھی کبھی اُن کے تن سے
اب تک حیات منزل وارورسن میں ہے
ہے زندگی میں موت کے انسان ہمکنار!
اک ہاتھ آستین میں ہے ایک کفن میں ہے
حسن حبیب، درد محبت، غم جہاں
عارف جو دل میں ہے وہی شعر و سخن میں ہے

تو فضل دین اور شہاب دین کی پریشانی کا تو کوئی عالم ہی نہ تھا۔ وہ مہمانوں کو جواب دیتے دیتے تھک چکے تھے۔ کھانا الگ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ساتھ آئے ہوئے بچے بھوک اور نیند سے بے حال ہو رہے تھے۔ گھبراتے ہوئے شہاب نے نواب صاحب کے ہاں فون کر دیا وہاں سے بہت تسلی آمیز جواب ملا کہ نادیہ کو پارلر سے لوٹتے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ بس وہ لوگ پہنچنے ہی والے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد نواب وجاہت علی خاں آتے دکھائی دیئے۔

"خیریت! آپ اکیلے ہی آ گئے۔ نادیہ کہاں ہے؟"۔ شہاب اور فضل دین یک زبان ہو کر بولے۔

نواب صاحب نے چاروں طرف دیکھا۔ شہر بھر کے شرفا، اور بڑے لوگ جمع تھے اور یہی وقت اور موقعہ مناسب ترین تھا۔

"جناب فضل دین صاحب! یہ رہی فرنشڈ کوٹھی کی چابی اور یہ شہاب دین تمہارے لئے ہونڈا کار کی چابی۔ باہر جا کر دیکھ لینا۔ سیاہ رنگ کی شوروم سے نکلی ہوئی گاڑی ہے۔ اور اب اس کاغذ پر سائن کر دو۔"

فضل دین اور شہاب دین بے تابی سے چابیاں مٹھی میں دبائے ہوئے کاغذ پر جھک گئے۔

"خلع کے کاغذ"۔ شہاب کے منہ سے بیساختہ نکلا۔ "مگر نواب صاحب یہ کیسے ممکن ہے! سارے مہمان قریب آ گئے۔

"کاش آپ لوگوں میں کچھ صبر ہوتا۔ گھر کا سامان تو میں نے بیٹی کو اس لئے ساتھ دیا تھا کہ دنیا یہ نہ کہے کہ خالی ہاتھ بیٹی رخصت کر دی۔ یہ فرنشڈ کوٹھی اور کار میں نے پہلے سے تیار کر رکھی تھی۔ کہ جب نادیہ اور شہاب چند روز میرے پاس رہ کر لوٹیں گے تو انھیں دوں گا۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ میری بچی کا نصیب کہاں جا کر پھوٹنا ہے۔ یوں تو جو بھی بیٹی والے یہاں موجود ہوں گے وہ میرے دکھ میں برابر کے شریک ہوں گے۔ ایسے محسوس کریں گے کہ جیسے بیٹی دیکھا اُن کے پاس اور رہ گیا۔ مگر میں اِس وقت مجبور ہو کر ساری عمر کی ذِلت خریدنا نہیں چاہتا۔ اِس لئے اِن کی منہ مانگی قیمت پر اپنی بیٹی کا چھٹکارا چاہتا ہوں اُمید ہے آپ سب حضرات میرا ساتھ دیں گے۔"

ذرا دیر میں وہ تینوں ذِلتوں، ملامتوں اور لعنتوں کے درمیان کھڑے لالچ اور ہوس کی گہری دلدل میں دھنستے چلے جا رہے تھے۔ اور اُنھیں سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ بیٹی والا اُن کے منہ پر زور سے طمانچہ مار کر گیا تھا۔

●

سرور تونسوی

شاہ صاحب جودھپوری رح

سلسلہ کیلئے دیکھئے "شانِ ہند" ماہ دسمبر ۱۹۸۰ء

سیر و سیاحت

آپ کا مسلک "اَلاِستِقَامَۃُ فَوقَ الکَرَامَۃ" ... مطابق تھا۔ آپ اپنے مکان جو پہلے کرایہ ... معروف حضرت خواجہ شاہ سلیمان ... کے عرس مبارک کے دنوں میں ہی ... تشریف لاتے تھے۔ یا پھر سلطان الہند ... غریب نوازؒ کے عرس مبارک میں تشریف ... لے جاتے۔ ویسے دو تین بار حرمین شریفین ... زیارت اور حج کر چکے ہیں۔ حجاز، عراق، شام، ... ایران اور دیگر ممالک اسلامی میں بھی جا چکے ... اندرون ہند بنگال، مدراس، حیدر آباد، دکن، ... اور اودھ کا بھی کئی بار دورہ کر چکے ہیں ... پونا، احمد آباد، احمد نگر، دہلی اور پاکستان میں ... حیدر آباد سندھ، کراچی، لاہور اور پشاور وغیرہ ... اب بھی ان کے معتقدین موجود ہیں۔ ساٹھ سال ... حیدر آباد دکن میں علوم نجوم و رمل اور جفر و طلسمات ... ذوق اور تجربۂ کمال کی وجہ سے چار ماہ تک ... جمال صاحب وکیل جودھپوری ساکن حیدر آباد ... کے یہاں قیام رہا۔ اسی زمانے میں یمین السلطنت ... مہاراجہ سر کشن پرشاد شادؔ وزیر اعظم حیدر آباد سے ... ملاقات ہوئی جن کے ہاں ہر ماہ چاند کی ۶ تاریخ ... غریب نوازؒ کی فاتحہ ہوا کرتی تھی۔ مہاراجہ

بہادر نے علمِ رَمل کے بارے میں آپ کا اعتراف فرمایا۔ کیوں کہ مہاراجہ بہادر خود بھی اس علم میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ اسی زمانے میں سر سالار جنگ بہادر سے بھی ملاقات ہوئی اور موصوف نے بہت سے دیرینہ طلسمات دکھا کر آپ سے معلومات حاصل کیں۔

۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء میں احمد آباد سے لوٹتے وقت ایک دن مقام پراور (متصل کرانچی) لال محمد خان صاحب کام دار کے ہاں قیام فرما کر پھلیرہ جنکشن سے ہوتے ہوئے آپ دہلی تشریف لے جا رہے تھے، راستہ میں خیال آیا کہ جے پور میں اپنے سلسلہ کے بزرگ حضرت مولانا ضیاء الدین آسودہ ہیں، کیوں نہ ٹھہر کر فاتحہ پڑھتے چلیں چنانچہ جے پور اتر گئے اور مزار مبارک پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی۔ حضرت مولانا ضیاء الدینؒ کی روحِ پُرفتوح نے آپ سے جے پور میں قیام کا ارشاد فرمایا۔ مزارِ مبارک سے باہر آئے ہی تھے کہ بہت سے اصحاب نے بہ اصرار جے پور میں قیام فرمانے کی درخواست کی۔ چنانچہ آپ نے ہوا محل بازار میں باندا پول دروازہ (مہاراجہ کے محلات کا صدر دروازہ) کے شمال جانب متصل بالائی مکان میں قیام فرمایا اس مکان کے زیریں حصہ میں پہلے تعزیہ بنا کرتا تھا اور اب اس میں سرکاری شفاخانہ ہے یہاں

ایک سال آپ کا قیام رہا اور جے پور میں پہلا عرسِ سلیمانی اسی مکان میں منعقد ہوا، جس میں جے پور کے علماء و علم دوست حضرات، صوفیۂ مشائخ، وابستگانِ سلاسلِ مختلفہ نے شرکت کی۔ پھر غالباً ۱۹۲۱ء میں دوبارہ جے پور تشریف لائے اور مولانا ضیاء الدینؒ کی درگاہ میں، جو آبادی شہر سے باہر ہے، ایک علیحدہ حجرے میں قیام فرمایا اور گیارہ سال تک بطورِ معتکف یہاں رہے۔

اس طویل قیام کے بعد آپ اندرونِ شہر تشریف لائے اور محلہ پیلی کاٹیاں میں متصل مسجد نگہ میاں ایک کرایہ کے مکان میں دو سال قیام فرمایا۔ پھر یہیں سلیمانی عرس منعقد ہوتے رہے۔ اس کے بعد آپ محلہ سابلیان چوکڑی گھاٹ دروازہ میں ایک کرایہ کے مکان میں اُٹھ آئے جہاں آخری سانس تک قیام رہا۔ یہ مکان شاہ صاحب نے بعد میں خرید لیا اب اسے کافی وسیع کر دیا گیا ہے اور اب یہیں ہر سال خواجہ شاہ سلیمان تونسویؒ کا عرس شریف منعقد ہوتا ہے۔ آپ کی زندگی میں یہ عرس متواتر پندرہ دن تک چلتا تھا۔ اس عرس کو انھوں نے ڈیڑھ یک جہتی میلے کا روپ دے دیا تھا۔ عرس کے آغاز سے آپ باہر والے کمرے میں تشریف لے آتے تھے

یا نذرانہ پیش کیے دفنانے اور عرس کے اختتام کے پندرہ دنوں بعد تک ایک ہی مخصوص جگہ پر بیٹھے رہتے تھے۔ بس یہی ایک مہینہ ایسا ہوتا تھا کہ جس کا جب دل چاہتا کسی بھی وقت شاہ صاحب کے دیدار کر لیتا ورنہ اور دنوں میں صبح سات بجے دروازہ کھلتا تھا اور نو بجے بند ہو جاتا تھا۔

استغناء

کم و بیش پچیس سال کا زمانہ تو میری نظر میں بھی ہے۔ اس دوران اور اس سے پہلے بھی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ آپ نے کسی سے کوئی نقد روپیہ یا جنس یا کوئی شے کسی بھی نوعیت سے بطور نذرانہ قبول کی ہو۔ دعوے کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک بھی شخص ایسا ثبوت پیش نہیں کر سکتا کہ انھوں نے کسی سے کچھ لیا ہو جب کہ ہر سال عرس پر ہزار ہا روپیہ اٹھتا ہے۔ صرف لنگر میں ہی پچاس سے زائد دیگیں دالے یا چاول کی لگتی تھیں اور عرس میں پندرہ روز تک ہر آنے والا لنگر سے ہی کھانا کھاتا تھا۔ قوالوں کی بیس بیس پارٹیاں عرس میں شریک ہوتی تھیں انھیں کچھ نہ کچھ ضرور دیا جاتا تھا۔ غرض سینکڑوں اقسام کے اخراجات تھے مگر کیا مجال کہ کسی سے ایک پیسہ بھی نذرانہ قبول کیا ہو، صرف قوالوں کو جو روپیہ سامعین دیتے تھے وہ بزم سماع میں ہی دے دیا جاتا تھا۔

میرے ذاتی علم میں متعدد واقعات ہیں کہ امراء و رؤسا نے نذرانے پیش کرنے کے لئے حاضری کی اجازت چاہی اور آپ نے انکار کر دیا آپ کو صرف سیم و زر ہی سے استغناء نہیں تھا، بلکہ ان کمالات کی جانب بھی مطلق اعتناء نہیں تھا جن کے حصول کی خاطر لوگ عمریں گزار دیتے ہیں۔ ایک بار آپ مارواڑ اسٹیشن سے گزر رہے تھے۔ وہاں کا اسٹیشن ماسٹر فقیر دوست اور درویش منش تھا۔ وہ آپ کا شہرہ سن چکا تھا۔ اس نے منت سماجت کر کے آپ کو ایک دن کے لئے اپنے یہاں ٹھہرا لیا۔ وہیں ایک اور عامل بھی مقیم تھے۔ اتفاق امر کہ رات کو ایک شخص کو سانپ نے ڈس لیا اور اس کو بحالت بیہوشی اسٹیشن ماسٹر کے گھر پر لایا گیا جنھوں نے تین کوڑیاں (خر مہرہ) طلب کیں جو پیش کی گئیں انھوں نے ایک کوڑی پر کچھ دم کر کے اسے ایک طرف پھینک دیا اور اسی طرح دوسری کوڑی بھی پھینک دی۔ پھر مارگزیدہ کی چارپائی سامنے رکھوالی اور ایک جانب سے راستہ چھڑوا دیا۔ تماشائیوں کا ایک کثیر ہجوم تھا۔ تیسری کوڑی اور پھینکی تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک بہت کالا سانپ راستے راستے چلا آرہا ہے اور ایک کوڑی اس کے پھن پر چپکی ہوئی ہے، وہ سیدھا مارگزیدہ کی چارپائی کے پاس پہنچا اور جس جگہ کاٹا تھا وہاں منہ لگا کر زہر چوس کر نیم مردہ حالت میں لوٹ گیا۔ سانپ کا لوٹنا تھا کہ مارگزیدہ اٹھ گیا۔ لوگ اپنے گھروں کو خوش خوش تعجب کرتے ہوئے لوٹے۔ عامل صاحب نے شاہ صاحب سے عرض کیا "یہ عمل میں آپ کے سپرد کرتا ہوں، قبول فرما لیجئے" تو آپ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا "یہ چیز میرے کام کی نہیں میں کہاں سے کوڑیاں مانگتا پھروں گا اور سانپ کا زہر اتارا کروں گا۔ یہاں تو اللہ کا نام لے کر مارگزیدہ کے زخم کو چھو دینا ہی کافی ہے۔"

دستِ غیب

حضرت محبوب صمدانی خواجہ حافظ شاہ محمد سلیمان تونسوی کا عرس ہر سال اس شان و شوکت سے ہوتا تھا کہ لوگ اس کے اخراجات و انتظامات دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ دستِ غیب ہے، کوئی کہتا ہے کہ شاہ صاحب کیمیا جانتے تھے۔ اصلیت کچھ بھی ہو مگر:

نظر خلق سے پوشیدہ جو رہتا ہے مدام
اس کے بندوں پہ ہوا کرتے ہیں یوں ہی انعام

بس اگر اسی کا نام دستِ غیب ہے تو ماننے لینے میں کیا تامل ہے۔ آپ کی زندگی میں عرس اس قدر دھوم دھام سے ہوتا رہا کہ جیسے پورے تاریخ میں اس کا ایک خاص مقام رہا۔ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد بھی یہ عرس ہوتا ہے مگر وہ شان و شوکت نہیں رہی۔ تاہم آپ کے جانشین جناب بشیر الدین سلیمانی ہر ممکن طریقے سے عرس کی روایات کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

انکسار و تواضع

شاہ صاحب انکسار اور تواضع میں صالحین کے اخلاق کا نمونہ تھے۔ گفتگو میں انکسار اور عاجزی ان کا شیوہ تھا۔ اگر گفتگو کے دوران کسی کی زبان سے کوئی تعریفی جملہ نکل جاتا تو آپ فرماتے اور ارشاد ہوتا کہ "میں تو ایک ناچیز ذرۂ بے مقدار ہوں، میری نسبت یہ حسن ظن کیوں" آپ کے ہاں سے کوئی رنجیدہ ہو کر کبھی نہیں گیا۔ تفریق مذہب و ملت کی بابت آپ کا نظریہ بڑا صاف تھا اور یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب و ملت کے ماننے والے آپ کے گرد جمع رہتے تھے اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے تھے۔ آپ نے ہمیشہ نظریہ یہی رکھا کہ تمام بنی نوع انسان مساویانہ ہمدردی اور اچھے سلوک کے مستحق ہیں بلکہ آپ نے ہمیشہ اپنوں سے زیادہ غیروں کو اپنایا اور اس کو دین و ایمان کی تبلیغ کی روح سمجھا۔ وہ فرماتے تھے کہ اسلام نے غیروں ہی کو اپنا بنا کر اپنی صداقت کا سکہ جمایا ہے اور اخوت و مساوات کا ایسا سبق دیا ہے کہ جس کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔

رشد و ہدایت

آپ کو حضرت خواجہ محمد حنیف سے ... جھنجھنوں (شیخاوائی) بن حضرت خواجہ ... شاہ ولایت جو دھپور سے شرف بیعت حاصل ... مفصل شجرہ آپ کی تصنیف "کشف العلا..." میں درج ہے (یہ کتاب اب نایاب ہے) ...

ہر چہار سلسلہ قادری و چشتی نقشبندی سہروردی حضرت موصوف کے علاوہ حضرت شاہ محمد اسحاق محدث نقشبندی سے ...

...اللہ بخش صاحب خلیفہ مجاز
...شاہ سلیمان ...تونسوی سے بھی
...تھی۔ اس طرح آپ کو حضرت خواجہ شاہ
...سے بھی بہت قریبی سلسلہ کا شرف
... آپ اپنے پند و نصائح سے طالبان
...کو بیشتر مستفیض فرماتے تھے۔ جب
...بھی موجود ہوتے تھے تو رنگ تقریر کچھ
...تھا۔ اس وقت سلوک و تصوف کے
...نکات اور اہم مسائل اس قدر دل نشین اور
...اور سادہ انداز بیان میں ارشاد ہوتا تھا کہ
...پر ایک عالم انشراح و انبساط طاری
...تھا۔

بیعت کرنے سے آپ نے ہمیشہ احتراز
فرماتے تھے" فی زمانہ پیری مریدی ذریعہ
...دنیا بن کر رہ گئی ہے۔ الا ماشاء اللہ، اگر
کوئی طالب حق ہے تو بسم اللہ! میں بتہ
...دیتا ہوں۔ نعمت وہیں سے ملے گی جہاں
...ہو چکی ہے۔ مجھ سے کسی کی کوئی خدمت ہو
سکتی ہے تو بلا مرید کئے بھی کی جا سکتی ہے۔"

عطائے طلسمات

...پور اور دیگر مقامات پر کثیر تعداد ایسے
...کی موجود ہے جو محض خدمت گزاری کے
...خواہش تھے، مگر ان کی واقعی ضرورت
...خدمت خلق کے تحت ان کو طلسمات
...فرمائے گئے۔ یہ سلسلہ میں نے خود بائیس
سال تک دیکھا۔ یہ طلسمات اکثر بشکل انگشتری
بصورت لوح ہوتے تھے۔ ان کی تیاری میں
...وقت کے ساتھ اور بھی متعدد قیود ہوتی
...جو بظاہر بہت دشوار اور دقت طلب معلوم
...تھیں، مگر جب مستعدی، توجہ اور سلیقہ سے
...کیا جائے اور وہ مقصد براری اللہ کو بھی منظور
...پوری شرائط و پابندی کے ساتھ انگشتری یا
...تیار بھی ہو جاتی تھی۔ ان عطیات کا اثر بھی
...ہوتا تھا۔ بصورت دیگر اہل حاجت کی
...فروگذاشت ہو جاتی تھی کہ اپنی بدنصیبی کا

ہوا کہ آپ نے چند مرتبہ حکم دیا کہ فلاں وقت
آجانا تمہیں ایسی چیز بتا دوں گا کہ ساری زندگی
آرام و آسائش سے گزارو گے۔ مگر میری بدقسمتی
کہ میں دہلی سے وقت مقررہ پر حاضر نہ ہوتا تھا
دو مرتبہ تو انھوں نے ٹیلی فون پر حکم دیا کہ فلاں
وقت تمہیں میرے پاس بیٹھا ہوا ہونا چاہیئے۔
اور قدرت کی یہ ستم ظریفی کہ کبھی گاڑی لیٹ
تو کبھی میں علالت کے باعث سفر کرنے کے ناقابل
اس کے باوجود میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ اُنکی
نظر کرم تا زندگی میرے ساتھ رہے گی اور ہے
اس قدر بے لوث و بے غرض خدمت خلق
کے باوجود بعض حضرات اُن سے ناراض تھے
اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے تھے۔ یہ ایسے
صاحبان تھے جن کے ناجائز مطالبات نہ مانے گئے
کسی کا برا کرنے کے لئے آپ کی طرف سے کبھی کوئی
طریقہ نہ بتایا گیا۔ یا جن حضرات نے ناممکن الوقوع
امر کی تمنا کی یا جن کی منشاء مشیت کے خلاف
آرزو کی تو آپ یہی فرماتے کہ "قادر مطلق اللہ ہی
ہے۔ میں احکام و منشاء قدرت میں دخل دینے کی
ذرہ برابر بھی مجال نہیں رکھتا۔ میرا کام دعا کرنا ہے
یا اپنے علوم کی بنا پر معلومات کر کے ممکن الحصول مقصد
کے لئے مناسب تدبیر کرنا۔

تصنیفات و تالیفات

(۱) "کشف العطاء" اس کتاب میں آپ
نے جملہ خانوادہ ہائے اہل سلوک کے سلسلوں کا
نہایت جامع ذکر کیا ہے، نیز مسائل تصوف سمجھانے
کی بھی سعی مشکور فرمائی ہے۔ جملہ مسائل کے جوابات
آیات و احادیث کی روشنی میں نہایت مدلل طریقہ
سے دیئے ہیں اور مسلمانوں کو متحد و متفق رہنے
کی تلقین فرمائی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں طبع ہوئی
اور اسے آپ نے مفت تقسیم کرایا۔ ۱۹۵۲ء
میں اس کتاب کی ایک جلد مجھے بھی عنایت فرمائی
تھی۔

(۲) "مجربات معینی" اس میں مجرب نسخہ جات
مجرب تعویذ، علم طلسمات، علم نادرہ، بندش و دفعات و
احتیاط و شرائط اعمال کا بہترین ذخیرہ جمع کیا گیا ہے
یہ تالیف آپ کے انتقال فرمانے تک غیر مطبوعہ
رہی۔ اس کا مسودہ غالباً آپ کے وارث اعلیٰ
جناب بشیر الدین سلیمانی کے پاس ضرور ہوگا۔

(۳) "معینی النجوم بالجفر" یہ علم نجوم و جفر کے متعلق
ایک بے مثل رسالہ ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

اب تک آپ نے حضرت قبلہ شاہ صاحب
کے حالات کے علاوہ اُن کے وہ واقعات پڑھے
جو میں نے کتابوں میں پڑھے یا معتبر حضرات سے
سُنے، یا اُنھوں نے خود بھی مجھ سے بیان فرمائے،
اب میں اُن واقعات پر مختصراً روشنی ڈالوں گا
جن کا خود میری ذات سے واسطہ رہا یا جو میں نے
اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

تقریباً بائیس سال تک قبلہ شاہ صاحب
کی قدم بوسی کا ہزاروں بار مجھے موقع ملا اور میں کئی بار
اُن کے ہاں ہفتوں مہمان رہا۔ چونکہ میں تونسہ شریف
کا رہنے والا تھا اس لئے مجھ سے وہ اتنی محبت
فرماتے تھے کہ اسے دوسرے حضرات میری خوش
نصیبی سمجھتے تھے۔ مجھ سے تنہائی میں جو راز کی باتیں
ہوئیں شاید اُن کے نزدیکی، یہاں تک کہ ان کے وارث
اعلیٰ کو بھی معلوم نہ ہوں۔ ان کے انتقال کے بعد اکثر
مفسدہ پرداز حضرات نے نیز خود مسلم اوقاف والوں
نے عدالتی کارروائی کی حد تک کوشش کی

باقی آئندہ

بابِ انتقاد

احساس کی صلیب — یوگندر بہل تشنہ

ڈمائی سائز ضخامت ۱۲۸ صفحات مجلد -/۵۰ روپے

ناشر:۔ غالب میموریل ویلفیئر سوسائٹی دہلی

جناب یوگندر بہل تشنہ ملک کے قابلِ ذکر اردو شاعروں میں گنے جاتے ہیں۔ مگر خوش قسمتی سے ہندو ہیں۔ چونکہ آجکل اردو کے ٹھیکیدار کسی غیر مسلم اردو دوست، اردو پرست یا اردو ادیب و شاعر کو کسی گنتی میں ہی نہیں سمجھتے، اس لئے دنیائے اردو میں انھیں جو مقام ملنا چاہیے تھا اُس سے وہ محروم رہے۔

حال ہی میں تشنہ صاحب کا شعری مجموعہ "احساس کی صلیب" پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ کلام تو خیر تشنہ صاحب کا ایسا ہے کہ دشمنوں سے بھی داد لے لیتا ہے، مگر کتاب بہ لحاظ کتابت، چھپائی، کاغذ اور گٹ اپ بھی اپنا جواب آپ ہے۔ کاش اس کی جلد بندی بھی معیاری ہوتی تو گٹ اپ میں مزید بہتری اور دلکشی آ سکتی تھی۔

اردو شاعری کے ایسے دلدادہ شائقین جو واقعی اچھے غزلیہ کلام، نظموں اور ترقی پسندانہ شاعری کے جویا ہوں اُن کے لئے "احساس کی صلیب" ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ یہ مجموعہ دفتر "شانِ ہند" سے مل سکتا ہے۔

بہارِ سخن — حافظ باقوی

عام کتابی سائز ضخامت ۱۲۸ صفحات قیمت -/۱۵ روپے

ناشر:۔ مصنف خود

نیر قریشی گنگوہی جس قدر اچھے، سچے اور وطن پرست سیاسی نیتا ہیں، اُتنے ہی اچھے شاعر بھی ہیں۔ ایک ماہ ہوا اُن کا مجموعۂ کلام "نمودِ سحر" منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہو کر دنیائے شاعری کو منور کئے ہوئے ہے۔

ایک ایسا معروف ترین شخص جو کاروباری ذمہ داریوں میں بری طرح پھنسا ہوا ہے اور اس پر آج کل کی گندی سیاست کے چھینٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے سیاسی زندگی میں بھی مقبولیت کی حد تک کامیاب ہو، نہ معلوم اس قدر بہترین شاعری کے لئے کس طرح وقت نکال سکتا ہوگا۔

زیادہ تر غزلیات اور چند رباعیات و قطعات کا یہ مجموعۂ کلام یقیناً تعریف کا حقدار ہے اور اس قابل ہے کہ اہلِ ذوق اسے اپنی ذاتی لائبریری میں رکھیں۔ مجموعہ کی کتابت بہت اچھی، کاغذ نہ صرف بہترین بلکہ قابلِ تعریف۔ چھپائی روشن، گٹ اپ دیدہ زیب اور دلکش اور قیمت ۲۵ روپے جو یقیناً کم ہے۔ مصنف یا دفتر "شانِ ہند" سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

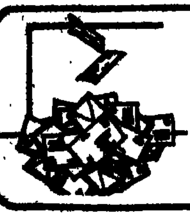
نمودِ سحر — نیر قریشی گنگوہی

ڈمائی سائز ضخامت ۱۷۶ صفحات مجلد -/۳۵ روپے

ناشر:۔ مصنف خود

حافظِ قرآن، مولوی، عالم (الباقیات الصالحات) ادیب فاضل، ایم۔اے، ایم۔فل (مدراس یونیورسٹی) ادیب کامل (جامعہ اردو علی گڑھ) راشٹر بھاشا پروین (ڈی۔بی ہندی پرچار سبھا) اور اردو کے پروفیسر جناب حافظ عبدالرزاق صاحب حافظ باقوی کا یہ مجموعۂ کلام بظاہر ایک معمولی سا مجموعۂ کلام معلوم ہوتا ہے، مگر جب اسے پڑھا تو ایسا معلوم ہوا کہ آندھرا کا یہ شاعر ملک کے اُنے گنے مشہور شاعروں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ اگر آپ معمولی داموں میں ایک اچھا مجموعۂ کلام پڑھنا چاہتے ہیں تو "بہارِ سخن" ضرور خریدیے۔ اس مجموعہ کی سادگی اور لیتھو چھپائی پر مت جائیے، بلکہ اس کی اہمیت اور انفرادیت کو نظر میں رکھتے ہوئے پڑھیے۔ آپ یقیناً تعریف کریں گے۔ دفتر "شانِ ہند" کے ذریعہ یہ مجموعہ طلب کیا جا سکتا ہے۔

سرور تونسوی



من کہ مکتوب الیہ

جناب سرور صاحب تسلیم و آداب!

پہلی مرتبہ "شانِ ہند" دسمبر ۱۹۸۷ء نظر کے سامنے آیا ہے۔ آپ کا اداریہ "بلبل چہ گفت گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟" بے حد پسند آیا۔ خدا کرے آپ کی یہ آواز وزیرِ اعظم تک پہنچے۔

ڈاکٹر اودے سرن ارمان کا افسانہ "حساس عورت" اس دور کی عکاسی کر رہا ہے۔ انور جلالپوری کی غزل کا ایک ایک شعر میرے دل میں گھر کر گیا۔ اسی شمارے کے ذریعہ نامور مزاح نگار جناب دلیپ سنگھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ "ابراہیم الخواص" کی تیسری قسط پڑھ کر ایک بزرگ کی سوانحِ مبارک سے روشناس ہوا۔ غرض کہ آپ کا "شانِ ہند" دینی، دنیوی، ادبی و فنی ہر لحاظ سے نیا اور تازہ ہے جس کے مطالعہ سے کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم کی روانی میں ترقی عطا فرمائے۔ آمین!

—— متین انصاری

"رعیت" اخبار کو بند کرنا پڑا اور اس کی جگہ ایک دوسرے ہی موضوع سے متعلق "ریاست" ہفتہ وار کو جاری کرنا پڑا۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ اسی دہلی سے تقسیمِ ملک کے بعد آپ نے اس صنفِ ادب کو "شانِ ہند" کے توسط سے پھر سے زندہ کیا ہے اور اُسے بامِ عروج پر پہنچایا ہے اس فن کے توسط سے آپ نے نئی نئی ہستیوں کو تاریخِ ادبِ اُردو میں روشناس کرایا ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی جو آپ کی تحریر میں ہے وہ ہے آپ کی "انا" کی اہمیت کی گمشدگی۔ اپنے کام سے ماورا ہو کر آپ نے دوسروں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے جو ایک مستحسن قدم ہے۔ کتاب کی اندرونی خوبیوں کے علاوہ اس کی ہیئت کذائی کا بھی آپ نے ایسا معیار قائم کیا ہے جو دوسروں کے لئے قابلِ تقلید ہو گیا ہے۔ کتاب کیلئے میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے

نیازمند، دعاگو
ہیرا لعل چوپڑہ

قابلِ احترام وِدیا پرکاش سرور تونسوی صاحب
آداب!

امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے
ایک بزرگ دوست کی وساطت سے آپ کی کتاب "بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گذر" پڑھنے کو ملی۔ خلافِ توقع آپ کی تحریر نے متاثر کیا۔ خلافِ توقع اس لئے کہ پچھلے سال کے واقعات نے بڑا دل برداشتہ کر دیا تھا۔ چند ایک رہنماؤں کے بیانات نے بھی بہت تکلیف پہنچائی ہے ایک آپ ہیں کہ انسان دوستی کا ثبوت آپ کی تحریر سے جھلکتا ہے۔ اگرچہ مزاحیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس کتاب نے میری ڈھارس باندھی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اس کو بار بار پڑھوں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

سرور صاحب نیازمند کو پڑھنے کی زیادہ اور لکھنے کی بہت کم عادت ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ آپ کو شکریہ کرنے کے بغیر نہ رہا گیا۔ فقط

آپ کا خیراندیش
حمید اللہ شاہ
زکورہ، سری نگر

برادرم عزیز ودیا پرکاش جی!

"بہ کوئے یار" کا مستقل کتابی صورت میں شائع ہونا اُردو ادب میں ایک معتدبہ اضافہ ہے جس پر ہم سب اُردو پرست بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کوئی ستر سال کا عرصہ ہوا کہ ۱۹۲۰ء میں دہلی سے میرے ہم وطنی سردار دیوان سنگھ مفتون نے جب ہفتہ وار اخبار "رعیت" شروع کیا تھا جسے خواجہ حسن نظامی کی سرپرستی کا فخر حاصل تھا۔ تو اس میں خواجہ حسن نظامی نے اسی طرح کی خاکہ نگاری کا آغاز کیا تھا جسے عام طور پر پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا گیا تھا لیکن بعض باہمی تفرقات کی وجہ سے سردار دیوان سنگھ کو

جناب سرور صاحب نمستے!

آپ نے اپنی کتاب "بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گذر" کے متعلق مجھ ناچیز کی رائے پوچھی ہے۔ تو لیجئے میرے اس ایک جملے ہی سے میرے تاثرات جان جائیں گے۔ "اگر میں یہ کتاب پڑھنے سے محروم رہتا تو ان پڑھ رہتا۔" یعنی آپ نے یہ کتاب بھیج کر مجھ پر احسان فرمایا ہے حسنِ باطن تو ہے ہی قابلِ ستائش لیکن کتاب کا حسنِ ظاہر بھی اتنا دلکش ہے کہ

"کیا ذوق ہے کیا شوق ہے سو مرتبہ دیکھوں
پھر بھی یہ کہوں جلوۂ جاناں نہیں دیکھا"

اب میں آپ سے کیا کہوں کہ میں نے کتاب کتنی دفعہ پڑھ لی ہے۔ کئی ایک چیپٹر تو خود مجھے بھی یاد نہیں کہ کتنی مرتبہ پڑھے ہوں گے۔ اچھا کھانا اگر اچھے برتنوں میں ڈال کر کھایا جائے تو سواد دو گنا لذیذ ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ معاملہ آپ کی کتاب کے اندر اور باہر کی دل کشی کا ہے۔ بات ذرا طویل ہوتی جا رہی ہے لیکن دلچسپی سے خالی نہیں، اور پھر آپ کو تو خاص طور پر لطف آئے گا۔

پچھلے دنوں ایک انگریز جوڑے نے مجھے کرسمس ڈنر پر مدعو کیا۔ بڑی دیر سے میری اُن سے رسم و راہ ہے اور آپس میں کافی حد تک بے تکلفی بھی ہے۔ پینے پلانے کا دور شروع ہوا جب محفل جوان ہو کر رنگ پر آئی تو یہ انگریز عورت مجھ سے کہنے لگی کہ مسٹر آرزو کوئی اپنی زندگی کا عجیب و غریب اور دلچسپ واقعہ سنائیں۔ چونکہ میں آپ کی کتاب کے چیپٹر "جے ماتا دی" میں لدھارام کے کیریکٹر سے اس قدر متاثر ہوا کہ پڑھتے پڑھتے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے رت جگا کا سارا واقعہ سنا ڈالا۔ جب بات چوری میں ناکامیاب ہونے پر لڑکوں کے پیٹنے پہ آئی تو انگریز عورت کے ہاتھ سے شراب کا جام لبریز گھبراہٹ سے گر پڑا اور کہنے لگی "Oh, my God, it is simply like in childhood"

میں کیا دیکھتا ہوں کہ ابھی خاصی رنگین اور پُر شور محفل سنجیدہ ہو کر رہ گئی۔ محفل کوئی پندرہ بیس اشخاص پر مبنی تھی۔ اتنے میں میرے انگریز دوست کہنے لگے کہ انھیں دو ایک منٹ کے لئے اجازت دیجئے وہ Toilet جانا چاہتے ہیں۔

دو منٹ کے بجائے دس منٹ ہو گئے وہ نہیں آئے۔ میں نے حیران ہو کر ان کی بیوی سے کہا کہ دس منٹ ہونے کو آئے ہیں، آپ کے Husband ابھی تک نہیں آسکے۔ بے ساختہ کہنے لگیں کہ وہ لدھارام بن کر آپ کے گھر چلا گیا ہے۔ بس پھر کیا تھا کہ ہنسی کا ایک طوفان تھا جو روکے سے نہیں رُکتا تھا۔ اسی اثنا میں اُن کے میاں بھی خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ پوچھنے لگے کہ اتنی زبردست ہنسی کس بات پہ تھی؟ جب اُنھیں ہنسی کا راز بتایا گیا تو پوری کی پوری محفل ایک بار پھر دیوار قہقہہ بن گئی۔ اب یہ عالم ہے کہ ان کی بیوی کبھی کبھار ان کو مذاق میں لدھارام ہی کے نام سے پکارتی ہے۔

فرمایئے تسرور صاحب! آپ کو لطف آیا کہ نہیں؟ حسنِ بیان اور شگفتگی کی وجہ سے آپ کی کتاب "ناقابلِ فراموش" پر سبقت لے گئی ہے۔ آپ کے قلم میں واقعی بہت جان ہے

آپ کا!

اندرجیت آرزو

اسکاٹ لینڈ

[redacted]

فنِ تاریخ گوئی

تاریخ گوئی کا فن اب خال خال شعرا تک ہی محدود ہے اس فن پر ابوالبلاغت تحسین یادودی کی جامع اور مکمل کاوش بالخصوص شعرا کے لئے یہ کتاب ایک نعمتِ عظمیٰ نہیں فنِ شعر کے قدر دانوں کے لئے ایک گراں قدر تحفہ

[redacted]

[redacted]

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 January 1988
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

شانِ ہند

دہلی

فروری سنہ ۱۹۸۱ء



یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

ماہنامہ شانِ ہند دہلی

فروری سنہ ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹

شمارہ ۲

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

پرنٹر پبلشر پرو پرائٹر
وِدیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت۔ خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقامِ اشاعت۔ دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"
جلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی ۲-۱۱

خطاط
سبطین حسین
محمد حمران

حسن کار
مصطفیٰ آرٹسٹ

قیمت فی شمارہ ——— چار روپے
قیمت سالانہ ——— چالیس روپے
لائف ممبر ——— پانچ سو روپے

[illegible]

غزل

از جناب سید حسن پاشا صاحب شاعر لکھنوی

محبت کو محبت کی طرح دل میں نہاں کرلوں،
مکمل پھر ترے جور و ستم کی داستاں کرلوں

ترے دردِ محبت کو سکونِ جسم و جاں کرلوں
میں جب چاہوں غمِ پیہم کو عیشِ جاوداں کرلوں

خوشی سے پھر ترے جلوے کو گھر میں میہماں کرلوں
میں پہلے دل میں پیدا وسعتِ کون و مکاں کرلوں

محبت کی قسم دل کو اگر محوِ فغاں کرلوں
ترے کوچے کے ہر ذرّے کو اپنا ہمزباں کرلوں

زمینِ کوچۂ قاتل کی رفعت صاف کہتی ہے
جو ذرّہ اُڑ کے آئے میں شریکِ آسماں کرلوں

یہاں تک جذب ہو جاؤں تمھارے عہد و پیماں میں
نہیں بھی تم کرو ایفائے وعدہ پر تو ہاں کرلوں

دمِ آخر جو ہو جائے ترے دیدار کا دھوکا
تو پھر دو ہچکیوں میں ختم دل کی داستاں کرلوں

میں وہ میکش ہوں جب بہکوں تو لب پر نام ہو تیرا
صدائے قلقلِ مینا کو تکبیرِ اذاں کرلوں

بس اتنی دیر اے برقِ طپاں دم لے مری خاطر
نکل کر آشیاں سے میں دعائے آشیاں کرلوں

حریمِ ناز کے پردوں میں پھر ہیں جنبشیں پیدا
ٹھہر اے جذبِ دل میں خود ہی اپنا امتحاں کرلوں

قدِ رعنا جو اُن کا مجھکو آجائے نظر شاعرؔ
قیامت کا مرقع دل کے دامن میں نہاں کرلوں

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | کالات خاص | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

ا ڈ ی ٹ و ر ی ل

ہندوستان میں اردو کا مستقبل

اردو کے ہندوستانی مسلمان دانشوروں کے ہاتھوں تاریک

غیر مسلم اردو پرستوں کے لئے لمحۂ فکریہ

اردو کے نام پر زہر آلود لقموں کو مسلمان دانشوروں نے نعمتِ عظمیٰ سمجھا

اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر اُردو کو زندہ دفنانے کی کوشش ایک عرصہ سے جاری ہے۔ حکومت نے بڑی چالاکی سے بغیر کچھ کہے مسلمانوں کو یہ ذہن نشین کرانے کے لئے کہ اُردو مسلمانوں ہی کی زبان ہے، ایسے حربے استعمال کئے کہ حکومت کی چال کامیاب ہو گئی اور مسلمان دانشوروں نے عملی طور پر اسے قبول کر لیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اُردو کے مسلمان دانشوروں کو حکومت نے لقمہ ہائے تر کچھ اس خوش سلیقگی سے پھینکے کہ ان زہر آلود لقموں کو مسلمان دانشوروں نے نعمتِ عظمیٰ سمجھ کر آپس میں بل بانٹنے کا کھلا ہندوں مظاہرہ کیا دوسرے لفظوں میں اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سیکولرازم کا دم بھرنے والی سرکار نے اُردو ایسی میٹھی زبان جو کہ سب کی مشترکہ زبان تھی اس کو

منسوب یہ اسلام کر کے مسلمانوں کو خوش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی تاکہ اسے مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے میں آسانی ہو۔

حالانکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ مسلمانوں کی زبان عربی ہے۔ اگر مسلمانوں کی زبان اُردو ہوتی تو (مشرقی پاکستان) بنگلہ دیش میں اسی اُردو کے تنازعہ پر گولی نہ چلتی اور یہی اُردو ہی اس امر کا موجب ہوئی کہ مشرقی پاکستان کے بنگالی مسلمانوں نے پاکستان سے کنارہ کشی کر لی اور بنگلہ دیش ایک نیا ملک وجود میں آیا کیونکہ پاکستانی حکومت اُردو کو اپنی قومی زبان بنانے پر مُصر تھی اور مشرقی پاکستان کے بنگالی مسلمان اپنی مادری زبان بنگلہ کو جاری و ساری رکھنا چاہتے تھے۔

پاکستان کی سرکاری زبان چونکہ اُردو ہی ہے، اس لئے بھی یہ سمجھ لیا گیا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور پاکستان ریڈیو نے ہندی اور ہندی بولنے والوں کی جس بھونڈے انداز میں تضحیک کا سلسلہ جاری رکھا، اُسے سُننے والے غیر مسلموں کے دلوں میں اُردو کے خلاف جذبہ پیدا ہونا قدرتی تھا۔ نیز ہندوستان میں اُردو کا مستقبل جن ہاتھوں میں سونپا گیا انھیں اپنے ذاتی مفاد کے سوا اردو سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اُردو کو بے شک زندہ و شاد باد رہنا چاہئے مگر اُن کے اعزازات اگرانٹیں، وظائف، اُردو اکادمیوں کی ممبرشپ اور لیڈری قائم رہنی چاہئے

مگر اُردو کے نام پر لوٹ کھسوٹ کرنے کے اس اُردو دشمن دَور میں بھی ایسے کچھ صائب الرائے اور ثقہ لوگ ابھی موجود ہیں جو ایمانداری سے یہی رائے رکھتے ہیں کہ اُردو ہمارے ملک کا مشترکہ سرمایہ ہے اور یہ سب کی مشترکہ زبان ہے۔ اُردو کی آبیاری میں مسلمانوں کی نسبت غیر مسلموں کا حصّہ زیادہ ہے۔ اس وقت بھی جبکہ اُردو کو محض مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا گیا ہے، ہندوستان میں اُردو بچانے والوں میں غیر مسلموں کی تعداد وافر ہے۔ اُردو کے غیر مسلم پرستاروں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اُردو کو اب ہندوستان میں اگر زندہ رکھ سکتے ہیں تو صرف غیر مسلم۔ اُردو کی حفاظت کے لئے اب ہندوؤں کو ہی میدان میں آنا چاہئے اگر ایسا نہ ہوا تو خود حکومت اور اُردو کے دُشمن اُردو کی تجہیز و تکفین مسلم اُردو دانشوروں کے ہاتھوں ہی سے کرا دے گی۔ اور یہ ایسے ہو سکتا ہے کہ:۔

۱۔ وہ اُردو اخبارات جو سیکولرازم کا دعویٰ کرتے ہیں اُن کے منتظمین سے کہا جائے کہ وہ اپنے اخبارات کی اشاعت بڑھانے کے لئے مسلم نواز کی بجائے ایسی پالیسی بنائیں کہ غیر مسلم بھی ایسے اخبارات کو اپنائیں۔ مثال کے طور پر روزنامہ "قومی آواز" اپنے آپ کو کانگریس کا آرگن کہتا ہے اس کا انتظام بھی غیر مسلموں کے سپرد ہے اور ادارتی عملہ میں ہندو مسلم دونوں حضرات ہیں۔ مگر اس اخبار کی اشاعت بڑھانے کے لئے اسے دیدہ و دانستہ ایسا روپ دے دیا گیا ہے کہ اسے پڑھنے والا بیساختہ کہہ اُٹھتا ہے کہ یہ تو مسلمانی اخبار ہے ہم چاہتے ہیں کہ پڑھنے والے یہ کہیں کہ یہ اُردو کا اخبار ہے۔

۲۔ ہر وہ ادارہ جو اُردو کی بقاؤ بہبود کے لئے قائم ہے اس میں زیادہ سے زیادہ اُردو دوست غیر مسلموں کو لیا جائے خصوصاً انجمن ترقی اُردو ہند، اُردو ترقی بورڈ اور اُردو اکادمیوں کے ڈھانچوں میں زبردست تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے انجمن ترقی اُردو ہند میں جناب جسٹس ملا صاحب، جناب مالک رام صاحب ایسے نام صدر کی حیثیت سے اس امر کی تشہیر کرتے تھے کہ انجمن ترقی اُردو واقعی سرسید کے قول پر کاربند ہے کہ اردو ہم سب کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ مگر یہاں سے تو جناب اندر کمار گجرال اور رام لعل صاحب ایسے لوگ بھی جا چکے یار لوگوں کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے اپنی تگڑم سے اندر کمار گجرال ایسے اُردو پرست اور اردو دوست کو انجمن سے باہر کر دیا اور ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ کہنا ہے کہ اندر کمار گجرال صاحب از خود انجمن کی خدمت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بے شک ووٹنگ کے ذریعہ سب کچھ ہوتا ہے مگر خلیق انجم صاحب ایسے گرگ باراں دیدہ کے لئے ووٹنگ شوٹنگ سب بیکار کی چیزیں ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ووٹ دینے والے حضرات نے اُردو دشمنی کرتے ہوئے رام لال صاحب ایسے لوگوں کو انجمن سے باہر کر دیا

ترقی اردو بورڈ کے بارے میں بھی غیر مسلم ادیبوں کو شکایت ہے کہ بورڈ جو کتابیں شائع کرتا ہے

حالانکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ مسلمانوں کی زبان عربی ہے اگر مسلمانوں کی زبان اُردو ہوتی تو (مشرقی پاکستان) بنگلہ دیش میں اسی اُردو کے تنازعہ پر گولی نہ چلتی اور یہی اُردو ہی اس امر کا موجب ہوئی کہ مشرقی پاکستان کے بنگالی مسلمانوں نے پاکستان سے کنارہ کشی کر لی اور بنگلہ دیش ایک نیا ملک وجود میں آیا کیونکہ پاکستانی حکومت اُردو کو اپنی قومی زبان بنانے پر مُصر تھی اور مشرقی پاکستان کے بنگالی مسلمان اپنی مادری زبان بنگلہ کو جاری و ساری رکھنا چاہتے تھے۔

س کے مصنفین یا مرتبین میں غیر مسلموں کا
قریب قریب ممنوع سا ہے۔ حالانکہ یہ سب
ی کسی نہ کسی بورڈ کے ذریعے ہوتا ہے اور اس
میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور ڈاکٹر
یند نارنگ جیسے حضرات موجود ہیں، پھر نہ
م غیر مسلموں سے امتیازی سلوک کیوں
کیا جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ترقی اردو بورڈ
ڈائریکٹر صاحب اس ضمن میں آئندہ خیال
یں گی۔ اور اگر حکومت کی طرف سے ہی کوئی
پابندی عائد ہو تو دوسری بات ہے جیسے
ن ترقی اردو ہند کو سرکاری طور پر یہ ہدایت ہے
اس نے کسی غیر مسلم کو درجۂ چہارم کا بھی ملازم
یا تو اس کی سرکاری گرانٹ بند کر دی جائے گی۔
اردو اکادمیاں تو کھلم کھلا مسلم نوازی
ت دیتی ہیں اور حیرت تو یہ ہے کہ انہیں جو
ٹ دی جاتی ہے وہ روپیہ غیر مسلم ٹیکس دہندگان
یادہ لیا جاتا ہے۔ مگر نہ معلوم کونسی ایسی وجہ
ردلی کے لیفٹننٹ گورنر اردو اکادمی کے
ن میں ہندوؤں کو صرف ایک نامزدگی ہی
ے ہیں۔

۳۔ ملک بھر میں ہر جگہ غیر مسلم اردو کے
ں، شاعروں اور دانشوروں کو چاہیئے کہ وہ
ے ہو کر اردو کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے وجود
ت دیں اور ایسی انجمنیں بنائیں جن کے ممبر
اردو دوست غیر مسلم ہی ہوں۔

۴۔ ریاستی اسمبلیوں اور مرکزی پارلیمنٹ
یسے غیر مسلم ممبران جن کو اردو سے دلچسپی ہو
تعاون حاصل کیا جائے اور وہ ریاستی
لیوں اور مرکزی پارلیمنٹ میں اردو کے حقوق
کرانے کے لئے آواز بلند کریں۔ کیونکہ مسلمان
بران اسمبلی اور پارلیمنٹ حکومت کے
ہ ہیں۔ ان میں اتنی سکت اور ہمت نہیں
اردو کی بقا و حیات کے لئے زبان کھول سکیں۔

۵۔ ہر اردو ادیب اور شاعر اپنے بچوں کو
ی تعلیم دلانے کی دلی کوشش کرے۔ اور
سکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہ ہو تو
مقامی ایڈمنسٹریشن پر دباؤ ڈالے کہ وہ ان کے
اور دوسرے اردو پڑھنے والے بچوں کے لئے
اردو کی تعلیم کا انتظام کرے۔

۶۔ غیر مسلم اردو ادیبوں، شاعروں، اور
دانشوروں کی اردو تصانیف زیادہ سے زیادہ
خریدی جائیں اور ایسے غیر مسلم اردو کے ادیب،
شعراء اور مصنفین کی تصانیف شائع کرائی جائیں
جو اتنی سکت نہیں رکھتے کہ خود اپنی تصانیف
شائع کرا سکیں

۷۔ ہندی داں طبقہ کو ذہن نشین کرایا
جائے کہ اردو ایک ملی جلی زبان ہے اور اس کی
تشکیل میں ہندوؤں کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ
مسلمانوں کا۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمانوں نے
جیسے سرسید کی پیروی کرتے ہوئے انگریزی کو
ایسے اپنایا کہ جیسے یہ ان کی مادری زبان ہو اور
اب ہندی کو مسلمانوں نے اس تیزی سے اپنایا
ہے کہ غیر مسلم بھی بعض شعبوں میں ان کا مقابلہ
نہیں کر سکتے۔ اسی طرح مسلمانوں نے اردو کو
اپنانے میں فراخ دلی سے کام لیا مگر اس کا مطلب
یہ نہیں ہے کہ اردو محض مسلمانوں کی زبان ہے۔

۸۔ مشاعروں کی وبا، اردو کے لئے زہر قاتل
ہے۔ ہم مشاعروں میں سامعین کا جم غفیر دیکھ
کر خوش ہو جاتے ہیں کہ اردو زندہ ہے اور زندہ
رہے گی۔ مگر اس کے دور رس نتائج یہی ہیں
کہ مشاعرے اردو کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اگر
شاعروں کو کلام سنانا ہی ہے تو وہ قدیم روایات
کے مطابق شعراء کے مجمع میں ہی کلام سنائیں یا
مخصوص شعری نشستوں میں۔ عوامی مشاعروں
سے گریز کیا جائے۔ پیشہ ور شعراء جن کی روزی
روٹی کا دارومدار ہی مشاعروں پر ہے انہیں معاف
کر دیا جائے۔ مشاعروں پر جو روپیہ ضائع کیا
جاتا ہے اور ہوائی واہ واہ حاصل کی جاتی ہے
اس سے کہیں بہتر ہے کہ اس روپیہ سے ایسے شعراء
اور ادیبوں کی تصانیف شائع کرائی جائیں جو اس
کی سکت نہیں رکھتے کہ خود اپنی تصانیف شائع کرا سکیں۔

۹۔ جن علاقوں میں اردو کو علاقائی زبان
قرار دیا جانا ضروری ہے، وہاں کے غیر مسلم عوام،
ممبران اسمبلی اور ممبران پارلیمنٹ، غیر مسلم ادیب
اور شعراء اس کے لئے آواز بلند کریں اور حکومت
سے پرزور مطالبہ کریں تاکہ وہاں اردو علاقائی زبان
قرار دی جا سکے۔

۱۰۔ ہر وہ وفد جو اردو کے حقوق منوانے
کے لئے حکومت کے کسی سربراہ، وزیر اعظم،
یا کسی وزیر متعلقہ سے ملے وہ غیر مسلم ممبران پر
ہی مشتمل ہونا چاہیئے۔ تاکہ حکومت یہ نہ کہہ سکے
کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے (مگر سوال یہ ہے
کہ کیا ڈاکٹر خلیق انجم یا دوسرے مسلم اکابر ایسا
ہونے دیں گے ؟)

۱۱۔ غیر مسلم اردو پرست اپنے احباب،
پڑوسیوں اور ملنے جلنے والوں پر اردو کی اصلیت
ظاہر کریں اور انہیں ذہن نشین کرائیں کہ اردو ہم
سب کی مشترکہ زبان ہے اور اسے بڑھانا قومی
یک جہتی کو بڑھاوا دینا ہے کیونکہ قومی یکجہتی کی امین
صرف اور صرف اردو زبان ہے۔

"شانِ ہند" کا یہ شمارہ ملک بھر کے
غیر مسلم اردو دانشوروں، مشہور ادیبوں اور
شاعروں کو جن کے پتے ہمارے یہاں ہیں تحفت نذر
کیا جا رہا ہے۔ جن حضرات کے پتے ہمارے یہاں
موجود نہیں ہیں وہ ایک پوسٹ کارڈ پر اپنا پتہ
لکھ کر بھجوا دیں یہ شمارہ ان کی خدمت میں فوری طور
پر پیش کر دیا جائے گا۔



غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

آنکھوں میں محبت کی ضیا ہے کہ نہیں ہے
ہاں بول کہ جی تجھ پہ فدا ہے کہ نہیں ہے

اٹھتی ہے اذاں بن کے کبھی بن کے تلاوت
ہر حال میں تیری ہی صدا ہے کہ نہیں ہے

یہ شکوے شکایات بجا ہوں گے تو ہوں گے
یہ کام محبت میں روا ہے کہ نہیں ہے

ہیں اور جو کرتے ہیں امانت میں خیانت
جو درد دیا تو نے سوا ہے کہ نہیں ہے

جو راز تری ذات سے وابستہ رہا تھا
وہ راز ترا افشا ہوا ہے کہ نہیں ہے

ہم تیرے تجسس میں ادھر تھک سے گئے ہیں
تو اور نہیں اتنا بتا ہے کہ نہیں ہے

میں بھی تو سنوں اپنے نصیبوں کی کہانی
وہ یار مرا مجھ سے خفا ہے کہ نہیں ہے

اپنے ہی تصور سے لرز اٹھتا ہوں اکثر
یہ بھی تو گناہوں کی سزا ہے کہ نہیں ہے

ہونے کو تو ہو جائے ترا کام دوا سے
ہمراہ مگر دست دعا ہے کہ نہیں ہے

جس شخص کو اپنے ہی نہ ہونے کا گماں ہو
وہ کیسے کہے گا کہ خدا ہے کہ نہیں ہے

گھیرا تجھے گھنگھور گھٹاؤں نے حقیر آج
انفاس میں گرداب بلا ہے کہ نہیں ہے

702, Gold Crown
J. P. Road
Andheri (W)
Bombay-400 061

عقیدت و محبت میں گوندھی ہوئی

روح کو سرشار اور ایمان کو تازہ کرنے والے واقعات

چوتھی قسط

اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں کو عجب کمالات سے نوازتا ہے۔ ایسے کمالات جو عام انسانوں کی فہم سے بالاتر ہوں مگر اس کے لئے جو کل عالموں کا مقتدرِ اعلیٰ ہے کوئی بات ناممکن نہیں۔

ابراہیم الخواصؒ



اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کشف المحجوب	تذکرۃ الاولیاء	نفحاۃ الانس	سفینۃ الاولیاء	انوار الاولیاء
شیخ علی ہجویری	شیخ فریدالدین عطار	عبدالرحمٰن جامی	داراشکوہ	صبغۃ اللہ شاہ

آپ کا اعتماد مجھے توکل سے بے نیاز نہ کر دے۔"

حضرت خضرؑ نے یہ بات سن کر تبسم فرمایا اور کہا "الحمدللہ! ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو توکل کے رموز سے اچھی طرح آشنا ہیں۔" اس اعتراف کے بعد خضرؑ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

آپ نے ایک آہ کے بعد دل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تیرے ہاتھوں مجھے بہت پشیمان ہونا پڑتا ہے۔ تیری بے سروپا آرزوئیں میرے لئے اذیت بن جاتی ہیں۔ آج تو نے مجھے معیتِ الٰہی سے غافل کر کے غیراللہ کی رفاقت کا مطالبہ کر دیا اے نادان میں جس کا طالب ہوں وہ تو ہر وقت میرے ساتھ ہی ہے۔"

آپ سفر کے مراحل طے کرتے ہوئے مکۂ مکرمہ پہنچے اور بلدُ الامین کی تجلیوں میں محو ہو گئے۔ طوافِ باذوق سجدہ کی تسکین کے علاوہ آپ کا کوئی مشغلہ باقی نہ رہا۔ شوال ۲۳۳ھ میں آپ داخلِ ارضِ حرم ہوئے تھے۔ فریضۂ حج ادا کر کے وہاں سے مدینۃ النبیؐ میں باریاب ہوئے۔ حرمین میں دونوں جگہ مختلف کیفیات طاری رہیں۔ حرمِ کعبہ میں آپ نے اللہ تعالیٰ کی جمیع صفات کے ساتھ محسوس کیا اور قبۃ الخضریٰ کی فضا میں صرف صفتِ رحمت کی کارفرمائیاں دیکھیں۔ بارگاہِ رسولِ کریمؐ سے اپنی مراد کے دامن کو بھر کر آپ نے تبوک کا سفر اختیار کیا۔ پیدل چلے جا رہے تھے کہ ایک قافلہ آپ کے پاس سے گزرا۔ امیرِ قافلہ کی نظر آپ پر پڑی۔ اس نے اونٹ روک کر آپ سے دریافت کیا "محترم! کہاں کا عزم ہے؟"

"میں سروست تبوک جا رہا ہوں۔"

آپ نے جواب دیا۔

امیرِ قافلہ نے کہا "میرے ساتھ فاضل اونٹ بھی ہے، آپ اس پر سوار ہو جائیں میری منزل بھی تبوک ہے۔"

"میں یہ مسافت آسانی سے آہستہ آہستہ چل کر بھی طے کر لوں گا۔ اگر جلد پہنچنا چاہوں یہ بھی میرے لئے ممکن ہو گا۔ میں بغیر تھکن کے بھی تیز رفتار اونٹ سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہوں میں بہرکیف تمہارا شکرگزار ہوں کہ تم نے مجھے

...ازی کے جذبہ کا اظہار کیا۔

امیر قافلہ یہ بات سُن کر اونٹ سے نیچے اتر آیا۔ کچھ دیر تک بغور آپ کا جائزہ لینے کے بعد وہ بولا "آپ صورت سے ایک شریف انسان نظر آتے ہیں۔ اگر آپ میرے ساتھ کسی خاص مصلحت کی وجہ سے چلنا نہ چاہتے تھے تو ایک سادہ سا انکار کافی تھا۔ میں کبھی آپ پر جبر نہ کرتا کہ آپ میرے ساتھ ضرور چلیں۔ جواب کا یہ پہلو بھی قابلِ قبول ہے کہ آپ آہستہ آہستہ اپنی منزل تک پیدل ہی پہنچ جائیں گے لیکن آپ کا یہ کہنا کہ آپ تیز رفتار اونٹ سے بھی تیز دوڑ سکتے ہیں، تو مجھے اس میں مبالغہ نظر آتا ہے۔ اگر میں زیادہ واضح الفاظ میں اپنا ما فی الضمیر بیان کروں تو یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے یہ جھوٹ بولا ہے۔"

امیر قافلہ کی یہ بات سُن کر آپ نے کہا۔ "اوّل تو میں تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ میرے متعلق نیک گمان کرو، میری بات مان لو اور اپنی راہ لو لیکن اگر تم مجھے جھوٹا ہی سمجھنا چاہتے ہو تو میں خود کو سچا ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ اس میں مجھے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔"

امیر قافلہ نے کہا "تم خود کو سچا ثابت کرو! تم جس فائدے کا اپنے لئے تعین کرو گے میں اُسے ادا کروں گا۔"

قافلہ کے اور افراد بھی قریب آ کر دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ آپ نے کہا "میں اپنی تیز رفتاری کا ثبوت ابھی فراہم کرتا ہوں، مگر تمہیں میری تین شرطیں پوری کرنا ہوں گی۔ پہلی شرط یہ ہے کہ تم اپنا سودی کاروبار آج ہی سے ختم کر دو۔ جو رقم تم نے دوسروں کو سود پر دی ہے، اسی پر تمہارا حق ہے، تم سود معاف کر دو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ آج کے بعد شراب کبھی نہ پیو گے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ تم اپنے ضعیف باپ کے آرام کا ہر طرح خیال رکھو گے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تم خود اچھا کھانا کھاؤ، اچھا پہنو، اور باپ تمہارا بچا کھچا کھائے، تمہارے پرانے کپڑے پہنے۔"

تینوں شرطیں سُن کر امیر قافلہ اور اہلِ قافلہ انتہائی حیران ہوئے۔ ایک اجنبی وہ سب کچھ جانتا تھا جو وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ امیر قافلہ نے تینوں شرطیں منظور کر لیں۔

آپ نے اہلِ قافلہ سے کہا "اس معاہدے کے تم لوگ شاہد و عادل ہو، تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس معاہدہ کی تکمیل کے لئے اسے مجبور کرو۔"

امیر قافلہ ایک تیز طرار اونٹنی پر سوار ہو گیا اور آپ بھی تیار ہو گئے، چنانچہ ایک ساتھ دونوں فریق میدان میں دوڑ پڑے۔ ابتدا میں آپ نے اپنی رفتار اونٹنی کی رفتار سے مساوی رکھی۔ امیر قافلہ نے لاکھ کوشش کی کہ اونٹنی کو آگے نکال لے جائے، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ بازی جیت لینا ناممکن ہے تو ہمت ہار دی۔

آپ نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا "فیصلہ کن مرحلہ آ گیا ہے، کوشش کرو اور میری یہ بات بھی ذہن نشین کر لو کہ اگر تم نے طے شدہ شرائط پر عمل نہیں کیا تو اللہ کا عذاب تمہیں آ لے گا" یہ کہہ کر آپ نے اپنی رفتار اتنی تیز کر دی کہ تھوڑی دیر میں قافلہ کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔

امیر قافلہ ناکام ہو کر قافلے کی طرف پلٹا تو اس میں انقلاب آ چکا تھا۔ اس نے تینوں شرطوں کو پورا کرنے کا عہد کیا اور تمام زندگی اُن پر کاربند رہا۔

آپ تبوک پہنچے تو معلوم ہوا کہ خشک سالی کا عذاب نازل ہے، جانور بھوک پیاس سے دم توڑ رہے ہیں اور انسان ایک ایک بوند پانی پر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ لوگوں کے ویران چہرے، بجھی ہوئی آنکھیں اور لاغر جسم دیکھ کر آپ بے قرار ہو گئے۔ گلی گلی جا کر آپ نے لوگوں کو نمازِ استسقاء کی دعوت دی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا یقین دلایا۔ نا اُمیدی کی فضا میں آپ کی آواز نے توقعات کے کچھ چراغ روشن کئے۔ آبادی سمٹ کر ایک میدان میں پہونچی۔ سخت دھوپ اور شدید پیاس کے عالم میں نمازِ استسقاء کے بعد آپ نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو شدتِ گریہ سے آپ بے حال ہو گئے۔ دُعا کے الفاظ رندھے ہوئے گلے میں اٹکے ہوئے تھے مگر علیم و خبیر نے جان لیا کہ اُس کا بندہ کیا چاہتا ہے۔ گھٹائیں چاروں طرف سے جھوم جھوم کر اُٹھیں اور تپتے ہوئے میدان پر بادِ خنک سائبان تن گیا۔ ٹھنڈی ہواؤں نے سُلگتے ہوئے سانسوں کو تسکین دی اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ دشت و جبل جل تھل ہو گئے۔ بھیگتے ہوئے سب لوگ جب شہر کی طرف چلے تو اُنھوں نے آپ کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ جب تک بادل برستے رہے آپ کی آنکھیں برستی رہیں۔ تبوک کے شیخ عامر آپ کو اپنے ساتھ مہمان بنا کر لے گئے۔

شیخ عامر نے جب کھانے کے لئے آپ کو دسترخوان پر آنے کی دعوت دی تو آپ نے اُن سے کہا "یہ کھانا میں کیسے کھا سکتا ہوں؟ تبوک میں میرے بھائی قحط کی وجہ سے بھوکے ہیں، کسی کے پاس ایسی نعمتیں موجود نہیں جو تمہارے تموّل کی وجہ سے تمہیں آج بھی میسّر ہیں۔ بارش سے لوگوں کی پیاس بجھی ہے بھوک نہیں مٹی ہے تم کھانا کھاؤ، میں دوسروں کے لئے کھانے کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔"

شیخ عامر آپ کی صورت دیکھتے رہ گئے اور آپ اُن کے گھر سے باہر آ گئے۔ آپ نے گلی میں دیکھا کہ ایک بچہ نحیف آواز میں اپنی ماں سے کہہ رہا ہے "مجھے کچھ کھلاؤ ماں ورنہ میرا دم نکل جائے گا۔"

مجبور ماں کے پاس حرفِ تسلی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تسلی ایک مدت کے لئے انتظار کی قوت فراہم کرتی ہے مگر انتظار کی اب ساری مدیں ختم ہو چکی تھیں۔ آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے بچے پر غشی طاری ہونے لگی۔ آپ نے دوڑ کر بچے کو اُٹھایا جو اپنی ماں کے زانو پر سر رکھے لیٹا تھا۔

آپ نے بچے کی ماں سے کہا "پانی لاؤ"

وہ دوڑی ہوئی گئی اور پانی لاکر آپ کو دیتے ہوئے کہا " مَیں اسے پانی پلا چکی ہوں پانی سے کچھ نہ ہوگا۔ تین دن سے ایک گھیل بھی اِس کے مُنہ میں نہیں گئی ہے "۔

آپ نے بے ساختہ کہا " یہ پانی نہیں، دُودھ ہے "۔

عورت نے پیالے کی طرف دیکھا تو واقعی پیالہ دودھ سے بھرا ہوا تھا۔

بچّے کو آپ نے دودھ پلایا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ آپ نے بچّے کی ماں سے کہا۔

" جاؤ تمہارا مٹکا دودھ سے بھرا ہوا ہے تم خود بھی سیر ہو کر پیو اور دوسرے ضرورت مندوں کو بھی خوب پلاؤ۔ تین دن تک مٹکے کا دودھ ختم نہ ہوگا "۔

آپ وہاں سے چلے اور کچھ دُور جاکر مراقبہ کیا۔ آپ نے دیکھا کہ مصر سے غلّہ لے کر ایک قافلہ قراطہ کی طرف جا رہا ہے۔ قراطہ تبوک سے پچاس فرسخ کے فاصلہ پر تھا۔ قافلہ قراطہ سے اِس وقت پانچ فرسخ کے فاصلے پر تھا۔ آپ نے اپنی توجہ اونٹوں کی طرف مبذول کر کے اونٹوں کو اپنی طرف بُلایا۔ آپ کی توجہ سے پانچ سو اونٹ بے قرار ہو کر دوڑ پڑے۔ سمتِ سفر بدل لی، تو ساربانوں نے اونٹوں کو صحیح راستے پر ڈالنے کے لیے نکیلیں کھینچنی شروع کیں اور اُن کی پٹائی کرنے لگے۔ بے زبانوں پر یہ اُفتاد دیکھی تو آپ نے ساربانوں کو بھی رُوحانی طور پر اپنی طرف سفر کی دعوت دی۔ ساربانوں کی گرفت نکیل پر ڈھیلی پڑی اور اونٹوں کی رفتار ناقابلِ یقین حد تک تیز ہو گئی۔ غلّے کی درآمد کا فوری اہتمام کر کے ایک قریبی مسجد میں پہنچ کر آپ نے بذریعۂ کشف یہ معلوم کیا کہ اجناس کے ذخائر کن کن لوگوں کے پاس ہیں، ان کی فہرست ذہن میں محفوظ کر کے ذخیرہ اندوزوں سے جاکر فرداً فرداً مُلاقات کی۔ قحط کے زمانے میں اشیائے خورد و نوش کا ذخیرہ کرنے والے نہ کسی اخلاق سے آشنا ہوتے ہیں، نہ اُن کا کوئی مذہب ہوتا ہے۔ انسانیت کے نام پر اُن سے لاکھ درخواست کی جائے، اثر انداز نہیں ہوتی۔ بھوک کی سسکتی ہوئی آبادی کو وہ دیکھتے رہے، مگر ان کے دل نہ پسیجے۔ آپ اپنی روحانی قوتوں کے ساتھ اُن پر اثر انداز ہوئے اور اُنھوں کے ایک معمول کی طرح ذخیرہ کی ہوئی اشیاء ذخائر سے نکال کر گھر سے باہر ڈھیر کر دیں۔ آپ نے ان اشیاء کو عوام میں مُفت تقسیم کروا دیا۔

باقی آئندہ

غزل



مری زباں پہ ہمیشہ تمہارا نام آئے
بلا سے زندگی کی صُبح ہو کہ شام آئے

قدم قدم پہ جھلے وقت میں ملے تھے دوست
بلا نہ اک بھی جو مشکل گھڑی میں کام آئے

بے وعدہ ساقیا پی کر نہ لڑکھڑاؤں گا
سنبھل چکا ہوں میں پھر ایک دو جام آئے

گُذر گئی ہے عمر و رنج میں حسرت بری
قریب مرگ خوشی کا کوئی پیام آئے

جئے بھی جائیں گے جب تک سانس ہے میں
خبر نہیں ہے کہ کب زندگی کی شام آئے

پریشاں روز کی روٹی کمانے میں مُفلس
بلا سے اُس کی کوئی مُلک میں نظام آئے

عزیزِ خلق تھا ظاہر اِس حقیقت سے
ہزاروں اُسکے جنازے میں خاص عام آئے

یہی اک آرزو باقی ہے دل میں اے ناصرؔ
مری یہ زندگی دُنیا میں سب کے کام آئے

پادری بَلدیو سِنگھ ناصرؔ
(امریکہ)



پچیس سال پہلے

اِنڈو پاک مُشاعِرہ کرنال

سرورتونسوی

یہ مشاعرہ ۲۲ جون ۱۹۶۳ء کی رات کو منعقد ہونا تھا مگر بارش ہونے کے باعث تمام انتظامات درہم برہم ہو کر رہ گئے لہٰذا ۲۳ جون ۱۹۶۳ء اتوار کی صبح کو ساڑھے آٹھ بجے یہ مشاعرہ رام لیلا بھون میں منعقد کیا گیا۔

آج ۲۳ جون ۱۹۶۳ء اتوار ہے۔ صبح کے ۸½ بجے ہیں۔ شری کیدارناتھ ساہنی ایڈوکیٹ کی کوٹھی سے تمام شعرائے کرام کو رام لیلا بھون میں لایا گیا ہے۔ مشاعرہ گاہ کی سجاوٹ کو رات کی بارش نے تحس نحس کر دیا تھا تاہم منتظمین نے پنجاب کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے مشاعرہ گاہ کو اچھے انداز سے سجایا ہے۔ اسٹیج بہت ہی آرام دہ ہے۔ اتنا آرام دہ اسٹیج کسی دوسرے مشاعرہ میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ شعرائے کرام کے ساتھ ساتھ عالی جناب ٹکا جگجیت سنگھ بیدی جج پنجاب ہائی کورٹ اور عالی جناب وی۔ شنکر آئی۔ سی۔ ایس۔ بھی اسٹیج پر تشریف رکھتے ہیں۔ سامعین کی صفِ اوّل میں مسز وی شنکر کنور رانی صاحبہ، شری ایم۔ آر۔ وید ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر، رائے صاحب پرتاب سنگھ شجاع آبادی، شری کیدارناتھ ساہنی ایڈوکیٹ معہ اہلیہ محترمہ۔ شری مہربان سنگھ دھوبیا آنریری مجسٹریٹ دہلی۔ سردار شیر سنگھ سندھو مجسٹریٹ درجہ اوّل دہلی اور دیگر افسرانِ ضلع و معززینِ شہر تشریف فرما ہیں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی آئی۔ اے۔ ایس ڈپٹی کمشنر کرنال نے مائک سنبھالتے ہوئے فرمایا کہ گزشتہ رات بارش کی وجہ سے ہم مجبور تھے کہ مشاعرہ ملتوی کیا جائے۔ اور آج بے وقت مشاعرہ کیا جا رہا ہے۔ کنور صاحب نے نادر شاہ کے دربار کی ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ ٹکا صاحب اور وی شنکر صاحب کی موجودگی میں میرے لئے یہ انتخاب مشکل ہو رہا ہے کہ کس ہستی سے کونسا احسان لوں۔ تاہم اپنے بڑے بھائی جناب ٹکا جگجیت سنگھ جج ہائیکورٹ سے مؤدبانہ گذارش کرتا ہوں کہ وہ اس مُشاعرہ کا افتتاح فرمائیں۔ اور عالیجناب وی شنکر صاحب سے التماس ہے کہ وہ اعلان کے مطابق اس مشاعرہ کی مسندِ صدارت کو زینت بخشیں۔

ٹکا صاحب نے نہایت جچے تلے انداز میں مشاعرہ کا افتتاح فرمایا ہے۔ چونکہ ٹکا صاحب کرنال میں سیشن جج رہ چکے ہیں اس لئے اہلِ کرنال ذاتی طور پر انھیں جانتے ہیں اور سامعین کے چہروں اور آنکھوں سے عقیدت کے جذبات صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ کیونکہ بیدی برادران جہاں بھی رہتے ہیں، وہاں کے رہنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں جناب وی شنکر مسندِ صدارت پر تشریف لائے تو تالیوں کی جھنکار میں کنور صاحب نے انہیں طلائی ہار پہنایا۔ صاحب صدر نے مائک سنبھالتے ہوئے صدارتی تقریر شروع کی ہے۔ تقریر کیا ہے، اُردو کے عروج و زوال کی ایک داستان ہے —— صاحبِ صدر نے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات پر چند کلمات میں روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ملک چاہے دو ہوں مگر انسانیت میں فرق نہیں آئے گا۔ شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی سے متعلق صاحب صدر نے نہایت اچھے الفاظ میں ذکر فرماتے ہوئے کنور مہندر سنگھ بیدی سے مشاعرہ شروع کرانے

کی خواہش فرمائی۔ پُرجوش تالیوں کی جھنکار میں مہدی خشکر صاحب نے تقریر ختم کی تو کنور صاحب نے شعرائے کرام کے اسمائے گرامی سُنانے کے بعد عزیز وارثی کو کلام سُنانے کی دعوت دی ہے۔
سنیئے عزیز صاحب فرمارہے ہیں ؎

" عشق میں ایسا اک عالم بھی گُزر جاتا ہے
ذہن و احساس کا ادراک بھی مرجاتا ہے
بعض اوقات تو ہوتی ہے کچھ ایسی حالت
چاندنی رات میں دل پھولوں سے ڈر جاتا ہے "

اس کے بعد غزل شروع کی ہے ؎

" آنکھ مشتاقِ صنم ہو تو غزل ہوتی ہے
دل کو بھی اک یہی غم ہو تو غزل ہوتی ہے
بے تکلف کبھی ہنسنے میں رُخِ زیبا پر
زُلف اُس شوخ کی خم ہو تو غزل ہوتی ہے
آپ اس بات کو تسلیم کریں یا نہ کریں
آپ کا خاص کرم ہو تو غزل ہوتی ہے "

عزیز وارثی مناسب داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئے تو کنور صاحب نے سلیم کھتولوی سے کلام سنانے کو کہا ہے۔ سنیئے سلیم صاحب فرمارہے ہیں ؎

" ترا دستِ نہاں ہے اور میں ہوں
متاعِ دو جہاں ہے اور میں ہوں
شبِ غم روح فرسا ظلمتوں میں
تصور ضَو فشاں ہے اور میں ہوں
پئے سرکوبیٔ طوفانِ باطل
مرا عزمِ جواں ہے اور میں ہوں "

سلیم صاحب غزل سُنانے اور موزوں داد پانے کے بعد مائک سے ہٹے تو نہایت اچھے الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے کنور صاحب نے نرتیش کمار شاؔد سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ شاد صاحب نے اپنے تازہ مجموعۂ کلام سے چند قطعات سنائے ہیں اور بے انتہا داد پائی ہے۔ افسوس ہے کہ راقم الحروف یہ قطعات نقل نہ کرسکا اور شاد صاحب نے وعدہ کے باوجود نقل مہیا نہیں فرمائی۔
لیجئے اب محشر امروہوی مائک پر تشریف لائے ہیں اور اپنی ایک پُرانی غزل سُنا رہے ہیں دو مطلعے آپ بھی سُن لیجئے:۔

" یوں رات بسر کرلیتا ہوں یوں رات بسر ہو جاتی ہے
جب اُن کا تصور کرتا ہوں ہر بار سحر ہو جاتی ہے
بھرپور جوانی میں حسنِ صنم تیارِ نظر ہو جاتی ہے
ہر شیخ و برہمن کوئی ہو ہر ایک کے سر ہو جاتی ہے "

اس مطلع کے پہلے مصرعہ نے سامعین کو ہنسی ہنسی میں محشر صاحب کی عمر اور سفید داڑھی کا جائزہ لینے پر مجبور کردیا ہے۔ محشر صاحب کو اتنی داد ملی ہے کہ مشاعرہ پر میدانِ حشر کا دھوکہ ہورہا ہے۔
لیجئے کنور صاحب جناب بسمل سعیدی ٹونکی سے کلام سُنانے کی استدعا کررہے ہیں۔ بسمل صاحب مائک پر تشریف لائے اور انہوں نے سامعین کی خواہش پر تین غزلوں کے تین تین شعر سنائے۔ ایک غزل کا مطلع اور ایک شعر آپ بھی سن لیجئے ؎

" رُتبہ یہ ترے در کو مرے سر سے ملا ہے
حالانکہ مجھے سر بھی ترے در سے ملا ہے
ملتا ہے ترے در سے مقدر سے زیادہ
حالانکہ مقدر بھی ترے در سے ملا ہے "

دوسری غزل کا مطلع اور مقطع بھی سن لیجئے۔

" حجابِ لطف و کرم میں ستم نکلتا ہے
ہر اک لباسِ مسرت میں غم نکلتا ہے
مفارقت کے غموں سے یہ حال ہے بسمل
کہ آہ لب سے جُدا ہو تو دم نکلتا ہے "

بسمل صاحب بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئے تو کنور صاحب نے بہت ہی اچھے تعارف کے ساتھ جناب دلاور فگاؔر سے کلام سنانے کی گزارش کی ہے۔ دلاور فگار صاحب مائک پر تشریف لائے تو قطعات پر اتنی داد پائی کہ اس مشاعرے میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ قطعات کے بعد فگار صاحب نے اپنی ایک مشہور نظم "عشق کا پرچہ" سنائی اور بے انتہا داد پائی ہے۔ چونکہ اس نظم کا تعلق بھی سرزمین پنجاب سے تھا اس لئے یہ نظم اور بھی لطف دے گئی۔ فگار صاحب مائک سے ہٹنے لگے تو کنور صاحب نے فرمائش کی کہ فگار صاحب اپنی تازہ ترین نظم "آج کی تازہ خبر" سنائیں۔ سنیئے فگار صاحب کیا ارشاد فرمارہے ہیں:۔

ایک عاشق کی مرمت ہوئی چوراہے پر
حملہ آور تھا کوئی شوخ خبیث و خود سر
پٹنے والا تھا مگر صبر و رضا کا پیکر
پٹتے وقت اس کی زباں پر نہ اگر تھا نہ "
آج کی تازہ خبر

حسبِ دستورِ قدیم آج سرِ راہ گزر
دو بسوں میں ہوئی اک عبرت آموز سی ٹکّر
حادثہ سخت تھا لیکن نہ مرا کوئی بشر
کچھ مسافر تھے کہ جو کر گئے دُنیا سے سفر
آج کی تازہ خبر

راہزن بھیس بدل لیتے ہیں اب لیلیٰ کا
چاندنی چوک میں کل رات پڑا ہے ڈاکا
اک حسینہ نے کسی شخص کے دل کو تاکا
لے کے دل بھاگ گئی ہے وہ خدا جانے کد
آج کی تازہ

اس حسینہ کو پکڑنے میں پولیس ہے ناکام
عام شہرت ہے کہ وہ بھاگ گئی ہے نیلام
نہ کہیں اس کا وطن ہے نہ کوئی جائے قیام
لطف قیمہ ہے کہ اس کے نہ دہن ہے نہ
آج کی تازہ "

قوم پر آج ہوا اک نئی آفت کا نزول
ایک صاحب کو یہ دعویٰ ہے کہ میں بھی ہوں رسول
لیکن اس حکم کو کرتا ہی نہیں کوئی قبول
اپنی اُمت میں ہے اب صرف یہی :
آج کی تازہ خ

ایک زردار نے ایران میں پالا ہے گدھا
ناشتہ جنگلے سے کرتا ہے نرالا ہے گدھا
ہم غریبوں سے بہت برتر و بالا ہے گدھا
ہندوالوں سے بہت اچھے ہیں ایران کے
آج کی تازہ "

آج اک بوڑھے جواں مرد کے اولاد ہوئی
روحِ مضطر یہ خبر سُن کے بہت شاد ہوئی
کوٹھری دل کی تمناؤں سے آباد ہوئی
آ گیا سوکھی ہوئی شاخِ تمنا پہ ثمر
آج کی تازہ "

آج کچھ بیٹوں نے اک باپ کو فرما دیا عاق
واقعی باپ بھی ہوتے ہیں بڑے بداخلاق
فوجِ اولاد بڑھانے کو سمجھتے ہیں مذاق
ہر نئے سال اُگا دیتے ہیں اک لختِ جگر
آج کی تازہ خبر

آج دہلی سے الیکشن کی خبر آئی ہے
پہلوانانِ سیاست میں صف آرائی ہے
ممبری فلم ہے اور قوم تماشائی ہے
فلم اچھی ہے اداکار ہیں اد بچے لیڈر
آج کی تازہ خبر

کل عدالت میں ہُوا پیش وہ مجذوبِ فقیر
جرمِ اغوائے طوائف میں ہُوا تھا جو اسیر
کورٹ میں وقتِ بیاں جج سے یہ کہتا تھا پیر
"خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر"
آج کی تازہ خبر

ایک صاحب کہ جو صورت سے تھے تھوڑے سے جمیل
چاہتے تھے کہ کریں جنس کو بالکل تبدیل
یہ تمنا نہ پہونچ پائی بہ حدِ تکمیل
اب یہ صورت ہے کہ موصوف نہ مادہ ہیں نہ نر
آج کی تازہ خبر

کٹ گیا ریل کے نیچے کوئی آشفتہ نصیب
مرنے والے کو خدا بخشے کہ شاعر تھا غریب
اُس کی صورت بھی ٹیپیکل تھی طبیعت بھی عجیب
رہنے والا "بھادل" کا تخلص تھا قمر
آج کی تازہ خبر

ہم نے اک شخص کو کل لکھا تھا مرحوم ہُوا
ابھی زندہ ہے وہ مرحوم یہ معلوم ہُوا
غلطی پرچہ کی تھی جس کا یہ مفہوم ہوا
کل کے پرچے میں جو خبریں ہیں غلط ہیں یکسر
آج کی تازہ خبر

دلاور فگار آج کی تازہ خبر سُنا کر اور داد سے جھولیاں بھر کر اپنی جگہ پر واپس آئے تو کنور صاحب نے محترمہ شبنم اٹاوی سے کلام سُنانے کو کہا ہے۔ دلاور فگار کے فوراً بعد کسی دوسرے شاعر کا کامیاب ہونا مشکل نظر آتا تھا مگر کنور صاحب نے شبنم اٹاوی سے کلام سنانے کا اعلان فرما کر اس خدشہ کو کسی حد تک دُور کر دیا سنئے شبنم فرما رہی ہیں ؎

"تنگ آ کے ناخدا سے یہ کہنا پڑا مجھے
غیرت دلا رہا ہے مرا حوصلہ مجھے
ہر سمت ایک سلسلۂ دلفریب ہے
گمراہ کر رہے ہیں ترے نقشِ پا مجھے"

کچھ تو مائک کا سلسلہ ٹھیک نہیں دوسرے شبنم صاحبہ نہایت دھیمی آواز میں کلام سُناتی ہیں اور تیسرے ابھی تک سامعین کے دل و دماغ پر دلاور فگار چھا رہے ہیں اس لئے شبنم صاحبہ کو داد نہیں مِل رہی۔ سنیئے شبنم نغمہ سرا ہیں ؎

"کچھ رہنما سے مجھ کو شکایت نہیں مگر
رہزن سے ہر قدم پہ ملا آسرا مجھے
ساحل کی زندگی تو کوئی زندگی نہیں
یہ راز موجِ عشق نے سمجھا دیا مجھے"

ہر شعر پر مناسب داد ملی ہے۔ شبنم مقطع فرما رہی ہیں ؎

"شبنم کہاں کا ہوش کہاں کی تمکنتیں
پہلے ہی اس نگاہ نے تڑپا دیا مجھے"

شبنم اٹاوی اپنی جگہ پر تشریف لے گئیں تو کنور صاحب فرمانے لگے "اب آپ میرے برادرِ خورد مگر عقل میں بڑے جناب ساحر ہوشیار پوری سے اُن کا کلام سنئیے۔ ساحر صاحب مسکراتے ہوئے مائک پر تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں ؎

"جنونِ عشق ٹل جائے تو جانیں
خرد کا وار چل جائے تو جانیں
بدل سکتی ہیں تقدیریں یہ مانا
ہمارا دل بدل جائے تو جانیں"

داد سے جھولیاں بھرتے ہوئے ساحر صاحب فرما رہے ہیں ؎

"کرو سرسبز صحرائے محبت
مقدر میں ہی جاگیر نکلی
مجھے تدبیر سے اِتنا گِلہ ہے
کہ یہ بھی حامیِ تقدیر نکلی"

اس کے بعد غزل شروع کی ہے فرماتے ہیں:-

"غم کے ماروں کا کیا بھروسہ ہے
بیقراروں کا کیا بھروسہ ہے
چاند تاروں کی ہے چمک شب بھر
اِن شراروں کا کیا بھروسہ ہے
یہ تو منزل کی خود پرستی ہے
رہگزاروں کا کیا بھروسہ ہے
حُسن، دولت، شباب، نام و نسب
ان سہاروں کا کیا بھروسہ ہے
پھول کھلنے پہ جن کا تکیہ ہو
اُن بہاروں کا کیا بھروسہ ہے
خود جو طوفاں کی زد میں ہیں ساحر
اُن کناروں کا کیا بھروسہ ہے"

جناب ساحر ہوشیار پوری خوب خوب داد پا کر اپنی جگہ تشریف لے گئے تو جناب سوہن لال صاحب ساحر کپور تھلوی مائک پر تشریف لائے۔ صبح کے وقت مشاعرہ ہونے کا یہ فائدہ ساحر صاحب کو دیکھ کر منظرِ عام پر آ گیا کہ اگر مشاعرے دن کے وقت ہوں تو شاعروں کا یہ عذر لنگ اپنے آپ بیکار ہو کر رہ جائے گا کہ شراب پینے کے بعد شعر اچھا پڑھتے ہیں۔ اس وقت کوئی بھی شاعر شراب پئے ہوئے نہیں ہے اور مشاعرہ اتنے نظم و نسق اور کامیابی سے چل رہا ہے کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ کنور صاحب دل ہی دل میں سوچ رہے ہیں کہ کیوں نہ آئندہ مشاعرے دن کے وقت میں منعقد کئے جائیں۔ عام طور پر ساحر کپور تھلوی مشاعروں میں کثرتِ شراب نوشی کے باعث بغیر کلام سنائے ہی تشریف لے جایا کرتے ہیں اور اگر ان کے دل و دماغ کی ستم ظریفی سے کسی موقع پر ان میں کچھ سکت باقی رہ گئی تو لڑکھڑاتی زبان سے یوں اشعار سُناتے ہیں کہ سننے والوں کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ مگر آج چونکہ یہ شراب پئے ہوئے نہیں ہیں اس لئے نہایت شستگی اور روانی کے ساتھ اشعار سنا رہے ہیں۔ اور بہت اچھی داد پا رہے ہیں۔ ساحر کپور تھلوی اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو کنور صاحب نے جناب عرش ملسیانی سے کلام عطا کرنے کو کہا ہے۔ سنئیے عرش قطعات فرما رہے ہیں

" عشق ہرگز نہیں ہوس کا نام
عشق دل کا چراغ ہوتا ہے
حسن صورت پہ یہ نہیں موقوف
حسن تو اک مزاج ہوتا ہے۔"

" حسن معنی سے جو مُبرّا ہو
اُس غزل کو لطیف کہتے ہیں
مفتی ہو جو بے د قوفی میں
لوگ اُس کو شریف کہتے ہیں "

کنور صاحب فرما رہے ہیں" عرش صاحب ہم تو آپ کو بھی شریف کہتے ہیں۔ عرش نے برجستہ فرمایا" آپ سے زیادہ اس محفل میں کوئی نہیں اس پر ایک طویل قہقہہ لگتا ہے۔ سنئے عرش صاحب غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

" کبھی اِس مکاں سے گزر گیا کبھی اُس مکاں سے گزر گیا
ترے آستاں کی تلاش میں میں ہر آستاں سے گزر گیا
ابھی آدمی ہے فضاؤں میں ابھی آدمی ہے خلاؤں میں
یہ نہ جانے پہنچے گا کس جگہ اگر آسماں سے گزر گیا
یہ مرا کمال گنہ سہی، مگر اس کو دیکھ مرے خدا
مجھے تو نے روکا جہاں جہاں میں وہاں وہاں سے گزر گیا۔
جسے لوگ کہتے ہیں زندگی وہ تو حادثوں کا ہجوم ہے
وہ تو کہئے مرا ہی یہ کام تھا کہ میں درمیاں سے گزر گیا "

جناب عرش اس غزل پر بہت اچھی داد پاکر مائک سے ہٹے تو کنور صاحب نے جناب قیس جالندھری سے کلام سنانے کی درخواست کی ہے۔ قبلہ فرما رہے ہیں ؎

ضبط سے عشق کے حالات کہاں تک پہنچے
لب پہ آ جائے تو پھر بات کہاں تک پہنچے
لامکاں میں بھی ترا نقشِ کفِ پا نہ ملا
اور اب شوقِ ملاقات کہاں تک پہنچے
آج ساقی نے اِدھر بھی کوئی چھینٹا تو دیا
دیکھئے اب یہ شروعات کہاں تک پہنچے
اُٹھ کے میخانے سے مسجد میں گئے پڑھنے نماز
دیکھئے اہلِ خرابات کہاں تک پہنچے
جتنی گھٹتی ہے کچھ اتنی ہی سوا بڑھتی ہے
کیا خبر ہجر کی یہ رات کہاں تک پہنچے "

قیس صاحب ہر شعر پر بہت اچھی داد پاتے ہوئے فرما رہے ہیں ؎

جب رہا میں تری محفل میں تو کچھ بات نہ تھی
اب خدا جانے کہ یہ بات کہاں تک پہنچے
بیخودی میں بھی ترا نام ہی منہ سے نکلا
تیری الفت کے خیالات کہاں تک پہنچے
کیا کہے کوئی جو شرما کے کہے یہ کوئی
جو کوئی سن لے تو یہ بات کہاں تک پہنچے

اس شعر پر داد نے شورِ قیامت کا روپ دھارن کر لیا ہے اور قیس صاحب کو یہ شعر چار مرتبہ پڑھنا پڑا۔ مقطع فرماتے ہیں ؎

" اپنے مطلب کے تراشے گئے معنی کیا کیا
قیس قرآں کے بھی آیات کہاں تک پہنچے "

قبلہ قیس صاحب اپنی جگہ تشریف لے گئے تو کنور صاحب نے علامہ انور صابری سے گزارش کی ہے کہ مائک پر تشریف لائیں۔ سنئے علامہ فرما رہے ہیں

جبینِ شام روشن کر رہا ہوں
چراغِ جام روشن کر رہا ہوں
بجھا کر اپنی شمعِ زندگانی
تمہارا نام روشن کر رہا ہوں "
بظاہر اجالے بباطن اندھیرے
لباسِ رفیقِ سفر میں لٹیرے
خدا کے لئے اِن سے بچ کر گزر جا
یہ اہلِ سیاست نہ تیرے نہ میرے

داد کا شور کچھ کم ہوا تو مضطر صاحب فرمانے لگے" علامہ آپ کو کسی وزیر سے روپیہ نہیں ملا جو یہ قطعہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی؟ اس پر شعراء کا قہقہوں سے بُرا حال ہے سُنا تو علامہ غزل ارشاد فرما رہے تھے ؎

" نظر نظر کو خمِ میکدہ بنا کے پی گیا
کسی حسیں نگاہ سے نظر ملا کے پی گیا
بڑھی جو دل کی تشنگی دو تورا اضطراب میں
سبک سبک صراحیاں اُٹھا اُٹھا کے پی گیا
یہ کارِ خیر دیکھئے جب آئے شیخ سامنے
بہ احترامِ شرع شیخ نظر جھکا کے پی گیا
درود پڑھ کے آفتابِ جام کے ورود پر
گناہ کو ثواب کی حدوں میں لا کے پی گیا "

علامہ غزل پر اچھی داد پا کر اپنی جگہ پر تشریف لائے تو شری رام کرشن مضطر نے پھر لقمہ دیا اور پوچھا" علامہ، یہ دوسرا قطعہ آپ نے کس ناراضگی میں فرمایا؟" فرمانے لگے میرا وظیفہ حکومت نے بند کر دیا۔ علامہ صاحب جناب رتل ایڈیٹر "تحریک" سے کہنے لگے کہ آپ کو اس بارے میں کچھ لکھنا چاہئے۔ رتل فرمانے لگے "صاحب میرا لکھنا ہم دونوں کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ دیکھو تو شری رام کرشن مضطر آف 'ملاپ' ارشاد فرما رہے ہیں ؎

آج پھر اس نے اِدھر ایک نظر دیکھ لیا
رنگِ دل دیکھ لیا، رنگِ جگر دیکھ لیا
مسکرا کر جو مرا دیدۂ تر دیکھ لیا
اپنے اندازِ تغافل کا اثر دیکھ لیا
آہ کیا بیت گئی جان پہ ہنگامِ وداع
اُس نے جب مُڑ کے مجھے ایک نظر دیکھ لیا

مضطر صاحب ہر شعر پر مناسب داد پاتے ہوئے نغمہ سرا ہیں ؎

دیدہ و دل میں سمٹ آئے ہزاروں جلوے
چلتے چلتے جو یونہی جانبِ در دیکھ لیا
جس طرح برق چمکتی ہوئی چھپ جاتی ہے
یوں انہیں آج سرِ راہ گزر دیکھ لیا
کوئی اشکوں کی زباں جاننے والا نہ رہا
تیرا انجام بھی اے شمعِ سحر دیکھ لیا

داد و ستائش کی آوازوں میں مقطع فرما رہے ہیں۔

" بڑھ گئی اور بھی بیتابیٔ دل اے مضطر
اُس نے جب میری طرف بارِ دگر دیکھ لیا "

جناب مضطر صاحب غزل سنا کر اپنی جگہ پر تشریف لے آئے تو کنور صاحب نے جناب کشمیری لال ذاکر سے کلام سنانے کو کہا۔ لیجئے صاحب مائک پر تشریف لے آئے ہیں۔ ارشاد فرما

رنگینیِ جام و سبو سے ڈرتے ہیں
عشرتِ رنگ و بُو سے پھسلتے ہیں
لوگ اب موت سے نہیں ڈرتے
زیست کی جستجو سے ڈرتے ہیں "

" تم گھٹاؤں کا اہتمام کرو
اُڑیں جامِ شراب ہم دیں گے
تم گناہوں کا لطف تو لے لو
حشر کے دن حساب ہم دیں گے "

" تم گناہوں سے ڈر کے جیتے ہو
ہم اُنھیں ساتھ لے کے چلتے ہیں
یہ وہ رہبر ہیں جن کے ہاتھوں سے
جنتوں کے چراغ جلتے ہیں "

" آ! کہ بزمِ طرب سجائیں ہم
آ! کہ عشرت کا گیت گائیں ہم
زندگی عمر بھر کا رونا ہے
آ! کہ پل بھر تو مسکرائیں ہم "

- - - - - - -

ذاکر صاحب قطعات پر بہت اچھی داد پاکر اپنی جگہ پر تشریف لے آئے تو جناب ظفر ادیب نے مائک سنبھالا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

" ہمارا کیا ہے نہ آئے کہ آ کے بیٹھ گئے
وہ اپنے طور تو ہم کو بھلا کے بیٹھ گئے
سمجھ لیا تھا کہ جانبر نہ ہو سکیں گے ہم
سحر ہوئی تو عدو سر جھکا کے بیٹھ گئے "

اس شعر نے مشاعرہ میں نئے سرے سے جان پیدا کر دی ہے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

" ستم! کہ زندہ ہے اور زندگی نہ رہی
فغاں! کہ موت سے آنکھیں چرا کے بیٹھ گئے
چراغ بجھ گئے تو ہم جلائیں گے دل کو
وہ اور تھے کہ جو دل کو بجھا کے بیٹھ گئے "

داد و ستائش سے بے نیاز ظفر صاحب مقطع ارشاد فرماتے ہیں ؎

" ظفر خلوص کے مارے پنپ نہیں سکتے
یہ روگ جان کو تم کیا لگا کے بیٹھ گئے "

ظفر صاحب مائک سے ہٹے تو جناب تبسم دہلوی نغمہ سرا ہوئے۔ فرماتے ہیں ؎

" جب دستِ جنوں جیب و گریباں سے چلا ہے
رُخ میں نے رگِ جاں کی طرف موڑ دیا ہے
اے دل یہ کوئی کھیل نہیں دادِ وفا ہے
سو نقش مٹے ہیں تو کہیں ایک بنا ہے
تم کیوں مجھے آرام سے مرنے نہیں دیتے
اے چارہ گرو رحم کرو وقتِ دعا ہے "

تبسم صاحب نے شاعرانہ ترنم کو موسیقی کی گہرائیوں میں لاپتہ کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مشاعرہ کے ماحول میں موسیقی داد نہیں پا رہی۔ افسوس کہ تبسم صاحب نے اپنی اچھی غزل کو موسیقی کی نذر کر دیا۔ کنور صاحب نہایت اچھے الفاظ میں شعری بھوپالی سے کلام عطا فرمانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ شعری نغمہ سرا ہیں ؎

" مری دیوانگی سے لوگ اُنھیں پہچان جاتے ہیں
نہ اُن کا ذکر ہوتا ہے نہ اُن کا نام ہوتا ہے
جھٹک دو دامنِ کشورِ امن سے انگارے تعصب کے
کہ ان باتوں سے سارا میکدہ بدنام ہوتا ہے
وہ پاکیزہ طلب وہ جذبۂ صادق سہی پھر بھی
محبت کرنے والا ایک دن بدنام ہوتا ہے
قیامت ہے یہ کہہ کر اس نے لوٹایا ہے قاصد کو
کہ اُن کا تو ہر اک خط آخری پیغام ہوتا ہے "

شعری صاحب غزل سنانے اور اچھی داد پانے کے بعد مائک سے ہٹنے لگے تو سامعین نے اصرار کیا کہ ایک غزل اور عنایت کیجئے۔ شعری ارشاد فرما رہے ہیں ؎

" تیری دزدیدہ نگاہوں کو دعا دیتے ہیں
جتنا چبھتے ہیں یہ تیر اُتنا مزا دیتے ہیں
مسکراتے ہوئے پیغامِ وفا دیتے ہیں
دل کے انگاروں کو کیوں آپ ہوا دیتے ہیں
اپنی بربادی پہ خوش ہوں یہ سنا ہے جب سے
وہ مجھے اپنا سمجھتے ہیں مٹا دیتے ہیں "

اس شعر نے مشاعرہ میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اور شعری صاحب فرما رہے ہیں ؎

" ایسا اک وقت بھی آتا ہے محبت میں کہ جب
خود وہ گھبرا کے حجابات اُٹھا دیتے ہیں
اپنے دامن کو ذرا آپ بچائے رکھئے
سرد آہوں سے بھی ہم آگ لگا دیتے ہیں "

شعری صاحب بہت اچھی داد پاکر مائک سے ہٹے تو کنور صاحب نے اعلان فرمایا کہ اب فیض احمد فیض صاحب کلامِ بلاغت نظام سے محظوظ فرمائیں گے۔ فیض احمد فیض کا نام سُنا تو سامعین کی گردنیں اونچی ہو گئیں۔ چونکہ سامعین کا ذہن کرنل فیض احمد فیض کی طرف چلا گیا تھا جب فیض جھنجھانوی مائک پر تشریف لائے تو کرنل فیض احمد فیض کے پرستاروں کو مایوسی ہوئی۔ سنئے فیض صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

" ماہِ نو حلقۂ زنجیر بنا کر دیکھو
قوسِ ابرو، خمِ شمشیر بنا کر دیکھو
دل سے کس طرح لگایا ہے تمہارے غم کو
برگِ گل پر کوئی تصویر بنا کر دیکھو "

- - - - - - -

واقفِ غم، قائلِ حالِ پریشاں کر دیا
سر بزانو، سرنگوں، سر در گریباں کر دیا
اب میں کیا اس سے زیادہ دوں ثبوتِ جذبِ دل
اپنا آنسو اُن کی آنکھوں سے نمایاں کر دیا "

فیض جھنجھانوی کا کلام یقینی طور پر کرنل فیض کے کلام سے بہتر ہے لہٰذا اُنھیں داد بھی خوب ملی۔ فیض صاحب فرما رہے ہیں ؎

" ساغرِ بادہ سرِ جوش ہوا جاتا ہے
دیدۂ شاہدِ مے نوش ہوا جاتا ہے
وہی شوخی، وہی مستی، وہی خوشبو، وہی رنگ
پھول کھل کر تری آغوش ہوا جاتا ہے "

- - - - - - -

" تجلیاتِ شرار بار کو اسیرِ دامِ نگاہ کیجئے
پناہ لے آفتابِ محشر فضائیں اتنی سیاہ کیجئے
غریقِ موجِ شراب بھی ہے خیالِ زہد و ثنا بھی ہے
گناہ کیجئے تو صدقِ دل سے کوئی مکمل گناہ کیجئے "

شفیق صاحب بہت اچھی داد پا کر تشریف لے گئے تو کنور صاحب نے جناب گوپال متل ایڈیٹر "تحریک" سے کلام سُنانے کی گذارش کی۔ وقار و سنجیدگی کا پیکر گوپال متل رطب اللسان ہے ؎

شعر کہنے کا مزا ہے اب تو — دل کا ہر زخم ہرا ہے اب تو
آشنا بے طرفہ نہ تھا دل کا لہو — باغ دامن پہ کھِلا ہے اب تو
زندگی زندگی ہوتی تھی کبھی — مرنے جینے کی سزا ہے اب تو
تھا کوئی شخص مرا محرمِ دل — وہ مجھے بھول چکا ہے اب تو
دل کا یہ حال ہمیشہ تو نہ تھا — جانے کیا مجھ کو ہوا ہے اب تو
ہو گئے شہر بہ شہر ہوئے دیوانے — چاکِ دامن بھی سیا ہے اب تو

مُتل زمین کی اس پُر وقار غزل پر داد پانے کے بعد جناب متل صاحب اپنی جگہ تشریف لے آئے تو کنور صاحب نے جناب دِل لکھنوی کو دعوت نغمہ سرائی دی۔ کنور صاحب کی فرمائش پر دِل لکھنوی نے چند خمریاتی قطعات سُنا کر سامعین سے خوب داد پائی۔ اور غزل ارشاد فرما رہے ہیں۔

جیتیں ہیں دیکھے ان کو نہ آئے — اور دیکھوں تو دیکھا نہ جائے
ہے عجب چیز رازِ محبت — جتنا سمجھو سمجھ میں نہ آئے
اشکِ غم جھلملانے نہ پائے — آگئے کام پلکوں کے سائے
پیچ زلفوں کے وہ روئے روشن — جیسے گنگا میں سورج نہائے

داد و ستائش کے ریلے میں جناب دِل فرما رہے ہیں ؎

اے صبا چھو نہ زلفوں کو اُن کی — یہ بلا میرے سر ہو نہ جائے
دیکھ کر شیخ یوں رند بولے — خیریت! کیسے تشریف لائے "

شیخ صاحب کو خمریات سے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے۔ چنانچہ دِل صاحب کے یہ اشعار خوب داد پا رہے ہیں۔ دل صاحب غزل سُنانے کے بعد مائک سے ہٹنے لگے تو سامعین نے اصرار فرمایا کہ ایک غزل اور سُنائی جائے۔ چنانچہ دل صاحب ارشاد فرما رہے ہیں

" زندگی کچھ بھی نہ تھی عشق و وفا سے پہلے
راہرو نیند میں تھے بانگِ درا سے پہلے
ہم بھی دیکھیں گے کہ ایماں کی حقیقت کیا ہے
توبہ توڑے تو سہی ساون کی گھٹا سے پہلے "

اس غزل پر بھی دل صاحب نے خوب داد پائی ہے۔ لیجئے اب جناب نظر بارہ بنکوی مائک پر تشریف لائے ہیں اور نغمہ سرا ہیں ؎

" کئی بار اُس نے رُلایا ہنسی میں
کئی حشر آئے مری زندگی میں
مجھے مار ڈالا ہنسی ہی ہنسی میں
مزا موت کا آگیا زندگی میں
مصیبت پڑی تو خدا یاد آیا
بڑا فرق نکلا خدا اور خودی میں
خفا ہو چکے اب ذرا مسکرا دو
قیامت بھی ہم دیکھ لیں زندگی میں
نظر آج ساقی سے نظریں ملا کر
اندھیرے سے ہم آگئے روشنی میں "

نظر صاحب غزل سُنا کر اور بہت اچھی داد پا کر مائک سے ہٹے تو کنور صاحب نے جناب بیکل اُتساہی سے التماس کیا ہے کہ وہ مائک پر آئیں اور سامعین کو محظوظ فرمائیں۔ بیکل صاحب نے ایک گیت "حادثوں کے بعد" سُنایا اور خوب داد پائی آپ بھی یہ گیت سنئے۔ ؎

اے مری فکر! مری تابِ نظر!
پہلے جلووں کو نظاروں میں بکھر جانے دے۔ پھر کوئی گیت لکھوں
غنچۂ گل ہیں ابھی حُسنِ تبسم پہ نثار
ہے ابھی چاند ستاروں کی لگن وقفِ سحر
ہے چمن زار کی مُسکان بھی پابندِ بہار
منزل ابھی تکمیں ہے منزل کا ہر اک راہ گذر
وقت کے سر سے یہ جادو تو اتر جانے دے۔ پھر کوئی گیت لکھوں
نازکو سوئے کے دُزدیدہ نگاہی کی ادا
آئینہ ٹوٹ گیا تھک بھی گئی انگڑائی
بانہہ پھیلائے ہے پونم کی طرف کالی گھٹا
ناگ بل کھائے ہیں مرمر پہ چلی پُروائی
حُسن کا یوں بھی تو انداز سنور جانے دے۔ پھر کوئی گیت لکھوں
دیکھو وہ اُٹھتا ہے کیا رسکے دامن دھواں
وہ اُبھر آئی ہے ماحول کے ماتھے پہ شکن
وہ سُلگتا ہوا تعمیر و ترقی کا مکاں
وہ جھلستا ہوا تہذیب و تمدن کا بدن
ٹھہر یہ قافلۂ برق و شرر جانے دے۔ پھر کوئی گیت لکھوں
اے مری فکر!

گیت سُنانے اور داد پانے کے بعد بیکل صاحب اپنی جگہ پر آنے لگے تو کنور صاحب نے فرمائش کی کہ بیکل صاحب اپنے دو مشہور گیت "یقین" اور "مشورے" سنائیں۔ چنانچہ بیکل صاحب نے یہ دونوں گیت سُنا کر اہلِ کرنال سے خوب خوب داد پائی۔ کنور صاحب فرما رہے ہیں کہ اب ایک واجب التعظیم شاعر حضرت قبلہ صولت ٹونکی کلام عطا فرمائیں گے۔ قبلہ صولت صاحب نہ صرف بلحاظِ شاعری اُستادانہ مقام رکھتے ہیں بلکہ روحانیت میں بھی اُن کا ایک خاص مقام ہے۔ لیجئے قبلہ صولت صاحب مائک پر تشریف لے آئے ہیں۔ زبانِ مبارک سے عطا ہوا ہے ؎

" بام و در مطلعِ انوار نظر آتے ہیں
اُن کے آنے کے سے آثار نظر آتے ہیں "

مطلع، مطلعِ انوار ہے۔ شعراء اور سامعین نے دِل کھول کر داد دی ہے۔ قبلہ فرما رہے ہیں ؎

" صرف انوار ہی انوار نظر آتے ہیں
خود کہاں وہ دمِ دیدار نظر آتے ہیں "

اس شعر نے مشاعرہ میں ایک نئی روح پھونک دی قبلہ جوش ملیح آبادی اور صاحبِ صدر نے مطلعِ ثانی کو تین بار پڑھوایا ہے۔ سنئے صولت صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

یا الٰہی وہ کبھی مجھ سے کشیدہ نہ رہیں
جب وہ کھنچ جاتے ہیں تلوار نظر آتے ہیں

صاحبِ صدر، قبلہ جوش، کنور صاحب اور دیگر شعراء نے اس شعر پر بھی خوب خوب داد دی ہے اور قبلہ فرما رہے ہیں ؎

لمحہ بھر کو بھی اگر اُن کا تصور نہ رہے
کیا عجب تک در و دیوار نظر آتے ہیں

واہ ہے اگر بس مشاعرہ پھر سے جوان ہوتا نظر آ رہا ہے۔ قبلہ سے یہ شعر تین مرتبہ پڑھوایا گیا ہے اور داد کی آوازیں تھمیں تو صولت صاحب سامعین پر یوں ظلم ڈھا رہے ہیں ؎

ہے یہی حُسن سراپا مجموعۂ سخن
آپ میں سب مرے اشعار نظر آتے ہیں

نوپال متل صاحب فرما رہے ہیں کہ صولت صاحب
کی غزل حاصلِ مشاعرہ ہے۔ اس شعر پر تو داد
کے شور سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے
رہی۔ یہ شعر بھی قبلہ نے دو تین بار سنایا ہے۔
سنیئے ارشاد ہو رہا ہے ؎

حسبِ دلخواہ نظارا نہیں ہونے پاتا
یوں نظر آنے کو سو بار نظر آتے ہیں
حسنِ کامل کا یہ عالم ہے کہ اُن کے منہ سے
پھول جھڑتے دمِ گفتار نظر آتے ہیں

داد کا وہی عالم ہے اور صولت صاحب فرما رہے ہیں ؎

مجمع رشک ہے یا حشر کا میداں یارب
سینکڑوں طالبِ دیدار نظر آتے ہیں

جوش فرما رہے ہیں پھر ارشاد فرمائیے۔ صاحب صدر
جی بھر کر داد دے رہے ہیں۔ ہر شعر پر قابلِ رشک
داد پانے کے بعد قبلہ مقطع عطا فرما رہے ہیں ؎

آپ تو حضرتِ صولت دمِ دیدارِ جمال
صورتِ نقش بہ دیوار" نظر آتے ہیں "

- - - - - - - -

قبلہ صولت صاحب اپنی جگہ پر تشریف لائے
کنور صاحب نے نہایت احترام کے ساتھ جوش
ملیح آبادی سے کلام ارشاد فرمانے کی استدعا کی ہے
سامعین نے پُرجوش اور طویل تالیوں سے جوش
صاحب کا خیر مقدم کیا ہے۔ سنیئے قبلہ کیا فرما رہے
ہیں۔ رُباعی ہے تو بہت پرانی مگر پرانی شراب کی طرح
زیادہ لطف دے رہی ہے ؎

مرضی ہو تو سُولی پہ چڑھانا یارب
سو بار جہنم میں جلانا یارب
معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ"
تا جینے کو یہ دن نہ دکھانا یارب "

داد کا شور ہے کہ شورِ قیامت کا دھوکہ ہونے لگا
ہے۔ سنیئے جوش صاحب کیا قیامت ڈھا رہے ہیں ؎

دُنیا کا عجب دَور نظر آتا ہے
بگڑا ہوا ہر طور نظر آتا ہے
حیرت ہے کہ جب آئینہ میں دیکھتا ہوں
بوڑھا سا کوئی اور نظر آتا ہے "

قبلہ صولت صاحب نے اس رُباعی پر دل کھول کر
داد دی ہے۔ کیونکہ قبلہ صولت صاحب بھی جب
آئینہ دیکھتے ہیں تو انھیں بھی بوڑھا سا کوئی اور نظر
آتا ہے۔ جوش صاحب فرما رہے ہیں ؎

" ہم دیکھ کے مہ وشوں کو کیا کہتے ہیں
اتنا ہی کہ بس صلِّ علیٰ کہتے ہیں
لیکن یہ غلامِ زر بایں ریشِ دراز
موقع ہو تو ہر بُت کو خدا کہتے ہیں "

- - - - - - - -

" کیا فائدہ شیخ کچھ کہنے میں مجھے
خشکی میں تجھے لطف سفینے میں مجھے
عیاش تو دونوں ہیں مگر فرق یہ ہے
کھانے میں تجھے مزا ہے پینے میں مجھے "

" کیا شیخ نے گالی ترانی کر کے
توہینِ مزاجِ زندگانی کر کے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انھیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے "

- - - - - - - -

رباعیات پر خوب خوب داد پانے کے بعد
جوش صاحب نے نظم " مینی فیسٹو" اور ایک دو
اور نظمیں سُنائیں ہیں اور جی بھر کر داد پائی ہے۔
قریباً ڈیڑھ بجے بعد دوپہر کنور صاحب نے اعلان
فرمایا ہے کہ مشاعرہ کی یہ یادگار محفل برخاست کی
جاتی ہے - - - - - - -

حاصلِ مطالعہ

"مراجعت"

روحی دہلوی

ایک عورت اپنے شوہر سے جنسی خیانت کرتی تھی۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد اس کا ضمیر اس خیانت اور بے وفائی پر اُسے ملامت کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنا ذہنی سکون کھو بیٹھی۔

وہ اپنے آپ کو خود حقیر سمجھنے لگی۔ اس کا یہ احساس اس حد تک بڑھا کہ وہ اپنے بچوں کو بھی پیار کرنے سے ڈرتی تھی کہ مبادا وہ بھی اس کی بے وفائی سے ملوث ہو جائیں۔ غلطی کا احساس اتنا شدید ہو گیا کہ وہ اپنے شوہر سے آنکھ ملاتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی دونوں آنکھوں میں اس کی خیانت اور بے وفائی کے آثار دیکھ لے۔ وہ اپنے آپ کو اس قدر حقیر سمجھنے لگی کہ نہ وہ سو سکتی تھی اور نہ ہنس سکتی تھی اب اسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ آرام کرنے کھانے اور خوش ہونے کی مستحق ہی نہیں۔ وہ اپنے ضمیر کی آواز اور احساسِ حقارت کی زیادہ دیر تک تاب نہ لا سکی۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائے گی چاہے اُسے کچھ بھی تکلیف سہنی پڑے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی ساری بے وفائی کی داستان اپنے شوہر کو کہہ سنائے گی۔ شاید وہ اسے معاف کر دے اور اس ذہنی کوفت سے نجات دلا دے جو اسے اس کے ضمیر کی ملامت کے باعث برداشت کرنی پڑتی تھی۔

کئی مہینے گزر گئے اور وہ پاک صاف رہی اس لئے کہ کوئی جنسی خیانت سرزد نہیں ہوئی۔ وہ روز ارادہ کرتی تھی کہ اپنے شوہر کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرلے۔ لیکن پھر اُسے ہمت نہ ہوتی وہ ڈرتی تھی۔ کبھی یہ ڈر کہ وہ اسے مار ڈالے گا کبھی یہ ڈر کہ وہ اسے طلاق دے دے گا۔ اُسے چھوڑ دے گا اور بچوں کو بھی الگ کر دے گا۔

آخر کار اس میں اتنی ہمت ہوئی کہ وہ اپنے خوف پر غالب آکر اپنی غلطی کا اعتراف کرلے۔ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ اس کا اعتراف کر لیا۔

اس کا شوہر خاموش رہا۔ کئی دنوں تک مستقل خاموش رہا۔ اس طویل خاموشی نے اس عورت کو اور زیادہ حیرت میں ڈال دیا وہ کچھ سوچ رہا ہے؟ اس کے لئے کیا فیصلہ کر رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک پستول خریدنا چاہتا ہے جس سے وہ اس کو مار ڈالے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ محکمۂ طلاق میں جانے والا ہے کہ چپکے سے اُسے طلاق دے دے؟

کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔ یہاں تک کہ وہ عورت فکر سے پاگل ہونے لگی۔

پھر اُس کے شوہر نے اس سے بات کی۔

اُس نے کہا کہ اُس نے معاف کر دیا۔

اس کے معاف کر دینے سے اس عورت نے خوش ہونے کی کوشش کی اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہا لیکن اُس کی یہ خوشی وقتی تھی یہ خوشی ایسی ہی عارضی تھی جیسے کہ ایک چراغ کی روشنی جس میں تیل نہ ہو اور وہ فوراً ہی گل ہو جائے اب خوشی کی جگہ ایک عجیب قسم کے احساس نے لے لی۔ اس احساس کی وہ شروع میں تفسیر نہ کر سکی لیکن آہستہ آہستہ اُسے اندازہ ہوا کہ حقارت کا احساس ہے۔ اس مرتبہ وہ اپنے آپ کو حقیر نہیں سمجھ رہی تھی بلکہ وہ اپنے شوہر کو حقیر سمجھ رہی تھی۔ وہ شوہر جس نے اُسے معاف کر دیا تھا۔

اُسے مار ہی نہیں ڈالا اور نہ ہی اُسے طلاق دی۔

اپنے شوہر کے لئے حقارت اور نفرت اس کے دل میں بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ برداشت سے باہر ہو گئی۔

اب اُس کے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ ایک ایسا حل تلاش کرے جس کے ذریعہ وہ اس شدید نفرت کا مُقابلہ کر سکے اور وہ اس شخص کے گھر میں رہ سکے جسے وہ اس قدر حقیر اور قابلِ نفرت سمجھتی ہے

اس نے وہ حل نکال لیا۔

وہ پھر جنسی بے وفائی کی طرف لوٹ آئی۔

آخری موقع۔

ڈائریکٹر نے دفتر آکر کلرک سے پوچھا:۔

"اکاونٹنٹ کہاں ہے؟"

کلرک نے جواب دیا۔ "وہ ریس میں گیا ہے۔"

ڈائریکٹر نے خفا ہو کر کہا:۔ کیا کہا ریس میں؟ دفتری اوقات میں وہ ریس میں جاتا ہے؟۔

کلرک نے جواب دیا:۔ "جی ہاں! کیونکہ ایک بڑی حسابی گڑبڑ ٹھیک کرنے کا یہ اس کے لئے آخری موقعہ ہے۔"

رحمدل:۔

ایک عورت سے جس پر اپنے شوہر کو زہر دے کر مارنے کا الزام تھا مُقدمہ کے دوران میں وکیل نے پوچھا۔

"جب تم اپنے شوہر کو چائے میں زہر ملا کر دے رہی تھیں تو تمہیں اس پر ترس نہیں آیا؟"

عورت نے جواب دیا۔ "ہاں آیا تھا — جب اُس نے دوسری پیالی مانگی۔"

عورت اور خاموشی :۔

ایک بار گراموفون کے موجد ٹامس ایڈیسن سے ایک صاحبہ کی ملاقات ہوئی۔ وہ صاحبہ بہت باتونی تھیں۔ ہر وقت زبان چلتے ہی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹامس ایڈیسن کے بالکل نزدیک آئیں اور پوچھنے لگیں :۔

"کیا واقعی آپ نے ہی بولنے والی مشین بنائی ہے؟"

ٹامس ایڈیسن نے نہایت ادب سے کہا :۔

"آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ بولنے والی مشین میں نے بنائی ہے۔ اُسے تو خود خدا نے بنایا ہے میں نے تو صرف ایسی مشین بنائی ہے جس کا بولنا جب جی چاہے بند کیا جا سکتا ہے"

دیکھتے جاؤ :۔

شملہ میں کچھ نوجوان کسی ہال میں ڈرامہ کر رہے تھے جس کا نام تھا "تمنا"۔ پنڈت ہری چند اختر بھی ایک تماشائی کی حیثیت سے جب وہاں پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ ڈرامے کی ہیروئن کسی بات پر ناراض ہو کر ابھی ابھی وہاں سے اپنے گھر چلی گئی ہے اور ڈرامے کے منتظمین بے حد پریشان ہیں۔

اختر صاحب نے ایک لمحہ کے لئے صورت کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کے بعد منتظمین اور تماشائیوں سے خطاب کرتے ہوئے شعر موزوں کیا۔

"تھی جس پہ کامیابی منحصر چل دی وہی لڑکی
"تمنا" کی جگہ خونِ تمنا دیکھتے جاؤ"

مگر بل نہیں گیا :۔

ایک معزز آدمی استبدادِ زمانہ کے باعث انتہائی غریب ہو گیا تھا۔ تن کے کپڑے تک بک گئے۔ گھر کے زیورات، برتن، فرنیچر افلاس کا شکار ہو گئے۔ پاس ایک پھوٹی کوڑی تک بھی نہ رہی۔ سارا گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ مگر اُس کے دروازے پر یہ بورڈ بدستور لٹکتا رہا کہ :۔ "بغیر اجازت اندر آنا منع ہے"

بہادری :۔

عدالت میں جب ایک خاتون بحیثیتِ گواہ اپنا بیان دے چکیں تو مجسٹریٹ نے کہا :۔

"تم نے گھبرانے کے بجائے چور کی جس طرح مرمت کی اس سے تمہاری بہادری کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ عورتیں تم سے یقیناً سبق لیں گی جو چور کو دیکھ کر جن کے اوسان ختم ہو جاتے ہیں"

مجسٹریٹ کی بات سُن کر خاتون نے کہا :۔

"دراصل میں تو یہ سمجھی تھی کہ میرا شوہر ہے جو میرے سمجھانے کے باوجود پھر دیر سے گھر آیا ہے"

ناردرن ریلوے
آپ کی روزمرہ زندگی سے وابستہ ہے



ذرا سوچیئے ۔

● ناردرن ریلوے ان گنت طریقوں سے آپ کی زندگی کو آرام دہ بناتی ہے ۔ سماجی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو ریلوے سے ہم رشتہ نہ ہو ۔

ایک حیات بخش وسیلہ جو کروڑوں کو غذا ' ایندھن اور انرجی فراہم کرتا ہے ۔ ریلوے مختلف علاقوں کو باہم جوڑنے والی مضبوط کڑی ہے ۔



● ناردرن ریلوے آپ کے فرصت کے لمحات کو زیادہ پر لطف بناتی ہے ۔ یہ آپ کو مختلف قدرتی مناظر' راجستھان کے تپتے ہوئے ریگستانوں سے ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں' پنجاب' ہریانہ اور اترپردیش کے سرسبز و شاداب میدانوں میں لے جاتی ہے ۔

● تقریباً ۱۲۵ سالوں سے ریلوے ہر طرح قومی ترقیاتی پروگراموں' نقل و حمل' زرعی ترقی' بجلی کی پیداوار' صنعتی ترقی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے ۔

● ناردرن ریلوے روزانہ ۹۰۰ میل' ایکسپریس اور پسنجر ٹرینوں میں ۱۱ لاکھ مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچاتی ہے اور روزانہ چھ سو مال گاڑیوں میں ۲ لاکھ ٹن مال ڈھویا جاتا ہے ۔

ناردرن ریلوے کی روزانہ کارگزاریوں میں شامل ہیں ـــــ ● ۴۷،۰۰۰ ٹن اناج کی شمال کے زرعی علاقوں سے مختلف حصوں کو ترسیل ۔
● ۶۲،۰۰۰ ٹن کوئلہ صنعتی کاموں کیلئے پہنچانا ۔ ● ۱۵،۰۰۰ ٹن پیٹرولیم کی پیداوار کی آمد و رفت ۔ ● ۱۷،۰۰۰ ٹن کھاد ڈھونا ۔

یہ سب ملک میں خود اعتمادی اور خودداری کی فضا تیار کرنے میں معاون ہیں ۔
خاموشی سے' مگر یقینی طور پر ناردرن ریلوے کروڑوں باشندوں کے بہتر مستقبل کے لئے سرگرم ہے ۔
ریل پٹریوں کا مضبوط جال' زندگی کو قائم رکھنے والی رگوں اور نسوں کی طرح کام کر رہا ہے ۔

ناردرن ریلوے



اَٹھانوے

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

صُبح سات بجے ہم سات آدمی مندر میں نئی مورتی استھاپنا اُتسو کے لیے ایک فنڈ کی صورت میں چندہ مانگنے سیٹھ جنا داس جوہری کی کوٹھی پر پہنچے۔ حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ بڑے آدمی دیر سے سوتے ہیں اور دیر تک سوتے ہیں پھر بھی ہم احتیاطاً جلدی اس لیے پہنچ گئے کہ وہ کہیں باہر نہ چلے جائیں کیونکہ بڑے آدمیوں کو کام بھی بہت ہوتے ہیں۔ پتہ چلا کہ سیٹھ جی اندر ہی براجمان ہیں۔ چنانچہ ہم سب بیرونی لان میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور دور تک ترتیب میں رکھے بے شمار ماربل کے گملوں میں مختلف قسم کے پودوں کی بہار دیکھتے رہے۔ طرح طرح کے پھول، پودے اور دیدہ زیب بیل بوٹے سجی ہوئی بیلیں من موہ رہی تھیں۔ امیر لوگ اپنا دل ہی بہلانے کے لیے جتنا روپیہ صرف کر دیتے ہیں اُتنے روپئے سے کسی معمولی آدمی کے خاندان کی قسمت بدل سکتی ہے۔ میں ایسا سوچ ہی رہا تھا کہ سیٹھ جی کے کمرہ سے سولہ سنگار کیے ہوئے، نیلی ساڑی میں ملبوس ایک شعلہ بدن حسینہ باہر آئی۔ سب کی نظریں اُس کی طرف کھنچ گئیں۔ اتفاق سے میری کرسی کا رُخ پہلے ہی سے کمرے کے دروازے کی طرف تھا اس لئے یہ جلوہ میرے حصے میں کچھ زیادہ آیا۔ اس آفتِ جاں کے چہرے پر ٹھوڑی کے نیچے چھوٹا سا کالا تل اس کے حُسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ کمرہ سے کوٹھی کے مین گیٹ تک جاتے جاتے اس سراپا غزل کے خدوخال میرے ذہن میں ایسے اُجاگر ہو گئے کہ میں اُسے ہزاروں میں پہچان لوں۔

حُسن کے سامنے فرشتے بھی ڈگمگا جاتے ہیں اور حُسن میں کیسا جادو ہوتا ہے یہ حقیقت مجھ پر آج ہی منکشف ہوئی۔ میرے ایک ساتھی نے کہا، "بھگوان کسی کسی کو تو بہت سنوار کر بناتا ہے" یہ سُن کر دوسرا ساتھی بولا "کیا پسند آ گئی؟"

پہلے والے کہنے لگے، "پسند ناپسند دوسری بات ہے، لیکن کیا حسین کو حسین کہنا گناہ ہے؟"

"جی ہاں" دوسرے نے زور دے کر کہا "اگر آپ کو شک ہے تو کسی حسین عورت کے سامنے اُس کے حُسن کی تعریف کر کے دیکھ لیجیے۔ دیکھئے کیا جواب ملتا ہے۔"

یہ سُنتے ہی سب نے ایک آواز ہو کر اُس کی تائید کی۔ میں نے بھی اس حقیقت سے انکار نہ کیا۔ تعریف میں جادو ہوتا ہے۔ تعریف کرنے و... راجاؤں، نوابوں کے ناک کے بال بن جاتے ہیں اور تعریف سُن کر بڑے بڑے ... بھی خوش ہوتے ہیں، مگر عورتیں اس معاملہ ... برعکس نظر آتی ہیں۔ وہ کسی بھی غیر مرد سے اپنی تعریف سُننا گوارہ نہیں کرتیں (حالاں کہ دل ہی دل میں اپنی تعریف سُن کر تعریف کرنے والے کی ممنونِ احسان ہوتی ہیں مگر دکھانے کے لئے ایسے ظاہر کرتی ہے کہ وہ اسے نسوانی... کے خلاف سمجھتی ہے)

کیا ہر عورت کسی غیر مرد سے اپنی تعریف سُن کر دلی یا محض دکھاوے کے طور پر بُرا مانتی ہے یا کچھ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو کھلے بندوں پسند کرتی ہیں۔ ان دونوں اقسام کی عورتوں کے نسوانی جذبات میں کیا فرق ہوتا ہے، میرے دماغ میں یکے بعد دیگرے اسی قسم کے سوالات لیتے رہے۔

میں نے ایم۔ اے کرتے وقت سوچا تھا کہ اسی ٹاپک پر پی۔ ایچ۔ ڈی کروں گا، لیکن کسی وجہ سے میں ایسا نہ کر سکا۔ مگر میرے دل

ضرورت ہی اللہ آج میں سے یہ اولوہ کر لیا کہ اسی مسئلے کو لے کر ایک کتاب ترتیب دوں۔ میں خیالات کے تانے بانے میں اُلجھا ہوا تھا کہ سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ سیٹھ جی باہر لان میں آگئے تھے۔ میں بھی فوراً استقبال کے لئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"آپ لوگوں نے کیسے زحمت فرمائی ہے" مُسکراتے ہوئے سیٹھ جی نے پوچھا۔ ساتھیوں نے مُدّعا ظاہر کیا تو سیٹھ جی بولے۔

"آپ لوگ اِس گیان دگیان کے یُگ میں بھی اندھ وشواسی بنے ہوئے ہیں۔ پُرانی لکیر کے فقیر بنے رہنے کے زمانے تو جا چکے۔ پتھّر کی بے جان مورتی کے لئے کچھ کرنے سے تو کہیں اچھا ہے کہ چندہ کر کے کسی فٹ پاتھ پر پڑے بے سہارا اپنگ کے لئے کچا گھر بنا کر دے دیا جائے۔"

میرے دل میں آیا کہ اُن سے پوچھوں کہ سیٹھ جی کبھی آپ نے کسی ایسے کنبہ کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے، مگر معاً مجھے خیال آیا کہ ہم بھیک یا چندہ مانگنے والوں کو عاجزی سے کام لینا چاہیئے۔ انکساری اللہ کو بھی پیاری ہوتی ہے۔ اِس لئے میں خاموش رہا۔ مگر میرے ایک ساتھی نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

"سیٹھ جی! دھرم کے کام میں اُپدیش دینا یا بحث کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کچھ مدد کرنا ہو تو عنایت کر دیجئے، نہیں تو جانے دیجئے۔"

یہ سُنتے ہی وہ نرم ہو گئے اور اکیاون روپئے دے کر اندر چلے گئے۔ اس کے بعد ہم سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے آئے، اور نجی کاموں میں مصروف ہو گئے۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد، میں اپنی دُھن میں مصروف ہو گیا۔ کیوں کہ عورت کی اِس سیرت پر مجھے کام کرنا ضرور تھا، اس لئے میں نے سب سے پہلے بازارِ حُسن کی ایک طوائف سے اِس زمرہ میں اُس کے خیالات جاننے کی بسم اللہ کی۔

کسی غیر عورت سے خصوصاً طوائف سے ہم کلام ہونے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ جس طرح بابرنے پانی پت کے میدان میں آنے سے پیشتر بڑی ہمّت سے کام لیا ہوگا، اسی طرح میں نے بھی مضبوط ارادے کے ساتھ مگر لرزتے ہونٹوں اور کانپتے جسم پر بظاہر کنٹرول کرتے ہوئے ایک طوائف سے اُس کا حَسَب نَسَب پُوچھا مگر مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ اُس نے اپنا تعارف صحیح نہیں دیا، جس پر میں نے اندازِ گفتگو بدلتے ہوئے شاعرانہ انداز میں اُس کے حسن و شباب کی مدح سرائی شروع کی، جسے وہ سُنتی رہی اور مُسکراتی رہی، جب میں خاموش ہُوا تو اُس نے نہایت مؤدبانہ انداز میں میرا شکریہ ادا کیا اور گاہے گاہے آتے رہنے کی فرمائش کی اور میں نے پھر آنے کا وعدہ کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

بقولِ منٹو کسی مہم میں اگر پہلا ہی قدم کامیاب ہو جاتا ہے تو حوصلہ کو پختگی اور جذبات کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے آج کی اپنی کامیابی کو من وعن اپنی ڈائری میں لکھ لیا۔

دوسرے دن میں نے کالج سے آتی ہوئی ایک تنہا لڑکی کو روک کر خاصے شریفانہ انداز میں اور مناسب الفاظ میں اُس کی خوبصورتی اور مُتناسب چال ڈھال کی تعریف کی۔ اُس نے کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا بلکہ حیرانی سے مجھے تکتے ہوئے بغیر کچھ بولے، چہرے پر کسی قدر نفرت کا اظہار لئے ہوئے، اور مجھے شریف نہ سمجھتے ہوئے نسوانی انداز میں بُرا بھلا کہنے لگی۔ مجھے اپنی آبرو خطرے میں نظر آنے لگی تو میں نے "بہن جی معاف کرنا" کہتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا اور کہا کہ میں ایک ریسرچ اسکالر ہوں۔ ایک تھیسس لکھ رہا ہوں جس میں اکثر عورتوں سے کئے گئے ایک ہی سوال کے مختلف جواب درج کئے جائیں گے۔ اس طرح میں نے اس کالج گرل سے گلو خلاصی کرائی۔

میرے تجربات کی تحقیقی کتاب میں یہ دوسرا واقعہ درج ہُوا۔

اِس کے بعد میں نے فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے والی سے لے کر، ساگ سبزی، گوشت، مچھلی، کھلونے، تیل، گھاس، چوڑیاں، پان، پھل بیچنے والی اور زیرِ تعمیر کوٹھیوں پر مزدوروں کے ساتھ کام کرنے والی عورتوں، گوبر تھاپنے والی چماری، کھیت پر کام کرنے والی کسان عورت، دھان کوٹنے والی، پتھّر توڑنے والی محنت کش، کپڑے بُننے والی جولاہی، برتن صاف کرنے والی کہاری، کھانا بنانے والی مصرانی، اناج پیسنے والی پسنہاری، بچّہ پالنے والی دایا، مہترانی، دھوبن، سیلس گرل، نرس، ہیلتھ وزیٹر، ڈاکٹرنی، اُستانی تک پوری اٹھانوے عورتوں سے مل کر یہی سوال کیا اور طرح طرح کی کھری کھوٹی سُننے کے بعد یہی کہنا پڑا کہ ہر عورت نے مجھے پھٹکار سنائی۔ کہیں کہیں تو پٹنے کی نوبت بھی آگئی۔

اب تک اٹھانوے انٹرویوز میری تحقیقی کتاب میں درج ہو چکے تھے۔ کرکٹ کے کھلاڑیوں کی طرح اب میری سینچری میں صرف دو کی کمی رہ گئی تھی۔ میں نے اگلے دن بازار میں کاسمیٹکس کی دُکان پر ایک گداز جسم، تیس سالہ نہایت ہی حسین لیڈی سے بات شروع کر دی۔ اب میرے بات کہنے کا ڈھنگ کافی نکھرا اور نیا تُلا ہو چلا تھا میری جھجھک بھی جاتی رہی تھی۔ اس معاملے میں نے شروع سے اِس فارمولے پر عمل کیا کہ جب بھی کسی عورت سے مخاطب ہُوا تو اُسے اکیلی پا کر ہی یہ جُرأت کی

میں نے اس سے سلسلۂ کلام دھڑکتے دل اور کسی حد تک ہکلاہٹ کے ساتھ شروع کیا کیونکہ یہ "سینچری لیڈی" کافی حسین تھی کیونکہ یہ اتنی خوبصورت تھی کہ میں اس کے حسن و جمال کی تاب نہ لاسکا اور دوران گفتگو اُس کے چہرے پر بھی سرسری نظر ڈال لیا کرتا تھا۔ میں نے اُس کے حُسن و شباب کی خوب تعریف کی۔ اُس کے چہرے پر دوسری عورتوں کی طرح نہ تو کوئی شکن آئی اور نہ ہی اس نے مجھے پھٹکارا جیسی کہ مجھے اُمید تھی جب میں نے سلسلۂ کلام بند کیا تو اس نے بڑے مہذبانہ انداز میں مُسکراتے ہوئے میرا شکریہ ادا کیا۔ تھینک یو کہنے کا طریقہ بہت ہی ماڈرن اور دلکش تھا۔ میری جان میں جان آگئی۔ مجھے دورِ حاضر کی تہذیب و تمیز اور خوش خلقی پسند آئی۔ اِس

ماڈرن لیڈی سے بیلے والے انٹاؤنے کیسوں کی تلخ تجربہ کاری اور ضرب کاری نیز دل خراش پھٹکار اور دل شکن جھڑکیوں سبھی کو بھلا دیا۔ میں پھر تروتازہ ہو گیا۔ میری تکان اُتر گئی آج میں نے یہ سمجھ لیا کہ ہمارے سماج میں صرف دو فیصد ہی لکھنوی تہذیب اور خوش اخلاقی باقی رہ گئی ہے۔ اس عورت پر میری سَو عورتوں والی ریسرچ تو پوری ہو گئی مگر یہ بات اُدھوری رہ گئی تھی کہ حسن کی تعریف پر ناخوش ہونے والی اٹھانوے فی صد مستورات اور خوش ہونے والی دو فیصد لیڈیز کی نیچر میں کیا فرق تھا۔ طوائف کی نیچر سے تو سبھی واقف ہیں لیکن آخری لیڈی تو طوائف نہیں ہو سکتی ہاں موڈرن عورت ہو سکتی ہے یا نئی تعلیم یافتہ لیڈی۔ یہ آخری عورت میری ریسرچ کے لئے کئی ضمنی سوالات کی موجب بن گئی اور میں دوسرے دن شام کو اس کے دیئے ہوئے پتہ پر اس کے مکان پر حاضر ہوا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ شریفانہ انداز میں ہلکی سی دستک دی مگر دروازہ نہیں کھُلا۔ کچھ دیر بعد پھر دستک دی، مگر دروازہ حسب سابق بند رہا۔ لہٰذا دروازہ کھُلنے کے انتظار میں خاموشی کے ساتھ برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

ماحول بالکل پُرسکون تھا۔ کچھ دیر بعد کمرے میں "چٹ" سے سوئچ آن ہونے کی آواز آئی اور کمرے میں ہوئی روشنی سے کرنیں دروازے کے نیچے سے دکھائی دینے لگیں۔

میں منتظر بیٹھا تھا۔ کچھ لمحے بعد دروازہ کھُلا اور ایک آدمی باہر آیا۔ اُس نے بڑے بھولے انداز سے مجھ سے پوچھا "کیا آپ بہن جی سے ملنے آئے ہیں" اُس کا سینہ سانس کے مریض کی طرح بار بار پھول رہا تھا۔

"بہن جی" میں نے اُس کا جائزہ لیتے ہوئے دل ہی دل میں اُس کے مُنہ سے نکلے الفاظ کو نفرت سے دوہرایا اور کہا اس کمینے ناپاک نے تو اتنے پاک صاف جذبات سے بھرپور رشتے "بہن" کے لفظی ہی نہیں لغوی معنیٰ بھی بدل کر رکھ دیئے۔ ایسے لوگ تو دھندہ کرنے والی کسی سے بھی گئے گزرے ہوگئے۔ وہ جو کچھ کرتی ہے ایک اصول کے ساتھ کرتی ہے لیکن اس کے ظاہر و باطن اور قول و فعل میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اور وہ میرے جواب کے لئے میرا منہ تک رہا تھا۔ میں نے فوراً کہاں "جی ہاں، مجھے اُن سے ملنا ہے"

"کیا کسی لڑکی کا ٹیوشن طے کرنا ہے؟"

"جی ہاں" میں نے فوراً کہا۔ کیوں کہ میں اب یہ سمجھ چکا تھا کہ یہ عورت کسی اسکول میں ماسٹرنی ضرور ہے۔ "آپ بھی اسی کام سے آئے تھے کیا؟" میں نے ذرا چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

"جی نہیں! میرا اور کام تھا" اُس نے جاتے جاتے کہا۔

اب میرے دماغ میں اس شک نے جنم لیا کہ یہ عورت گھر گھر جا کر ٹیوشن پڑھانے کے بہانے سے یہ دھندا کرتی ہے۔ اندر سے برابر چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز آرہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بن سنور رہی تھی۔ ادھر مجھے اُس آدمی پر حیرت ہو رہی تھی۔ کتنا بدچلن اور بد اخلاق شخص تھا وہ — بہن جی نہ کہہ کر ماسٹرنی جی بھی تو کہہ سکتا تھا میں سمجھتا ہوں ناپاک اور بدچلن لوگ محض دوسروں کی نظر میں خود کو پاک صاف ثابت کرنے کے لئے اکثر اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ باہر آئی۔ میں نے بہ غور اُسے دیکھا۔ اُس کی ٹھوڑی پر تل تھا۔ میں سمجھ گیا یہ وہی عورت ہے جو سیٹھ جی کی کوٹھی سے نکلتی دیکھی تھی۔ میں نے اُسے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا۔ کہیں دھن کو سلام ہوتا ہے کہیں فن کو یہاں اِن دونوں میں سے کچھ نہیں تھا۔

"نمستے بھائی صاحب!" اُس نے مہندی رچے ہاتھوں کو بڑے دلربانہ انداز میں جوڑ کر سرخ ہونٹوں پر مسکان پھیلاتے ہوئے میری نمستے کا جواب دیا۔ اور ڈاکٹروں جیسی خوش مزاجی سے پوچھا "آپ کو یہاں کھڑے کتنی دیر ہو گئی ہے؟" میں اس کے اس سوال کا مُدعا سمجھ گیا تھا اس لئے میں نے کہا۔

"ابھی ابھی آیا ہوں"

"کیا آپ کو ہمارے اسکول کا چپراسی جاتا ہوا سے جلتے ہوئے نہیں ملا؟" اس نے مطمئن ہونے کے خیال سے یہ دوسرا سوال کیا۔

"میں نے کسی کو نہیں دیکھا" جس سے اُس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں! آیئے اندر بیٹھتے ہیں"۔ اُس نے نہایت خوش اخلاقی سے مجھے اندر وا لے کمرے میں لیجا کر صوفہ پر بٹھایا۔ وہ مجھ سے بڑے اچھے ڈھنگ سے پیش آرہی تھی مگر مجھے اُس سے اندر ہی اندر نفرت ہوتی جا رہی تھی "کیا ٹیوشن کے سلسلہ میں آنا ہوا ہے؟" یہ اُس کا اگلا سوال تھا۔

"جی ہاں! ایک لڑکی ہائی اسکول میں آئی ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ سے اُس کے لئے بھی عنایت کر دیں" میں نے یونہی بہانہ تراشا۔

"یہ بات تو آپ کل دوکان پر بھی کہہ سکتے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں ہے میں وقت نکالوں گی۔ وہ یہاں آئے گی؟ یا مجھے گھر جا کر پڑھانا ہوگا" مسکراتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس نے پوچھا۔

"گھر جا کر" میں نے مختصر سا جواب دیا تو وہ بولی۔

"گھر پر پڑھانے کا مطالبہ زیادہ ہوگا"

میں نے کہا "جو بھی ہوگا بخوشی دوں گا" یہ سُن کر اُس نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ کہا

"شاید لڑکی آپ کی نہیں ہے"۔

میں اس سوال پر چونکا۔ اس کو یہ کیسے پتہ چل گیا کہ لڑکی میری نہیں ہے

"یہ آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"آپ کی عمر کے مطابق آپ کا کوئی بھی بچہ ہائی اسکول میں نہیں ہونا چاہئے۔ ہاں کسی عزیز کے بچے کے سلسلہ میں آپ بات کر رہے ہیں"۔

اُس نے مضبوطی کے ساتھ کہا۔ میں اُس کی ذہانت کا لوہا مان گیا۔ وہ حسین اور فنکار ہی نہیں، ہوشمند بھی تھی۔ میں نے اُس کے بعد اُس سے اُس کے بارے میں پوری جانکاری معلوم کی تو کہنے لگی:

"میرے شوہر ایک اچھے انجنیئر ہیں۔ اُنھوں

بہت سی لڑکیاں دیکھیں لیکن مجھے پسند کیا کیونکہ شُدرو تھی ہی بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ بھی تھی۔ یہی چاہتے تھے۔"

مَیں نے کہا" وہ آزنگ ہینڈ لڑکی چاہتے ہوں گے' نئی تہذیب کے شیدائی جو ٹھہرے۔"

"اِس میں بُرا بھی کیا ہے۔ اِس زمانے میں دن کو کمانا چاہیئے۔ اَب مَیں بھی کماتی ہوں' اور بھی کماتے ہیں۔ ہے اور شوخن ملا کر خاصی آمدنی جاتی ہے۔ چھٹی کے دِن اُن کے پاس چلی جاتی ہوں" بے تکلفی سے اُس نے کہا۔

"اُن کے کھانے پینے کا انتظام کیسے ہوتا ہے؟"

مَیں نے پوچھا تو وہ اِس طرح بولی جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے۔" ایک بیوہ عورت اُن کے پاس رہتی ہے اور وہی کھانا بناتی ہے اور گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔"

"آپ اِس زندگی سے مطمئن اور خوش ہیں؟"

مَیں نے اُس کے اندر کی عورت کو کُریدا۔

"ایسی زندگی تو بڑے قسمت والے کو نصیب ہوتی ہے۔ اِس طرح کی مست اور شکھوں سے بھرپور زندگی سے کون خوش اور مطمئن نہ ہوگا؟"

اُس نے بے جھجک ہو کر جواب دیا۔ میری ڈائری میں یہ کیس سوواں تھا۔ میری بچوں کتاب اِس کے بعد پوری ہو گئی۔ مَیں خوشی خوشی اُس کے پاس سے اُٹھا اور بولا" اچھا تو آنے"

وہ" اچھا آنے" لفظ پر زور دے کر دُہراتی رہ گئی اور کچھ بھی نہیں سمجھ سکی۔ ایک دم اُس کی اُن تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا جو وہ مجھ سے وابستہ کئے بیٹھی تھی۔

غزل

یوسف ثاقی سلیمانی

خود سنورنا بھی اب سکھا دینگے
اُن کے ہاتھوں میں آئینہ دینگے
صاحبو! ہم فقیر کیا دیں گے
کر بھلا ہو بھلا دُعا دینگے
ایک دم تو یہ غیر ممکن ہے
رفتہ رفتہ چلو بھلا دینگے
یاد آنے کو دوست ترسو گے
ہم جو بھولے تو سب بھلا دینگے
اب زیادہ تو کچھ نہیں کہنے
حکم جائز پہ سر کٹا دینگے
اُن کا اِنصاف یوں بھی ہے مشہور
خوں بہا کر وہ خوں بہا دینگے
ہیں ترے شعر کھُردرے ثاقی
زخمِ دل پر ہوا اُٹھا دینگے

۹۴۔ محلہ بھوپاییان' پالی' راجستھان

غزل

عروج نفیسی جھانسوی

ذرّے ذرّے میں چمک پھولوں میں رعنائی ہے
آج بھارت میں ہر اِک سمت بہار آئی ہے
پرچمِ ہند کا اعزاز تو دیکھے کوئی
وہ سلامی کو جھکا گنبدِ مینائی ہے
روشنی لال قلعے کی جو فلک تک پہنچی
بزمِ انجم بھی اُسے دیکھ کے شرمائی ہے
بجتی ہیں چاروں طرف قومی ترانے کی دھنیں
اور کہیں جاوِدِ جگاتی ہوئی شہنائی ہے
کیف آگیں ہیں ہر اِک سمت ہوا کے جھونکے
اِس کی ندیوں کی طبیعت بھی تو لہرائی ہے
جشنِ گل' جشنِ چراغاں ہے گلی میں ہر سُو
محبت کی یہ گھڑی بڑی سے ڈھونڈ کے آئی ہے
آسنے لیش کو ہم اور اُٹھائیں اُونچا
آج ہر ایک عروج اِس کا تمنائی ہے

۴۶۔ چھنیاں پورہ' جھانسی' یوپی

غزل

سلام ساگری

حجرِ ادا کے دامنِ رنگیں وہ مسکرا کے چلے
چراغِ عشق کی لو اور کچھ بڑھا کے چلے
چلے مِٹا کے چلے' خاک میں مِلا کے چلے
فنا کے بعد بھی وہ مجھ کو آزما کے چلے
کچھ اِس ادا سے وہ مجھ پر نظر اُٹھا کے چلے
کہ جیسے سینکڑوں ساغر مجھے پلا کے چلے
کسی کے راز کی عظمت تھی میرے سینے میں
وہ میرا دِل نہیں عرشِ بریں ہلا کے چلے
وہ آج کچھ مرے سجدوں سے بدگماں ہو کر
چلے تو نقشِ قدم بھی مِٹا مِٹا کے چلے
ہمیں سنبھالے رہی مفلسی کی خودداری
جو میکدے میں تھے کم ظرف لڑکھڑا کے چلے
فضائے عشق سے نکلے ہیں یوں ہم
وہ ایسی دھُن میں سلام آج گنگنا کے چلے

ساگر۔ (ایم۔ پی)

سرور تونسوی

شاہ صاحب جودھپوری رح

سلسلہ کیلئے دیکھئے "شانِ ہند" ماہ جنوری ۱۹۸۸ء

املاک منقولہ و غیر منقولہ شاہ صاحب کے وارثِ علی بشیر الدین صاحب کو نہ ملیں بلکہ انھیں وقف قرار دے دیا جائے" مگر میری شہادت پر عدالت نے بشیر الدین صاحب کو جائز وارث قرار دیتے ہوئے تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ اُن کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ قبلہ شاہ صاحب نے اپنا وصیت نامہ میرے حوالے کر دیا تھا اور اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ چنانچہ عدالت کے روبرو شہادت دیتے ہوئے جب وہ وصیت نامہ پیش کیا گیا تو معاملہ صاف ہو گیا۔ وصیت نامہ میرے حوالے کیا جانا ایک ادنیٰ سا ثبوت ہے اس امر کا کہ قبلہ اپنے اس نیاز مند پر کس قدر اعتماد فرماتے تھے۔ میں نے متعدد حضرات کی شاہ صاحب موصوف سے سفارشات کرکے اُن کے ایسے ایسے کام کرا دیئے جن سے اُن کی زندگیاں سنور گئیں۔ مگر واہ ری دُنیا کہ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد یہ حضرات مجھے پہچانتے بھی نہیں۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ آیئے کچھ سو فی صد سچے ایسے واقعات سُنیئے جن کا تعلق مجھ سے ہے اور جو میرے چشم دید ہیں۔

جناب لکشمی نارائن صاحب فارغ راجستھان سکریٹریٹ میں ایک اعلیٰ عہدے دار تھے۔ اب ریٹائر ہو کر جے پور میں ہی مستقل طور پر مقیم ہیں۔ میری درخواست پر یہ عرس کے سالانہ مشاعرہ میں شرکت فرماتے تھے اور کلام سُناتے تھے ایک بار میں نے جو دیکھا تو فارغ صاحب کو نہایت ادب کے ساتھ قبلہ شاہ صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا۔ جب فارغ صاحب سے بات چیت کرکے واپس جانے لگے تو میں بھی اُن کے ساتھ واقف صاحب کے دفتر تک گیا۔ راستے میں ازراہِ مذاق میں نے فارغ صاحب سے پوچھا کہ آپ نے کب سے شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے؟ تو فرمانے لگے" سرور صاحب! آپ کو علم نہیں ہے کہ شاہ صاحب نے مجھ پر کس قدر احسان فرمایا ہے" اِس کے بعد وہ فرمانے لگے کہ میرا لڑکا جو ملٹری میں ہے اچانک بیمار ہو گیا اور اس کے پاؤں کی کچھ ایسی کیفیت ہو گئی کہ کوئی دوا کام ہی نہ کرتی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ سوا پاؤں کاٹنے کے اور کوئی علاج نہیں ہے۔ فارغ صاحب خیال میں ہی اللہ میاں کا تصور کرتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہنے لگے کہ اس وقت مجھے تم یاد آ گئے اور میں نے سوچا کہ سرور قبلہ شاہ صاحب کی بہت تعریف کرتا ہے اور دونوں تک شاہ صاحب کے یہاں قیام کرتا ہے لہٰذا میں لڑکے کو رکشا میں بٹھا کر شاہ صاحب کے یہاں لے گیا۔ شاہ صاحب نے چند دنوں میں ہی میرے لڑکے کو ٹھیک کر دیا۔ وہ ڈاکٹر جو میرے لڑکے کو لا علاج قرار دے چکے تھے اور کہتے تھے کہ پاؤں کٹے گا وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کون سا ڈاکٹر اور کون سی دوائیاں ہیں جس نے اس لڑکے کو ٹھیک کر دیا۔ سرور صاحب اب میں اُن ڈاکٹروں کو کیا بتاؤں کہ جنگل میں مرے ہوئے کتے کی ٹانگ کی ہڈی کا سفوف اور گلو کے پتوں سے اس لاعلاج بیماری کا علاج ہوا ہے کیونکہ حقیقت تو یہی ہے۔

اور میرا لڑکا قبلہ شاہ صاحب کی دعاؤں سے چند دنوں کے بعد ہی ماؤنٹ آبو پر ڈیوٹی میں شریک ہو گیا۔ میں نے محلے کے دو اشخاص کے کہنے پر گوڑ گاؤں کی کورٹ میں ایک بدمعاش کی ضمانت پانچ ہزار روپے کی دی۔ میں اس شخص سے قطعی واقف نہ تھا۔ یہ شخص ضمانت پر رہا ہونے کے بعد فرار ہو گیا اور پتہ چلا کہ اس شخص نے چلتی ریل میں ڈاکہ ڈالا تھا۔ چنانچہ اس کی عدم حاضری پر ایڈیشنل سیشن جج گوڑ گاؤں کی عدالت میں میرے خلاف ضبطیٔ ضمانت کی کارروائی شروع ہوئی۔ میرے پاس کوئی طریقہ نہ تھا کہ میں اس مفرور کو تلاش کر سکوں یا گرفتار کرا سکوں۔ میں سیدھا جے پور گیا اور قبلہ شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ اس نئی مصیبت سے نجات دلایئے۔ شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا کہ گھبرایئے نہیں یہ مصیبت بخیر و خوبی کٹ جائے گی اور مفرور گرفتار ہو جائے گا۔ میرے خلاف کارروائی عدالت میں چل رہی تھی کہ سردار پرتاپ سنگھ جو ہیں

سابق چیف منسٹر پنجاب کے قتل کے سلسلے میں پولیس مشتبہ اشخاص کی دیکھ ریکھ کر رہی تھی کہ یہ مفرور تھا۔ سرائے روح اللہ کے علاقے میں ایک باغ سے گرفتار کر لیا گیا مگر راقم الحروف کو اس چکر میں کم و بیش ایک ہزار روپے کا زیر بار ہونا پڑا۔ گویا اتفاقی یہ مصیبت بخیر و خوبی گزر گئی۔

مرحوم محمد نذیر صاحب مالک روزنامہ اردو ٹائمز بمبئی نے جب "اردو ٹائمز" جاری کیا تو یار لوگوں نے ان کے راستے میں قدم قدم پر کانٹے بچھا دیئے۔ بمبئی کے دوسرے اردو روزناموں کے مالکان نے تجارتی حسد کے تحت اردو ٹائمز کو فیل کرانے کے لیے نذیر صاحب کو قتل کرانے تک کی کوشش کی مگر دیکھتے ہی دیکھتے اردو ٹائمز نے اپنا مقام قائم کر لیا اور اس وقت بھی وہ بمبئی کے روزناموں میں دوسرے درجے کا گنا جاتا ہے۔ نذیر صاحب ہر سال عرس پر جے پور تشریف لاتے تھے اور یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ قبلہ شاہ صاحب میری موجودگی میں بمبئی تشریف لائے تو نذیر صاحب کے یہاں ہی قیام فرمایا۔ نذیر صاحب کہتے تھے کہ یہ سب کچھ شاہ صاحب کی دعاؤں کا اور اللہ تعالیٰ کے کرم کا نتیجہ ہے کہ میری تمام مصیبتیں دور ہو گئیں۔

منگھ بہاری لال تبسم دہلوی (مرحوم) محکمہ سینٹرل پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں ایک اچھے عہدے پر ملازم تھے۔ ان پر دورے کے درمیان کار حادثے میں کوئی ایسی اندرونی چوٹ لگی کہ وہ انتہائی پریشان تھے۔ سرکاری طور پر ان کا علاج اچھے سے اچھے ہسپتال میں ہوا مگر افاقہ نہ ہوا۔ ان کی خوراک کیلا، دہی، یا ہاف فرائی انڈا ہی تھی۔ اناج وہ کھا ہی نہ سکتے تھے۔ ایک دفعہ شاہ صاحب مجھ ناچیز سے فرمانے لگے: "بھئی تبسم دہلوی کی بڑی تعریف سنی ہے کہ وہ بڑے اچھے ترنم سے کلام سناتا ہے، اس بار اسے عرس کے مشاعرے میں لائیے گا" جناب تبسم مشاعرۂ عرس میں میرے ساتھ ہی شریک ہوئے۔ کھانے کے وقت شاہ صاحب کہنے لگے

"سرور صاحب! تمام مہمان شعراء کو ادھر لے جائیے اور کھانا کھلوا لیجئے" جب ہم سب کھانے کے لئے جانے لگے تو تبسم صاحب بیٹھے رہے۔ تب مجھے یاد آیا کہ یہ تو کھانا کھا ہی نہیں سکتے، اور پھر لنگر کا کھانا جس میں مرچ جے پور کے حساب سے ڈالی جاتی ہے۔ میں نے شاہ صاحب سے ان کی کیفیت بیان کی تو فرمانے لگے "تبسم صاحب جائیے اور کھانا کھائیے آپ کو کچھ نہیں ہوگا" میں تبسم صاحب کو بھی ساتھ لے آیا تو اوپر آ کر وہ کہنے لگے "سرور صاحب، آپ کھا لیجئے۔ میں آپ کے ساتھ بازار چل کر دہی اور کیلا وغیرہ کھا لوں گا۔ اگر میں نے کھانا کھا لیا تو بیمار ہو جاؤں گا۔ ابھی درد شروع ہو جائے گا اور رات کو مشاعرہ نہ پڑھ سکوں گا" اتنے میں شنکر شمبھو قوال دونوں بھائی آ گئے اور کہنے لگے "تبسم! تم تو نرے شاعر ہی ہو، جب شاہ صاحب نے کہہ دیا ہے تو کچھ نہیں ہوگا"

لنگر کا کھانا جس میں جے پور کی مرچیں پوری مقدار میں تھیں، تبسم صاحب کے پیٹ میں پہلا لقمہ ہی گیا تھا، جیسے ان کے پیٹ میں آگ لگ گئی ہو۔ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بتا رہے تھے کہ وہ بے دلی سے کھانا کھا رہے ہیں۔ مگر کسی نہ کسی طرح ایک رومالی روٹی چنے کی دال کے ساتھ انھوں نے کھا ہی لی۔ اور اس کے بعد ان کی ایسی بھوک چمکی کہ انھوں نے چاول اور روٹیاں خوب جی بھر کر کھائے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ تبسم صاحب کو کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ دن بھر وہ جے پور اپنے مداحوں کے ساتھ گھومتے رہے۔ رات کا کھانا بھی انھوں نے ہم سب کے ساتھ لنگر کا کھانا کھایا اور رات کو مشاعرہ اس شان سے پڑھا کہ جے پور کے لوگ انھیں اب تک یاد کرتے ہیں۔ اس کے بعد زندگی بھر تبسم صاحب کو یہ تکلیف نہ ہوئی۔

قبلہ شاہ صاحب بمبئی میں نذیر صاحب مالک "اردو ٹائمز" کے مکان پر قیام فرما تھے تو نوشاد صاحب کے ساتھ شکیل بدایونی (مرحوم) بھی تشریف لائے۔ ان دنوں شکیل صاحب انہی فلموں کے گیت لکھتے تھے جن کے میوزک ڈائریکٹر جناب نوشاد ہوتے تھے، جس کی وجہ سے جب نوشاد کے پاس فلمیں کم رہ گئیں تو شکیل صاحب بھی مالی طور پر اچھے نہ رہے۔ شکیل صاحب نے شاہ صاحب کو جے پور اس قسم کا خط لکھا کہ وہ دعا کے طالب ہیں۔ شاہ صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا کہ خدا نے چاہا تو اب شہرت کے آسمان پر اڑے گا اور اسے مالی طور پر کوئی پریشانی نہ رہے گی۔ لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے شکیل صاحب فلم لائن پر چھا گئے اور مالی آسودگی نے ان کے قدم چومے۔ ایک دوسرے موقع پر شکیل صاحب نے شاہ صاحب سے فون پر کہا کہ انھیں ذیابیطس کا مرض ہے کوئی دوا بتا دیجئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا "آج کل سرور بمبئی میں ہے۔ وہ بمبئی سے سیدھا جے پور عرس میں شریک ہونے آئے گا۔ اس کے ساتھ ہی عرس پر آ جاؤ۔ انشاءاللہ یہ مرض جاتا رہے گا۔ چنانچہ شکیل صاحب میرے ساتھ بمبئی سے جے پور تشریف لائے۔ عرس کے مشاعرے میں انھوں نے کلام پڑھا اور چار دن جے پور میں رہے۔ لنگر کا کھانا کھایا اور ہر وہ بد پرہیزی کی جو ذیابیطس کے مریض کے لئے نقصان دہ ہے مگر جب ڈاکٹر سردار سنگھ رام گنج جے پور سے پیشاب اور خون کی جانچ کرائی گئی تو شکر نارمل تھی اس کے بعد شکیل صاحب کا یہ مرض جاتا رہا۔

ایک مشہور قوال تھے عبدالرحمٰن کانچ والا، ان کا ساز کانچ کے دو ٹکڑے ہوتے تھے اور قوال بڑے اچھے تھے۔ ایک بار عرس پر جے پور آئے تو کھڑے ہو کر محفل میں گانے لگے۔ عرس کے خدام نے عبدالرحمٰن کانچ والا سے کہا کہ وہ کھڑے ہو کر نہیں گا سکتا۔ اس پر کانچ والا نے قبلہ شاہ صاحب سے عرض کیا کہ مجھے کھڑے ہو کر گانے دیا جائے۔ شاہ صاحب نے کہا "تمہیں بیٹھ کر گانے میں کیا اعتراض ہے" تو کانچ والا نے کہا "حضور میں بیٹھ کر گا ہی نہیں سکتا کیونکہ مجھے بھگندر کی بیماری ہے" اس پر شاہ صاحب نے آنکھیں لال کرتے

ہوئے کہا کہ اچھا جاؤ، جب بیٹھ کر گانے کے قابل ہو سکو تو آجانا۔ عبدالرحمٰن کا پچ والے نے خود مجھے یہ بتایا کہ سرکار صاحب میں اپنی رہائش گاہ پر آکر روتا رہا اور روتے روتے ہی مجھے رات کو نیند آگئی۔ صبح کو جب نہا کر ملازم کو آواز دی کہ وہ زخم پر دوائی لگادے (عبدالرحمٰن کا پچ والے بہت موٹے تھے اور اُن کے ہاتھ پیچھے مڑنے پر زخم تک نہیں جا سکتے تھے اس لئے دوا وہ ملازم سے ہی لگواتے تھے) جب ملازم دوا لگانے لگا تو زخم ہی نہ تھا۔ ملازم نے کہا جناب میں دوا کہاں لگاؤں، زخم ہی نہیں ہے"

بس پھر کیا تھا، عبدالرحمٰن کا پچ والے نے اُس روز محفل میں ایسا گایا، ایسا گایا کہ ایسا وہ کبھی نہ گایا تھا اور سُننے لوگوں نے اتنا روپیہ دیا کہ اُس نے کبھی اتنا روپیہ محفل میں نہ پایا تھا۔ اُس کے بعد عبدالرحمٰن کا پچ والا دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، عُرس پر ضرور آتا۔ ایک دفعہ وہ پاکستان میں تھا، اور عُرس میں شریک ہونے کے لئے ہندوستان آرہا تھا کہ پاسپورٹ میں، یا ویزا فارم میں کوئی غلطی ہونے کی بنا پر پاکستانی بارڈر والوں نے اُسے جانے سے روک دیا تو کا پچ والے نے پاکستانی پولیس والوں سے کہا کہ اگر میں عُرس میں شریک نہ ہوا تو میں جان دے دوں گا اور میری بے کُنا ہی تم سب کو بھی لے ڈوبے گی، جس پر پاکستانی حُکّام نے خود غلطی کی اصلاح کرکے اُسے ہندوستان آنے دیا۔ اب کا پچ والا نہیں ہے، مگر اہلِ جے پور اُسے اب بھی یاد کرتے ہیں۔

آپ نے آکاش وانی سے اکثر کرکٹ میچ کی کمنٹری کرتے ہوئے سردار جسدیو سنگھ کی آواز تو سُنی ہوگی۔ یہ صاحب پہلے جے پور آکاش وانی پر تھے اور عُرس کی ریڈیو رپورٹ کے سلسلہ میں کچھ جھلکیاں اور عرس میں شریک ہونے والے کچھ اصحاب کے انٹرویو ریکارڈ کرنے تشریف لایا کرتے تھے۔ جسدیو سنگھ کی والدہ صاحبہ کو کینسر تھا۔ کسی نے اُن سے کہا کہ شاہ صاحب جو دھپور والوں کے پاس جاؤ۔ اگر اُن کی نظرِ عنایت ہوگئی تو تمہاری والدہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ جسدیو سنگھ نئی روشنی کا نوجوان۔ وہ اِن باتوں کو کہاں ماننے۔ خیر، وہ یہ سوچ کر بابا کے پاس گئے کہ بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ جسدیو سنگھ چونکہ عرس پر ریکارڈنگ کے لئے آیا ہی کرتے تھے اس لئے بابا اُنھیں پہچانتے تھے۔ جب جسدیو سنگھ نے اپنے والدہ کے بارے میں سب حالات بتائے تو شاہ صاحب نے کہا کہ دیکھو جسدیو سنگھ میں خدا تو نہیں ہوں کہ کسی کو مرنے نہ دوں۔ مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری ماں اپنی عمرِ طبعی پا کر ہی اس جہان سے جائیں گی۔ کینسر سے ان کی موت نہیں ہوگی۔ لہٰذا ابھی یہ کافی عرصہ جئیں گی، مگر کینسر کے مریض کی طرح نہیں، بلکہ ایک صحت مند انسان کی مانند۔ مگر جب اُن کی آئی ہوگی تو اسے کوئی نہ روک سکے گا۔" لہٰذا کئی سال تک جسدیو سنگھ کی والدہ زندہ رہیں اور ہنستے کھیلتے زندگی بتائی۔ جسدیو سنگھ کی خواہش تھی کہ میں دوسرے ملکوں میں جا کر ایشیائی کھیلوں کی کمنٹری کروں۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تم خوب شہرت پاؤ گے، خوب ترقی ہوگی۔ چنانچہ جسدیو سنگھ جے پور آکاش وانی سے تبدیل ہو کر دہلی آکاش وانی پر آگئے، اور آتے ہی جاپان میں دُنیا بھر کے کھلاڑیوں کے گیمز کی کارروائی ریکارڈ کرنے اور کمنٹری کرنے کے لئے بھجوائے گئے۔

اس کے علاوہ متعدد حیرت انگیز واقعات ایسے ہیں جو میرے چشم دید ہیں مگر مضمون کی طوالت کے باعث اُن کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔

جس کسی نے بھی شاہ صاحب کے ہاں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کو ایک ہی صف میں پایا تو اُسے انور صابری کے اس شعر کی تفسیر نظر آئی ؎

میں نے اک کعبہ بنایا ہے عجب انداز کا
جس میں ناقوس و اذاں کی ایک ہی آواز ہے ٭

غزل

کوثر شاجاپوری

ایک خوشبو کی طرح آکر گزر جاتی ہے رات
یاد کے رنگین پھولوں سے سنور جاتی ہے رات

بد نصیبی کی بری چٹان سے ٹکرا کے یہ
ریزہ ریزہ ہو کے شیشے سی بکھر جاتی ہے رات

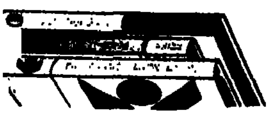
ہم ہی کرتے ہیں بسر تاریکیوں میں زندگی
دیکھتے ہیں ڈھونڈ کر ہم سے کدھر جاتی ہے رات

قیدبن جاتے ہیں یارو تیرگی کے قافلے
داغہائے دِل کے جلنے سے نکھر جاتی ہے رات

میں تو یادوں میں کسی کی کھو کے رہ جاتا ہوں بس!
مجھ کو کیا معلوم ہے کب اپنے گھر جاتی ہے رات

ساتھ لاتی ہے کئی خوابوں کے رنگیں سلسلے
نیند بن کر میری آنکھوں میں اُتر جاتی ہے رات

رقص کرنے کو ترس جاتی ہے سورج کی کرن
بارہا کوثر مرے گھر پر ٹھہر جاتی ہے رات



بابِ انتقاد

ارمغانِ کندن ـــ کندن لعل کندن
سنِ اشاعت ۱۹۸۷ء ۔ سائز ۲۳×۳۶/۱۶
قیمت ------ ۳۵/- روپے

دہلی کا ماحول کچھ ایسا گہما گہمی اور ہنگامہ آرائی کا ہے کہ جسے دیکھئے مصروف 'مشغول' اور بھاگ دوڑ میں نظر آتا ہے۔ اس عالم میں سب سے اہم سوال دو روٹی کا ہے اور دو روٹی ملتی ہے صحیح وقت پر اپنی ڈیوٹی پر پہونچنے میں۔ اگر ذرا غفلت ہوئی یا دیری ہوئی تو اس بے راہروی اور غیر ذمہ داری کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ یوں تو نوکری اور ملازمت پھر نوکری اور ملازمت ہی ہوتی ہے لیکن پوسٹ آفس یا آر۔ ایم۔ ایس کی نوکری نہایت ذمہ داری کی ہوتی ہے۔ یہاں قائم ہوتا ہے نہ بجھتی ہر عالم میں مستعدی سے کام کرنا ہوتا ہے، اور یہ ذمہ داری ایسی ہوتی ہے کہ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہوتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انھی کے ایک نہایت دیانتدار اور ذمہ دار عہدیدار کس وقت میں ایسے آفاقی' لافانی اور شگفتہ اشعار کہہ لیتے ہیں ؎

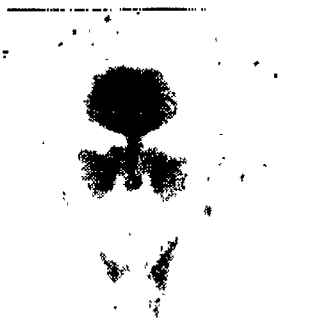
" گردشِ وقت سے بدلے ہیں اب ان کا شعار
فکرِ روزی میں نکل آئے قلندر کتنے

میرے گناہوں کی جب مل رہی ہے مجھ کو سزا
تو کارِ نیک کا بھی کچھ مجھے ثواب ملے

میں بھی تنہا ہوں آپ بھی تنہا
کیسے کاٹیں گے زندگی تنہا

نظام ایسا چلا رکھا ہے کس نے
ہو اتنک درہم و برہم نہیں ہے "

ان اشعار کے خالق ہیں
جناب کندن لال کندن۔ !
کندن صاحب فطری شاعر ہیں' شاعری ان کی گھٹی اور خمیر میں شامل ہے۔



شاعری سکون اور فرصت چاہتی ہے لیکن کندن صاحب دن بھر مصروف رہتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ گھریلو اور دنیاوی ضروریات' کام' اور ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ اس صورت میں وہ کونسا وقت نکال لیتے ہیں' ایسے اللہ ہی جانے۔ لہٰذا مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل ہے نہ جھجک کہ کندن صاحب واقعی فطری شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں کہیں اصلاحی انداز اور پہلو ہوتا ہے' کہیں ملک و قوم ... پیغامِ بیداری اور کہیں راز و نیاز کی باتیں نظر آتی ہیں۔ گویا کندن صاحب خشک شاعر ہیں ... واعظ و ناصح۔ کہیں وہ بچوں کے روپ میں ... سادہ زبان میں ان سے باتیں کرتے ملتے ہیں۔ ... حال مجموعی طور پر کندن صاحب عہدِ حاضر کے ہم ... شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں قدامت کی ... روایت کی قندیلوں کی روشنی اور فن کے چراغوں ... ہلکا ہلکا دھیما دھیما اثر بھی ہے اور خلوص کی مہک ... کرتی ہے۔ ابھی میں ان کی شاعری کے بارے ... صرف یہ رائے قائم کر سکتا ہوں اور یہی لیا ... سکتا ہوں۔ وہ پرانے زمانے کے' اس ... بزرگ شاعر ہیں اور انھوں نے اپنی معتبر ... کے لئے' ایک راہ نکالی ہے جس پر وہ سُبک ... مست خرامی سے گامزن ہیں اور اس را ... نہ تقلید کے خاروں کا ڈر ہے' نہ بے اصولی ... گر پڑنے کا خطرہ۔ کچھ حقائق ہوتے ہیں جنھیں ... من و عن کہہ گزرتے ہیں۔ مصلحت آمیز ... نظر اندازی سے وہ سمجھوتہ نہیں کرتے۔ گویا وہ ... کے رُخ پر نہیں چلتے اور یہ شاعری ان کو ا... ہمعصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

کندن صاحب کا مجموعۂ کلام "ارمغان ... کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں ... سے لے کر غزلیں' نظمیں' قطعات اور رباعیات ... تک ہے۔ غزلوں کا تو وہی رنگ ہے جو قد... روایتی' فنی اور اصولی چلا آ رہا ہے۔ وہ اس ... سے ہٹتے نہیں اور اس کے لب و لہجہ میں ... فرق نہیں آتا۔ اگر وہ اس رنگ سے ہٹتے بھی ... یقیناً وہ اب بھٹک جائیں گے۔ ان کی شا... کی موت واقع ہو جائے گی۔ جدت کی مشق ...

ایک خاص رنگ اختیار کیا جاتا ہے اور وہ اس رنگ میں کامیاب ہیں۔ نہایت آسان زبان میں شستہ، ہلکی پھلکی غزلیں کہتے ہیں۔ یہ غزلیں روح و دل کو چھوتی ہیں۔ ان میں کوئی بناوٹ، اور تصنع نہیں ہوتا۔ اساتذۂ کرام کی غزلوں پر تضمین بھی کی ہے۔ یہ کام کچھ آسان نہیں ہے لیکن کندن صاحب نے تضمینیں بھی کی ہیں حضرت جوش ملسیانی کی غزل پر تضمین کرنا کوئی مذاق اور آسان بات نہیں۔ ایک بند اس طرح ہے ؎

دل کسی سے نہ جو لگا جائے
کوئی ٹھوکر نہ پھر وہ کھا جائے
عشق کرنا نہ وہ ذرا جانے
دل پہ جو گزری وہ کیا جانے
یہ تو ہم جانیں یا خدا جانے

کہیں کندن صاحب مُصلح کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ مے نوشی کے خلاف اس طرح فرماتے ہیں ؎

"عرض میری ہے اس قدر تم سے
تم نہ دارُو سے پُر عذاب پیو
پینا ہی ٹھہرا ہے اگر تم کو
اُلفتِ قوم کی شراب پیو۔"

مثنوی "لذّتِ عشق" کا وہی قدیمی اسلوب اور مثنوی کے روایتی رنگ اور انداز سے شروع کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے حمد، نعت۔ لذّتِ عشق، اور آغاز داستان، سرخیاں قائم کی ہیں۔ بارہ صفحات تک یہ مثنوی محیط ہے۔ واقعی یہ مثنوی پُر لطف ہے۔ اس مثنوی سے اندازہ ہوا کہ کندن صاحب بڑے قادرُالکلام اور زُود گو شاعر ہیں وہ کسی بھی شاعر کی تقلید نہیں کرتے۔ اُن کا اپنا ایک مخصوص انداز اور رنگ ہے۔ اس رنگ میں طبع آزمائی کر کے دُنیائے شعر و شاعری کو بیش بہا پھول، انمول موتی اور جگمگاتے لعل و جواہر عطا کر رہے ہیں۔ بڑی سُبک روی اور نازک خرامی سے وہ قدیم اور روایتی رنگ میں فکر کر کے یہ نازک اور پُر خطر راستہ طے کر رہے ہیں۔ اس راہ میں نہ ٹھوکر کا خطرہ ہے نہ قدم ڈگمگانے کا خوف۔ میری دُعائیں اور نیک خواہشات اُن کے ساتھ ہیں۔ خداوند کریم اُن کو شہرتِ دوام اور قبولیتِ عوام عطا کرے اُن کے کلام کی خوشبو خُوب خُوب مہکے۔

کریمی الاحسانی

من کہ مکتوب الیہ

محترم المقام جناب سرور تونسوی صاحب!
آداب و نیاز!
"بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" پر اتر پردیش اردو اکادمی کا انعام مبارک ہو۔ حالانکہ انعام کی رقم نہ آپ کے شایانِ شان ہے نہ کتاب کے لیکن انعام انعام ہوتا ہے۔ اس کی رقم کوئی معنی نہیں رکھتی۔

احقر
اختر بستوی

محترمی و مکرمی جناب سرور صاحب
آداب و تسلیمات!
چندی گڑھ سے برادرِ مکرم جناب تاثیر صاحب کا نوازش نامہ موصول ہوا جسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ کی تصنیف "بہ کوئے یار..." پر اترپردیش اردو اکادمی کی طرف سے ڈیڑھ ہزار روپئے کے انعام کا اعلان کیا گیا ہے، ازحد مسرت ہوئی۔ ناچیز کی طرف سے خلوص و احترام کے ساتھ دلی مبارکباد پیشِ خدمت ہے۔ یقیناً آپ کی تصنیف اس سے بھی بہتر اور بڑے انعام کی مستحق ہے مگر آج کل کس کا کیا حق بنتا ہے، اس طرف کون دھیان دیتا ہے اور کون انصاف کرتا ہے۔

آپ کا:- سحر پریمی

محترمی جناب سرور صاحب سبحے ہند!
"ہیرلڈ میلہ" کی حالیہ اشاعت میں "بہ کوئے یار" پر آپ کو یو۔پی اردو اکادمی سے انعام سے نوازا گیا ہے۔ بیحد خوشی ہوئی۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔ حالانکہ آپ کی محنت کے پیشِ نظر یہ انعام اونٹ کے منہ میں زیرہ ہے لیکن

محسنِ گرامی مربیِ اعظامی!
آداب نیازمندانہ و تسلیمات خاکسارانہ!
یو۔پی اردو اکادمی کی صریحی ناانصافی سے انتہائی رنج و افسوس ہوا۔ ناانصافی اور تنگدلی کے ساتھ ساتھ کتاب کی آبروریزی[ا] کی گئی ہے یہ ادبی و علمی جرم ہے جس کا ارتکاب اردو اکادمی لکھنؤ کی انعامی کمیٹی نے کیا ہے۔ خاکسار کم از کم تین ہزار روپیہ انعام کی پختہ امید باندھے ہوئے تھا۔ کیونکہ اپنے موضوع کے لحاظ سے "بہ کوئے یار..." اپنی مثال آپ ہے۔ بھگوان کرے بہار اور مغربی بنگال کی اردو اکادمیاں بازی لے جائیں۔

نیازمند:-
ابوالفصاحت پنڈت رتن پنڈوروی۔

[ا] کتاب کی آبروریزی تو خیر کیا ہوگی، ہاں انعامی فیصلہ کرنے والوں نے اپنی سوجھ بوجھ کی آبروریزی اپنے ہاتھوں کر ڈالی۔

(ادارہ)

غنیمت ہے۔
نیازمند:- پروفیسر ہنری ولیم ہما میرٹھی

قابلِ صد تعظیم سرور صاحب، آداب!
اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا "بہ کوئے یار ... محرمانہ گزر" پر یو۔پی اردو اکادمی کی طرف سے انعام دیئے جانے کی اطلاع "ہیرلڈ میلہ" سے ملی۔ بہت بہت مبارکباد قبول فرمائیے۔ یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز ہے
نیاز آگیں: آر۔ ڈی۔ شرما، تاثیر

مکرم سرور صاحب!
"بہ کوئے یار" پر یو۔پی اردو اکاد[...] طرف سے انعام ملنے کی دلی خوشی ہوئی [...] قبول کیجئے۔

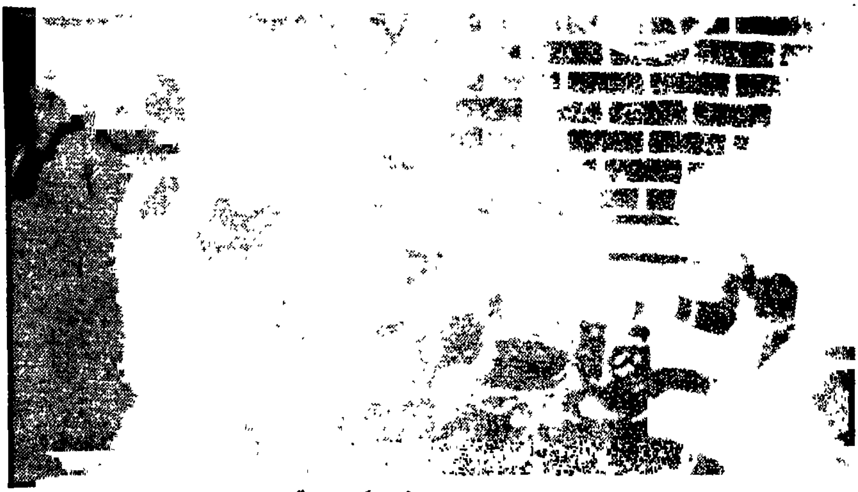
راجندر پال تسو[...]

برادرم سرور تونسوی صاحب، آداب
"قومی آواز" میں اعلان چھپا ہے کہ یو[...] اکادمی نے آپ کی کتاب "بہ کوئے یار..." [...] ڈیڑھ ہزار روپیہ انعام دیا ہے۔ مبارک ہو [...]
رام لعل

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 FEB 1988
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57
Delhi Postal

NOOR MOHAMMADI HOTEL

جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے



● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مداحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نور محمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ [illegible] لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اسے ممتاز بنایا ہے، آپ یہاں تشریف لا کر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نور محمّدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115



[illegible] پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
[illegible] پرست ہوں نہ [illegible] پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن ہے [illegible]
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

[illegible] ۶۷۲۳
[illegible]
[illegible] فون نمبر ۲۷۵۶۰۲

ماہنامہ شانِ ہند

مارچ سنہ ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹
شمارہ ۳

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر
ودیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت۔ خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقام اشاعت دفتر ماہنامہ شانِ ہند
[illegible] دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خطاط
سبطین حسین
محمد عمران

حسن کار
مصطفیٰ آرٹسٹ

قیمت فی شمارہ ——— [illegible] روپے
قیمت سالانہ ——— [illegible] روپے
لائف ممبر ——— [illegible] روپے

[illegible]

غزل

مولانا اظہر امرتسری

کسی پردہ نشیں نے دے کے دردِ جاوداں مجھکو
بنا ڈالا رموزِ زندگی کا ترجماں مجھکو

نہ چھیڑ اے ہمنشیں ہنگامۂ ماضی کے افسانے
کہ پھر محسوس ہوتا ہے غمِ عمرِ رواں مجھکو

گری دشمن پہ لیکن ڈوب کر نکلی مرے دل سے
سمجھ رکھا ہے کیا تیری نظر نے رازداں مجھکو

نظر تاریک، دل محزوں، جگر مردہ، کمر پرخم
اری ظالم جوانی چھوڑ کر بھاگی کہاں مجھکو

مرا ہی نقشِ ہستی چوٹ کھا کھا کر ابھر آیا،
وگرنہ آپ نے تو کر دیا تھا بے نشاں مجھکو

کھلانا چاہتے ہو کیا کسی ابلیس سے گندم؟
بلاتے ہو جو تم پھر جانبِ باغِ جناں مجھکو

کرم مجھ پر بھی اے غیروں میں مرہم بانٹنے والے
تری ہی تیغ نے بخشا تھا زخمِ خونچکاں مجھکو

خدا جانے قفس کی بات ہے یا قصۂ گلشن
چمک کر کہہ رہی ہے کچھ تو برقِ آشیاں مجھکو

نگہ میں یاس، دل میں صدمۂ افسوس [illegible] مژگاں پہ
نہ جانے لیے چلا ہے عشق کا سودا کہاں مجھکو

بجا ہے تیرا کہنا لیکن اے صیاد دم بھر بھی
قفس پر ہو نہیں سکتا گمانِ آشیاں مجھکو

مری بربادیوں پر ہنسنے والو کچھ خبر بھی ہے
کہ یاد آنے کو ہے بھولی ہوئی طرزِ فغاں مجھکو

قفس میں شورشِ گلشن تو ہو سکتی ہے اے اظہر،
مگر بھولا ہوا ہے شیوۂ آہ و فغاں مجھکو

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | حالاتِ حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

اڈیٹوریل

مہنگائی۔ بددیانتی۔ رشوت ستانی۔ غنڈہ گردی اور حکومت کی فرض ناشناسی کے باعث عوام میں بے چینی اور خود غرضی کی لہر۔

ہندوستانی حکومت دوسرے ممالک کے امن و امان کے لئے بے چین ہو رہی ہے، مگر اپنے ملک کے امن و امان کو نظر انداز کر رہی ہے۔

بداصل انسانوں کے پاس زر و مال کی فراوانی عوام کو فاقوں مارنے کا باعث ہو رہی ہے

وزیرِ اعظم راجیو گاندھی کے لئے لمحۂ فکریہ

کیا۔! راجیو گاندھی کا دورِ حکومت عوام کی مشکلات میں اضافہ کا موجب ہے؟

سلطان علاؤالدین خلجی جب بغاوتوں سے عاجز آگیا تو اس نے امراء کو طلب کیا اور مشورہ کیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا سبب کیا ہے؟ بعض نے کہا کہ بدامنی کے چار سبب ہوتے ہیں:

۱۔ رعایا کے نیک و بد سے فرماں روا کا لاعلم ہونا۔

۲۔ شراب کا اعلانیہ استعمال جو امراء کی باہمی مجالس میں اسرار کشائی کے علاوہ بیجائی کا باعث ہوتا ہے۔

۳۔ امراء و اعیان کی باہمی رشتہ داری [illegible] سے طبقاتی اغراض پرورش پاتے ہیں اور [illegible] عوام ڈھکے چھپے رہتے ہیں۔

۴۔ بداعمال انسانوں کے پاس [illegible] کی فراوانی یا دولت کا ایک مخصوص طبقہ [illegible]

ہو جاتا۔

نمایاں کی بات تو یہی ہے کہ یہی چاروں اسباب بھی ملک کو تہس نہس کرنے کے موجب ہوتے ہیں اور بد قسمتی سے ہمارے ملک میں یہ چاروں بدعتیں سرعت تمام پھیل نہیں رہیں بلکہ پھیلائی جا رہی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہندوستانی عوام (پنجاب اور ایک آدھ دوسری اسٹیٹ کے کچھ لوگوں کے علاوہ) اپنی حکومت کے خلاف بغاوت کرنا ہی نہیں چاہتے کیونکہ وہ پیدائشی اور فطری طور پر پر امن، بُرد بار اور ہر مصیبت کو برداشت کرنے والے ہیں۔ مگر سوچنا تو یہ ہے کہ اس وقت ملک میں مہنگائی، بد دیانتی، رشوت ستانی، غنڈہ گردی اور حکومت کی فرض ناشناسی کے باعث عوام میں بے چینی اور خود غرضی کی جو لہر چل رہی ہے اس کا خاتمہ کہاں ہوگا؟ اور اس کا نتیجہ ملک کے لیے کیا ہوگا؟"

مہنگائی پر لگا کر دن دن اونچائی پر اُڑ رہی ہے۔ بد دیانتی کا یہ عالم ہے کہ اب ہر شخص کو اپنے آپ پر بھی شک ہونے لگا ہے کہ وہ اپنے اپنے اہل و عیال کے تئیں بھی دیانت دار ہے؟ رشوت ستانی روز مرہ ہو گیا ہے اور غنڈہ گردی ہر گلی محلہ میں کچھ لوگوں کا پیشہ ہو گیا ہے اور حکومت کو اسے آئندہ آنے والے الیکشن میں کامیابی کی راہیں یہی مہنگائی، بد دیانتی، رشوت ستانی اور غنڈہ گردی میں لپٹی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔

ملک میں امن و امان کا حال کون نہیں جانتا۔ بد امنی کے حالات اخبار بین اصحاب سے ڈھکے چھپے نہیں اور ہمارے وزیر اعظم ہیں کہ اُنہیں دوسرے ممالک میں امن و امان کے قیام کی فکر تو کھائے جا رہی ہے، مگر اپنے ملک میں محض اقتدار کے بھوکے لیڈروں کے باعث، جو ملک کے ٹکڑے کرنے کے راستے اختیار کئے جا رہے ہیں اُن پر اُنہیں توجہ دینے کی فرصت نہیں ہے اور مہنگائی، بد دیانتی، رشوت ستانی اور غنڈہ گردی نے اپنے ملک میں جو بے چینی اور خود غرضی کی لہر دوڑا رکھی ہے اُسے ختم کرنے کے ذرائع سوچنے کی ضرورت کا احساس ہی نہیں کیا جاتا۔

کیا غضب ہے کہ ارباب حکومت کو عوام کے نیک و بد کا قطعاً خیال تک نہیں ہے اور اپنی کرسیوں کی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی فکر میں ہر بلیک مارکیٹر، ہر دھوکہ باز، ہر بد دیانت اور ہر غنڈے سے مدد حاصل کرنے کی فکر میں ملک اور عوام کو بربادی کے غار میں پھینکنے کو تیار ہیں۔

جمہوریت کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں جو ہمارے ارباب حکومت نے اخذ کر رکھے ہیں۔ آخر دوسرے ممالک میں بھی تو جمہوری حکومتیں ہیں۔ وہاں ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ اگر اسلام آباد میں اسلحہ خانے میں آگ لگنے کی اطلاع آتی ہے تو ہندوستان میں ہر چیز کے نرخ بڑھ جاتے ہیں۔ روسی فوجوں کی واپسی کا فیصلہ جنیوا میں ہوتا ہے، اور افغانستان سے آنے والے پھلوں کے دام ہندوستان میں اس لئے بڑھ جاتے ہیں کہ اب افغانستان میں خانہ جنگی ہوگی اور وہاں سے پھلوں کی آمد کم ہو جائیگی۔ بسوں کی ہڑتال دہلی میں ہوتی ہے اور سارے ملک میں سبزیوں، دالوں اور دیگر اشیاء کے دام بڑھا دیے جاتے ہیں۔

ارباب حکومت کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو عوام کی خود غرضی اور بد دیانتی ہے۔ بلاشبہ ایسا ہی ہے۔ مگر وہ حکومت کس کام کی جو ان بدعتوں کو روک نہ سکے اور اپنے عوام پر عرصۂ حیات تنگ کرنے میں خود غرضوں اور بلیک مارکیٹیوں کا ساتھ دے۔ بے چارہ متوسط طبقہ اور غریب طبقہ پس رہا ہے اور حکومت ہے کہ کاغذی اور زبانی طور پر ہر بدعت کا خاتمہ کر رہی ہے مگر حقیقتاً ہر بُرائی کو بڑھاوا دے رہی ہے۔

دراصل انسانوں کے پاس زر و مال کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ جو حضرات دس پندرہ سال پہلے کسی خوبصورت کار کو اپنے پاس سے گزرنے پر اس کی اُڑائی ہوئی دھول میں کھڑے ہو کر کار کو دیکھتے رہتے تھے، آج اُن کے دروازوں پر متعدد کاریں کھڑی ہیں۔ جن لوگوں کو جھونپڑیاں نصیب نہ تھیں وہ دیکھتے دیکھتے محلوں میں رہنے لگے ہیں اور ایئر کنڈیشن کمروں میں بھی اُنہیں بے چینی محسوس ہوتی ہے تو وہ پہاڑوں پر داد عیش دینے جاتے ہیں۔ اور یہی تو دولتیئے اپنی تجوریاں اور زیادہ بھرنے کی ایسی ایسی تدابیر سوچنے میں لگے رہتے ہیں کہ جن سے عوام فاقوں مرنے لگیں تاکہ اُن کی دولت میں اضافہ ہو۔ مگر حکومت ہے کہ وہ اتنی جسارت ہی نہیں کر سکتی کہ ان حرام زادوں سے یہ پوچھے کہ آخر کار اُن کے پاس یہ روپیہ آیا کہاں سے، ہندوستان

ملک میں امن و امان کا حال کون نہیں جانتا۔ بد امنی کے حالات اخبار بین اصحاب سے ڈھکے چھپے نہیں اور ہمارے وزیر اعظم ہیں کہ اُنھیں دوسرے ممالک میں امن و امان کے قیام کی فکر تو دامن گیر ہے مگر اپنے ملک میں محض اقتدار کے بھوکے لیڈروں کے باعث، جو ملک کے ٹکڑے کرنے کے راستے اختیار کئے جا رہے ہیں اُن پر اُنھیں توجہ دینے کی فرصت نہیں ہے اور مہنگائی، بد دیانتی، رشوت ستانی اور غنڈہ گردی نے اپنے ملک میں جو بے چینی اور خود غرضی کی لہر دوڑا رکھی ہے اُسے ختم کرنے کے ذرائع سوچنے کی ضرورت کا احساس ہی نہیں کیا جاتا۔

ہند" میں ایک مرتبہ محکمۂ انکم ٹیکس کی توجہ کچھ دولتیوں کی مالی فراوانی کے سلسلے میں تحقیقات کرنے کے لئے دلائی گئی تو اُن لوگوں کا تو کچھ نہ بگڑا، اُلٹا مدیر "شانِ ہند" کو شاملِ تفتیش کر لیا گیا اور چھبیس پیشیوں کے بعد بڑی مشکل سے جان چھڑائی جاسکی۔

بمبئی میں اس وقت عیاشی کے اڈّے کھلے بندوں سینکڑوں کی تعداد میں اپنا دھندہ کر رہے ہیں اور ان اڈوں میں صرف داخلہ کی فیس ۳۰/- سے لے کر ۶۰/- روپئے تک کی ہے جس کے لئے کوئی ٹکٹ جاری نہیں کیا جاتا یعنی کروڑوں روپیہ روزانہ سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس کی زد سے بچا ہوا ہے اور ان اڈوں کے اندر جو بظاہر مغربی دُھنوں پر ناچنے کے ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں، ہر ملک اور ہر مذہب کی عورتیں پسند کرکے سودا طے کرکے لے جائی جا سکتی ہیں۔ ان اڈوں پر کھانے پینے کی چیزوں کے نرخ اتنے زیادہ ہیں کہ جن کا تصوّر کرنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان اڈوں کے اندر جو کیش میمو جاری کئے جاتے ہیں، اُن پر نہ اڈّے کا نام، نہ پتہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بس روپیہ کی تعداد لکھی ہوتی ہے یعنی یہاں بھی سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر ہمارے وزیرِ خزانہ تیواری جی چاہیں تو اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔

ایسے ہزاروں واقعات ہیں جن پر اگر دھیان سے نگاہ رکھی جائے تو گورنمنٹ کو ہر سال بجٹ میں نئے نئے ٹیکس نہ لگانے پڑیں۔

بدا صل انسانوں کے پاس زر و مال کی فراوانی یا دولت ایک مخصوص طبقے کے پاس جمع ہو جانا ملک اور عوام کے لئے کس قدر خطرناک ہے اس کا اندازہ اربابِ حکومت نے لگانے کی تکلیف ہی نہیں کی۔ کیوں کہ ایسے ہی لوگوں سے تو انہیں الیکشن لڑانے کے لئے روپیہ ملتا ہے اور اسی لئے حکومت خود بلیک مارکیٹ کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

اُمرا و اعیان کے رشتہ داروں کی طبقاتی اغراض پر اگر تفصیلی طور پر روشنی ڈالی جائے تو معاملہ اس حد تک بڑھ جائے گا کہ شاید مدیر شانِ ہند کو کئی جھوٹے مقدمات میں پھنسا دیا جائے۔

رہا شراب کا استعمال، تو اس کے متعلق کچھ لکھنا یا کہنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ کانگریس حکومت کے عہد میں جسقدر شراب نوشی کو بڑھاوا ملا ہے، شاید ہی دُنیا کی کسی حکومت کو شراب نوشی کو بڑھاوا دینے کے بارے میں یہ شرف حاصل ہوا ہو۔ کانگریسی حکومت نے شراب بندی کی آڑ میں شراب نوشی اور شراب سازی کو اس قدر بڑھاوا دیا ہے کہ جس کی مثال رُوئے زمین پر ملنا مشکل ہے۔

ہندوستان میں عوام جن مشکلات میں مبتلا ہیں اُنہیں دیکھتے ہوئے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ عوام کا یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ "راجیو گاندھی کا عہدِ حکومت عوام کی مشکلات میں اضافے کا بدترین دَور ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اربابِ حکومت عوام کی مشکلات کو دُور کرنے کا جس قدر بُلند بانگ دعوے کرتے ہیں اُتنا ہی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ہندوستان کو جب آزادی ملی تو انگریزوں نے اقتدار درحقیقت پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں میں سونپا اور جواہر لال جی عوام کے دلوں پر حکومت کرتے تھے لہٰذا عوام نے حکومت بھی جواہر لال نہرو کو سمجھا اور وہ سب کی مشکلات کا حل نکالنے کی کوششیں بھی کرتے تھے۔ جس قدر اعتماد پنڈت نہرو پر عوام کو تھا اُتنا شاید پوری حکومتِ ہند پر نہیں تھا۔ ہر شخص اپنی ہر تکلیف کا حل صرف جواہر لال نہرو کو ہی سمجھتا تھا۔ یہ پریکٹس شری لال بہادر شاستری اور محترمہ اندرا گاندھی تک رہی اور عوام اپنے وزیر اعظم کو ہی اپنی تکالیف کا مداوا کرنے والا سمجھتے رہے اور یہی عمل اب بھی جاری ہے اور عوام

راجیو گاندھی کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔

راجیو گاندھی نے وزارت عظمیٰ سنبھالی تھی تو ... کا یقین اُن کی اس قدر مستحکم تھا کہ راجیو اپنی والدہ ... اور نانا صاحب سے بھی زائد مفید ثابت ہوں۔

مگر ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے ... چاہے کچھ رہے ہوں، ہمارے راجیو ہندوستا[ن] (جنہیں واقعی عوام کہا جا سکتا ہے) کی توقعا[ت] پورا اُترنے کی اہلیت رکھتے ہوئے بھی ناکا[می کی] طرف گامزن ہیں۔

آدھے سے زیادہ ملک کانگریس کی گرفت سے نکل چکا ہے، پنجاب میں خون خرابہ کے ... ۱۹۴۷ء کی طرح عوام پھر پنجاب چھوڑنے ... بنگال میں گورکھا لینڈ کی تحریک پنپ رہی ہے ... آسمان کو چھونے لگی ہے۔ بیکاری سنگین شکل ... کرنے لگی ہے اور بھرشٹاچار اپنی تمام حدیں پھلانگ چکا ہے۔

ان حالات کے باوجود عوام کا ایک خا[ص] حصّہ دل و جان سے چاہتا ہے کہ راجیو ... ملک کی حالت کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش ... اور جس طرح چار سال پیشتر ہر ہندوستانی نے ... مکمل بھروسہ کرتے ہوئے چناؤ میں ... سے کامیابی دلائی کہ آج تک کسی وزیر اعظم ... کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ راجیو پھر ... پر ہر نیم روز بن کر چمکیں۔ کیونکہ بے شک ... کا دامن داغدار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ... اس کے باوجود ہر ہندوستانی (اپوزیشن کے ...) کی خواہش ہے کہ راجیو گاندھی اپنی ماں اور نانا سے زیادہ مقبولیت اور کامیابی پائیں۔

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

دامن میں حوادث کے صبح و شام بہت ہیں
تیرے لئے دنیا میں ابھی کام بہت ہیں

کوتاہیٔ پرواز میں ہے موت فراواں
اس گردشِ دوراں میں ابھی دام بہت ہیں

اپنے ہی اِرادوں میں نہیں پختہ مزاجی
آتے ہیں خیالات مگر خام بہت ہیں

پہچان گئے تجھ کو ترے رنگ سے بو سے
مانا کہ زمانے میں ترے نام بہت ہیں

ہر بار یقیں مسخ ہوا وہم و گماں سے
اللہ قسم! دہر میں اوہام بہت ہیں

یہ درد کی شدت ہے کہ ہے فیضِ جنوں کا
آرام بہت ہی ہمیں آرام بہت ہیں

ناغہ ہی کریں پینے پلانے سے حقیر آج
ویسے تو ابھی شیشے بہت جام بہت ہیں

702, Gold Crown
J. P. Road
Andheri (W)
Bombay-400 061

روح کو سرشار اور ایمان کو
تازہ کرنے والے واقعات

پانچویں قسط

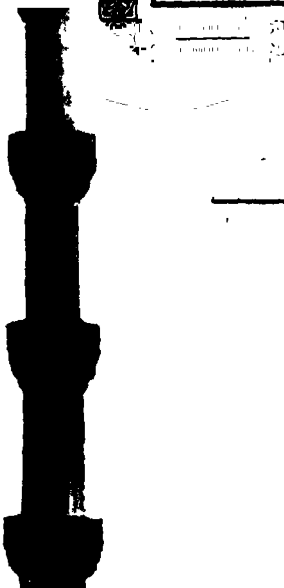
اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں کو عجب کمالات سے نوازتا ہے۔ ایسے کمالات جو عام انسانوں کی فہم سے بالاتر ہوں مگر اس کے لئے جو کل عالموں کا مقتدرِ اعلیٰ ہے کوئی بات ناممکن نہیں

ابراہیم الخواصؒ

تاریخ کی برگزیدہ [illegible] کی سوانحِ مبارک

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کشف المحجوب	تذکرۃ الاولیاء	نفحاۃ الانس	سفینۃ الاولیاء	انوار الاولیاء
شیخ علی ہجویری	شیخ فریدالدین عطار	عبدالرحمٰن جامی	دارا شکوہ	صبغۃ اللہ شاہ



آٹھویں دن دھوپ میں پیاس کی شدت سے آپ نڈھال ہو کر گر پڑے تو ندا آئی "اے ابراہیمؒ! اللہ تعالیٰ نے تم پر اتنے احسانات کئے ہیں کہ تم نہ ان کا شمار کر سکتے ہو نہ شکر۔ اس سے اس کی رحمتیں طلب کرنا افضل عبادت ہے۔ دعا کے لئے ہاتھ کیوں نہیں اٹھاتے؟ جو نعمتیں تمہیں عطا کی گئی ہیں ان کا شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟"

آپ نے ہاتفِ غیب کے جواب میں کہا۔ میں تو اللہ کی رضا کا طالب ہوں۔ دھوپ میں پیاس کی یہ شدت بھی مجھے قبول ہے۔ اگر اس کے برعکس کوئی فضا میسر آ جائے تو بھی میں منہ نہ پھیروں گا۔ وہ جس حال میں رکھے اس کی مرضی۔

ابھی یہ جملہ مکمل ہوا تھا کہ جہاں آپ نڈھال ہو کر گر پڑے تھے ٹھنڈے اور شیریں پانی کا چشمہ ابل پڑا۔ آپ نے سیر ہو کر پانی پیا اور اس جگہ سے ہٹنے لگے۔ جہاں چشمہ پھوٹا تھا وہاں سے ایک تربوز برآمد ہوا اور پانی غائب ہو گیا۔ توکل کی انتہا ترکِ توکل ہے۔ پردۂ غیب سے ترکِ توکل کی ترغیب دی گئی تو سجدۂ شکر ادا کیا۔ تربوز کھانے کے بعد آپ دوسرے لمحہ میں مصر پہنچ گئے۔ آپ دریائے نیل کے کنارے کھڑے دیر تک بے قرار موجوں کو دیکھتے رہے۔ یہ ابھی اس وقت تھا جب حضرت خضرؑ نے نمودار ہو کر بلند آواز سے آپ کو سلام کیا۔ جواب دیتے ہوئے آپ نے معانقہ کے لئے بازو کھولے تو دوسری طرف سے بھی پذیرائی ہوئی۔ دونوں ساحلِ نیل پر بیٹھ گئے۔

حضرت خضرؑ نے سلسلۂ کلام کا آغاز کرتے ہوئے کہا: "زندگی ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کو تمہارا عشق کس حد تک قبول کئے رہنے کا روادار ہو گا؟"

آپ نے جواب دیا "یہ زندگی بے شک نعمت ہے۔ لیکن ایک اعلیٰ تر نعمت کے لئے حجاب بھی ہے میں قربِ الٰہی میں زندگی اور زندگی کے سارے تقاضوں کو حجاب ہی سمجھتا ہوں۔ اس روشنی میں

یہ بات بہت واضح ہے کہ زندگی ایک بوجھ ہے جسے ہر وقت سر سے اتار دینے کی تمنا میرے دل میں کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ جسے لوگ موت کا دن کہتے ہیں، میرے لئے یومِ وصال ہو گا۔"

حضرت خضرؑ نے یہ کلمات سن کر فرمایا "میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں کہ صرف چھ ماہ بعد تم اپنی مراد پا لوگے۔"

یہ نوید سن کر آپ نے سجدہ میں سر رکھ دیا۔ سجدے سے فارغ ہوئے تو حضرت خضرؑ غائب ہو چکے تھے۔

آپ نے زندگی کے چھ ماہ کو سامنے رکھ کر ایک لائحۂ عمل مرتب کیا اور روحانی پرواز کے ذریعہ کعبۃ اللہ پہنچے۔ وہاں آپ نے طواف کیا اور حرم میں بیٹھ کر کلام اللہ اوّل تا آخر پڑھا۔ اس تلاوت کے دوران میں آپ یہ جائزہ بھی لیتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکامات دیئے ہیں، اُن کی بجا آوری میں آپ سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہوئی ہے اور جن کاموں کی بجا آوری کے لیے منع کیا گیا ہے وہ کہیں سرزد تو نہیں ہو گئے۔ تجزیے کے نتیجہ میں وہ سراپا شکر و سپاس بن گئے۔ اُن کی زندگی صراطِ مستقیم پر ہی گزری تھی۔ اعمال کے ظاہر کی صحت پر یقین کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ اِن اعمال کو اللہ تعالیٰ نے سندِ قبول بھی عطا کی یا نہیں؟ یہ سوال ایسا تھا جس کا جواب اُن کے پاس نہ تھا۔ آپ نے سجدہ میں سر رکھ کر گریہ و زاری شروع کر دی اور اسی طرح نصف شب گزر گئی۔ بندہ اپنے رب کے سامنے گڑگڑا کر اُس کا فضل طلب کر رہا تھا۔ سجدہ نے طول کھینچا اور آپ رو رو کر بیہوش ہو گئے۔ اسی عالمِ بے ہوشی میں آپ نے دیکھا کہ آسمان سے انوار کی بارش ہو رہی ہے اور کعبۃ اللہ سورج کی طرح جگمگا رہا ہے۔ اسی روشن فضا میں ایک فرشتہ صحنِ حرم میں اُترا، آپ کے قریب آیا اور اُس نے کہا "اے ابراہیم خواص! خوش ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہے اس نے تمہارے سارے اعمال اپنی رحمت سے قبول فرمائے اور تمہیں بھی قبول فرمایا۔"

یہ نوید جانفزا سن کر آپ ہوش میں آ گئے اور دیکھا کہ ایک شخص کے زانو پر آپ کا سر ہے اور وہ بڑے نرم لہجہ میں کچھ کہہ رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں آپ نے عبداللہ کو پہچان لیا اور یہ بھی یاد آ گیا کہ میں آپ عبداللہ سے جدا ہوئے تھے تو اس سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور عبداللہ کو منتظر رہنے کے لئے ہدایت کی، پھر خود تازہ وضو کے لئے زمزم پہنچے واپس آ کر آپ نے پہلے دوگانۂ شکر ادا کیا۔ اس کے بعد نمازِ تہجد ادا کی اور عبداللہ کو ساتھ لے کر نمازِ فجر تک طواف میں مصروف رہے۔ نمازِ فجر کے بعد عبداللہ سے آپ نے اُس کی خیریت دریافت کی۔

"میں یہاں کعبہ کا جاروب کش بن گیا ہوں۔ اور یہ خدمت مجھے ساری دنیا کی بادشاہی سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے دلی مسرت ہے کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ آج میں سو رہا تھا کہ ایک بزرگ نے خواب میں آ کر کہا "عبداللہ! اٹھو! تمہارے مرشد تشریف لائے ہیں اور اُس وقت صحنِ حرم میں انوار و تجلیات کی بارش میں رضائے الٰہی سے سرفراز ہو رہے ہیں" میں نے آپ کو آسانی سے پا لیا۔ آپ جب پہلے آئے تھے تو میں اُس وقت طائف میں تھا۔"

"میں خوش ہوں کہ تمہیں اچھے حال میں پایا۔ اللہ تمہارے درجات اور بلند فرمائے۔ میرے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ، اس لئے خدا حافظ! میں اب مدینۂ منورہ کی طرف جا رہا ہوں۔ مجھے دعائے خیر میں یاد رکھنا۔ دنیا میں ہماری یہ آخری ملاقات ہے۔"

عبداللہ کے اصرار پر آپ کو اُن کے ساتھ کھانا بھی کھانا پڑا۔

آپ مدینۂ منورہ پہنچے۔ دربارِ رسول ﷺ میں حاضری دے کر فیوض و برکات حاصل کیں۔ پھر روحانی پرواز کے ذریعے تبوک پہنچ گئے۔ اہلِ تبوک کو آپ کی اطلاع ملی تو پورا شہر زیارت کے لئے حاضر ہو گیا۔ آپ نے انہیں اپنی دعاؤں اور نصیحتوں سے سرفراز فرما کر کہا "اب تم اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ! میں مسجد میں قیام کروں گا۔"

رات جب آپ مصروفِ عبادت تھے تو عاملِ شہر کچھ لوگوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں آئے۔ انہوں نے ایک خوبصورت تمہید کے بعد کہا "میرا نام سعید ہے۔ وصیف میرے حقیقی ماموں تھے۔ آپ پہلے یہاں آئے تھے تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ آپ نے اُن سے اور خلیفہ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا حرف بہ حرف درست ثابت ہوا۔ قبیصہ کے پاس سے آپ کے ارشاد کے مطابق بہت دولت نکلی۔ میری وساطت سے آپ کی پیشن گوئی کا حال موجودہ خلیفۂ بغداد مہتدی کو بھی معلوم ہو چکا ہے۔ آپ کو مہتدی نے بہت تلاش کروایا مگر کامیاب نہ ہوئے۔ انہوں نے یہاں کا عامل بنا دیا اور ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ آپ یہاں پھر کبھی آ جائیں تو آپ سے درخواست کروں کہ آپ میرے ساتھ چل کر امیر المؤمنین سے ملاقات کریں۔"

آپ نے فرمایا "تمہارے ساتھ جا کر والی شرط میرے لئے قابلِ قبول نہیں۔ میں طور پر اُن سے ملاقات کر لوں گا۔ میری اطلاع کے مطابق مہتدی آج کل سامرہ میں ہیں۔"

"میں آپ سے اس بات پر اصرار نہیں کرتا کہ آپ میرے ساتھ سامرہ چلیں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ کی ملاقات اُن سے ضرور ہو جائے۔ کل آپ کے سفر کا معقول انتظام کر دوں گا" سعید نے کہا۔

آپ نے فرمایا "میرے سفر کے انتظام کی کوئی ضرورت نہیں۔ کل دن چڑھے تم ان سے ضرور ملاقات کر لینا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

سعید اور اُس کے ساتھیوں نے قدم بوسی کی پھر چلے گئے۔

عباسی خلیفہ مہتدی اپنے قصر کی مسجد نمازِ فجر کے لئے پہنچے تو ایک اجنبی کو دیکھ کر خصوصیت سے اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اس سے بات نہ کی۔ نماز کے بعد وہ اجنبی خود ہی خلیفہ مہتدی کے پاس پہنچا اور سلام کے بعد کہا "میرا نام ابراہیم خواص ہے۔ آپ کے عامل تبوک سے مجھے اطلاع ملی تھی کہ آپ مجھ سے ملاقات کے خواہشمند ہیں، اس لئے چلا آیا ہوں۔"

مہتدی آپ کا نام سنتے ہی آپ کو

گے۔ وہ بڑی عزت و تکریم کے ساتھ آپ کو محل میں لے گئے۔

آپ نے خلیفہ مہتدی سے کہا "مجھے خوشی ہے کہ میں اس وقت بنو عباس کے عمر بن عبدالعزیزؒ سے ہم کلام ہوں۔ آپ اپنی ذات سے اتنے ہی فرض شناس ہیں جتنا ہونا چاہیئے۔ لیکن آپ ایسے لوگوں میں گھرے ہوئے ہیں جو اسلام کو خود پر نافذ کرنے کی آرزو نہیں رکھتے اور اصل اقتدار انھیں لوگوں کے پاس ہے۔ اصلاح حال کی جو کوششیں آپ کر رہے ہیں ان میں آپ مخلص ہیں۔ اخلاص کا اللہ تعالیٰ ضرور اجر عطا کرے گا۔ آپ نے عدل و انصاف کے قیام کے لئے جو عمارت قبۃ المظالم کے نام سے تعمیر کی ہے، تاریخ میں یادگار رہے گی۔ آپ کو میں نے عمر ابن عبدالعزیزؒ سے اس لئے تشبیہ دی ہے کہ آپ اصلاحات کی کوششیں اسی جذبہ سے کر رہے ہیں۔ انجام میں بھی صرف اتنا سا فرق ہوگا کہ عمر ابن عبدالعزیزؒ کو ان کی اصلاحی کوششوں کے نتیجے میں زہر دے دیا گیا اور وہ سنہری شہادت سے سرفراز ہوئے، آپ اللہ کی راہ میں قتل ہو کر جیالے جاودان سے ہمکنار ہوں گے۔ آپ اس وقت یہ سوچ رہے ہیں کہ میں آپ کی کامیابی کے لئے دعا کیوں نہیں کر رہا ہوں، تو آپ یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ جو شخص تقدیر الٰہی سے ناآشنا ہوتا ہے اس کے ہاتھ دعا کے لئے کسی وقت بھی اٹھ سکتے ہیں مگر منشائے الٰہی کا علم رکھنے والے اس کی منشا کے احترام میں کبھی دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ آپ پورے انہماک سے اپنے کام میں مصروف رہیں اور شکر ادا کرتے رہیں کہ آپ کو شہادت کی موت نصیب ہونے والی ہے"

مہتدی نے آپ کی ہر بات کو توجہ سے سنا تھا۔ آپ کا اعتبار ان کے قلب میں پہلے ہی راسخ تھا اس لئے مستقبل کے انکشافات نے آبدیدہ کر دیا مہتدی نے پُرعزم لہجے میں کہا "آپ مطمئن رہیں میرے قدم حق کی راہ میں کبھی نہیں لڑکھڑائیں گے۔ میں آپ کو ایک زحمت دینا چاہتا ہوں، امید کہ بار خاطر نہ ہوگی" مہتدی اپنی جگہ سے اٹھے اور دوسرے کمرہ میں چلے گئے۔ جب واپس آئے تو تہہ کیا ہوا ایک کاغذ ان کے ہاتھ میں تھا جس پر سعید کا نام درج تھا مہتدی نے وہ کاغذ آپ کو دیتے ہوئے کہا "یہ سعید کو دے دیجئے گا۔ آج سے آپ میرے مہمان ہیں۔ آپ کی میزبانی کی آرزو میں اس لئے رکھتا ہوں کہ آپ کے قرب سے اکتساب فیوض کے مواقع بھی حاصل رہیں گے۔"

یہ سن کر آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا "میں یہاں نہ ٹھہر سکوں گا۔ اگر آپ مجھے اجازت دے دیں تو نوازش ہوگی۔"

مہتدی نے افسردہ لہجے میں کہا "میں آپ کی مرضی کے خلاف آپ کو رکنے پر مجبور نہیں کروں گا، خدا حافظ!

دروازے تک خلیفہ مہتدی نے آکر آپ کو رخصت کیا۔ کچھ دور چل کر آپ نے روحانی پرواز شروع کر دی اور تبوک پہنچ گئے۔ ابھی آپ کو مسجد میں آئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ عامل تبوک سعید اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ رات کو وہ آپ کے متعلق بہت کچھ سوچتے رہے تھے۔ انھوں نے بغیر کسی تمہید کے کہا "میں نے آپ کے منع کرنے کے باوجود سفر کے لئے بہت معقول بندوبست کر لیا ہے چار خادم بھی آپ کے ساتھ ہوں گے جو آپ کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ ہر نئی منزل پر تازہ دم گھوڑے آپ کو ملتے رہیں گے۔ مجھے امید ہے کہ میری اس جسارت کو آپ معاف کر دیں گے"

سعید نے گفتگو ختم کی تو آپ نے اپنی جیب سے خلیفہ مہتدی کا خط نکال کر ان کے حوالے کیا۔ سعید نے خط کھول کر جب یہ دیکھا کہ خط امیرالمومنین مہتدی کا ہے تو اسے بوسہ دے کر آنکھوں سے لگایا۔ پھر عبارت پڑھی جس میں آپ کی تعظیم و تکریم کے خصوصی احکامات تھے لیکن آخر میں تاریخ دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ انھوں نے حیرت ہی سے آپ کی طرف دیکھا۔

آپ نے فرمایا "میں آج ہی مہتدی سے ملا ہوں۔ آج ہی کی تاریخ ہونی بھی چاہیئے۔ ہم صاحب معراج کے امتی ہیں۔ فاصلے ہمارے لئے سمیٹ دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں برکتیں عطا کرے۔ اب چلے جاؤ۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں"

سعید نے دست بوسی کی اور چلے گئے آپ سو گئے۔ ایک پہر کے بعد آپ بیدار ہوئے تو مسجد سے باہر تبوک والے جمع تھے۔ آپ کے بیدار ہونے کی اطلاع ہوئی تو وہ مسجد میں آ گئے ظہر کی نماز کے بعد آپ نے ان کا لایا ہوا کھانا تناول فرمایا اور عصر تک ان کے ساتھ محو گفتگو رہے نماز عصر کے بعد آپ نے تبوک کے شہر کا گشت کیا نماز مغرب جامع مسجد تبوک میں ادا کی اور وہیں سے سب کو رخصت کر کے تنہا اسی مسجد میں آئے جہاں قیام تھا اور اب جس کا نام مسجد ابراہیمؒ ہے۔ عشاء کے بعد آپ نے روحانی سفر کے ذریعہ زنجان کا قصد کیا جب آپ طبرستان پر سے پرواز کر رہے تھے تو آپ نے دیکھا کہ ایک بلند عمارت کی چھت پر ایک نوجوان لڑکی خودکشی کے ارادے سے چھت کے آخری سرے کی طرف دوڑ رہی ہے۔ آپ اسے بچانے کے لئے تیزی سے پرواز کرنے لگے۔ لڑکی کود چکی تھی۔ آپ نے زمین پر پہنچ کر اسے ہاتھوں پر سنبھال لیا۔ لڑکی نے اقدام خودکشی کو ناکام ہوتے دیکھا تو ایک چیخ مار کر کہا "مجھے مر جانے دو! تم کون ہوتے ہو دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرنے والے؟"

آپ نے لڑکی کو زمین پر کھڑا کرتے ہوئے کہا "کیوں جان دے رہی ہو پاگل لڑکی! وہ کوئی اچھا آدمی تو نہیں جسے داماد کی حیثیت سے قبول کرنے پر تمہارا باپ آمادہ نہیں ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو"۔

آپ نے لڑکی سے کہا "آنکھیں بند کر لو!"

اس نے تعمیل حکم کی، پھر دوسرے حکم پر آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک مکان کی چھت پر پایا زینے سے مکان میں اترتے ہوئے آپ نے سرگوشی کی "جو کچھ دیکھو اس پر صبر کرنا چاہئے اور احتجاج کرنا تمہارے لئے مضر ہوگا"

لڑکی کو ساتھ لئے ہوئے آپ ایک کھڑکی

سے قریب ہو سکے جو تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی اور اندر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ آپ ایک طرف مُنہ کرکے کھڑے ہوگئے۔ لڑکی نے دیکھا اس کا محبوب ایک عورت کے ساتھ بیٹھا شراب پی رہا ہے۔ اُس کی گفتگو اور حرکات وسکنات میں بے حیائی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ لڑکی نے اپنے محبوب کے لئے جو رائے قائم کررکھی تھی اُس کے برعکس مُشاہدہ کرکے اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا وہ چکرا کر گرنے والی تھی کہ آپ نے سہارا دے کر سنبھالا۔

جس طرح آپ اُسے یہاں تک لائے تھے اُسی طرح واپس اس کے مکان کی چھت پر پہنچا کر کہا "لڑکی پہلے تو تم اِس بات کا تجزیہ کرو اور یقین دلاؤ کہ تم خواب نہیں دیکھ رہی ہو۔ تم نے جو کچھ بھی دیکھا ہے جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

لڑکی نے کہا "بیشک میں جاگ رہی ہوں اور جاگتی آنکھوں سے ہی میں نے سب کچھ دیکھا ہے مگر میں حیران ہوں آپ کون ہیں۔ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوگیا جو ہر اعتبار سے ناممکن نظر آتا ہے!"

آپ نے کہا "تمہارا باپ بہت نیک آدمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے بدنامی سے بچانے کیلئے مجھے بھیج دیا۔ اب تم جاؤ اور اپنے باپ کی ہر بات مان لیا کرو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

وہ آپ کے نافذ حکم کو ٹال نہ سکی۔ سوالات کا بوجھ اپنے ذہن پر اُٹھائے ہوئے وہ زینے سے اُتر گئی اور آپ نے زنجان کا رُخ کیا۔ حجاز بغرض حج... آپ نے زنجان سے رے کی طرف رُخ کیا اس راستے سے آپ کے بچپن کی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ زندگی کے آخری سفر سے پہلے یادوں کو تازگی بخشتے آپ رے پہنچے۔ زندگی کے باقی دن آپ نے وہیں عبادت میں گزارے۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۱... طالب نے اپنے مطلوب کی طرف "اللّٰهُمَّ لَبَّيْك" کہتے ہوئے سفر کیا۔

کیا

آپ "شانِ ہند" کے باقاعدہ خریدار ہیں؟
اگر نہیں تو دیر کیوں
آپ کا نیوز پیپر ایجنٹ "شانِ ہند" منگاتا ہے؟
آپ اُس سے مطالبہ کیجئے۔
آپ کی لائبریری، اسکول، یا کالج میں "شانِ ہند" آتا ہے؟
یہ آپ ہی کا کام ہے آپ اِسے وہاں لگوائیں۔
اپنے احباب میں "شانِ ہند" کا تعارف کرائیں۔
اپنے اثر و رسوخ سے اسے اشتہار دلوائیں۔
ہمیں آپ سے بڑی توقعات ہیں۔
"شانِ ہند" آپکا محبوب ماہنامہ ہے۔
اسے آگے بڑھائیں۔

سرکولیشن مینجر

تفصیلات ماہنامہ شانِ ہند دہلی

زیر فارم نمبر ۴ — مطابق رول ۸

مقام اشاعت: فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲
وقفۂ اشاعت: ماہنامہ
پرنٹر کا نام: ودیا پرکاش سرور
قومیت: ہندوستانی
پتہ: فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی ۲
پبلشر کا نام: ودیا پرکاش سرور
قومیت: ہندوستانی
پتہ: فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی ۲
ایڈیٹر کا نام: ودیا پرکاش سرور
قومیت: ہندوستانی
پتہ: فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲
مالک کا نام: ودیا پرکاش سرور
قومیت: ہندوستانی
پتہ: فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲

میں ودیا پرکاش سرور تونسوی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفاصیل میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

ودیا پرکاش سرور تونسوی
یکم مارچ ۱۹۸۸ء

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

جہاں آپ کی رقم پہلے سے زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے

اب ۹۰ سالانہ سود حاصل کیجئے

چھ ماہ اور اس سے زائد لیکن

ایک سال سے کم مدت کے لئے میعادی ڈیپازٹ پر۔

●

فکسڈ ڈیپازٹ پر شرح سود

۱۱٪ سالانہ ۲ سال کی مدت کے لئے

۱۰٪ سالانہ :۔ ایک سال سے زائد لیکن ۲ سال سے کم مدت کے لئے۔

●

سیونگ ڈیپازٹ پر ۶٪ سالانہ سود دیا جاتا ہے۔

ایک ہزار روپے ۶ سال میں ۳۳ .۲۰ روپے بن جاتے ہیں۔

ایک ہزار روپے ۱۰ سال میں ۳۲۶۷ روپے بن جاتے ہیں۔

ہر قسم کے بینکنگ کے کاروبار (جس میں غیر ملکی زرِ مبادلہ بھی شامل ہے) کے لئے تشریف لائیں۔

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ ۳۶ نیتاجی سبھاش مارگ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون: ۲۶۸۲۶۶، ۲۶۴۳۲۷۴ ٹیلیکس 31 - 66823 Zain In

دبئی میں سنہ ۱۹۸۸ء کا شاندار بھارت پاک مشاعرہ

صبیح احمد صدیقی
مقیم:- عجمان،
متحدہ عرب امارات

متحدہ عرب امارات کے مشہور شہر دبئی میں "بزم شعر و ادب" کے زیر اہتمام ۷ جنوری سنہ ۱۹۸۸ء کی شب میں حیات ریجنسی کے دلفریب کرسٹل ہال میں ایک شاندار بھارت پاک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ہندوستان اور پاکستان کے متعدد نامور شعراء نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت جناب حبیب انصاری نے فرمائی جو امارات میں اردو شعر و ادب کے قابلِ احترام سرپرستوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور نظامت کے فرائض برصغیر ہند و پاک کے مشہور نقیبِ مشاعرہ جناب ثقلین حیدر نے انجام دیئے۔ مشاعرے میں سلسلۂ شعر و سخن کے آغاز سے قبل "بزم شعر و ادب" کے مہتمم جناب انیس انصاری نے ایک مختصر و جامع استقبالیہ تقریر کی جس میں انھوں نے اردو کے مشاعروں، اردو زبان کی بے پناہ جاذبیت اور اردو شاعری کی سحر انگیز کشش کا مظہر قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"آج ہندوستان اور پاکستان کے ہر شہر ہر قصبے اور ہر ہر گاؤں میں مشاعرے ہوتے ہیں اور ان میں ایسا زبردست مجمع ہوتا ہے جو کسی بھی دوسرے ادبی اجتماع میں نہیں ہوتا۔ ان مجموں میں اردو شاعری کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اب یہ جادو ہندوستان اور پاکستان کی حدود سے نکل کر دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ آج یورپ اور امریکہ کے بہت سے ملکوں اور متعدد عرب ممالک میں بھی اردو کے مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں جن میں اردو زبان اور اردو شاعری اپنا جادو جگا رہی ہے"

انیس انصاری صاحب نے اس پر زور دیا کہ اردو کے مشاعروں کو اردو تہذیب کا عکاس ہونا چاہیئے۔ موصوف نے کہا کہ:

"اردو کے مشاعرے اردو شاعری کی محفلیں ہیں اور ہر زبان کی شاعری ایک مخصوص تہذیب اور ایک خاص کلچر کی نمائندگی کرتی ہے۔ اردو کی بھی ایک تہذیب اور اس کا بھی ایک کلچر ہے جس کی آئینہ دار اردو شاعری ہے۔ اس لیے اردو کے مشاعرے ہر طرح اس تہذیب اور اس کلچر کے عکاس ہونے چاہئیں جسے ہم اردو تہذیب اور اردو کلچر کہتے ہیں۔ یہ تہذیب اور یہ کلچر عبارت ہے شائستگی، رواداری، فراخدلی اور وسیع النظری سے۔ یہ تہذیب اور یہ کلچر ہر قسم کی سطحیت اور ہر طرح کی غرض پسندی سے دور رہنے کا نام ہے۔ ہمارے مشاعروں کی پوری فضا اور ان کے پیش منظر و پس منظر کو ہر طرح ان صفات سے مزین ہونا چاہیئے تاکہ یہ مکمل طور پر اردو تہذیب اور اردو کلچر کے مظہر ہو سکیں۔"

جناب انیس انصاری کی تقریر کے بعد ہندوستان کے نامور شاعر کرشن بہاری نور سے گزارش کی گئی کہ وہ نعتیہ کلام سے مشاعرے کا مبارک آغاز عطا کریں۔ نور صاحب نے یہ نعتیہ قطعہ پڑھا:—

"دیرے نور چلوں کہ سر تک پہنچا
سلسلہ میرے گناہوں کا کرم تک پہنچا
تیری معراج محمد تو خدا ہی جانے
میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا"

اس قطعہ نے مشاعرہ میں جذب و کیف کی ایک زبردست لہر دوڑا دی اور سامعین

انھیں جم کر داد دیتے رہے۔ تنویر لکھنوی سے یہ
قطعہ بار بار پڑھوایا گیا۔ اس کے بعد تنویر صاحب نے
سات شعروں کی ایک نعت سنائی جس کے درجِ
ذیل اشعار بے حد پسند کیے گئے ؎

" تجھ سے جتنی ہی عقیدت ہے رسولِ عربی
اتنی معبود سے قربت ہے رسولِ عربی
خیرۂ عیسیٰ کی بلندی کی ہے دنیا قائل
ہاں مگر تیری بدولت ہے رسولِ عربی "

تنویر لکھنوی کے نعتیہ کلام کے بعد مشاعرے
کے اصل دَور کی ابتدا ہوئی۔ اردو کے مشہور عرب
نژاد شاعر ڈاکٹر زبیر فاروقی کو سب سے پہلے دعوتِ سخن
دی گئی کیونکہ یہ مشاعرہ اُن کے وطن میں ہو رہا تھا اور
اس وقت انھیں میزبان شاعر کی حیثیت حاصل تھی
فاروقی صاحب نے کئی تین چند اشعار سنائے اور
دو غزلیں پیش کیں۔ اُن کے ذیل کے اشعار نے
سامعین سے کافی داد پائی ؎

" وہ مجھ سے لاتعلق نہیں کس بے خبر تھا
لیکن بھلا لگا ہے کوئی تو ہم سفر تھا
ہاتھوں میں ہاتھ بھی تھے ہم دونوں ساتھ بھی تھے
پھر بھی قدم قدم پر اِک اجنبی سا ڈر تھا "

مہمان شعراء میں پہلے مائکروفون پر تشریف
لانے والے نوجوان پاکستانی شاعر جمال احسانی جنھوں نے
بلند آواز اور پُراثر انداز میں چار غزلیں تحت اللفظ
سنائیں اور مجمع سے خوب خوب داد وصول کی موصوف
کے ان اشعار کو خصوصیت کے ساتھ زبردست داد و
تحسین سے نوازا گیا ؎

" ایک آدمی کی رہائی سے بھی تو ہو جاتا
جو شہر بھر کی گرفتاریوں کے بعد ہوا

اچھا ہوا کہ زندہ نہیں ہیں مرے بزرگ
حاکم بنا ہوا ہے جو کارندہ تھا مرا "

پاکستانی شاعر ننکر امروہوی نے ترنم سے
اپنا کلام پیش کیا۔ انھوں نے پہلے دو غزلیں پڑھیں
پھر جب سامعین نے اصرار کیا تو دو غزلیں اور سنائیں
ان کا ترنم بھی دل کو چھو لینے والا تھا اور اُن کے کلاسیکی
رنگ کے اشعار میں بھی بڑی جاذبیت تھی۔ مندرجہ ذیل
شعروں پر لوگوں نے اُن کو جی کھول کر داد دی ؎

" جب بھی عزمِ جنوں کو اذنِ سفر ملا ہے
پُر پیچ راستے بھی ہموار ہو گئے ہیں "

" تعمیر کے پردے میں ہے تخریبِ جہاں بھی
دُنیا میں مجھے گرتی ہوئی دیوار لگے ہے "

ہندوستان کے مقبول شاعر حبیب ہاشمی بھی
ترنم کے ساتھ غزل سرا ہوئے۔ اُن کی دلکش مترنم
آواز سے سارا مجمع مسحور ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے تین
غزلیں نذرِ سامعین کیں اور ان اشعار پر زوردار
داد سمیٹی ؎

" خرقہ پوشانِ جنوں ہم ہیں ہمیں مت چھیڑو
ضد کرو گے تو شہنشاہ بھی ہو جائیں گے

ٹکرا کے چٹانوں سے بٹ جانے کا سوچو ہیں
بے سمت سفینے کا انجام بھی کیا ہوگا "

نامور پاکستانی شاعر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کو
جب زحمتِ سخن دی گئی تو مجمع نے زبردست تالیوں
سے اُن کا استقبال کیا۔ موصوف نے شائستہ اور مدھم
ترنم کے ساتھ اپنا کلام سنایا۔ شروع میں
انھوں نے ایک تازہ غزل پیش کی جس کے درجِ
ذیل شعروں پر داد دیتے وقت سامعین اتنے جوش
میں آگئے کہ اپنی جگہوں پر کھڑے ہو ہو گئے اور
"مکرر ارشاد" کے پیہم نعروں کے درمیان یہ اشعار
موصوف کو کئی کئی بار پڑھنے پڑے ؎

" آپ کتنے سادہ ہیں چاہتے ہیں بس اتنا
ظلم کے اندھیرے کو رات کہہ دیا جائے
بے حسی کی دنیا سے دو سوال میرے بھی
کب تلک جیا جائے اور کیوں جیا جائے "

چونکہ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم یہاں کے مشاعروں
میں پہلے بھی آ چکے تھے اور ان کی کئی غزلیں یہاں
بے حد مقبول تھیں، اس لیے انھوں نے جیسے
ہی اپنی تازہ غزل ختم کی لوگ مختلف غزلوں کی
فرمائش کرنے لگے۔ قاسم صاحب نے دو ایسی
غزلیں سنائیں جن کی فرمائش ہر سمت سے کی جا رہی
تھی۔ ان غزلوں کے ذیل کے اشعار پر سامعین نے
وجد کی سی کیفیت کے ساتھ داد دی ؎

" شہرِ طلب اگر کرے تم سے علاجِ تیرگی
صاحبِ اختیار ہو آگ لگا دیا کرو

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے مری بساط کیا ایک بجھا ہوا دیا "

ہندوستان کے مشہور دانشور ڈاکٹر اختر
بستوی کے نام کے اعلان پر بھی سارا ہال تالیوں
کی زوردار گڑگڑاہٹ سے گونج اُٹھا۔ اُنھوں نے
بڑے ہی پُروقار انداز میں اپنا کلام تحت اللفظ
پیش کیا۔ پہلے موصوف نے کچھ تشبیہاتی قطعات
سنائے۔ یوں تو اختر صاحب کے ہر ہر قطعہ پر خوب
تحسین بلند ہوتا رہا لیکن ان کے مندرجہ ذیل رومانی
قطعے پر تو ہال میں شاید ہی کوئی ایسا رہا ہوگا جس
کی زبان سے داد نہ نکلی ہو ؎

" تن پہ ملبوس ہرا سبز پری کے مانند
اس پہ زلفیں عجب انداز سے لہرائی ہیں
تجھ کو اس رنگ میں پا کر یہ گماں ہوتا ہے
بدلیاں دھان کے کھیتوں میں اُتر آئی ہیں "

قطعات کے بعد ڈاکٹر اختر بستوی نے
ایک غزل پیش کی جس کے یہ اشعار بہت سراہے گئے ؎

" وہ زیور فرشِ مخمل پر جو ٹوٹا تھا کبھی گر کر
زبانِ خامشی سے کہہ گیا تھا بے وفا مجھ کو
یہ منشا ہے کہ لکھوں وقت کی وحشت کا افسانہ
گئی ہے دے کے اک سادہ ورق پاگل ہوا مجھ کو "

تشبیہاتی قطعات اور غزل سنا کر ڈاکٹر اختر
بستوی جب رخصت ہونے لگے تو مجمع سے "اور"
"اور" کا زبردست شور اُٹھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
انھیں پھر مائک پر آنا پڑا۔ سامعین کی فرمائش پر انھوں
نے کچھ اور قطعات سنائے اور ایک غزل بھی پڑھی
اُن کی دوسری غزل کے ذیل کے اشعار پر بے حد داد ملی

" آساں نہیں انصاف کی زنجیر ہلانا
دنیا کو جہانگیر کا دربار نہ سمجھو
احساس کے سوزِ غم بچا سکتے ہو خنجر
اظہارِ مروت کو اگر پیار نہ سمجھو "

معروف و مقبول پاکستانی شاعر جون ایلیا

کی آمد مرحبا تالیوں کی گونج میں ہوئی۔ وہ بھی یہاں کے جانے پہچانے شاعر تھے اور سامعین اُن کا کلام سننے کے لئے دیر سے منتظر تھے۔ انھوں نے نرم آواز اور لطیف انداز میں تحت اللفظ اپنا کلام پیش کیا اور ہر ہر شعر پر لوگوں کا دل موہ لیا۔ پہلے انھوں نے دو غزلیں خود سے سنائیں پھر جب سامعین نے زوردار اصرار کیا تو ایک غزل اور پڑھی۔ موصوف کے ان اشعار پر ہر طرف سے داد و تحسین کی زبردست بوچھار ہوئی ؂

" بنا ایک رشتہ بپا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم "

" کیسے کہیں کہ تجھ کو بھی ہم سے ہے کوئی واسطہ
تو نے تو ہم سے آج تک کوئی گلہ نہیں کیا
تو بھی کسی کے باب میں عہد شکن ہے غالباً
میں نے بھی ایک شخص کا قرض ادا نہیں کیا "

ہندوستان کے خوش گلو اور خوش فکر شاعر ڈاکٹر ساغر اعظمی مائک پر تشریف لائے تو ایک بار پھر حیات ریجنسی کے خوبصورت کرسٹل ہال کے آئینہ بند در و دیوار تالیوں کی پُرشور آواز سے جھنجھنا اُٹھے۔ دُبئی کے سامعین ساغر صاحب کے سحر انگیز ترنم اور دلنواز کلام سے پہلے سے آشنا تھے چنانچہ اُن کے مائک پر آتے ہی پورے مجمع میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ پھر جب وہ غزل سرا ہوئے تو اُن کے ترنم نے بھی خوب خوب قیامت ڈھائی اور اُن کے اشعار نے بھی خوب خوب طوفان اُٹھائے۔ لوگ فرمائشیں کرتے رہے اور وہ غزلیں سناتے رہے "واہ" اور "مکرر" کے نعروں سے مجبور ہو کر انھیں چار غزلیں پڑھنی پڑیں۔ اُن کے شعروں پر مسلسل داد کے ڈونگرے برستے رہے۔ بالخصوص درج ذیل اشعار پر تو شور تحسین نے شاعر کی آواز کو بھی تادیر دبائے رکھا ؂

" اِس سے بلی جھلی میں آواز کہاں سے لاؤں گا
تاج محل بن جائے گا اعجاز کہاں سے لاؤں گا "

" اب مجھ سے امانت یہ سنبھالی نہیں جاتی
لے وقت بزرگوں کی یہ دستار سنبھالے جا "

اس کے بعد اعلان ہوا پروفیسر پریشان خٹک کے نام کا۔ موصوف پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے چیئرمین ہیں اور گومل یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ یہ بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں اور اُن کا شمار پشتو کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے انھیں اس بھارت پاک مشاعرے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ انھوں نے کلام سنانے سے پہلے سامعین کو مخاطب کر کے کہا:

" میں آج سے پہلے صرف پشتو زبان کا شاعر تھا لیکن آج سے میں اُردو کا شاعر بھی ہو گیا ہوں میری اُردو شاعری کی عمر ابھی بمشکل چند گھنٹوں کی ہے۔ آج صبح جب میں دبئی پہنچا اور ہوٹل کے کمرے میں آرام کرنے کے لئے لیٹا تو میں نے سوچا کہ اُردو کے مشاعرے میں شرکت کرنا اور اُردو کے علاوہ کسی اور زبان کے اشعار سُنانا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ لہٰذا میں نے پہلی بار اُردو میں شعر گوئی کی کوشش کی اور ایک قطعہ بھی کہہ لیا اور ایک غزل بھی مکمل کر لی "

پریشان خٹک جی صاحب کی اس بات پر مجمع نے دیر تک تالیاں بجا کر اظہارِ مسرت کیا۔ موصوف نے تحت اللفظ اپنا کلام سُنایا۔ انھوں نے جب قطعہ پڑھا تو اُس پر بھی لوگوں نے بڑھ چڑھ کر داد دی اور جب غزل پیش کی تو اُسے بھی بھرپور داد سے نوازا گیا۔ خصوصاً اُن کی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار کو سامعین نے کافی سراہا ؂

" فضا میں اُڑتے ہیں بے چین ہر طرف طائر
کسی نے آگ لگا دی ہے آشیانوں میں
غمِ وطن ہے، غمِ زیست ہے، غمِ دل ہے
میں بٹ گیا ہوں پریشان کتنے خانوں میں "

پھر مائک پر آئے کرشن بہاری نور لکھنوی جو مشاعرے کے آغاز ہی میں اپنے نعتیہ اشعار سے سامعین کے دلوں پر اپنا سکہ بٹھا چکے تھے۔ یوں بھی وہ دُبئی والوں کے لئے نئے نہیں تھے اور اُن کے کلام کا جادو یہاں پہلے بھی چل چکا تھا۔ اس لئے اُن کی آمد پر مجمع میں ہر طرف اشتیاق کی ایک لہر دوڑ گئی۔

اُنھوں نے بہت ہی سُبھے ہوئے انداز میں بڑی ہی رکھ رکھاؤ کے ساتھ تحت اللفظ اپنے کلام سے نوازا۔ پہلے انھوں نے ایک تازہ غزل پیش کی پھر ہر جانب سے لوگ اپنی پسندیدہ غزلوں اور اشعار کی فرمائش کرنے لگے۔ چنانچہ تازہ غزل کے بعد نور صاحب نے متعدد متفرق اشعار سُنائے اور دو پُرانی غزلیں پڑھیں۔ اُن کے ذیل کے شعروں پر لوگوں نے خوب لہک لہک کر داد دی ؂

" اُس سے دریافت نہ کرنا کبھی دن کے حالات
صبح کا بھولا جو لوٹ آیا ہو گھر شام کے بعد "

" میں تو غزل سُنا کے اکیلا کھڑا رہا
سب اپنے اپنے چاہنے والوں میں کھو گئے "

پاکستان کے پختہ کار شاعر شبنم رومانی نے بھی تحت میں کلام سُنایا۔ اُن کی آواز قدرے دھیمی تھی لیکن کلام میں ایسی جاذبیت اور اتنی کشش تھی کہ سامعین نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے اُن کے اشعار سُنے۔ شبنم صاحب نے چار غزلیں پڑھیں اور مجمع نے موصوف کے شعروں پر مسلسل داد و تحسین کے نذرانے پیش کئے۔ خاص طور سے اِن اشعار پر انھیں زوردار داد ملی ؂

" سُنا رہا ہوں بڑی سادگی سے پیار کے گیت
مگر یہاں تو عبادت بھی کاروباری ہے
مجھے یہ زعم کہ میں حُسن کا مصوّر ہوں
انھیں یہ ناز کہ تصویر تو ہماری ہے "

ہندوستان سے تشریف لائے ہوئے مشہور ماہرِ عروض و معمّر و کہنہ مشق شاعر ڈاکٹر اوم پرکاش اگروال زار علامی کو زحمتِ سخن دی گئی تو مجمع اُن کے ادب و احترام میں بے حد سنجیدہ ہو کر اُن کا کلام سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ انھوں نے بڑی متانت کے ساتھ تحت میں پہلے کچھ متفرق اشعار پڑھے پھر چند رباعیاں سُنائیں اور آخر میں ایک غزل پیش کی۔ اُن کے کلاسیکی انداز کے کلام میں زبان و بیان کا ایسا لُطف تھا کہ اُن کے اشعار باذوق سامعین کے دلوں میں گھر کر گئے۔ درج ذیل شعروں پر موصوف ۳۱۲ داد حاصل کی ؂

"پھر اختیار کی طاقت دکھاؤں میں تجھ کو
ذرا سی لغزشِ بے اختیار ہونے دے"

"جب سے عرفانِ نظر ہونے لگا
آئینہ میری نظر ہونے لگا"

دہلی کے اس شاندار بھارت پاک مشاعرے کا اختتام پاکستان کے نامور بزرگ شاعر حضرت محشر بدایونی کے کلام پر ہوا۔ سامعین نے شروع میں موصوف سے فرمائش کی کہ وہ ترنم سے اشعار سنائیں لیکن جب انھوں نے فرمایا کہ وہ ترنم ترک کر چکے ہیں تو لوگ خاموش ہو گئے۔ محشر صاحب نے بہت ہی شائستہ انداز میں تحت اللفظ کئی متفرق اشعار پیش کئے اور پھر تین غزلیں پڑھیں۔ اُن کے ہر ہر شعر پر داد کی بوچھار ہوتی رہی۔ مندرجہ ذیل شعر پر داد دینے والوں کا جوش و خروش قابلِ دید تھا۔

"کون کہتا ہے شب کو شب نہ کہو
کچھ تو پینے بھی تو زبان سکے ہیں"

اور جب محشر صاحب نے یہ شعر پڑھا تو داد کے شور کا ایسا طوفان اٹھا کہ معلوم ہوتا تھا ہال کی چھت اڑ جائیگی۔

"اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائیگا"

غزل

ڈاکٹر راہی

تم نے تنہائی میں سوچا ہو خدا ہے کہ نہیں!
سچ کہو شیخ! کبھی ایسا ہوا ہے کہ نہیں
میرے بارے میں نہیں آپ فقط یہ سوچیں
میں نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ بجا ہے کہ نہیں
خوبصورت ہے مہذب ہے اسے دلبر بھی ہے
دیکھنا یہ ہے اُسے پاسِ وفا ہے کہ نہیں
روز وہ راہروؤں کو ہمیں دیتا ہے پیام
یہ الگ بات ہے وہ راہنما ہے کہ نہیں
روز ملتا ہوں میں خود اپنے خدا سے زاہد!
خود کبھی اپنے خدا سے تو ملا ہے کہ نہیں
جاؤ اور قافلہ سالار سے پوچھو راہی
قافلہ اُسکے اشارے پہ چلا ہے کہ نہیں

غزل

پناراعبدالرب نشتر

گلوں سے ہم نے محبت بڑھا کے دیکھ لیا
ہر ایک خار کو دشمن بنا کے دیکھ لیا
جلا سکا نہ محبت کے آشیانے کو
فلک نے بارہا بجلی گرا کے دیکھ لیا
جہاں خرد کا گزر بھی نہ ہو سکا اب تک
وہاں جنوں نے نشیمن بنا کے دیکھ لیا
خزاں کا آج بھی اپنے چمن پہ قبضہ ہے
گو ہم نے جشنِ بہاراں منا کے دیکھ لیا
نظر نہ آیا بُرا مجھ سا کوئی دُنیا میں
جو دل کا آئینہ میں نے اٹھا کے دیکھ لیا
جہاں کی نظرِ غضب اٹھ رہی ہے نشتر پر
جو تم نے اس کو ذرا مسکرا کے دیکھ لیا

غزل

پریم سوشیل درد

جگمگانے لگ گئے ہیں شام سے ہی راستے
جانے کب سے منتظر ہیں آپ کے ہی راستے
شاہراہِ دَیر ہو یا ہو حرم کی رہگذر
ملتی جلتی صورتیں ہیں ایک سے ہی راستے
منزلوں میں سب سے بہتر منزلِ انسانیت
راستوں میں سب سے اچھے پیار کے ہی راستے
دوست بدلیں گے بدلتے موسموں کے ساتھ ساتھ
اجنبی ہو جائیں گے کل آج کے ہی راستے
چل رہے ہیں ہم اُسی کی رہبری میں آج تک
جو بدلتا ہے ہمارے سامنے ہی راستے
ہم سفر بننے کا وعدہ جو کیا کرتے تھے درد
اب بدل دیتے ہیں مجھ کو دیکھتے ہی راستے۔

انگریزی سے ترجمہ

چارلس ٹاور کا بھوت



مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری گفتگو کا موضوع اُس شب اچانک چارلس ٹاور کی سمت مڑ گیا تھا۔ ہم سب کھانے کے بعد بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔ جنوری کی سرد رات تھی۔ اسٹیفن، اپنی میری بیوی جینٹ اور میں سب آتش دان کے قریب بیٹھے ہوئے ہاتھ سینک رہے تھے۔ ہم میاں بیوی اپنی تعطیلات گذارنے کے لئے اسٹیفن کی دعوت پر اس کے یہاں مقیم تھے۔

اسٹیفن نے کہا کہ اسے سرد موسم سے سخت نفرت ہے۔ ایمی نے فوراً یاد دلایا کہ وہ اسے کئی بار کہہ کر چکی ہے کہ ایسے موسم میں کہیں اور چلا جانا چاہئے۔ اور پھر جانے کس طرح موسم کی ہولناکیوں کا ذکر چھڑ گیا اور یہی ذکر بڑھتے بڑھتے چارلس ٹاور کی داستان تک جا پہنچا۔ اسٹیفن نے آسیب کا ذکر چھیڑا تو میں نے فوراً کہا کہ مضافاتی علاقوں کے توہم پرست لوگ اس قسم کی باتوں پر کچھ زیادہ ہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

اسٹیفن نے پوچھا "کس بات پر؟"

"آسیب اور بھوت وغیرہ پر" میں نے جواب دیا۔

"لیکن شاید تم کو یقین نہ آئے گا کہ ان کے بیشتر عقیدے حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں" اس نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"آپ کو تو یہاں دیہات میں رہ کر بس "بھوت" ہی کا جنون ہو گیا ہے" جینٹ نے اسٹیفن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا درحقیقت آپ کو ان لغویات پر یقین ہے؟"

"میں بھوت کے بارے میں کوئی عقیدہ نہیں رکھتا لیکن ....."

"لیکن کیا؟" جینٹ نے پھر پوچھا۔

"کیا تم دونوں نے یہاں آتے ہوئے راستے میں اس ٹاور کو دیکھا تھا جو سڑک کے موڑ پر بالکل کنارے پر واقع ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا "وہ ٹاور مجھے بہت برا لگا تھا میرے خیال میں [illegible] میں سے ہے"

"ہاں وہی چارلس ٹاور کہلاتا ہے" اسٹیفن نے جواب دیا "اور اب اس علاقے میں چارلس کی صرف یہی یادگار باقی رہ گئی ہے۔ اصل قلعہ تو مسمار ہو چکا ہے"

"اور یقیناً ٹاور آسیب زدہ ہوگا" میں نے طنز کیا "مجھے خوب یاد آیا جب ہماری گاڑی ٹاور کے اوپر پہنچی تو ایک بھوت گردن نکال کر [illegible] جھانک رہا تھا"

"اس ٹاور میں کوئی کھڑکی نہیں ہے کہ جس سے باہر جھانکا جا سکے" اس نے [illegible] کہا "اور چارلس ٹاور کا بھوت کوئی مذاق نہیں ہے جو تم اس طرح طنز کر رہے ہو"

"تو گویا اس میں واقعی کوئی بھوت ہے؟" جینٹ نے مضحکہ خیز لہجے میں پوچھا۔

"مقامی باشندوں کا تو یہی خیال ہے"
"مقامی باشندے تو ...."
"اوہ! بھئی تم لوگ بحث مت کرو۔ بلکہ حقیقت بتاؤ" جینٹ نے اشتیاق آمیز لہجہ میں کہا۔ اینی نے ذرا ہی موضوع بدلنے کی کوشش کی اور کہا کہ کافی تیار ہے۔ لیکن اسٹیفن اب بھوت کا قصہ سنانے پر مصر نظر آ رہا تھا۔ اور کسی بھی صورت میں اس موضوع کو بدلنے کے لئے تیار نہ تھا۔ چنانچہ جب کافی پی جا چکی تو اس نے پھر وہی قصہ شروع کر دیا۔

"ہم چارلس ٹاور کا ذکر کر رہے تھے" اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا" سچ پوچھو تو یہ داستان بہت سیدھی اور سادی ہے۔ اب تک اس ٹاور میں قتل کی گیارہ وارداتیں ہو چکی ہیں۔ سب سے پہلا قتل ۱۸۵۲ء میں ہوا تھا اور آخری ۱۹۰۳ء میں۔ یہ تمام تفصیلات تمہیں مقامی آثارِ قدیمہ کے دفتر اور مقامی پولیس اسٹیشن کے ریکارڈ سے مل سکتی ہیں۔"

"اور یہ تمام قتل بھوت نے کئے ہوں گے" میں نے کہا۔

"ہاں پہلے کے علاوہ بقیہ قتل کسی زندہ ہستی نے نہیں کئے۔ اور یہ بات بالکل یقینی ہے۔"

اینی نے دو بارہ موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ "بھئی تم لوگ اور کسی موضوع پر گفتگو کیوں نہیں کرتے۔ یہ کیا فرسودہ تذکرہ لے کر بیٹھ گئے ہو۔"

لیکن جینٹ کی دلچسپی پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں تجسس اور اشتیاق سے چمک رہی تھیں۔

"ہاں تو پھر ان قتل کی وارداتوں کا کیا ہوا؟" اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تمام قتل ایک دوسرے سے مشابہ تھے۔ ان کی ہر تفصیل ایک دوسرے سے ہو بہو ملتی جلتی تھی۔" اسٹیفن نے کہا" اور یہی وہ بات تھی جو سب سے زیادہ عجیب و غریب تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ تمام قتل ایک تسلسل کے ساتھ ہوئے یعنی ہر پانچ سال بعد ایک قتل، اور پھر تمام مقتول جس انداز سے قتل کئے گئے، وہ بالکل یکساں تھے اور بہت ہولناک بھی۔"

وہ ایک لمحہ کے لئے رُک گیا۔

"خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔" اینی نے کہا۔ "تم جینٹ کو خوف زدہ کر دو گے۔ ہم سب کے دل تمہاری طرح مضبوط نہیں۔"

"اوہ! جینٹ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ اور اسٹیفن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی" تم کہے جاؤ مجھے ایسی کہانیوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔"

اسٹیفن نے پھر سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے کہا۔ پہلا قتل بلا شبہ حقیقی تھا۔ ایک نوجوان لڑکی کو اس کے عاشق نے قتل کر دیا تھا۔ وہ ایک مقامی باشندہ تھا اور اس کا عجیب سا نام تھا جیکب بارطلب"

"واقعہ اس طرح مشہور ہے کہ وہ اپنی محبوبہ سے اس ٹاور میں ملاقات کیا کرتا تھا اور وہ دونوں گھنٹوں اس جگہ بیٹھ کر محبت اور پیار کی گفتگو کیا کرتے تھے۔ جیکب شادی شدہ تھا۔ اسی لئے اس کو ایسی ویران جگہ ملاقاتوں کے لئے منتخب کرنا پڑی لیکن کچھ ہی دنوں بعد جیکب اپنی محبوبہ سے تھک گیا۔ ادھر لڑکی حاملہ ہو گئی۔ ایک شب وہ غریب حسبِ دستور اپنا سب کچھ اس کے قدموں پر نثار کرنے آئی تو ہم آغوش ہوتے ہوئے جیکب نے ایک خنجر اس کے سینے میں پیوست کر دیا اور اس طرح محبت نے حسن کی بھینٹ لے لی۔

اینی کانپ اٹھی۔ میں اسٹیفن کے بھیانک اندازِ گفتگو سے بے چین ہو چکا تھا۔

"کیا تم خاموش نہیں رہ سکتے؟" بالآخر میں بھی بول پڑا۔

"رات ویسے ہی بھیانک اور تاریک ہے اور تم جیکب کے بھوت کا قصہ سنا کر ہم سب کی نیند حرام کرنے پر تُلے بیٹھے ہو۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ رات بہت ڈراونی تھی۔ ہر سمت گھٹا ٹوپ تاریکی مسلط تھی۔ ہوا کے چیختے چنگھاڑتے ہوئے تیز جھونکے مکانوں اور درختوں سے ٹکرا کر عجیب ہولناک آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بیک وقت ہزاروں چڑیلیں ویرانوں میں کوئی جشن منا رہی ہوں۔ دفعتوں دفعتوں کے بعد کتوں کے رونے کی آوازیں ماحول کو اور بھی دہشت ناک بنا دیتی تھیں۔

"کیا قاتل گرفتار ہو گیا تھا؟" جینٹ کی دلچسپی بدستور قائم تھی۔

"ہاں، پرانے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے جرم سے اس قدر خوف زدہ ہو چکا تھا کہ ایک ہی ہفتہ بعد خود کو قانون کے حوالے کر کے اقبالِ جرم کر لیا۔ اس کے بعد اس پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ تاہم اسے سزا ہو گئی۔"

"کیسی سزا؟"

"اسے بر سرِ عام پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔"

"خدا کے لئے خاموش رہو" میں نے اینی کا خوف زدہ چہرہ دیکھ کر پھر کہا۔

"تم ان لوگوں کی پرواہ مت کرو۔ ہاں تو دوسری وارداتوں کا قصہ کیا ہے۔" جینٹ نے وفورِ شوق سے پوچھا۔

"ہاں تو جیکب بارطلب کو پھانسی دیدی گئی، اور اس کے کچھ عرصہ بعد مقامی باشندوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ اس ٹاور پر جیکب کے بھوت کا قبضہ ہے اور وہ آسیب زدہ ہے۔ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن لوگوں نے وہاں جانا ترک کر دیا خصوصاً رات کے وقت صرف وہی لوگ جاتے تھے جنھیں بھوت پریت پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اس ٹاور پر کسی بھوت کا قبضہ نہیں ہے۔ یہ بھوت اور آسیب وغیرہ توہم ہے۔ چنانچہ کئی باہمت آدمیوں نے مقامی باشندوں کی ضعیف الاعتقادی کو ثابت کرنے کے لئے وہاں شب باشی شروع کر دی۔ میرے خیال میں بہت سے لوگ وہاں رات کو رہے لیکن بالآخر ان میں سے گیارہ کو ہولناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔"

"کیا حشر ہوا اُن کا؟" میں دریافت کئے بغیر نہ رہ سکا۔

اسٹیفن نے جواب دینے کے بجائے ہاتھ سے اپنے گلے پر چھری پھیر کر بتایا۔

"لغو۔ واہیات" میں نے کہا۔

"ممکن ہے پیکن میں گاؤں کے ایسے لوگوں سے تم کو ملوا سکتا ہوں جنھوں نے دونوں مقتولوں کو بہ چشم خود دیکھا تھا اور وہ ۱۹۰۳ء کے اس ہولناک قتل کی شہادت دے سکتے ہیں جو اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ مقتول اسکول ماسٹر تھا جس کا نام ہونارڈ کوئیل تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی آخری شب اس آسیب زدہ ٹاور پر اپنے ایک دوست کے ساتھ بسر کی۔ انھوں نے حسب دستور ٹاور کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ دوسری صبح اسکول ماسٹر کی گردن جسم سے الگ پائی گئی اس کا دوست بیہوش تھا اور ایک ہفتہ کے بعد جب وہ عالم ہوش میں آیا تو پاگل ہو چکا تھا۔"

اب میرے صبر کی انتہا ہو چکی تھی اور مجھے خود اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کیوں کہ میں نے اس خرافات میں دلچسپی لی۔ ممکن ہے یہ سب کچھ حقیقت ہو۔ پھر بھی اتنی بھیانک رات میں اس ذکر نے سب پر خواہ مخواہ کا ہراس طاری کر دیا تھا۔ اور میں یوں محسوس کر رہا تھا کہ سب ہی اس ان دیکھے بھوت کے وجود سے خوف زدہ ہیں اور اب تو جینٹ بھی کچھ فرزدہ سی ہو گئی تھی۔ میں اپنے آپ پر لعنت بھیج رہا تھا کہ کیوں میں اسٹیفن کی دعوت پر تعطیلات گزارنے اس مقام پر آیا۔

ایک بات اور مجھے ناگوار گزر رہی تھی کہ اس گفتگو میں جینٹ میرے خلاف اسٹیفن کا ساتھ دے رہی تھی۔ اسٹیفن نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"آرتھر! تم جیسے آدمی کا جسے روحانیت پر اعتبار ہی نہ ہو، واسطہ کسی بھوت سے پڑ جائے تو ساری مادہ پرستی دھری رہ جائے گی۔"

جینٹ نے فوراً ہی کہا۔

"ہاں یہ بالکل صحیح ہے آرتھر۔ تم بھی کیوں نہیں ایک مرتبہ ہمت کرتے ہو۔ ممکن ہے تم ہی ثابت کر سکو کہ چارلس ٹاور میں کوئی بھوت نہیں ہے۔"

اسٹیفن نے پھر شہہ دی۔

"میں سو پونڈ کی شرط لگاتا ہوں کہ تم جیک کے بھوت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہمت ہے تو آج ہی آزما لو۔"

میں پریشان ہو گیا کہ اب کیا کروں۔ میں خواہ مخواہ ان دونوں کی شہ پر ایسی حماقت کرنے کو تیار نہ تھا کہ اس بھیانک طوفانی رات میں اپنی نیند حرام کر کے اس بوسیدہ ٹاور میں جاؤں۔ لیکن اسٹیفن نے مجھے بالکل کھلا ہوا چیلنج دے دیا تھا۔ اور جینٹ بھی میری ہمت آزمانا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا طنز جھلک رہا تھا۔ میں نے بہت چاہا کہ اس شرط کو نظر انداز کر دوں مگر جب کوئی عورت مرد کی آزمائش کر رہی ہو تو....."

"میں تیار ہوں" خود بہ خود میرے لبوں سے یہ جملہ نکل گیا۔

"بہت خوب! آفرین ہے تمہاری ہمت پر۔"

اسٹیفن اچھل پڑا۔

میں نے جینٹ کی سمت دیکھا۔ وہ بھی مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ جیسے میری ہمت کی داد دے رہی ہو۔

"تم تینوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" ایمی نے کہا۔ "تم لوگ اس ذکر کو ختم کر کے کوئی اور بات کیوں نہیں کرتے۔"

لیکن اب بات کیسے ختم ہوتی؟

"مجھے تمہارا احمقانہ چیلنج قبول ہے اور آج ہم دونوں کو اس ٹاور میں ٹھہرنا ہے۔ تاکہ تمہیں اطمینان ہو جائے۔"

چارلس ٹاور سڑک کے کنارے ایک سنسان کنج میں واقع تھا، جس کے ایک طرف خشک جھاڑیاں تھیں اور دوسری طرف ناہموار میدان۔ اسٹیفن نے کہا کہ صرف آدھ گھنٹہ میں ہم وہاں پہنچ کر اطمینان کر لیں گے۔ اس وقت گیارہ بجنے والے تھے اور ہمیں وہاں پہنچ کر دو بجے تک ٹھہرنا تھا کیوں کہ آدھی رات کا وقت ہی ایسے مقامات کی آزمائش کے لئے زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ اس وقت عموماً بد روحیں اپنے مسکنوں سے باہر نکلتی ہیں۔ اور رات کی تاریکیوں میں ایسے مقامات پر منڈلاتی ہیں۔

ایمی اور جینٹ کو اس دوران گھر میں رہ کر ہمارا انتظار کرنا تھا۔ ایمی کی نگاہوں میں خوف پھر اس کی پرچھائیاں بھی لرزاں اور رقصاں تھیں لیکن جینٹ بالکل پُر سکون تھی۔

سرد ہوا کے جھکڑ اور بھی شدید ہو گئے تھے اور اب ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو چکی تھی کبھی کبھی بجلی کی گرج چمک باہر کی ڈراؤنی فضا کی ایک ہلکی سی جھلک دکھا دیتی تھی۔ لیکن اسٹیفن ان سب چیزوں سے بے نیاز برساتی اور دیگر ضروری اشیاء جمع کرنے میں مصروف تھا۔ نجات کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

"ہم اسے بھی ساتھ لئے چلتے ہیں۔" اسٹیفن نے ایک بڑی سی رسی لیتے ہوئے کہا۔ "آسیب زدہ ٹاور تقریباً پچاس فٹ بلند ہے۔ اور ایک چکر دار زینہ اوپر تک چلا گیا ہے۔ اور جب دروازہ بند کر دیا جائے تو پھر اندر ہی سے کھولا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح ہم اندر بالکل محفوظ رہ سکتے ہیں۔ کوئی بھی باہر کی شے اندر داخل نہیں ہو سکتی۔ اس ٹاور کا خوب اچھی طرح معائنہ کیا جا چکا ہے اور یہ بات مصدقہ ہے کہ اس میں کوئی خفیہ دروازہ موجود نہیں ہے۔ اور اس کی تمام دیواریں ٹھوس اور محفوظ ہیں۔ آدھا زینہ طے کرنے کے بعد ایک چھوٹا سا چبوترہ ملتا ہے۔ ہم میں سے ایک وہاں ٹھہر سکتا ہے اور دوسرا چوٹی تک جا سکتا ہے۔ اس وقت یہ رسی ہمارے درمیان تعلق قائم رکھے گی۔ اس کا ایک سرا چبوترہ پر کھڑے ہوئے شخص کے پاس رہے گا اور دوسرا سرا اوپر جانے والے کے پاس۔ خطرہ درپیش ہونے کی صورت میں رسی کو بار بار جھٹکے دیں گے تاکہ دوسرا فوراً مدد کو پہنچ جائے۔ اطمینان کی صورت میں رسی کو صرف تین بار جھٹک کر اطمینان دلایا جائے گا۔"

ہم دونوں نے خوب اچھی طرح سردی کا دفاع کر لیا تھا۔ کیوں کہ باہر خون منجمد کر دینے والی ٹھنڈ تھی۔ اسٹیفن کے پاس ایک ٹارچ تھی جس کی روشنی میں ہم ناہموار راستے کو طے کر رہے تھے تھوڑی ہی دیر بعد ہم چارلس ٹاور پہنچ گئے۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اندھیرے میں کوئی دیو قامت سیاہ بھوت سامنے کھڑا ہے۔



ہم ابھی دروازے سے اندر داخل ہوئے مکڑی کے جالے ہمارے چہروں سے چپک گئے۔ اسٹیفن نے زور لگا کر دروازہ اندر سے مقفل کر دیا اور اس طرح ہم اس منحوس جگہ پر محفوظ طریقے سے مقید ہو کر رہ گئے۔

اندر پُراسرار سکوت چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی قبرستان یا اہرام کے اندر داخل ہو گئے ہیں، جہاں موت کی سی خاموشی مسلط تھی۔ البتہ باہر چلتی ہوئی تیز ہوا کے جھکڑوں کی آواز اب سسکیوں کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ اور اس ہولناک فضا میں ایک عجیب سی دم گھٹا دینے والی بُو موجود تھی۔ سیڑھیاں بالکل ہمارے سامنے تھیں ہم ٹارچ کی زرد روشنی میں اوپر چڑھنے لگے۔ تقریباً پندرہ فٹ اوپر چڑھنے کے بعد اس چبوترہ پر پہنچ گئے جس کا ذکر اسٹیفن نے کیا تھا۔

"سب سے پہلا قتل اسی جگہ ہوا تھا"۔ اسٹیفن نے بتایا "جیکب بارنلب نے اپنی محبوبہ کو اسی جگہ ذبح کیا تھا۔ لیکن خیر! اب ہم ٹاس کر کے طے کریں گے کہ کسے اوپر جانا ہے۔"

ہم نے جیب سے سکہ نکال کر ٹاس کیا۔ اور اسٹیفن کی ہار پر نہ جانے کیوں مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب مجھے اوپر جانا تھا اس لئے میں نے ٹارچ اسٹیفن کے حوالے کر دی اور اس نے بلا تأمل اسے لے لیا۔

میں نے رسی کا ایک سرا اُٹھایا اور زینے طے کرنے لگا۔ سیڑھیاں ٹوٹی پھوٹی اور بے حد خطرناک تھیں۔ بھیانک سی تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ اور میں لڑکھڑاتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اوپر پہنچ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کیونکہ زینے کے اختتام پر ٹاور کی کھلی ہوئی چھت تھی۔ تازہ ہوا سے میری جان میں جان آئی۔

میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ میں نے صرف آزمانے کے لئے رسی کو تین بار جھٹکے دیئے جس کے جواب میں نیچے سے اسٹیفن نے بھی جھٹکے دیئے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ طریقہ بے حد کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ چکردار زینے پر گھومتے ہوئے آنے کے سبب رسّی کا جھٹکا بہت ہلکا محسوس ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کو بہت آسانی کے ساتھ واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

میں اطمینان کے ساتھ چبوترہ کے نیچے بیٹھ کر وقت کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا سے میرے دل کا وہم دُور ہو چکا تھا اور مجھ پر چھایا ہوا ہراس بھی غائب ہونے لگا تھا میں نے پائپ نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور تب مجھے خیال آیا کہ وہ تو میں گھر ہی پر بھول آیا ہوں۔ مجھے سخت کوفت ہوئی۔ کیونکہ ایسے موقعہ پر تمباکو نوشی ایک بڑا سہارا ثابت ہوتی ہے۔ میں مجبوراً اسٹیفن اور جینٹ کی اس احمقانہ شرط کے متعلق سوچنے لگا اور پھر اچانک بالکل غیر ارادی طور پر ذہن آج کی تاریخ کی طرف چلا گیا۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۰۸ء۔ ۱۹۰۸ء! آخری قتل ۱۹۰۳ء کو ہوا تھا۔ اور آج اس واقعہ کو تقریباً پانچ سال ہو چکے تھے۔ تو کیا! ابھی میں اسی قدر سوچ پایا تھا کہ اچانک میں نے محسوس کیا کہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی رسی میں ہلکے ہلکے مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔ پہلے مجھے یقین نہ آسکا۔ اس لئے میں کھڑا ہو کر زینے کے پاس پہنچ گیا تاکہ رسّی کو کچھ ڈھیل مل جائے۔ اس مرتبہ جھٹکا بلاشبہ زیادہ صاف اور تیز تھا۔ میں نے آزمانے کے لئے فوری جھٹکا دیا۔ لیکن پھر بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے وقت دیکھا تو ایک بجنے میں ۱۸ منٹ باقی تھے۔

طوفان قدرے ختم ہو چکا تھا اور ہوا کی شدت میں بھی کمی ہو گئی تھی لیکن اب بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور تب —! رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی زینے کے نیچے سے ایک ہولناک چیخ فضا کے سکوت کو درہم برہم کر گئی۔ خوف سے میرا خون منجمد ہو گیا۔ میرے قدم کپکپانے لگے اور میرے ہوش و حواس بالکل گم ہو گئے۔ اس قدر بھیانک چیخ میں نے زندگی میں پہلی بار سُنی تھی۔ چیخ کی آواز آدھے گھنٹے تک فضا میں گونجتی رہی۔ میں پسینہ میں تر اپنی جگہ کھڑا ہوا کانپتا رہا۔

میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رسّی میں دوبارہ جھٹکے محسوس ہوئے۔ میں نے سوچا کہ مجھے بھاگ کر نیچے پہنچنا چاہیئے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اسٹیفن کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا اور آیا یہ چیخ اُس کی تھی یا کسی اور کی۔ مجھے طے شدہ وعدے کے تحت فوری طور پر اس کی مدد کے لئے پہنچنا تھا لیکن میرے پاس ٹارچ نہیں تھی۔ اور سیڑھیاں خطرناک حد تک شکستہ تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اسٹیفن کسی سے خوفزدہ ہو گیا ہے تو بھی اسے اس طرح بزدلی سے چیخنا نہیں چاہئے تھا کیونکہ وہ خود ہی ضد کر کے مجھے یہاں لایا تھا۔

میں اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ حالانکہ مجھے اسٹیفن کی مدد کو جانا چاہئے تھا۔ میں زینے کے سرے پر ہی کھڑا رہا۔ رسّی میں اب بالکل جھٹکے

سوس نہیں ہو رہے تھے۔ اچانک مجھے زینے پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی شخص دھیرے دھیرے اوپر آ رہا ہو۔ میں نے ایک دفعہ اسٹیفن کا نام لے کر پکارا لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے وہ آواز میری اپنی نہیں تھی۔

"اسٹیفن!" میں نے دوبارہ پکارا "کیا بات ہے" لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ البتہ لڑکھڑاتے قدموں کی آواز دمبدم نزدیک آتی جا رہی تھی۔ اور اسی وقت مجھے ایک عجیب سی آواز سنائی دی جیسے کوئی زور زور سے ہانپ رہا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک گھٹی ہوئی کراہ بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد ٹارچ کی روشنی کی جھلک مجھے دکھائی دی جو بوسیدہ دیواروں پر لرز رہی تھی۔ اس زرد روشنی میں مجھے اسٹیفن کی جھلک نظر آئی۔ تب اچانک مجھے ہوش آ گیا۔ میں بے تحاشا بھاگتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ بار بار میں اسٹیفن کو پکار رہا تھا لیکن کوئی جواب نہ ملتا تھا۔

اور جب میں کئی سیڑھیاں اتر چکا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ چیخ کیسی تھی۔ اور اسٹیفن کیوں جواب نہیں دے رہا تھا۔ کیوں کہ وہ میرے قدموں کے پاس پڑا ہوا تھا۔ وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا تھا اور جیسے ہی میں اس کے پاس پہنچا، اس نے ٹارچ کی روشنی اوپر ڈالی تاکہ میں اسے دیکھ سکوں۔

یہ صرف اسٹیفن جیسے باہمت اور تندرست شخص کی طاقت تھی جو اس سیڑھی تک پہنچ گیا تھا کیوں کہ ٹارچ کی روشنی میں، میں نے دیکھا اس کا چہرہ اور بر ساتی خون سے تر ہے۔ اور جیسے ہی میں نے گھبرا کر اسے تھاما، اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے برساتی کا کالر الٹ کر دکھایا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خوف سے میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ کیوں کہ میں نے دیکھا کہ اس کی گردن ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بالکل کٹی ہوئی تھی اور اس میں سے خون کی مسلسل دھار بہہ رہی تھی۔

وہ مجھے اس لئے جواب نہیں دے رہا تھا کہ اس میں بولنے کی طاقت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے حلق سے بڑی کربناک خرخراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ غالباً وہ بولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن حلق سے بلند ہوتے ہوئے خون کے فوارے میں اس کی آواز رک جاتی تھی۔

جیسے ہی میں نے اسے دونوں بازوؤں میں تھاما، وہ لڑکھڑایا اور ٹارچ اس کے ہاتھ سے نیچے جا گری۔ اور اچانک خرخراتی آواز میں اسٹیفن کراہا۔

"مت..... جاؤ..... مت..... جاؤ۔"

میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ غالباً اس پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ایک بار پھر ہولناک سکوت چھا گیا۔ موت کا سکوت۔ میں سمجھ گیا کہ اسٹیفن مر چکا ہے۔

رنج و غم اور خوف و ہراس کی شدت سے میں دم بخود رہ گیا تھا۔ رسّی کا سرا ہنوز میرے ہاتھوں میں تھا۔ اسٹیفن کی سرد اور خون آلود لاش میرے قدموں میں پڑی تھی۔ طوفان نے پھر شدت اختیار کر لی تھی۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تاریک زینے پر کھڑے کھڑے خوف سے میرا خون منجمد ہو چکا تھا۔ میں ۴۵ فٹ کے اس بلند ٹاور کے اندر تنہا کھڑا تھا۔ میرے ہر سمت پُراسرار سکوت اور خوفناک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ نیچے جانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ لیکن درمیان میں کیا شے ہو سکتی تھی۔

میرے دماغ میں صرف ایک خیال تھا کہ میں کسی صورت میں باہر نہیں پہنچ سکتا۔ میرے قدم منجمد ہو چکے تھے۔ اسٹیفن کی بھیانک موت سے میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ میرے ہاتھ پیر برف کی طرح سرد تھے اور میرا چہرہ پسینہ سے تر ہو چکا تھا۔ میرے ذہن میں عجیب بھیانک خیالات آ رہے تھے۔ دیوار کا سہارا لئے ہوئے میں نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی تاکہ کسی خوفناک منظر کو نہ دیکھ سکوں۔ لیکن جیسے ہی میں چلا، میں نے محسوس کیا کہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی رسّی کو کسی نے جھٹکا دیا۔ میں دم بخود کھڑا رہ گیا۔ جھٹکا پھر محسوس ہوا اور پھر رسّی میں کھنچاؤ سا محسوس ہوا ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی دھیرے دھیرے رسّی کھینچ رہا ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ رسّی کو پھر جھٹکا لگا۔ اس مرتبہ جھٹکا اور تیز تھا۔ خوف سے میرا جسم کانپنے لگا میرے قدم لڑکھڑائے۔ جھٹکے اب مسلسل لگ رہے تھے۔ اور تب مجھے محسوس ہوا کہ کوئی..... شے اوپر آ رہی ہے۔ رسّی کا سہارا لئے ہوئے وہ دمبدم مجھ سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی آ رہا تھا۔ اس کی تیز سانس کی آواز اب میرے انتہائی قریب پہنچ چکی تھی۔ اوہ میرے خدا..... !!

ایک بھیانک تیز چیخ میرے لبوں سے بلند ہوئی۔ میں نے اوپر بھاگنے کی کوشش کی لیکن بے سود! اس کی سانسوں کی آواز اب غراہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے اوپر سے نیچے پوری قوت سے چھلانگ لگا دی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی عمیق اور بدبودار غار میں گرتا جا رہا ہوں۔ اور پھر میرا وجود دھم سے نیچے فرش پر گر پڑا۔ مجھے اپنے سر پیر کا قطعی ہوش نہ رہا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اور دیوانوں کی طرح تاریکی میں دیواروں پر ہاتھ مار مار کر دروازہ تلاش کرنے لگا۔ اتنی بلندی سے نیچے گرنے کے باعث میرے جسم کی کئی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور جسم کا گوشت کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا لیکن اس وقت موت کو اتنے خوفناک روپ میں اپنے سامنے دیکھ کر اس ٹوٹ پھوٹ اور زخموں کا ہوش ہی کسے تھا۔

بالآخر وہ دروازہ مل گیا۔ لیکن اُف میرے خدا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں دروازہ کبھی نہ کھول سکوں گا۔ میری قوت جواب دینے لگی۔ دفعتاً میرے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے کوئی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے اترتا ہوا نیچے آ رہا ہے۔ میرے جسم میں [illegible]

کی سرد لہر دوڑ گئی۔ میری حالت اس وقت بچے کی سی تھی جو جو بچہ دان میں پھنس چکا ہو اور جس کا انجام ہر حالت میں موت اور صرف موت ہو۔ بے بسی کی موت!! اس کے قدموں کی آواز ہر لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ میں ایک بار پھر اپنی تمام تر قوت مجتمع کر کے دروازہ کا آہنی کنڈا کھولنے کی آخری کوشش کی اور پھر دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ باہر کی دُنیا کی سرد ہوا کا جھونکا مجھے زندگی بخشتا ہوا گذر گیا۔ یکایک مجھے اپنے پیچھے غراہٹ کی تیز آواز سنائی دی اور اسی لمحہ اندھیرے میں ایک خنجر کی چمک نے میری آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ میں نے دروازے کے پٹ کو پوری قوت کے ساتھ کھول دیا اور دُوسرے میں جس قدر تیزی سے دوڑ سکتا تھا، دَوڑتا چلا گیا۔ اس منحوس ٹاور سے باہر نکلتے ہوئے میرے کانوں میں اس نادیدہ شے کے خنجر کے دروازے میں پیوست ہونے کی آواز آئی۔

میں جس سمت دوڑ رہا تھا، وہ ناہموار میدان تھا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخموں سے چور جسم کے ساتھ میں کب تک دوڑ سکتا تھا۔ تھوڑی ہی دُور پہنچ کر میں بے دَم ہو کر گر پڑا۔ اپنی گہری گہری اور تیز سانسوں کے درمیان مجھے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ تاریکی میں، میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن میری پلکیں اس قدر بوجھل ہو گئی تھیں کہ میں آنکھیں کھول ہی نہ سکتا تھا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز تیزی سے میرے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میرے ڈوبتے ہوئے ذہن میں آخری خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ اب دُنیا میں کوئی طاقت مجھے اس نادیدہ قوت کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتی اور اس کے ساتھ جیسے ہی میں نے اپنے جسم پر کسی کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت محسوس کی میرے لبوں سے ایک خوفناک اور دلخراش چیخ بلند ہوئی...

اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو اسٹیفن کے کمرے میں پایا۔ جینٹ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ خوب روئی تھی۔

بعد میں مجھے اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے جانے کے ایک گھنٹہ بعد وہ بھی ہمارے پیچھے ٹاور تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن ٹاور کا دروازہ چونکہ ہم نے بند کر دیا تھا۔ اس لئے باہر ہی ایک محفوظ مقام پر چھپ کر آنے والے واقعات کی منتظر رہی۔ اور وہ بیہوشی کے عالم میں مجھے وہاں سے اُٹھا لائی۔

اِس واقعہ کے کوئی آٹھ، نو مہینے بعد میں چلنے پھرنے کے قابل ہو سکا۔ لیکن اب بھی چارلس ٹاور کے بھوت کی دہشت کی وجہ سے اکثر و بیشتر میری راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔

علامہ عروج زیدی مرحوم

یہ جہاں، وہ جہاں، ہر جہاں آپ کا
شش جہت میں ہے سکہ رواں آپ کا
اے خوشا یہ کرم بے کراں آپ کا
مجھ کو آواز دے آستاں آپ کا
میری ہر سانس ہے عالمِ وجد میں
نام نامی ہے وردِ زباں آپ کا
آپ محبوبِ خلاقِ کون و مکاں
آپ سب کے ہیں سارا جہاں آپ کا
آپ قرآن کی زندہ تفسیر ہیں
کس طرح ہو کوئی ہم زباں آپ کا
آپ کا ہر قدم ہے بہار آفریں
کلمہ پڑھتی ہے فصلِ خزاں آپ کا
کیوں نہ ذرہ مرکزِ علم و تہذیب ہو
آستاں! اور پھر آستاں آپ کا
تا بہ سدرہ ملائک جلو میں رہے
اِس سے آگے خدا راز داں آپ کا
سر نہ پہنچا کسی کا جہاں آج تک
دیکھئے تو قدم ہے وہاں آپ کا
رنگ و نکہت کی چاروں طرف دھوم ہے
گل فشاں، بے خزاں گلستاں آپ کا
جانے کیا ہوتا محشر میں حشرِ عروج
سلسلہ آ گیا درمیاں آپ کا



خدیجہ مستور

پیوند

بتیسی کھیسی کا قول یقیناً بڑے رنگین مزاج مرد نے گھڑا ہوگا۔ ایسے اقوال زریں سے عورتیں لاکھ چڑیں، مگر کبھی کبھی یہ کتنے سچے معلوم ہوتے ہیں۔

اب کوئی فاطمہ کو دیکھے۔ اس نے خود ہی تیس سال کی عمر میں کھیسیں نکال دی تھیں۔ اس کی آنکھوں کا تو یہ حال تھا جیسے فاطمہ سے تیس سال پہلے پیدا ہو گئی ہوں۔ ہر وقت سفید سفید کیچڑ بھرا رہتا۔ ذرا ذرا دیر بعد میلے میلے آنسو آنے لگتے، سامنے دھندھ چھا جاتی، دوپٹے کے پلّو سے رگڑ رگڑ کر آنکھیں صاف کرتی جاتی، تب کہیں سلائی کا کام پورا ہو پاتا۔ آنکھوں کی اس درگت کے باوجود ایسی باریک بخیا کرتی کہ مشین کی سلائی کا دھوکا ہوتا۔ پہلے تو بخیہ ادھیڑنے کی نوبت نہ آتی تھی، مگر اب کچھ دنوں سے کام گڑبڑ ہو جاتا تا ادھر [illegible] ہوتے اور اس نے ابھر ابھر کر کھولنا شروع کیے۔

محلے کی ساری عورتوں کو فاطمہ پر رحم آتا۔ میاں ہی اسے ایسا نکھٹو ملا تھا جو کوئی کام کر کے نہ دیتا تھا۔ شادی کو دس سال ہو گئے تھے۔ چار عدد بچوں کا باپ تھا، اس کے باوجود روزی کمانے کی بیڑے سے سنتا ہی نہ تھا۔ جب تک اس کا باپ زندہ رہا، اپنی پنشن سے سب کے دال دلیے کا انتظام کر دیتا۔ وہ جب مرا تو فاطمہ کو آس بندھی کہ اب آپ ہی کوئی کام کرے گا، مگر جب فاقے پڑے اور میاں کے معمول میں فرق نہ آیا تو فاطمہ نے اس کے باپ کی جگہ سنبھال لی۔ پھر اس بے چاری کی کون سی پنشن آتی۔ سارا دن ہاتھوں میں سوئیاں بھونکتی تب کہیں بچوں کی دو فراکیں یا ایک جمپر تیار کر پاتی۔

اس زمانے میں تو سلائی ملنا بھی مشکل ہوتی۔ آج کل تو ایک روپیہ روز کمانے والا مزدور بھی جب سال میں ایک قمیص سلاتا ہے تو سلائی کا ایک روپیہ درزی کی خدمت میں پیش کرنے کو پہلے ہی رکھ چھوڑتا ہے۔ یہ تو فاطمہ کے محلے والوں کے رحم و کرم کا نتیجہ تھا کہ اسے سلائی کے لیے کپڑے دیتے رہتے۔ اس طرح اس مہنگائی کے زمانے میں بھی کچھ بچت ہو جاتی اور سلائی کبھی ایسی نہ ہوتی کہ کھاتا نظر آتا۔

فاطمہ کو بڑی اچھی سلائی آتی تھی۔ سوتیلی اماں تو مارے دشمنی کے سارا سارا دن اپنے آدھے درجن بچوں کے کپڑے سلواتی تھی، مگر آج یہی ہنر فاطمہ کے کام آ رہا تھا۔ محلے کی عورتیں تعریف کرتے ہوئے کہتیں "فاطمہ کے ہاتھ تو جانو بالکل مشین ہیں" اپنی تعریف سن کر فاطمہ پھولے نہ سماتی۔ ویسے یہ تعریف اس کی سوتیلی ماں کے حق میں بھی جاتی تھی، مگر خیر سے کبھی کسی نے سلائی سکھانے والے کی تعریف ہی نہیں کی ورنہ فاطمہ ضرور منہ نوچ لیتی۔ سوتیلی ماں کی کوئی اچھی بات اسے یاد ہی نہ تھی۔ وہ تو صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ اس کی ماں کی وجہ سے اس کی زندگی برباد ہو گئی۔ اسے سب کچھ یاد تھا۔ سوتیلی اماں نے اسے کتنی بے دردی سے [illegible] تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ لڑکا کما [illegible] تیس [illegible] کی عمر میں بھی ایک دھیلا کما کر نہیں دیتا۔ [illegible] کا کمانے کی عادت ہے پھر بھی اسے بیاہ کر [illegible] چپکا لی تھی۔ اسے یہ بات بھی خوب یاد تھی کہ [illegible] دنوں سوتیلی اماں اس کے جہیز کا [illegible] تیار کر رہی تھی تو ہر وقت اسے [illegible]

[illegible] جو کر کھائے لیتا تھا کہ اس کے جہیز کے [illegible] کا پیٹ کٹ رہا ہے۔ وہ ان [illegible] میں جو ٹاپکا تا تکتے ہوئے تڑپ کر اسے [illegible] سے فاطمہ شوق سے پہننا نصیب نہ ہو۔" پھپھی اسے پہن نہ پاتیں اور فاطمہ کی مرحوم ماں کو ہی باتیں سنانے لگتی۔ "خود تو جنّ کر چھوڑ گئی اور یہ مصیبت میں ڈال گئی۔"

ان باتوں کو گزرے دس سال ہو گئے۔ پھپھی ماں کب کی قبر میں سو چکی تھی لیکن فاطمہ ابھی تک بدلے چکا رہی تھی۔

"اللہ کرے گود میں کیڑے پڑیں لوا" جہاں بیٹھے بیٹھے بیزی کمر کر اکتی تو بددعا بڑے بے ساختہ پن سے زبان پر آجاتی۔ جانے لوگ یہ بددعائیں کیوں دیتے ہیں۔ یہ زمین تو ویسے ہی کیڑے مکوڑوں سے بھری پڑی ہے۔ پھر یہ سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ بے چاری کو کب کیڑوں سے پاک صاف ہو گی! یہ بددعائیں شاید اسی لیے وجود میں آئی تھیں کہ ایک ذرا دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہو گی۔ پھر فاطمہ کیسے چوکتی۔

ادھر شام روندناتی ہوئی چلی آرہی تھی اور فراک کالا دوبارہ ادھیڑنے کے بعد بھی ٹھیک نہ ہوا تھا۔ سے اوپر کے تینوں لڑکے اور لڑکی سر پر اودھم مچا رہے تھے۔

"اب آٹھ فراک نہیں جلائیں، میں قینچی سے کاٹ دوں گا اس فراک کو" آٹھ سال لڑکا ہاتھ میں قینچی لیے دور سے دھمکا رہا تھا۔

"ذرا قریب آ تو بتاتی ہوں"

"بڑی آئیں جلانے والی، میں تو ساری فراک کاٹ دوں گا۔ ہمیں بھوک لگی ہے۔" وہ دیدے گھما کر آگے بڑھا۔

"ذرا اور پاس آ" فاطمہ بھی دھمکا رہی تھی۔ ویسے تو بچے چاہے کچھ کرتے رہتے کبھی دو تھپڑ نہ لگاتی بس زبان ہی چلاتی۔

"بھوک لگی ہے" باقی تینوں بھی اسی طرح کی ایک ہی دھن میں ٹھنک رہے تھے۔

"مجھے کھا لو تو بھوک مٹ جائے سو روپے" کے پلو سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔ پھر دھند چھا رہی تھی۔ اس پر گوندتے ہوئے روشنی کی [illegible] کرنے کی دہلیز سے کتے صحن میں آ گئی۔ لڑکوں نے ماں کو قابو میں نہ آتے دیکھ کر دوسرا حربہ استعمال کیا۔ وہ تینوں کم زور سی بہن پر پل پڑے۔ فاطمہ اسے چاہتی جو زیادہ تھی۔ لڑکی کی ذات اپنی ماں کے پاس تو سکھی رہے۔ نہ جانے اگلی زندگی کیسے گزرے۔

"ٹھہر جاؤ بھوکے کتو!" آخر تنگ آ کر وہ جلدی سے ان کی طرف لپکی۔ تینوں لڑکے گلی میں بھاگ گئے اور لڑکی کو سینے سے لگائے لگائے وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

آگ جلا کر آٹا گوندھ رہی تھی کہ قاسم آ گیا فاطمہ نے چوری چوری اس کی طرف دیکھا اور اپنے کام میں لگ رہی۔

"آگ جلا چکیں؟" وہ باورچی خانے کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی جلدی سے باپ کی گود میں سوار ہو گئی۔

"ہوں!"

"اچھا آٹا گوندھ رہی ہو؟" اس کی آواز بھکاریوں ایسی لجاجت تھی۔

"ہوں"

"اتنی تیزی سے آیا ہوں کہ سانس پھول گئی۔"

"ایں!" فاطمہ کو اپنی سانس رکتی محسوس لگی۔ شام کے چھ سے پہلے آنے کا مطلب وہ خوب جانتی تھی۔

"میں نے آج سلائی نہیں کی" اس نے بہانہ کیا۔

"تو وہ سامنے کیا رکھا ہے۔"

"کیا؟" فراکیں تو وہ صحن میں پلنگ پر چھوڑ آئی تھی۔ "مشکل پر تو تھمر پڑ گئے ہیں" وہ بڑبڑائی۔

"اب جلدی سے سوا روپیہ لا دو۔ بڑی اچھی فلم لگی ہے، سب دوست جا رہے ہیں۔ اگر میں نہ گیا تو وہ کیا کہیں گے؟"

"وہ سب بیوی کی کمائی پر تو فلم نہ دیکھتے ہوں گے۔"

قاسم چپ رہا۔ ایسی باتوں پر وہ ہمیشہ چپ [illegible]

[illegible] مت بنا جاؤ ایسے تو نہیں دوں گی اب"

"اور ہی لہجے سے بولا اور شاید فاطمہ کو خوش کرنے کے لیے بچی کو پٹا کر پیار کرنے لگا۔ فاطمہ کے چہرے پر ہزاروں کرب پھیل گئے۔ وہ چپ چاپ اٹھ گئی۔ کمرے میں جا کر برقع لیا، فراکیں اٹھائیں اور پڑوس میں چلی گئی۔

ذرا دیر بعد آئی تو شوہر کی ہتھیلی پر روپیہ رکھ دیا۔ بچی کو گود سے اتار کر وہ تیزی سے چلا

"بوا تمہاری گود میں کیڑے پڑیں" فاطمہ نے بہتے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔

"ابا چیز لائیں گے" لڑکی نے ماں کے کی پروا نہ کرتے ہوئے اطلاع دی۔

"ادھر جا کر کھیل" فاطمہ نے اسے جھڑک دیا۔ "چیز لائے گا بے حیا! خدا مجھے موت دے" وہ بڑبڑائی۔ لڑکی جھڑکی کھا کر باورچی خانے کی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور ریں ریں کرنے لگی۔

سب کہتے کہ قاسم واقعی خاصا بے حیا ہے دسویں تک مارے باندھے پڑھا تھا۔ باپ پہلے سپاہی تھا مگر بیٹے پر ذرا سی بھی دھونس نہ چلا اکلوتا پوت تھا، جو چاہتا تھا کرتا۔ ماں باپ نہ مارتے تھے۔ بغیر کہے اس کی ہر بات پوری پڑھنے سے انکار کیا تو باپ نے ذرا سختی برتی، فوراً آڑے آ گئی۔ "اتنا تو کم زور ہے۔ بس ہو پڑھائی۔ کوئی کام دلا دو ورنہ پڑھ پڑھ کر خالی ہو جائے گا۔"

باپ کی پنشن ہو چکی تھی پھر بھی افسر مانتے تھے۔ منتیں کیں تو اس کے بیٹے کو ٹریفک کے سپاہی کی جگہ مل گئی۔ اس کے بعد چوک میں لمبی لمبی ڈیوٹیاں لگیں تو ہفتہ بھی نہیں گزرا نوکری چھوڑ کر گھر آ بیٹھا۔ جو لڑکا کبھی چار پیسے نہ لایا ہو وہ مشقت کیسے برداشت کرتا۔ کھڑے پاؤں دکھ جاتے اشارے کرتے کرتے شل ہو جاتے۔ نوکری چھوڑ دی تو کیا کرتا۔ [illegible] بعد تو قاسم ہے کہ یار دوستوں میں جی لگا

سارا سارا دن بیٹھکوں میں تاش کی بازی، ان کی فلموں کے پروگرام بنتے، میلے دیکھے جاتے اور پھر سکین صورت بنائے گھر آکر سو رہتا۔ اسے سنبھالنے کے لیے آخری کڑی شادی تھی، سو وہ بھی کر کے دیکھ لی۔ آبادی بڑھنے کے علاوہ کوئی فرق نہ پڑا۔ اسی طرح پنشن سے سب کا گزارہ ہوتا رہا اور آخرکار ماں باپ بیٹے کی کمائی کا ارمان لیے قبر میں جا سوئے۔

ویسے قاسم میں اور کوئی برائی نظر نہ آتی۔ اپنے محلے میں اتنا شریف کہ ہمیشہ سر جھکا کر چلتا۔ اگر کوئی بزرگ نصیحت کرتا تو سر جھکا کر سن لیتا۔ جب بات ماننی ہی نہ ہو تو سننے میں کیا حرج ہوتا ہے۔ زبان کا ایسا میٹھا کہ مجال ہے جو کسی کو سخت بات کہہ جائے۔ جب سے نوکری چھوڑی تھی باپ یا ماں سے اونچی آواز میں بات نہ کی۔ کچھ ایسی لجاجت پیدا ہو گئی تھی کہ دیکھنے والے کو رحم آتا اور اب تو چالیس سال کا ہو رہا تھا۔ مارے لجاجت کے منہ سے بات نہ نکلتی۔ فاطمہ سے بھی کبھی سختی سے بات نہ کی۔ باپ کے مرنے کے بعد تو وہ اور بھی جھک گیا تھا۔ فاطمہ جو چاہتی کہتی، مگر وہ منہ سے اُف نہ کرتا۔ بڑی خاموشی سے دونوں وقت کھانا کھاتا اور سارا وقت باہر گزار دیتا۔ فلم تو وہ باپ کے زمانے میں بھی دیکھتا تھا اور اب بھی اسی کام پر بیوی کی آنکھوں کی روشنی اٹھتی۔ ایسے بھکاریوں کی طرح آکر کھڑا رہتا کہ فاطمہ کو پیسے دیتے ہی بن پڑتی۔

فاطمہ بھی تو اماؤں کی طرح اس کی عادتیں بگاڑ رہی تھی۔ جب ساس سسر زندہ تھے تو روزانہ قاسم کے پاؤں بھی دباتی۔ اگر کبھی بھولتی تو ساس بپھر اٹھتی "واہ! میرا بچہ تھک کر آیا ہوگا۔ ارے یہ تو جب سے چلنے کے لائق ہوا، میں نے اس کے پاؤں بھی دبائے اور اب تم بیوی ہو کر آرام سے بیٹھی ہو۔" فاطمہ نے اب پاؤں بھی دبانے چھوڑ دیے تھے، مگر کھانے پینے کا اسی طرح خیال رکھتی جیسے وہ بے حد کماؤ کھاؤ میاں ہو۔ اس کے سامنے جو روٹی رکھتی اس میں بھی ایک ماشہ گھی ضرور چپڑ دیتی۔ شادی کی تھوڑ بیچ کر بچوں کے دودھ کے لیے جو بکری پالی تھی اس کا آدھا دودھ بھی قاسم کے حصے میں آتا۔ رات سونے سے پہلے وہ سرہانے سے دودھ کا گلاس اٹھا کر جھٹ سے ڈکار جاتا۔ اگر کسی دن پینے کو جی نہ چاہتا تو پھر فاطمہ سوتے سے اٹھا دیتی اور ضد کر کے پینے پر مجبور کرتی۔

اس ہماہی سے میاں کا خیال کرنے کے باوجود وہ سارا دن کڑھا کرتی۔ کون سی بری بات تھی جو اسے قاسم کے نام پر یاد نہ آتی۔ کسی کسی وقت تو ایسا جی کھولتا کہ چپکے چپکے گالیاں دیتی رہتی۔ چہرے پر ناکامیوں کی پھٹکار برستی رہتی، کپڑے سینے سے اگر کچھ وقت بچ رہتا اور بچے بھی باہر گلی میں اِدھر اُدھر چلے جاتے تو سر جھکا کر چپ چاپ بیٹھ جاتی۔ ایسے وقت میں وہ ان پیغاموں کو یاد کرتی جنھیں ابا نے رد کر دیا تھا۔ دو پیغام تو اپنی طرف کے جاننے والوں کے تھے۔ ملک کی آزادی کے بعد وہ دونوں گھرانے بھی فاطمہ کے ساتھ ہی یہاں آئے تھے۔ راستے میں فاطمہ کا دیدار ہوتا رہا تھا۔ پھر جب ذرا چین سے بیٹھنے کو ملا تو دونوں کے ہی گھروں سے پیغام آگیا۔ کیسے کماؤ کھاؤ تھے، اتنے ہی دکانیں کر لیں۔ اب تو جانے کتنی ترقی کر چکے ہوں گے۔ ان کی گھر والیاں کیسے مزے میں ہوں گی۔ فاطمہ سوچ سوچ کر ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی۔ وہ دونوں پیغام تو کلیجے میں لمبی سیخ کی طرح گڑ کر رہ گئے تھے۔ ذرا ذرا سے دکھوں پر یہ کلیجے میں چبھنا شروع ہو جاتے۔

شادی سے پہلے کتنے ارمان تھے۔ اپنا چھوٹا سا گھر ہوگا۔ اس گھر میں اس کا میاں ڈھیر دل پیسے کما کر لایا کرے گا۔ اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لیے خوب بن ٹھن کر بیٹھا کرے گی۔ اس کی ایک شادی شدہ سہیلی نے بتایا تھا کہ جب میاں گھر آئے تو خوب بن سنور کر بیٹھنا چاہیے، مرد کی ساری تھکن چٹکی بجاتے میں اتر جاتی ہے۔ یہاں میاں رات کو دس گیارہ بجے سے پہلے گھر نہ آتا تھا اور جب آتا تو چوروں کی طرح چپکے سے بستر میں دبک جاتا۔ فاطمہ کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھتا۔ اگر وہ کچھ کہتی تو ایسے گھگیا کر جواب دیتا جیسے وہ اسے کچا چبا جائے گی۔ کپڑے تھے پہن کر لبھانے کا موقع ہی نہ آیا۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ سارا دن سلائی کرتے گزر جاتا۔ پیٹ ہی مشکل سے بھرتا، ٹیپ ٹاپ نکھارنے کے لیے دولت کہاں سے آتی۔

اب رات کے نو بج رہے تھے۔ بچے بے خبر سو رہے تھے اور فاطمہ لالٹین کی روشنی میں بیٹھی داروغہ کی بیوی کا جمپر سی رہی تھی۔ آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی نے اتنا تنگ کر رکھا تھا کہ بخیے کے ٹانکے بار بار لمبے ہو جاتے جنھیں اُدھیڑتے اُدھیڑتے وہ تنگ آچکی تھی۔ جمپر رکھ کر اس نے ذرا دیر کو آنکھیں موند لیں۔ کیسی ٹپکن ہو رہی تھی ڈھیلوں میں۔ یہ بھی بے چاری فاطمہ کے نصیبوں کے پھیر تھے جو آج اپنے بال بچوں کے لیے روزی کمانا پڑ رہی تھی ورنہ اس کے خاندان میں تو عورتوں نے کبھی ایسی بات سوچی بھی نہ تھی۔ میاں، باپ، بھائی روپیا دھیلا کما کر لاتے، اسی میں گزر بسر ہوتی۔ اگر کبھی کسی لڑکی کو پرائمری اسکول بھی بھیجا تو سارے تھو تھو مچا دیتے کہ لڑکی کو کیوں پڑھایا جائے کیا اس کی کمائی کھانی ہے؟ سلائی کرتے ہوئے جب فاطمہ کو اس کا خیال آجاتا تو مارے ذلت کے رو پڑتی۔ اس دن قاسم کی بھی خیر نہ رہتی۔ ایسی سناتی کہ دھوتے نہ چھوٹے، مگر کیا مجال جو وہ پلٹ کر جواب دے جائے۔ چپکے سے کھانا کھایا اور بستر پر لیٹتے ہی خراٹے لینے لگتا۔ ساس کی زندگی ہی میں فاطمہ کے یہ چار بچے ہو گئے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد تو جیسے اس نے بڑھاپا لا دیا تھا۔ کمبخت نکھٹو میاں کے قریب جاتے ہوئے بھی اس کا دل نہ جانے کیسا ہونے لگتا۔ اُدھر قاسم کا خود یہی حال تھا۔ جب سے اس کی ماں اور ابا مرے تھے، جیسے جوگ سادھ لیا تھا۔ ایک آدھ بار جو اس نے سہانا سا اشارہ کیا تو فاطمہ بپھر اٹھی "ارے شرم نہیں آتی مفت کی کھا کھا کر [illegible] ہوئے" اور قاسم بھیگی بلی کی طرح سکڑ کر رہ گیا۔

رات دس بجے کے قریب قاسم فلم دیکھ کر لوٹا تو سیدھا بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

باقی آئندہ

ہندی و اُردو افسانہ نگاری میں عالمی شہرت کے مالک

ڈاکٹر اودے سرن ارمانؔ

جن کے اُردو افسانوں کے دو مجموعے "مان سروور" اور "دھرم بار کہا دل نے" کو بہار اور اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ نے انعامات سے نوازا۔ اور جنھیں "نیشنل لٹریری سرکل" مُراد آباد کی طرف سے ۵۱ سو روپے کا چیک اُن کی چالیس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں پیش کیا گیا۔ اب ـــــ

"کِرنوں کے پدچِنّ"

کے رُوپ میں ایک نرالے انداز سے ہندی ساہتیہ میں قابلِ فخر اور یادگاری اضافہ کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔

اِس نادرۂ روزگار تصنیف کے باعث ڈاکٹر اودے سرن ارمانؔ کا نام نامی ہندی ساہتیہ میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور کوئی بھی ہندی ساہتیہ کا مؤرخ "کرنوں کے پدچِنّ" اور "ڈاکٹر اودے سرن ارمان" کے ذکر کے بغیر اپنی ریسرچ کو مکمل نہ کہہ سکے گا۔

ایک انقلابی ذہن، جو خدا کے وجود کو سائنس کی روشنی کے ساتھ ساتھ تسلیم کرتا ہے مگر اندھ وشواس کے گورکھ دھندے سے پُورے انہماک کے ساتھ بغاوت کرتا ہے۔ قدامت اور جدیدیت کا یہ سنگم "کرنوں کے پدچِنّ" میں انتہائی اہم موضوعات پر زندگی میں پیش آئے واقعات کی روشنی میں ایسے ایسے مسائل پہ مُدلّل بحث کرتا ہوا قاری کے دِل و دماغ پر اپنے نقوش اس سُبک روی سے چھوڑتا ہے کہ قاری بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ع جو کہا تُو نے وہ میرے دِل میں تھا۔

"کِرنوں کے پدچِنّ" میں آپ ارمانؔ صاحب کی یادداشتوں میں بڑی انمول باتیں پائینگے۔ ہندی رسم الخط میں اپنی طرز کی یہ واحد کتاب پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔ قیمت: -/۵۰ روپے

تقسیم کار:- **شانِ ہند پبلی کیشنز**

فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

سرشار سیلانی

سنہ ۱۹۴۲ء میں منٹگمری (مغربی پاکستان)
ساہیوال کے قدیمی نام سے پکارا جاتا
ایک کل ہند مشاعرہ مرحوم مولانا علامہ
ب آبادی کی صدارت میں منعقد ہوا
عرے کے کنوینر جناب جیم سین سرشار
تھے۔ یہ مشاعرہ اپنی نوعیت کا ایسا
ر کامیاب مشاعرہ تھا کہ جس کی مثال
میں ملنی مشکل تھی۔ اس مشاعرے میں
بی بر صغیر ہند و پاک کا ہر دوسرا شاعر
تھا جسے اردو شاعری کا محافظ سمجھا
تھا۔

رشار سیلانی صاحب سے میری پہلی
سی مشاعرے میں ہوئی۔ منٹگمری کے
ہیں ایک باذوق گانے والی تھی۔
نار صاحب شعراء کی قیام گاہ پر اکثر و
ے کرام سے اس مغنیہ کا غائبانہ تعارف
نداز میں کراتے ہوئے دبے الفاظ میں
س مغنیہ کی خواہش ہے کہ شعراء حضرات
ہاں گانا سننے تشریف لائیں۔
تر شاعر حضرات شرافت اور نیکی کا لبادہ
ہیں مگر ان کے تحت الشعور میں ایک
رہتا ہے۔ چنانچہ ایک دو لاابالی مزاج

کے شعراء نے ایسے انداز میں اس دعوت کی تضحیک کی کہ جس سے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہ تھی کہ یہ شعراء بازاری مذاق رکھتے تھے۔ اس پر سرشار صاحب بگڑ گئے اور کہنے لگے "صاحب آپ کی ہمشیرۂ محترمہ اور آپ کی والدۂ محترمہ بھی اس قدر مہذب اور شائستہ اخلاق کی مالک نہ ہوں گی جس قدر صاف ستھرے مزاج کی یہ فنکارہ ہے۔ اس مغنیہ کی تہذیب اور اخلاقی رکھ رکھاؤ کو دیکھو گے تو اپنی شیروانی پر شرماؤ گے۔ شاعرنے بھرے ہوئے جیسے شاعروں کو تو وہ عروض پڑھا سکتی ہے اور اس کا ش۔ ق۔ ایسا ہے کہ گھنٹوں گفتگو کرنے کو دل چاہے۔"

آخر طے پایا کہ مشاعرے کے بعد کل دن میں جب شاعروں کی بڑی بڑی توپیں اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں گی تو اس مغنیہ کے ہاں گانے کی محفل ہوگی۔

مشاعرے کے دوسرے دن چار بجے شام سرشار صاحب کی معیت میں شاعروں کا ایک اچھا خاصا گروہ جن میں پنڈت ہری چند اختر (مرحوم) بھی شامل تھے اس مغنیہ کے ہاں پہنچے۔ ایک ۲۵۔۲۶ سالہ دلکش جوان عورت نے جو انتہائی سادہ لباس شلوار قمیض پہنے ہوئے

تھی شعرائے کرام کا خیر مقدم دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ سے کیا۔ کمرے میں چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ شعراء حضرات جب گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھ گئے تو اس شعلہ جوالہ نے نہایت متانت سے شیریں آواز میں شعراء سے مخاطب ہو کر کہا کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔ میری گردن آپ حضرات کے اس احسان سے جھکی جا رہی ہے کہ آپ نے میری مودبانہ درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور مجھ ناچیز کے غریب خانے کو اس قدر منور کر دیا ہے کہ سورج دیوتا کی آنکھیں بھی چکا چوند ہو کر رہ گئی ہیں کیونکہ ہم لوگوں کے غریب خانوں میں رات کی تاریکی میں روشنی تو ہر رات ہی رہتی ہے مگر دن کے اجالے میں یہاں خوفناک تاریکی پھیلی رہتی ہے۔

اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ازراہ کرم چائے کی ایک ایک پیالی قبول فرمائیے یہ یقین فرمائیے کہ میرے ہاں اکل حرام کا گزر نہیں ہے۔ پنڈت ہری چند کی رگ ظرافت پھڑکی اور فرمانے لگے "بہن فکر نہ کرو ہم میں سے اکثر حلال خور ہیں" اس ریمارک پر وہ اس مفرح حسن انداز سے مسکرائیں کہ فرشتوں

سکے بھی دل مل جائیں۔ جب تک کوئی شاعر بھی چند اعزہ کی اس چوٹ کو قطعاً نہ سہ سکے۔ یہ گفتگو ختم ہونے کے بعد سازندے مہذبانہ انداز سے سلام کر کے سازوں کو لے کر قریب۔ بیٹھ گئے۔ اس مغنیہ نے جگر، غالب [illegible] انداز میں سنائیں [illegible] ان غزلیات کے [illegible] وجد میں آجاتا۔ یہ سلسلہ شام کے چھ بجے تک رہا کچھ حضرات نے دبی زبان سے کہا کہ اب اجازت دیجیے مگر سرشار سیلانی فرمانے لگے "ابھی تشریف رکھیے۔ اب ان سے ان کا اپنا کلام سنیئے، جو بغیر سازوں کے اپنے مخصوص شاعرانہ ترنم میں عنایت فرمائیں گی۔

یہ سنتے ہی سب شعراء فرمانے لگے 'ارشاد ارشاد'۔ اس فتنۂ محشر نے انتہائی نیازمندی کے ساتھ اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے ایک غزل سنائی۔ مطلع سے مقطع تک کسی عیب سے پاک غزل، اس پر شاعرانہ ترنم نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ حسنِ شعر اور ترنم کی اس تثلیث نے عجب سماں باندھ دیا۔

سرشار صاحب ہر روز کے پینے والے تھے بلکہ ہر وقت پیے رہتے تھے۔ ایک ملازم نہایت قرینے سے ٹرے میں "جم خانہ" وہسکی کی بوتل اور پانی کا جگ لایا اور ان کے سامنے رکھ کر ادب سے کہنے لگا۔ "حضور گلاس کتنے لاؤں؟" سرشار صاحب نے شعراء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بھئی تکلف نہ کیجیے، جو حضرات شوق رکھتے ہوں ادھر میرے پاس آجائیں۔ چھ سات حضرات نے واقعی بے تکلفی سے کام لیا اور سرشار صاحب کا ساتھ دینے لگے۔ اور یہ محفل ایک شعری نشست میں بدل گئی۔ سب سے پہلے سرشار صاحب نے ایک غزل سنائی ؎

"توبہ ہیں ایک عمر جو کرنے کے نہیں ہم
ساقی کی نگاہوں سے اترنے کے نہیں ہم
اللہ پہ تکیہ کبھی مسلا پہ تکیہ
واعظ کبھی گھاٹ اترنے کے نہیں ہم
یاروں کی خوشی پہ کہیں چڑھ جائے نہ پانی
اچھا ہے کہ اب تم سے ابھرنے کے نہیں ہم
دوزخ ہمیں منظور مگر بارِ الٰہا
تنہا تو بسر خلد میں کرنے کے نہیں ہم
سرشار خم دیتے بھی اگر کوئی لنڈھائے
پانی کسی کم ظرف کا بھرنے کے نہیں ہم"

سرشار مستی کے عالم میں دنیا و مافیہا سے بے خبر کہنے لگے ایک اور غزل کے کچھ اشعار سنیئے۔ فرمانے لگے

جب تک کسی آفت میں جوانی نہیں آتی
تکمیل کے نقطے پہ کہانی نہیں آتی
ساقی مجھے اِک جام تو لا ڈال کے دینا
یہ کس نے کہا جا کے جوانی نہیں آتی
پھر دعوتِ فردوس ہے فردوس بدر کو
اپنی تو سمجھ میں یہ کہانی نہیں آتی
رندوں پہ بڑھاپے میں بڑھاپا نہیں آتا
زاہد پہ جوانی میں جوانی نہیں آتی
سر دے کے رہِ عشق میں ہوتا ہے سبکدوش
دل دے کے ہمیں جان چھڑانی نہیں آتی
ہر دل کا مقدر نہیں آزارِ محبت
ہر آنکھ کو خوننابہ فشانی نہیں آتی
ہر رند کو سرشار تبرک نہیں ملتا
ہر رند کے حصے میں پرانی نہیں آتی

باری باری ہر شاعر کلام سنا رہا تھا۔ ملتان کے ایک شاعر نے مطلع پڑھا ہی تھا کہ سرشار صاحب بدمستی و سرمستی کے عالم میں کہنے لگے "حضرات اسی زمین میں جناب باسط بسوانی کے کچھ اشعار یاد آ گئے ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔" اور سرشار صاحب نے باسط بسوانی کی پوری غزل مطلع کے بغیر سنا دی کیونکہ باسط صاحب کا مطلع تو یہ ملتانی شاعر اپنے نام سے سنا ہی چکے تھے۔

یہ شعری نشست "مرغ و ماہی" اور مے نوشی کے توسط سے دس بجے رات تک جاری تھی کہ یکایک اسی "شاعرہ کم مغنیہ" نے سرشار صاحب سے لجاجت آمیز لہجے میں درخواست کی کہ مشہور شعراء کے اچھے مطلعے اور اشعار سنائیے۔ بس پھر کیا تھا۔ سرشار صاحب کی شگفتگی شراب سے مل گئی تھی، لہٰذا پوری رفتار سے اشعار سنانے لگے۔ مگر اشعار کیا تھے نگینے تھے۔ شاید ہی برصغیر کا کوئی زندہ یا مردہ شاعر رہ گیا ہو جس کے درجنوں اشعار سرشار صاحب نے نہ سنائے ہوں۔ میں نے اب تک کسی ایسے شاعر یا باذوق فرد کو نہیں دیکھا جسے سرشار صاحب سے زیادہ شعر یاد ہوں، یہ محفل رات کے بارہ بجے برخاست ہوئی۔

منٹگمری کے اس مشاعرے میں شرکت سے میرے مراسم سرشار سیلانی سے شروع ہوئے اور اُن کی زندگی کی آخری سانس تک قائم رہے۔ سرشار میرے اداریے "شذرے" پڑھ کر بہت خوش ہوتے اور مجھے کہتے بھائی قلم کو ذرا نرم رکھو۔ فرماتے تھے کہ "شانِ ہند" میں تمہارے اداریے "شذرے"، بہ گوئے یار کا مستقل کالم اور مشاعروں کا آنکھوں دیکھا کانوں سنا حال پڑھ نہ لوں کسی کو پرچہ لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جب بھی وہ دہلی تشریف لاتے مجھ نیازمند کو پہلے اطلاع دیتے۔

سرشار سیلانی ۱۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو سانجھوال ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے تعلیم صرف مڈل تک حاصل کر سکے۔ خانگی حالات خراب تھے۔ خاندان کے افراد کی پے بہ پے اموات سے گھبرا کر ۱۹۳۰ء میں جوگیا لباس پہن لیا اور ہردوار میں رہنے لگے۔ گزر اوقات کے لیے ٹیوشن پڑھاتے تھے ۱۹۴۲ء کے شروع میں منٹگمری چلے آئے۔ وہاں ایک ہفتہ وار اخبار "ہمدرد" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور منٹگمری میں ہی مسٹر ملک راج بھاگڑی سے ملاقات ہوئی جو ایک سینما کے مینیجر تھے۔ ۱۹۴۵ء میں لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے میں مرحوم لالہ مُرلی دھر شاد کی دعوت پر لائل پور گئے مگر وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مشاعرہ کی تاریخ ملتوی ہو گئی ہے ان دنوں مسٹر ملک راج بھاگڑی منٹگمری سے

لائل پور آ چکے تھے اور کسی سینما کے منیجر تھے۔ سرشار صاحب انہیں ملنے گئے تو بھاکر جی صاحب نے سرشار صاحب کا تعارف سیٹھ جیون داس چاندنہ سے کرایا۔ چاندنہ صاحب ان دنوں فلم کمپنی کھولنے کے چکر میں تھے۔ چنانچہ چاندنہ جی نے سرشار صاحب کو اپنے "ریگل" سینما میں رہائش کے لئے کمرہ دے دیا اور فلم آرسی کے گانے اور مکالمے لکھوانے شروع کر دیئے۔ ("آرسی" سلور جوبلی فلم تھی جو کہ سرشار صاحب کی پہلی گانوں اور مکالموں کی پکچر تھی) اسی سال چاندنہ نے لاہور میں "جیون پکچرز" کے نام سے ایک فلم کمپنی جاری کی۔ سرشار صاحب بھی لاہور آ گئے۔ تقسیم ملک تک سرشار صاحب کے پاس ایک درجن فلمیں گانوں کی تھیں۔

تقسیم ملک کے بعد سرشار صاحب دہرہ دون چلے گئے۔ وہاں کچھ پروڈیوسر آؤٹ ڈور شوٹنگ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ چنانچہ سرشار صاحب نے دہرہ دون میں کئی فلموں کے گانے اور مکالمے لکھے مگر صرف ایک فلم ہی بن سکی جس کا نام تھا "گورو دکشنا" اور یہ فلم بری طرح فیل ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں سرشار صاحب بمبئی چلے گئے اور انفنسٹن ہوٹل میں قیام کیا۔ بمبئی میں سرشار صاحب شروع شروع میں صرف گانے ہی لکھتے تھے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ایک شاعر میوزک ڈائریکٹر کا محتاج ہے اور اسی کے آگے پیچھے پھرنا پڑتا ہے اور میوزک ڈائریکٹر کے گھر کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ تو انھوں نے گانے لکھنے چھوڑ دیئے اور ڈائیلاگ لکھنے شروع کر دیئے۔

سرشار صاحب نے جن پکچروں کے گانے لکھے ان میں چند ایک کے نام یہ ہیں: بڑا آدمی، شادی کی رات، کشمیر، برہا کی رات، آدھی رات، من کا میت، بے وفا وغیرہ۔ "بے وفا" کے سرشار صاحب نے ڈائیلاگ بھی لکھے تھے۔ ویسے تو سرشار صاحب نے ایک صد کے قریب فلموں کے ڈائیلاگ لکھے ہیں جن میں چند قابلِ ذکر فلمیں یہ ہیں:۔

"آنچل، کاریگر، اَن پڑھ، گنگا کی لہریں، آپ کی پرچھائیاں، آئی ملن کی بیلا، آئے دن بہار کے، آیا ساون جھوم کے، باپ بیٹا اور بہو، نیلا آکاش، کنیا دان، مٹی میں سونا، الگن بولا کا دیوتا، ڈاکٹر ودیا، مجبور، دیور، میں شادی کرنے چلا، عقلمند، باغی، میرا دوست، رات کے اندھیرے میں، ہنستے جی، بڑی دیدی، اور انجانا"۔

جن حضرات نے یہ فلمیں دیکھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان فلموں کے مکالمے کس قدر بہترین تھے اور یہ فلمیں مکالمات کی متانت کی وجہ سے بھی کامیاب تھیں۔

سرشار صاحب کو ہمیشہ شکایت رہی کہ ہندوؤں میں ادیب کی قدر و منزلت نہیں ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ اگر میں مسلمان ہوتا تو میرا ایک مقام ہوتا۔

سرشار صاحب کسی کا دکھ دیکھ کر خود بھی دکھی ہو جاتے۔ شری رام سروپ کپلا کا کہنا ہے کہ میں ان کے ساتھ ۲۵ سال تک رہا ہوں میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کسی تنگدست شاعر یا کسی ضرورت مند کی ضرورت انھوں نے پوری نہ کی ہو۔

سرشار صاحب ابھی ریٹائرڈ لائف گاؤں میں گزارنے کے خواہش مند تھے اور اکثر گاؤں کا ذکر کرتے رہتے تھے۔

سرشار صاحب کا کلام ویسے تو رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ "شانِ ہند" میں بارہا اُن کا تازہ کلام شائع ہوتا رہا۔

شراب کے تو وہ رسیا تھے ہی مگر بمبئی کی خطرناک فضا میں انھوں نے افیم، چرس، ایسے بدترین نشے بھی شروع کر دیئے تھے اور جب ان سے بھی کام نہ چلا تو مارفیہ کے عادی ہو گئے اور یہی منشیات اُن کو بڑی تیزی کے ساتھ موت کی آغوش میں لے گئے اور ۱۱ اپریل ۱۹۶۹ء کی درمیانی رات کو ہندوپاک کا یہ بہترین شاعر، ادیب مکالمہ نگار نانا وتی ہسپتال میں بمبئی میں اپنے حقیقی مالک سے جا ملا۔

سرشار صاحب نے اپنی یادگار اپنی بیوہ، دو لڑکیاں پندرہ اور گیارہ سال اور ایک لڑکا پانچ سال، چھوڑ گئے تھے۔ اُن کے خاندان میں صرف اُن کی ایک بڑی بہن (جو اُن سے پانچ سال بڑی ہیں) کالکا جی کالونی میں رہتی تھیں۔

باقی رہے نام اللہ کا۔

غزل

فخر واحدی قنوجی

تسلیم ہے کہ آج کا رہبر نہیں ہوں میں
یعنی کسی کی راہ کا پتھر نہیں ہوں میں

مانا مرے مزاج میں تلخی بھی ہے مگر
جو زہر سے بھرا ہو وہ ساغر نہیں ہوں میں

جو سامنے سے وار کرے ایسی تیغ ہوں
پیوست پشت پر ہو وہ خنجر نہیں ہوں میں

وہ سنگِ میل ہوں جو دکھاتا ہے راستہ
ٹھوکر کی زد میں آئے جو پتھر نہیں ہوں میں

اے فخر آن کی طرز کو اپناؤں کس طرح
اک اہلِ دل ہوں کوئی ستمگر نہیں ہوں میں

بابِ انتقاد

جوہر نامہ مرتب: حکیم محمد عرفان
ضخامت: ڈیمائی سائز ۲۲۴ صفحات
خوبصورت جلد با تصویر گرد پوش۔ قیمت: ۴۰/- روپے
شائع کردہ: محمد علی لائبریری۔ کلکتہ۔

جنگِ آزادیٔ ہند کے جانباز سپاہی مولانا محمد علی (۱۸۷۸ء تا ۱۹۳۱ء) کی ذات مجمع اوصاف تھی۔ وہ جہاں چوٹی کے مقرر، اعلیٰ پائے کے شاعر، اردو اور انگریزی کے مقتدر صحافی تھے، وہاں اُن کی ملک و ملت کے لئے قربانیاں بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ کلکتہ سے مولانا مرحوم کو خاص اُنس تھا۔ ایک تو اس لئے کہ کلکتہ ۱۹۱۲ء تک ہندوستان کا دارالسلطنت تھا اور دوسرے اعلیٰ صحافتی مرکز تھا جہاں سے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنا اخبار "الہلال" نکالا اور انگریزی کے نامور اخبارات بھی یہیں سے شائع ہوتے تھے۔ یوں تو مولانا کی سیاسی زندگی بیشتر جیل میں ہی بسر ہوئی، لیکن جتنی مدت وہ باہر رہے وہ ملک و ملت کے سرگرم کارکن رہے۔ خلافت کی تحریک کے روحِ رواں، جنگِ آزادی کے بیباک سپہ سالار، کانگریس کے صدر بھی رہے اور مہاتما گاندھی کے دستِ راست بھی۔ گول میز کانفرنس میں لندن ۱۹۳۰ء میں گئے۔ وہاں دھواں دھار تقریریں کیں اور ۱۹۳۱ء میں وہیں خدا کو پیارے ہو گئے۔

ابتداء میں علی گڑھ اور بعد میں انگلستان میں تکمیلِ تعلیم کی اور شروع سے ہی جذبۂ حب الوطنی کے تحت جنگِ آزادی میں لگ گئے، اگرچہ کچھ مدت ایک ریاست میں اعلیٰ عہدے پر ملازمت بھی کی۔

فروری ۱۹۸۵ء میں مولانا محمد علی کے متعلق ایک سیمینار کا، محمد علی لائبریری کلکتہ کے کارکنوں نے اہتمام کیا اور بہت سے دانشوروں کو مدعو کیا کہ وہ مولانا کی مختلف الانواع کی قومی خدمات کا جائزہ لیں۔ اس موقعہ پر ملک کے مقتدر دانشور اور صحافی جمع ہوئے اور انہوں نے مولانا کی مختلف قسم کی سرگرمیوں کے متعلق مفید اور کارآمد مقالات پڑھے۔

حال ہی میں محمد علی لائبریری نے ان تمام مقالات کو یکجا کر کے شائع کیا ہے۔ حکیم محمد عرفان صاحب نے ان کو ایڈٹ کیا ہے۔

سیاسی بیداری پر مولانا کی سرگرمیوں کے متعلق پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، عبداللطیف اعظمی، ڈاکٹر احتشام بن حسن، مولانا طاہر محسن علوی کے مضامین بہت ہی دلکش انداز میں لکھے گئے ہیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا مضمون ہے کہ "ہم مولانا محمد علی سے کیا سیکھ سکتے ہیں" مولانا کے فضائل و کمالات پر مولانا ابوالعرفان خان ندوی اور مولانا ابوالبقا ندوی کے مضامین، اُن کی شاعری پر مولانا ضیاءُ الدین اصلاحی، نیز مولانا طاہر محسن علوی، مولانا کی اخبار نویسی اور صحافت پر جناب رئیس الدین فریدی اور احمد سعید ملیح آبادی کے مضامین خوب روشنی ڈالتے ہیں۔ "مولانا اور کلکتہ" پر محمد اسحاق صاحب کا مضمون دلچسپ ہے۔ اُن کی گھریلو زندگی پر خالدہ حسینی کا مضمون پڑھنے والوں کو بہت ہی واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ سب سے اچھی چیز جو اس مجموعۂ مقالات میں پائی جاتی ہے وہ مولانا کے کلام کا انتخاب ہے جسے حکیم محمد عرفان منتخب کیا ہے۔ ڈاکٹر اکمل ایوبی نے مولانا کی حاضر جوابی پر مقالہ لکھا ہے۔

یہ کتاب مولانا مرحوم کی ایک مستقل یادگار ہے جس سے آنے والی نسلیں ادب، سیاست اور صحافت کے متعلق حتی الامکان استفادہ کریں گی۔ کتاب کی قیمت بھی بالکل واجبی ہے۔

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ

من کہ مکتوب الیہ

محبّ محترم نمستے!
کرم نامہ مع شمارہ موصول ہُوا۔
مَیں خود اس خیال میں تھا کہ ایک عرصہ
ے آپ کی طرف سے کوئی نامہ و پیام کیوں نہیں۔
پ سے کیا دُشمنی تھی جو یاروں نے نکالی ذرا ہم
ں تو سُنیں۔ بہرحال اب پرماتما نے سب ٹھیک
کر دیا ہے تو کیا ذکر۔
دیوانِ غالبؔ (عکسی) ۱۸۶۲ء اگر امریکن
بریری نے منظور نہیں کی تو کوئی مضائقہ نہیں
لب نے یا کالی داس گپتا رضاؔ نے امریکنوں کے
لیے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ میرے پاس یہ دیوان سب
روخت ہو چکا ہے۔ اگر ہو سکے تو وہ کاپیاں
مجھے واپس ارسال فرمائیں تاکہ یہاں کام آسکیں۔
دیوانِ غالبؔ (کامل) تاریخی ترتیب سے"
فحات ۵۰۰، قیمت ۱۶۰/- روپے، میری زندگی
اہم ترین کارنامہ ہے۔ عمدہ چھپا ہے کام تو بہرحال
ہ ہے ہی۔ آپ کو کتنی کاپیاں بھجوا دوں۔ اس
ت جلد بندی ہو رہی ہے ۱۵/۵ تک مارکیٹ
ں آجائیگا۔

مخلص
کالی داس گپتا رضاؔ

جناب سرورؔ تونسوی صاحب
زیرِ نظر شمارے میں آپ کی علالت کے
رے میں پڑھ کر تشویش ہوئی۔ خدا کے حضور دُعا
ہے کہ وہ آپ کو ہمیشہ صحت مند رکھے۔ آمین!
آمین! اور خدا آپ کی عمر دراز فرمائے۔
امی بھی آپ کی صحت کیلئے دعاگو ہیں۔ اقبال بھائی

GOVERNOR
UTTAR PRADESH

راج بھون
لکھنؤ

مکرمی سرورؔ تونسوی صاحب
سلام و راحت!
"شمع" ستان ہند میں آپ کی علالت کا حال پڑھ کر دُکھ ہُوا۔
خدا کا شکر ہے کہ اب آپ اچھے ہو گئے ہیں۔
ہاں بھائی! یہ سچ ہے کہ میری آنکھ کا آپریشن ہُوا ہے اور آپ نے صحیح
لکھا ہے کہ حضورؐ کے صدقے میں آپریشن کامیاب ہُوا۔ آپ کو اس لئے اطلاع
دے رہا ہوں کہ آپ میرے دیرینہ خیر خواہ ہیں
باقی حالات بدستور ہیں۔ اللہ کرے آپ مع اہل و عیال خیر و عافیت سے رہیں۔

دعا گو
محمد عثمان عارف

اور تمام اہلِ خانہ آپ کی صحت کے لئے دعا کرتے ہیں۔
ساجدہ بیگم، بمبئی

مکرمی سرورؔ صاحب، آداب!
"یہ کوچے، یہ بازار..." دلچسپی سے پڑھ رہا
ہوں اور اس نتیجہ پر پہنچ رہا ہوں کہ ابھی کتاب
ختم نہیں ہو پائی ہے اور دوبارہ پڑھنے کی تمنّا
باقی ہے میری سمجھ میں تمام اہلِ ذوق حضرات
کو جو خاص طور سے ہندوستان کے رہنے والے
ہیں، یہ کتاب اسی طرح بھائے گی جس طرح دِلّی
کے رہنے والے کسی زمانے میں اُس خوبصورت
شاعرہ کے عاشق تھے جس کا ذکر آپ نے اس
کتاب میں کیا ہے۔ خدا کرے آپ کی صحافت
آگے آنے والے دَور میں اس سے بھی زیادہ کامیاب
رہے۔

نیاز مند
محمود احمدی اقنوجی

محترم و مکرم سرورؔ صاحب
"یہ کوچے، یہ بازار" بے حد پسند آئی یقیناً اس
جیسی کتاب کی اُردو دُنیا کو ضرورت تھی۔ ... کی
بیتے دنوں کی بات کرتا۔ آپ نے جس وقت کی

کی ہے کسی شخص میں اتنی جرات نہیں۔ وہ آپ کی ہی جرأت تھی۔ ورنہ آج کے ماحول میں ہر کوئی دوسرے کی چاپلوسی کرتا ہے مبادا کوئی ناراض نہ ہو جائے۔ مجھے دلی خوشی ہوئی ہے چھپائی اور کتابت اور کاغذ کی کیا تعریف کروں۔ یہ تو آپ کا ہی حوصلہ ہے کہ اس دور میں ایسی اچھی کتاب چھاپی۔

آپ کا بھائی
یوگیندر بہل تشنہ

برادرم مخمور توفنوی صاحب۔ آداب!

اس بار "شانِ ہند" (جنوری) خاصی تاخیر سے یعنی کل ہی ملا۔ اسی میں آپ کی علالت کا ذکر پڑھا اور وجہ تاخیر معلوم ہو گئی۔ آپ کی صحت کے بارے میں تشویش ہو رہی ہے۔ دعاگو ہوں کہ جلد صحت یاب ہو جائیں۔ مضطرب صاحب سے خط لکھوا کر مطلع کریں کہ اب کیسے ہیں۔

مضطرب صاحب کو آداب۔

رام لال لکھنؤ

مکرمی و محترمی مخمور صاحب

جے ہند!

روز نامہ "اخبار مشرق" میں یہ خبر پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آل انڈیا اُردو پبلشر اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا ہے جس کا آپ کو نائب صدر منتخب کیا گیا ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ اشاعتی کاموں میں آپ کا نصف صدی کا تجربہ ہے جو نئے ناشرین کے بہت کام آئے گا۔ ایسی تنظیم کی کمی بہت عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی کیونکہ ناشرین کے مسائل بڑھتے جا رہے ہیں اور تنظیم کے بغیر کوئی مسئلہ ان دنوں حل نہیں ہوتا۔ مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب اور آپ کی قیادت میں یہ ایسوسی ایشن نہ صرف پبلشرز کی مشکلات رفع کرنے کی جانب متوجہ ہو گی بلکہ اُردو لٹریچر کی کتابت و طباعت اور ظاہری حسن کے معیار کو بلند کرنے کی سعی بھی کریگی۔ میں آپ کی اس تنظیم کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

مخلص
وشوناتھ طاؤس۔

محترم مخمور صاحب۔ نمسکار!

"یہ کوچے یار" کے کئی باب پڑھ ڈالے مزا آگیا۔ پرانی یادوں کے سلسلے بہت ہی لطیف انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ مگر "یہ کوچے یار" کو صرف پرانی یادوں تک ہی پابند نہ رہنا چاہیے تھا۔ زیادہ نہیں صرف چار چھ حال کے واقعات بھی اگر شامل کر لئے گئے ہوتے تو میرے خیال سے بہتر ہوتا۔ بہر حال واقعات کا انتخاب آپ نے کافی سوچ سمجھ کر کیا ہوگا اور کچھ واقعات کو چھوڑ دینے کا فیصلہ قرین مصلحت ہوگا۔ تنقید کے دائرے سے بہت دور یہ صرف ایک حقیر سا مشورہ تھا۔ اس جسارت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

مخلص بھائی
ڈی۔ این۔ آریہ،
الہ آباد۔

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 MARCH 1988
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57
Delhi Postal

دہلی
اپریل سنہ ۱۹۸۸ء

شانِ ہند



اندر پڑھیے :-
آغا خورش کاشمیری مرحوم
کی جذبات سے لبریز ایک دل گداز
تحریر —

[illegible] پرست ہوں نہ [illegible] پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن ہے قیامت [illegible]
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

شانِ ہند
دہلی

اپریل سنہ ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹
شمارہ ۴

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

پرنٹر پبلشر پرو پرائٹر
وِدّیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت۔ خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقامِ اشاعت دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"
ملت، انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خطاط
سبطین حیدر
محمد عمران

حسن کار
مصطفےٰ آرٹسٹ

قیمت فی شمارہ — [illegible]
قیمت سالانہ — [illegible]
لائف ممبر — [illegible]
[illegible]

غزل

پروفیسر فراق گورکھپوری

حسن کے جلوے گریزاں عشق کی ظلمتیں نہ دیکھ
تو ہے خود ایک داستاں غم کی عبارتیں نہ دیکھ

پھر بھی تو حسن حسن ہے پھر بھی تو عشق عشق ہے
اپنی عنایتوں کو سوچ، میری شکایتیں نہ دیکھ

غمکدۂ مجاز میں عالمِ سوز و ساز میں
غفلتِ صد نشاط بن درد کی کشمتیں نہ دیکھ

آج خطائے عشق پر آہ یہ تیری بیدلی
اپنی رعائتیں نہ دیکھ اپنی مروتیں نہ دیکھ

برقِ نگاہ سے بھی تیز، شدتِ اضطراب ہے
عشق کی خود نمائیاں، حسن کی حیرتیں نہ دیکھ

برقِ نظر گرائے جا فکرِ سکونِ عشق کیا
جلوۂ صبحِ حشر بن میری قیامتیں نہ دیکھ

غفلتِ دائمی سے جاگ عشرتِ بے بسی سے بھاگ
تجھ سے ہے آسماں کو لاگ دھوکے کی راحتیں نہ دیکھ

پرسشِ بے نیاز میں عشوۂ جاں گداز میں
دیکھ حریمِ ناز میں عشق کی غیرتیں نہ دیکھ

ذوقِ نظر بھی ترک کر جذبِ نہاں سے بھی گذر
غم کے اشاروں پر نہ جا حسن کی شدتیں نہ دیکھ

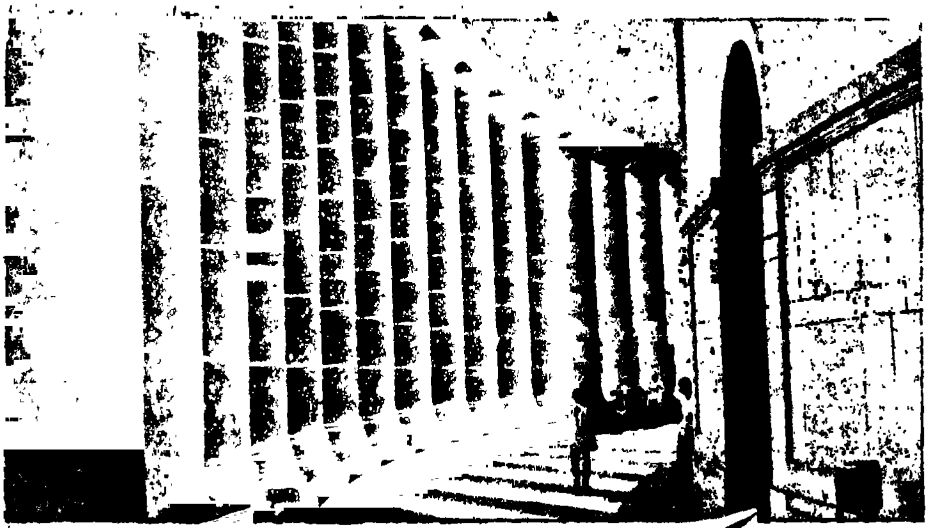
بہنے دے میری غفلتیں ہونے دے اس کو بے حجاب
اے غمِ ہجرِ عشق کی حسن سے نسبتیں نہ دیکھ

غمکدۂ فراق میں کیا ہوئیں تیری غفلتیں
پھیر نگاہِ آشنا میری مصیبتیں نہ دیکھ

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

اکڑو واقعات | حالات حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

اڈیٹوریل



جمہوریت کی نشوونما اور اپوزیشن فرائض

ہندوستانی اپوزیشن — اقتدار کا مرثیہ

جمہوریت کی نشوونما کے لئے اپوزیشن کا وجود لازم و ملزوم ہے۔ جس ملک میں جمہوریت ہو اور اپوزیشن نہ ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ملک جمہوریت کے عوامی استحقاق سے محروم ہے اگر اپوزیشن محض اقتدار سے محرومی کا ماتم ہو یا

اس میں اس قسم کے سیاست داں جمع ہو جائیں کہ انہیں اقتدار نہیں ملا اور وہ حصول اقتدار کے لئے کوشاں ہیں تو یہ صحیح قسم کی اپوزیشن نہ ہوگی بلکہ اپوزیشن کے نام پر ایک تعزیہ ہوگا۔ ہمارے ملک کی اپوزیشن واقعی اقتدار کا

مرثیہ بن کر رہ گئی ہے۔ اور اس طائفے میں جتنی اس قسم کے سیاست داں جمع ہو گئے ہیں جنہیں اقتدار ملنے کی مستقبل قریب میں کوئی امید دور دور تک نظر نہیں آ رہی ہے۔ لہٰذا ایسا طائفہ حصول اقتدار کے لئے عوام میں بے چینی ا

بے جا مداخلت روی اور کسی حد تک لاقانونیت، غیر ذمہ داری اور کئی قسم کی غلط اور بے بنیاد افواہوں سے پیدا ہونے والے ذہنی کشیدگی کے جرائم پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنے۔

بوفورس سودے کو لے کر اپوزیشن نے پارلیمنٹ کی کارروائی میں اس قدر وقت ضائع کیا ہے کہ جس سے ملک کا کثیر روپیہ بے مصرف ضائع ہوا۔ اور جب اپوزیشن کے مجوزہ مطالبہ پر حکومت نے اس مسئلے کی تحقیقات کے لئے پارلیمانی کمیٹی بنائی تو اپوزیشن نے اس تحقیقاتی کمیٹی میں شرکت سے انکار کر دیا کیونکہ کمیٹی میں شریک ہونے سے اصل باتیں اُن کے سامنے آتیں جس سے انھیں جھوٹ و افتراء پر ندامت ہوتی اور عوام اُن سے اور بھی بدظن ہوتے۔

بھلا ہو دُوردرشن کا جس نے حال ہی میں "بوفورس سودا" کے عنوان سے ایک پروگرام دکھایا۔ جرنلسٹ دنود دُوا نے جس چابک دستی سے "بوفور سودا" کے خلاف بغیر سوچے سمجھے پروپیگنڈہ کرنے والوں پر سوالات کی جو بوچھاڑ کی وہ سُننے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

ایڈیٹر "شانِ ہند" بعض اوقات "دُوردرشن" کو "ہندو درشن" کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے مگر "بوفور سودا" پروگرام سننے اور دیکھنے کے بعد دلی خوشی ہوئی کہ ہمارا دُوردرشن اب صحیح راستے پر آ رہا ہے اور حکومت نے بھی دُوردرشن کے تئیں اپنی پالیسی میں تبدیلی کی ہے۔

اس پروگرام میں سرکار کی طرف سے جناب نارائن دت تیواڑی، جناب کرشن چندر پنت، جناب پی چدمبرم، جناب ارون سنگھ اور جناب گوپی ارورہ نے شرکت فرمائی اور اپوزیشن کے جناب رام جیٹھ ملانی، جناب پی اوپی کرشنن، جناب جسونت سنگھ، جناب الادی ارونا اور جناب وی پی سنگھ نے پروگرام کی رونق بڑھائی۔ اور مزے کی بات یہ رہی کہ مجلہ حضرات کو اپنی اپنی بات کہنے کا بھرپور موقع دیا گیا۔ جلسوں میں تقریروں میں یا اخبارات میں بیانات کے ذریعے الزامات لگانا بڑی آسان بات ہے لیکن کیمرے کے سامنے ایک منجھے ہوئے جرنلسٹ کے تابڑ توڑ سوالات کے جوابات میں ان الزامات کو ثابت کرنا اور مؤثر انداز میں بیان کرنا دوسری بات ہے۔

اب تک کی جملہ اطلاعات، الزامات، تردیدوں غرضیکہ بوفور سودے کے بارے میں ہر قسم کی کہی گئی باتوں سے متعلق دنود دُوا صاحب نے بغیر کسی طرفداری کے سب کا ذکر بڑے ہی اچھے انداز میں کیا مگر ستم ظریفی تو یہ ہوئی کہ جناب رام جیٹھ ملانی جیسا رواں دواں قانونی بحث کرنے والا قانون داں محض انگریزی کے بے تکان بولنے کا ہی مظاہرہ کر سکا مگر دُوا کے سوالات کے جواب وہ اپنی روایات کے مطابق نہ دے سکے اور محض اپنی صفائی بھدے اور پھوہڑ انداز میں دیتے رہے۔

جناب رام جیٹھ ملانی نے وزیراعظم کو ایک عرصہ تک ہر روز دس سوالات کے تحت کیا کچھ نہیں کہا۔ بے شک انھیں اس اقدام سے سستی شہرت ملی مگر انھوں نے کسی حد تک ہندستانی تہذیب اور کافی حد تک بعض اخلاقی قدروں کو مجروح کیا اور ہمیں یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی تکلف نہیں ہونا چاہیئے کہ جناب رام جیٹھ ملانی کے بعض سوالات محض وزیراعظم کی ناتجربہ کاری، مردم ناشناسی اور بعض حماقتوں (معافی کے ساتھ) کے باعث عالم وجود میں آئے۔

بوفور سودے کے اہم ستون جناب وِن چڈھا کو بھی اس پروگرام میں شرکت کا فخر حاصل تھا۔ مگر وہ کچھ بڑے غصے میں اور ایمانداری کی بات بھی یہی ہے کہ اُن کا غصہ حق بجانب تھا اپوزیشن نے جناب وِن چڈھا کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا جبکہ اُن کو قصوروار ٹھہرانے کے لئے اپوزیشن کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مگر یہ کہنا ہی پڑے گا کہ وِن چڈھا نے جس بیباکانہ انداز میں مدلل اور صداقت پر مبنی جوابات دیئے وہ جناب رام جیٹھ ملانی کے پیشہ ورانہ قانونی انداز بیان سے کہیں زیادہ مؤثر اور وزن دار تھے۔

حکومت کی طرف سے جناب تیواڑی اور خصوصاً جناب گوپی ارورا نے بڑے ہی اچھے اور مؤثر انداز میں اور بغیر کسی اشتعال کے وزیراعظم کا کیس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔

اپوزیشن کا رہا سہا معاملہ جناب اوپی کرشنن نے تمت بالخیر تک یہ کہتے ہوئے پہنچا دیا کہ اُن کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وزیراعظم نے رشوت کھائی ہے اور اُنھوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے انگریزی میں کہا:۔

" آئی ایم وِتنگ ٹو گیو ہِم دی بینی فٹ

> ایڈیٹر "شانِ ہند" بعض اوقات دُوردرشن کو ہندو درشن کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے مگر "بوفور سودا" پروگرام سُننے اور دیکھنے کے بعد دلی خوشی ہوئی کہ ہمارا دُوردرشن صحیح راستے پر آ رہا ہے اور حکومت نے بھی دُوردرشن کے تئیں اپنی پالیسی میں تبدیلی کی ہے۔

غرضیکہ وَنودڈوا صاحب نے ایک ہی جھٹکے میں بوفورز سودے کی حقیقت کو روڈالی عوام کے سامنے رکھنے پر اپوزیشن کو بے بس کر دیا جب کہ حکومت یہ کام ایک سال تک نہ کر سکی تھی۔

ہمیں دُوَر درشن کا ممنون ہونا چاہیئے کہ جس نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کی ہے اور بوفورز سودے ایسے متنازعہ مسئلہ پر حکومت اور اپوزیشن دونوں کو اپنا اپنا کیس عوام کے سامنے رکھنے میں کسی رُو رعایت کے بغیر یہ پروگرام پیش کیا ہے۔

وزیر اطلاعات ونشریات جناب ایچ۔ کے۔ ایل بھگت جو کہ بعض (اوقات) خودساختہ کانگریسیوں اور عوام کو دھوکے میں رکھنے والوں کی مدد کرنا بھی کانگریس کی خدمت سمجھتے ہیں اس زمرہ میں مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دُوَر درشن کی کایا پلٹ کرنے کی مہم کا آغاز کیا ہے۔ اسی وزارت کے سکریٹری گوپی کرشن سمن دوبے اور دُوَر درشن کے ڈائرکٹر جنرل بھی دُوَر درشن کی اس خوشگوار پیش قدمی پر مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے عوام کے ذہنوں سے اس حقیقت کو دُور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ دُوَر درشن محض سرکاری بھونپو ہی نہیں ہے۔

۱۹۸۸ء کی اُردو مطبوعات پر اُردو اکادمی دِلّی کے انعامات

کل پرسوں ہی اُردو اکادمی دِلّی کی طرف سے ۱۹۸۷ء کی اُردو مطبوعات پر انعامات کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ مطبوعات شریکِ مقابلہ نہیں کی گئیں ہیں جنھیں اُردو اکادمی دِلّی کی طرف سے مالی امداد دی گئی تھی۔ حالانکہ یہ سلسلہ ۱۹۸۶ء تک کی ایسی مطبوعات پر جاری رہا۔

جب ۱۹۸۷ء کی مطبوعات انعامی مقابلہ کے لیے اردو اکادمی نے ایک اشتہار کے ذریعہ طلب کیں تو اس اشتہار میں اس امر کی تشریح نہیں کی گئی تھی کہ جن مطبوعات کی اشاعت پر اُردو اکادمی دلّی نے مالی امداد دی ہے وہ شریکِ مقابلہ نہ ہوسکیں گی۔

انعامی مقابلہ کے لیے اُردو مطبوعات کی وصولی کی آخری تاریخ کے کچھ ماہ بعد اُردو اکادمی نے اچانک یہ فیصلہ کیا کہ اُن کتابوں کو شریکِ مقابلہ نہ کیا جائے جن پر اکادمی نے مالی امداد پہلے ہی دے دی ہے۔

یہ فیصلہ بادی النظر میں اخلاقی اور اصولی طور پر سو فیصد درست ہے مگر اکادمی کے اشتہار کی روشنی میں قانونی طور پر یہ فیصلہ سراسر غلط ہی نہیں، ناانصافی پر بھی مبنی ہے بلکہ دوسرے الفاظ میں اکادمی کی وعدہ خلافی کے مترادف ہے۔ اکادمی کو یہ فیصلہ انعامی مقابلہ کے لیے، کتابیں طلب کرنے سے پہلے ہی کر لینا چاہیئے تھا اور اپنے اشتہار میں یہ اعلان کر دینا بھی ضروری تھا۔

اکادمی کو وعدہ خلافی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اُسے یہ اختیار تھا کہ ایسی تمام مطبوعات کو انعام کا مستحق قرار ہی نہ دیتی جن پر اکادمی نے مالی امداد دی تھی۔ ایسی حالت میں کوئی بھی مصنّف اُسے چیلنج نہ کر سکتا تھا کہ اس کی تصنیف پر انعام کیوں نہیں دیا گیا کیونکہ انعامی کمیٹی کے ایسے فیصلہ پر کوئی گرفت نہیں مگر جس صورت میں اکادمی نے وعدہ خلافی کی ہے اُسے قانونی طور پر چیلنج کیا جا سکتا ہے۔

اُردو اکادمی کی دوسری وعدہ خلافی

تقریباً تین ماہ ہوئے کہ اُردو اکادمی کی قائم کردہ دارا شکوہ لائبریری کا افتتاح دلّی کے لیفٹننٹ گورنر صاحب نے دلّی اکادمی کے ہال میں فرمایا۔ جس میں انھوں نے سکریٹری صاحب اردو اکادمی کی تقریر کے جواب میں فرمایا تھا کہ دس ہزار کتابوں کی کیا بات ہے میرے پاس اتنا روپیہ ہے کہ لائبریری کے لیے ایک لاکھ کتابیں خریدنے کی بھی گنجائش ہے جس پر حاضرینِ جلسہ نے پُرزور تالیوں سے ایل۔ جی صاحب کا دلی شکریہ ادا کیا۔

اس کے کچھ دنوں بعد اُردو اکادمی دِلّی نے ناشرین، کتب فروشوں اور مصنّفین سے کتابیں طلب کیں تاکہ ایک کمیٹی ان کتابوں کا انتخاب کر سکے جو دارا شکوہ لائبریری کے لیے خرید کی جا سکیں۔ لہٰذا تاریخ مقررہ سے پہلے پہلے ہزاروں کتابیں اکادمی کے دفتر میں پہنچ گئیں۔ اشتہار میں یہ تشریح بھی کی گئی تھی کہ جو کتابیں قابلِ خرید نہیں ہوں گی وہ ۵ اپریل کے بعد واپس لے لی جائیں۔ مگر ہوا یہ کہ ۵ اپریل کے بعد جس قدر بھی کتابیں برائے انتخاب آئی تھیں، وہ سب کی سب ناشرین، بک سیلرز وغیرہ کو بغیر کوئی وجہ بتائے واپس کر دی گئیں یعنی اشتہار کے ذریعہ کتابیں خریدنے کا لالچ دے کر ناشرین، بک سیلرز اور مصنّفین کو یہ عزت بھی دی گیا کہ اپنا کوڑا کرکٹ اٹھا کر لے جاؤ۔

دلّی کے لفٹننٹ گورنر فرماتے ہیں کہ اُنکے پاس دس ہزار تو کیا ایک لاکھ کتابیں خریدنے کے لیے روپیہ کا انتظام ہے اور لیفٹننٹ گورنر کے نمائندے جناب سکریٹری اُردو اکادمی بغیر کوئی وجہ بتائے، کل کتابیں واپس کر دیتے ہیں ہو سکتا ہے کہ روپیہ کی کمی کا معاملہ درپیش ہو تو ایسی حالت میں ایسے اشتہار جاری کرنے کا کیا فائدہ جس سے کہ وعدہ خلافی ہو اور لیفٹننٹ گورنر صاحب کے فرمان بلکہ وعدہ کو جھٹلایا جائے۔

مندرجہ بالا ہر دو وعدہ خلافیوں کی اصل وجہ کیا ہے، اس سلسلے میں اُردو اکادمی کے معزز ممبران کی آراء گرامی کی روشنی میں "شاعر" کی آئندہ اشاعت میں روشنی ڈالی جائیگی۔



غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

خوفِ تقدیر بھی دو روز کی مہمانی بھی
ایک مشکل ہے کچھ ایسی کہ ہے آسانی بھی

اپنے زخموں کو بہر طور ہرا رکھا ہے
دل نے چاہت میں تری کی ہے نمکدانی بھی

غرب سے اُبھرا نہیں مہرِ درخشاں ہرگز
کیا بدلتی ہے کبھی فطرتِ انسانی بھی؟

اپنی وحشت کے تصوّر سے کبھی گھبرائے؟
اپنی صورت کسی آئینے میں پہچانی بھی؟

دم بخود رہنے لگی لمحہ بہ لمحہ گویا
مری مانند یہاں ہے مری حیرانی بھی

دل بھی کچھ صاف سا، شفاف سا ہوگا اُن کا
ویسے چہرہ تو منوّر بھی ہے نورانی بھی

کیا کیا میں نے زمانے کے چلن سے ہٹ کر
کام آئے جو مری بے سر و سامانی بھی

یہ جو آثار نظر آتے ہیں محشر کے یہاں
ہو نہ ہو، کی ہے کسی نے کوئی نادانی بھی

وقت کا ناگ ازل سے بڑا زہریلا تھا
اِس کا کاٹا تو نہ مانگے ہے کہیں پانی بھی

پھنس گیا آدمی خود ساختہ پھندوں میں حقیر
بھول بیٹھا کہ ہے یہ چیز کوئی فانی بھی

702, Gold Crown
J. P. Road
Andheri (W)
Bombay-400 061

ایم۔ ایچ۔ پرکار

کویت کا تاریخ ساز مشاعرہ

۲۵ فروری ۱۹۸۸ء بروزِ جمعرات امتیاز الیاس کی رہائش گاہ پر کویت کی ۲۷ ویں "عیدالوطنی" کے موقع پر

سرزمین کویت نے نہ صرف روزگار کے لئے برِّ صغیر کے باشندوں کو اپنی طرف راغب کیا، بلکہ فن و ادب کے دلدادہ افراد کے لئے اُن کے پوشیدہ جوہر اُجاگر کرنے کے مواقع عطا کئے۔ مورخہ ۲۵ر فروری ۱۹۸۸ء بروزِ جمعرات جناب امتیاز الیاس صاحب کی رہائش گاہ پر ایک غیر طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا تاکہ کویت کے ستائیسویں عید الوطنی کے موقع پر اہلِ کویت کی خوشیوں میں برابر کے شریک بنیں اور کویت سے ملی ہوئی محبت، محبت ہی کے روپ میں لوٹا دیں مشاعرے کا اخبار میں اعلان کیا گیا اور تین ہفتے پہلے ہی سے فرداً فرداً شعرائے کرام و ادب نواز خواتین و حضرات کو مدعو کیا گیا۔ رہائش گاہ تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو اس لئے راستوں کا نقشہ تیار کر کے تقسیم کیا گیا رہائش گاہ تک پہنچانے کے لیے راستوں پر جا بجا رہبری کے بورڈ آویزاں کئے گئے رابطہ کے لئے ٹیلیفون نمبر دیا گیا اور ہر طرح سے یہ اطمینان کر لیا گیا کہ کسی قسم کی کمی نہ رہ گئی ہو۔ شہر میں عیدالوطن کی متعدد تقریبات تھیں لیکن جناب امتیاز الیاس کی دعوتِ پُرخلوص نے اس طرح دل میں گھر کر لیا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے شہر کے سارے راستے انھیں کے گھر لے جاتے ہیں۔ شہر بھر میں مشاعرہ کی دھوم تھی۔

جناب نور پرکار کی رہائش گاہ ادبی روایتوں کو جنم دیتی رہی ہے۔ ادبی تقاریب میں شمولیت کے لئے اربابِ ذوق یہیں سے روانہ ہوتے ہیں بقول جناب وفا صابری "قافلہ یہیں سے بنے گا" اب کے بھی ایسا ہی ایک قافلہ یہاں سے روانہ ہوا جس میں جناب وفا صابری، جناب نور پرکار، جناب قیصر عالم صدیقی، جناب اشفاق شاد، جناب فرید قریشی، جناب بختیار ملک، جناب کید ناتھ، جناب ایم۔ ڈی۔ خان، محترمہ عارفہ بانو کے علاوہ راقم الحروف بھی شامل تھا۔ یہ کاروانِ شوق جب منزلِ مقصود پر پہنچا تو جناب امتیاز الیاس، اُن کے ماموں جناب باقر صاحب، جناب الماس صاحب نیز خاندان کے جملہ افراد کو سراپا خلوص بنے، مہمانوں کا استقبال کرتے دیکھا۔ گھر کے احاطے سے باہر کے دروازے سے لے کر مشاعرہ گاہ تک خوش آمدید کہنے والے مخلص اربابِ خانہ نے شہر بھر میں پھیلے ہوئے مشاعرے کے جوش و خروش کو دوبالا کیا۔ گھر میں قدم رکھا تو ادب نواز خواتین و حضرات کا جمِ غفیر موجود پایا جتنی وسیع جگہ اُن کے دلوں میں مہمانوں کے لئے تھی، اتنی ہی وسیع جگہ اُن کے بیٹھنے کے لئے گھر میں موجود تھی۔

صدر، مہمانِ خصوصی اور ناظمِ مشاعرہ کے لئے مخصوص نشستوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دو مائیکروفون سامنے رکھے ہوئے تھے۔ ایک ناظم کے لئے، دوسرا کلام سُنانے والے کے لئے۔ ویڈیو کیمرہ اور ٹی وی سیٹ موجود تھے تاکہ مدعو خواتین و حضرات مشاعرے کی کارروائی سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔ غرض شہر سے مشاعرہ گاہ تک مشاعرے کی ایک فضا بن چکی تھی۔ جونہی نشستوں پر بیٹھ گئے، نور پرکار صاحب نے مائیک سنبھالا، سامعین ہمہ تن گوش ہوگئے۔ انھوں

نے اپنے منفرد انداز میں حاضرینِ محفل کا خیر مقدم کیا۔ صدرِ مشاعرہ جناب اشرف شاد کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ روایت کے پاسدار اور جدیدیت کے علمبردار ہیں۔ اچھے شاعر، بیباک صحافی اور ادب دوست انسان ہیں۔ مہمانِ خصوصی جناب ایم۔ ڈی۔ خان کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی ادبی تقریب ہو اُن کی شرکت کے بنا وہ نامکمل معلوم ہوتی ہے۔ جناب بختیار ملک صاحب جنھوں نے مشاعرے کے باقاعدہ آغاز کا اعلان کیا تھا اُن کا تعارف کراتے ہوئے جناب نور پرکار نے کہا کہ بختیار ملک صاحب نہ صرف ایک صحافی ہیں جن کا قلم صحافتی دُنیا کی جان ہے، بلکہ ایک ایسے ادب شناس نقاد ہیں جن کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ایک سند و دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے نظامت کے فرائض بیکس صاحب کو سونپتے ہوئے جب اُنھوں نے اپنی جگہ لی تب تک اس تاریخی مشاعرے کا سماں بن چکا تھا۔

بیکس صاحب نے اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کا نام لے کر مشاعرے کا آغاز کیا اور صدرِ مشاعرہ کی اجازت سے حسبِ روایت پہلے اپنا کلام پیش کیا بیکس صاحب نے اپنا پہلا شعر ؎

"کیا گزرتی ہے بھنور میں وہ نظارہ دیکھنا
چھوڑ کر میری طرح تم بھی کنارہ دیکھنا"

پڑھا تو "واہ واہ" کی آوازوں سے کمرہ گونج اُٹھا۔ اور جب وہ اِس شعر پر پہنچے ؎

"نفرتوں کی آگ جب بھڑکے گی تو ہوگا بہت
ساری بستی کے لئے اک ہی شرارہ دیکھنا"

تو محفل میں پوری جان آ گئی تھی۔ اُنہوں نے اپنی غزل پوری کی اور جناب رحمت اللہ سلیم کو دعوتِ کلام دی جو چند اشعار لکھ کر پہلی بار مشاعرہ میں شامل ہوئے تھے۔ ادب نوازِ محفل نے اُن کی خوب ہمت افزائی کی۔ ذرا اِس تازہ واردِ بساط کے تیور تو دیکھنا۔

"وہ ہمیں اپنے ہی تو لگتے ہیں
جو ہمیں نفرتوں سے تکتے ہیں"

بیکس صاحب عرصۂ دراز سے نظامت کے فرائض انجام دیتے آ رہے ہیں ہر بار جب نئے شاعر کو دعوتِ کلام دیتے تو اسی شاعر کے مقبول شعر پڑھ کر ضرور سُناتے۔ قیصر عالم صدیقی آئے اور "خون کی ایک بوند" کے عنوان سے نظم پیش کی۔ نظم کیا تھی پیغامِ جہاد تھا جو اُنھوں نے ارضِ فلسطین پر ڈھائے ہوئے مظالم کے خلاف دیا تھا۔

تازہ واردانِ بساط میں ایک نام منوّر مرزا صاحب کا بھی آیا جن کے پاس بہر ملاقات فنِ مصوری پہلے ہی موجود تھا۔ بہ طورِ شاعر مُترنّم اپنے ہر فن مولا ہونے کا ثبوت دیا

"گزرے لمحوں سے مت چُرا آنکھیں
گزرے لمحے تو یاد آئیں گے"

اب فیاض دردگ صاحب کی باری تھی۔ انھوں نے صاف ستھرے اشعار کو جوش و خروش سے پیش کیا۔ آپ بھی دیکھئے گا۔

"کیسے کھلیں گے پھول محبت کے سوچئے
نفرت سے دل کا باغ تو ویران ہو گیا"

کئی سال پہلے ہندوستان کے معروف شاعر کا قطعہ پڑھا تھا جس کا یہ مصرعہ ع میری شام شام ہوئی" ہر وقت میری زبان پر رہتا ہے۔ آج بھی تکرارِ لفظی سے خوبصورت معنی پیدا کرنے والے کئی اشعار سُننے کو ملے درج ذیل اشعار آپ کی توجہ چاہتے ہیں:۔

(۱) "اے نازِ محبت سے ہم ناز اُٹھائیں گے
ہم پہ نہ دابِ جلی گو جلنے دے"

(نادر فتح پوری)

"نہ لے مجھ سے قسم تیری قسم یوں بھی ہے اور یوں بھی
مجھے تم سے محبت اے صنم یوں بھی ہے اور یوں بھی
جو بخشے تو کرم تیرا، نہ بخشے تو کرم تیرا
بہر صورت سرِ تسلیم خم یوں بھی ہے اور یوں بھی
رہیں گے ہم تو اے طالب حیات و موت کے طالب
نتیجہ زندگانی کا عدم یوں بھی ہے اور یوں بھی"

(یونس طالب)

"یوں تک رہا ہے آدمی ہر آدمی کو آج
جیسے تکے شکار شکاری مچان سے

محشر کے بعد پھر کوئی محشر نہ آسکے گا
مجھ کو یقین نہیں ہے تو پوچھ قرآن سے"

(محشر افغانی)

آج جہاں تکرارِ الفاظ کے اشعار سُننے کو ملے وہیں کئی شاعروں سے مطلع ثانی سُننے کو ملے کسی طرزِ خاص کا کثرت سے استعمال تقلید و پیروی کی نشاندہی کرتا ہے نہ کہ انفرادیت کی عکاسی

جناب محمد حسین صدیقی صاحب اور جناب کیدار ناتھ کیدار نے پنجابی میں خوبصورت کلام پیش کیا۔ گو سامعین میں اکثریت اُردو داں احباب کی تھی اس کے باوجود الفاظ کو تول تول کر ادا کرنے کے فن نے کلام کا مرکزی خیال سمجھنے میں سامعین کی مدد کی اور سامعین داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔

خورشید مظفر صاحب کی دانشوری اور قابلیت سے کون منکر ہو گا۔ وہ ایسے ایسے مضامین کلام میں باندھتے ہیں کہ خوش ہو جائیے۔ تخیل کا ساتھ اُنھیں الفاظ بھی عطا کریں تو سامعین پر حکمت کے خزانے کھل جائیں۔

"ہو فوقیت زباں پہ مذہب کی اے خدا
بن جائے اس جہاں میں اُخوت کی اک مثال"

یا

"وعدہ کر کر کے مکر جانا ادا اُن کی ہے
اُن کی ہر بات پہ مر جانا ہے شیوہ میرا"

جناب عبداللہ ساجد کے یہاں حکمت و ادب کا حسین امتزاج بدرجۂ اتم موجود ہے۔ سائنس کے سند یافتہ شاعرِ جدید کے کلام میں نازک خیالات کی آئینہ داری انھیں کا حصّہ ہے۔ آپ ہی خود فیصلہ کیجئے۔

"دَور جو امکان کی حد سے گزرا ہے ابھی
تو پکارے تو پلٹ آئے گا زندہ ہے ابھی
خواہشوں کی وسعتیں جچتی ہیں جیسے جسم میں
زندگی صحرا میں آوارہ بگولہ ہے ابھی"

جناب نور پرکار آزاد نظم کے شاعر ہیں۔ طرحی مشاعرہ ہو یا غیر طرحی وہ صرف نظم کہتے ہیں نظم میں طرح باندھنا اساتذہ وقت کو انگشت بدنداں ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ پوری نظم پڑھیں یا کوئی

پیش آپ کے سامنے اثرات بھی موجود ہیں —— ملاحظہ ہو:۔

بات تو کچھ بھی نہ تھی بات فقط اتنی سی تھی
کہ ہم میں تم میں کوئی بھی شناسائی نہ تھا
دل تو تھا مگر حوصلۂ باریابی نہ تھا
بات تو کچھ بھی نہ تھی بات فقط اتنی سی تھی
ہم نے تمہیں دیکھا تھا کبھی نہ تم نے ہمیں چاہا تھا کبھی"

اگر نور بہ کار دو آزاد نظم کے شاعر ہیں تو محترمہ مسرت جبیں زیبا وہ واحد شاعرہ ہیں جو کویت میں پہلی صاحب کتاب شاعرہ ہیں۔ درد، لذّت درد، احساسِ تنہائی اور یادیں اُن کی شاعری کے موضوع ہیں۔

میرے لئے تو سب کچھ ہے بکھا بھی اور بے جز بھی
تو بھلے تو یوں لگتا ہے بدلا پہلو موسم کا
رِم جھم بوندیں مانگ کے آنسو سارے جہاں پر برسی ہے
میں نے بانہوں میں لے کر دیکھا پہلا آنسو موسم کا

شاہد رنظامی صاحب کا شمار کویت کے اُستاد شعراء میں کیا جاتا ہے۔ اکثر چھوٹی بحر میں شعر کہتے ہیں اور بھرپور کہتے ہیں۔ اُن کے اشعار میں مزدور طبقہ کی آواز پوشیدہ ہوتی ہے لہٰذا اُن کا درد سب کا درد لگتا ہے۔ رنگِ کلام ملاحظہ ہو۔

" ایک حسینی، ایک یزیدی
دونوں اپنے بازو نکلے

اپنی تہذیب کے نغمہ پر بولنے والو!
نئے کشکول کو تیرے کیوں بھرنے کے آگئے

شدّتِ غم سے بند تھیں آنکھیں
لوگ سمجھے کہ سو رہا ہوں میں

کویت کے دوسرے اساتذہ شعراء میں ایک نام باقی احمد پوری صاحب کا ہے جو غزل کے شاعر ہیں۔ اب تک دو مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور تادم تحریر وہ شاگردوں کے اُستاد بن چکے ہیں۔ بذلہ سنج ہیں

سبھی رتوں کو یہاں اعتبار میں رکھنا
خزاں کا رنگ بھی شاملِ بہار میں رکھنا
اگر مقصودِ طلب ہو تو بے قصوروں میں ہو
ہوا کا کام نہیں ہے قرار میں رکھنا

نیاز بنارسی صاحب کا شمار اُن اساتذہ میں ہوتا ہے جو فنِ عروض پر حاوی ہیں اور فنِ شعرگوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ شعر کو سمجھ کر داد دینے والا فردِ واحد اُن کے نزدیک لاکھ درجہ بہتر ہے دل لگی کی خاطر اُٹھائی ہوئی ہزار ہا واہ واہ کی آوازوں سے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

" ذرّوں کا درد رُوح میں تحلیل ہو گیا
یہ مادہ حیات کی تاویل ہو گیا "

کہنہ مشق شاعروں میں جناب عبدالحمید ہوش صاحب کا نام سرِفہرست ہے۔

" یارب کسی کے عشق نے کیا کیا دیا مجھے
غم کیا دیا کہ درد کا دریا دیا مجھے "

جیسے اشعار سے اُن کا کلام مُرصّع ہے۔ وہ غزل کے شاعر ہیں اور بیگمان اُن کے کلام کا خاصہ ہے روایت کے پاسدار اور جدیدیت کے علمبردار شاعر اشرف شاد صاحب کے پاس طرزِ ادا کی وہ خوبی بھی موجود ہے جو سامعین کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے۔ جدیدیت اور روایت کے رنگ الگ الگ دیکھئے۔

" میری اذیتوں کا سفر ختم ہو گیا
اب اُس کے زخم دیکھنا اچھا لگا مجھے
سوچوں کو خودپسندی کی دیمک بھی لگ گئی
جھوٹی انا کے روگ کا کیڑا لگا مجھے

یا

تمہارے عارض و لب پر شفق شگفتگی ہے
تمہاری آنکھوں میں خوں رنگ ڈھب جلتے ہیں۔"

ان شعراء حضرات کے علاوہ جن شعراء کے کلام کو داد ملی اُن کے نام و اشعار درج ذیل ہیں۔

" کچھ نہ کہنے پہ کہہ گئی کیا کیا
یہ نظر اپنی کام کر آئی "
(افتخار اعظمی)

" میں تیرا ذکر کروں اور تیرا نام نہ لوں
کہاں یہ چھوڑ دیا ہے کسی نے لاکے مجھے"
(ناز فتح پوری)

" زمانہ گزر کے کہاں آ گیا ہے
دلوں سے گزر دل کی حالت تو دیکھو "
(عمران حسامی)

" ایک مدت سے مجھے اپنے ہی کھوئے دل کی تلاش
ہاں یہیں کھویا تھا میں خود ہی تو چل کے آگئے "
(امانت علی امانت)

اس شان سے وہ کرتا ہے انکارِ محبت
انکار بھی اس کا مجھے اقرار لگے ہے "
(ماد دل بہادر گڑھ)

غزل

یوسف گوہر شاہجہانپوری

کوئی بھی ملتا نہیں اب پیار سے
زندگی ہم تھک گئے ہیں بس ہار سے
خونِ دل سے آبیاریِ ادب
چاہتے ہو اور کیا فنکار سے
چہرے تو پہچان اپنی کھو چکے
آدمی پہچانئے کردار سے
ہر قدم پر حادثے ہونے لگے
شکر بھیجو لوٹ کر بازار سے
دوستوں کے یاد آتے ہیں سُلوک
سابقہ پڑتا ہے جب اغیار سے
پرچمِ حق کون پھر لہرائیگا
ہم جو ڈر جائیں فرازِ دار سے
مان لیں گوہر اُسے کیسے بشر!
جو نہیں ڈرتا خدا کی مار سے

سال تک ہم جہاں میں یہی کشتی کا وقت ہے
وہیں گلوں اکتفے یہیں جہاں حاصل کرتے ہیں "
(عبدالمجید نجم)

" ہائے رے مفلسی تیرے صدقے
خون تک میں نے بیچ ڈالا ہے "
(عنبر فتح پوری)

اے حق ہے کہ سے دل سینکڑوں وعدہ ترغیبوں سے
مرد وعدہ کوئی پورا نہ ہونے دے تو اچھا ہے "
(رشید میواتی)

اس نے کلام جس سے کیا بات آ گئی
پتھر ہو یا شجر ہو ہر اک بولنے لگا "
(کمال اظہر)

جہاں تم نے چھوڑا تھا راہِ وفا میں
وہ کم نشدہ حامد ابھی تک وہیں ہے "
(حامد کرتار پوری)

حسن چھپتا نہیں پسِ پردہ
چھوٹتی ہے کرن نگینے سے "
(فرید قریشی سحر اکبر آبادی)

دورِ استحصال کا ہے معجزہ
محنت و زر کی کشاکش عام ہے "
شاہجہاں معروف سی ہے شخصیت
تاج کے خالق مگر گمنام ہیں "
(وفا صابری)

اس تاریخ ساز مشاعرے میں چونتیس شعراء کرام نے شرکت کی اور اسی کے قریب تعداد میں ادب نواز خواتین و حضرات تھے۔ لہٰذا ہر کسی کو واجبی توجہ اور خاصی حد تک آئی نہ ملی۔ تحسین منصفانہ جہاں کہیں غیر ضروری داد دینے کی کوشش کی گئی تو وہ اہل نظر کی دانست میں بیدا و کمرا انگی گئی۔ کیمرے کی چوکنا آنکھ سے کب کونسی چیز پوشیدہ رہ سکتی ہے جہاں اُس نے مشاعرے کی پوری کارروائی کو محفوظ کر لیا وہیں حاضرینِ محفل کی معمولی سے معمولی حرکات و سکنات کی عکاسی بھی کی۔ مذکورہ بالا مہمانوں کے علاوہ جن کی آمد نے اس مجلسِ مشاعرہ کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ان میں جناب محمد طالب جنجوعہ دیو حسن بنگش صاحب، جناب فخرالدین چکی والا، محمد اکبر تاج الدین صاحب، ضیغم خان صاحب، باقر صفدر علی صاحب، الیاس حسین صاحب، عنایت علی ٹھاکر صاحب اور اقبال صاحب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

مشاعرے کے اختتام پر مہمانِ خصوصی ایم۔ ڈی۔ خان صاحب نے اُبھرتے ہوئے شاعروں کو خوب سراہا اور بیش قیمت ہدایات سے نوازا۔ کہنہ مشق شاعروں کے نیک دوش ہونے کی طرف بھی اشارہ کیا جس سے مجھے اتفاق نہیں اس لئے کہ اہلِ قلم کی تحریروں میں تابندگی اُن کی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ جناب بختیار ملک صاحب نے کہا کہ آج کا قلمکار اپنے فن کو وقت کے تقاضوں سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ اُسے وقت اور تاریخ کے ساتھ چلنا ہے۔ وہ تاریخ سامنے ہے جو تاریخ سامنے ہے اور اس کا ذکر کویت کے ہونے والے مشاعروں میں برسوں تک ہوتا رہے گا۔ چند شعراء جو کسی مجبوری کی بنا پر اس میں شرکت نہ کر سکے اُن کی کمی کسی طرح محسوس نہیں کی گئی البتہ یہ احساس ضرور ہوا کہ وہ ایک بہترین نشست سے محروم ہو گئے۔

آخر میں صاحبِ خانہ جناب امتیاز الیاس نے خاص ادبی انداز میں تمام حاضرینِ مجلس کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا اور حاضرین کی پذیرائی شربت سے تواضع کی۔ اُن کے الفاظ جو جذبۂ خلوص میں پنہے ہوئے تھے ادب کے لفظوں میں گویا کہہ رہے ہوں کہ

" قطرۂ خونِ جگر سے کی تواضع عشق کی
سامنے مہماں کے جو کچھ تھا میسر رکھ دیا "

جس خلوص و محبت سے کاروانِ شوق نے محفلِ مشاعرہ میں شرکت کی تھی اور جس چاہت سے اُسے کا استقبال کیا گیا تھا اسی محبت و چاہت سے رخصت بھی کیا گیا۔ گھر پہنچ کر تاریخ ساز مشاعرے کی کامیابی پر زبان سے الفاظ نکل رہے تھے اور پاس کی مسجد سے اللہ اکبر کی آواز آئی اور میرے ذہن میں ذوقؔ کی نظم کا یہ شعر گونج گیا

" مؤذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے "

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

جہاں آپ کی رقم پہلے سے زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے

اب ۹٪ سالانہ سود حاصل کیجئے

چھ ماہ اور اس سے زائد لیکن
ایک سال سے کم مدت کے لئے میعادی ڈیپازٹ پر۔

●

فکسڈ ڈیپازٹ پر شرح سود
۱۱٪ سالانہ ۲ سال کی مدت کے لئے
۱۰٪ سالانہ :- ایک سال سے زائد لیکن ۲ سال سے کم مدت کے لئے۔

●

سیونگ ڈیپازٹ پر ۶٪ سالانہ سود دیا جاتا ہے۔
ایک ہزار روپے ۶ سال میں ۲۰۳۳ روپے بن جاتے ہیں۔
ایک ہزار روپے ۱۰ سال میں ۳۲۶۷ روپے بن جاتے ہیں۔

ہر قسم کے بینکنگ کے کاروبار (جس میں غیر ملکی زرمبادلہ بھی شامل ہے) کے لئے تشریف لائیں۔

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ ۳۶ نیتاجی سبھاش مارگ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون: ۲۷۸۲۶۶، ۲۶۴۳۷۴ ٹیلیکس 31 - 66823 Zain IN



فیصلہ

جس طرح عورت کی خوبصورتی اس کیلئے جی کا وبال بن جاتی ہے کہ ہر ایرے غیرے کی نظریں اس کے مل وجود کو چھیدتی رہتی ہیں اسی طرح مرد کی وجاہت اور اونچا قد کاٹھ مرد کے لئے عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ عموماً ایسے مرد ننانوے فیصد لڑکیوں کا آئیڈیل بن جاتے ہیں۔

میں کوئی حُسن کا دیوتا تو نہیں ہُوں۔ لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ مَیں مکمل طور پر لڑکیوں کا آئیڈیل ہوں حالانکہ مَیں نے خود کو ہمیشہ قبول صورت شخص ہی سمجھا ہے۔ البتہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے مَیں خود ہی کمپلیکس کا شکار رہا ہوں۔ اور با تنہائی میں خود کو لعنت ملامت کی ہے۔ کہ اگر ابا کی بات مان لی ہوتی اسکول سے نہ بھاگتا تو آج بس ڈرائیور تو نہ ہوتا جس کی جان ہمہ وقت ہتھیلی پر ہی رہتی ہے جی ہاں مَیں اومنی بس کا ڈرائیور ہوں۔ لوگوں کے خواب اور خواہشیں بہت بُلند ہوتی ہیں۔ کوئی بچہ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے کوئی انجینئر یا پائلٹ۔ مگر میرا خواب شروع ہی سے بس ڈرائیور بننا تھا۔

مَیں اسکول سے بھاگتا اور بسوں پر سوار ہوتا "ڈبل اے استاد جانے دوس"

یا۔ "روک کے اُستاد۔!!"

جس طرح کنڈیکٹر سیٹیاں مارتے ہیں مَیں بھی دو انگلیاں زبان تلے رکھ کر زوردار سیٹی بجاتا۔

میری کئی ڈرائیوروں سے دوستی ہو گئی تھی کوئی بھی مجھے بس پر چڑھنے سے نہ روکتا بلکہ آخری اسٹاپ پر مجھے چائے یا فانٹا اور کوکا کولا کی بوتلیں پلائی جاتیں۔ مَیں یوں خوش ہوتا جیسے مجھے کونین کی دولت مل گئی ہو۔

پڑھائی میں، مَیں زیرو تھا تبھی تو پانچویں کلاس میں تین بار فیل ہونے کے بعد مجھے اسکول سے نکال دیا گیا پڑھنا کون کافر چاہتا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ چلو پڑھائی سے تو جان چھوٹی۔ اب بسیں تھیں اور مَیں تھا۔

سارا دن "ڈبل اے جانے دوس" کا نعرہ لگاتا رہتا اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ڈرائیور کو رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچتا۔

کیا کبھی مَیں بھی یہ جگہ حاصل کر سکوں گا؟ اس وقت بس ڈرائیور میرے لیے کسی شہزادے سے کم نہ تھا۔ گھر میں ابا لعنت ملامت کرتے تو اماں ڈھال بن جاتیں۔

میرے دونوں چھوٹے بھائی پڑھ رہے تھے۔ بقول ابا کے مَیں ہی اُن کے دل کی پھانس تھا آخر انھوں نے مجھے درزیوں کی دُکان پر بٹھا دیا دو روز تو مَیں نے لگن سے کام کیا مگر جونہی گاڑی کا ہارن سُنتا میرے کان کھڑے ہو جاتے اور ہاتھ کانپ جاتے۔ کئی بار سوئی انگلی میں چبھ گئی مَیں بے زار ہو گیا بھلا یہ میری منزل کب تھی؟ ایک ہفتہ بعد ہی مَیں اُستاد سے لڑ پڑا صرف اس لیے کہ کاج بنانے پر اُس نے مجھے ڈانٹا تھا۔ مَیں نے سوئی دھاگا پھینک دیا اور دکان چھوڑ کر سیدھا بسوں کے اڈے پر پہنچا۔ اور ڈرائیوروں اور کنڈیکٹروں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

"بشیرے یار کہاں چلا گیا تھا۔؟" ڈرائیور چاچا منیر نے مجھے پچکارا تب مَیں نے اُسے بتایا کہ ابا نے مجھے کام پر بٹھا دیا تھا اور مَیں بھاگ آیا ہوں۔

چاچا منیر نے اپنے کنڈیکٹر سے کہا۔

"لالی دین آج سے بشیرے کا حصہ بھی کر دیا

محمود نے بشیر سے تیری نوکری پکی۔ صبح ساڑھے سات بجے آجایا کر اور دوپہر تک چالیس پیسے پیٹتا تھر سے۔ بس آواز لگانی ہے تو نے

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں آواز لگانی تو مجھے آتی ہی تھی۔ دوسرے روز ڈیوٹی مشقت کرنے کے بعد لال دین نے مجھے پچیس روپئے دیئے۔ اور اسی وقت اسی بس پر صادق ڈرائیور کی ڈیوٹی تھی میں نے صادق کے ساتھ بھی بس پر آواز لگانے کی خواہش کا اظہار کیا اور وہ مان گیا۔ شام کو اس نے بھی بیس روپئے مجھے دیئے۔ اور جب رات کو میں نے پینتالیس روپئے ابا کے ہاتھ میں رکھے تو انھوں نے ایک لمحہ کو حیرت سے مجھے دیکھا۔

"چوری تو نہیں کیئے؟"

"خود کمائے ہیں۔" میں نے اکڑ کر جواب دیا۔

"کیا رفیق میرے نے دیئے ہیں۔"

"وہ کنجوس دے گا۔" میں نے تمسخر سے کہا میں نے اس کی دُکان چھوڑ دی ہے۔"

"پھر۔؟" ابا نے پوچھا۔

"پھر یہ کہ میں بس پر کنڈیکٹری کر رہا ہوں۔ یہ میرا شوق ہے اس کے علاوہ میں کچھ نہیں کرونگا۔ مجھے ڈرائیور بننا ہے۔" میں نے پہلی بار ماں باپ کو اپنے ارادوں کے بارے میں بتایا اور پھر جب لڑکے چاہیے گھر لا کر دیں تو خود بخود عجیب طرح کی اکڑ میرے اندر بھی آگئی تھی۔ میری باتیں سُن کر والدین خاموش رہے اور میں روزانہ جو بھی کماتا لا کر انھیں دے دیتا۔

شکر کا شکر تھا کہ مجھے کوئی بری عادت نہ پڑی تھی سگریٹ پان کو چھوتا تک نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی ڈرائیونگ سیٹ پر ضرور بیٹھ جاتا یہی میرا شوق تھا۔ وقت گزرتا رہا اور میں مختلف بسوں پر آواز لگاتے ہوئے عمر کی منزلیں طے کرتا رہا اب میں اٹھارہ برس کا بھرپور جوان تھا۔ وہ خواب جو میں نے بچپن سے دیکھا تھا وہ اب پورا ہوگیا تھا یعنی میں ڈرائیور بن گیا تھا وہ بھی اومنی بس کا ڈرائیور۔ پہلے روز جب میں نے بس چلائی تو مجھے لگا جیسے آسمان پر اُڑ رہا ہوں۔ بس روڈ پر چلاتا کہ بس پلک جھپکتے میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی اور بہت جلد میں سب بارے میں مشہور ہوگیا کہ۔

بشیر سے زیادہ تیز بس کوئی نہیں چلاتا میری ماں مجھے منع کرتی میرے افسران نے بھی کئی بار تنبیہ کی مگر میں کیا کرتا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی مجھے جانے کیا ہو جاتا۔ کہ میں ماں سے کیا ہوا عہد بھول جاتا۔ افسر کی تنبیہ دماغ سے نکل جاتی تھی کہ سارجنٹ مقبول بخاری نے بھی مجھے سمجھایا تھا مگر میرے ذہن میں کوئی بات بیٹھتی ہی نہ تھی۔

میں نے ڈرائیوروں سے شرط لگائی تھی۔ کہ کوئی بھی مجھے اوور ٹیک کرے میں اُسے ایک ہزار روپئے انعام دونگا۔ لیکن اب تک کسی مائی کے لال کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ میری سُرخ پری سے آگے نکل جائے جبکہ میری سُرخ پری کئی بسوں، ٹرکوں موٹروں کو اوور ٹیک کرتی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی۔ جب بھی نئی بسیں آتیں میں افسروں سے بالکل بچوں کی طرح ضد کرکے نئی بس اپنے روڈ کے لیئے لے لیتا۔

میرے مسافر میرے نام سے واقف ہیں حتیٰ کہ وہ میری بس کے آنے کا انتظار کرتے ہیں کہ انھیں چند منٹوں میں صدر پہنچا دیتا ہوں۔ عورتیں کہتی ہیں۔

"بشیرا بہت مراثی ہے بہت تیز بس چلاتا ہے۔" اس کے باوجود بھی وہ میری بس میں سفر کرتی ہیں عورتوں کی بھی سمجھ کا بھی عجیب معاملہ ہے۔ ان کے قول و فعل میں بہت تضاد ہوتا ہے۔

جب میری ماں مجھے سمجھا سمجھا کر تھک گئی کہ میں بس آہستہ چلاؤں اور جب میں نہ مانا تو اُس نے میری زندگی میں اپنی بھانجی زرافشاں کو شامل کر دیا کہ اپنے ساتھ دوسری زندگی کا احساس کرکے میں اپنی عادت بدل لوں گا۔ مگر وہی بات ہے کہ پوتڑوں کے بگڑے ہوئے کب سُدھر سکتے ہیں۔

زرافشاں جو میری بیوی تھی اور جس نے بارہا مجھے کہا تھا۔

"دیکھو بشیر اب تم اکیلے نہیں ہو میری زندگی تمہاری ہی زندگی کی مرہونِ منت ہے بس تم بس آہستہ چلایا کرو۔"

یہ نہیں ہو سکتا۔" میں جلدی سے بولا۔

"کیوں؟" اس نے اپنی بے پناہ خوبصورت آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"اس لیئے کہ میری شہرت کی وجہ ہی یہی ہے کہ میں بس تیز چلاتا ہوں۔" میں نے فخر سے کہا۔

"ضروری ہے شہرت؟"

"اگر میں نے تمہاری خاطر خود پہ کنٹرول کیا تو سب کہیں گے بشیرا ڈر گیا ہے اور میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا پھر زندگی موت تو رب کے ہاتھ میں ہے" میں نے زرافشاں کو سمجھایا۔

"تم یہ نوکری چھوڑ دو۔"

"کیوں۔؟" میں نے ابرو چڑھا کر اُسے دیکھا

"جب تک آتے نہیں ہو میرا دل سہما ہوا کبوتر بنا رہتا ہے۔ پتا بھی کھڑکتا ہے تو میری جان کانپ کر رہ جاتی ہے۔ میرے منہ میں خاک لگتا ہے ابھی تمہارے بارے میں بری خبر سنوں گی بس تم یہ نوکری چھوڑ دو"

"پھر کیا کروں؟"

"کوئی بھی کام کر لو۔ پرچون کی دُکان کھول لو"

"مجھ سے یہ بنیوں کا کام نہیں ہوتا۔ تجھے رہنا ہے تو رہ ورنہ چلی جا ماسی کے گھر۔" میں مسلسل اس کی نصیحتوں سے تنگ آگیا تھا۔ میرے لہجے میں پتھروں جیسی سختی تھی زرافشاں حیرت سے مجھے دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں ساون بھادوں اُتر آئے۔ میں اس کی پرواہ کیئے بغیر کرسی کو ٹھوکر لگاتا ہوا کمرے سے نکل گیا کہ عورت کے آنسوؤں سے مجھے بہت چڑ ہوتی ہے۔ پھر اس روز کے بعد زرافشاں نے مجھے کوئی نصیحت نہ کی البتہ یہ ہوا کہ جب صبح سویرے میں نوکری پر جانے لگتا تو جانے کیا کچھ پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکتی۔ تاکہ میں بلاؤں سے محفوظ رہوں۔

مگر زرافشاں کی پُرخلوص دعائیں بھی کام نہ آسکیں اور آخر کار ایک بلا مجھ سے چمٹ ہی گئی۔

خوبرو عورت بھی تو کسی بلا سے کم نہیں ہوتی نا۔؟" یہ تو وہ خوشبو ہے جو آپ ہی آپ دل کے آنگن میں پھیل جاتی ہے۔ میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ شادی نے مجھ پر بہت خوشگوار اثر ڈالا ہے اور میں پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگیا ہوں۔ وہ خوبصورت سی لڑکی جس کی رنگت گندم کی سنہری بالیوں کی طرح تھی۔ آنکھوں میں ستاروں کی چمک تھی اور سیاہ بالوں کی لمبی سی چوٹی اس کی کمر پہ ناگن کی طرح جھولتی رہتی

ے سے دو پٹے میں لگو کو چھپائے وہ بالکل
یری بائیں جانب کی سیٹ پر بیٹھی۔ اور میں نے
ں غور بھی نہ کیا تھا کہ مجھے دیکھ کر چپکے چپکے
راتی ہے۔ میں نے کہا۔ کہ جب میں بس چلاتا
ہے صرف ایک ہی خیال رہتا کہ کوئی مجھے ادور ٹیک
جائے۔

اور وہ خوبصورت حسینہ اپنی مسکراہٹوں کے پھول
کتی مجھے پتہ بھی نہ تھا وہ تو ایک روز میرے کنڈیکٹر
یف نے کہا۔

"یار اُستاد آج کل بہت اونچے جا رہے ہو۔"
"میں تو ہمیشہ ہی اپنی پرواز اونچی رکھتا ہوں۔" میں
ہا۔

"ہاں اُستاد تم نے دیکھا نہیں اس لڑکی کو جو تمہیں
دیکھ کر مُسکراتی ہے۔ تمہاری ہی بس میں بالکل
ی بائیں جانب بیٹھتی ہے۔"

"اچھا۔" میں اس کے انکشاف پر حیران تھا۔ "میں
بھی غور نہیں کیا۔"

"اب دیکھنا لگتا ہے وہ تم پر فدا ہو گئی ہے" شریف
"یار آخر کیا ہے مجھ میں۔"

"وجیہہ آدمی ہو اور مضبوط قد کاٹھ کے مرد ہی
یوں کے خوابوں کے شہزادے ہوتے ہیں قسم
تم اُسے لائن دو دیکھو کیسے کھنچی چلی آئے گی"
ماتے مجھے سمجھایا۔

"اچھا اب مجھے بتا نا کہ وہ کون سی ہے؟"
کہتے ہیں کہ نہ جاننے کے بہت سکھ ہوتے ہیں
قصے سے آگہی ہو جائے تو سکھ بھی دکھ میں تبدیل
لگتا ہے۔"

جب تک مجھے علم نہ تھا کہ وہ لڑکی مجھے دیکھ
ر مُسکراتی ہے میں بڑا مطمئن تھا اور جب سے
نے مجھے بتایا تھا تو دل میں عجیب سی گدگدی
لگی تھی۔ شریف نے بتایا تھا کہ وہ کسی بستی کے
اسے بس میں بیٹھتی ہے۔

دوسرے دن جونہی وہ فاتمہ بس اسٹاپ سے
شریف نے زور دار سیٹی بجائی۔

"مانتے ہو اُستاد ہیں ڈبل ہے۔"

کی آواز میرے کانوں میں آئی تو میں نے پلٹ
کر دیکھا پچھلے میں چڑھتی ہوئی اُس لڑکی کو دیکھا
وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سیٹ پر آ بیٹھی۔ جہاں
سے میں پورا کا پورا اُس کی نظروں کی رینج میں تھا۔

بس چلاتے ہوئے میں نے کن اکھیوں سے
کئی بار سے دیکھا۔ واقعی وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میری
طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ کئی بار میرا ہاتھ اسٹیرنگ
پر کانپا اور دل اتنی تیزی سے دھڑکا کہ اس کا شور بس
کا طور پر سُن رہا تھا۔ صدر تک پہنچنے تک کئی بار میری
اور اس کی نظروں کا ٹکراؤ بھی ہوا۔ بلاشبہ وہ حسین
لڑکی تھی۔ مگر زرافشاں سے زیادہ حسین نہ تھی
زرافشاں جس کی آنکھوں میں، میں ڈوب جاتا تھا
جو میری بیوی تھی میرے بیٹے کی ماں تھی۔ مگر وہ تو
تھی ہی میری اُسے کوئی بھی مجھ سے نہ چھین سکتا تھا
اور یہ لڑکی جو خود بخود ہی میری طرف بڑھ رہی تھی
میں اُسے جھڑک کر کفرانِ نعمت کا مرتکب نہ ہونا چاہتا تھا۔

دو روز بعد جب شریف اس لڑکی سے ٹکٹ لینے لگا
تو میں نے کہا۔

"اُنہوں۔" لڑکی نے ایک نظر مجھے دیکھا میں نے
مسکرا کر اُسے نظروں ہی نظروں میں منع کیا کہ ٹکٹ
نہ دے جواباً اس نے مُسکرا کر پیسے واپس اپنے پرس
میں ڈال لیے کہتے ہیں عورت ہنسی اور پھنسی مُسکرائی
اور جیب میں آئی اور یہ مقولہ کچھ غلط بھی نہیں ہے
اس کے مُسکرانے نے مجھے اتنا حوصلہ بخشا تھا
کہ جب آخری اسٹاپ پر بس خالی ہونے لگی اور وہ
بھی اُترنے لگی تو میں نے اپنے وجود کی ساری ہمتیں
مجتمع کر کے کہا۔

"سنیئے۔"

اُس نے ایک انداز بے پروائی سے گردن ترچھی
کر کے مجھے دیکھا۔

"آپ کا نام؟"

"رُوبینہ۔" اس کے پنکھڑی جیسے لبوں سے یہ
نام اس طرح نکلا جیسے سُریلی گھنٹیاں سی اٹھی ہوں اور
پھر وہ جلدی سے بس سے اُتر گئی۔ میں اُسے جاتا
دیکھتا رہا۔ بالآخر وہ لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔

"کہاں کھو گئے اُستاد۔" شریف نے میری
نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا
اور میں ہنس دیا بار بار میرا ذہن مجھے سمجھا رہا تھا۔

بشیر ایسی راہوں پر نہ چلو، تم شادی شدہ اور
ایک بچے کے باپ ہو۔ زرافشاں کا خیال کرو۔ ایسی راہ
چلتی لڑکیاں کسی کی بھی رفیق نہیں ہوتیں۔

اور دل کہہ رہا تھا۔

مجھے بہلانے میں تمہارا کیا جاتا ہے۔ چلو دل لگی ہی سہی
اور پھر دل کی بات میں نے مان لی۔ روبینہ جیسے ہی پہلی
سیٹ پر بیٹھنے لگا تھا اس سے پینگیں بڑھانے لگا میں نے
بس کو خوب سجا لیا تھا اور ٹیپ بھی سُنتا اور پوری
بس کے مسافروں کو بھی سُنواتا۔ اور جب اُس نے مجھ
سے پوچھا۔

"تم شادی شدہ ہو؟"

میں تو اس سوال کے لیے تیار ہی تھا۔

"بالکل نہیں۔ جب تک تم نہ ملتیں تو بھلا میں کس
طرح شادی کرتا۔" میں نے اُسے مدہوش کن ڈوز
دیا تو اس کی آنکھوں میں چمک کے ساتھ ساتھ
فخر کے ڈورے بھی لہرانے لگے۔ جب وہ بس سے اُترتی
تو میں ایک آدھ چبھتا ہوا جملہ کہہ دیتا۔ میرا دل چاہتا تھا
کہ کہیں بیٹھ کر جی بھر کر اس سے باتیں کروں مگر ایسے
دھندے کبھی کیے نہیں تھے۔ اس لیے اب مزا آ رہا تھا
آخر ایک روز میں نے اُس سے کہہ دیا۔

"صرف ایک جھلک سے میری تشنگی نہیں مٹتی
بینا اور دوسرے جھلک کے لیے پورے ایک پہاڑ جیسے
دن کا انتظار کرنا پڑتا ہے" وہ کوئی جواب دیے بغیر
بس سے اُتر گئی اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا

دوسرے روز جب وہ بس میں چڑھی تو میں
نے خواہش کے باوجود اس کی طرف نہ دیکھا۔ میں اس
سے ناراض ہو گیا تھا صدر میں بس خالی ہوئی تو وہ بھی
اُترنے لگیں۔

"میں رنگیل اسٹاپ پر جا رہی ہوں۔"
بینا نے کہا اور اُتر گئی۔ میرے لیے پیغام تھا کہ میں
بھی رنگیل اسٹاپ پر پہنچ جاؤں۔ مجھے لگا جیسے
دعاؤں کے سوکھے ہوئے کھیت میں بہار آ گئی ہو۔

میں نے غلام کبیر سے کہا۔

"صاحب جی ایک گھنٹے کی چھٹی دے
دیں میری طبیعت خراب ہے۔ اب کسی اور سے

کا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے ایک گھنٹہ تک آجاؤں گا۔"

میرا ارادہ ایسا تھا کہ اگر اجازت نہیں ملی تب بھی چلا جاؤں گا۔ تاہم کیپر نے بھی حجت نہیں کی اور مجھے چھٹی دے دی۔ میں نے شریف کو بتا دیا اور رنگل اسٹاپ کی طرف چل دیا۔ وہ وہاں پہنچی ہی تھی اور رومال سے چہرے کا پسینہ صاف کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

"خفا تھے۔؟"

"نہیں۔"

"پھر آج میری طرف دیکھا بھی نہیں تم نے۔"

"کل تم نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔"

"آج میں نے چھٹی کی ہے۔ اور جب تک مجھے فیکٹری سے چھٹی نہ ملتی میں تم سے وعدہ کیسے کر لیتی اس نے بڑی ہی معقول بات کی تھی۔

"چلو کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں بہت کچھ کہنا ہے۔" اور پھر ایک خالی رکشہ کو ہاتھ دے دیا۔

اس وقت مجھے اور کوئی جگہ نہ سوجھی میں نے رکشہ والے سے کہا۔ "گارڈن لے چلو۔"

حالانکہ اتنے سویرے گارڈن جانا بے وقوفی تھی، مگر کیا کرتا، ایسے دھندے پہلے کیے ہوتے تو پتہ ہوتا کہ محبوبہ کو کیسے اور کہاں لے جایا جاتا ہے، وہاں سبزے پر بیٹھ کر مینا نے مجھے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ کہ وہ چار بہنیں اور دو بھائی ہیں بھائی دونوں بڑے ہیں اور شادی شدہ ہیں اپنی بیویوں کے ساتھ الگ مکان مگر ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ والد کا چند برس قبل انتقال ہو چکا ہے۔ وہ خود ایک گارمنٹس فیکٹری میں سلائی کا کام کرتی ہے اور اس سے چھوٹی بہن ایک دواؤں کی فیکٹری میں پیکنگ گرل ہے چھوٹی بہنیں ماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔"

مجھے ایک لمحہ کو تو افسوس ہوا کہ اتنی مجبور لڑکی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا کہاں کی شرافت ہے اسے سچ سچ بتا دوں کہ میں شادی شدہ ہوں اور ایک بچے کا باپ بھی ہوں مگر مرد کا دل بہت ہی کمینہ ہوتا ہے اس میں پرانی خواہشیں بھی رہتی ہیں اور نئی محبتوں کے لیے بھی جگہ نکلتی رہتی ہے میں نے بھی جذبات کی یورش میں بہتے ہوئے اس سے ڈھیروں وعدے کر لیے۔ صرف دل لگی ہی کے لیے حتیٰ کہ شادی کا بھی وعدہ کر لیا۔

زرافشاں میری بیوی تھی اس کی قربت مجھے مدہوش کر دیتی تھی۔ مگر مینا کی قربت میں تو جادو تھا۔ میں نے اس کے طلسم میں گرفتار تھا۔

اصل میں زرافشاں نے بیوی ہوتے ہوئے اس طرح نثار ہونے اور دل کو لبھانے والی گفتگو کبھی نہ کی تھی۔ پھر وہ گھریلو لڑکی تھی۔ جبکہ مینا گھر سے باہر نکلنے والی زمانے کو سمجھنے والی لڑکی تھی۔ اسے یہ علم تھا کہ مرد کو کس طرح قابو کیا جاتا ہے پھر میں دن میں سینکڑوں لوگوں کو دیکھتا تھا اور شاید آپ کو علم نہیں ہوگا کہ ڈرائیوروں کی نظر بہت تیز ہوتی ہے۔

جس طرح انھیں یہ علم ہوتا ہے کہ کتنی جگہ سے وہ اپنی ڈرائیوری کی مشاقی دکھاتے ہوئے گزر سکتے ہیں اسی طرح انھیں شریف اور چلتر باز عورتوں کا بھی پتہ ہوتا ہے۔ اور جو لڑکیاں بسوں میں مسکراہٹوں کے تیر چلاتی ہیں وہ شریف نہیں ہو سکتیں۔

ان سے دل لگی کی جا سکتی ہے۔ میں بھی مینا سے دل لگی کر رہا تھا۔ اس نے نہایت سچائی سے یہ اعتراف کیا تھا کہ میں اسے ڈرائیور تو لگتا ہی نہیں بلکہ پڑھا لکھا شریف بندہ لگتا ہوں۔

تب میں نے دھڑے سے جھوٹ بولا۔

"بارہ جماعت پاس ہوں۔ کہیں نوکری نہیں ملی تو ڈرائیوری کر لی۔ آخر گھر والوں کا پیٹ بھی تو پالنا ہے۔"

"محنت میں کوئی شرم نہیں۔" وہ مجھ سے خاصی مرعوب ہو گئی۔

پھر یہ ہوا کہ مہینے میں ایک آدھ بار ہم کہیں باہر ضرور مل لیتے اور عموماً جب وہ شام کو فیکٹری سے واپس آتی تب ملنے کہ نہ چھٹی کرنی پڑے اور نہ مجھے ٹائم کیپر سے بہانہ کرنا پڑے اس نے اپنی ماں کو بھی میرے بارے میں بتا دیا تھا اور ایک بار میں اس کے گھر بھی ہو آیا تھا خاصی آؤ بھگت کی گئی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کھیل سے میں اوب گیا اب مجھے مینا کی مسکراہٹیں اچھی نہ لگتیں۔

اب دیکھیں نا روز ایک ہی کھانا تو اچھا نہیں لگ سکتا نا۔ مگر میں مینا کا دل بھی نہ توڑنا چاہتا تھا۔ انہیں دنوں میرا بہنوئی علی نواز دوبئی سے آیا تو میں نے چند روز کی چھٹیاں لے لیں کہ بہن اور بہنوئی آئے ہوئے تھے ہمارے گھر۔

مینا نے مجھے نہ پایا تو دوسرے روز شریف سے پوچھ لیا۔

مینا کو علم تھا کہ شریف کو ہمارے تعلق کا پتہ ہے۔ تب شریف نے شرارت سے کہا۔

"وہ تو بیمار ہے اور ایک ہفتے کے لیے چھٹی پر ہے۔"

"مجھے اس کا ایڈریس دو۔" مینا نے کہا اور شریف نے اسے میرا ایڈریس دے دیا اس کا خیال تھا کہ بھلا یہ کہاں اس کے گھر جائے گی مگر وہ تو محبت میں دیوانی تھی تیسرے روز ہی وہ اپنی ماں کے ساتھ ہمارے گھر پہنچ گئی۔ بشیر ڈرائیور پورے محلے میں، میں شیطان کی طرح مشہور تھا۔

اس وقت ہم سب لوگ شام کی چائے پی رہے تھے۔ بیل ہوئی تو میں نے چھوٹے بھائی رشید سے کہا۔

"دیکھو تو کون ہے؟"

وہ گیا اور دوسرے ہی لمحے واپس آکر بولا

"لالا تمہارے مہمان ہیں میں نے بیٹھک میں بٹھا دیا ہے۔"

"کون ہیں؟"

"دو عورتیں ہیں۔" بولا۔

"عورتیں۔؟" میں گھبرا گیا اور عورتوں کا نام سن کر تو میری ماں بہن اور بیوی کے بھی کھڑے ہو گئے میں بیٹھک میں آیا تو اماں بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئیں۔ میرے تو چودہ طبق روشن ہو گئے کہ سامنے مینا اور اس کی

ی ہوئی تھیں۔ اور پیچھے میری ماں اور
بہن کھڑی تھیں۔
" جی فرمایئے۔" میں نے خود پر قابو پا کر
پوچھا۔
" آپ کی بس میں تین چار روز ہوئے
میری کتابیں رہ گئی تھیں۔ بہت ضروری نوٹس
ہیں مہربانی فرما کر وہ دے دیں آپ کے کنڈیکٹر
نے بتایا تھا کہ آپ کے پاس ہیں۔"
بینا مجھ سے کہہ رہی تھی یعنی وہ بھی بہانہ
سوچ کر آئی تھی۔
" وہ تو میں نے ڈپو میں جمع کرا دی تھیں۔ آپ
ایسا کریں کل آ کر لے جائیں میں لے آؤں گا"
میری بیوی مطمئن ہو کر چلی گئی تھی ماں ان کے
قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی تب ہی زرافشاں ٹرے
میں چائے اور بسکٹ وغیرہ لیے آ گئی۔
ساتھ ہی خرم بھی اس کے ساتھ تھا۔
" ارے اس کا کیوں تکلف کیا۔" بینا بولی
" چائے کا وقت تھا اس لیے آ گئی ہوں
تکلف کی کیا بات ہے؟" زرافشاں نے محبت
سے کہا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس وقت زرافشاں
کو پتا چل جائے کہ یہ عورت اس کے حق پر ڈاکہ
ڈالنا چاہتی ہے تو ابھی اس کا منہ نوچ لے گی
تبھی خرم مجھ سے لپٹ گیا۔
" بہت پیارا بچہ ہے۔" بینا بولی۔
اس سے پہلے کہ ماں یا زرافشاں جواب
دیتیں میں نے جلدی سے کہا۔ " میرا بھتیجا ہے
زرافشاں نے حیرت سے مجھے دیکھا
اور میں نے شرارت سے اسے آنکھ مار دی
جانے کے بعد وہ ماں بیٹیاں چلی گئیں
تو زرافشاں نے کہا۔
" خرم کو تم نے بھتیجا کیوں بتایا؟"
ویسے ہی ذرا مذاق کرنے کو جی چاہتا ہے
ورنہ تو میرا بیٹا ہے۔" میں نے خرم کو سینے سے لگا
کر بھینچ لیا تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں اپنے
دوست احمد کے گھر جانے کا بہانہ کر کے گھر سے
نکلا۔ ٹیکسی پکڑی اور سیدھا بینا کے گھر جا پہنچا

پہلے تو میں نے اسے ڈانٹا کہ وہ وقت سے
پہلے میرے گھر کیوں آئی اور اس نے روتے
ہوئے بتایا۔
" بشیر تمہاری بیماری کا سن کر دل پر اختیار
نہیں رہا مجھے کیا پتہ کہ شریف نے جھوٹ بولا ہے
اس سے تو میں نپٹ لوں گا۔ اب تو مجھے
چھوٹی بہن کی کتابیں دے دے اور کل آ کر لے
جانا میں اماں یا بھائی کو دے دوں گا
اور کوئی بات نہ کرنا۔"
" میں دروازے سے ہی کتابیں لے کر
واپس آ جاؤں گی۔" بینا نے کہا تو مجھے اطمینان
ہوا کہ ابھی میرا جھوٹ نہیں کھلے گا اور اس روز
میں نے عہد کر لیا کہ بینا سے پیچھا چھڑا ہی لوں
تو اچھا ہے۔ ورنہ رسوائیاں میرا مقدر بن جائیں
گی لیکن ایک دم بھی پیچھے ہٹنا مناسب نہ تھا۔
اس کے لیے بھی باقاعدہ پلاننگ کرنی تھی
میں اس سے کتابیں لے آیا تھا اور
زرافشاں کو دے دی تھیں کہ میں اگر نہ بھی ملوں تو
اسے دے دینا اور دوسرے روز جب بینا
آئی تو زرافشاں نے اسے کتابیں دے دیں
میں نے شریف کو بہت ڈانٹا کہ اس
نے میرا پتہ کیوں دیا تو وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔
" استاد مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ گشتی رن اتنی
بہادر ہو گی کہ تمہارے گھر پہنچ جائے گی۔"
" آئندہ خیال کرنا۔"
پھر یہ ہوا کہ میں نے اپنی بس کا ٹائم
تبدیل کروا لیا۔ مگر بینا نے تو شاید قسم
کھائی تھی کہ میری بس کے علاوہ کسی اور بس
میں نہیں چڑھنا۔ وہ گھنٹہ بس کا انتظار کرتی
اور اسٹاپ پر کھڑی رہتی۔ اب تو لوگوں نے
بھی محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ کوئی نہ کوئی
چکر ضرور ہے اور میں پریشان تھا کہ اس بلا
سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں
مجھے بینا کا خوف نہ تھا۔ ڈر تھا تو اپنے
گھر والوں کا اماں ابا کا ڈر تھا۔
زرافشاں کے اعتماد کی دیوار میں

دراڑیں پڑنے کا خوف تھا اور ایک بار اگر اعتماد
ختم ہو جائے تو پھر کبھی نہیں آتا۔ چاہے کتنی بھی
کوشش کر لی جائے۔
میں نے افسروں سے کہہ کر اپنی ڈیوٹی
دوپہر کی شفٹ میں کرا لی۔ مگر وہ عذاب کی
طرح اب شام کو میری بس میں فیکٹری سے واپسی
پر سوار ہو جاتی۔ ویسے وہ سمجھ تو گئی تھی کہ میں
اب اس سے کھنچا کھنچا سا رہتا ہوں۔
آخر میں نے تنگ آ کر اپنا روٹ ہی تبدیل
کروا لیا اور ایسا کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا
اطمینان کا ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ وہ میری
بس میں سوار ہوئی۔
" یہ کچی بستی نہیں جائے گی۔" میں نے
کہا تو نجانے کیوں آپ ہی آپ میرے لبوں
پر مسکراہٹ بھی آ گئی۔
" مجھے معلوم ہے رحیم منزل اتر کر بس
بدل لوں گی۔" وہ نہایت اطمینان سے بولی۔
اور میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ پھر اکثر ہی
ہونے لگا۔ وہ شام کو واپسی پر صرف میری
ہی بس پر سوار ہوتی ہے۔ اگر میری بس موجود
نہ ہوتی تو انتظار کرتی۔ رحیم منزل پر وہ
اتر جاتی۔ میں بہت پریشان سا رہنے لگا آخر
میں نے شریف سے مشورہ کیا تو اس نے کہا
" استاد ایکسپریس پر ڈیوٹی لگوا لیں
کئی بار زاہد صاحب تم کو کہہ بھی چکا ہے کہ تم
ایکسپریس کے قابل ہو۔" شریف کی بات میرے
دل کو لگی اور پھر میں نے ڈیوٹی بدلوا لی۔ یہ
روٹ ایسا تھا کہ بینا اس بس میں سوار ہی
نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ یہ ہوتا کہ میری بس کھڑی
ہوتی تو میرے سے سلام دعا ضرور کرتی لیکن
اسے ذرا پروا نہیں تھی کہ لوگ دیکھ رہے ہیں
یا کوئی کیا کہے گا۔ لگتا تھا دنیا والوں سے بے فکری
اس نے پکڑ لی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ
لڑکیاں جب محبت کرتی ہیں تو عشق کی حدود
بھی پھلانگ جاتی ہیں۔ کسی سے بھی نہیں ڈرتیں
ہماری لوک کہانیاں اس کی گواہ ہیں چاہے

گرداب کی سیر ہو یا تقن کی دریائے چناب کے کنارے بسنے والی سوہنی سندھ کی تپتی ریت پر چلنے والی سسی ہو۔ پنجاب کی صاحبان سب ہی نے محبتوں میں خوب نام کمائے ہیں۔ اور اب بینا بھی انھیں کے نقش پر چل رہی تھی اور نہایت دھڑلے سے اُس نے مجھے کہہ دیا تھا کہ۔

" اب اتنا ہجر برداشت نہیں ہوتا تم میرے گھر رشتہ بھیجو ہماری تیاری مکمل ہے۔

میں نے اُس سے وعدہ کر لیا کہ میں ماں سے بات کروں گا۔ یہ بات کس کافر کو کرنی تھی دو روز کے لئے میں نے چھٹی لے لی اور میری جگہ ایکسپریس بس چاچا غفور نے سنبھال لی۔ مجھے پتہ چلا کہ اس نے بوڑھے چاچا غفور سے پوچھا

" وہ ڈرائیور کہاں ہے ؟"

" کیوں ؟"

" کل بس میں میرا ایک شاپر رہ گیا تھا اس میں کچھ کپڑے تھے "۔ نہایت اطمینان سے بینا نے کہا تو چاچا غفور نے کہا۔

" دو روز بعد وہ آئے گا تو پوچھ لینا چھٹی پر ہے۔ شاید اس نے ڈپو میں جمع کر دیئے ہوں" بینا مطمئن ہو گئی۔ تیسرے روز مجھے ملی تو میں نے اُسے صاف صاف کہہ دیا۔

" بینا میری ماں نہیں راضی ہوتی وہ اپنی بھانجی سے میری شادی کرنا چاہتی ہے اور اُسے زبان دے چکی ہے"

" تم نے بھی تو مجھے زبان دی تھی"

" لیکن جو بھی کرنا ہے میری ماں کو کرنا ہے اور میں اُس کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ ہمارا جو بھی وقت گزرا اچھا گزرا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دے" اور سچ مچ میں نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے مگر پھر بھی نہ بتایا کہ میں شادی شدہ ہوں اور دو بچوں کا باپ ہوں، کہ گزشتہ ماہ ہی میرے ہاں کو مل سی بیٹی زرینہ نے جنم لیا تھا۔"

" دیکھو بشیرا ہمارے محلے میں سب کو پتہ ہے کہ تم مجھ سے شادی کرو گے۔ میری ماں نے بھی سب کو بتا رکھا ہے یہ کتنی شرم کی بات ہے۔ تم والدین سے چھپ کر شادی کر لو مجھ سے"

" یہ ناممکن ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ بس آئندہ تم مجھ سے نہ ملا کرو۔" میں نے سختی سے کہا۔"

میرا خیال تھا کہ اس رویئے کے بعد وہ خاموشی سے راستہ بدل لے گی۔ مگر یہ تو میری خام خیالی تھی آخر تو نے دو سال تک میں نے اُس سے محبت کا کھیل کھیلا تھا۔ بھلا وہ مجھ کو یونہی چھوڑ دیتی۔

جبکہ میرا خدا گواہ ہے کہ بارہا قربت کے لمحوں میں بھی میں نہ بھٹکا۔ اپنے نفس کو قابو میں رکھا تھا۔ اُس کے گھر جاتا تو اُس کی ماں کام میں مصروف رہتی۔ میں اور وہ ایک کمرے میں اکیلے بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ وہ میرے قریب ہوتی لیکن اُسے سینے سے لگانے کا جرم بھی نہ کر سکا تھا کہ میرے اندر شرافت کی کوئی رمق باقی تھی۔ انسان کا قدم ایک بار بھی پھسل جائے تو پھر پھسلتا ہی چلا جاتا ہے۔ میرے نفس کے کنٹرول کو بینا نے شرافت کا نام دیا تھا اور وہ ہر صورت میری پناہوں میں آنا چاہتی تھی۔

میں پھر واپس اپنے پرانے روٹ پر آگیا تھا جہاں وہ مجھے ملی تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ اب میرے راستے میں وہ نہ آئے گی مگر ایسا کب ممکن تھا۔

اس روز بھی وہ میری بس میں سوار ہوئی تھی میں نے غور سے دیکھا اس کا گلاب سا چہرہ مرجھا گیا تھا اور آنکھوں میں چمک کی جگہ نمی نے لے لی تھی۔

" بشیرا کینٹ چمنستان میں ملو دوپہر کو تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ میرا جواب سنے بغیر بس سے اُتر گئی جیسے اُسے یقین ہو کہ میں اُس کی بات مانوں گا۔ اور ہوا بھی یہی۔ میں ڈیوٹی آف کر کے دوپہر کو کینٹ چمنستان چلا گیا۔ یہاں ہم اکثر ملا کرتے تھے علیحدہ علیحدہ پورشن بنے ہوئے تھے۔ بینا مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھی اصیحہ

بہت زور کی بھوک لگی ہوئی تھی میں نے کھانے کا آرڈر دے دیا اور بینا کے بجھے بجھے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

" کیا بات ہے کیوں یاد کیا تھا ؟"

" کیا یاد کرنے کا حق بھی تم مجھ سے چھیننا چاہتے ہو۔"

بینا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ بیرے کے آجانے کی وجہ سے میں نے کوئی جواب نہ دیا بیرے نے نہایت پھرتی سے میز پر کھانا چن دیا بینا نے مجھے دیکھا۔

" بھوکی کھاؤ نا۔"

" مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ بولی

میں نے پروا نہ کی اور کھانا کھانے لگا۔ اسی لمحہ میرا نوالہ پلیٹ میں گر گیا۔

کوئی گرج کر بولا۔

" بھاگنے کی کوشش نہ کرنا تم دونوں رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو" میں نے اٹھا کر دیکھا تو سامنے ہی پولیس وردی میں ملبوس غالباً وہ تھانے دار ہی تھا۔ اس کے پیچھے تین چار پولیس والے تھے "چلو تھانے"

" مگر قصور کیا ہے جناب" میں نے آہستہ سے کہا" جوان چھوکریوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہو اور ہم سے قصور پوچھتے ہو" تھانے دار گرجا۔ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔

" صاحب معاملہ یہیں ختم کریں کچھ لے لیں"

" اوئے ہمیں تو رشوت دیتا ہے تیرے اوپر تو میں مقدمہ بناؤں گا سمجھا تو یاد کیا کرے گا چل آگے لگ" اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور دھکا دے کر کیبن سے باہر نکالا۔

" چل کاکی تو بھی" اُس نے بینا سے کہا۔

" میں نہیں" بینا کانپ کر بولی۔

" یار کے ساتھ یہاں آگئی ہے اب چل تھانے بال پتہ چلے گا اس عشق بازی کا" تھانے دار نے نہایت غلیظ نظروں سے بینا کو دیکھا اور پھر ہم دونوں پولیس والوں کے نرغے میں سر جھکائے چل

دیئے۔

کیبنے میں موجود سب لوگوں کی نظریں ہم پر تھیں ہم دونوں کے بیان ہوئے۔

بینا نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مجھے چاہتی ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

جبکہ میں نے کہہ دیا کہ میرے گھر والے نہیں مانتے۔ "گھر والوں نے کہا یہاں مال۔" تھانے والے نے بہت گندی گالی دی۔ اور میرا خون کھول اٹھا۔ شادی تجھے کرنی ہے یا گھر والوں کو؟

"میں اللہ کی منشا کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا" میں نے کہا۔

"یاری اُن کی منشا سے لگائی تھی" تھانے دار بولا۔

"قصور اس کا ہے نہ یہ آگے بڑھتی نہ میں بڑھتا" میں نے سارا الزام بینا کے سر تھوپ دیا ذراسی کا قصور تھا اور میں لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ گیا تھا کہ یہ بینا اور اُس کے گھر والوں کی چال ہے مجھے پھانسا گیا ہے اور یقیناً پولیس کو بھی بھاری رقم دی گئی ہے۔ تھانے دار مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں بینا سے ابھی اور اسی وقت نکاح کر لوں۔

مگر میں نے کہہ دیا کہ میرے ٹکڑے بھی کر دو تو میں اس لڑکی سے نکاح نہیں کروں گا جس نے دھوکے سے مجھے کیبنے میں بلایا اور پھر چھاپہ بھی لگوایا۔ کراچی تک تو کبھی ہوٹلوں میں چھاپے پڑے وہاں کیا کچھ نہیں ہوتا یہ میں جانتا ہوں اسی وقت انسپکٹر معین بخاری آگیا۔ پہلے ٹریفک پولیس میں سارجنٹ تھا اور انسپکٹر ہو گیا تھا نائیلہ ارسلان نے زوردار سیلیوٹ مارا۔ تبھی اُس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ پہچان کر بولا۔

"ارے بشیر تو یہاں کیسے؟ کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"نہیں صاحب چھ سال سے بس چلا رہا ہوں اللہ کا شکر ہے کہ کبھی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا مگر دل جیسا جرم کر کے تھانے کی شکل دیکھنی پڑ گئی" میں نے کہا۔

"کیا بات ہے؟" معین بخاری نے پوچھا۔

"اُن سے پوچھیں۔" میں نے تھانے دار کی طرف اشارہ کیا۔

"کچھ نہیں سر معمولی بات ہے نپٹا لیں گے" تھانیدار بولا۔ تب معین بخاری رعب سے بولے

"چوہدری ریاض بتاؤ کیا ہوا؟" تب تھانے دار نے اپنی کارکردگی بتائی کہ اُس نے کس طرح ہمیں چھاپہ مار کر پکڑا۔

"یہ کوئی ایسی بات تو نہیں چوہدری ریاض کیا۔ تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ اس کیبن میں اس کے علاوہ کوئی ایسا جوڑا نہ تھا۔"

"جی سر" چوہدری ریاض نے کہا۔

"یہ دعویٰ غلط ہے تمہارا بس آنکھیں کھلی رکھا کرو۔ یہ بتاؤ کہ اِن کی مخبری کس نے کی تھی" وہ ایک دم اصل مقصد پر آگیا۔

"وہ جی۔" تھانے دار گڑبڑا گیا۔

"کس نے تمہیں یہ نا ٹک کرنے پر مجبور کیا۔ کتنے پیسے لئے ہیں تم نے بولو" معین بخاری سوال پر سوال کر رہے تھے اور چوہدری ریاض واضح طور پر کانپ رہا تھا۔

"جواب دو ورنہ پیٹی اُتروا دوں گا اس جرم میں، کہ شریف شہریوں کو پریشان کرتے ہو۔" معین بخاری نے غصے سے کہا۔ پھر اس کا رُخ بینا کی طرف ہو گیا۔

"بتاؤ لڑکی کیا ہوا تھا؟ سچ سچ بولو ورنہ تمہارے پورے خاندان کو جیل میں سڑوا دوں گا۔"

"سر میں نے بشیر سے محبت کی ہے۔ میں ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں حالانکہ میرے بھائی نہیں مانتے۔

انھوں نے مجھے مارا پیٹا بھی مگر میری بھی ضد ہے کہ میری اس سے شادی ہو، حالانکہ مجھے پتہ ہے یہ شادی شدہ ہے جبکہ اُس نے کہا تھا کہ یہ شادی شدہ نہیں۔ اب معلومات کی ہیں" بینا نے یہ کہا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا

"مگر اس کے باوجود میں اسے اپنانا چاہتی ہوں یہ میرے دل کا خواب ہے اور جناب میری ماں اور بھائی میری ضد سے تنگ آ گئے تو انھوں نے چوہدری ریاض صاحب کو پانچ ہزار دے کر یہ منصوبہ بنایا اس میں، میں بھی شریک ہوں۔ ہمارا خیال تھا کہ بشیر اپنی عزت کے ڈر سے فوراً شادی پر راضی ہو جائے گا۔ ہمارے گھر میں نکاح خواں وغیرہ کا انتظام کر لیا گیا ہے سب تیاری مکمل ہے بس اسے راضی کر دیں" بینا نے معین بخاری کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے

"دیکھو لڑکی۔ شادیاں وہ کامیاب ہوتی ہیں۔ جو دونوں فریقوں کی باہمی رضا مندی سے ہوں۔ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ نکاح کے بعد یہ تمہیں چھوڑ کر نہیں چلا جائے گا یہ تو اُس کی شرافت ہے کہ وہ نکاح سے انکار کر رہا ہے ورنہ اپنی جان چھڑانے کو وہ دو بول کہنے میں کیوں تامل کرتا اچھی لڑکیوں کی طرح گھر جاؤ اور اپنے دل کی بات ماننے سے بہتر ہے کہ والدین کی بات مانو۔ کسی کا گھر اُجاڑنے کی بجائے کسی شخص کا گھر بساؤ، معین بخاری بینا کو سمجھا رہے تھے اور وہ بس رو رہی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ معین بخاری میرے لئے فرشتہ بن کر آئے تھے اور میری گلو خلاصی ہو گئی تھی بس انھوں نے مجھے اتنا کہا تھا۔

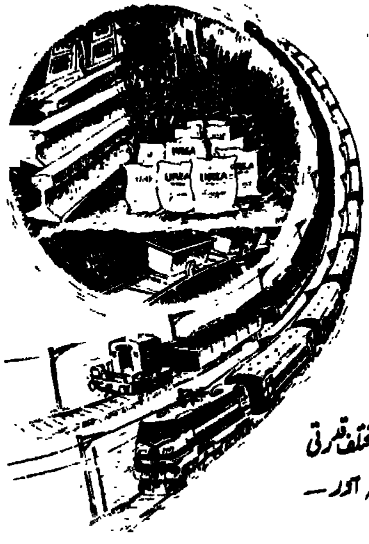
"بشیر آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔"

"توبہ کریں جی میری توبہ بلکہ باپ کی توبہ" میں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے تو وہ ہنس دیئے اور اب کی صورت حال یہ ہے کہ بینا میری بس میں بھی سوار نہیں ہوتی۔

میں بھی اُسے دیکھتا ہوں تو گاڑی کو ریس دے دیتا ہوں خدا کا یہ احسان ہے کہ اس ڈرامہ کی خبر میرے گھر والوں تک نہیں پہنچی جیسے راہ چلتے یہ ڈرامہ شروع ہوا تھا ویسے ہی ختم بھی ہو گیا۔ اب میں زلفشاں کی زلفوں کا اسیر ہوں جو میری بیوی اور بچوں کی ماں ہے۔ تھانہ سے نکلتے ہوئے میں نے ایک فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ کسی لڑکی کی طرف نہیں دیکھوں گا۔

ناردرن ریلوے

آپ کی روزمرہ زندگی سے وابستہ ہے





ذرا سوچیئے۔

■ ناردرن ریلوے ان گنت طریقوں سے آپ کی زندگی کو آرام دہ بناتی ہے۔ سماجی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو ریلوے سے ہم رشتہ نہ ہو۔

ایک حیات بخش وسیلہ جو کروڑوں کو غذا، ایندھن اور انرجی فراہم کرتا ہے۔ ریلوے مختلف علاقوں کو باہم جوڑنے والی مضبوط کڑی ہے۔

● ناردرن ریلوے آپ کے فرصت کے لمحات کو زیادہ پرلطف بناتی ہے۔ یہ آپ کو مختلف قدرتی مناظر، راجستھان کے تپتے ہوئے ریگستانوں سے ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں، پنجاب، ہریانہ اور اترپردیش کے سرسبز و شاداب میدانوں میں لے جاتی ہے۔

● تقریباً ۱۲۵ سالوں سے ریلوے ہر طرح قومی ترقیاتی پروگراموں، نقل و حمل، زرعی ترقی، بجلی کی پیداوار، صنعتی ترقی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔

● ناردرن ریلوے روزانہ ۹۰۰ میل، ایکسپریس اور پسنجر ٹرینوں میں ۱۱ لاکھ مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچاتی ہے اور روزانہ چھ سو مال گاڑیوں میں ۲ لاکھ ٹن مال ڈھویا جاتا ہے۔

ناردرن ریلوے کی روزانہ کارگزاریوں میں شامل ہیں ——— ■ ۴۷ر۰۰۰ ٹن اناج کی شمال کے زرعی علاقوں سے مختلف حصّوں کو ترسیل۔
● ۶۲ر۰۰۰ ٹن کوئلہ صنعتی کاموں کیلئے پہنچانا۔ ● ۱۵ر۰۰۰ ٹن پیٹرولیم کی پیداوار کی آمد و رفت۔ ● ۱۷ر۰۰۰ ٹن کھاد ڈھونا۔
یہ سب ملک میں خود اعتمادی اور خودداری کی فضا تیار کرنے میں معاون ہیں۔
خاموشی سے، مگر یقینی طور پر ناردرن ریلوے کروڑوں باشندوں کے بہترین مستقبل کے لئے سرگرم ہے۔
ریل پٹریوں کا مضبوط جال، زندگی کو قائم رکھنے والی رگوں اور نسوں کی طرح کام کر رہا ہے۔

ناردرن ریلوے

گزشتہ سے پیوستہ



خدیجہ مستور

پیوند

(سلائی چھوڑ کر فاطمہ کھانا لے آئی اور پھر خود چیز اُٹھا کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ گلی میں ابھی سے کتنا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ جانے کہاں کہاں کے کتے جمع ہو کر بھونک رہے تھے۔ چاند کی تیرھویں تاریخ تھی۔ نیلے شفاف آسمان پر بادلوں کے دو چار چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اٹکے ہوئے تھے۔ فاطمہ آنکھوں میں بھرے ہوئے پانی کو پونچھ کر کسی کسی وقت آسمان کی طرف دیکھ لیتی۔ آندھی، پانی سے کیسا خوف آتا۔ اتنے بہت سے پلنگ اٹھا کر اندر کمرے میں لے جانا پڑتے۔ قاسم تو سب سے پہلے اٹھ کر کمرے میں بھاگ جاتا۔ ایک ہی بار فاطمہ نے لڑ کر اس سے پلنگ اٹھوائے تھے تو کمرے میں ایسی تکلیف ہوئی کہ تین دن بھر بھر پڑا کراہتا رہا۔ اس کے یار دوستوں کا تانتا بندھ گیا۔ چائے پانی سے ان کی مدارات کرنی پڑی اور کمر کی مالش کر کر کے ہاتھ الگ ٹوٹ گئے۔

کون سی فلم دیکھی؟" فاطمہ نے پیتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔ قاسم نے کھانے کی کشتی پلنگ کے نیچے سرکا دی۔

"ارے بڑی اچھی فلم تھی اور فلم سے پہلے تو ایک مزے کی بات دیکھی، وہ ہیں امریکہ ملک کے لوگ وہ چاند پر چڑھ رہے تھے پہلے انھوں نے ایک راکٹ بھیجا ہے۔ یوں شوں کر کے چاند کی طرف بڑھا ہے کہ مزہ آگیا۔" قاسم نے بہت خوش ہو کر بتایا۔ اگر کبھی فاطمہ آہستہ سے بولتی تو کھِل اُٹھتا۔ اس کا پیلا چہرہ تمتما جاتا۔

"کیا ملے گا لوگوں کو یہ گناہ کر کے چاند پر کون سی دولت رکھی ہوگی؟"

"ارے دولت ہوگی جبھی تو نا، مجھے موقع ملے تو خود چلا جاؤں۔"

وہ ہنسا۔

"ہوں!" اس نے چیز سمیٹ کر رکھ دیا۔ اب تو آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ "تم سے نوکری تو ہوتی نہیں چاند پر کیسے جاؤ گے، پاؤں میں موچ آ جائے گی۔" فاطمہ نے لالٹین بجھا دی اور چیز کمرے میں رکھ آئی۔ "کیا مل گیا تمھیں پیسے اٹھا کر اب میں کل کے لیے جھک ماروں گی۔ تمھارے تنور تو بھرنا ہی ہیں۔" وہ بچوں کے پلنگ کی طرف بڑھی۔ قاسم یا تو بیٹھا تھا یا جلدی سے لیٹ گیا اور چادر میں منہ چھپا لیا۔ "کب تک میری آنکھوں کی کمائی کھاؤ گے۔ اللہ کرے پھوٹ جائیں یہ آنکھیں۔" اس نے بڑے لڑکے کو گود میں اٹھا کر قاسم کے پہلو میں لٹا دیا۔ تینوں لڑکے ایک ہی پلنگ پر کشتی لڑتے لڑتے سو گئے تھے۔ فاطمہ اپنی لڑکی کے پاس لیٹ گئی۔

"سرہانے دودھ کا گلاس رکھا ہے وہ بھی پی لو خوب پیٹ بھر جائے تو مزے کی نیند آتی ہے۔" فاطمہ کے لہجے کا طنز رات کے کلیجے کو کاٹے دے رہا تھا۔

"اب پیٹ میں جگہ نہیں۔" قاسم ممنایا۔

"جگہ نہیں! یہ نخرے کسی اور کو دکھانا میں تمھاری اماں نہیں ہوں۔" اس نے جل کر کروٹ بدلی اور دوپٹے سے منہ چھپا لیا۔ ہوا آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی، بادلوں کے ٹکڑے کہیں اور چلے گئے تھے، تھکن اور آنکھوں کی جلن کے مارے نیند کوسوں دور تھی، ہاں قاسم کے خراٹوں کی آواز آ

تھی۔ فاطمہ نے منہ کھول کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر اس کے سرہانے جا کھڑی ہوئی۔ چادر میں سکڑا ہوا قاسم کتنا دبلا اور چھوٹا سا نظر آرہا تھا۔ ویسے بھی چالیس سال کی عمر میں ہی اس کے چہرے پہ جھرّیاں پڑنے لگی تھیں۔

فاطمہ دیر تک کھڑی سوچتی رہی پھر شانہ ہلا کر اسے اٹھا دیا۔

"یہ دودھ پی لو!" اس کی آواز آنسوؤں کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔ قاسم نے گلاس کے ساتھ فاطمہ کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ اس نے اتنی بے دردی سے اپنا ہاتھ کھینچا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ قاسم دودھ کے لمبے لمبے گھونٹ پی کر چپکے سے لیٹ گیا۔ فاطمہ کی رنگینی اس کی ساری جان میں رینگ رہی تھی۔ اس نے بے بسی سے ٹھنڈا سانس بھرا اور چادر کے اندر سکڑ کر رہ گیا۔ گلی میں آوارہ کتے منہ اٹھائے روتے چلے جا رہے تھے۔ فاطمہ اپنے پلنگ پر لیٹ کر پھوٹ پڑی۔

"ملا تمہاری گور میں کیڑے پڑیں، تمہاری جائیدادیں کے آگے آئے،" اس نے بلک کر کوسا۔ ایک ذرا سے رونے نے آنکھوں کی جلن کو کتنا تیز کر دیا تھا۔

ڈرائیور کی بیوی نے قمیص میں ہزاروں عیب نکال دیئے "بھلا کوئی اس طرح سیتا ہے، یہ لمبے لمبے ٹانکے ہیں غریب جان کر ایسا کام کیا ہے۔ کیا ہم درزی سے نہیں سلا سکتے تھے!"

فاطمہ ٹکر ٹکر منہ تکتی رہی۔ اس نے تو بڑے دھیان سے سیا تھا، مگر اب آنکھیں ہی ساتھ نہ دیں تو کوئی کیا کرے؟

"میں تو اسے نہ لوں گی نہ سلائی کا ایک پیسا دوں گی، اسے ٹھیک کر کے لاؤ۔"

فاطمہ کپڑے لے کر واپس آئی اور سارا دن ادھیڑ ادھیڑ کر سیتی رہی آنکھوں کے سامنے بار بار دھند چھا جاتی۔ پانی اتنا بہا کر دوپٹے کا پلو تر ہو گیا۔ جب ڈرائیور کی بیوی کی مرضی کا تو نہ سِلا، مگر سلائی کی اجرت مل گئی۔ اس کے بعد تو فاطمہ سے سب کو شکایت رہنے لگی روز روز کپڑے واپس ہونے لگے۔

"ہم تو تمہارا خیال کرتے ہیں کہ شریف عورت ہو، وقت پڑنے پہ کام کر رہی ہو اور تم اس طرح کپڑوں کا ستیاناس مار دو یہ بھی کوئی بات ہے؟"

فاطمہ جدھر جاتی جھاڑ پڑتی۔ عورتیں اسے اور کپڑے دیتے ہوئے گھبرا تیں۔

اس دن فاطمہ صبح صبح برقع اوڑھ کر اسپتال چلی گئی۔ اب تک تو صرف اس لیے ٹالتی رہی تھی کہ اسپتال دور ہے اور کرائے کے لیے پیسے نہیں بچتے۔ پیدل گئی تو اتنی تھک جائے گی کہ پھر کام کس طرح ہوگا، مگر اب روز روز کی جھاڑ نے اسپتال جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ آنکھیں ہی تو اس کی روزی کا ذریعہ تھیں۔ اسپتال تک کا راستہ پورے ایک گھنٹے میں طے ہوا، اس پر پندرہ بیس آدمیوں کے بعد اس کی باری آئی۔ ڈاکٹر نے جو مرض بتایا وہ نظر کا کام کرنا چھوڑ دے، لکھی ہوئی دوا دن میں تین بار آنکھوں میں ڈالے پھر کچھ دن بعد اسپتال میں داخل ہو کر آپریشن کرالے۔

فاطمہ جب اسپتال سے واپس آرہی تھی تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنی آنکھیں ڈاکٹر پاس رہن رکھ آئی ہے۔ مارے غم کے اس کا جی گھٹا جاتا تھا۔ نقاب کے اندر بار بار آنکھوں کو رگڑتی مگر دھند نہ ہٹتی۔ چار چھ دن سے تو آنکھوں کی بُری حالت ہو رہی تھی۔ مارے دکھ کے وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے رونے لگی، مگر کم بخت دھند پھر بھی صاف نہ ہوئی۔ یہ بھی کوئی گرد کے طوفان کی دھند تھی جو بارش سے بیٹھ جائے اور آسمان نکھر کر رہ جائے۔ یہ تو وہ دھند تھی جو آنسوؤں سے اور بڑھتی تھی۔

سارے راستے رونے کے بعد گھر آکر اسے ذرا سا سکون ہوا۔ کچھ عجیب سی اُمید، شاید اب اس کی زندگی آرام سے کٹ جائے۔ اب تو اس کا شوہر یقیناً کوئی کام کرے گا۔ اب تو وہ آنکھیں ہی نہ رہیں جن پر سب عیش کرتے تھے۔ آج بڑی مدت کے بعد وہ قاسم کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ گلی میں ذرا سی چاپ ہوتی تو چونک اٹھتی اور جب قاسم آیا تو وہ اس کی طرف لپکی۔

"آ گئے؟"

"ہاں ابھی دیر تو نہیں ہوئی۔" قاسم لجاجت سے بولا اور اپنے بستر کی طرف بڑھا۔

"آج میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔"

"کیوں؟"

"میری آنکھیں جو خراب ہو رہی تھیں، تمہیں کیا پتا!" وہ قاسم کے پلنگ پر ٹک گئی۔

"نہیں نہیں، مجھے تو معلوم تھا۔" وہ ہکلا گیا۔

"ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ نظر کا کام کرنا چھوڑ دو، ورنہ اندھی ہو جاؤ گی۔ دوا بتائی ہے اور یہ کہا ہے کہ اسپتال میں داخل ہو جانا، آپریشن ہوگا۔"

"ارے!" وہ سخت فکر مند ہو گیا۔

"پھر اب کیا ہوگا؟" اس نے بڑی اُمید سے قاسم کی طرف دیکھا۔

"بھئی یہ ڈاکٹر بکتے بھی بہت ہیں۔ میں تم کو سُرمہ لا دوں گا۔ حکیم صاحب کا بیٹا میرا دوست ہے۔ اس سُرمے سے تو بڑے بڑے جالے بھی کٹ جاتے ہیں۔"

فاطمہ نے اسے تکتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ دل پر کیسی چوٹ لگی تھی۔ وہ اس وقت مارے دُکھ کے کچھ کہہ بھی نہ سکی اور چُپ چاپ باورچی خانے میں چلی گئی۔ آخری امید بھی دم توڑ گئی تھی۔ وہ اسے سُرمہ لا دے گا، مگر کام نہیں کرے گا۔

کھانا اس کے سامنے رکھ کر فاطمہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ قاسم سر جھکائے کھانا کھاتا رہا اور فاطمہ دوپٹے کے پلو سے منہ چھپائے آنسو بہاتی رہی۔

دوسرے دن قاسم سچ مچ سُرمے کی ایک پڑیا لے آیا۔

"حکیم صاحب کہتے ہیں کہ یہ سُرمہ آنکھوں کے ہر مرض میں فائدہ دیتا ہے۔ انشاء اللہ تمہاری آنکھیں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"ہوں!" فاطمہ نے پڑیا اس کے ہاتھ سے لے کر نالی میں پھینک دی۔ قاسم سر جھکائے کمرے میں چلا گیا۔

"ہاں میری آنکھوں کے علاج کی سخت فکر ہے۔ اس لیے تاکہ محنت کی کھاتے رہو۔ تم کو محنت نہ کرنی پڑے۔ تم سا بے شرم اس دنیا میں کون ہوگا؟ اللہ کرے کہ میری آنکھیں پھوٹ جائیں!"

فاطمہ صحن میں کھڑے کھڑے سنتی رہی۔ قاسم کمرے میں دم بخود بیٹھا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دو چار دن سلائی کا کام نہیں کیا۔ راشن کے پیچھے آنے سے کام چلاتی رہی۔ اس کے آگے کیا کر سکتی تھی۔ آخر کو سلائی کا کام ہی روزی۔ دو چار کپڑے تو مل گئے مگر اس سے کہ پھر سب نے بہانے شروع کر دیے۔

"اے فاطمہ اس مہنگائی کے زمانے میں کون روز روز کپڑے خریدتا ہے۔" بھلا اپنے کپڑوں کی کون گت بنواتا۔ اب تو ٹانکے تک سیدھے سے نہیں تھے۔ فاطمہ ہر گھر سے مایوس لوٹتی۔ کم بخت فقیر یا جو ہیں۔ کیسا اچھا ہوتا کہ وہ کہیں امیروں کے محلے میں رہتی ہوتی!" فاطمہ کو اپنی سلائی کی بجائے ان پر غصہ آتا۔

اب کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے! گھروں گھروں سیر سیر آٹا مانگتی پھرتی کچھ دن تک تو قرض ملتا رہا، مگر جب واپس ملنے کی امید نہ ہو تو روپے کا ایک سیر آٹا کون قرض دیتا ہے! یہ کوئی سستے کا زمانہ تو تھا نہیں کہ دروازے پر آیا ہوا فقیر بھی پاؤ ڈیڑھ پاؤ آٹا لے جاتا۔ دن بڑے کٹھور ہو گئے بچے جان کو پیٹتے، فاطمہ تڑپ تڑپ کر اپنی بوا کی قبر میں کیڑے ڈالتی رہتی۔ قاسم نے دس پندرہ دن سے دوپہر کو گھر میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ رات کو جب گھر آتا تو بھوک سے ہونٹ خشک پڑے ہوتے۔ چہرے پر جیسے کسی نے مٹی مل دی ہو۔ فاطمہ اسے کھلا پلا کر پھر الٹی ہو منٹ میں آتا کہتی۔ اب تو ایسی اونچی آواز میں لڑتی کہ سارا محلہ سنتا۔ قاسم جلدی سے سوتا بن کر خراٹے لینے لگتا۔ ان دنوں وہ کیسا کمزور لگنے لگا تھا۔

انسان تو پرائے بچوں کی بھوک بھی نہیں دیکھ سکتا پھر اپنے بچوں کو بلبلاتا ہوا کیسے دیکھے۔ یہ حضرت انسان بندروں سے لاکھ تحاور اتی رشتے جوڑیں، مگر وہ خصوصیات پیدا کرنے سے رہے۔ بندریا کا جسم چلے تو اپنے بچوں کو اٹھا کر بھی دوڑ سکتی ہے۔ پر فاطمہ سے ایک دن بھی یہ نہ ہوا کہ اپنے بچوں کو بھوکا مرتے دیکھ سکتی۔ شرم و حیا اور خاندان کی عزت کی پرواہ کیے بغیر ہوتے ہوئے وہ دو چار کھاتے پیتے گھروں میں اوپر کا کام کرنے لگی۔ اس پورے محلے میں بس ایسے چند ہی گھر تھے جو تھوڑی سی اجرت دے کر کام کرا سکتے تھے۔

تین چار گھروں میں جھاڑو برتن اور کپڑے دھونے کے بدلے دس بارہ آنے ملتے۔ ساتھ ہی ایک وقت کی خوراک مل جاتی۔ دوپہر تک کام ختم کر کے وہ اپنا کھانا لیے گھر واپس چلی جاتی۔ اپنے حصے کا کھانا قاسم کے لیے ڈھانک کر رکھ دیتی۔ جب سے فاطمہ نے کام شروع کیا تھا قاسم دوپہر میں چند منٹوں کے لیے آنے لگا تھا۔ کھانا کھا کر وہ جلدی سے واپس چلا جاتا۔

دس بارہ آنے میں چھ جانوں کے پیٹ کہاں بھرتے، بچے ہر وقت بھوک بھوک کرتے رہتے۔ ادھر فاطمہ کا یہ حال کہ ایک آدھ پھلکا کھا لیتی، بچوں کے خیال سے دوسرا پھلکا نہ اٹھاتی۔ خالی معدہ سارا دن اس کی جان جھنجھوڑا کرتا۔ سفید رنگ پر ہلدی مل گئی تھی۔ قاسم جب گھر آتا تو فاطمہ کی زبان بڑی دھاردار ہو جاتی۔

ادھر کچھ دنوں سے فاطمہ نے قاسم سے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا تھا۔ بچوں کو پیٹ بھر کھانا مل جاتا۔ فاطمہ کے چہرے پر بھی رونق آگئی تھی۔ بچوں کے لیے ایک ایک جوڑا بھی بن گیا تھا، مگر اب جانے کیوں ہر وقت چپ رہتی۔ فاطمہ جو ہر وقت بکتی رہتی تھی، اب بالکل خاموش رہتی۔ قاسم بڑے آرام سے کھاتا پیتا۔ ایک ذرا اپنے بچوں سے باتیں کرتا، مگر فاطمہ اسے طعنے نہ دیتی بلکہ اب اس کے کھانے پینے کا زیادہ ہی خیال کرنے لگی تھی۔ ان دنوں آدھے پیٹ کھانے نے اسے کتنا کمزور کر دیا تھا!

کئی دن تک اسے بخار بھی آتا رہا۔ اس کی کھوئی ہوئی طاقت واپس لانے کے لیے چائے کے ساتھ پراٹھا بھی پکنے لگا تھا۔ ان ملاقاتوں کے باوجود فاطمہ نے اس سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ جب وہ گھر آتا اور اپنے بچوں کو سینے سے لگا کر ہنستا بولتا تو فاطمہ دور بیٹھی اسے دیکھا کرتی۔ قاسم لپک لپک کر اس سے باتیں کرتا، مگر وہ دوسری طرف منہ پھیر لیتی۔ اس کے چہرے پر ایسی نفرت ابھرتی کہ قاسم بجھ کر رہ جاتا۔

یہ مزے مزے زندگی گزارنے پر کوئی کس طرح سوچتا کہ صرف جھاڑو برتن کی برکت ہے! یا تو فاطمہ تھکے تھکے بگلیوں کی طرح پھرتی یا اب ہر وقت صاف ستھری نظر آتی۔ آنکھوں میں سرمے کی باڑھ دکھائی دیتی۔ ظاہر ہے کہ یوں چولا بدلنے پر کس کو صبر آتا! عورتیں دوسروں پر دھر دھم کر اپنے دل کی بات کہنے لگیں۔ فاطمہ سنتی تو کلیجہ پھاڑ کر روتی۔

"دیکھ لو آپا ہاتھ گھس گئے برتن مانجھ مانجھ کر، پیاز کی جھار سے آنکھیں پلم ہو گئیں۔" وہ دونوں ہاتھ پھیلا دیتی۔ برتن مانجھ مانجھ ہتھیلیوں پر کالی کالی لکیریں اس کی کم نصیبی کا پتا دیتی تھیں۔

"لوگ خواہ مخواہ کہتے ہیں، بے چاری بدنصیب کو میاں ایسا نہ ہوتا تو آج کیوں کسی کی بات سنتی!" اطلاع دینے والوں کو فوراً رحم آجاتا۔

"کہنے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے، کوئی مائی کا لال پکڑ کر دکھائے۔" وہ نظریں جھکا کر ٹھنڈا سانس بھرتی۔

اور اسی دن فاطمہ کو موقع پر پکڑ کر دکھا دیا گیا۔ وہ ٹھیکیدارنی کے ہاں اوپر کے کام پر لگی ہوئی تھی۔ دس روپے مہینا اور ایک وقت کا کھانا۔ ٹھیکیدارنی اس سے بہت خوش تھی۔ ذرا ذرا سے پونڈے بھی کام کے لیے رکھو تو بیس پچیس روپے کی بات کرتے۔ فاطمہ نے تو کبھی منہ سے اف بھی نہ کی۔ جس نے جو کچھ دے دیا، چپکے سے رکھ لیا۔ انہی دنوں ٹھیکیدارنی کا بھائی ادھر ملنے آگیا۔ بھائی کو ہر وقت پیاس لگنے لگی۔ باورچی خانے میں رکھے ہوئے کورے گھڑوں کا پانی پی پی کر پیٹ نہ بھرتا۔ اللہ جانے کہاں کی آگ لگی تھی سینے میں جو بجھنے میں نہ آتی۔ ٹھیکیدارنی کا ماتھا ٹھنکا۔ ایک بار دبے قدموں پیچھے گئیں

دماغ میں زور سے اختلاج ہونے لگا۔ اس
بلڈ پریشر کے مرض نے کہیں کا نہ رکھا تھا اور
جب انھوں نے یہ دیکھا تو سانس رکنے لگی کہ چار
ن کی اماں ان کے معصوم کنوارے بھائی کو خراب
کر رہی تھی۔ حد ہے کہ وہ اس کا دوپٹا کھینچ رہا تھا
اور وہ نخرے کر رہی تھی۔ بھائی تو خیر فوراً معصوم
بن کر باہر چلا گیا مگر فاطمہ جیسے جیتے جی مر گئی۔
"اری بے شرم پانچ ہاتھ کا میاں رکھ
کر یہ حال ہے۔ کنوارے لونڈے کو پھانس بیٹھی
سکتی ہے" انھوں نے فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا
اور جارحانہ جوش کے اسے اپنے کمرے تک کھینچ
لے آئیں۔ ان کی اماں کو معلوم ہوا تو وہ بھی تڑپ
اٹھیں۔
"اسی لیے تو میں لڑکے کے ساتھ شہر آتی
نہیں خدا بچائے یہاں کی عورتوں سے" اماں
نے دانتوں تلے انگلی دبا لی۔
ٹھیکیدارنی اور ان کی اماں کی اونچی
آوازیں سن کر نچلی منزل میں رہنے والی پڑوسن
بھی آگئی۔ اب ان تینوں کے بیچ میں کھڑی ہوئی
فاطمہ ایسی لگ رہی تھی جیسے ابھی ابھی بیوہ ہوئی ہو
"صدقے جاؤں کس ٹھاٹ سے کہتی تھی
کہ کوئی مائی کا لال پکڑ کر دکھائے اور ادھر جانے
کن گوروں میں ہاتھ صاف کر رہی تھی نا ننگ حرام اب
چپ کیوں کھڑی ہے" ٹھیکیدارنی بُری طرح
بپھر رہی تھیں۔ کنوارے ہائے بھائی کی منگنی
ہو چکی تھی۔ وہ کیسے برداشت کرتیں کہ بھائی
ایسی عورتوں کے پھیر میں پڑے! اس پھیر میں
تو بڑے بڑے خاندان تباہ ہوتے دیکھے تھے۔
فاطمہ سر جھکائے چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس
نے اب تک ایک لفظ بول کر نہ دیا تھا۔ بس صورت
سے ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی اپنی جان پیٹ پیٹ
کر بین شروع کر دے گی۔ کھڑے کھڑے وہ اس
طرح زمین پر بیٹھی جیسے کسی نے دھکا دے دیا ہو۔
"اب پھر یوں بھی ناک لڑکے سے کیوں چہلیں
کر رہی تھی۔ شرم نہیں آتی، تیری اولاد کے
برابر ہو گا۔ کیسا بدلہ دیا ہے میرے احسانوں
کا ایک روٹی زیادہ ہی دے رہی تھی کہ اس
کے بچے ہیں" ٹھیکیدارنی کی زبان نہ رکتی تھی۔
"کچھ بتاؤ بھی نا کیا ہوا؟ کچھ پتا بھی تو
چلے کیوں فاطمہ کیا ہوا؟" پڑوسن، فاطمہ کے
منہ سے سننے کو بے تاب تھی، مگر فاطمہ تو اس
طرح چپ تھی جیسے پیدائشی گونگی ہو۔ اس
نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔
"چوری اور سینہ زوری تو دیکھو کہ سب
کہہ کر تھک گئے اور لاٹ صاحبہ کی زبان نہیں
کھلتی" ٹھیکیدارنی کی اماں حیران ہو کر فاطمہ کو
دیکھ رہی تھیں "اللہ ایسی عورتوں کو اٹھا لے
جو پردہ رہ جائے" فاطمہ نے سر اٹھا کر سب
کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔
"دیکھو فاطمہ تم کچھ بتاؤ گی جبھی ہمیں کچھ بات
معلوم ہو گی" پڑوسن نے فاطمہ کا شانہ تھپکا۔
"گھنٹا ہو گیا تم چپ بیٹھی ہو۔ تمھارے بچے الگ
بھوکے پیاسے پھرتے ہوں گے۔ انھیں بھی تو
کھانا پکا کر دینا ہو گا"
فاطمہ جیسے ایک دم چونک پڑی۔
"تم جو بھی سمجھ لو آپا" وہ ایک دم کھڑی
ہو گئی۔
"سمجھ لو کی بچی! مردوں پر ڈورے ڈالتے
شرم نہیں آتی؟" ٹھیکیدارنی کی اماں غصے
سے لال ہو رہی تھیں۔
"میں اپنے بچوں کو روٹی کھلا آؤں" فاطمہ
نے اس طرح کہا جیسے کوئی بات سنی ہی نہیں۔
"تڑپتے رہیں۔ بھوکے۔ میں تیری جان لے
لوں گی۔ بتا کیا ہوا؟" ٹھیکیدارنی کو اپنے بھائی
کی بے گناہی کا یقین تھا۔ شاید جبھی تو وہ فاطمہ
کے پیچھے پڑی تھیں کہ اقرارِ جرم کر لے۔
"مجھے معافی دے دو آپا اور یہ لو پانچ
روپے جو تمھارے بھائی نے دیے تھے۔ یہ بھی رکھ
لو" اس نے دوپٹے کے پلو سے نوٹ کھول کر پلنگ
پر پھینک دیا۔ وہ کوئی انوکھی حرکت تھی، اس
نے بڑی حقارت سے ٹھیکیدارنی کو دیکھا۔
ٹھیکیدارنی اور ان کی اماں کا منہ اتر گیا
کبھی لڑکے کے لیے ایسی ویسی بات نہ سنی تھی۔
سب تعریف کرتے تھے۔ پڑوسن کے سامنے کیسی
بھد ہوئی۔
"تو تم نے سکھا کر لیے ہوں گے"
"ہاں تمھارے بھائی جیسے لوگوں نے تو یہ
کام سکھایا ہے"
"مگر فاطمہ تم ایسا کیوں کرتی ہو تمھارا
شوہر ہے بچے ہیں۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گی؟"
پڑوسن نے فاطمہ کو سمجھانا چاہا۔
"ہاں آپا میرا شوہر ہے مگر کماتا نہیں
اب میری آنکھیں جواب دے گئی ہیں تو کیا کروں
دس سال ہو گئے۔ میں نے بڑے دکھ جھیلے ہیں"
فاطمہ نے جیسے یہ سب کچھ خواب میں کہا۔
"تو اسے نکال باہر کرو! اسے کیوں کھلاتی
ہو؟ اسی لیے تو کما کر نہیں دیتا" پڑوسن نے
ہمدردی سے مشورہ دیا۔
"نکال دوں گی تو بھوکا مر جائے گا۔ وہ
کام نہیں کر سکتا"
"مرنے دو تمھاری بلا سے۔ ایسے لوگوں
کا مرنا ہی اچھا ہے تم کیوں اس سے عشق کرتی
ہو" ٹھیکیدارنی بھی اب کچھ نرم پڑ رہی تھیں۔
"میں اس سے عشق کرتی ہوں؟" فاطمہ
نفرت سے چیخی اور پھر زمین پر تھوک دیا"
میں اس سے عشق کرتی ہوں!" اس نے ہر
طرف نفرت سے دیکھا "ذرا اپنے سینوں پر ہاتھ
رکھ کر کہو کہ میں اسے مرنے کو چھوڑ دوں" وہ میرے
بچوں کا باپ ہے، میرے بچے پھر کسے ابا کہیں گے"
فاطمہ اس طرح تڑپ کر روئی جیسے اسے پیٹا گیا
ہو۔ وہ روتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ ذرا دیر کو سناٹا
طاری ہو گیا۔

غزل

آپ میرے سامنے کیا آ گئے
گلستاں میں پھول بھی شرما گئے

آمد و رفتِ نفس میں بارہا
داستانِ زندگی دہرا گئے

خون ہو کر رہ گیا پیوندِ خاک
دیکھ کر انجام دل گھبرا گئے

ٹھوکریں کھا کھا کے عبرت ہو گئی
رفتہ رفتہ راہ پر ہم آ گئے

شیخ کے کہنے سے کر دی ترک مے
آپ بھی کہنے میں کس کے آ گئے

اب یہ کس منزل میں پہنچے ہیں ہم
ہم کہاں تک اپنی رَو میں آ گئے

دید کے قابل تھا بادلؔ دل کا حال
دوستوں کے جب کرم یاد آ گئے

دلیپ بادل

غزل

غم وقت کو جو سہہ لے تو ٹل جائیگا ہمراز
دشمن کا کوئی داؤ بھی چل جائیگا ہمراز

آنکھوں کو چھپائیں رہے دو لاؤ نہ اداسی
غم خود ہی مسرت میں بدل جائیگا ہمراز

یہ رسمِ چمن ہے رہے گفتار میں نرمی
ورنہ دلِ آہن بھی دہل جائیگا ہمراز

یارب تری رحمت کو میں محدود ہی سمجھوں
یا میرا مقدر بھی بدل جائیگا ہمراز

چڑھتے ہوئے سورج کی نہ پوجا کرے کوئی
سورج تو سرِ شام ہی ڈھل جائیگا ہمراز

ہم کو نہ خبر تھی کہ مصیبت کے دنوں میں
اپنا بھی ضرورت پہ بدل جائیگا ہمراز

مغموم نہ ہو حال کی تاریکی پہ مونسؔ
پل بھر کا ہے طوفان بھی ٹل جائیگا ہمراز

نوشاد مونس اعظمی

غزل

بٹنے کو جام غیروں میں بھر بھر کے بٹ گئے
باری جو میری آئی تو ساغر الٹ گئے

لہرا گئے کچھ اس طرح گیسو ترے دراز
میں سمجھا میرے شانوں پہ کالے لپٹ گئے

آزادیٔ وطن کی بدولت ہی اے ندیم
سائے خزاں کے صحنِ گلستاں سے ہٹ گئے

بھاتے نہیں مناظرِ دیر و حرم مجھے
آنکھوں میں جب سے آپ کے جلوے سمٹ گئے

اٹھی نگاہ ان کی تو محسوس یوں ہوا
جیسے دل و جگر مرے سینے میں کٹ گئے

اب بس گئے ہیں اس قدر شہروں میں کہ لوگ
آنگن گھروں میں جتنے تھے کمروں میں بٹ گئے

اس دور میں ہوئی جو ترقی تو لے رؤفؔ
سائے بڑھے جہان میں انسان گھٹ گئے

حکیم رؤف

غزل

دائمی تو بس خدا کی ذات ہے
اور سب کی عارضی اوقات ہے

یا خدا کیا راز ہے کیا بات ہے
زندگی کی دوپہر میں رات ہے

خالقِ عالم کا ہے یہ معجزہ
خاکی انساں شاہِ مخلوقات ہے

جام بھر بھر کر پلا دے ساقیا
خوش نما تاروں بھری یہ رات ہے

گو زبانیں ہم نے سیکھیں اور بھی
لیکن اردو کی نرالی بات ہے

کروٹیں لیتی ہے ہر دم زندگی
زندگی کی بات بھی کیا بات ہے

رائیگاں ہونے نہ دے ناصرؔ اسے
زندگی نایاب سی سوغات ہے

بادری بلدیو سنگھ ناصر

غزل

رنگ اگر میں برف ابھرنے پھول پتھر پھینک دے
اپنی آنکھوں سے کھرچ کر سارے منظر پھینک دے

ساری لہریں سو گئی ہیں ذہن کے آغوش میں
کوئی اس ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک دے

زندہ جب تک ہوں بتائے اپنے گھر کے راز تک
اور اگر مر جاؤں مجھ کو بھی سمندر پھینک دے

لکھ گیا ہے میرے چہرے پر مرے قاتل کا نام
بستیوں سے دور لیجا کر مرا سر پھینک دے

اس کے گلدانوں میں مرجھانے نہیں چہرے کے پھول
تو بھی تنہائی کا موسم گھر کے باہر پھینک دے

جل گیا جب گھر تو پھر کیسی نشانی کیا ثبوت
جانے کب جھونکا ہوا کا راکھ اٹھا کر پھینک دے

خوش ہے کیوں ساحل پہ خالی سیپ مٹھی میں لئے
کوئی ہوتا پھینک دیتا تو بھی اخترؔ پھینک دے

خورشید اختر بسوانی

غزل

اول اول ہی جنوں میں مل گئی زنجیرِ پا
کیا لکھی تھی کاتبِ تقدیر نے تقدیرِ پا

میں اکیلا پا برہنہ جانبِ منزل گیا
مل گئے میرے نشاں تو یہ ہوئی تقصیرِ پا

پاؤں کی زنجیر کو نسبت رہی پازیب سے
ڈھونڈتا ہوں ہر طرف کہ کیا ہوئی زنجیرِ پا

ان کے آتے ہی مرے گھر میں اجالا ہو گیا
اس کو کہتے ہیں محبت پہ ہوئی تنویرِ پا

کس بلا کی تھیں نگاہیں اس سراپا حسن کی
دو قدم چلنے نہ پایا ہو گئی تسخیرِ پا

جب خود سے مجھ کو بڑھ کر لے لیا آغوش میں
ہاتھ ملتی رہ گئی تقدیرِ پر زنجیرِ پا

ڈاکٹر محمد یٰسین کامل

شورش کاشمیری

لاہور کی ایک بھیانک یاد

شورش صاحب علالت طبع کی وجہ سے اس مرتبہ "بہ کوئے یار" کا مستقل کالم نہیں لکھ سکے۔ یہ سلسلۂ اشاعت آئندہ سے پھر جاری ہو جائے گا

مظہر صحرائی

جمیل ہر لحاظ سے کوتوال شہر کا ایجنٹ تھا۔ پولیس افسر جس قماش کے اعزازی مخبر رکھتے ہیں، وہ تمام خوبیاں اس میں پائی جاتی تھیں۔ جمیل کوتوال کے لئے سب کچھ فراہم کرتا روپے سے لے کر جسم تک۔ اُس نے اپنی عورت کو بھی پٹرول ڈال کر جلا دیا تھا۔ کیونکہ اس رات سے کوئی نیا چہرہ نہ ملا تھا۔ اس کے شناسا چہرے کوتوال پہلے ہی چکھ چکا تھا۔ انگریزوں نے اُسے کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ اُن کی حکومت میں شراب پینا افسروں کا شعار اور عورتوں سے پیچ لڑانا اہل کاروں کا امتیاز تھا۔

کوتوال نے جمیل سے کہا۔ اس بازار کے سارے مال کا ذائقہ وہ چکھ چکا ہے۔ وہاں اب کوئی نئی شکل نہیں۔ بار بار کی دیکھی ہوئی شکلیں ہیں جن کے پانکوں کی ابھی تھرتھری نہیں کھلی۔ اُن کی عمریں کم سن ہیں۔ کوتوال پچاس، پچپن کے پیٹے میں تھا۔ اس کو عربی و عجمی دونوں ذوق تھے بعض روایتوں کے مطابق یہ عجمی ذوق کا زیادہ دلدادہ تھا جہاں جہاں خوبصورت مصرعہ نظر پڑا اُس کے منہ میں پانی آجاتا۔ وہ ان مصرعوں کو حاصل کرنے کے لئے سب ہی کچھ کر گزرتا۔ اُس نے اپنے بعض ماتحتوں کو بھی اس کام پر لگا رکھا تھا جو غزلہائے رواں کو اس کی شب خوابی کے لئے مہیا کرتے۔ جو قصیدۂ منثور رہتے نہ چڑھتا اس کو مختلف حیلوں سے گرفتار کر لیا جاتا۔ بستہ الف بستہ ب کھلی آنتے پکڑ کر حوالات میں دے دیا جاتا۔ وہ کوتوال نہیں اژدہا تھا۔ جمیل نے رسول سپلائی کے اس کام سے بڑے پیسے کمائے اور شب و روز کما رہا تھا۔ کوتوال پر صاحب لوگ اس لئے خوش تھے کہ اُس نے مہاتما گاندھی کی سول نافرمانی کو لاہور شہر میں دبانے کے لئے نہ صرف ڈنڈا خوب چلایا تھا بلکہ عام مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی ایک کھیپ بھی مخبر بنا لی تھی جو اسے کانگریس کی سرگرمیوں خفیہ میٹنگوں اور اندر خانہ کی تحریکوں سے آگاہ رکھتے تھے۔ مسلمانوں کو اپنے ڈھب پر لانا اس کے لئے مشکل نہ تھا کیونکہ وہ خود بھی مسلمان تھا اور کافروں کو مروانے کے ثواب میں انھیں شریک رکھتا تھا۔ جمیل کے پو بارہ تھے کہ یہی کوتوال کا منہ لگا ہوا تھا۔ صبح کو مخبری کرنا اور رات کو گرہ لگانے کے لئے طرحی مصرعہ اڑا کر لانا اس کا شعار تھا۔ بیوی کو اس نے اس لئے قتل کیا تھا کہ اُس عفیفہ خاتون نے کوتوال کی ردیف بننے سے انکار کر دیا تھا۔ کوتوال نے ان خدمات کے عوض اس کو چھوٹی موٹی رشوتیں لینے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ کسی کو پکڑوا دینا اور پھر چھڑوا دینا اس کا کاروبار تھا۔ وہ سو پچاس روپیہ روز پیدا کر لیتا جس پر کوتوال شہر خوش ہوا اس سے صاحب لوگ بھی راضی ہوتے تھے۔ انگریز ترتیباً چلتے تھے۔ ہندوستانیوں کے معاملہ میں حوالدار سے لیکر انسپکٹر جنرل تک کی خوشی اور ناراضی ایک ساتھ قدم ملا کر چلتی تھی۔ جمیل لانبے قد کا دُبلا پتلا آدمی تھا۔ عام لوگ اپنے طور پر اُس کو بانکے خاں اور شرف بدمعاش کہتے اور مسلمانوں میں تو کوئی تانوالے تاواں اُسے سلام بھی کر لیتا تھا۔ لیکن ہندوؤں میں جہاں تو کرشا ہی کے اور اعضا کا ماتم ہوتا وہاں اس کا ماتم بھی ہوتا تھا۔

۱۹۳۵ء کی سول نافرمانی میں کیسے کیسے

تھوڑے دیکھا دیکھی ہو گئے تھے۔ " ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" "انقلاب زندہ باد، برطانوی سرکار مردہ باد، اپ دی نیشنل فلیگ، ڈاؤن ڈاؤن دی یونین جیک" سارے شہر میں سیاپا ہوتا۔ بچے ہائے ہائے کرتے عورتیں جلوس نکالتیں۔ دن بھر ہنگامہ رہتا۔ معلوم ہوتا کہ انگریز حکومت غائب غلّہ ہو گئی ہے۔ غائب غلّہ تو خیر وہ کیا ہوتی ابھی اس کا سورج نصف النہار پر تھا۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ انگریزی حکومت کے وقار کا دیوالہ نکل چکا تھا۔ ہر روز گرفتاریاں ہوتیں، جوان بھی پکڑے جاتے اور بوڑھے بھی عورتیں بھی اور لڑکے بھی۔ جیل خانے ان دنوں کھیل کا میدان بنے ہوئے تھے۔ پولیس عموماً رات کے وقت، پَو پھٹنے سے گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے جب آدمی مزے کی نیند سوتا ہے، لیڈروں، اور کارکنوں کو گرفتار کرتی۔ ملک میں صرف عدم تشدد ہی نہیں چل رہا تھا، تشدد کا بھی دور دورہ تھا۔ ہر روز کسی نہ کسی شہر میں کہیں نہ کہیں بم پھٹ جاتا جیل کی چاندی تھی۔ ملک میں سول نافرمانی کا اتنا زور بندھا ہوا تھا کہ انگریزی سرکار کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ کانگریس خلافِ قانون ہو گئی۔ نوجوان بھارت سبھا پہلے سے خلافِ قانون تھی۔ ان کی جگہ جو جماعت بنتی یا جس کسی کو کانگریس کا ڈکٹیٹر بنایا جاتا، یا جو شخص 'انقلاب زندہ باد' کہتا دھر لیا جاتا۔ انقلاب کا نام لینا جرم ہو گیا تھا۔ جلسے، جلوس سب ممنوع تھے لیکن لوگ پھر بھی جلسے کرتے تھے اور جلوس نکالتے تھے۔ سارا ملک متحد تھا کہ انگریز صبح گئے یا شام، اور ٹوڈی بچوں کو کوتوال شہر اور جمیل کے جو پیدا ہی انگریزوں کے لئے ہوئے تھے، جنھیں ہر چیز سے زیادہ انگریزی حکومت تھی۔ وہ اس پر جان باپ قربان کرنے کو تیار تھے۔ جمیل تو بیوی کی قربانی دے جا چکا تھا۔ کوتوال شہر کو ایسے ہی جاں نثاروں کی ضرورت تھی۔ وہ جمیل کو پیار سے پچی کہہ کر پکارتا اور جب بہت پیار آتا تو 'پچی سواں' سے پکارتا۔ جمیل اس کو طرۂ افتخار سمجھتا اور دوستوں میں بیٹھ کر رعب ہانکتا کہ کوتوال شہر نے بچی ہی بدل کر اس کو بھائی بنا رکھا تھا۔ دونوں میں زیادہ سے زیادہ اتنا پیار تھا جتنا پیار صاحب بہادر کو اپنے خانساماں سے ہوتا ہے۔ لیکن نہیں! بعض صاحبوں کے خانساماں لکھ پتی ہو گئے تھے۔ کوتوال کو اس سے اتنا پیار تھا جتنا طوائف کو شب کے ناخواندہ مہمان سے ہوتا ہے۔

لاہور ہمیشہ ہی ہندوستان کی آبرو رہا یہاں سول نافرمانی کی تحریک کا بڑا زور تھا۔ اردو کے بڑے بڑے روزنامے یہاں سے نکلتے جو ملک بھر کی ہنگامہ پرور خبروں کو آناً فاناً پھیلا دیتے۔ دن میں کئی کئی بار ضمیمے نکلتے۔ مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت اور نامور ایثار پیشہ لیڈر بھی اس وقت کانگریس کے ساتھ تھے۔ ان سب کا طوطی بولتا تھا۔ لاہور کے طلبہ نے جو دسویں جماعت تک پڑھتے تھے، آپس میں مل جل کر 'بال بھارت سبھا' قائم کی تھی۔ موری دروازے سے باہر باغ میں تکیہ کندن شاہ کے سامنے اس کے کیمپ لگے ہوئے تھے۔ جہاں دن بھر میلہ لگا رہتا تھا۔ سینکڑوں لڑکے آتے لڑکیاں آتیں، جلوس بنتا اور شہر بھر میں سرکار کا سیاپا کرنے کے بعد منتشر ہو جاتا۔ یہاں صبح و شام لنگر لگا رہتا۔ دودھ، دہی، چینی، چاول، آٹا، پھل غرض کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ قید ہونے والے لڑکے یہیں سے روانہ ہوتے۔ جلسہ منعقد ہوتا۔ باغیانہ تقریریں ہوتیں۔ حاضری کم ہوتی تو مقررین کو وہیں پکڑ لیا جاتا، حاضری زیادہ ہوتی تو کارِ خاص کے آدمی تعاقب میں رہتے جہاں داؤ لگا پکڑ لیا۔ ڈی اے۔ وی ہائی اسکول اور سناتن دھرم ہائی اسکول کے طلبہ زیادہ تر گرفتار ہوئے۔

موری دروازہ شروع ہی سے کانگریس کے جلسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مگر یہ علاقہ تھا مسلمانوں کے کندن شاہ کے تکیہ میں، رات دن بھنگ، چرس اور سلفا چلتا۔ دمادم مست قلندر، ایک طرف شطرنج کھیلنے والوں کا مجمع۔ دوسری طرف رستمِ زماں گاما پہلوان اور رستمِ ہند امام بخش پہلوان کا اکھاڑا۔ تیسری طرف نہر کی پٹری کے اُس پار عمریں جہنم کے مجاہدوں کی چوپالیں، جہاں دن بھر ہیر وارث شاہ، طلسم ہوشربا پڑھی جاتی۔ ایک بوڑھا منشی جو کسی وکیل کا اہلکار تھا اس کڑکے سے طلسم ہوشربا پڑھتا کہ داد و تحسین کے ڈونگرے برستے۔ ان لوگوں کے نزدیک طلسم ہوشربا سے مقدس کوئی کتاب نہ تھی اور ہیر وارث شاہ میں جو کچھ تھا وہ ہو بہو قرآن پاک کا پنجابی ترجمہ تھا۔ طلسم ہوشربا اور ہیر وارث شاہ کے علاوہ انہیں کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ دن بھر کانگریس کے ہندو و مسلم رہنماؤں کو گالیاں دیتے جو انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے گاندھی جی کی بکری، اور کانگریس کا چرخہ لے کر نکلے۔ یہ لوگ اُن پر اس طرح ہنستے جس طرح بڈھا دلال جوان کنیا پر ہنستا ہے۔ بال بھارت سبھا کے بچے ان کیلئے تو تاش کے پتے تھے جن سے اُن کی چرب زبانی کے مطابق پولیس کے کھلاڑی مہرہ بازی کرتے۔ ظاہر ہے کہ بچوں کی زبانیں تیز ہوتی ہیں وہ کوئی سلجھے ہوئے مقرر نہیں ہوتے۔ اُن کے لئے "فرنگی راج مردہ باد" اور "نہیں رہے گی انگریز سرکار" ہی سب سے بڑی تقریر تھی۔

کوتوال شہر کے معرفت ان لوگوں کو گرفتار کرتے اور جیل بھجوا دیتے۔ مشہور یہ تھا کہ بنارس کی صبحیں اور اودھ کی شامیں ان لڑکوں کے سانچے میں ڈھل گئی ہیں جو شب کے ہاتھوں زخمی ہو کر نڈھال ہو جاتی تھیں۔ طلبا کی ایک ڈار تھی جو سال بھر سے اسی دُھن میں لگی ہوئی تھی شہر کے سٹی مجسٹریٹ ایک صاحب رائے بہادر لالہ ٹھاکر رام تھے۔ لانبا قد، سفید چہرہ، رخساروں پر چیچک کے داغ۔ وہ انگریزوں سے زیادہ انگریزوں کے وفادار تھے۔ ٹھاکر رام کا ہر روز سیاپا ہوتا۔ طلباء، طالبات اور دیویاں جلوس نکال کر ضلع کچہری کی طرف جاتیں، زور زور سے ماتم کرتیں، جتنی گالیاں کوتوال شہر اور ٹھاکر رام کو اس زمانے میں پڑی تھیں، اتنی گالیاں کئی صدیوں سے نہیں پڑی ہوں گی۔ دونوں لاہور میں ایک واشگاف گالی ہو گئے تھے۔ دونوں اپنے آقائے ولی نعمت

کے سنے گالی کھا کر خوش ہوتے بلکہ فخر محسوس کرتے۔ جب انگریز آفیسر کسی بڑے جلوس کو روکنے کے لئے سامنے آتے تو کوتوال شہر اور مجسٹریٹ اپنے خفیہ کارندوں کی معرفت خود کو گالیاں نکلوا دیتے تھے تاکہ آقاؤں کو معلوم ہو کہ اُن کے وفاداروں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ نتھو رام نے بڑے معمولی درجے سے ترقی کی تھی۔ جیتو کے مورچے پر سکھوں کو مار مار کر ادھ مرا کر دیا تھا۔ ان خدمات کے صلہ میں یہاں تک پہنچا تھا۔ کوتوال کے لئے کوتوال ہونا ہی بڑا اعزاز تھا۔

اُس زمانے میں لاہور کا کوتوال 'کوتوال' ہوتا تھا، تبادلہ کا مہرہ نہیں۔ بال بھارت سبھا کے کیمپوں کو سٹی مجسٹریٹ نے کوتوال شہر کی معیت میں پولیس کا لاؤ لشکر لے کر تین دفعہ لوٹا۔ لیکن رات کو کیمپ لٹتا، دن کو اسی طرح رونق ہو جاتی۔ کیمپ لگ جاتا، کھانے پینے کی چیزیں عام چلی آتی تھیں۔ بال بھارت سبھا کا صدر ڈی۔ اے۔ وی۔ ہائی اسکول کی دسویں جماعت کا طالب علم اوم پرکاش تھا۔ عمر سولہ برس کی ہو گی۔ حسن کی تصویر تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، رنگ گلابی۔ سفید دانتوں پر موتیوں کا گمان ہوتا تھا۔ کریم نواز بال بھارت سبھا کا جنرل سکریٹری تھا۔ دونوں جگری دوست تھے۔ اوم پرکاش کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ اس پر شدید تشدد کیا۔ اوم پرکاش نے بیان کرتے ہوئے کہا کہ کوتوال نے میرے منہ پر طمانچے رسید کئے۔ کوتوال نے سب کو باہر نکال دیا۔ صرف جمیل اندر رہ گیا۔ کوتوال صاحب ریٹائرنگ روم میں چلے گئے۔ جمیل نے مصرعہ اٹھایا، وہ کوتوال کے کمرے میں جاؤ وہاں تمہاری مسل تیار ہو گی۔ میں ریٹائرنگ روم میں چلا گیا۔ کوتوال نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ جمیل نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور پستول لے کر کھڑا ہو گیا۔ میرا ازار بند کھول دیا گیا۔ کوتوال نے اپنے پینٹ کی مہریں توڑ دیں اور کافر کے بچے کی آبرو چھین لی" اوم پرکاش کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ اس نے کہا "میرے دستے یہ دیکھو میرے ہونٹ۔ یا تھوڑی ہونٹوں پر دانتوں کے کاٹ کے نشان بنے ہوئے تھے۔ یہ دیکھو میرے گال جن پر اَن گنت چانٹے لگے تھے، یہ دیکھو میری مقعد!

میرے ساتھ دو روز تک ساری ساری رات کوتوال سے لے کر ادنیٰ کانسٹیبل تک نے طبع آزمائی کی۔ یہ الفاظ اس نے اٹک اٹک کر کہے اس کا ایک ایک حرف آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا "بھائی کریم نواز میرے ساتھ جو سلوک ہوا حیا اجازت نہیں دیتی کہ بیان کروں۔ افسوس یہ ہے کہ انہوں نے جب بھی یہ اقدام کیا، مجھے بچہ کافر کہا۔ تم مسلمان ہو، میرے بھائی ہو، ہمارے بعض بڑے بڑے لیڈر مسلمان ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہیں۔ یہ بھی تو مسلمان ہیں۔ کیا انھیں قرآن و اسلام نہیں آتا؟ کوتوال شہر اور کانسٹیبلوں کو زیادہ آتا ہے کہ بچہ کافر سے یہ سلوک ہونا چاہئے۔ یہ بچہ کافر کیا ہوتا ہے مجھے سمجھاؤ۔ میں جاننا چاہتا ہوں۔ آپ کی کس کتاب میں لکھا ہے کہ بچہ کافر سے یہ سلوک کرو۔ میں تو تمہاری کتابوں کو بھی نہیں جانتا۔ کیا مجھے بتاؤ گے؟

اوم پرکاش دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ تیسرے دن رہا ہو کر سیدھا کریم نواز کے پاس آیا تھا۔ اُس کی ریشمی قبا پر لہو کے نشان تھے۔ اُس نے کہا مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا۔ میرے اندر زخم ہو گئے ہیں۔ سخت درد ہو رہا ہے۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ بچہ کافر کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے۔ دھرم نے یہی سکھایا ہے؟ سنا تھا کہ آپ کے حضرت علیؓ نے اس کام کے مرتکبین کو آگ میں زندہ جلوا دیا تھا۔ مجھے قرآن سناؤ، قرآن کیا کہتا ہے میں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا قرآن سنا ہے وہ تو جادو کر دیتے تھے۔ اُن کا قرآن سن کر تو مسلمان ہونے کو جی چاہتا تھا" وہ اس تیزی، غیرت، خوف اور تجسس سے بول رہا تھا کہ کریم نواز جو خود ایک بچہ تھا۔ اندر خانہ وہ کانپنے لگا کہ کوتوال شہر کا اسلام مبادا اس پر حملہ آور ہو! اوم نے کہا "میں لوگوں سے چھپ رہا ہوں، گھر جاتا ہوں۔ مجھے بخار چڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ تم گھر چلے آنا۔ میں نے صرف تمہیں بتایا ہے۔ ماں کو نہیں بتاؤں گا۔ میری ماں پہلے ہی غشی میں ہے اگر اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ میرے ساتھ یہ سلوک ہوا ہے تو وہ صدمے ہی مر جائے گی۔

کریم نواز کو اُس کے والد نے والدہ کے پاس امرتسر بھجوا دیا۔ کیونکہ لاہور میں پولیس نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ تاہم کوئی دو مہینے بعد کریم نواز امرتسر سے چوری چھپے لاہور پہنچا تو سیدھا اوم پرکاش کے پاس گیا۔ اس کے پتا کی دکان بند تھی۔ گھر پہنچا تو اس کی ماتا نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ کہنے لگی "بیٹا اوم مر گیا۔ اس کو مہینہ ہو گیا ہے۔ اب تو اس کی چتا بھی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اُس کے پھول بھی گنگا میں بہا آئی ہوں۔ بیٹا وہ مرتے مرتے بھی تمہیں بہت یاد کرتا تھا۔ ہائے میرا اوم! میرا اکلوتا بچہ! کوتوال شہر کھا گیا۔

ٹپ ٹپ ٹپ۔ آنسو۔ آنسو۔ آنسو!

●

غزل

قمر ایلوی

کھول دیتے بھرم تخاطب کا
پاس تھا کچھ ہمیں مراتب کا

بام سے نیچے آ گئی غیرت
ہاتھ پھیلا جہاں بھی طالب کا

دست ہمت سے اُس کو تھام لیا
آسماں ٹوٹا جب مصائب کا

لاکھ جدت طرازیاں کر لیں
رنگ پایا نہ میر و غالب کا

خوبصورت ترین طباعت میں
سحر شامل ہے کلکِ کاتب کا

زخم دل جب قمر ترے چمکے
رنگ پھیکا پڑا کواکب کا

بابِ انتقاد

گلشنِ تخیّل / ضیاؔ میرٹھی
سنِ اشاعت ۱۹۸۸ء / سائز ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات۔ ۲۰۸ / قیمت مجلد۔/۳۰ روپئے۔
ناشر:۔ کرشن مُراری ضیاؔ میرٹھی۔

ضیاؔ میرٹھی کا شمار اُردو کے ممتاز اور اساتذہ شعراء میں ہوتا ہے۔ حال ہی میں اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے موصوف کا یہ مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے۔ کتابت، طباعت اور گٹ اَپ کے لحاظ سے مجموعہ قابلِ تعریف تو ہے ہی کلام کے لحاظ سے بھی اسے کسی بھی اچھے اور مشہور شاعر کے مجموعۂ کلام کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔

یہ مجموعہ ضیاؔ صاحب کی صرف غزلیات کا ہی ایک قابلِ قدر مجموعہ ہے ورنہ شاعری کی دیگر اصناف پر موصوف کا کلام اِس قدر جمع ہے کہ کئی مجموعے شائع ہو سکتے ہیں۔ اُتر پردیش کی اُردو اکادمی مبارکباد کی مستحق ہے جو بلا تخصیص مذہب و ملت اُردو کے قابلِ قدر شعراء کے کلام کے مجموعے شائع کرانے کی سعی کر رہی ہے اچھے غزلیہ کلام جو جدیدیت اور قدامت کا سنگم ہوں۔ مطالعہ کے شائقین کے لئے یہ مجموعہ یقیناً قابلِ قدر ہے جو مصنف سے 'پریذیڈنٹ جونیئر ہائی اسکول گھنٹہ گھر، غازی آباد' یو۔پی' کے پتہ سے یا دفتر "شانِ ہند" سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سرورؔ تونسوی

"شگوفہ" **مجتبیٰ حسین نمبر**
سائز ۲۰×۳۰/۸۔ صفحات ۴۸۸۔ قیمت مجلد: ۵۵ روپیے
ملنے کا پتہ:۔ دفتر "شگوفہ" ۲۱۔ بیچلرز کوارٹرز
معظم شاہی مارکیٹ۔ حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۰۱

زندہ دلانِ حیدر آباد کا ترجمان "شگوفہ" طنز و مزاح کا ایک مستند اور مشہور و معروف ماہنامہ ہے۔ اِس کی اشاعت ماہِ نومبر ۸۷ء مجتبیٰ حسین کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ جس میں برِّ صغیر کے بڑے اچھے، نامور، مشہور اور معروف لکھنے والے نے مجتبیٰ حسین کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور بعض مضامین تو اتنے وزن دار ہیں کہ لکھنے والوں نے مجتبیٰ حسین کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کے جملہ فنی محاسن پر بڑا پُرمغز اور حاصل تبصرہ کیا ہے۔

مجتبیٰ حسین کو خاکہ نگاری میں جو ملکہ حاصل ہے اُسے طنز و مزاح ایسی شئے لطیف کے دشمنوں نے بھی سراہا ہے بقول ۔۔۔۔ "یار سرورؔ میں بھی چاہتا ہوں کہ مجتبیٰ حسین میرا بھی قلمی خاکہ لکھیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟" کسی خاص صنفِ ادب کے ماہر ادیب کی شہرت میں اُس وقت اور بھی چار چاند لگ جاتے ہیں جبکہ یہ ادیب ذاتی طور پر شرافت اور اعلیٰ انسانیت کا ایک ایسا نمونہ ہو کہ جس کی پیروی کرنے کو دل چاہے۔

مجتبیٰ حسین نے جن اخلاقی قدروں اور اعلیٰ سماجی روایتوں کو اپنے جلو میں رکھتے ہوئے ملک بھر میں شہرت کے ساتھ ساتھ قدر و منزلت پائی ہے، وہ بہت کم ادیبوں کو میسّر آتی ہے۔

یہ تو امرِ مسلّم ہے کہ ایسی خصوصی اِشاعت ادیبِ متعلقہ کی تعریف و توصیف کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مگر جب یہ تعریف و توصیف کسی خوشامد کے تحت یا کسی مطلب براری کے جذبہ کے باعث نہ کی گئی ہو بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا گیا ہو تو قاری کو خوشی ہوتی ہے کہ وہ اپنے محبوب ادیب کی کچھ نئی صفات سے بھی واقف ہو رہا ہے۔

زندہ دلانِ حیدر آباد واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے یہ خصوصی نمبر شائع کر کے مجتبیٰ حسین کی ادبی خدمات کا صحیح حق ادا کیا ہے۔

اِس خصوصی اشاعت میں ستّر کے قریب تصاویر میں مجتبیٰ حسین نمایاں حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

ہر لائبریری میں اور باذوق حضرات کے ذاتی کتب خانہ میں "شگوفہ" کا "مجتبیٰ حسین نمبر" کا ہونا اِس امر کی دلالت کرے گا کہ ذوقِ سلیم اپنی پہچان خود کرا لیتا ہے۔

سرورؔ تونسوی

من کہ مکتوب الیہ

جنابِ سرور تونسوی صاحب
آداب!

آج ہی "شانِ ہند" کا تازہ شمارہ موصول ہُوا۔ آپ کا اداریہ "ہندوستان میں اُردو کا مستقبل" نہایت دلچسپ ہے۔ وہ باتیں جو آپ نے اس اداریے کے ذریعے قارئین تک پہنچائیں وہ اُردو دوستوں کے ذہنوں میں پنپ تو رہی تھیں مگر آج تک کسی نے کھُل کر نہیں کہا تھا۔ کیونکہ اُردو پرست اور اُردو دوست تمام تر وہ لوگ ہیں جو نقلِ وطن کر کے ہندوستان میں آئے تھے۔ جن کا اوڑھنا اور بچھونا اُردو ہی ہی تھا مگر چونکہ وہ ابھی تک بمشکل تمام خود کو مالی سنبھال ہی پائے تھے اور روٹی کے مسئلے میں ہی اُلجھ کر رہ گئے تھے اس لئے اُن کا دھیان اُردو کی بہبودی کی طرف گیا ہی نہیں کیونکہ انھیں اس سے کوئی Personal Gain تو تھا ہی نہیں وہ تو اب تک یہی سمجھے ہیں کہ اُردو ایک اچھی اور میٹھی زبان ہے اور ہندوستان کے ہر شخص کی زبان ہے۔ ایسے اُردو دوست آپ کے یقیناً بہت ہی ممنون ہیں کہ آپ نے وہ بات کہہ دی جو اُن کے لبوں اور دِلوں میں اظہار کے لئے تڑپ رہی تھی یعنی آپ نے اُن کے لبوں سے بات چھین لی۔

مگر وہ لوگ جو خود کو بابائے اُردو اور جاں نثارانِ اُردو کہتے اور اُردو کی فلاح و بہبود کا ٹھیکہ لئے ہیں اور اُردو کے باعث Personal Gain میں شب و روز منہمک رہتے ہیں یقیناً آپ کے اس اداریے کا حل ڈھونڈ رہے ہیں۔ اُن کے لئے یہ بھی خوشی کا مقام ہے کہ انھیں اس میں زیادہ دقت درپیش نہیں آئے گی کیونکہ ہمارے دیش کے اِس طرح کے Democratic Set ups میں جنھیں ووٹوں کو ہر حال میں بحال رکھنا ہو وہ لوگ زبان کے نام پر کچھ بھی کرا دیتے ہیں۔ اگر انھوں نے اُردو زبان کو ایک فرقے کے ساتھ جوڑ دیا ہے تو کوئی بڑی بات نہیں اس میں اُردو کے سربراہ بھی شامل جہاں وطن فروشوں کی بھی کمی نہیں ہے وہاں اُردو کی قبر کھودنا قدرے آسان کام ہے۔ اُردو گو ہم سب کی زبان ہے مگر ان سربراہوں اور حکومت اُردو کو ایسے دہانے پر لے آئے ہیں جہاں مسلم قوم کا ہر فرد اِسے اپنے فرقے کی زبان سمجھ بیٹھا ہے اور اُن کے گھروں میں یہی ہدایات دی جا رہی ہیں کہ اُردو پڑھو کیونکہ یہ تمہاری یعنی مسلمانی زبان ہے۔ اُردو کی یہ حالت دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا ہے۔ پچھلے دِنوں میں نے دورانِ سفر ایک مسلم خاتون کو اپنا شعری مجموعہ "احساس کی صلیب" پیش کیا وہ مجھے بہت اچھی طرح سے جانتی ہیں اور ایک بزرگ کی حیثیت سے عزت کرتی ہیں، میرے شعری مجموعے کو بڑی حیرانی سے دیکھ رہی تھیں اور صدق گردانی کرنے کر نے حیرانی ظاہر کر رہی تھیں۔ یوں ظاہر [illegible]

بزرگوار۔ آداب!

فروری کے شمارے میں آپ نے زبردست ایڈیٹوریل لکھا ہے مُبارکباد!

میں نے اِن دنوں تین ایسے مضامین ایسی شخصیتوں پر لکھے جن پر بہت تو کیا کام ہی نہیں ہُوا۔ ایک میں بھگونت رائے راحت کاکوروی، دوسرے وِلحن فلک، تیسرے صوفی امبا پرشاد۔ دو مضامین منظور ہو گئے ہیں۔ "صوفی امبا پرشاد" کل ہی "آجکل" کو بھیجا ہے۔

آلِ احمد سرور صاحب نے لکھا کہ "اپنی وراثت کو پہچاننا چاہئے۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ ہندو اُردو سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ میں نے انھیں خط لکھ کر پوچھا کہ وہ وراثت کیا ہے؟ مجھے پتہ ہے میں اپنے ورثے سے چمٹا بیٹھا ہوں۔ ورثہ کون چھوڑتا ہے کوئی پیسہ نہیں چھوڑتا۔ ہم تو یہی دیکھ رہے ہیں کہ اُردو میں ہندوؤں کا کبھی دخل تھا نہ اب ہے۔ پھر میں نے انھیں دس بیس ایسے شاعروں اور ادیبوں کے نام لکھ کر بھیجے اور ساتھ ہی پتہ بھیج دیا۔ اُن کا جواب ملا کہ وہ اِدھر توجہ دیں گے بات صحیح ہے۔ میں اُن کی توجہ کا انتظار کر رہا ہوں۔

نیازمند
رام لعل نابھوی

حالانکہ وہ کسی اجنبی نقطے سے دوچار ہو رہی تھیں اور [illegible] نہایت حیرانی کے عالم میں انھوں نے فرمایا کہ آپ ہماری زبان کو اتنی اچھی طرح سے جانتے ہیں کمال ہے۔ اس خاتون کے یہ جملے سن کر میرا کیا حال ہوا ہوگا اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اردو کے سربراہوں نے اردو زبان کو اس بری طرح سے ایک قوم کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ انہیں یہ کہتے ہوئے انتہائی مسرت ہوتی ہے کہ اردو مسلمانی زبان ہے۔ ان حالات میں سرور صاحب اردو کا مستقبل کس قدر تاریک ہو سکتا ہے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جن لوگوں کے ہاتھ میں اردو کی فلاح و بہبود ہے اُن لوگوں نے اسے ایک فرقہ کے ساتھ جوڑ دیا ہے کیونکہ اُن کے ذہنوں پر مفاد پرستوں نے کچھ اس قسم کا جال بُن رکھا ہے کہ وہ اس سے باہر سوچنے پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اردو زبان کی فلاح و بہبود کا کوئی غیر مسلم حق نہیں رکھتا۔ آپ نے اپنے اداریے میں جو لکھا ہے، وہ سب تو صحیح، مگر یہ لوگ بقول آپ کے آپ کے فرمودات پر توجہ دیں گے؟ جن جن انجمنوں اور اکیڈمیوں کی لیڈری اِن کے ہاتھوں میں ہے، وہ کسی طور سے اُسے اپنے ہاتھ سے نکلنے نہیں دیں گے چاہے اردو کی قبر کھود دی جائے۔ ان لوگوں نے اردو کو اپنا بزنس سمجھ رکھا ہے اور اس کی کمائی کسی حال میں کسی اور کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔ اور وہ وظیفے جو یہ اردو کے نام پر ہضم کرنے کی فکر میں ہیں ناممکن ہے کہ کسی غیر مسلم کو ٹھیک طور سے استعمال کرنے دیں۔ کاش ایسا ہو سکتا کہ ان اداروں کی سربراہی کسی ایسے اردو دوست، اردو پرست معزز شخص کے ہاتھ میں ہوتی جو بلا مذہب و ملت اردو زبان کو فروغ دینے میں ان وظیفوں کو صحیح طور سے استعمال کرتا۔

وہ باتیں جو آپ کے اداریے سے ابھر کر سامنے آتی ہیں اگر اُن پر فوری طور پر عمل نہ کیا گیا تو یقیناً وہ دن دور نہیں جب یہ زبان بھی عجائب گھروں کی زینت بن کر رہ جائیگی۔

خیر اندیش
یگیندر بہل تشنہ

برادرم سرور صاحب
بھگوان آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

"یہ کوئے یار" بڑی دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں۔ ایسی کتاب کی اردو ادب میں ضرورت تھی۔ کتاب پڑھ رہا ہوں اور وہ تمام مناظر شاہ صاحب، کوثر صاحب اور صولت صاحب آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ کام آپ کو آج سے بیس سال پہلے کرنا چاہئے تھا کیونکہ اشاعتی کاموں میں آپ کو پچاس سال کا تجربہ ہے ہماری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ جیسی محنت کی تاریخ قلمبند کی ہے کسی شخص میں اتنی جرأت نہیں۔ یہ آپ کی ہی ہمت ہے ورنہ آج کے ماحول میں ہر کوئی دوسرے کی چاپلوسی کرتا ہے۔ چھپائی، کتابت اور کاغذ کی کیا تعریف کروں۔ اس دور میں ایسی اچھی کتاب شائع کر کے اردو ادب کی بہت زیادہ خدمت کی ہے جو کہ صرف آپ کا ہی حوصلہ ہے۔ خدا کرے آپ کی صحافت آنے والے دور میں اس سے بھی زیادہ کامیاب رہے۔

آپ کا بھائی —
ڈاکٹر سوامی اونکار انند سرسوتی
سابقہ: ڈاکٹر رام پرکاش جوشی ۔ ایم ۔ ایس ۔

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 **APRIL** 1988

Regd. with the Registrar of Newspaper at R.NO. 644/57

Delhi Postal

مئی سنہ ۱۹۱۱ء

دہلی

شانِ ہند



شانِ ہند دہلی

مئی سنہ ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹ — شمارہ ۵

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر
وِدیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت۔ خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقام اشاعت۔ دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"
ملت انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی-۲

خطاط
سبطین حیدر
محمد عمران

حسن کار
مصطفیٰ آرٹسٹ

غزل

عزیز احمد عزیز

غم سے نجات پانے کو مے نوش ہو گئے — اک عالمِ خیال میں مدہوش ہو گئے
سُنکر غمِ فراق کا پُر درد ماجرا — تصویر بن گئے لبِ خاموش ہو گئے
پُر کیف وہ صدائیں مرے سازِ دل کی تھیں — بیہوش کرنے والے بھی مدہوش ہو گئے
مدت سے بسملوں پہ ترے ایک بار تھا — سر نذر کر کے آج سبکدوش ہو گئے
ہم کو امید تھی کہ بر آئے گی آج امید — بجلی گرا کے آپ تو روپوش ہو گئے
دنیا بدل گئی غمِ دشمن ہیں آپ کی — کالی گھٹا کی طرح سیہ پوش ہو گئے
کیسی چلیں ہوائیں گلستانِ عشق میں — سینے میں جلتے داغ تھے گل پوش ہو گئے
رقصاں ہیں پھر لبوں پہ تبسم کی بجلیاں — شاید شہیدِ ناز فراموش ہو گئے

شاید مرا بیان مرا ذکر تھا عزیز
کچھ کہتے کہتے غیر سے خاموش ہو گئے

مرارجی ڈیسائی نے فرمایا —

کون سی اردو؟

کیسی اردو؟

اردو کا فیصلہ تو اسی روز ہو گیا تھا جس روز ملک کی تقسیم ہوئی تھی

اردو کے مسائل پر غور و خوض

جس شد و مد سے اردو پرستوں نے اردو کے مسائل پر غور و خوض کیا وہ کافی حد تک صحیح سمت کی نشاندہی کر رہا تھا

کل ہند انجمن ترقی اردو کے صدر دفتر "اردو گھر" میں ۲۴ جون ۱۹۸۲ء کو اردو کے دانشوروں کا اجتماع ہوا۔ جس میں دلّی، بہار، یو۔ پی اور پنجاب کے نمائندگان نے شرکت فرمائی۔ اجلاس کی صدارت انجمن کی اردو ہند کے صدر

جناب سید حامد صاحب نے فرمائی اور اجلاس کا افتتاح انجمن ہذا کے سابق صدر جناب جسٹس آنند نارائن ملا کی تقریر سے ہوا۔

ملا صاحب نے اپنی روایات کے مطابق نہایت جذباتی تقریر فرمائی اور اردو کے مسئلہ یا

مقدمہ کو اپنے اچھے ڈھنگ سے [illegible] ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر [illegible] پروفیسر گلزار زتشی، محترمہ [illegible] شوہر ناہار، ملک زادہ [illegible] اور دیگر کئی حضرات کی تقاریر [illegible]

[illegible] (ڈی) سے [illegible]
[illegible] کے بیچ میں [illegible]
[illegible] اور اُردو کو [illegible]
[illegible] دی زبان قرار نہیں دیا گیا
[illegible] نے وضاحت الفاظ میں فرمایا کہ جس
[illegible] انتخابات ہو رہے ہیں اس میں
[illegible] کو اُردو والوں سے صاف صاف کہہ
[illegible] کہ جو بھی اُردو کا حق دلانے کی یقین
[illegible] ہم اسے ووٹ دیں گے کیونکہ
[illegible] کہا تھا کہ وعدے وعید تو کانگریس
[illegible] سے پہلے بھی تحریری طور پر کر رکھے ہیں
[illegible] یا کوئی دوسری پارٹی ووٹ حاصل
[illegible] کے لئے اُردو والوں سے ہر وعدہ کرنے
[illegible] ہو جائے گی مگر اس نے اپنا وعدہ نہ
[illegible] کانگریس (آئی) نے تو پھر آپ
[illegible] اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

جناب بہار برنی نے وزیر اعظم سے اُردو
[illegible] کے مدیران کرام کی ملاقات کا حال سنایا
[illegible] ملاقات کے حالات تو انہوں نے کچھ یوں ہی سے
[illegible] مگر انہوں نے حاضرین پر اپنی یہ برتری
[illegible] کر دی کہ انھیں وزیر اعظم کے ہاں بطور
[illegible] بھیجے جانے کا فخر حاصل ہے۔ مگر وہ

یہ بتانے سے قاصر رہے کہ پی۔ آئی۔ بی والوں
نے بہ تاب طلب ایسے [illegible] اخبارات
کے مدیران کرام کو کیوں مدعو کیا حالانکہ بعض غیر
مسلم روزناموں کے مدیران کرام کو بلایا گیا جن کے
اخبارات کی اشاعت ہندوستان میں اتنی نہیں ہے
جتنی کہ بہ تاب یا طلب وغیرہ کی صرف دریا گنج میں
ہے۔ ہاں انہوں نے پی آئی بی کی طرف سے وزیر
اعظم سے ملاقات کے بعد اُردو کے اخبارات کے
مدیران کرام کو دعوت بہت اچھی دینے کا بار بار
ذکر کیا۔ مدیر "شان ہند" کو پی آئی بی کی طرف
سے اخبارات کے مدیران کرام کو دی جانے والی
دعوتوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ ایسے
دعوتوں میں اخبارات کے مدیران کرام کی آڑ میں
پی آئی بی کے افسران اور دوسرے اُن
کالکان کے مزے ہوتے ہیں جو ایسی دعوتوں
کا انتظام کرتے ہیں۔ شراب کی فراوانی،
مرغ و ماہی کی فراوانی، غرضیکہ دعوت کا انتظام
کرنے والے جہاں پینے والے مدیران کرام کو نہال
کرتے ہیں وہاں اپنے کوٹے کا انتظام بھی کر لیتے
ہیں۔

جناب بہار برنی نے وزیر اعظم کی اس
ملاقات میں اُردو کمپیوٹر کا بھی ذکر فرمایا اور دبے

الفاظ میں وہ عالمی اُردو کانفرنس کے [illegible]
اور مسٹر شہر یار عادل پر بھی کچھ کہہ گئے جنھوں نے
اُردو کمپیوٹر کا کام شروع کر رکھا ہے۔

جناب علی صدیقی کو عام طور پر اپنی زبان
پر قابو نہیں رہتا اور وہ عام بول چال میں بلف
کرتے ہوئے ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے
یہ معلوم پڑتا ہے کہ ہندوستان کی حکومت اگر
چل رہی ہے تو اُن کے اشاروں پر۔ چونکہ پیسے
کی اُن کے ہاں فراوانی ہے اور اُردو والے عام
طور پر پیسے کے ازلی بھوکے ہوتے ہیں، لہٰذا
علی صدیقی کی چرب زبانی پر واہ واہ کرنے والوں
کی کمی نہیں ہے۔ مگر داد دی جانی چاہیئے علی
صدیقی صاحب کو کہ انہوں نے اس اجلاس میں
بہت ہی بہکی تلی تقریر فرمائی۔ اُن کی دلائل سے
پُر تقریر سنتے ہوئے یہ شک ہو رہا تھا کہ کیا وہی علی
صدیقی ہیں جو لاف زنی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

شہر یار عادل اور عالمی اُردو کانفرنس
کے علی صدیقی نے اُردو کمپیوٹر کے لئے جو کام شروع
کیا تھا اور جس کا افتتاح جناب وزیر اعظم نے
فرمایا تھا علی صدیقی نے اس کی ناکامی کی وجوہات
پر روشنی ڈالی اور وہ لوگ جو یہ کہتے نہیں تھکتے
کہ علی صدیقی اور شہر یار عادل نے سرکاری مدد
سے اُردو کمپیوٹر کی آڑ میں کروڑوں روپیہ سرکار
سے ہڑپ لیا ہے، چپ سادھے یہ سب کچھ سن
رہے تھے۔ علی صدیقی کی یہ تقریر سننے کے بعد
یقین سا ہونے لگا تھا کہ واقعی بوفورس سودے
کے بارے میں ہر فن مولا کو انھوں نے رشوت
کی پیش کش کی ہوگی یعنی لگا کہ مفت میں بدنام ہوئے
میں شامل نہیں ہوئے

پی آئی بی نے کھلے طور پر وزیر اعظم کی
اُردو اخبارات کے مدیران سے ملاقات میں اُردو
اخبارات کے غیر مسلم مدیران کرام کو نظر انداز کر کے
یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حکومت اُردو کو
صرف اور صرف مسلمانوں کی زبان سمجھتی ہے
حالانکہ یہ روش اُردو کے لئے زہر قاتل ہے۔
بیشک مسلم دانشور اور مسلم اخبارات کے مدیران

جناب علی صدیقی کو عام طور پر اپنی زبان پر قابو نہیں رہتا
اور وہ عام بول چال میں بلف کرتے ہوئے ایسی باتیں
کہہ جاتے ہیں جن سے یہ معلوم پڑتا ہے کہ ہندوستان کی حکومت
اگر چل رہی ہے تو اُن کے اشاروں پر۔ چونکہ پیسے کی
اُن کے ہاں فراوانی ہے اور اُردو والے عام طور پر پیسے
کے ازلی بھوکے ہوتے ہیں لہٰذا علی صدیقی کی چرب زبانی
پر واہ واہ کرنے والوں کی کمی نہیں ہے مگر داد دی جانی چاہیئے علی
صدیقی صاحب کو کہ انہوں نے اس اجلاس میں بہت ہی بہکی تلی تقریر
فرمائی۔ اُن کی دلائل سے پُر تقریر سنتے ہوئے یہ شک ہو رہا تھا کہ کیا وہی علی
صدیقی ہیں جو لاف زنی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

[illegible] کہا جاتا ہے کہ نقوی بیابانی صاحب کو اس ملاقات میں شریک کرکے غیر مسلموں کا کوٹا پورا کر دیا گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نقوی بیابانی صاحب کو مدعو کرنے والوں کو یہ علم ہی نہ تھا کہ وہ ہندو ہیں اور اُن کا اسم گرامی دیوان بیریندر ناتھ ہے۔ وہ نقوی بیابانی کو مسلمان سمجھ کر ہی مدعو کرنے کے گنہگار ہیں۔

اس اجلاس میں بعض مقررین کا یہ کہنا تھا کہ انجمن کے جلسوں میں کسی وزیر کو نہ بلایا جائے اور نہ ہی سرکاری مدد قبول کی جائے غرضیکہ مکمل طور پر حکومت سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ اس سلسلہ میں جسٹس ملاؔ صاحب صدر، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، خلیق انجم اور کچھ ایک دو حضرات کا موقف یہ تھا کہ سرکار کا ساتھ دینا چاہیئے اور اپنے مطالبات اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا جائے کہ اُنہیں منظور کیا جائے بصورت دیگر مناسب انداز میں شدید احتجاج قانونی حدود میں رہ کر کیا جائے۔ لہٰذا اس تجویز کو سنجیدہ حضرات نے پسند فرمایا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ایک واقعہ سُنایا کہ جب مُرارجی ڈیسائی وزیرِ اعظم تھے تو انجمن ترقیٔ اُردو کا ایک وفد اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور اردو کے لئے کچھ مطالبات اُن کے سامنے رکھے تو مرارجی فرمانے لگے۔ "کونسی اُردو؟ کیسی اُردو؟ اُردو کا فیصلہ تو اسی روز ہو گیا تھا جس روز ملک کی تقسیم ہوئی تھی۔"

انجمن ترقیٔ اُردو ہند کے نئے صدر سید حامد صاحب اپنی سابقہ روایات اور ذمہ دار عہدوں پر فائز رہ کر ثابت کر چکے ہیں کہ وہ ہندوستان کے لئے ایک مایۂ ناز شخصیت ہیں لہٰذا اردو پرست حلقے انہیں انجمن ترقیٔ اُردو کا صدر بنایا جانا اُردو کے لئے نیک فال سمجھتے ہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب سے انھوں نے یہ ذمہ داری سنبھالی ہے، وہ دِل و جان سے کوشاں ہیں کہ اُردو کے لئے کچھ کیا جائے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انجمن ترقیٔ اُردو ہند میں کوئی نئی روح عود کر آئی ہے۔ ہمارے خلیق انجم صاحب [illegible] اور مجد بازی کا مظاہرہ کرنے لگے ہیں۔ ہم [illegible] سید حامد صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ [illegible] اُن کے ساتھ ہے۔

یہ سُن کر غیر مسلم اُردو دوستوں کو [illegible] خوشی ہوگی کہ حال ہی میں جناب نرسمہا راؤ صاحب سے انجمن ترقیٔ اُردو ہند کا ایک وفد ملاقی ہوا [illegible] میں جسٹس آنند ملاؔ، مالک رام صاحب، [illegible] راج بہادر گوڑ بھی شریک تھے۔ [illegible] میں غیر مسلم اُردو دوستوں کو بھی یاد رکھا گیا۔

انجمن ترقیٔ اُردو ہند کے زیرِ اہتمام [illegible] "اُردو کے مسائل پر غور و خوض" واقعی [illegible] اجلاس تھا۔ اور جس شدو مد سے اُردو [illegible] اُردو کے مسائل پر غور و خوض کیا وہ کافی [illegible] سمت کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ہم انجمن کے صدر اور جنرل سکریٹری سے امید کریں گے کہ وہ اس قسم کے [illegible] مسائل متعلقہ اُردو پر کھلے دل سے بحث کے مواقع اُردو دوستوں کے لئے مہیا کرتے رہیں گے۔

اُردو اکادمی کا التوا یا بہانہ

'شانِ ہند' کے نومبر اور دسمبر ۸۸ء کے دو شماروں میں "اُردو اکادمی دلی کی بددیانتی" عنوان سے اداریٔ شذرے شائع ہوئے تو جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ صدر ایوارڈ کمیٹی اُردو اکادمی نے یقین دلایا کہ ان دونوں معاملات میں بددیانتی نہیں کی گئی ہے ہو سکتا ہے کہ کسی غلط فہمی کی بنا پر یہ فیصلے بددیانتی کی نشاندہی کرتے ہوں۔

کیونکہ بدقسمتی سے یہ دونوں معاملات ایوارڈ کمیٹی سے متعلق تھے اور چونکہ اس کمیٹی کے صدر جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ ہیں لہٰذا اُن کے فرمان پر آمنّا و صدّقنا کہہ کر یہ معاملہ ختم کر دیا گیا۔ اس لئے کہ راقم الحروف جناب کنور صاحب کا اس قدر ممنونِ احسان ہے کہ اُن کے ہر فرمان کی تعمیل اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ اسکے دوران اُردو اکادمی دلی سے ایک فرمائش موصول ہوئی کہ دلی کے ۲۰۳ مدرسوں میں "شانِ ہند" جنوری ۱۹۸۸ء تا اکتوبر ۸۸ء جاری کر دیا جائے اور ان رسائل کی قیمت کا بل بھجوا دیا جائے۔ چونکہ 'شانِ ہند' اس سے پہلے بھی دلی کے کچھ مدرسوں میں اُردو اکادمی کی طرف سے بھجوایا جاتا تھا، لہٰذا اس فرمائش کی تعمیل کر دی گئی۔ مگر بل بھجوانے کے ایک ہفتہ بعد اکادمی کی طرف سے خط موصول ہوا کہ آپ کے بل کی ادائیگی کو معرضِ التوا میں ڈال دیا گیا ہے لہٰذا شانِ ہند کی ترسیل تا اطلاع ثانی بند کر دی جائے۔

کیونکہ اُردو اکادمی کے سکریٹری [illegible] محکموں میں اہم اور ذمہ دار عہدوں پر [illegible] ہیں اس لئے ایک اچھے ایڈمنسٹریٹر [illegible] ناطے وہ بل کی ادائیگی سے انکار [illegible] التوا میں ڈالنے کا فرق سمجھ بھی [illegible] انھوں نے اپنی ذہانت سے اپنے آپ کو [illegible] سی الجھنوں سے محفوظ کر لیا۔

درحقیقت سکریٹری صاحب کا [illegible] طریقہ کار 'شانِ ہند' کو نقصان پہنچانے [illegible] غرض سے تھا۔ لہٰذا انھوں نے اُردو [illegible]

[illegible] رسالہ جسے ہماری [illegible] کرتا ہے اسے ہم اسکولوں [illegible] طلباء اور اساتذہ میں کیوں [illegible] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ [illegible] اساتذہ کو ہماری اکادمی کی بیٹیاں یا [illegible] مجبور کیا جائے۔ اور اس فیصلے میں ڈاکٹر [illegible] قریشی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر تنویر [illegible] ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ایسے ماہرین تعلیم [illegible] ہے۔ باقی ممبران کا تو خیر تعلیم و تدریس سے [illegible] واسطہ نہیں تھا مگر ہم ان اہم تعلیمی شخصیتوں [illegible] پوچھنے کا یہ حق تو رکھتے ہیں کہ کیا آجکل تعلیمی [illegible] میں یہ بھی شامل ہے کہ طلبا، اور اساتذہ [illegible] اور سچ کی تمیز بھی نہ ہونے دی جائے [illegible] اکادمی صرف وہی رسائل و جرائد [illegible] میں بھجوا سکتی ہے جس میں ان کی [illegible] ہو اور جس رسالے میں اسے ایمانداری [illegible] دیانتداری سے چلنے کی تلقین کی جائے اسے اسکولوں کے لئے ممنوع قرار دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچوں کو شروع سے ہی خوشامد پسندی اور جھوٹی تعریف کا عادی بنایا جائے اور انہیں دیانتداری اور ایمانداری کے فوائد سے روشناس نہ ہونے دیا جائے۔

اس خیال کو نزدیک بھی نہ آنے دیجئے کہ شان ہند کے ۲۲ پرچوں کی خریداری ملتوی ہو جانے سے مالی نقصان کا ہمیں احساس ہے یا تھا۔ کیونکہ سکریٹری صاحب اردو اکادمی کے علاوہ غیر سرکاری ممبران بخوبی جانتے ہیں کہ ہم ان ۲۲ پرچوں کی خریداری کے التواء پر لعنت بھیجتا ہے۔ دراصل سکریٹری صاحب اور اکادمی کا مدعا ایڈیٹر شان ہند کو بے عزت کرنا تھا۔ کیونکہ وہ اس کے عادی ہیں کہ وہ اپنی سرکاری ملازمت کے دوران اپنے مبینہ مخالفوں (حالانکہ ہم ان کے مخالف نہیں) کو نقصان پہنچانے اور انہیں بدنام کرنے کی ہر ممکن سعی کرتے رہے (ہم اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتے)

مگر یہاں معاملہ دوسرا ہے اردو اکادمی ایک ایسا ادارہ ہے جو صرف اور صرف اردو کی فلاح و بہبود کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ ہر اردو پرست کو یہ حق حاصل ہے کہ جہاں بھی وہ اسکے اردو کی بہبود کے دائرہ سے باہر نکلتا ہوا دیکھے اکادمی کو ٹوکے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ شان ہند کے ۲۲ پرچوں کے دس مہینوں کے بل کے ایک ہزار روپیہ کی ادائیگی کو غیر محدود عرصہ کے لئے التوا میں ڈال سکتی ہے مگر سکریٹری صاحب دو دو ایئر کنڈیشنر اپنے دفتر میں لگوا سکتے ہیں حالانکہ قانونی طور پر وہ اس عیاشی کیلئے مناسب حیثیت نہیں رکھتے۔ دلی سکریٹریٹ میں محض فائننس سکریٹری کو ہی غالباً ایئر کنڈیشن لگوانے کا اختیار ہے باقی افسران بالا کو اس کا حق حاصل نہیں ہے مگر یہاں حالت یہ ہے کہ ہمارے سکریٹری صاحب دو دو ایئر کنڈیشن کے بغیر اردو کی بہبود کے لئے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔

[illegible]

ممبران اکادمی سے یہ ریزولیوشن پاس کروا کر کہ شان ہند کا اجراء اسکولوں میں نہ کیا جائے لیفٹننٹ گورنر یعنی اکادمی کے چیئرمین سے اس کی اجازت لے لی ہے۔ مگر وہ کب تک چیئرمین یا نائب چیئرمین اکادمی کو غلط اطلاعات دیتے رہیں گے۔

سکریٹری صاحب اردو اکادمی کی اس گھٹیا حرکت کا نوٹس لینا بھی ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ مگر حال ہی میں انہوں نے ایڈیٹر 'شان ہند' کو بے عزت کرنے کی ایک طفلانہ حرکت پھر کی ہے۔ لہٰذا مجبوراً ہمیں یہ داستان لکھنی پڑی اور انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اگر شیر نے مشتہر کر دیا ہو کہ وہ پرامن رہے گا اور کسی کو نہیں کھائے گا تو بھی وہ اپنی مٹھو یا کسی چوہے کو مجھ سے کی گستاخی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

مُبارکباد

جناب حکیم شبیر علی خاں شبیر کانپور کی ایک ایسی علمی، ادبی اور سماجی ہستی ہیں جن کی عزت اور شہرت بلا تخصیص مذہب و ملت کانپور کے ہر حلقہ میں پائی جاتی ہے۔ حال ہی میں شبیر صاحب کے صاحبزادے اظہر علی خاں کی شادی خانہ آبادی عزیزی ثریا بیگم دختر جناب امان اللہ خاں صاحب، احاطہ کمال خاں کانپور کے ساتھ ۵ رجون ۱۹۸۸ء کو نہایت دھوم دھام سے ہوئی اور ۵ رجون ۱۹۸۸ء کو ہی حکیم شبیر صاحب کی صاحبزادی نور چشمی نور جہاں بیگم کا نکاح مسٹر زاہد علی خاں، پسر راحت علی خاں صاحب، باندہ، یو۔پی سے بڑی شان و شوکت سے ہوا۔

عزیز اظہر علی خاں کا نکاح مولینا قمر شاہجہانپوری نے پڑھایا۔ اور شبیر صاحب کی صاحبزادی کا نکاح امام مسجد کلاں گھوسی حافظ رزاق صاحب نے پڑھایا۔ ہر دو تقاریب میں شہر کی معزز ہستیوں نے بلا تخصیص مذہب و ملت شرکت فرما کر قومی یکجہتی کا ثبوت دیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دو نئے جوڑوں کو ازدواجی خوشیاں عطا فرمائے۔ حکیم شبیر کو اللہ نے جس عزت کے ساتھ اس فرض کی ادائیگی سے سبکدوش فرمایا ہے اس کے مُبارکباد کے مستحق ہیں

(ادارہ)

[illegible]

حالِ زار

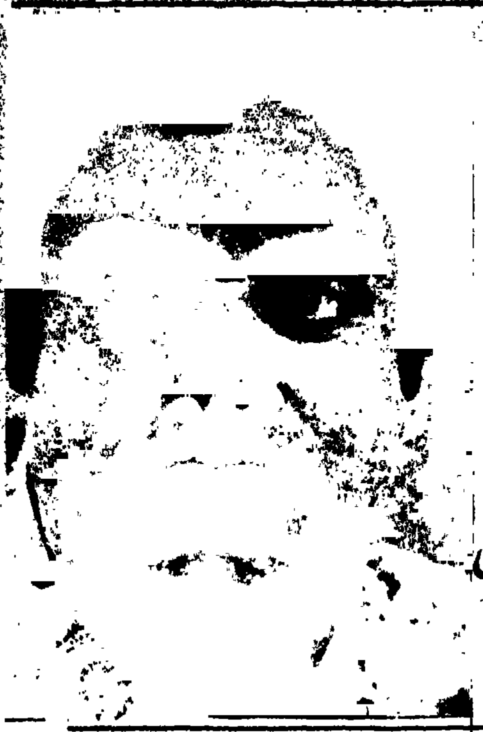
ڈاکٹر حقیر آستانی

ٹوٹ گیا ہے، پھوٹ گیا ہے
خود کو شاید لوٹ گیا ہے
اُس کے صبر کا دامن یارو
رفتہ رفتہ چھوٹ گیا ہے
خود سے پریشاں رہتا ہے وہ
دست و گریباں رہتا ہے وہ
اپنے حال پہ نالاں، نالاں
ویراں ویراں رہتا ہے وہ
چین کسی بھی طور نہیں ہے
اُس کا کوئی اور نہیں ہے

جس طغیان کا پروردہ ہے
اُس کا کوئی طور نہیں ہے
سعیٔ مسلسل بھی وہ ہی تھا
کاوش کامل بھی وہ ہی تھا
منزل اُس کے پہلو میں تھی
اپنا ساحل بھی وہ ہی تھا
اب کھویا کھویا رہتا ہے
جھڑکی دنیا کی سہتا ہے
بے چارہ، گم صم، چپ چپ سا
وقت کی دھارا میں بہتا ہے

سمے سے اُس کا میل نہیں ہے
یہ قسمت کا کھیل نہیں ہے؟

702, Gold Crown
J. P. Road
Andheri (W)
Bombay-400 061



دیب انٹرنیشنل

لدھیانہ کی جانب سے

یم شاعر ساحر لدھیانوی کے یومِ ولادت کے موقعہ پر

تواں سالانہ ادبی اجلاس، مشاعرہ اور محفلِ غزل

ڈاکٹر کیول دھیر

لدھیانہ بارہ لاکھ سے زائد
ی کا جو ایک صنعتی شہر ہے اور جہاں کی فضا
چھوٹے بڑے ہزاروں کارخانوں کی مشینوں
ے شور جنم لیتا ہے — جہاں کے آسمانوں
چمنیوں کا دھواں منڈلاتا ہے اور جو اس
رکی صنعتی پہچان کو نمایاں کرتا ہے — جہاں
زراعتی یونیورسٹی ہرے انقلاب کی ضامن ہے
نیز جہاں متعدد تعلیمی ادارے علم کی روشنی
پھیلاتے ہیں — اور جہاں کی مقدس دھرتی
عظیم شاعر ساحر لدھیانوی اور موہن سنگھ نے
نت عطا کی ہے۔ یہی لدھیانہ شہر ادبی، فنی
کلچرل سرگرمیوں کی آماجگاہ بھی ہے۔ ایسے
سے میدانِ علم وادب میں نہ صرف صوبہ
اب، بلکہ ملک کی بھی رہنمائی کی ہے۔
"ادیب انٹرنیشنل سوسائٹی" اسی شہر
ھیانہ کی ادبی، علمی، ثقافتی اور کلچرل سرگرمیوں کی
ایسی نمائندہ جماعت ہے جس نے اردو،
ابی، ہندی اور انگریزی زبانوں کے ادیبوں

کے علاوہ یہاں کے فنکاروں کو ایک بلند مقام عطا کرکے قومی سطح پر نہ صرف اپنی ایک خاص پہچان پیدا کی ہے بلکہ پنجاب کے موجودہ حالات میں عوام میں پیار محبت اور آپسی بھائی چارے کے جذبے کو تقویت پہنچا کر قومی یکجہتی کے لئے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ گذشتہ ایک دہائی سے سوسائٹی کی طرف سے قومی، صوبائی اور مقامی سطح پر ادبی اجلاس، مشاعرے اور سیمینار منعقد کرنے کی ایک شاندار روایت رہی ہے — اور اسی شاندار روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے مورخہ ۸ مارچ کو لدھیانہ کے "پنجابی بھون" میں "ادیب انٹرنیشنل" کی جانب سے عظیم شاعر ساحر لدھیانوی کے یومِ ولادت کے موقعہ پر سوسائٹی کا ساتواں سالانہ ادبی اجلاس، مشاعرہ اور محفلِ موسیقی کا انعقاد کیا گیا جس میں دیش کے مختلف حصوں سے بہت بڑی تعداد میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں نے شرکت کی۔ مقامی باذوق سامعین کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ پنجابی بھون کے آڈیٹوریم میں ایک میلہ سا لگا دکھائی دے رہا تھا۔

تقریب کا آغاز کرتے ہوئے پنجاب کے مشہور قلم کار ڈاکٹر کیول دھیر نے اپنی تقریر میں سوسائٹی سے وابستہ رہے ان ادیبوں اور فنکاروں کو خراجِ عقیدت پیش کیا جو گذشتہ برسوں ہم سے جدا ہو گئے تھے۔ بعد ازاں مرحوم خواجہ احمد عباس، فکر تونسوی، کلونت سنگھ ورک، ستیش بترہ، سریندر پنڈت سوز اور کماری وددلا کی یاد میں دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔

تقریب کا افتتاح جناب ست پال مِتّل ممبر پارلیمنٹ نے ساحر لدھیانوی کی تصویر کی گل پوشی کرکے کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جہاں ساحر کی عظمتوں پر روشنی ڈالی وہاں ادیب انٹرنیشنل سوسائٹی کی خدمات کا بھرپور الفاظ میں اعتراف کیا۔

سوسائٹی کے چیئرمین جناب کے کے سیٹھ نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور سوسائٹی کی سرگرمیوں سے سامعین کو متعارف کرایا۔

[illegible] رسالہ [illegible] کا ہے کہ ان ادیبوں اور فنکاروں کو ان کی [illegible] خدمات کے اعتراف میں ادیب ایوارڈ [illegible] جاتے ہیں۔ سال ۸۸-۱۹۸۷ کے لئے مشہور افسانہ نگار جناب رام لعل (اردو ادب) [illegible] شاعر جناب امریک سنگھ پونی (پنجابی ادب) [illegible] رینو کا نیر (ہندی ادب) مشہور صحافی اور روزنامہ "اجیت" کے مدیر جناب برجندر سنگھ (صحافت) اور کلچرل سرگرمیوں کے لئے جناب ادم پرکاش منچال کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جناب ست پال متل نے اپنے دست مبارک سے اُن کی خدمت میں بصد احترام ایوارڈ پیش کئے۔

مشہور اداکارہ اور ادیبہ محترمہ چاند کرن اس تقریب میں شرکت کے لئے خاص طور پر لندن سے یہاں تشریف لائی تھیں مقبول اُردو رسالہ ماہنامہ "شان ہند" کے مدیر صحافی جناب شہروز تونسوی نئی دہلی سے اور افسانہ نگار محترمہ ڈاکٹر صبیحہ انور لکھنؤ سے یہاں تشریف آور ہوئے تھے۔ تالیوں کی گونج کے درمیان اُنھیں بھی اعزاز سے نوازا گیا۔

ادب نواز اور ادب پرور دوست جناب ایس۔ ایس۔ براڑ ڈپٹی کمشنر لدھیانہ اس تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ اُنھوں نے اپنے دست مبارک سے ادب، فن اور صحافت کے میدان میں نمایاں کارکردگی کے لئے جناب وجے نرائن (ایڈیٹر پنجاب کیسری) جناب جتیندر بجاج (ایڈیٹر ہندستان) جناب کلدیپ سنگھ بیدی (ایڈیٹر جگ بانی) اردو شاعر نثار نیپالی، ڈاکٹر راہی پنجابی شاعر سرجیت پاتر، گوربھجن گل، سندھی ادیب پریم درج، رمیش اخلاص، جنگل کشور تیواری، گھنشیام نروبہادت، ٹی۔ ڈی۔ چاولہ، فنکار ڈاکٹر سکھ نین، شانو اور سوال، پرتھاسکھ، ستیش مہیندر، پروفیسر آئی۔ ایس۔ سلوجہ، شری ایچ۔ ایس۔ مندھ، شری ہرچند گریوال، ڈاکٹر سی۔ پی۔ سنگھ، ڈاکٹر اقبال سنگھ آہوجہ، ڈاکٹر بی۔

ایس ڈھلوں۔ شری چرنجیت سنگھ، شری ویندر سنگھ اور شری پشپال بالمیا و ڈاکٹر نیتن ملہوترہ کو اعزاز پیش کئے۔ شری براڑ نے اپنی تقریر میں کہا کہ ادیبوں اور فنکاروں کی عزت افزائی کرکے سوسائیٹی نے ایک مقدس فرض ادا کیا ہے۔ اُنھوں نے سوسائیٹی کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

اس موقعہ پر پٹیالہ ڈویژن کے کمشنر جناب امریک سنگھ پونی نے مشہور ادیب ڈاکٹر کیول دھیر کی انگریزی کتاب "بانڈز آف لو" ( ) کی رسم رُونمائی کی۔ ڈاکٹر ایس این سیوک نے ڈاکٹر کیول دھیر کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ امن کے ادیب ہیں اُن کی تخلیقات میں امن، عالمی بھائی چارے اور انسان دوستی کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر کیول دھیر اب تک پہلے پنجابی اور دوسرے ہندوستانی ادیب ہیں جنھیں انسانی بھلائی کے لئے ایشیائی ایوارڈ حاصل ہوا ہے۔ اس موقعہ پر شری پونی نے مشہور شاعر اور نقاد جناب آزاد گلاٹی کے مضامین کی کتاب "اذکار" جناب عجائب چترکار کی کتاب "آبشار" اور جناب ناقی نادری کی کتاب بھی ریلیز کی۔ اپنی تقریر میں اُنھوں نے کہا کہ موجودہ حالات میں یہ سوسائیٹی اپنی ادبی و کلچرل سرگرمیوں کے ذریعے سماج اور مُلک کی جو خدمت کر رہی ہے وہ قابلِ تحسین ہے جناب امریک سنگھ پونی نے اپنی شعری تخلیقات سے سامعین سے خوب داد حاصل کی۔

سوسائیٹی کے جنرل سیکریٹری ڈاکٹر کیول دھیر نے اپنی تقریر میں سرکار سے مانگ کی کہ لدھیانہ میں ادیبوں، فنکاروں اور صحافیوں کے لئے ایک رہائشی کالونی تعمیر کی جائے تاکہ سماج کے اس اہم طبقہ کو زندگی کی بہتر سہولیات میسر ہوسکیں۔

اُنھوں نے بتایا کہ سوسائیٹی اپنے طور پر، عوام کے تعاون سے اور اب تک بغیر کسی طرح کی سرکاری مدد کے لدھیانہ میں ایک "انٹرنیشنل آڈیٹوریم" کی تعمیر کر رہی ہے۔ اُنھوں نے اس فلاحی پروجیکٹ کے لئے عوام سے مزید تعاون کی اپیل کی۔ ڈاکٹر دھیر نے یہ بھی مانگ کی کہ اعلان شدہ "ساحر آڈیٹوریم" کی تعمیر کا کام جلد از جلد شروع کیا جائے۔ برسوں سے یہ پراجیکٹ نامکمل پڑا ہوا ہے۔ اُنہوں نے تجویز پیش کی کہ سرکار لدھیانہ میں نہایت خستہ حالت میں پڑے ساحر کے مکان کو اپنی تحویل میں لے کر یہاں اس عظیم شاعر کی مُناسب یادگار قائم کرائے۔

اس موقعہ پر دیگران کے علاوہ جالندھر دوردرشن کے ڈائریکٹر جناب ایم۔ ایل پنڈت، جالندھر ریڈیو کے ڈائریکٹر جناب پریم پرکاش سیتیا، بھاشا وبھاگ پنجاب کے ڈائریکٹر جناب راجندر سنگھ بھسین، پنجاب کلا منچ کے صدر جناب جگدیو سنگھ جسووال اور بہت سے معززین بھی حاضر تھے۔

ساحر لدھیانوی کی یاد میں اس موقعہ پر ایک مُشاعرہ اور محفلِ موسیقی کا انعقاد بھی کیا گیا جس میں جناب آزاد گلاٹی، کرشن ادیب، نثار نیپالی، عجائب چترکار، سُرجیت پاتر، گوربھجن گل اور ڈاکٹر جون اکبر راہی نے شرکت کی۔ جناب پریم پرکاش سیتیا ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو نے بھی اپنے کلام سے نوازا۔ مشہور نوجوان گلوکار ڈاکٹر سکھ نین نے اپنی مدھر آواز میں کلام ساحر پیش کرکے سامعین کا من موہ لیا

"ادیب انٹرنیشنل" کی طرف سے منعقدہ یہ ایک یادگاری تقریب تھی جسے برسوں یاد رکھا جائے گا۔

کشمیر میرے خواب میں بھی نہیں آسکتا
چہ جائیکہ اُسے دیکھا جاتا یا اُس کے
بارے میں کچھ سوچا جاتا۔

شرط

جناب خلیل انجم صاحب کا
سفرنامۂ کشمیر

جب میں پرائمری اسکول کے چوتھے درجے میں تھا تو ہمارے کورس میں ایک قومی نظم تھی جس کا یہ مصرعہ "کشمیر تیری جنت، شملہ ترا گلستاں" تبھی مجھے معلوم ہوا تھا کہ کشمیر بھی کوئی مقام ہے جسے "ارضی جنت" کہا جاتا ہے لیکن جس زمانے کی یہ بات ہے، کشمیر میرے خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا چہ جائیکہ اُسے دیکھا جاتا یا اُس کے بارے میں کچھ سوچا جاتا ـــــ آج ستمبر ۸۷ء کی گیارھویں تاریخ ہے، اور میں اپنی اہلیہ، بچوں اور بہو کے ساتھ کشمیر کے سفر پر کمربستہ ہوں۔ نسیمہ آپا بھی اپنی بہو اور بڑے صاحبزادے توحید الحق اور ننھے منے بچے جُنید، ابرار، رانی صائمہ اور منو شعیب کے ساتھ ہم سفر ہیں۔

تامل ناڈو ایکسپریس اپنے مقررہ وقت پر ہم سب کو لے کر ناگپور سے دلّی کی طرف روانہ ہوئی ہمارا ریزرویشن تھا اس لئے سفر بڑے آرام سے دلّی تک ہوا۔ ہم دوسرے روز صبح سات بجے دلّی کے اسٹیشن پر تھے۔ اسٹیشن پر ہمارا استقبال کرنے کے لئے شمیم ماموں، عادل اور عابد موجود ہیں۔ یہ تینوں ہمارے ہم وطن ہیں یہ تینوں ارشد جاوید کے آپریشن کے لئے آئے ہیں جو گووند ولبھ پنت ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ یہاں سے ہمیں جموں تک جانے کے لئے شالیمار ایکسپریس میں سفر کرنا ہے جس کے روانہ ہونے کا وقت شام میں چار بجے ہے۔ ہمارے پاس کافی وقت تھا لہٰذا ہم سب بلقیس آپا سے ملنے کے لئے اُن کی رہائش گاہ ٹیگور ہاسٹل چلے گئے۔ بلقیس آپا کو ہماری آمد کی اطلاع تھی لہٰذا اُنھیں ہماری آمد سے کوئی تعجب نہ ہُوا۔ سنیچر ہونے کی وجہ سے بھائی صاحب یعنی ظفیر الحسن صاحب بھی ہمارے منتظر ملے۔ آپا نزلہ اور زکام میں مبتلا تھیں لہٰذا ہماری بھابھی دیبا نے ساری ذمّہ داری اپنے سر لے لی نغمہ ابھی کالج سے لوٹی نہیں تھی۔ بلقیس آپا کی یہ رہائش گاہ تیسری منزل پر ہے جہاں سے جامع مسجد کا گنبد اور مینارے صاف نظر آتے ہیں۔ دلّی میں خوب گرمی پڑ رہی ہے۔ جب ہم جامع مسجد پہنچے تو ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ ظہر کی نماز ہم نے یہیں ادا کی۔ جامع مسجد کے اطراف میں گندگی دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کے منتظمین کا دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔ خاص طور سے پیشاب گھر میں اتنی گندگی ہے کہ دیکھ کر آپ پیشاب کرنا بھی بھول جائیں۔ جگہ جگہ کالے جھنڈے لگے ہوئے ہیں جو اس بات کا مظہر ہیں کہ مسلمانوں کو حکومت سے کچھ شکایتیں ہیں۔ شکایتیں اپنی جگہ درست مگر عملی طور پر بھی ہم کو اپنا جائزہ لینا چاہئے صرف نعروں اور اشتہار بازی سے قوم کے مسائل حل نہیں ہو سکتے ؎

"یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں"

شالیمار ایکسپریس میں بھی ہمارا ریزرویشن ہے مگر غازی آباد، میرٹھ، مظفر نگر وغیرہ جانے والے مسافر زبردستی ہماری سیٹوں پر بیٹھ گئے ہیں۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ ریلوے ڈیپارٹمنٹ کا کیسا نظام ہے کہ ریزرو نشستیں کرنے والے مسافر تکلیف اٹھائیں اور دوسرے مزے اڑائیں۔ ابھی پندرہ روز پہلے ہی ریلوے وزیر

کہا تھا کہ بھارت ریل کے میدان میں پاکستان کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ بہرحال ہمیں مسافروں سے گفتگو کرنا ہی اچھا تھا۔

سے [illegible] سکتے ہیں کہ آداب سفر جانتے ہیں
ہم جنگ کے میدان کو گھر جانتے ہیں"

سہارن پور کے بعد ہمیں اطمینان نصیب ہوا اور ہم لیٹ گئے۔ اب ٹرین پنجاب کے شورش زدہ علاقوں سے گزر رہی ہے، مگر کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ لوگ کسی بھی مذہب یا فرقے سے تعلق رکھتے ہوں مگر امن چاہتے ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ کچھ لوگ اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے امن میں خلل ڈالتے ہیں مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ پنجاب جیالوں اور بہادروں کا علاقہ ہے یہاں کے لوگ کسی بھی قسم کے خطرے سے نمٹنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ پنجاب کے حالات پر غور کرتے کرتے میری آنکھ لگ گئی۔

صبح سات بجے ہم جموں پہنچتے ہیں۔ سرینگر جانے والی بسیں مسافروں کی منتظر ہیں۔ ہم بھی ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر بس میں بیٹھ گئے۔

قدیم زمانے میں دو بھائی جامبو لوچن اور باہو لوچن کشمیر میں تھے۔ جامبو نے جموں شہر کو آباد کیا اور اپنی حکومت قائم کی۔ باہو لوچن نے دریائے توی کے دوسرے کنارے اپنے محلات بنائے جن میں سے باہو نامی قلعہ اب بھی موجود ہے۔ جموں پتھریلی زمین کی وجہ سے پتھروں کا شہر کہا جاتا رہا ہوگا۔ مگر قدم قدم پر مندر ہونے کی وجہ سے اسے مندروں کا شہر کہا جاتا ہے۔ خاص طور سے رگھوناتھ مندر فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہاں زیارت گاہیں بھی بہت ہیں جن میں پیر روشن شاہ ولی اور بابا بڈھن شاہ کے مزارات کافی معروف ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے قبل یہاں مسلمان بھی کافی تعداد میں تھے جس کی وجہ سے ہر محلے میں مسجد ہے جن میں سے بیشتر آج کل غیر آباد ہیں۔ جموں سے سرینگر کا سفر تقریباً بارہ گھنٹے کا ہے۔ ہم ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوئے ہیں اور رات میں ساڑھے آٹھ بجے تک سرینگر پہنچنے کی امید کر سکتے ہیں۔ بس شہر کو چھوڑ کر اب قومی شاہراہ پر چل رہی ہے۔ اور جھولنے کی طرح گھومتا ہوا پہاڑی راستہ شروع ہو گیا ہے۔ ہم اوپر کی طرف جا رہے ہیں اس لئے بس خرام ناز کی طرح دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ سامنے تا حد نظر پہاڑوں کے سلسلے در سلسلے ہیں اور نیچے دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیت نکھری ہوئی دھوپ میں بڑا دل کش منظر پیش کر رہے ہیں۔ جموں سے تیرہ کلومیٹر دور نگروٹہ نامی ایک چھوٹا سا قصبہ آتا ہے جہاں صوبہ کا ایک فوجی اسکول ہے۔ یہاں سے "تری کٹا" پہاڑیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو "جھجری کوٹلی" تک چلا جاتا ہے۔ یہ "تری کٹا" کے انہی پہاڑی سلسلوں میں شخصی حکمرانوں کے عہد میں میاں ڈیڈو جیسا قوم پرست اور وطن پرست جیالا اپنے ساتھیوں سمیت رہا کرتا تھا۔

جموں، سرینگر شاہراہ پر ادھم پور سب سے پہلا پڑاؤ ہے۔ یہ ضلع ادھم پور کا صدر مقام ہے۔ یہاں ڈگری کالج برائے مرد اور ایک ڈگری کالج برائے خواتین ہے۔ اس کے علاوہ یہاں شمالی علاقہ کی ملٹری کا سب سے بڑا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ادھم پور سے ایک گھنٹہ سفر کے بعد ایک چھوٹا سا قصبہ چھننی Chahanni نام کا آتا ہے۔ چھننی سے سڑک کا کوہستانی بل کھاتا ہوا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ راستہ ہر لمحہ بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ بس بل کھاتی پر پیچ سڑک کو پیچھے چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ نیچے کی طرف دیکھئے تو طے شدہ راستہ پتلی بل کھاتی ہوئی سانپ کی لکیروں کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح بس پٹنی ٹاپ کی پرجمال رفعت کی قدم بوسی کرتی ہے۔ پٹنی ٹاپ دیودار کے درختوں سے گھری ہوئی جگہ ہے اور یہاں تک بس نے جس طرح لمحہ بہ لمحہ رفعت حاصل کی ہے اب یہاں سے بس نشیب حاصل کرنا شروع کرتی ہے۔

دونوں جانب سے سیب اور دیگر پھلوں کی معطر بو ایک نشہ طاری کر دیتی ہے۔ سیب کی فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ سیب اس طرح لدے ہوئے ہیں جس طرح ہمارے یہاں بیری کے درختوں میں بیر لگتے ہیں۔ "بٹوٹ" راستے کا دوسرا اور اہم پڑاؤ ہے۔ یہاں بس رک گئی ہے۔ مسافر یہاں کھانا کھاتے ہیں۔ ہم بھی ایک ہوٹل میں طعام کی غرض سے بیٹھ گئے ہیں۔ تقریباً نصف گھنٹے کے بعد بس پھر روانہ ہو گئی ہے۔ بٹوٹ سے سرینگر کے راستے میں "رام بن" اور "بانہال" دو خاص پڑاؤ آتے ہیں۔ بانہال میں جواہر سرنگ مسافروں کی توجہ کا مرکز ہے۔ یہ سرنگ بھارت کی سب سے لمبی سرنگ ہے جس کی لمبائی ڈھائی ہزار میٹر سے کچھ زیادہ ہے۔ اس سرنگ کی تعمیر ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔ جس کی تعمیر سے تقریباً چالیس کیلو میٹر کا فاصلہ سمٹ گیا ہے۔ سرنگ کو پار کرتے ہی ہم وادیٔ کشمیر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ "قاضی گنڈ" راستے کا تیسرا پڑاؤ ہے۔ یہاں سے سری نگر کا فاصلہ تقریباً ساٹھ کیلو میٹر ہے۔ یہاں سے راستے میں کوئی موڑ یا پیچ نہیں ہے، بلکہ سیدھا راستہ ہے۔ بس اب تیز رفتاری سے چل رہی ہے۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی جا رہی ہیں۔ اننت ناگ سے گزرنے لگے تو بالکل اندھیرا چھا گیا۔ بچے طویل سفر سے اوب گئے ہیں۔ بار بار سوال کر رہے ہیں کہ اب کتنا فاصلہ رہ گیا ہے؟ بس میں خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اچانک ملشو کی آواز آئی۔

"امی گھر چلو! کشمیر نہیں آ رہا ہے"۔

ننھے بچے کی اس سادگی پر تمام مسافروں میں ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ خیر خدا خدا کر کے بس سرینگر کے لال چوک پر پہنچی۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بج چکے ہیں۔ سردی زیادہ تو نہیں ہے پھر بھی چہل پہل نہیں ہے۔ ہم نے اپنی پھوپی آپا یعنی ڈاکٹر شفیقہ پروین کو اپنی آمد کی اطلاع تو دے دی تھی تاہم اتنی رات میں ان کے یہاں جانا ہم نے مناسب نہیں سمجھا۔ لہٰذا ہم اپنا سامان

[illegible] بس پہنچے تے یہاں ہیں بڑا سکون ملا۔ توحید اور سہیل ہوٹل سے کھانا لے کر آگئے۔ ہم سب نے خوب سیر ہو کر کھایا اور آرام سے سو گئے۔ دوسرے روز صبح ہم سامان اٹھا کر ناصر بھائی یعنی ڈاکٹر شفیقہ پروین کے چھوٹے بھائی سرائے پائین میں گئے تو ناصر بھائی ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ چھوٹی آپا گھر پر نہیں ہیں۔ وہ اپنے شوہر ڈاکٹر اشرف میر صاحب کے پاس کسی دیہات میں ہیں۔ ناصر بھائی نے فوراً ہماری آمد کی اطلاع فون پر چھوٹی آپا کو دیدی ہے جو شام تک پہنچ جائیں گی۔

آج صبح ہم نے مغل گارڈنز کی سیر کا پروگرام بنایا ہے۔ کشمیر کا موسم بڑا سہانا ہے دھوپ نکھری ہوئی ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ سیاحوں کی آمد آمد ہے۔ بس میں حسب معمول بھیڑ ہے۔ ڈل گیٹ سے نکلتے ہی ہم سب کی نگاہیں ڈل جھیل پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ آہ! کیا خوبصورت منظر ہے۔ ہرے ہرے نیلے نیلے پانی میں ڈولتے ہوئے رنگ برنگی شکارے سڑک کے دائیں بائیں پیدل سیر کرنے والوں کی کثیر تعداد نے ماحول کو اور بھی خوشگوار بنا دیا ہے۔ ہم پہلے شالیمار باغ پہنچے یہاں سیاحوں کی بھیڑ بہت لگی ہیں۔ نرم گھاس پر دسترخوان بچھایا اور کھانا کھایا۔ موسم خوشگوار ہو کھانے کا لطف اور بڑھ جاتا ہے۔ طعام سے فارغ ہو کر کیمرے لے کر بچوں کی تصویریں لیں۔ تقریباً دو گھنٹے کی تفریح کے بعد ہم نشاط گارڈن پہونچے۔ نشاط گارڈن شالیمار سے زیادہ خوبصورت ہے۔ یہاں سیب کے کچھ درخت بھی ہیں۔ یہاں بھی کچھ تصویریں لی گئیں۔ یہاں سے چشمہ شاہی پہونچے تو شام ہو گئی۔ چشمہ شاہی بھی قابل دید باغ ہے۔ اس چشمہ کا پانی پیٹ کی بیماری کے لئے مفید ہے۔ کہتے ہیں پنڈت جواہر لال نہرو کے لئے پینے کا پانی اسی چشمے سے مہیا کیا جاتا تھا تاہم جہاں تک شالیمار، نشاط اور چشمہ شاہی کا تعلق ہے مجھے کشمیر بحیثیت مجموعی بہت پسند اور دلکش لگتا ہے

مگر میں علامہ اقبال کے اس شعر کا قائل ہوں کہ ؎

"کشمیری کہ با بندگی خوگرفتہ
بتے می تراشد ز سنگ مزارے"

قدرت نے کشمیر کو حسن کی دولت سے مالا مال ضرور کیا ہے، مگر انسان اسے پامال کر رہا ہے۔ قدم قدم پر کئی بُت خانقاہوں، مزاروں اور تکیوں کی صورت میں کھڑے ہیں کہ ہم اللہ کو چھوڑ کر انسانوں اور وہ بھی مُردہ انسانوں کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ رات میں تقریباً دس بجے واپس لوٹے۔ ابھی ہم سب کپڑے بدل کر بیٹھے ہی تھے کہ ہماری میزبان یعنی بھابی کمرے میں آگئیں۔ بھابی یعنی مسز ناصر سے یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ بڑے تپاک سے وہ ہم سب سے ملیں۔ بچوں کو گود میں لے کر اتنا پیار کیا کہ بچے گھبرا گئے۔ بھابی درمیانے قد کی، خوبصورت اور منس مکھ ہیں۔ یہ کہنا کہ کشمیری لڑکیاں حسن و خوبی کا مرقع ہیں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہے۔ کشمیری لڑکیوں کو دیکھ کر جوش ملیح آبادی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

"پڑھ کر وہ فاتحہ جو کسی سمت پھر گئی
اک پیر کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی"

بھابی ہم سب کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ خوش مزاج کے ساتھ خوش لباس بھی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں چھوٹی آپا بھی آگئیں۔ وہ بھی ہم سب سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ سفر اور سیر و تفریح کی داستان سننے کے بعد وہ بہت دیر تک ہمارے پاس بیٹھی رہیں۔ اس دوران سہیل، عاطف اور شاداب غزلوں اور لطیفوں سے محظوظ کرتے رہے۔ چھوٹی آپا سے میری پہلی ملاقات ۲۳ ستمبر ۱۹۸۴ء کی صبح یہیں اُن کی شادی میں ہوئی تھی۔ وہ آج بھی اسی طرح شگفتہ پھول کی طرح نظر آرہی تھیں۔ ہم سب نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنی غزلوں کے کچھ شعر سنائیں مگر وہ ٹالتی رہیں۔ تاہم مجھے ہی اُن کی غزل کے یہ شعر سنانے پڑے ؎

"میں اپنے آپ میں بنتی بکھرتی رہتی ہوں
اگرچہ سخت ہے یہ کام کرتی رہتی ہوں
[illegible] جو وقت نے کردیا [illegible]
میں موج آب ہوں پر تشنگی سے ڈرتی ہوں
زمانہ ڈھونڈتا ہے ہاتھ میں لئے سورج
میں ہر مقام سے تنہا گزرتی رہتی ہوں
ہر ایک سمت سے آتے ہیں زخم کے پتھر
تمہارے شہر سے پھر بھی گزرتی رہتی ہوں"

آج ۱۶ ستمبر ہے۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر لال چوک آئے اور بس پکڑ کر نہرو پارک کی طرف رواں ہوئے۔ آج ڈل جھیل کی سیر کا پروگرام ہے تقریباً دو گھنٹے ہم دو گروپ میں دو شکاروں پر بیٹھ کر ڈل جھیل کی سیر کا لطف اٹھاتے رہے۔ سیر سے فارغ ہو کر دوپہر کا کھانا ہوٹل میں کھایا۔ یہاں سے لال چوک ہوتے ہوئے حضرت بل پہنچے۔ حضرت بل کا گنبد اور مینارہ مسجد نبوی کے نمونے پر بنایا گیا ہے اور فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ بہت سے غیر مسلم بھی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ پاس ہی نسیم باغ میں شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی آخری آرام گاہ ہے۔

آج ۱۷ ستمبر ہے۔ آج پہلگام جانے کا پروگرام ہے۔ ہم صبح ہی ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر بس اسٹینڈ پہنچے۔ بس میں جگہ آسانی سے مل گئی۔ بس میں ابن علی خاں اور ان کے ہمنواؤں سے ملاقات ہوئی ہے جو رام پور کے رہنے والے ہیں ابن علی خاں تقریباً آٹھ برس سے سرینگر ہی میں ہیں۔ اُن کا قالین بنانے کا کارخانہ ہے۔ بڑے مخلص اور ادب نواز شخص ہیں۔ تقریباً گیارہ بجے ہم پہلگام پہنچے۔ پہلگام اپنے بے مثال قدرتی مناظر کی وجہ سے کشمیر کا حسین ترین علاقہ ہے۔ نکھری ہوئی دھوپ اور خرام ناز کی طرح چلتی ہوئی ہواؤں نے موسم کو بہت خوشگوار بنا دیا ہے۔ پہاڑوں کے دامن سے بہتا ہوا چشمہ سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ کھانا بنانے کا سامان ساتھ لے کر آئے ہیں لہٰذا ہماری بھابی ناصر اور آپا سعد کو لے کر کھانا بنانے میں مصروف ہیں اہلیہ اور نسیم آپا کپڑے دھونے لگ گئیں [illegible]

مہمانوں کی تیاری کرتے گئے۔ گلمرگ میں ہم جب اپنے اپنے کیمرے تیار کر کے تصویریں کھنچوانے میں مصروف تھے۔ بچوں نے گھوڑوں پر خوب سیر بھی کی۔ اسی سلسلے اور سوچ مستی میں پانچ بجنے لگے تو ہم بس اسٹینڈ کی طرف آ گئے۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے ہماری بس واپسی کے لئے روانہ ہوئی۔ ہم ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے لال چوک پہنچ گئے۔ آج بس میں ہمیں چھوٹی آپا نے ایران سے کچھ واقعات سنائے جن سے وہ وابستہ رہیں۔ سال گذشتہ وہ ماہ کی چھٹی لے کر اپنے شوہر ڈاکٹر محمد اشرف میر صاحب کے پاس ایران میں رہیں۔ ہم سب مزے لے لے کر اُن کی باتیں سن رہے تھے۔ دراصل اُن کا اندازِ بیان اتنا پیارا ہے کہ سننے والا کھو جاتا ہے۔

آج ۱۸ر ستمبر ہے اور جمعہ کا مبارک دن — سری نگر میں آج ہمارا آخری دن ہے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر نسیمہ آپا، اہلیہ، عارفہ اور آصفہ کو لے کر میں نوا کدال چلا گیا۔ یہاں سیدہ نسرین نقاش سے ملاقات نہیں ہو سکی تو رشید بھائی اور واجدہ باجی اور اُن کی بچی سوزانہ تبسم سے ملنے ہم عالی کدل چلے گئے۔ رشید بھائی اور واجدہ باجی نے پہلے ہی ہمیں تار کے ذریعہ مطلع کر دیا تھا کہ وہ دونوں ان دنوں کشمیر میں نہیں ملیں گے۔ یہ سوچ کر کہ چلو سوزانہ سے ہی ملاقات ہو جائے گی۔

مگر مایوسی ہوئی۔ سوزانہ اپنی خالہ کے یہاں رعنا واری میں ہے۔ البتہ یہاں رشید بھائی کی والدہ اور اُن کی دونوں بھابیوں سے ضرور ملاقات ہوئی یہاں سب نے نہایت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ اُن کا اصرار تھا کہ ہم دوپہر کا کھانا کھا کر جائیں مگر ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو دونوں بھابیاں ہماری رہنمائی کرتی ہوئی مین روڈ اسٹینڈ تک آئیں۔ یہی کشمیریوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے کے لئے دور تک آتے ہیں خواہ میزبان مرد ہو یا خاتون۔

جمعہ کی نماز ہم نے سرائے پائین کی مسجد میں ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر توحید، سہیل، عائشہ، عارفہ، آصفہ اور میں رام پور والے ابن علی خاں صاحب کے ہاں گئے۔ یہاں ابن علی خاں کے علاوہ محترم نصیر احمد خاں صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ دونوں حضرات شعر و شاعری سے گہرا شغف رکھتے ہیں لہٰذا تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک محفلِ شعر و سخن گرم رہی۔ اس محفل کی یاد ہمیشہ قائم رہے گی۔

آج ۱۹ر ستمبر ہے۔ ہم سب اپنے میزبانوں سے مل کر اپنے دلوں میں خلوص اور بھائی چارے کی شمع جلا کر رخصت ہو رہے ہیں۔ سورج آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا ہے اور جہلم حسبِ معمول اسی شان و شوکت کے ساتھ رواں دواں ہے۔ لال چوک پر جموں جانے والے مسافروں کا ہجوم ہے۔ بس ٹھیک آٹھ بجے روانہ ہوئی۔ قاضی گنڈ، بانہال، رام بن وغیرہ ہوتی ہوئی بس جب جموں پہنچی تو رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ ہمارا ریزرویشن ۲۰ر ستمبر کا شالیمار ایکسپریس سے ہے لہٰذا طعام سے فارغ ہو کر ہم جموں اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ہی بستر لگا کر سو گئے۔

آج اتوار ہے اور ستمبر کی ۲۰ر تاریخ ہم صبح ہی نہا دھو کر اپنے دوست پروفیسر محمد اسد اللہ وانی صاحب سے اُن کی رہائش گاہ گاندھی نگر میں ملنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ بچوں کے استفسار پر جب ہم نے انھیں بتایا کہ اسد اللہ صاحب کے یہاں ٹی وی بھی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اتوار کے روز بچے ٹی۔ وی پر "رامائن" دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ حسبِ معمول وانی صاحب اور شمیم بھابی بڑے خلوص کے ساتھ ہم سب سے ملے۔ اُن کے دونوں بچے یاسر اور ناصر بھی ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ہم سب ضروریات سے فارغ ہو کر ٹی۔ وی کے سامنے بیٹھ گئے۔ شمیم بھابی نے اس دوران چائے اور بسکٹ سے ہماری تواضع کی۔ 'رامائن' کے اختتام پر ہم نے اُتارے ہوئے کپڑوں کے دھونے کا پروگرام بنایا۔ شمیم بھابی نے ہم سب کے لئے دوپہر کا عمدہ کھانا بنایا جسے ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ طعام کے بعد ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ تقریباً پانچ بجے ہم اسٹیشن کی طرف کوچ کر گئے۔ ہماری ٹرین کے روانہ ہونے کا وقت ۶ بجے کا تھا مگر یہاں بھی قسمت سے ہمارا ریزرویشن ہے لہٰذا ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اسد اللہ صاحب اسٹیشن تک ہمارے ساتھ آئے اور ٹرین چھوٹنے سے کچھ دیر پہلے وہ ہم سے رخصت ہو کر چل دیئے۔ اب دیکھئے ان سے کب ملاقات ہوتی ہے۔

آج ستمبر کی ۲۱ر تاریخ ہے۔ ٹرین ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے نیو دلی کے اسٹیشن پر پہنچی۔ دوپہر کا کھانا ہم پاس کے ہوٹل ہی میں کھاتے ہیں بعد نماز سرکاری مسجد کے مسافر خانے چلے جاتے ہیں جو ہسپتال کے پاس ہی ہے۔ یہاں کا معقول انتظام ہے۔ شمیم ماموں، عابد اور عادل پہلے ہی سے موجود ہیں۔ یہاں ہر چیز کی سہولت۔ معلوم ہوا کہ ارشد جاوید کا آپریشن ۲۴ر ستمبر کو ہے لہٰذا ہم نے طے کر لیا کہ آپریشن کے بعد ہی یہاں سے واپس ہوں گے میں دوسرے روز آگرہ کے لئے روانہ ہو جاتا ہوں تاکہ وہاں سے ۲۶ر یا ۲۷ر ستمبر کو کسی مناسب ٹرین سے ناگپور تک ریزرویشن مل جائے مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تاہم آگرہ میں اپنے دوست بہار اکبر آبادی سے ضرور ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو انھوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ اُن کی ۲۹ر نومبر ۱۹۸۶ء کو فیروز آباد میں ہو چکی ہے پندرہ روز پہلے ہی وہ ایک عدد بچی یعنی "فائزہ" کے باپ بھی بن چکے ہیں۔ ہم نے ایک ساتھ اُنھیں ایک بیوی کا شوہر اور ایک بچی کا باپ بننے پر مبارکباد دی۔ بہار اکبر آبادی مشاعروں کے کامیاب شاعر ہیں۔ ہماری فرمائش پر اُنھوں نے تازہ غزلوں کے کچھ اشعار سنائے۔ اُن کی ایک غزل کے چند شعر یوں ہیں۔

خراب و شعر کی فطرت میں ڈھل کے آئے ہیں
جو لوگ تیری گلی سے نکل کے آئے ہیں

ہماری آبلہ پائی کی داد دو، لوگو!
تمہارے شہر میں شعلوں پہ چل کے آئے ہیں

رواج و رسم کے قاتل، سماج کے دشمن
تمہاری بزم میں بھیس بدل کے آئے ہیں

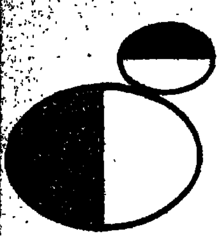
یہ لوگ جن کو فرشتے سمجھ رہے ہیں عوام
چمن سے سینکڑوں کلیاں مسل کے آئے ہیں

رات میں جب ہم اپنی رہائش گاہ یعنی مسافر خانہ پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے۔ جب ہم نے یہ خبر سنائی کہ ریزرویشن نہیں ہوا تو سب کے چہرے مرجھا گئے۔ مجبوراً ہمیں دوسرے روز صبح جا کر نئی دلی سے ہی ریزرویشن کروانا پڑا مگر ہمیں ۲۷ ستمبر کا ریزرویشن ملا۔ یہاں نئی دلی میں ریزرویشن کا بڑا اچھا طریقہ ہے کاؤنٹر نمبر ۱۰۵ سے لے کر ۱۴۹ نمبر کے کاؤنٹر پہ آپ کسی بھی گاڑی کا اور کسی بھی اسٹیشن کا ریزرویشن کروا سکتے ہیں اور کاؤنٹر نمبر ۱۳۶ خواتین کے لئے مخصوص ہے۔ تمام کاؤنٹروں پر قبول صورت اور پری چہرہ لڑکیوں یا خواتین کو بٹھا دیا گیا ہے تاکہ لائن میں کھڑے ہوئے امیدوار زیادہ بور نہ ہوں تاہم اُن پری چہروں کے کام کی رفتار سست ہے ابھی صبح کا وقت ہے۔ نہ جانے دوپہر اور شام کے وقت کیا عالم ہوتا ہوگا۔

آج ۲۴ ستمبر ہے، یعنی ارشد جاوید کے آپریشن کی تاریخ۔ ہم صبح ہی سے ارشد جاوید کے کمرے میں جمع ہیں اور اسے تسلی دے رہے ہیں۔ تقریباً دس بجے ارشد کو اسٹریچر میں ڈال کر آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ سب کے دل زور زور سے دھڑک رہے ہیں اور دل ہی دل میں خیر و عافیت کی دُعائیں مانگ رہے ہیں۔ مگر نصف گھنٹہ بعد ہی ارشد کو آپریشن تھیٹر سے واپس لوٹا دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی بہت ہی زیادہ ایمرجنسی کیس اس درمیان آگیا تھا جس کی وجہ سے یہ آپریشن ملتوی کرنا پڑا۔ نہ جانے اس میں خدا کی کیا مصلحت تھی۔ بہرحال گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مزید ہسپتال میں رہنے کے بعد ہم سب آرام گاہ میں لوٹ آئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم سب نے "گولچہ ٹاکیز" میں فلم "جان ہتھیلی پہ" دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ گولچہ ٹاکیز یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ٹکٹ تو آسانی سے مل گیا مگر فلم بے جان تھی۔ سینما حال سے نکل کر ہم سب سامنے انصاری مارکیٹ میں مدیر "نشانِ ہند" محترم سرور تونسوی صاحب کے یہاں چلے گئے۔ سرور صاحب روحی مجابی اور سلطانہ صحرائی صاحب آفس میں ہی موجود تھے۔ بڑے خلوص کے ساتھ ہمارا خیر مقدم ہُوا۔ اہلیہ، بچوں اور ہم سے مل کر وہ سب بہت خوش ہوئے۔ سرور صاحب بڑے زندہ دل آدمی ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم نے انہیں اُن کی تصنیف "کوئے یار" کی اشاعت پہ مبارکباد دی۔ اُن کی زبانی یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ کتاب کی قیمت ایک سو روپے ہونے کے باوجود لوگ خرید کر پڑھ رہے ہیں اور محظوظ ہو رہے ہیں۔ سرور صاحب سے مل کر غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

"بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جہاں میں"

اُن کی موہ لینے والی باتوں سے ہم بھی بہت متاثر ہوئے۔ خدا انہیں شاد و آباد رکھے۔ آمین!

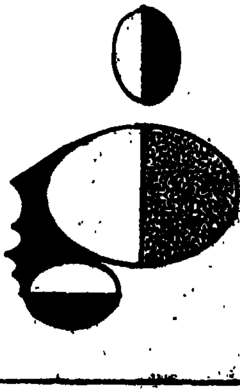


غزل

رئیس امروہوی

کراچی، پاکستان

میں اُن کو بھول کے اپنی تلاش میں گم ہوں
یہ وہ مقامِ طلب ہے جہاں خرد نہ جنوں
سما گئی ہے نظر میں یہ کس کی وضعِ جمیل
بدل رہا ہے زمانہ لباسِ گونا گوں!
نمو کا جوش ہوا صاحبِ رنگ و بُو ورنہ
عجب نہ تھا کہ اُبلتا زمیں سے چشمۂ خوں
یہ کیا کہ چہرۂ حق جب بھی بے نقاب ہوا
فسوں زدوں کو نظر آئے خدّ و خالِ فسوں
ستارۂ سحر و شمعِ نیم شب کی قسم
یہاں فروغِ بروں ہے بقدرِ سوزِ دروں
یہ نازِ حُسن ہے یا امتحانِ عشق اے دوست
کہ تیرے ساتھ رہوں اور تجھ کو پا نہ سکوں
ریاضِ ابر سے اے دوست سرسری نہ گزر
روش روش ہے تحیّر فروش و بوقلموں
ہر ایک گُل کی جبیں پر لکھا ہوا ہے "کیا؟"
ہر ایک غنچے کے دل پر کھدا ہوا ہے "کیوں؟"
بس ایک آگ ہے جو حُسن میں ہے گرمیٔ ناز
مزاجِ عشق میں ٹھہرے اگر تو سوزِ دروں
زمانیں یاد ہیں لاکھوں حکایتیں لیکن
کوئی سُنے تو سناؤں کوئی کہے تو کہوں



[illegible] ہم سب [illegible] تاج محل [illegible] میں۔ مہاتما گاندھی کی سادگی دیکھ کر [illegible] بانیاں یاد آجاتی ہیں۔ آہ! ہماری [illegible] نے کیسے کیسے انمول رتن پیدا کئے ہیں [illegible] اُن کی قربانیوں کی کوئی قیمت نہیں ہے [illegible] اپنے محترم کریم الاحسانی صاحب کا یہ شعر [illegible] آتا ہے ؎

ہم شہیدوں کے ذکر پہ اب بھی
سر جھکاتے تو ہیں مگر رسماً

جمعہ کی نماز کے لئے توحید اور میں خواجہ میر درد بستی چلے گئے۔ پاس ہی ٹیگور ہاسٹل میں بلقیس آپا سے بھی ملاقات ہو گئی۔ شام میں ہم سب صدر بازار چلے گئے۔ بچوں کے لئے کچھ کھلونے وغیرہ خرید کر جب ہم واپس اپنی قیام گاہ آئے تو رات کے دس بج چکے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ مسافر خانے میں ٹھہرنے والے مسافر ایک دوسرے سے بڑی محبت اور بھائی چارگی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے ہمدردی جتاتے ہیں۔ نہ یہاں چوری کا ڈر ہے اور نہ ہی کسی سے غیر فرقہ وارانہ حرکت کا امکان۔ یہ سب نرسری مسجد کے پیش امام صاحب اور مسافر خانہ کمیٹی کے ذمہ دار عہدیداران کی نیک نیتی اور رواداری کا نتیجہ ہے۔

آج سنیچر ہے اور ستمبر کی ۲۶ تاریخ ۔ ہم سب صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر بہائی ٹمپل دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ بس کے ذریعے جب یہاں پہنچے تو صبح کے گیارہ بج چکے تھے۔ بہائی ٹمپل سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے جس کا ڈیزائن کنول کے پھول کی طرح ہے۔ اس ٹمپل کو قومی یکجہتی کا نمونہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں گیتا بھی ہے، قرآن بھی ہے اور بائبل بھی۔ یہاں سے جب واپس ہوئے تو دوپہر کے ڈیڑھ بج چکے تھے۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر ہم نے کھانا کھایا اور آرام کیا۔ شام میں بلقیس آپا کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں ہماری ملاقات ڈاکٹر شکیل الرحمان سے ہوئی جو آج ہی صبح کشمیر سے یہاں پہنچے ہیں۔ پھر کیا تھا، فوراً شعری ادبی نشست کا انعقاد عمل میں آیا۔ بھائی ظفیر الحسن صاحب، بلقیس آپا اور ہم نے باری باری اپنی غزلیں سنائیں۔ ڈاکٹر صاحب سے شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت ہوئی۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کا باقاعدہ انٹرویو بھی لیا جسے جلد ہی کسی معیاری رسالہ میں شائع کروایا جائے گا۔ یہ انٹرویو ہر اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہو گا۔

آج اتوار ہے اور ستمبر کی ۲۷ تاریخ یا یوں کہیے سفر کا آخری دن ___ نسیمہ آپا، توحید، صبیحہ، سُہیل، عائشہ اور بچے صبح ہی آگرہ چلے گئے ہیں۔ اہلیہ، عارفہ، آصفہ، شاداب، عاطف اور میں رہ گئے ہیں کیونکہ ہم سب آگرہ اور تاج محل دیکھ چکے ہیں۔ میں صبح عاطف کو لے کر جامع مسجد کی طرف نکل جاتا ہوں۔ مُدیر "خاتونِ مشرق" توفیق فاروقی سے ملاقات کا ارادہ ہے۔ مگر اُن کا دفتر بند ملا۔ سوچا اُردو بازار میں اُن کے دولت کدہ میں وہ ضرور ملیں گے مگر وہاں اُن کی بھابی افسر جہاں صاحبہ کی زبانی معلوم ہوا کہ توفیق صاحب جامعہ نگر میں رہتے ہیں۔ افسر جہاں صاحبہ نے جس خلوص کا مظاہرہ کیا اُس سے ہم بے حد متأثر ہوئے اور فاروقی گھرانے کی مہمان نوازی کی یاد تازہ ہو گئی۔ پانچ سال قبل اسی دولت کدہ میں پہلی دفعہ ملاقات محترم عبداللہ فاروقی مرحوم سے ہوئی تھی جس کی یاد آج بھی باقی ہے۔ چلتے چلتے کچھ دیر کے لئے ہم محترم سرور صاحب کے یہاں بھی چلے گئے، خدا معلوم پھر ایسے مخلص اور زندہ دل لوگوں سے کب ملاقات ہو ___! دیکھا تو سرور صاحب، روحی بھابی اور مُطرب صاحب ٹی وی پروگرام سے لُطف اندوز ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم سب سے اجازت لے کر واپس ہو گئے۔

شام میں ہم سب ایک گھنٹہ قبل اسٹیشن پہنچ گئے۔ ٹرین اپنے مقررہ وقت پر روانہ ہوئی۔ آگرہ کینٹ اسٹیشن پر نسیمہ آپا وغیرہ مل جاتے ہیں اور پھر اطمینان سے ہم سب آرام کرتے ہوئے ۲۸ ستمبر کی صبح تقریباً بارہ بجے ناگپور پہونچتے ہیں اور جب اپنے گھر کامٹی پہنچے تو دوپہر کے تین بج چکے تھے۔ اس طرح کشمیر کا یہ سفر جو ۱۱ ستمبر کی دوپہر میں شروع ہوا تھا، ۲۸ ستمبر کی دوپہر کو اختتام کو پہنچا۔ ہم سب خدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ ہنسی خوشی سفر کا آغاز بھی ہوا، اور اختتام بھی!

●

غزل

سوہن راہی

شکوہ نہ کرو یاروں سے یاروں کی جفا کا
جینا ہے تو رُخ دیکھو زمانے کی ہوا کا
ہر کوئی تو مخلص نہیں، ہر کوئی نہیں دوست
ہر ایک سے کیوں مانگتے ہو قرض وفا کا
زخموں کی بھی سوغات تو سب کو نہیں ملتی
ایسے تو کرم ہوتا نہیں سب پہ خدا کا
الزام نہ دو کوئی بُرا کتنا ہو، راہی
فرصت جو ملے نام پڑھو اپنے گنہ کا



کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

سٹی مجسٹریٹ

یوں تو دہلی کی زندگی کا ایک ایک دن اپنی یادیں میرے دل پر نقش کئے ہوئے ہے لیکن سٹی مجسٹریٹی کے زمانے کے چند واقعات قابلِ ذکر ہیں۔

میں دو اڑھائی برس تک دہلی میں سٹی مجسٹریٹ رہا۔ یوں تو دہلی کی زندگی کا ایک ایک دن اپنی یادیں میرے دل پر نقش کئے ہوئے ہے۔ لیکن سٹی مجسٹریٹی کے زمانے کے چند واقعات قابلِ ذکر ہیں ایک دفعہ میری عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں ایک تھانیدار نے ایک نوجوان ملزم کو آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ اُس کا بیان تھا کہ وہ رات کو اپنے علاقہ جنگلی قبر میں گشت کر رہا تھا کہ اُسے ملزم ایک دیوار کے ساتھ چپکا ہوا دکھائی دیا اور جب تھانیدار نے ٹارچ اُس کی طرف کی تو وہ بھاگ نکلا۔ تھانیدار نے اس کا تعاقب کیا اور اُسے گرفتار کر لیا۔ ملزم سے اِن حالات میں اس کی وہاں موجودگی کی وجہ دریافت کی گئی لیکن وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اُس کی تلاشی لی گئی تو اُس کی جیب میں سے ایک موم بتی ایک دیا سلائی اور ایک بلیڈ برآمد ہوا جس سے تھانیدار کو سو فی صدی یقین ہو گیا کہ وہ ملزم وہاں واردات کرنے کی نیت سے کھڑا ہوا تھا۔ میں نے تھانیدار کا بیان قلمبند کرنے کے بعد اُس سے کہا کہ میرے ساتھ چلو۔ ملزم اور اُس کے وکیل کو بھی ساتھ لیا۔ عدالت میں کئی اور وکلاء اور سائل تھے اُن کو بھی ساتھ لیا۔ عدالت کے کمرے سے کچھ تھوڑی دُور بیلا روڈ تھی جہاں اس وقت آبادی نہیں تھی۔ جب میں اُن سب کو لے کر اُدھر چلا تو سینکڑوں لوگ ساتھ ہو لئے کہ کیا تماشہ ہونے والا ہے۔ جب ہم سب بیلا روڈ پہنچ گئے تو میں نے تھانیدار اور ملزم سے آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ جب وہ دونوں مجھ سے الگ ہو کر آگے بڑھے تو میں نے تھانیدار سے کہا کہ ملزم کو اب میں بھاگنے کے لئے کہتا ہوں آپ اِس کا تعاقب کر کے اسے پکڑ لیں۔ ملزم چھریرے بدن کا نوجوان تھا، تھانیدار فربہ، جسیم اور معمر تھا۔ حیلہ بہانہ کرنے لگا۔ میں نے کہا آپ تو کہتے تھے کہ ملزم کو آپ نے دُور سے ٹارچ جلا کر دیکھا اور آپ کے للکارنے پر وہ بھاگ نکلا۔ وقت بھی رات کا تھا اور آپ نے اس کا تعاقب کر کے اسے گرفتار کیا۔ اور اب تو روزِ روشن ہے اور ملزم بھی آپ سے دُور نہیں ہے اسے بھاگنے دیجئے اور آپ اُس کا تعاقب کر کے اسے پکڑ کر دکھایئے۔ تھانیدار اب کیا کرتا۔ ساری کارروائی تو فرضی ہی تھی، خاموش ہو کر نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ میں سب کو عدالت میں واپس لے آیا اور آتے ہی ملزم کو بری کر دیا۔

ایک اور مقدمہ میں دو ملزم میری عدالت میں پیش کئے گئے، بلکہ یوں کہئے کہ وہ کئی بار کئی عدالتوں میں پیش کئے جا چکے تھے۔ وہ پڑوسی تھے اور کسی نہ کسی بات پر ہر روز جھگڑتے رہتے تھے اور کئی بار تھانہ تھانے تک نوبت آ جاتی تھی۔ گلی محلے والے سب اُن سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ لیکن محض ہاتھا پائی کوئی ایسا جُرم نہیں ہے جس میں پولیس دست اندازی کر سکے البتہ وہ اُن کو اندیشۂ نقضِ امن میں کبھی کبھی گرفتار کر لیتی تھی لیکن وہ عدالت میں آتے ہی راضی نامہ کر لیتے تھے اور بیان دیتے تھے کہ ہمیں ایک دوسرے سے کوئی اندیشۂ نقضِ امن نہیں ہے۔ ایسے بیان کے بعد عدالت کے لئے سوائے مقدمہ خارج کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ میری عدالت میں بھی انہوں نے یہی بیان دینا چاہا۔ میں نے ان سے کہا کہ بیان تو تمہارا بعد میں لکھا جائے گا پہلے

[illegible] آپ کا نقصان ہو جاتا
[illegible] میں فریقین اطاعت کریں
[illegible] آپ کا خاندان دیکھیں گے اور کوئی دخل نہیں
[illegible] گے۔ وہ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ میں
نے کہا "میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ آج آپ کو ایسا
کرنا ہی ہوگا ورنہ تاریخوں پہ تاریخیں دیتا جاؤں گا
[illegible] شام تک عدالت کے باہر حاضر رہنا پڑے گا
[illegible] دونوں کا سارا روزگار غائب ہو جائے گا۔ وہ
[illegible] ہو کر نظریں جھکا کر کھڑے رہے میں
نے [illegible] دن کی تاریخ دے دی۔ جب اگلے دن
حاضر ہوئے تو شام تک بٹھایا اور اگلے دن کی تاریخ
دے دی۔ جب ایک ہفتہ تک یہی عمل جاری رہا
تو دونوں اپنے بیوی بچوں سمیت میری کوٹھی پر آئے
اور کہنے لگے کہ اب ہماری واقعی صلح ہو گئی ہے آئندہ
ہم شکایت کا کوئی موقعہ نہیں دیں گے۔ اس کے
بعد میں کافی عرصہ تک سٹی مجسٹریٹ رہا لیکن ان
کی کوئی شکایت میرے پاس نہیں آئی۔ ایک روز
چاندنی چوک میں اتفاق سے مل گئے۔ دونوں ساتھ
ساتھ گھوم رہے تھے۔ کہنے لگے اب ہم میں واقعی صلح
ہو گئی ہے اور ہم نے کاروبار بھی مشترک کر لیا ہے، اور
ہمارا جی چاہتا ہے کہ آپ ایک بار ہمارے گھر آئیں
میں نے وعدہ کیا کہ آؤں گا۔ چنانچہ میں حسب وعدہ
ان کے گھر گیا۔ انھوں نے سب محلے والوں کو بھی مدعو
کر رکھا تھا۔ سبھی نے ان کی تعریف کی اور کہا کہ اب
یہ واقعی اچھے پڑوسی اور شہری بن کر زندگی گزار
رہے ہیں اور ان کی وجہ سے محلے میں بھی امن سکون
کا عالم ہے۔

ایک بار میری عدالت میں ایک درخواست
پیش ہوئی۔ درخواست پیش کرنے والے نے تحریر
کیا کہ مجھے فلاں فلاں لڑکی سے محبت ہے اور وہ بھی
مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اس کے گھر والے
اس کی مرضی کے خلاف اسے گھر میں روکے ہوئے
ہیں۔ اسے عدالت میں بلوا کر اس کا بیان لیا جائے
کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ ایسی درخواست میں اگر
مجسٹریٹ کی تسلی ہو جائے تو زیر دفعہ ۱۰۰ ضابطہ
فوجداری وارنٹ نکال کر تھانیدار علاقہ کو حکم دیا
جاتا ہے کہ اس لڑکی کو عدالت میں پیش کیا جائے
لیکن چونکہ میں درخواست دینے والے کو اور اس
لڑکی کے والدین کو اچھی طرح جانتا تھا اور دونوں
دہلی کے نہایت شریف خاندانوں سے تعلق
رکھتے تھے، میں نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔
درخواست اپنے پاس رکھ لی اور درخواست دہندہ
سے کہا کہ ایک ہفتہ کے بعد پھر آنا۔ اس کے بعد میں
نے لڑکی کے والدین کو اطلاع بھجوائی کہ وہ مجھ سے
مل لیں۔ جب وہ آئے تو میں نے دبے الفاظ میں
ان کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ پہلے تو بہت
حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ ایسا نہیں ہو سکتا
میں نے کہا پہلے ذرا آپ اپنی بیگم صاحبہ کے ذریعہ
اپنی لڑکی سے تسلی دریافت کرا لیجئے۔ چنانچہ جب انھوں
نے ایسا کیا تو پتہ چل گیا کہ "دونوں طرف ہے آگ
برابر لگی ہوئی" بھاگے ہوئے میرے پاس آئے
اور کہنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ ہمارے خاندان
کی عزت کا سوال ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ
درخواست دہندہ کے خاندان کو پسند کرتے ہیں
اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ لوگ آپ کے ہم پلہ ہیں
تو آپ فکر نہ کریں، کوئی نہ کوئی صورت ایسی نکال
لی جائے گی کہ بدنامی نہ ہو۔ لیکن میں آپ کو پھر موقعہ
دیتا ہوں آپ اپنی لڑکی کو سمجھا سکتے ہیں تو سمجھا لیجئے
اور دو تین دن کے بعد پھر مجھ سے ملئے۔ اس دوران
اس درخواست پر کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی
دو تین دن کے بعد وہ پھر میرے پاس آئے تو کہنے
لگے کہ ہم رضامند ہیں لیکن یہ کام ایسے سلیقے سے ہو
کہ بدنامی سے بچ جائیں۔ میں نے کہا کہ میں اس کا
بندوبست کر دیتا ہوں۔ چنانچہ شہر کے چند معززین کے
ذریعہ لڑکے والوں کی جانب سے پیغام بھجوایا۔ فریقین
راضی ہو گئے، شادی کی تاریخ طے ہو گئی مجھے بھی
مدعو کیا گیا اور میں شریک بھی ہوا۔ افسوس کہ وہ
صاحبزادے آج دنیا میں نہیں ہیں۔ پاکستان چلے
گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ ایک بار
جب میں پاکستان گیا تو ان کے شاگرد رشید نے
جن کا وہاں بڑا وسیع کاروبار ہے مجھے اپنے ہاں مدعو
کیا جہاں طعام و کلام کی بڑی پُر تکلف محفل رہی چونکہ
فریقین دہلی کے برگزیدہ خاندان سے تعلق رکھتے
ہیں، نے نام لینے سے قصداً گریز کیا ہے۔

عام طور پر مقدموں کا فیصلہ گواہوں کے
بیان کی بنا پر کیا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں
کہ جس کے حق میں زیادہ گواہ ہوں اسے لازمی طور
پر بری کرنا پڑتا ہے یا جس کے خلاف زیادہ گواہ بیان
دیں اسے سزا دینی پڑتی ہے۔ گواہان کا رتبہ کیا ہے
ان کے بیانات پر کیوں یقین کرنا چاہیئے یا کیوں نظرانداز
کر دینا چاہیئے۔ اس کے لئے معقول وجوہات بیان
کرنا پڑتی ہیں۔ اس لئے سو گواہوں کے بیان کو بھی
مجسٹریٹ جھوٹا قرار دے سکتا ہے۔ اور اگر چاہے
تو ایک گواہ کے بیان پر یقین کرتے ہوئے ملزمان کو
سزا دے سکتا ہے یا بری کر سکتا ہے۔ اس
کی تائید میں ایک کیس کا خاص طور پر ذکر کروں گا۔
میری عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں دو
ملزمان تھے۔ الزام ان پر یہ تھا کہ ایک پھیری والا ان
کے گاؤں میں سائیکل پر گٹھڑی لاد کر کپڑا فروخت
کرنے گیا۔ ایک ملزم نے اس سے تقریباً سو روپے
کا کپڑا خریدا لیکن دام نقد دینے کے بجائے پیشکش
کی کہ پھیری والا اس سے قیمت کے عوض زیور لے
لے۔ پھیری والا راضی ہو گیا۔ چنانچہ زیور لے کر وہ
ملزم زرگر کے پاس گیا اور اس سے قیمت ڈلوائی۔ زرگر
نے جو ملزم نمبر ۲ تھا اس کی قیمت دو سو روپے بتائی
جس پر طے یہ ہوا کہ ملزم نمبر ۱ پھیری والے سے کپڑے
کے علاوہ پچھتر روپے اور لے اور زیور دے دے۔
پھیری والے نے پچھتر روپے دے دیئے اور اس
گاؤں سے دوسرے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے
میں اسے خیال آیا کہ زیور کو کہیں اور بھی دکھا لیا جائے
ایسا نہ ہو کہ یہ نقلی ہو۔ چنانچہ اس نے اگلے ہی گاؤں
میں یہ زیور ایک اور زرگر کو دکھایا۔ اس نے اسے
کسوٹی پر پرکھا اور بتایا کہ یہ پیتل کا ہے اور اس پر
سونے کا پانی چڑھایا گیا ہے۔ وہ بیچارہ زیور
لے کر پھر اسی گاؤں میں آیا اور ملزم نمبر ۱ سے اپنے
روپے اور کپڑے کی واپسی کا تقاضا کیا۔ اس پر
ملزم نمبر ۱ اور دو نے اس کو اپنے گھر میں بند کر کے
خوب پیٹا، بلکہ اتنا پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس

ال آیا اگر اس نے اُن کے گھر میں ہی
ہ قتل کے جرم میں گرفتار ہو جائیں گے
ں نے اُسے ایک کوٹھڑی میں باندھ کر جنگل
دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب اُسے ہوش آیا
ر اپنا شروع کیا۔ کچھ مسافر اُدھر سے گزر
اُنھوں نے اُسے دیکھا اور اُٹھا کر تھانے
ئے۔ پولیس نے کیس کی رپورٹ لکھی اور
نے گاؤں میں پہنچ کر تفتیش کی اور دونوں
تار کر کے عدالت میں بھیج دیا۔ جب یہ مقدمہ
میں آیا اور گواہان کے بیانات قلمبند ہوئے
ن استغاثہ نے لاعلمی ظاہر کی۔ پھیری والا
ا۔ گاؤں والوں نے سوچا کہ ہم ایک پردیسی
ں خواہ مخواہ اپنے گاؤں والوں سے بگاڑیں
لے نے البتہ اپنی درد بھری داستان دُہرائی
بیان دیتے وقت یہ عذر کیا کہ ان کے گاؤں
ریق نے اُن کو پھنسانے کے لئے اُن پر
بنوایا ہے۔ اب کیس میں سوائے پھیری
بھی گواہ منکر ہو چکے تھے۔ ملزمان کو بڑی
ا آسان بات تھی۔ مگر مجھے یقین ہو گیا تھا
الے کا بیان حقیقت پر مبنی ہے۔ اور اگر
ں نے ملزمان سے انتقام لینے کے لئے جھوٹا
ہوتا تو وہ لوگ گواہان بھی ایسے نامزد کرتے
ے فریق کے ہوتے اور ملزمان کے خلاف
ہادت دیتے۔ اسی ایک بات کو لے کر میں
پھیری والے کے بیان پر ملزمان کو دھوکا ہی
جا اور قتل عمد کے تین مختلف جرائم میں سات
کی قید بامشقت کی سزا دی۔ کیس
تک گیا اور میرا فیصلہ قائم رہا۔ عدالت
والے کا بیان صحیح تسلیم کیا اور اس پر یقین
نے ملزمان کی سزا بحال رکھی اور میرے فیصلہ
ما۔

سٹریٹوں کے پاس مقدمات میں اکثر سفارشیں
ہیں اور میں بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ میرے
سفارشیں آتی تھیں بلکہ دوسرے مجسٹریٹوں
زیادہ آتی تھیں۔ اور اس کی وجہ یہ تھی
سس دہلی میں مختلف عہدوں پر رہ چکا

تھا اور سبھی لوگ مجھے جانتے تھے۔ میں سب کی سنتا
لیتا تھا لیکن وہی کرتا تھا جو انصاف کا تقاضا ہو۔
کچھ لوگ افسران کے نام پر رشوت بھی لینے کے عادی
ہوتے ہیں لیکن وہ ایسے ہی افسران یا مجسٹریٹ کے نام
پر رشوت لے سکتے ہیں جو نہ کسی سے ملے نہ کسی سے
بات کرے نہ سنے اور جس کا دروازہ لوگوں کے
لئے ہر وقت بند رہتا ہو۔ جس کے بارے میں لوگ
یہ محسوس کریں کہ ہم اُس کے پاس جا کر عرضِ حال
کر سکتے ہیں اور اس تک پہنچنے کے لئے انھیں کوئی
سہارا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، ایسے
مجسٹریٹ کے نام پر رشوت بھی نہیں لی جا سکتی۔
میری یہی پالیسی تھی۔ جو کوئی بھی مجھ سے ملنا چاہے
اور جس وقت ملنا چاہے، کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی
تھی۔ اہلِ مقدمہ بھی میرے پاس آتے تھے۔ میں
اُن سے بھی ملتا تھا اور انھیں تسلی دلاتا تھا کہ جو حق
بات ہوگی وہی کی جائے گی۔ میرا عام لوگوں سے ہر
وقت ملنا اور اُن کی جائز یا ناجائز بات سُننا بعض
افسران کو ناگوار بھی گزرتا تھا۔ لیکن چونکہ میری نیت
بفضلِ خدا خراب نہ تھی اس لئے میں نے اس کی پرواہ
نہ کی۔ ہر شخص مجھ سے یہ اُمید ضرور رکھتا تھا کہ اگر
وہ مجھ سے کوئی بات کہنا چاہے گا تو کم از کم اس کی
بات ہمدردی سے سُن ضرور لوں گا۔

ایک دفعہ میرے والد دہلی تشریف لائے
لیکن ان کی آمد کی اطلاع کا تار مجھے صحیح وقت پر نہ
مل سکا۔ چنانچہ وہ ریلوے اسٹیشن سے ایک تانگہ
پر سوار ہوئے اور تانگہ والے سے فرمایا کہ مجھے کنور
مہندر سنگھ بیدی کی کوٹھی پر لے چلو۔ راستہ میں تانگہ
والے نے اُن سے پوچھا کہ آپ کیسے آئے ہیں تو انھوں
نے ازراہِ مذاق اُس سے کہا کہ اُن سے مجھے کچھ کام
ہے تو تانگہ والا کہنے لگا کہ صاحب چلئے میں اُن سے
آپ کے کام کے بارے میں سفارش کر دوں گا
اگر یہ آپ کا کام جائز ہے تو ضرور ہو جائے گا۔"

اب لوگ کس نگاہ سے دیکھیں، یہ
اپنے اپنے نظریے کی بات ہے۔ لیکن میں اس بات
پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ مجھ سے ہر چھوٹے بڑے کو
توقع تھی کہ میں اُن کا جائز کام کرنے کو ہر وقت

تیار ہوں۔

میری عدالت میں کتنے ہی لیڈر
کے مقدمے پیش ہوتے رہے اور ان میں سے آزادی
کے بعد کئی تو منسٹر بنے اور کئی دوسرے اچھے اچھے
عہدوں پر فائز ہوئے۔ مگر کچھ ایسے بھی تھے جو
گاندھی جی کے نام پر من مانی کرنا چاہتے تھے۔ ان
میں سے ایک کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ یہ اپنے
آپ کو گاندھی جی کا سب سے بڑا چیلا سمجھتے تھے
اور لوگوں کی بھی اُن کے بارے میں یہی رائے تھی۔
انھوں نے دلی شہر کے ایک علاقہ میں کچھ نئی دکانیں بنوائیں
اور پگڑی لے کر دینا شروع کیں۔ ایک دوکان ایک
رفیو جی نے بھی اُن سے لی۔ وہ کپڑے کا کاروبار کرنا
چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے بڑھئی کو بُلا کر اس میں
کچھ الماریاں وغیرہ اپنے خرچ سے بنوائیں لیکن
اس سے پہلے کہ وہ کپڑے لا کر دوکان میں رکھتا
کسی اور نے آ کر لالہ جی کو رفیوجی سے زیادہ پگڑی
کی پیشکش کی۔ لالہ جی کی نیت بدل گئی اور انھوں
نے اُس رفیوجی کی دوکان پر اپنا تالا لگا دیا۔ اُس
نے ہر چند منت سماجت کی، لوگوں سے بھی کہلوایا
مگر لالہ جی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ میری عدالت
میں پہنچا اور زیرِ دفعہ ۱۴۵ ضابطۂ فوجداری
ایک درخواست دی جس میں بیان دیا کہ لالہ جی
نے اُسے دوکان دی اور بعد میں اپنا تالا لگا دیا
میں نے لالہ جی کو نوٹس جاری کیا اور ساتھ ہی
ساتھ پولیس والوں کو حکم دیا کہ وہ دوکان کو اپنی
تحویل میں لے کر مقفل کر دیں۔ اور تا فیصلہ درخواست
اُس کی نگہبانی کریں۔ لالہ جی اس پر بڑے تلملائے
انھوں نے مجھ پر سیاسی دباؤ ڈالنا چاہا۔ دہلی کا
کوئی ہی ایسا لیڈر ہوگا جو میرے پاس اُن کی سفارش
کرنے نہ آیا ہو۔ میں نے سب سے یہی کہا کہ میں خود
موقعہ پر جاؤں گا، پوری تحقیقات کروں گا اور جو بات
صحیح ہوگی وہ کروں گا۔ چنانچہ میں موقعہ پر گیا۔ لالہ
جی اپنے حواریوں سمیت وہاں موجود تھے۔ فرمانے
لگے کہ رفیوجی اُن کی دوکان پر زبردستی قبضہ کرنا چاہتا ہے
اور اپنا قفل لگا دیا ہے۔ میں نے نہ اسے کبھی دوکان
دی، نہ کبھی دینے کا وعدہ کیا۔ رفیوجی بیچارہ بکھلا

[illegible] جس

میں انار یاں وغیرہ فٹ کرائی گئی ہیں اور اس کے علاوہ کچھ دور کھسکنے کے لیے کچھ خاص سامان بھی بنوایا گیا ہے جو دوکان کی لمبائی چوڑائی ناپنے کے بعد تیار کیا گیا تھا۔ میں نے لالہ جی سے پوچھا۔ آپ کا دفتر کہاں ہے؟ تو فرمانے لگے ساتھ والی دوکان میں ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اس دوکان میں جو سامان فٹ کرایا ہے، اس میں کم از کم ہفتہ عشرہ تو ضرور لگا ہوگا۔ اگر یہ رفیو جی آپ کی دوکان میں زبردستی گھس آیا تھا تو آپ اتنی دیر خاموش کیوں رہے اور فوراً ہی پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کی؟" اب اس بات کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے وہ دوکان رفیو جی کے حوالے کر دی اور فیصلے میں صاف طور پر لکھ دیا کہ لالہ جی نے محض لالچ میں آ کر اس کو دی ہوئی دوکان واپس لینا چاہی تھی۔ اس پر لالہ جی بہت سٹپٹائے اور سردار پٹیل تک میری شکایت کی۔ اُن کے چھوٹے بھائی پریس سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے میرے خلاف پریس میں بھی پروپیگنڈہ کرایا۔ میرے فیصلے کے خلاف اپیل بھی ہوئی لیکن ناکام رہی۔ آج بھی وہ دوکان اسی رفیو جی کے پاس ہے کبھی کبھی وہ مجھ سے ملنے بھی آتا ہے۔

اُس زمانے میں پگڑی لینے کا رواج ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ رینٹ ایکٹ کے تحت پگڑی لینا جرم تھا۔ چنانچہ مسٹر رندھاوا ڈی۔ سی نے مجھے حکم دیا کہ پگڑی کی بدعت کو روکنے کے لیے ایکشن لیا جائے۔ میں نے درجنوں پگڑی لینے والوں کو پکڑا جن میں سے کئی تو دہلی کے نگر سیٹھ تھے اور کئی بڑے بڑے ٹھیکیدار۔ آج کل پگڑی لینا اور دینا نہ کوئی جرم سمجھا جاتا ہے، نہ عیب۔ لوگوں نے اس کا نام گڈول رکھ دیا ہے یا فرنیچر کا معاوضہ۔ لاکھوں روپیہ کی پگڑی کی لین دین کی جاتی ہے۔ قرول باغ میں دو دو کمیٹی نیی کروڑ روپے تک پگڑی دینا پڑتی ہے۔ کناٹ پلیس میں اس سے بھی اونچا بھاؤ ہے۔

پنڈت رامیشور دیال کے ڈی۔ سی بننے کے بعد کچھ عرصہ تک تو سابقہ طریقے سے ہی کام چلتا

[illegible]

بدل ڈالا۔ جس میں سٹی مجسٹریٹ کا عہدہ اُڑا دیا۔ میری خدمات ری ہیبیلیٹیشن یعنی بحالیات کے محکمہ کے سپرد کر دی گئیں جس کا دفتر دہلی ریلوے اسٹیشن کے سامنے دیول کیمپ میں تھا۔ اس محکمہ کا کام رفیوجیوں کے لیے پلاٹ، دوکان اور مکان الاٹ کرنا تھا۔ لاکھوں رفیو جی در بدر مارے مارے پھر رہے تھے۔ رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ ملازموں کی نفری کئی سو کی تھی۔ مجھ سے پہلے وہاں کوارٹر، دوکانیں اور پلاٹ "نیلام" کیے جاتے تھے۔ جو زیادہ رشوت دیتا وہ کامیاب ہوتا تھا۔ میں نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر کے پاس گیا اور اُن کو حالات سے آگاہ کیا۔ وہ فرمانے لگے جس طرح بھی ممکن ہو اس محکمہ کی اصلاح کرنی ہے میں آپ کو پورا اختیار دیتا ہوں، آپ جس ڈھنگ سے چاہیں اسے چلائیں۔ چنانچہ سب سے پہلے تو میں نے رشوت خور ملازموں کو نکالا۔ اُن کی جگہ نئے آدمی بھرتی کیے اور سب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ رفیو جی تو پہلے ہی لٹ چکے ہیں اب انہیں اور نہ لوٹا جائے اور نہ میں سختی سے پیش آؤں گا۔ کچھ پبلک کے لوگ ایسے تھے جنھوں نے افسروں کے نام پر رشوت لے کر مکان، پلاٹ یا دوکان الاٹ کرانے کا دھندہ اختیار کیا ہوا تھا۔ میں نے کچھ عرصہ تک یہ سب دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ جہاں مکان، دوکان اور پلاٹ کم تعداد میں ہوں اور امیدوار بہت زیادہ ہوں، وہاں الاٹمنٹ کا کام جس کے سپرد کیا، وہی رشوت لینا شروع کر دے گا۔ چنانچہ میں نے لاٹری سے الاٹمنٹ شروع کر دی۔ اُمیدواروں کو اپنے دفتر میں بلاتا رہتا تھا اور اُن کے سامنے پلاٹوں، مکانوں اور دوکانوں کی لاٹری ڈالی جاتی تھی۔ اس سے بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ فوری ضرورت والے کچھ لوگ رہ جاتے تھے اور جن کو فوری ضرورت نہیں ہوتی تھی اُن کو پلاٹ، دوکان یا مکان مل جاتا تھا۔ لیکن کسی کو بھی رشوت لینے یا دینے کا موقعہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد مکان کے اُمیدواروں کی فہرست پر نظرِ ثانی

[illegible]

اپنے نام درج کرا سکے ہیں۔ جہیں [illegible] کی گئیں۔ اس پر بوگس قسم کے امیدوار برہم ہوئے اور ڈاکٹر سوشیلا نائر وزیرِ متعلقہ سے شکایت کی۔ میں نے انھیں ہر چند سمجھانے کی کوشش کی کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ اس لیے کیا ہے کہ حقدار کو حق ملے اور رشوت بند ہو لیکن اُن کی ذہنیت کچھ عجیب سی تھی۔ وہ اپنے کو سب پر فائق سمجھتی تھیں، چنانچہ مجھ سے برہم ہو گئیں۔ میں نے کہا کہ میں بھی اس محکمہ میں خوش نہیں ہوں، آپ اپنی پسند کا کوئی افسر بُلوا لیجئے۔ رائے بہادر مہر چند کھنہ ان دنوں مرکزی وزیرِ بحالیات ہوا کرتے تھے۔ وہ اور میرے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے بھی ڈاکٹر سوشیلا نائر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، وہ مجھ سے ناخوش رہیں۔ اسی کشمکش میں ایک دو سال اور گزر گئے۔ مجھے دوسری بار دہلی آئے ہوئے قریب قریب ساڑھے پانچ سال ہو چکے تھے اور میرا پنجاب واپس جانے کا وقت بھی آ گیا تھا۔ میں نے لمبی رخصت لے لی۔ پنڈت پنت کو پتہ چلا، یوں کہئے جوش صاحب اور پاٹودی نے انھیں مطلع کیا کہ میں نے لمبی رخصت لے لی ہے اور پنجاب واپس جانے کا ارادہ ہوں، تو انھوں نے بھیم سین سچر چیف منسٹر پنجاب سے کہا کہ اسے دہلی کے قریب ہی کہیں تبدیل کر دیجئے تاکہ دہلی سے اس کا تعلق قائم رہے۔ سچر صاحب نے میرا تبادلہ سونی پت کر دیا۔ میری رخصت کے ایک دو ماہ تو دہلی میں ہی الوداعی دعوتوں میں گزر گئے۔ لوگوں نے چاہا کہ مجھے پھر روک لیا جائے لیکن میں نے ہی اپنی ترقی کا سوال، میں نے خود انکار کر دیا۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں میں نے سونی پت آ کر چارج لے لیا۔ میں سونی پت تقریباً اڑھائی برس رہا لیکن اس دور میں دو دفعہ دو ماہ تک کا قائم مقام ڈپٹی کمشنر رہا۔ دو ماہ کے لیے گوروکشیتر میں میلہ ایڈمنسٹریٹر

...پت ایک تاریخی قصبہ ہے۔ کہتے ہیں کہ دہلی
...کے اردگرد پانچ پت تھے جو دہلی کے محافظ سمجھے
...تے تھے۔ اُن میں سے ایک سونی پت ہے مہابھارت
...بھی ان میں سے کچھ کا ذکر آتا ہے۔ تقسیم وطن
...پہلے یہاں مسلمانوں کے چند متموّل خاندان
...موجود تھے۔ مُسلم آبادی میں اکثریت شیعہ
...رات کی تھی۔ محرّم کے دنوں میں سلام
...رثیہ کی محفلیں ہوا کرتی تھیں جن میں مجھے بھی
...شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ علاقہ زرخیز ہے
...ترجاٹ آباد ہیں لیکن ہریجن اور برہمن بھی
...تعداد میں ہیں۔ جن دنوں میں یہاں میری
...تی ہوئی اُن دنوں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا کام
...شروع ہوا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گاؤں
...ماں پختہ کرا رہے تھے۔ پکی سڑک سے اپنے گاؤں
...رک بنوانے کے لئے مٹی ڈال رہے تھے تاکہ
...ٹ اپنے خرچ پر اُن کے گاؤں تک پکی
...بنا دے۔ میں اس علاقہ سے ناواقف نہیں
...ں کہ رہتک ضلع میں اس سے پہلے دوبار
...تھا اور چونکہ سونی پت رہتک ضلع کا حصہ
...ں لئے میرا یہاں آنا جانا پہلے ہی سے تھا
...واقفیت بھی تھی۔ کھرکھودہ قصبہ جو
...ت تحصیل میں تھا وہاں میر صاحبان کا ایک
...تھا۔ اس خاندان کے ایک صاحبزادے
...ت علی خاں میرے ساتھ حفص کالج میں
...تھے۔ فٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑی تھے
...یم کے بعد اس خاندان کے تمام افراد
...چلے گئے۔ میر مشیر علی جو نیشنل وار فرنٹ
...کٹر نائب تھے، وہ بھی اسی خاندان سے
...نکہ سونی پت دہلی کے قریب تھا میرا دہلی
...نی رہتا تھا۔ دہلی کے لوگ بھی اکثر میرے
...ہ رہتے تھے۔ اُن دنوں سونی پت کی
...ائیس ہزار کی تھی۔ آجکل تو سونی پت
...مرکز بن چکا ہے۔ درجنوں کارخانے
...وستان کی مشہور سائیکل ایٹلس
...جاتی ہے۔ رائے بہادر ماتھی داس
...کارخانہ قائم کیا تھا۔ اُن کا تو اب

انتقال ہوچکا ہے لیکن بیٹوں نے اسے نہ
صرف ترقی ہی دی ہے بلکہ اور نئے کارخانے
بھی قائم کئے ہیں۔ بشمبرداس کپور اُن
کے بڑے لڑکے ہیں جو اپنے بھائیوں کی امداد سے
یہ سارا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں۔ سونی پت
نے چند برگزیدہ وُکلاء اور سیاستدان
بھی پیدا کئے ہیں جن میں چودھری لہری سنگھ
سابق وزیر حکومت پنجاب، چودھری ٹیکہ رام،
چودھری رزق رام، چودھری مختار سنگھ ممبر
پارلیمنٹ، چودھری رندھیر سنگھ سابق ممبر پارلیمنٹ
پنڈت چرنجی لال سابق وزیر ہریانہ کے نام قابلِ ذکر
ہیں۔ مسٹر گرگ اور لالہ سنت لال یہاں کے
دو مشہور وکیل تھے۔ مسٹر گرگ کے ایک بیٹے
سیشن جج ہیں۔ لالہ سنت لال کے بڑے
بیٹے گیان پرکاش شروع میں ہی آئی۔ اے
ایس میں آگئے تھے۔ یو۔ پی کے پہلے آئی۔ اے۔
ایس چیف سکریٹری رہے ہیں۔ بعد میں حکومتِ
ہند کے مختلف ملکوں کے سکریٹری رہے ہیں
اور اب ہندوستان کے آڈیٹر جنرل کے عہدۂ
جلیلہ پر فائز ہیں۔ بہت نیک اور شریف آدمی
ہیں۔ اُن کے چھوٹے بھائی بھی سیشن جج ہیں۔

سونی پت میں ایک مشہور ایم۔ ایل۔ سی
تھے۔ اُنہوں نے ایک نام نہاد کوآپریٹو سوسائٹی
کھول رکھی تھی۔ چونکہ ایم۔ ایل۔ سی تھے گورنمنٹ
سے اس سوسائٹی کے نام پر خوب پیسہ وصول
کرتے تھے جس کا اوّل تو کوئی حساب کتاب
پوچھتا ہی نہ تھا اور اگر پوچھتا تھا تو فرضی حساب کتاب
بنا کر دکھا دیا جاتا تھا۔ اگر کہیں کسی مدبر
اُنگلی دھری بھی جاتی تھی تو ایم۔ ایل۔ سی
صاحب اپنا رسوخ استعمال کرکے معاملہ ختم
کرا دیتے تھے۔ یہاں تک تو مجھے کوئی اعتراض
نہ تھا کیونکہ اس کی دیکھ بھال کرنا کوآپریٹو
محکمہ کا کام تھا۔ لیکن ایم۔ ایل۔ سی صاحب نے
ایک اور کاروبار بھی جاری کر رکھا تھا۔ وہ ایک
تھانیداروں سے دوستی پیدا کرلی تھی۔ اُن کے
چھوٹے بھائی تھانیداروں سے مل کر اچھے

کھاتے پیتے لوگوں کو جھوٹے مقدمات میں
پھنسا کر چالان کراتے اور ایم۔ ایل۔ سی صاحب
اُن کو چھڑوانے کے پیسے وصول کرتے تھے۔ جب
یہ سب میرے علم میں آیا تو میں نے بھیم سین
سچر صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ اُنہوں نے کہا
کہ اِس کا تدارک ہونا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے
ایم۔ ایل۔ سی صاحب سے گزارش کی کہ وہ
اس دھندہ سے باز آجائیں ورنہ نتائج اچھے
نہیں نکلیں گے لیکن جس کے منہ کو خون لگا ہو
وہ کھاس کیوں چرے گا۔ نزدیک ہی ایک
گاؤں تھا۔ وہاں کے ذیلدار کے بیٹے پر ایم۔ ایل۔ سی
صاحب کے بھائی نے سرقہ کا ایک جھوٹا مقدمہ
درج کرا دیا۔ تھانیدار نے اُس کا چالان کرنا چاہا
وہ لوگ میرے پاس آئے اور بتانے لگے کہ ایم۔
ایل۔ سی صاحب دو ہزار روپیہ مانگتے ہیں اور
یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے بیٹے کا کوئی نقصان
نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کا چالان ہونے
دیں گے۔ یہ پتہ چلتے ہی میں نے اُن سے
کہا کہ آپ سَو سَو کے بیس نوٹ لائیں
میں نے اُن نوٹوں کے نمبر نوٹ کرکے اُن سے
کہا کہ جائیے اب ایم۔ ایل۔ سی صاحب سے
کہیئے کہ آپ کا نذرانہ حاضر ہے۔ ایم۔ ایل۔ سی
صاحب نے فوراً نوٹ قبول فرمالئے۔ ایک
مجسٹریٹ کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی۔ انھوں نے فوراً
چھاپہ مار کر نوٹ ایم۔ ایل۔ سی صاحب کی جیب سے
برآمد کر لئے۔ پہلے تو ایم۔ ایل۔ سی صاحب نے
مجسٹریٹ کو دھمکانے کی کوشش کی لیکن جب وہ
نہ مانے تو منت سماجت کی۔ مجسٹریٹ نے اُن سے
کہا کہ اب تو مقدمہ عدالت میں جائے گا وہیں اپنی
چارہ جوئی کر لیجئے گا۔ اس کے بعد ایم۔ ایل۔ سی
صاحب بھیم سین سچر چیف منسٹر صاحب کے
پاس پہنچے اور کہا کہ اُن پر جھوٹا کیس بنوایا ہے۔
اُنھوں نے پوچھا کہ اگر یہ کیس جھوٹا ہے تو یہ نوٹ
جن کے نمبر نوٹ کئے جاچکے تھے آپ کی جیب
میں کیسے پہنچ گئے؟ اس کا جواب اُنھوں نے
یہ دیا کہ ذیلدار نے اُنھوں نے دو ہزار روپیہ چھاپہ

رکھے گئے۔ چونکہ یہ ایک عدالتی معاملہ تھا چیف منسٹر صاحب نے مداخلت کرنے سے انکار کر دیا لیکن مجھ سے پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ میں نے گزارش کی کہ مقدمہ ایک مرتبہ عدالت میں آ جائے اس کے بعد آپ کو اختیار ہے جو چاہے کریں مگر ایم۔ ایل۔ سی صاحب کو آئندہ کے لئے توبہ کرنی پڑے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کیس کا چالان عدالت میں دے دیا گیا۔ اس کے بعد ایم۔ ایل۔ سی صاحب نے چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر آئندہ کے لئے توبہ کی جس پر وہ کیس عدالت سے واپس لے لیا گیا۔ میں قریب قریب ایک سال اس کے بعد وہاں رہا۔ اس عرصہ میں ایم۔ ایل۔ سی صاحب نے کوئی ایسی حرکت نہ کی لیکن میں نے سنا کہ میرے وہاں سے چلے جانے کے بعد پھر وہی دھندا شروع کر دیا۔

سونی پت میں ایک اور بہت ہی دلچسپ شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ وہ تھے پنڈت رشی پرکاش جو سونی پت کے رؤسا میں سے تھے مگر ان کا ذکر آگے چل کر کروں گا۔

سونی پت سے تبدیل ہونے کے کچھ عرصہ پہلے مجھے مئی ۱۹۵۲ء میں میلہ ایڈمنسٹریٹر بنا کر کوروکشیتر بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں ہر سورج گرہن کے موقع پر میلہ ہوتا ہے جہاں ہندوستان کے کونے کونے سے لاکھوں لوگ اشنان کرنے آتے ہیں۔ اس پوتر تیرتھ استھان کا تعلق مہابھارت سے ہے۔ کرشن نے گیتا کا سندیش اسی زمین پر دیا تھا۔ جب میں ڈی۔ سی کرنال تھا اس وقت کوروکشیتر ایک سب ڈویژن تھا، اب ضلع بن چکا ہے اور یونیورسٹی کا مرکز بھی ہے۔ کوروکشیتر کی آبادی صرف چند ہزار افراد کی ہے لیکن میلے کے موقع پر پانچ سات لاکھ یاتری آ جاتے ہیں۔ ان کے لئے رہائش وغیرہ کا انتظام کرنا پڑتا ہے اور چونکہ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آتے ہیں اس لئے ہیضہ، انفلوئنزا کی وباؤں کے پھیلنے کا خدشہ ہوتا ہے جس کی روک تھام کے لئے مناسب بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ اکثر و بیشتر یہ میلہ گرمیوں میں لگتا ہے اور بعض اوقات کچھ یاتریوں کو سانپ بھی کاٹ لیتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ہزاروں خیمے نصب کرانے پڑتے ہیں اور آٹھ دس مربع میل کے علاقہ میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں ملتی، کسی نہ کسی یاتری کا پاؤں سانپ پر پڑ جاتا ہے اور وہ اسے کاٹ لیتا ہے۔ اس بار بھی دو یاتریوں کو سانپ نے ڈس لیا لیکن فوراً ہی انھیں ہسپتال لے جا کر انجکشن لگوا دیا گیا جس سے وہ دونوں بچ گئے۔ اس تمام میلے میں صرف ایک موت ہوئی اور وہ بھی ایسی کہ جس میں میلے کا انتظام کرنے والوں کا کوئی قصور نہ تھا۔

وہ واقعہ یوں تھا کہ ایک فوجی سرحد سے دو ماہ کی رخصت پر گھر آ رہا تھا۔ اس کے گاؤں سے کوروکشیتر کا ہی اسٹیشن نزدیک پڑتا تھا۔ لیکن میلے کے دنوں میں چونکہ بہت سی اسپیشل ٹرینیں چلائی جاتی ہیں، روزانہ آنے والی گاڑیوں کے لئے ایک الگ پلیٹ فارم بنایا گیا تھا۔ اس امر کا علم اس بے چارے فوجی سپاہی کو نہیں تھا۔ جب ٹرین کوروکشیتر کے پلیٹ فارم پر نہ آئی تو سپاہی نے پہلے اپنا بستر اور سامان کھڑکی سے باہر پھینکا اور پھر خود کود ا۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی چنانچہ اسے گرنے سے سر پر چوٹ آئی جس سے وہ جاں بحق ہو گیا۔

اس بار بھی میلے میں تقریباً چھ لاکھ یاتری آئے تھے۔ میلے کا ذکر ختم کرنے سے پہلے میں ایک واقعہ اور سنانا چاہوں گا جس سے یہ بھی ظاہر ہو گا کہ رشوت لینے اور رشوت دینے والوں کا باہمی تعلق کس قدر استوار ہوتا ہے اور جب میاں بیوی راضی تو بے چارہ قاضی کیا کر سکتا ہے۔ میلہ کیمپ لگانے کے لئے ہزاروں چھوٹے بڑے خیمے درکار ہوتے ہیں جن کے لئے ٹینڈر طلب کئے جاتے ہیں چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ کئی آدمیوں نے ٹینڈر دیئے۔ میں نے ہر ایک ٹینڈر میں سے جو سستا آئٹم لگتا تھا الگ کر لیا اور پھر تخمینہ لگایا جس سے پچھلے سال کے مقابلے میں کرایہ کم تو بہت تھا مگر میری رائے میں پھر بھی بہت زیادہ تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ ٹینڈر دینے والے کچھ کم کرائے پر راضی ہو جائیں مگر چونکہ ان کو اس کرایہ میں سے میلے کے نچلے عملہ والوں کو بھی کچھ نہ کچھ نذر کرنا ہوتا تھا، وہ نہ مانے۔ دہلی میں خیموں کے ایک ٹھیکیدار سردار راجہ سنگھ تھے۔ میں نے ان کو بلوایا اور کم سے کم ٹینڈر دینے والے سے بھی کئی ہزار کم کر کے یہ کام ان کو دے دیا۔ جب یہ تمام رپورٹ گورنمنٹ کے پاس گئی تو گورنمنٹ نے ایک خط کے ذریعے اظہار مسرت کیا لیکن جب یہ میلہ ختم ہو گیا اور میں واپس سونی پت چلا آیا تو میلے کے دفتر والوں نے دہلی کے اس ٹھیکیدار کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کیا۔ کبھی کوئی عذر کیا کبھی کوئی اعتراض جن کی کوئی بنیاد نہ تھی۔ ٹھیکیدار میرے پاس آیا۔ کہنے لگا کہ میلے کے دفتر والے خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہیں۔ میں اگر کوروکشیتر ہوتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن دور بیٹھ کر کوئی خاص مدد نہ کر سکا لیکن اس امر کا بھی شدت سے احساس ہوا کہ میرے کہنے پر سردار راجہ سنگھ نے اس قدر کم قیمت پر کام کیا اور میں اس کے لئے کچھ نہ کر سکا چنانچہ میں نے چیف منسٹر شری بھیم سین سچر سے اس کا ذکر کیا اور انھوں نے کمشنر انبالہ کو انکوائری کے لئے تعینات کیا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ انکوائری کرتے "میاں بیوی" راضی ہو گئے اور راجہ سنگھ کو اونے پونے دام دے کر فیصلہ کر لیا گیا۔

سونی پت کا ذکر ختم کرنے سے پہلے وہاں کے ایک واقعہ کا ذکر کر دوں گا۔ شری سی۔ پی۔ این۔ سنگھ اس وقت پنجاب کے گورنر تھے۔ وہ رہتک کے دورے پر آئے اور سونی پت میں بھی دورہ رکھا۔ میں نے رات کے کھانے پر انھیں مدعو کیا۔ جوش صاحب بھی دہلی سے تشریف لائے۔ ان دنوں سونی پت میں نشہ بندی تھی، جوش صاحب کے لئے شراب کہاں سے لاتا اور اگر لے بھی آتا تو سراسر قانون شکنی ہوتی۔ جوش صاحب اگر غروب کے بعد طلوع جام نہ کریں، شعر سنانے کے تو کیا بولنے کے قابل بھی نہیں رہتے۔ گورنر صاحب جوش صاحب

کو پہلے سے جانتے تھے اور اُن کا کلام سننے کے متمنی تھے۔ اِدھر جوشؔ صاحب واپس دہلی جانا چاہتے تھے۔ میں نے گورنر صاحب سے سارا ماجرا بیان کر دیا اور گزارش کر دی کہ اگر آپ صرف چالیس پچاس منٹ کے لئے میری اور جوشؔ صاحب کی غیر حاضری معاف فرما دیں تو میں اُن کو موڈ میں لاکر لے آتا ہوں۔ وہ رضامند ہو گئے۔ سونی پت سے عین تیرہ میل کے فاصلے پر دہلی صوبہ کی حد شروع ہوتی ہے۔ وہاں ایک ہمارے ملنے والے تھے۔ میں جوشؔ صاحب کو وہاں لے گیا اور

اُنھیں دو تین بڑے پیگ شراب کے پلا کر واپس سونی پت لے آیا۔ جوشؔ صاحب نے موڈ میں آکر بہت کچھ سنایا اور سب کے مہمانوں کو محظوظ کیا۔ گورنر صاحب جاننے تو سب کچھ تھے لیکن پوچھنے لگے "بیدی صاحب! آپ نے کیا نسخہ استعمال کیا ہے کہ جوشؔ صاحب اس قدر موڈ میں ہیں" میں نے گزارش کی کہ حضور! نسخہ تو پرانا تھا لیکن ترکیبِ استعمال نئی تھی۔ گورنر صاحب خوب ہنسے اور رات گئے تک محفل جاری رہی۔ اب بھی جب کبھی وہ ملتے ہیں تو اس واقعہ کو یاد کر کے خوش ہوتے ہیں۔

سونی پت میں کوئی خاص ادبی سرگرمیاں نہیں جیسی سرشار اور تبسم علی پوری جیسی کو دا محفل آراستہ کر لیتے تھے تو کچھ شعر و شاعری ہو جاتی تھی۔ جیسی سرشار خوب شعر کہتے تھے مگر بینائی قریب قریب کھو بیٹھے تھے۔ تبسم صاحب کے جوشؔ صاحب کے دوستانہ تعلقات تھے اور جب تک جوشؔ حیات رہے، اُن کی خط و کتابت ہوتی رہی۔

غزل

غزل فلک سے اُترتی ہے ہم نہیں کہتے
غزل زمین کی رانی ہے ہم نہیں کہتے
چراغ گھر میں ہے محفل میں شمع محفل ہے
سڑک پہ دُھوم غزل کی ہے ہم نہیں کہتے
خیال ناؤ! غزل بے کراں سمندر ہے
غزل ہی ستزِ زمانی ہے ہم نہیں کہتے
نئی زمین، نیا آسماں کہیں سے تو!
نئی غزل بھی یقینی ہے ہم نہیں کہتے
ہے فلسفہ جو غزل کا وہ جانئے کس سے
غزل تو اُلجھی پہیلی ہے ہم نہیں کہتے
مُنافقوں نے کئی بار گھات کی پھر بھی
وُہی غزل وہی ثاقیؔ ہے ہم نہیں کہتے

یوسف ثاقیؔ سلیمانی

غزل

مری زبان پہ جب تیرا نام آیا ہے
ترے گلی میں سبھوں نے بہت ستایا ہے
مری حیات کا ہر نقش ہی پرایا ہے
مرا وجود بھی شاید کسی کا سایا ہے
زمانہ عشق کے سربستہ راز کیا سمجھے
کسی نے کس کے لئے کیوں لہو بہایا ہے
تمہاری یاد کے سائے میں اِک ذرا سو لوں
غموں کی دھوپ نے دل کو بہت جلایا ہے
تمام عمر کہیں پر سکوں نہیں پایا
گلے لگا کے مجھے موت نے سُلایا ہے
چمن میں روشنی قربانؔ اس طرح کی ہے
بُجھے چراغوں میں ہم نے لہو جلایا ہے

ڈی۔ اے۔ پیرسن قربانؔ

غزل

کوئی خنداں نظر آتا ہے اس میں کوئی گریاں ہے
یہ دُنیا کیا ہے یارب اِک مقامِ برق و باراں ہے
لکھا تھا اُن کی قسمت میں قتیلِ ناز ہو جانا
وہ قاتل عاشقوں کو قتل کر کے کیوں پشیماں ہے
حذر عشقِ بتاں سے روگ یہ لینا نہیں اچھا
مرض ایسا ہے یہ جس کا نہ دارُو ہے نہ درماں ہے
مجھے پاؤں کا چکر چین لینے ہی نہیں دیتا
ہمیشہ دَور میں سر ہو مرے گردش گرداں ہے
فصاحت جس کی لونڈی ہے بلاغت جس کی باندی
فصیحِ ملک حضرت داغؔ ہی کا وہ دبستاں ہے
چلا آ میکدے میں دین و دُنیا چھوڑ کر اے رازؔ
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستِ گرداں ہے

رازؔ لائل پوری

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

جہاں آپ کی رقم پہلے سے زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے

اب ۱۱٪ سالانہ سود حاصل کیجئے

چھ ماہ اور اس سے زائد لیکن
ایک سال سے کم مدت کے لئے میعادی ڈیپازٹ پر۔

●

فکسڈ ڈیپازٹ پر شرح سود

۱۱٪ سالانہ ۲ سال کی مدت کے لئے

۱۰٪ سالانہ :۔ ایک سال سے زائد لیکن ۲ سال سے کم مدت کے لئے۔

●

سیونگ ڈیپازٹ پر ۶٪ سالانہ سود دیا جاتا ہے۔

ایک ہزار روپے ۶ سال میں ۲۰۔۴۳ روپے بن جاتے ہیں۔

ایک ہزار روپے ۱۰ سال میں ۱۷۶۳ روپے بن جاتے ہیں۔

ہر قسم کے بینکنگ کے کاروبار (جس میں غیر ملکی زر مبادلہ بھی شامل ہے) کے لئے تشریف لائیں۔

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ ۳۶ نیتاجی سبھاش مارگ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون: ۲۶۸۲۶۶، ۲۶۴۳۷۴ ٹیلیکس 31 - 66823 Zain IN



رضی الدین صدیقی

سرٹیفکیٹ

اُس کے ہاتھ میں ایک سرٹیفکیٹ تھا وہ سرٹیفکیٹ کی عبارت کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اُسے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں پانی ہی پانی تھا۔ پانی کا یہ چشمہ نہ جانے کہاں سے پھوٹ پڑا تھا جو رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اُس نے پھر سرٹیفکیٹ کی عبارت پڑھنے کی کوشش کی۔ الفاظ دھندلے دھندلے تھے۔ الفاظ ہل رہے تھے۔ الفاظ ناچ رہے تھے۔ شاید الفاظ اُس کا منہ چڑا رہے تھے۔ برٹش حکومت کے محکمہ صحت عامہ کے ایک ذمہ دار افسر نے یہ سرٹیفکیٹ ثبوت کے طور پر اُسے دیا تھا۔ اس بات کا ثبوت کہ وہ کنواری تھی۔

اُس نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹے سرٹیفکیٹوں کا سہارا نہیں لیا تھا۔ وہ ہمیشہ سچ بولتی تھی اور سچائی پر ایمان رکھتی تھی۔ دو مرتبہ اُس کی زندگی میں ایسا موقع آیا تھا جب جھوٹے سرٹیفکیٹوں سے فیض پہنچ سکتا تھا۔

ایک دفعہ تو اس وقت جب وہ میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گئی تھی۔ کسی نے اُس کے گھر والوں سے کہا تھا کہ وہ اُسے جھوٹا سرٹیفکیٹ دلا سکتا ہے لیکن اُس نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا تھا

اُس نے اگلے سال پھر میٹرک کا امتحان دیا تھا اور اپنی محنت سے پاس ہو کر دکھایا تھا۔ پھر تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک اسکول میں ٹیچر ہو گئی۔ نوکری کے دوران اُس کے سامنے ایک جھوٹے سرٹیفکیٹ کی بات پھر آئی۔

ایک ضروری کام کی وجہ سے سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑی۔ اسٹاف کی کمی کی وجہ سے چھٹی نہ مل سکی تو اس کے کسی ساتھی نے صلاح دی کہ جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا جائے لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا۔ جب وہ بیمار نہیں ہے تو بیماری کا سرٹیفکیٹ کیوں حاصل کرے۔ وہ اپنے اصولوں پر سختی سے عمل کرنا چاہتی تھی۔

آج اُس کے ہاتھ میں جو سرٹیفکیٹ تھا وہ اُسے بغیر مانگے دیا گیا تھا۔ وہ لندن کے بین الاقوامی ہیتھرو ہوائی اڈے پر کھڑی تھی۔ ابھی ابھی وہ ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر نکلی تھی۔ اُسے اپنے منگیتر کے پاس جانا تھا۔ اُس کے منگیتر نے اُسے ہندوستان سے اپنے پاس شادی کے لئے بلوایا تھا۔ یہاں پہنچنے سے پہلے وہ ایک سنہرے مستقبل کا خواب دیکھ رہی تھی۔

اُسے پوری اُمید تھی کہ انگلستان میں اُسے اچھی نوکری مل جائے گی۔ پھر وہ اپنے منگیتر سے شادی کرے گی اور۔۔۔ دونوں مل کر شاندار زندگی گزاریں گے۔

اس کا منگیتر ایک کامیاب تاجر تھا۔

وہ کافی عرصہ پہلے ہندوستان سے انگلستان آیا تھا۔ یہ بڑا عجیب ملک تھا۔ ظاہری طور پر تو یہ نسلی امتیاز کی پالیسی کا مخالف تھا لیکن [illegible] یہاں کے لوگوں کے دل نسلی امتیاز کے زہر سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف تو حکومت والے [illegible] اعلان کرتے تھے کہ وہ نسلی امتیاز کے دشمن ہیں لیکن دوسری طرف عوام کا ایک بہت بڑا طبقہ کالوں سے [illegible]

گمشدہ کے بیچ نفرت کی دیوار بچھانے کی کوشش کرتا

رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کالوں کو اس طرح بس

مکت میں آزادی سے کھنے دیا گیا تو ایک وقت ایسا

آئے گا جب اس ملک میں کالوں کی اکثریت

ہوجائے گی۔ وہ گورے کالوں کو حقارت سے "نگر"

کہتے تھے یا سب کالوں کو بلا لحاظ قومیت "پاکی"

کہتے تھے۔

اُسے جب اپنے منگیتر کا خط ملا تھا تو وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اُس کی ساتھی ٹیچروں نے بھی اُسے مبارکباد دی۔ اُس کا پاسپورٹ پہلے ہی سے تیار تھا۔ ویزا کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔

اسکول سے اُس نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ دوستوں نے ساتھیوں نے سہیلیوں نے الوداعی پارٹی دی اور اس کی آئندہ زندگی کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

پھر ایک دن وہ دوستوں، ساتھیوں اور رشتہ داروں کو آنسو پونچھتے چھوڑ کر ایر انڈیا کی ایک فلائٹ سے انگلینڈ کے لئے روانہ ہو گئی۔

ہوائی جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھی وہ مستقبل کے نہ جانے کیا کیا خواب دیکھتی رہی۔

بہت عرصہ بعد اس کی منگیتر سے ملاقات ہوگی۔ وہ ایک نئے اور ترقی یافتہ ملک میں جاکر رہے گی۔ نئے نئے لوگ ملیں گے۔ اسے ایک معقول تنخواہ والی نوکری ملے گی۔

جب طیارہ ہوائی اڈے پر اترا تو اس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے انگلینڈ اور لندن شہر کے بارے میں اب تک یا تو کتابوں میں پڑھا تھا یا صرف تصویروں میں دیکھا تھا۔ اب وہ موقع آگیا تھا جب وہ شیکسپیئر، کیٹس اور ملٹن کی سرزمین پر قدم رکھنے والی تھی۔ طیارے کا دروازہ کھلا تو دوسرے مسافروں کے ساتھ وہ بھی نیچے اتری۔ پاسپورٹ کی چیکنگ اور کسٹم کی تلاشی ہوئی۔

اس کے پاس سب ہی کاغذات صحیح تھے۔ اسے امید تھی کہ وہ جلد ہی ان جھنجھٹوں سے چھٹکارا پا کر اپنے منگیتر سے ملے گی۔ لیکن اس لمحہ وہ چونک اٹھی جب اُس سے یہ پوچھا گیا کہ وہ کنواری ہے یا نہیں؟ اُسے یہ سوال عجیب سا لگا۔ اُس نے ایک دفعہ پھر اپنا پاسپورٹ سوال کرنے والے کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے نام کے آگے انگریزی لفظ 'مس' لکھا تھا۔ لیکن سوال کرنے والے آفیسر کی تسلی اس سے نہ ہوئی۔

اُسے انگریزی زبان پر خاصا عبور حاصل تھا۔ اُس نے صاف اور شستہ انگریزی میں آفیسر کو سمجھایا کہ وہ کنواری ہے اور شادی کرنے کی غرض سے ہی انگلستان آئی ہے۔ آفیسر نے اُسے بتایا کہ حکومت کا یہ قانون ہے کہ دوسرے ممالک سے انگلستان آنے والی عورتوں کو اپنے کنوارپن کا ثبوت دینا پڑتا ہے کیونکہ بعض اوقات غیر ملکی عورتیں اپنے آپ کو کنواری ظاہر کرکے یہاں آجاتی ہیں اور اس ملک میں بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے پیدا ہونے والا بچہ خود بخود انگلستان کا شہری بن جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر حکومت کے لئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن آفیسر کی یہ منطق اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اور اُس وقت وہ دوبارہ چونک اٹھی جب آفیسر نے اسے یہ بتایا کہ یہاں کے قانون کے مطابق اسے کنوارپن کا "ٹیسٹ" دینا پڑیگا۔

اُس نے زندگی میں بہت سے امتحان پاس کئے تھے۔ وہ میٹرک "ٹیسٹ" میں دو دفعہ بیٹھی تھی۔ 'بی۔ اے' کے ٹیسٹ میں بھی وہ کامیاب ہوئی تھی۔ 'بی۔ ایڈ' کا ٹیسٹ بھی وہ کامیابی نمبروں سے پاس کر چکی تھی۔ وہ اکثر طلباء کا ٹیسٹ لیتی رہی تھی لیکن کنوارپن کا "ٹیسٹ" اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔

اُسے ایک جھٹکا سا لگا جب اُسے یہ بتایا گیا کہ اُس کو اپنے کنوارپن کا ٹیسٹ یہاں پر ہی دینا پڑے گا۔

اگر وہ ٹیسٹ نہ دے گی تو اُسے انگلستان میں داخل نہیں ہونے دیا جائیگا۔ اس نے آفیسر کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے حلفیہ بیان دینے کی پیش کش کی جو ٹھکرا دی گئی۔ اُس نے اُنہے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ پینتیس برس کی ہی کنواری عورت ہے۔ اس کے ملک ہندوستان میں تو بعض عورتیں اسّی، نوّے سال تک کنواری رہتی ہیں۔ بہت سی بوڑھیاں اپنا کنوارپن اپنے ساتھ ہی اپنی چتا یا قبر میں لے جاتی ہیں۔ اس نے بتایا کہ اُس کے ملک کی تہذیب اور قدریں انگلستان کی معاشرت سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انگلستان میں لڑکیاں اپنا کنوارپن اسکول کی زندگی ہی میں کھو دیتی ہیں۔

یہ بھی سچ ہے کہ اس ملک میں اکثر بعض کنواریاں حقیقت میں "کنواریاں" نہیں ہیں۔ لیکن ان قدروں کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہوتا۔"

غزل

کہیں یہ دردِ جگر سوزِ جاں نہ ہو جائے
خفیف شعلہ اک آتش فشاں نہ ہو جائے
وہ دل کے حال کو پہچان لینگے چہرے سے
سنبھل کہ چہرہ ترا ترجماں نہ ہو جائے
حدِ گماں سے مسرت بڑھی تو ڈر بھی تھا
کہیں یہ رنج و الم کا جہاں نہ ہو جائے
حبابِ زیست کو بے باک رکھو تو ہر لمحہ
سفرِ جہاں سے ترا ناگہاں نہ ہو جائے
بچاؤ مذہبی نفرت کی آگ سے اس کو
کہیں تباہ یہ ہندوستاں نہ ہو جائے
دو ایک بوند ہی ساقی زبان پر رکھ دے
کہ خشک تشنہ لبی سے زباں نہ ہو جائے
چمن سے جانِ بہاراں چلا گیا ناصحؔ
کہیں چمن پہ مسلط خزاں نہ ہو جائے

پادری بلدیو سنگھ ناصحؔ
ایم۔ ایس۔ اے
[redacted]

لیکن اُس کی ایک بھی دلیل نہیں مانی گئی
ں سے یہی کہا گیا کہ اُسے ٹیسٹ ہر حالت میں
گا۔ اُس نے ایک دفعہ پھر آخری کوشش
س نے انھیں سمجھایا اور بتایا کہ کیسی کیسی
یبوں میں اُس نے اپنے کنوارپن کو محفوظ رکھا ہے
لیکن اُس کے سامنے ایک ہی مطالبہ
ٹیسٹ ہر حالت میں دینا ہوگا ۔ ورنہ ہندستان
ن جاؤ'' آخر مجبور ہو کر وہ ٹیسٹ کے لئے تیار
لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اُس کا ٹیسٹ مرد
ریں گے تو اُس نے زبردست احتجاج کیا مگر
سود۔ اُس نے مانگ کی کہ اُس کا ٹیسٹ کسی
ت ڈاکٹر سے کرایا جائے' درخواست مسترد
ی گئی۔ بہت مجبوری کی حالت میں اُس نے
ی درخواست کی کہ کم از کم اُسے مرد ڈاکٹروں

کے سامنے جسم ڈھانپنے کے لئے ایک گاؤن تو دے دیا جائے۔ اُس کی یہ درخواست بھی منظور نہیں کی گئی۔

اس پر کیا بیتی اور کیا نہ بیتی اس کا اسے ہوش نہ رہا۔ اس کا احساس مرگیا۔ وہ سکتے میں آگئی۔ وہ بول نہ سکی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی قوتِ گویائی سلب کرلی گئی ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر اپنا کام کرکے جاچکے تھے۔

وہ رو رہی تھی۔ سرٹیفکیٹ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے قدم زمین سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھنے سے قاصر تھی۔ ایرپورٹ سے اب اُسے لندن شہر میں داخل ہونا تھا۔ اس کا منگیتر اُس کا انتظار کررہا تھا۔ اسے ایرپورٹ سے ایک نئے ملک میں داخل ہونا تھا جس کی سربراہِ مملکت ایک عورت تھی۔ ایک ملکہ تھی۔ وہ ملک جہاں ایک عورت کے کنوارپن کا مذاق اڑایا گیا۔ وہ ملک جس ملک کی لڑکیاں اوائلِ عمر میں اپنا کنوارپن کھودیتی ہیں اب اسی ملک میں داخل ہونے کی اس کی اجازت دے دی گئی تھی۔

اُس کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ نظر دھندلی دھندلی سی ہورہی تھی قدم چپکے ہوئے تھے۔ دماغ ماؤف تھا۔ سرٹیفکیٹ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا جس کی عبارت پڑھنے کی وہ ناکام کوشش کررہی تھی۔ ڈاکٹروں نے تصدیق کی تھی کہ وہ کنواری ہے۔

اُس کے ہاتھ میں اس کی زندگی کا شاید پہلا جھوٹا سرٹیفکیٹ تھا۔

شورش کاشمیری

سرور صاحب علیل ہونے کی وجہ سے اس بار بھی "بہ کوئے یار" نہ لکھ سکے۔
امید ہے کہ آئندہ اشاعت سے یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو جائیگا۔
(مضطرب صحرائی)

چند یادیں

منٹو سب کے دوست تھے۔ وہ دوست بنانے اور بنانے میں چنداں تکلف نہ برتتے۔ پہلی ملاقات ہی میں یار غار نظر آتے۔ پاکستان بنا تو ابتدائی دنوں میں وہ ساحر لدھیانوی کے ہمراہ دفتر "آزاد" میں تشریف لائے۔ میں ان دنوں "آزاد" کا ایڈیٹر تھا۔ مصافحہ کیا اور بے تکلف ہو گئے۔ وہیں ترقی پسند کانفرنس کی صدارت کے لئے ان کا نام تجویز ہوا جس نے پیش کی تو منٹو ہنس دئیے۔ انہیں شعر و شاعری سے کچھ واجبی ہی سا تعلق تھا۔ پھر بھی جوش کا ایک شعر چائے کی پیالی کے گھونٹ پر جام کی طرح رسید کیا ؎

"سب کو اس خوباں کا جس کا جوش کہتے ہیں
کیا [illegible] کا مانند دیکھا ہے ساقی"

میں [illegible] ہو رہا تھا [illegible] ہی پریشان کرتی ہے، اور یہاں خطیب کا لب [illegible] کیا کہ [illegible]۔ میں نے کلام سے کیا۔ وہ کہاں [illegible] سیر ہو کر چلے گئے۔ اگلے [illegible] پیر موجود تھے۔

"بھئی یہ خطبہ تیار ہو گیا ہے۔ ذرا ایک نظر ڈال لو۔ آپ لوگ خطیب ہو؟"

میں نے کہا "آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ منٹو کا خطبہ اور میں دیکھوں؟"

اصرار کیا "نہیں! ایک نظر! پبلک کا معاملہ ہے"

ظاہر ہے کہ اس میں ان کا تیکھا انداز بیان موجود تھا۔ میں نے صاد کیا تو قہقہہ لگایا اور کہا "اچھا ایک دس روپے نکالو"۔ میں نے دس روپے کا نوٹ نذر کیا۔ ایک ردی کاغذ کی طرح اٹھایا اور چلے گئے۔

میں سورج چھپتے ہی ساحر کے ہاں پہنچا تو میز پر بوتل رکھی تھی اور نکتوں سے شاد کام ہو رہے تھے۔ جونہی دیکھتے ہی اچھلے۔ "آگئے! تمہارا نوٹ کارگر ہو گیا۔ بلاواسطہ نہ سہی، بالواسطہ سہی۔"

انہوں نے یہ الفاظ اس تیزی سے کہے جیسے ابھی [illegible] کہ میں نے سوچے سمجھے بغیر کوئی مصرع جڑ دیا۔ منٹو نے پیگ حلق سے نیچے کیا اور میں اُن کے شگفتہ چہرے کی طرف دیکھتا رہا جو شراب سے اور بھی نکھر رہا تھا۔ اسے کہتے ہیں ؎

"مالِ حلال بُود بجائے حرام رفت"

میں نے منٹو سے ازراہِ شرارت کہا اور منٹو نے کھٹ سے مصرعہ پلٹا

"مالِ حرام بُود بجائے حلال رفت"

اور پھر خود ہی اس کی توضیح میں لگ گئے۔ "حرام" حُرمت سے ہے اور حلال سے مُراد ہے صبوحی۔ اور اب ذرا اس پر غور کرو تم صحافی اور ادیب لوگ الفاظ استعمال نہیں کرتے اِن سے چار چاند لگا کر بڑھاتے ہو" منٹو کے حواس اور زبان دونوں بے قابو تھے۔

ان میں اور اختر شیرانی میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ مثلاً: دونوں شراب کی نذر ہو گئے دونوں نے اس طرح پی کہ ان کی زندگی میں سے اگر شراب نکال دی جائے تو ایک جو خالی رہ جاتا ہے۔ دونوں میں انا تھی۔ اختر دوسروں کی بات بھی پکڑ لیتے تھے۔ مثلاً [illegible] سے کہا

...غزل کے بادشاہ تھے، میں نظم کا شہنشاہ ہوں" میں یہ تکلف بھی نہ تھا۔ یعنی اپنے سوا کسی کو ذہی مانتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو اس برِصغیر کا سب سے بڑا افسانہ نویس سمجھتے تھے اور ان کا یہ ... کسی حد تک درست بھی تھا۔ لیکن اپنے معاملہ وہ سخت غیر ذمہ دار تھے۔ ترقی پسندوں سے ... کی جھڑپ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ کسی صف ... شریک ہو کر نہ تو اپنی انفرادیت کھونا چاہتے اور نہ انھیں پارٹی حیثیت قبول تھا۔ اُن کا خیال "یہ ہدایت نامۂ خاوند" کوئی منفرد ادیب گوارا ... کر سکتا۔ انھیں نعرہ بازی سے سخت نفرت ... وہ بے تحاشہ اور بے روک لکھنے کے عادی ... ان کا خیال تھا کہ جب تک زندگی کی مکروہ ... رتوں کو سامنے نہ لاؤ اور عوام کو اُن کی زبان انھیں کے زخم نہ دکھاؤ، یہ معاشرہ کبھی ... پذیر نہیں ہوگا۔ وہ اس دَور میں وعظ کے ... نہیں بلکہ طنز کے قائل تھے۔ ان کا نظریہ تھا ... نہ معاشرہ کو برہنہ گوئی سے زیر کیا جا سکتا ہے۔

ایک دفعہ میں نے اُن کے کسی مجموعہ پر تعارف میں لکھا کہ منٹو مومن کی طرح سوچتا اور کافر کی ... لکھتا ہے" تو بہت خوش ہوئے۔

"تم نے ٹھیک لکھا ہے"

وہ اس تیزی سے لکھتے تھے جیسے کوئی ... شاعر شعر کہتا ہے۔ ان آخری برسوں میں ... مختلف الاصل ضرورتوں نے خاصا پریشان ... تھا۔ اُن کا کوئی ذریعہ معاش نہ روز کا خرچ تھا ... پورا نہ کر لیتے چین نہ پڑتا۔ اس ضرورت ... انھیں زود نویس بنا ڈالا۔ اُنہوں نے ایک ... نشست میں طویل سے طویل افسانہ ہی ختم ... بلکہ بسا اوقات ایک ہی نشست میں کئی ... کا مجموعہ لکھ ڈالا۔ ناشر کے پاس لے ... یہ کھرے ... اور ... مجموعے کم ... میں لگ گئے۔

ان کا یہ اصول تھا کہ پہلے مختلف رسائل ... کے پاس علیحدہ علیحدہ قیمت پر افسانے بیچے ... ناشر کے پاس اُن کا مجموعہ اسی طرح ...

ایک معقول رقم پیدا کر لیتے۔ لیکن چونکہ اس کا بہت بڑا حصہ شراب کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ ان کی زندگی انہیں الجھنوں کا ایک دلچسپ مرقع تھی۔

میں اُنہیں تب سے جانتا ہوں جب وہ پہلے پہل لاہور آئے اور باری (علیگ) کے ساتھ جگو محلہ میں لدھیانہ لانڈری کے اوپر تین یا چار روپے ماہانہ کرایہ کی ایک کوٹھری میں رہنے لگے یہ ایک کھلنڈرے پن کا زمانہ تھا۔ اُردو کی اسٹال کے یعسوب الحسن پیرسحاں تھے۔ انھوں نے اس چنڈال چوکڑی کی معیت ہی میں شاہد و شراب کے تجربے شروع کئے اور بمبئی پہنچ کر تو آتا رُد ہو گئے۔

ایک دفعہ نگینہ بیکری میں منٹو کا ذکر ہو رہا تھا۔ باری مرحوم بھی موجود تھے۔ کہنے لگے "کل تک تو منٹو ہمارے ساتھ محض ایک یار باش تھا آج وہ سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ اس کی شہرت پر رشک آتا ہے"۔

میں اُن سے بمبئی میں ملا تو وہ موڈ میں نہ تھے۔ اور میں بھی کچھ غیر حاضر سا تھا۔ پاکستان بنا تو لاہور کی ملاقاتیں دوستانہ سانچہ میں ڈھلنے لگیں ترقی پسند کانفرنس گزر گئی۔ میں نے "آزاد" چھوڑ دیا۔ "چٹان" نکالا۔ ایک روز دفتر میں بیٹھا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی گھرر۔۔ گھرر۔۔ گھرر۔۔۔۔

"شورش دوڑو، دو چار آدمی ساتھ لے آؤ۔ یہ بحالیات والے مکان خالی کروانا چاہتے ہیں"!

لیکن بحالیات والوں کی سمجھ میں یہ بات جلد ہی آگئی کہ منٹو کون ہے اور اس سے مکان خالی کرانا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے۔

جن دنوں میں "اس بازار میں" لکھ رہا تھا منٹو سے اکثر ملاقات ہوتی۔ ایک دن مجھے کہنے لگے "تم نے بہت دن لگا دیئے اگر تم نہیں لکھ سکتے تو اس نام سے میں لکھوں گا اور اس بازار پر ہی لکھوں گا"

میں نے کہا منٹو صاحب میرا اور آپ کا نقطۂ نگاہ مختلف ہے۔ آپ شوق سے لکھیے، میں کوئی اور نام رکھ لوں گا۔ جب میری کتاب مکمل ہو گئی تو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ اُن کی خواہش تھی کہ اس پر دیباچہ لکھیں اور یہ اُن کا دوستانہ اخلاص تھا لیکن کچھ بات یہ ہے کہ میں اُن سے ڈرتا تھا۔ خدا معلوم وہ کیا لکھ دیں۔ وہ اپنے نظریات میں بالخصوص عورت کے مسئلہ میں سخت گیر تھے۔ اُن کا بس چلتا تو عورت کے اس حزن عزت کو جو آئے دن مجروح ہوتا ہے اُن سفید ڈاڑھیوں پر مَل دیتے جو طوائف کے وجود پر پتنگوں کی طرح تن جاتی ہیں لیکن چوری چھپے اُس کی تخلیق کرتی ہیں۔

قدرت اللہ شہاب پنجاب میں محکمۂ صنعت کے ڈائریکٹر تھے۔ اُنہوں نے ادیب کی حیثیت سے ایک ادیب کے کرب کو محسوس کیا اور الاٹمنٹوں کی تجدید کے موقع پر ایک برف خانہ میں اُن کا حصہ بھی رکھا۔ منٹو کو دفتری اطلاع ملی تو سخت پریشان ہوئے۔ برف خانے کے وابستہ داروں نے پنکھے پر ہاتھ رکھ کے ... کہا "صاحب اپنے حصے کی برف فروخت کرنے کا خود انتظام کر لو۔ ذرا غور فرمائیے، سعادت حسن منٹو برف لادے پھر رہے ہیں اور ایک آدھ ادبی جریدہ بھی ساتھ ہے"۔

بابِ انتقاد

گلدستۂ سخن ۔ گنپت سہائے سرِواستو
۱۹۸۸ء ۔ ڈمائی سائز ۔/۵۰ روپے
کتابستان، الٰہ آباد ۔

"اُردو شاعری کے ارتقاء میں ہندؤں کا حصّہ" ایسی مشہور زمانہ کتاب کے مصنّف جناب گنپت سہائے سرِواستو کی تازہ ترین تصنیف "گلدستۂ سخن" اُتر پردیش اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے منصۂ شہود پر آئی ہے۔

"گلدستۂ سخن" کے مطالعہ سے قاری یہ اندازہ بخوبی لگا سکتا ہے کہ مصنّف نے اردو شاعری میں ہندؤں کے قابلِ قدر یوگدان کو کس قدر اچھے انداز میں اُجاگر کیا ہے۔ اس قابلِ قدر کتاب میں ۵۳ معروف و ممتاز ہندو شعرائے کرام کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل تبصرے کے ساتھ ساتھ ان کا نمونۂ کلام بھی دیا گیا ہے۔

اس معرکتہ الآراء کتاب کو ترتیب دینے میں سرِواستو کو بارہ سال کی محنتِ شاقہ سے کام لینا پڑا اور اس کی اشاعت میں اتر پردیش اُردو اکادمی کے مالی اشتراک کے باوجود مصنّف کو خطیر رقم کا بوجھ اُٹھانا پڑا ہے۔

گلدستۂ سخن" میں شائع شدہ تذکروں میں سے اکثر تذکرے گذشتہ پندرہ سال کے عرصہ میں "شانِ ہند" میں شائع ہو چکے ہیں ـــ مصنّف نے بہت اچھا کیا کہ انہیں یکجا کرکے کتابی شکل دے دی، اور یہ کتاب اردو شاعری کی تاریخ کا حصّہ بن سکی۔

"گلدستۂ سخن" کتابستان الٰہ آباد سے، نیز مصنّف کے علاوہ دلی میں صرف دفترِ شانِ ہند سے دستیاب ہے۔

نغمۂ فردوس ساقی تونڈلوی
۱۹۸۷ء ۔ ڈمائی سائز ۔/۵۰ روپے
اسباق پبلی کیشنز، پونہ

ـــ سرزمینِ مہاراشٹر کے اُردو شعراء میں ساقی تونڈلوی کا نام جانا پہچانا ہے۔ حال ہی میں ان کا مجموعۂ کلام جو تین حصّوں میں یکجا ہے، شائع ہوا ہے۔ کاغذ بہت اچھا مگر لکھائی چھپائی درمیانہ قسم کی۔ جلد معمولی گرد پوش لیمنیشن کے باعث چمکتا ضرور ہے مگر آرٹسٹ کی ناتجربہ کاری کا آئینہ دار ہے۔

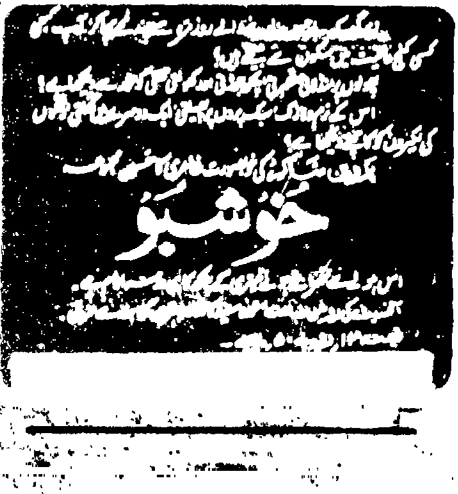
اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابر احسنی سے اکتسابِ فن کرنے والوں میں ساقی تونڈلوی ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنے فنکارانہ شعور سے غزل کو صحیح معنوں میں غزل کی طرح کہا ہے۔ اور بقول پروفیسر عنوان چشتی ساقی صاحب نے زبان اور اسلوب کی سطح پر اُردو شاعری کی تابندہ روایات سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ ناقص پروف ریڈنگ کے باعث اکثر اشعار بے وزن ہو گئے ہیں۔ مثلاً ساقی کا یہ شعر کچھ اس طرح ادا کیا گیا ہے ؎

سامنے آئیں اگر خنجر بکف نازک مزاج
کر نہ دیں برہم جواں مردوں کی صفِ نازک مزاج

دوسرے مصرعہ میں صف کو 'صنف' لکھ کر شعر کی ریڑھ مار دی ہے۔

اظہارِ تشکر میں مصنّف نے قریباً چار صد اصحاب کے اسمائے گرامی دیئے ہیں۔ کتاب کی نکاسی کے لئے یہ طریق کار قابلِ تعریف ہے جن حضرات کے اسمائے گرامی اظہارِ تشکر میں لکھے گئے ہیں وہ کم از کم اپنے نام کی خاطر ایک ایک جلد بھی خریدیں تو کتاب کے اخراجات بہ آسانی نکل آئیں گے۔

سرور تونسوی



من کہ مکتوب الیہ

محترم سرور صاحب تسلیم!

ایک لطیفہ سنیئے۔ تاج ہوٹل میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا کرشن موہن سے سامنا ہوا تو فرمانے لگے "کرشن موہن صاحب، آپ کی کتاب پر اکادمی نے تین ہزار روپے کا انعام دینا منظور کیا ہے۔ دو چار دن بعد اردو اکادمی کی ایوارڈ کمیٹی کے ایک اور رکن نے کرشن موہن سے حق دوستی ادا کرتے ہوئے مبارکباد دی کہ آپ کی کتاب انعام کے لئے منتخب کر لی گئی۔ ایک دوسرے ممبر ایوارڈ کمیٹی نے بھی کرشن موہن صاحب کو مبارکباد دی۔ تین ذمہ دار اصحاب کے فرمان اور مبارکباد کے بعد شک کا کوئی معاملہ نہیں گیا تھا۔ لہٰذا کرشن موہن صاحب نے اپنے عزیزوں اور احباب سے اس خوش خبری کا اظہار فرمایا تو مبارکبادوں کا تانتا بندھ گیا۔ کرشن موہن کے یار غار جناب ضیا حسن مرادآبادی نے اس خوشخبری کو کانوں کان دلی سے مرادآباد تک پہنچا دیا۔

مگر پچھلے ہفتے جب اردو اکادمی کی طرف سے ۱۹۸۸ء کی مطبوعات پر انعامی فہرست شائع ہوئی تو اس میں کرشن موہن صاحب کا اسم گرامی کو سوں تک دکھائی نہ دیا۔ کرشن موہن صاحب 'یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے' کا ورد کرتے ہوئے فوراً بذریعہ ٹیلی فون کنور صاحب سے شاکی ہوئے کہ صاحب، یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے آپ کے کہنے پر اس خوشخبری کو چند دوستوں تک پہنچا دیا تھا۔ اب وہ سب حیران ہیں کہ یہ کیا ہوا۔ کنور صاحب نے جواباً فرمایا "بھائی میں کیا عرض کروں۔ میرا تو خیال اب بھی یہی ہے کہ آپ کی کتاب انعام کے لئے منتخب ہوئی تھی، ویسے ہو سکتا ہے کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہو

اس پر (دروغ برگردنِ راوی) کرشن موہن صاحب نے فرمایا کنور صاحب میرا شعری مجموعہ شبنم کمار صاحبہ اور سکینہ راز کے مجموعہ ہائے شاعری سے بھی کمتر تھا کہ اُسے انعام کا مستحق قرار نہ دیا گیا۔ اب کرشن موہن اور اُن کے احباب کا یہ کہنا ہے کہ کمیٹی میں تو کرشن موہن صاحب کا مجموعہ انعام کے لئے منتخب ہوا (جسکی تصدیق اُردو اکادمی کی ایک سب کمیٹی کے چیئرمین نے ذاتی طور پر کی) مگر بعد میں کرشن موہن کو آوٹ آف باؤنڈری کس طرح کیا گیا، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے یا وہ جنھوں نے یہ کرتب دکھایا۔

سرور صاحب کیا آپ اس معاملہ میں صحافیانہ دیانتداری کا ساتھ دیتے ہوئے اس معاملہ پر روشنی ڈالیں گے؟

محمد طارق صدیقی
لوہا منڈی، آگرہ۔

برادرِ محترم سرور صاحب آداب!

'شانِ ہند' کا تازہ شمارہ ملا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی صحت پھر خراب ہے۔ اب کیسے ہیں؟ مطلع فرمائیں۔ آپ کے مستقل کالم کے بجائے مضطرب صاحب نے اس بار شورش کاشمیری کا لاہور سے متعلق کالم شامل کر دیا جو بہت ہی عبرتناک ہے انگریزی دور کی نوکر شاہی کی بڑی بھیانک تصویر سامنے لے آتا ہے۔

'شانِ ہند' کے تازہ شمارے میں آپ نے بوفورس کے معاملہ میں ونود دُوا کے دُوردرشن کے انٹرویوز والے فیچر کو جس طرح سراہا ہے وہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ اگر ہمارے قومی اخباروں کے سارے ایڈیٹر بھی اسی جرأت اور سچائی کے ساتھ حقائق کا تجزیہ کرنے پر قادر ہو جائیں تو ملک کا سیاسی وسماجی ڈھانچہ ہی بدل جائے۔

بھابی' اور مضطرب صاحب کو آداب

رام لعل

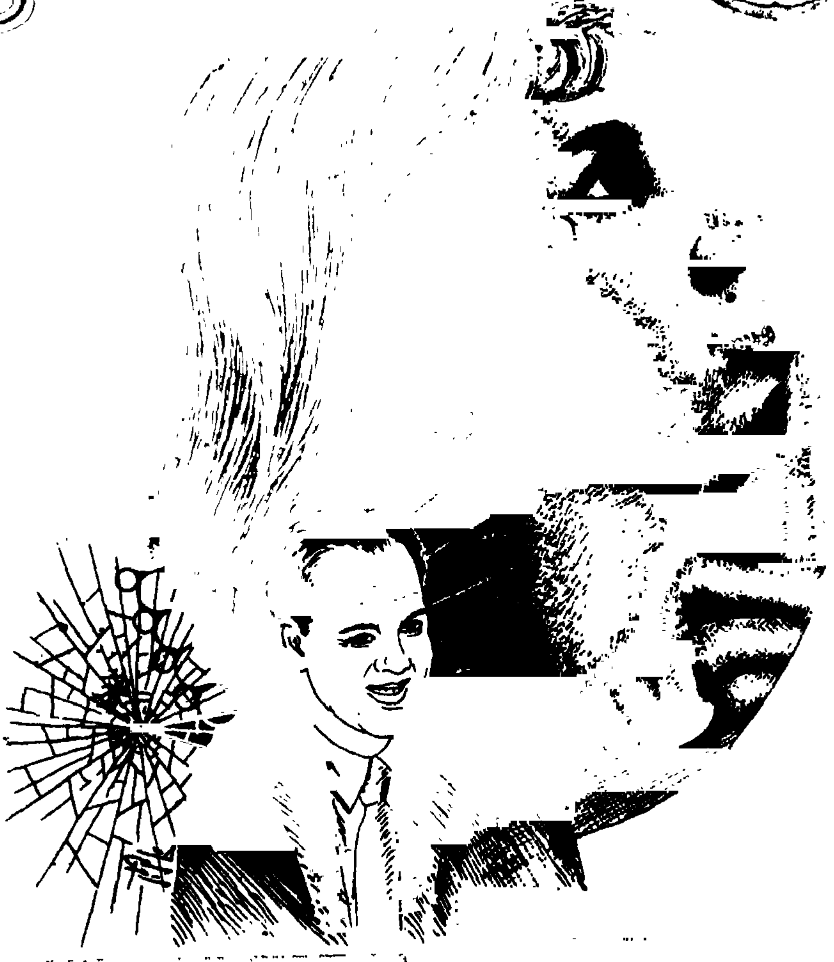
محترمی سرور تونسوی صاحب، تسلیمات۔

رام لعل صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔ خدا کرے آپ ٹھیک ہوں۔ لاہور میں بلراج مینرا سے اتفاقاً 'سنگ میل' پر ملاقات ہو گئی۔ آپ کے بارے میں اُس کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔

'شانِ ہند' کے تین شمارے مل گئے ہیں۔ اِس عنایت کیلئے شکرگزار ہوں۔ سنا ہے کہ رام لعل صاحب ستمبر میں پاکستان آ رہے ہیں آپ پروگرام کیوں نہیں بناتے۔ ایک دفعہ چکر لگا جائیں۔ اسلئے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کم از کم پاکستان آنے کی حسرت تو دل میں نہ رہے۔ آپ کے لئے آنا کون مشکل ہے آپ یہاں میرے مہمان ہونگے۔ بھابی صاحبہ کو میری طرف سے بہت بہت آداب۔ اپنی خیریت اور صحت کے بارے میں اطلاع دیں، شکریہ

آپ کا خیر اندیش
طاہر تونسوی

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 MAY 1988
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57 Delhi Postal



لوگوں کو اپنی بیویوں سے چھٹکارا پانے کی کوئی
ترکیب سمجھ میں نہیں آتی — مگر فریڈ ان خوش قسمت
لوگوں میں سے تھا جسے نصرف . . . . .
پڑھیے اسی شمارے میں اقبال پاریکھ کی کہانی

شانِ ہند دہلی

جون سنہ ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹

شمارہ ۶

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر
وِدّیا پرکاش سرور تونسوی
طباعت۔ خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقامِ اشاعت۔ دفتر ماہنامہ شانِ ہند
متصل انصاری مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خطاط
بسبطین حسینہ
محمد عمران

حسن کار
مصطفیٰ آرٹسٹ

غزل

دِل محمد فضا جالندھری

آکہ ہستی اک وبالِ دوش ہے تیرے بغیر
ہر نفس اب محشرِ خاموش ہے تیرے بغیر

تو حجابوں میں نہاں رہتا ہے اے خلوت نشیں
انجمن کی انجمن بیہوش ہے تیرے بغیر

تا کجا بے التفاتی اے نگاہِ عشوہ گر
اشکِ حسرت شکوۂ خاموش ہے تیرے بغیر

ہر نگاہِ مست کے ساغر میں ڈھلتی تھی شراب
وہ تصور اب تو خوابِ دوش ہے تیرے بغیر

ہائے یہ ساون کی بھیگی رات اور کالی گھٹا
قطرہ قطرہ شعلۂ خس پوش ہے تیرے بغیر

رات دن اک سیلِ غم جاری ہے تیری یاد میں
دیدۂ تر دیکھ طوفاں جوش ہے تیرے بغیر

یہ تمنا ہے سکونِ عشق بن جاتا کبھی،
دل بھی پہلو میں اذیت کوش ہے تیرے بغیر

نغمہ بن کر پھر سما جا دل میں اے جانِ بہار
میرا ہر تارِ نفس خاموش ہے تیرے بغیر

آکہ پھر سونی پڑی ہے کائناتِ حسن و عشق
نعرۂ ساقی بھی بارِ گوش ہے تیرے بغیر

آکہ پھر دیکھیں شبِ مہتاب میں رنگِ بہار
آکہ لب پر داستانِ دوش ہے تیرے بغیر

آکہ پھر جلوؤں سے پیدا ہو تماشائے نظر
منتشر اب کاروانِ ہوش ہے تیرے بغیر

آکہ دل پر چوٹ لگتی ہے ستارے دیکھ کر
آکہ عاشق ناشناسِ ہوش ہے تیرے بغیر

کیا سناؤں ماجرائے کاوشِ دل عشق میں
میری ہستی پیکرِ خاموش ہے تیرے بغیر

کاش بن جائے ترا جلوہ نشاطِ زندگی
غم اثر اک دردِ ہم آغوش ہے تیرے بغیر

تیرے دم سے تھی فضا کی زندگی بھی پُر نشاط
اب کہاں کا لطف، کس کو ہوش ہے تیرے بغیر!

اداریہ

ضمنی انتخابات

کانگریس (آئی) کے لئے ایک تازیانہ

...حالیہ ضمنی انتخابات میں یہ بات
...کی طرح ابھر کر سامنے آئی ہے کہ
(آئی) نے اپنی مقبولیت کو کافی
[illegible]
[illegible]

اور اسکی وجوہات حسب ذیل ہیں۔
۱۔ بوفورس کے سودے وغیرہ کے
بارے میں گذشتہ ایک سال سے چرچے سے
ہو رہی ہے جس سے عوام کے [illegible] شک
یقین کی صورت اختیار کر [illegible]

معاملات میں اسقدر [illegible] بدنامی
سرکاری خزانہ لاکھوں [illegible]
حکومت کو بدنام کرنے [illegible]
عوام کی تسلی نہیں ہوئی [illegible]
حکومت سیاسی پارٹی سے [illegible]

۲۔ ہندو کو یہ شکایت ہے کہ کانگریس نے اکثریتی ... کی پچاسی فیصد ہندوؤں کے مقابلے میں مسلم اقلیت کو سر پر بٹھا لیا ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ ہندو تو کانگریس کے ساتھ ہیں ہی لہٰذا اُن کی خوشنودی یا ناراضی اس کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی اور کانگریس محض مسلمانوں کی ووٹیں حاصل کرنے بلکہ اپنے حلقوں میں رکھنے کیلئے مسلمانوں کے ہر جائز و ناجائز مطالبہ کو تسلیم کر لیتی ہے۔ لہٰذا حالیہ ضمنی انتخابات میں ہندوؤں نے ڈنکے کی چوٹ اپوزیشن کا ساتھ دیا۔

۳۔ مسلمان اپنی جگہ حکومت سے نالاں ہے۔ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا قضیہ اُس کی مرضی کے مطابق حل ہونے کے کوئی آثار اسے نظر نہیں آ رہے ہیں اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ حکومت دیدہ و دانستہ اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔ اس کے علاوہ مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ سرکاری ملازمتوں اور دیگر مراعات میں ناانصافی ہو رہی ہے لہٰذا کانگریس آئی کے ووٹوں کا بیش بہا خزانہ اس کے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ نکلا جا رہا ہے۔

مندرجہ بالا تین وجوہات کے علاوہ چوتھی نہایت اہم اور وزن دار وجہ یہ ہے کہ کانگریس اور عوام میں فاصلہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر کانگریسی لیڈر یہ سمجھتا ہے کہ وہ رائل فیملی سے ہے لہٰذا اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ غریب عوام کو اپنی مطلب براری کے لئے کانگریسی لیڈر کچل رہا ہے۔ ہمارے کانگریسی وزیر غریب عوام کو اپنے پاس تک پھٹکنے نہیں دیتے۔ وزیر اعظم تو پھر بھی عوام سے کسی نہ کسی طور پر رابطہ بنائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہمارے اکثر کانگریسی وزراء اپنے چمچوں کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے ہوئے محل میں بیٹھے رہتے ہیں اور عوام سے ملنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی عام آدمی کسی جائز شکایت کے سلسلے میں کسی وزیر سے ملنا چاہے تو یہ قریب قریب ناممکن ہے کیونکہ وزیر تک پہنچنا مشکل ہے کیونکہ حفاظتی دستے اور چمچے گھیرے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کانگریسی لیڈر پر یہ تہمت دھری جاتی ہے کہ وہ عوام سے کٹ کر رہ گیا ہے اور کانگریس کی غیرمقبولیت کی یہ ایک بڑی وجہ بن گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وی پی سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو کانگریس سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی عوام کا اعتماد حاصل ہے اور کانگریسی وزراء اسے دیکھ کر ... کہ کہیں ملک کی باگ ڈور ... بن گئی جو ... عوام کو ... کہ کانگریس ... ساتھ نہیں دیتے ہیں۔ جو محض ... کی بات ... ہے کہ ... کی سرکار جانے ...

جو ہمیشہ گرفت رہا ہے کیونکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ کانگریسی لیڈر اور وزیر غیر پسندیدہ لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں مگر مظلوم کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ اپوزیشن کی طرف راغب ہوتا ہے جو اپنی مطلب براری کے لئے اُس کی بات محبت بھرے انداز میں سنتی ہے اور اُسے کانگریس سے مزید بدظن کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

۵۔ پنجاب میں بدامنی اور بے قصور عوام کا ہر روز قتل ہونا بھی حکومت کی ساکھ کو غیر یقینی بنانے میں بہت حد تک اثر انداز ہو رہا ہے۔

۶۔ کانگریس (آئی) میں ایسے عناصر کا شریک ہو کر ذاتی مفاد حاصل کرنا جو عوام کی نظروں میں ناپسندیدہ تھے۔ اور کانگریس میں شرکت کرنے سے پہلے یہ عوام کی زبان میں غنڈے سمجھے جاتے تھے۔

۷۔ اُردو کو حکومت نے صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اُردو کے ساتھ جو ناانصافی کی ہے اُس سے ہندوؤں کا اُردو پرست حلقہ تو خیر ناراض ہونے کے باوجود بے بس تھا۔ مگر مسلمانوں کا سنجیدہ اور حقیقی اُردو دوست حلقہ بھی حکومت کی اس غیر مناسب روش سے نالاں ہے کہ حکومت نے محض مسلمانوں کی ووٹیں حاصل کرنے کے لئے اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اُردو کے نام پر کچھ مراعات دینے کی جو چال چلی ہے اور اُردو کے کچھ مسلمان دانشوروں کو مالی مفاد پہنچا کر ہندو اُردو دانوں، جن میں پنجابی عنصر زیادہ ہے، کو ناخوش کیا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا سنجیدہ طبقہ اور ہندو اُردو داں حکومت کے طرز عمل کو اُردو دشمنی سمجھتا ہے۔

غرضیکہ کانگریس (آئی) اس وقت عوام میں اپنی مقبولیت بڑی تیزی سے کھو رہی ہے اور یہ نہ تو کانگریس آئی کے مفاد میں ہے اور نہ ہی ملک کے لئے۔ کیونکہ اپوزیشن میں بھی کالی بھیڑوں کی کمی نہیں ہے اور وہ اس وقت ایسی مضبوط پوزیشن میں بھی نہیں کہ ملک چلا سکے۔

ہمیں دلی خوشی ہے کہ ہمارے وزیر اعظم نے بہت جلد کانگریسی ذمہ دار حضرات سے صلاح و مشورہ کرنے کا اعلان فرمایا ہے تاکہ اُن مسائل پر غور و خوض کیا جا سکے جن سے دن دن کانگریس کی مقبولیت میں کمی آ رہی ہے اور یہ بھی طے کیا جائے کہ کانگریس (آئی) کو کن طریقوں اور ذرائع سے مقبول بنایا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں وزیر اعظم سے نہایت مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ الٰہ آباد کے ضمنی انتخاب کو نظر میں رکھیں کہ اپوزیشن نے مشترکہ طور پر آزاد امیدوار جناب وی۔ پی۔ سنگھ کو کن نظریات کے پیش نظر عوام کا ہیرو بنا کر کامیاب کرایا ہے۔

وزیر اعظم کے مشیروں اور غلام نبی آزاد اور سیتارام کیسری ایسے حضرات نے انھیں گمراہ کر رکھا ہے۔ الٰہ آباد کے الیکشن میں غلام نبی آزاد کے متکبرانہ اعلانات اور چناؤ مہم کے بارے میں جھوٹی اطلاعات عوام کو دینے سے بھی کانگریس کی پوزیشن کافی بگڑی۔ خود کانگریس کے کچھ بڑے امیدواروں کی اندرون خانہ مخالفت کی اور اُتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کا رول بھی قابل تعریف نہیں رہا۔ اگر یو پی وزارت کے وزیروں کا ٹھاٹھ گھٹہ الٰہ آباد کے حلقہ انتخاب میں نہ جاتا تو کانگریس کی پوزیشن زیادہ بہتر ہوتی اور یہ یو پی کے ایک وزیر نے جلال میں آ کر ووٹروں اور مخالف گروپ کے ورکروں کے ساتھ ساتھ اخبار نویسوں کی بھی پٹائی کرا دی تو معاملہ اور بگڑا۔ غلام نبی آزاد ہوں یا دوسرے کانگریسی لیڈر اور ورکر، سب کا دلی منشا یہ ہے کہ وہ وزیر اعظم کا قرب زیادہ سے زیادہ حاصل کریں اور اس لئے وہ بلفنگ کرتے رہے اور وزیر اعظم کو اندھیرے میں رکھتے رہے۔

اس لئے وزیر اعظم کو چاہئے کہ غلام نبی آزاد اور اسی قماش کے دوسرے کانگریس کی بقا حیات کے ٹھیکے داروں سے عوام ...

کیا کیا شکایات یا شکایتیں ہیں جو انھوں نے اس ضمن میں عموماً اور الہ آباد کی متنازعہ سیٹ پر خصوصاً کانگریس کو ووٹ کیوں نہیں دیا۔ یہی عوام ہی وزیر اعظم کو صحیح مشورہ دے سکیں گے اور اس کے ساتھ ہی وزیر اعظم کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ کانگریس کو عوام میں پھر سے مقبول کرنے کے لئے غلام نبی آزاد اور اسی قماش کے دوسرے حضرات پر بھروسہ کرنا مزید خطرے کو آواز دینا ہے لہٰذا انھیں ان حضرات کی جگہ معقول حضرات کو لانا ہوگا۔ لاف زن اور چرب زبان حضرات اب عوام کو کانگریس کے نزدیک نہ لا سکیں گے۔

وزیر اعظم کو یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ سنیل شاستری کو اگر ہزاروں ووٹ ملے ہیں تو محض اُن کی ذاتی شرافت اور انکساری پر اور ان کے کی شہرت، عزت اور احترام کے باعث، ورنہ اگر کوئی اور امیدوار ہوتا تو اس کا حشر بہت برا ہوتا۔

اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ وزیر اعظم عالیہ ضمنی چناؤ کو آنے والے جنرل انتخابات کے لئے ایک عظیم خطرہ کی نشاندہی سمجھتے ہوئے ایسے اقدام اٹھائیں جس سے کانگریس کا وقار پھر سے قائم ہو سکے۔ کیونکہ ملک کا مفاد اسی میں ہے کہ کانگریس ہی ملک کے نظم و نسق کی باگ ڈور سنبھالے رکھے اور یہ بھی ہو سکتا ہے جب کہ خود کانگریسی اپنے گریبان میں جھانکیں ورنہ عوام دن دن کانگریس سے بدظن ہو رہے ہیں۔

وزیر اعظم کی ذاتی شرافت، حسن اخلاق، خاندانی وجاہت اور عوام کے ساتھ جن سے عوام کو انتہائی عقیدت وزیر اعظم سے ہے اور محبت رکھتا ہے۔ لہٰذا انھیں چاہیئے کہ وہ اپنا عوامی رابطہ زیادہ سے زیادہ وسیع کریں۔ بے شک سکیورٹی کی پابندیوں کے باعث وہ کافی حد تک مجبور ہیں کہ زیادہ سے زیادہ عوام کی شکایات ذاتی طور پر سنیں مگر وہ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کے کارندوں اور وزیروں اور کانگریسی لیڈروں سے کہیں کہ وہ عوام سے محبت بھرا سلوک کریں اور ان کی جائز شکایات دور کریں تاکہ عوام زیادہ سے زیادہ وزیر اعظم کے گرویدہ ہوں اور کانگریس پر انھیں بھروسہ کرنے کی ہمت ہو سکے۔

یکا یک پریس جاری تھی کہ اعلان ہوا ہے کہ یو پی کے وزیر اعلیٰ وی پی سنگھ نے استعفاء دے دیا ہے۔

قصہ دلّی اردو اکادمی کا

شانِ ہند کی گزشتہ اشاعت میں جناب محمد طارق صدیقی کا مراسلہ شائع ہوا ہے لہٰذا اس سلسلہ میں ایڈیٹر شانِ ہند نے ذاتی طور پر تحقیقات کی تو اس مراسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تصدیق جناب کرشن موہن جناب خلیق انجم صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند اور جناب تاج بہادر گوڑ کی موجودگی میں اردو گھر میں ڈاکٹر خلیق انجم کے دفتر میں فرمائی۔ اور وہ پورے وثوق سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کی تصنیف انعامی مقابلہ میں منتخب ہوئی اور یہ فیصلہ بعد میں بدلا گیا۔ ایک تقریب میں راقم الحروف نے محترمہ جمیلہ بانو کی موجودگی میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر چیئرمین ایگزیکٹیو کونسل اردو اکادمی سے محمد طارق صدیقی کے اس مراسلہ کے بارے میں بات چیت کی تو انہوں نے فرمایا کہ ایگزیکٹیو کی جس میٹنگ میں کتابوں کے انعامات کے سلسلہ میں فیصلہ کیا گیا تھا اس میٹنگ میں صرف پانچ منٹ ہی بیٹھ سکا۔ کرشن موہن صاحب کی تصنیف میرے سامنے آئی ضرور تھی، مگر ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھے یاد نہیں کہ کرشن موہن صاحب کی تصنیف کو انعام کے لئے چنا گیا یا نہ۔ کیونکہ مجھے ایک عزیز کے انتقال کی خبر ملتے ہی فوری طور پر میٹنگ چھوڑ کر چلے جانا پڑا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کرشن موہن صاحب سے ان کی تصنیف کو انعام کے لئے چنے جانے کے بارے میں محض غلط فہمی کی بنا پر معلوم کیا کہہ دیا کیونکہ وہ کتاب میرے سامنے آئی تھی اور میرے نزدیک وہ یقیناً ایک بہترین تصنیف تھی مگر انعام کے لئے جو کتابیں انتخاب کی گئیں وہ میری عدم موجودگی میں ہوئیں۔

جمیلہ بانو صاحبہ نے نہایت پُر زور انداز میں کنور صاحب سے احتجاجی کلمات کہے کہ محترمہ شاکر گرودور شبنم کی تصنیف پر انعام کیوں دیا گیا جبکہ وہ اردو نہ لکھ سکتی ہیں اور نہ پڑھ سکتی ہیں۔ کنور صاحب نے فرمایا کہ جو فیصلے ہوئے وہ تمام ممبران کی متفقہ رائے سے ہوئے۔ ویسے شبنم صاحبہ ہندی اور انگریزی زبانوں کی ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اگر اردو سے دلچسپی رکھتی ہیں اور وہ اردو زبان میں شاعری کرتی ہیں اور ان کے اردو شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں تو ایسی شاعرہ کی اردو اکادمی کو حوصلہ افزائی کرنی ہی چاہیئے۔ کنور صاحب نے جمیلہ بانو صاحبہ سے فرمایا کہ جب آپ کا مجموعہ شائع ہوگا تو اکادمی آپ کی خدمات کا بھی اعتراف ضرور کرے گی۔

یہ سکینڈل کے خبری مجموعہ دینا اور کرشن موہن صاحب کو انعام کے معاملہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انعام حاصل





بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ کی گولڈن جوبلی

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ نے [illegible] کو بمبئی میں عوام کی خدمت کا [illegible] اٹھایا اور اس خوبی اور حسن انتظام سے [illegible] کے کاروبار میں نام پیدا کیا کہ گزشتہ [illegible] سالوں میں اس کی کئی شاخیں قائم ہو گئیں۔

تقریباً گیارہ سال ہوئے کہ اس بینک کی [illegible] دہلی میں قائم ہوئی۔ اور جناب شمیم کاظم [illegible] کی دیکھ ریکھ میں دیکھتے ہی دیکھتے اس [illegible] نے عوام کے دلوں میں اس طرح گھر کیا [illegible] اس بنک کا چرچا ہونے لگا اور آج [illegible] کہ ریزرو بینک اور اسٹیٹ بینک [illegible] کو چھوڑ کر دوسرے بینکوں کی کسی بھی [illegible] کے مقابلہ میں بمبئی مرکنٹائل بینک میں [illegible] داروں کی تعداد کئی گنا زیادہ ہے۔

شمیم کاظم صاحب نے جس تندہی اور [illegible] سے اس بینک کو دلی بلکہ شمالی ہند میں متعارف [illegible] اس کا ہی نتیجہ ہے آج سارے شہر [illegible] بینک کی دھوم ہے۔ [illegible] کے سلسلہ میں [illegible] مسلمانوں کی جو خدمت اس بینک [illegible] اس کا ایک ادنیٰ [illegible] کہ اس [illegible] کا جشن آج دلی میں [illegible] [illegible]

ہو رہا ہے۔

جناب شمیم کاظم صاحب نے شبانہ روز محنت اور کاوش سے اس بنک کو مقبول عام بنانے میں اپنی صحت تک کو داؤ پر لگا دیا مگر دلی کے عوام خصوصاً مسلمانوں میں بینکنگ کی اہم ضرورت کا احساس پیدا کر دیا۔

جب سے بنکوں کو نیشنلائز کیا گیا ہے تب سے بنکوں کے نظام میں خرابی آ گئی ہے اور بنکوں کے کارندے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اب وہ سرکاری ملازم ہیں اس لئے انہیں عوام سے تعاون کی کیا ضرورت ہے اور اسی وجہ سے ان بنکوں کے کارندوں کا رویّہ عوام کے تئیں گستاخانہ بلکہ ہتک آمیز ہونے لگا ہے مگر شمیم کاظم صاحب نے بمبئی مرکنٹائل بنک کے کارندوں کو اس قدر اچھا اخلاق اور مہذب رویّہ عوام کے ساتھ برتنے کی تاکید کر رکھی ہے کہ اس بنک کے حساب دار دوسرے بنکوں کے کارندوں سے یہ کہتے ہیں کہ بینکنگ کے سلسلہ میں حساب داروں سے گفتگو کرنے کا طریقہ بمبئی مرکنٹائل بنک کے کارندوں سے سیکھئے۔

بمبئی مرکنٹائل بنک نے عوام کو گھریلو آسائش کی چیزوں [illegible] کاروبار کے لئے آسانی سے قرض دے کر اکثر قرضے بھی اس ہیئت سے دیئے کہ آج ہزاروں گھروں میں ضرورت کی چیزیں [illegible] آسانی سے آسکنے کے ساتھ ساتھ ہزاروں غریب عوام اپنا کاروبار چلا کر عزت سے روزی کما رہے ہیں۔

دہلی میں اس بنک نے جہاں اپنا کاروبار شروع کیا تھا وہاں اب [illegible] کاؤنٹر اور شعبوں کے علاوہ کچھ اور شعبے قائم ہیں۔ ۱۱ دریا گنج پولیس اسٹیشن کے پاس [illegible] میں کرنٹ اکاؤنٹس کے علاوہ غیر ملکی بینکنگ نیز [illegible] پر تشریف لے جانے والوں کے لئے [illegible] شعبے قائم ہیں۔ اس شاخ کے مینیجر جناب [illegible] صاحب بھی شمیم کاظم صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عوام کے دلوں کو جیتنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۱۲ جون [illegible] کو بمبئی مرکنٹائل بنک کی گولڈن جوبلی دھوم دھام سے منائی گئی [illegible] کے چیئرمین اور [illegible] [illegible] منیجر جناب شمیم [illegible] [illegible] اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

آلودگی

ڈاکٹر حقیر آسانی

فکر میں آلودگی، افکار میں آلودگی
جس طرح بھی دیکھئے کردار میں آلودگی

کوئی بھی تیار سیدھی بات کرنے کو نہیں
سوچ میں آلودگی، گفتار میں آلودگی

کچھ نہیں ملتا یہاں جیسا کہ ہونا چاہیئے
دشت میں آلودگی کہسار میں آلودگی

اب ریا کی بات ہی کرنا غلط ہے جانِ من
لو سمٹ آئی دلِ بیمار میں آلودگی

بن گئی ہے مصلحت کوشی تقاضہ وقت کا
منصفی اقرار میں، انکار میں آلودگی

ذہنِ انسانی اگر محبوس رہتا ہو تو پھر
پھیل جاتی ہے، در و دیوار میں آلودگی

آدمی پھرتا ہے اندر سے شکستہ اے حقیر
گردشِ گرداب میں، منجدھار میں آلودگی



سرور تونسوی

۲۷ سال پہلے سُرسنگار سمند بمبئی کا

سالانہ انڈو پاک مُشاعِرہ

اس سال "سُرسنگار سمند" کی طرف سے سوامی ہری داس سنگیت سمیلن منایا گیا۔ سوامی ہری داس مشہور موسیقار تان سین کے گرو تھے۔ یہ تقریب ۱۷ فروری سے ۵ مارچ ۱۹۶۱ء تک جاری رہی۔ ملک کے مشہور موسیقار، رقاص، فنکار اور شعراء اس تقریب کے مختلف پروگراموں میں شامل ہوئے۔ اسی تقریب کے سلسلے میں ۲۵ فروری ۱۹۶۱ء کو ایک انڈو پاک مشاعرہ بھی کیا گیا جو سُرسنگار سمند کا چوتھا سالانہ مشاعرہ ہے۔ آئیے آپ بھی میرے ساتھ برلا ماتُشری سبھاگرہ (برلا ہال) بمبئی چلئے اور اس مشاعرہ سے لطف اندوز ہوجیئے۔

رات کے دس بجنے والے ہیں۔

مائیک پر شاعرِ شباب حضرت شکیلؔ بدایونی کی آواز آرہی ہے۔ فرما رہے ہیں:-

حضرات "سُرسنگار سمند" کے اس مُشاعرے میں صدرِ مجوزہ اور ہمارے مہمانِ خصوصی حضرت جوشؔ ملیح آبادی تشریف لے آئے ہیں۔ میں مُشاعرہ کمیٹی کے صدر جناب اسحاق قاسم، سمند کے ڈائریکٹر شری برج نرائن اور اپنی طرف سے صاحبِ صدر جناب وی شنکر آئی۔ سی۔ ایس اور مہمانِ خصوصی جناب جوشؔ ملیح آبادی اور دیگر بیرونی اور مقامی شعراء کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ صاحبِ صدر ہمارے لئے کوئی نئی ہستی نہیں ہیں اس لئے میں خود ہی تحریک اور خود ہی تائید کرتے ہوئے صاحبِ صدر سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ مسندِ صدارت سنبھالیں اور خطبۂ صدارت ارشاد فرمائیں۔

تالیوں کے طویل شور میں جناب وی شنکر صاحب مسندِ صدارت پر تشریف لائے اور دیکھیے نثر میں شاعری کرنی شروع کردی ہے۔ فرماتے ہیں:-

حضرات! شکیل صاحب نے آپ کو یہ یاد دلایا کہ میں بمبئی کے مشاعروں میں صدر کی حیثیت سے حاضر ہوتا رہا ہوں مگر آج کے مشاعرے کے لئے جو مجھے خوشی ہے وہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ایک تو یہ کہ اُردو کی خدمت کے لئے مجھے یہ خدمت سونپی گئی ہے دوسرے یہ کہ حضرت جوشؔ ملیح آبادی اس مشاعرے میں موجود ہیں۔ سُرسنگار سمند نے جہاں اُردو کی خدمت کی ہے وہاں موسیقی اور شاعری کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ شری برج نرائن جی کا میں شکر گذار ہوں۔ برج بھاشا تو ان کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ ہندی کے پریمی ہیں۔ انہوں نے اس مشاعرے میں جہاں مجھے اور آپ کو ممنون کیا ہے وہاں اُردو کی خدمت بھی کی ہے۔ موسیقی اور شعر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اُردو کئی ادوار سے گذر چکی ہے یہ خسروی محل میں پیدا ہوئی، ولی عہدی میں بڑھی اور میری حاصل ہوئی تو سودا بڑھا اور جب زوال کی طرف رجوع ہوئی تو ذوق سلامت رہا سخن غالب ہوا۔ دونوں سے علیحدگی کے بعد دل کے داغ سر سبز رہے جس پر حالی نے زبان کو پانی پر بہتی ہوئی بتی کی طرح سنبھالا تو اقبال بلند ہوا۔ پھر جگر نے سنبھالا اور جوش قائم رہا لیکن آخوش افسوس اس بات کا ہے کہ جوش نے دل کا ساتھ نہیں دیا اور دل نے جوش کا خیر! ان حادثات کو اُردو اسی طرح یاد کرتی رہے گی اور یہ کہتی رہے گی ؎

میرے حال تباہ پر مت جا
یہ حادثات ہیں زمانے کے

تالیاں ہیں کہ کچھ سُنائی نہیں دے رہا۔ صاحبِ صدر کے ایک ایک فقرے پر سامعین 'واہ' اور 'آہ' کر رہے ہیں۔ اس مختصر سی تقریر میں آپ نے جو چٹکیاں لی ہیں، باذوق حضرات ان کا لطف لے کر سر دھن رہے ہیں۔ صاحبِ صدر اپنی منثور شاعری کو جاری رکھتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ اُردو کے لئے قدر دانی محفوظ ہے تو اُردو

بھی ہموند ہے۔ برج نرائن جی نے اُردو کو ایک جگہ دی ہے۔ ان کا دل وسیع ہے لا محالہ بلند ہے اور خدا نے انھیں چار آنکھیں بھی عطا کی ہیں (برج نارائن جی چشمہ لگاتے ہیں) اس پر سامعین نے فلک شگاف قہقہہ لگایا ہے صاحبِ صدر فرما رہے ہیں کہ اس مشاعرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی یہاں موجود ہیں۔ ان کا تعارف کرانا آفتاب کو روشنی دکھانے کے مترادف ہے۔ جب میں جوشؔ سے ملا تو میرے دل میں اُردو کی خدمت کے لئے جوش پیدا ہوا اور میں اسی وقت سے اُردو کی خدمت کر رہا ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ اُردو ترقی کرے اور جوشؔ جیسی ہستیاں ہماری حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ اس کے بعد صاحبِ صدر نے فرمایا کہ اب میں شکیلؔ صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس مشاعرہ کی کارروائی شروع کریں۔

برج نارائن جی نے صاحبِ صدر اور حضرت جوشؔ کو ہار پہنائے ہیں اور شرینگار سمد کے طلائی تمغے پیش کئے ہیں۔

جناب شکیلؔ نے اعلان فرمایا ہے کہ مشاعرہ کا آغاز جناب ظہورؔ امرتسری فرما رہے ہیں۔ سنئے ظہورؔ صاحب فرما رہے ہیں۔

"غم سے کچھ دوستی نہیں ہوتی
زندگی میں خوشی نہیں ہوتی
غمِ دل اور بھی نکھرتا ہے
جب ستم میں کمی نہیں ہوتی
اس کو کھو کر کھلا یہ راز ظہورؔ
ہر خوشی دائمی نہیں ہوتی"

ظہورؔ صاحب بہت معمولی سی داد پا کر اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور جناب شکیلؔ نے سامعین کا شکیب و قرار لوٹنے کے لئے جناب شکیبؔ بنارسی سے کلام سنانے کو کہا ہے۔ لیجئے شکیبؔ صاحب مخمور دہلوی کے ترنم کی نقل کرتے ہوئے اپنا ہی شکیب و قرار گنواتے ہوئے زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں ؎

"میں نے جب ترکِ محبت کی قسم کھائی ہے
کیا ستم ہے کہ تری اور بھی یاد آئی ہے
دل پہ پھولوں کے جو گذرے ہے کوئی کیا جانے
لوگ بس اتنا سمجھتے ہیں بہار آئی ہے
کبھی رونا بھی جو چاہا تو نہ آنسو نکلے
اور کبھی یوں ہی مرے لب پہ ہنسی آئی ہے
لیجئے چاک گریباں بھی سئے لیتا ہوں
میری وحشت میں اگر آپ کی رسوائی ہے
دیکھ لیجئے وہ شکیبؔ دلِ محزوں تو نہیں
آپ نے جس کو مٹانے کی قسم کھائی ہے"

شکیبؔ کی غزل اچھی ہے مگر نقلی ترنم نے معاملہ جمنے نہیں دیا۔ لیجئے اب سامعین کے سمندِ شوق کو تازیانہ لگانے کے لئے جناب شوقؔ ساکی لکھنوی مائیک پر تشریف لائے ہیں بہت ہی اچھے ترنم میں فرما رہے ہیں ؎

مقصد میں نگاہوں کا تری جان گیا ہوں
اے دیکھنے والے تجھے پہچان گیا ہوں

صاحبِ صدر فرما رہے ہیں کہ حاضرین کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ اس پر ایک قہقہہ لگا ہے اور شوقؔ صاحب فرما رہے ہیں ؎

"مایوس پلٹ آئی ہیں مشتاق نگاہیں
جب دل میں لئے دید کا ارمان گیا ہوں
یہ بات صدا نقش رہے گی مرے دل پر
محفل سے تری ہو کے پشیمان گیا ہوں
حسرت کے سوا کچھ نہ ہوا بخیۂ گردوں سے
جس شہر میں بھی چاک گریبان گیا ہوں
ظاہر میں وفادار ہیں باطن میں جفاکار
اب آپ کو اچھی طرح پہچان گیا ہوں
کیا دیکھئے انجام ہو شوقؔ آج میں اُن کے
کچھ تلخ سے جملوں کا بُرا مان گیا ہوں

کچھ رسمی سی داد پا کر شوقؔ صاحب بھی اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور شکیلؔ صاحب نے جناب کاملؔ چاندپوری سے کہا ہے کہ وہ اپنی ضیا پاشی سے محفل میں کچھ رنگ بھریں۔ سنئے کاملؔ صاحب نغمہ سرا ہیں ؎

"چشمِ جاناں عطا ہو ایسا پیمانہ مجھے
ہوش میں آؤں تو کہیں لوگ دیوانہ مجھے
زندگی ہے عشق میں جل جل کے مر جانا مجھے
کہہ گیا کیا بات اک ننھا سا پروانہ مجھے
آ رہا ہے ساقیٔ رنگیں ادا ساغر بہ کف
ناصحا اس وقت جا پھر آ کے سمجھانا مجھے
اُٹھ رہی ہیں میری جانب وہ نگاہیں بار بار
مل رہا ہے آج بیگانہ پہ پیمانہ مجھے
مُدتوں آتے رہے جس کے تصور میں حضور
میں وُہی کاملؔ ہوں کیجئے اب تو پہچانا مجھے

افسوس ہے کہ کاملؔ چاندپوری کی ضیا پاشی بھی سامعین کے دلوں میں گرمی پیدا نہ کر سکی اور داد و ستائش کے الفاظ سننے میں نہیں آ رہے ہیں۔ اب شکیلؔ صاحب نے مشاعرے میں کچھ جان ڈالنے کے لئے محترمہ بینارانی نازؔ سے کلام سنانے کو کہا ہے۔ نازؔ صاحبہ اپنی روایتی سادگی اور متانت سے مائیک پر تشریف لائی ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

ہیں دل میں ہزاروں خارِ الم خاروں کا نظارا کیا ہوگا
معصوم نگاہِ اُلفت سے زخموں کا نظارا کیا ہوگا
آنکھیں بھی سلامت رکھی ہیں نظروں کو بھی زندہ رکھا ہے
پھولوں کی جگہ جب خار ملے خاروں کا نظارا کیا ہوگا
دُنیا سے گزرنے والوں کو دُنیا کے ستم سہنے ہوں گے
ہم دیکھ نہیں سکتے خود کو اوروں کا نظارا کیا ہوگا

بینارانی نازؔ بیرونی مشاعروں میں خوب کامیاب ہوتی ہیں مگر اہلِ بمبئی نے انھیں مقامی شاعروں میں داد دینے میں ہمیشہ بخل سے کام لیا ہے۔ یا تو یہ بات ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر اور یا پھر کوئی دوسرا معاملہ ہے جسے اہلِ بمبئی ہی بہتر جانتے ہیں۔ نازؔ صاحبہ بھی اپنی جگہ تشریف لے گئی ہیں اور اب سامعین کے دل و دماغ کو شاداب کرنے کے لئے شکیلؔ صاحب نے شادابؔ لاہوری کو کلام سنانے کی تکلیف دی ہے۔

شادابؔ صاحب نغمہ سرا ہوتے ہیں ؎

ایک خدا کے ڈر کو بہلنے اٹھ [illegible] جوانی ہائے زمانے

سب کچھ کہے پھر بھی نہ مانے اٹھ رہی جوانی ہائے زمانہ "

شاداب صاحب نے سامعین کے دلوں کو شاداب کرنے کے بجائے اپنی سوقیانہ اشعار سے سامعین کو اور بھی مایوس کر دیا ہے جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حاضرین نے ہوٹنگ شروع کر دی ہے۔ کاش کہ شاداب صاحب اِس عظیم الشان مشاعرے میں اچھے اشعار سُناتے۔ اب جناب اسد بھوپالی مائک پر تشریف لائے ہیں اور اپنے عیرِ دلکش ترنم سے ارشاد فرما رہے ہیں

" جب زندگی سکون سے محروم ہو گئی
اُن کی نگاہ اور بھی معصوم ہو گئی
اُن کی نظر کے کوئی اشارے نہ پا سکا
میرے جنوں کی چاروں طرف دھوم ہو گئی
آخر فریب ترک مراسم سے فائدہ
جو بات تھی زمانے کو معلوم ہو گئی "

اسد صاحب بھی اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سامعین کوئی سازش کر کے آئے ہیں کہ کسی شاعر کو داد نہیں دی جائے گی۔ مشاعرہ بالکل ڈل جا رہا ہے۔ سنیئے اب قمر بھوپالی نغمہ سرا ہو رہے ہیں ے

" آپ اپنی تمنا کا میں خود ہوں تماشائی
سورج کی کرن آخر شبنم کو نہ راس آئی
دل تھام کے اُن سے ہم رخصت تو ہوئے لیکن
گھبرا کے محبت تو آنکھوں میں چھلک آئی
تنہا ہو خیالوں میں جا تم ہو خیالوں میں
ہنگامے کا ہنگامہ تنہائی کی تنہائی
کانٹوں کی عنایت سے دامن بھی نہیں باقی
اللہ رے گلشن میں کیا خوب بہار آئی "

جناب قمر بھی اپنی تابانی سے محفل میں کچھ جان نہ ڈال سکے تو صاحب صدر نے اعلان فرمایا کہ حضرت جوش ملیح آبادی کلام بلاغت نظام عطا فرما رہے ہیں۔ گو اُن کا یہ مقام نہیں کہ اس مرحلہ پر کلام عطا فرمائیں مگر وقت اتنا نازک ہے کہ اُن سے ابھی کلام سُن لیا جائے تو بہتر رہے گا۔

شاعرِ انقلاب تالیوں کی جھنکار میں مائک پر تشریف لائے ہیں اور عطا فرما رہے ہیں ے

کیا شیخ کی تلخ زندگانی گزری
بیچارے کی اک شب نہ سہانی گزری
دوزخ کے خیالوں میں بڑھاپا بیتا
جنت کی دعاؤں میں جوانی گزری "

سینکڑوں بار مشاعروں میں سُنی اور رسائل و جرائد میں پڑھی ہوئی اِس رُباعی پر داد نہیں ملی اور جوش صاحب فرما رہے ہیں کہ بھئی مصرعہ اُٹھایا کرو۔ فرماتے ہیں ے

" خود کو گم کردہ راہ کر کے چھوڑا
حوا کو بھی تباہ کر کے چھوڑا
کیا کیا نہ کیے جنت میں خدا نے جتن
آدمؑ نے مگر گناہ کر کے چھوڑا "

شعراء نے مصرعے بھی اُٹھائے مگر سامعین کی پیدائش سے پہلے کا کہا ہوا کلام داد حاصل کرے تو کیسے۔ دو تین رُباعیات و قطعات کے بعد جوش صاحب نے ایک طویل نظم شروع کی ہے۔

" مجھے بیساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے "

جن اشعار کے سُننے سے مردوں کو حیا آ رہی ہو، وہاں بیچاری خواتین کا کیا حال ہوا ہوگا۔ جوش صاحب کا یہ ننگا کلام بھی داد نہ لے سکا تو شاعرِ انقلاب نے بمبئی کے ایک مشاعرہ کی طرح پر کہی ہوئی نظم سُنانی شروع کی ہے جس کے ایک دو بندوں پر داد کی کچھ آوازیں آئی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سامعین محض جوش کے مقام اور نام سے چپ چاپ پون گھنٹے سے اُن کا نصف صدی پُرانا کلام سُن رہے ہیں اور اگر کوئی اور شاعر ہوتا تو یقیناً ہوٹنگ ہو جاتی۔ میرے پاس مشہور فلم آرٹسٹ پنڈت بدری پرشاد، جناب قیصری بھوپالی، ایاز جھانسوی، شہر یار بیدار اور دیگر کئی شعراء تشریف فرما ہیں۔ ایک صاحب جو ہندی پریمی ہیں اور محض جوش صاحب کو سُننے تشریف لائے ہیں، بدری پرشاد جی سے مخاطب ہو کر فرما رہے ہیں کہ جوش صاحب کو سُن کر ہندی کوی نیرج یا مترسی کی ایک چوپائی یاد آ گئی۔

وہ فرماتے ہیں ے

" کابل سے اک گدھا منگایا بڑا دام دے کر آیا
جب اُس کی آواز سُنی تو اور گدھوں سا اس کو پایا۔

راقم الحروف نے جوش کو مشاعروں اور مخصوص نشستوں میں سینکڑوں بار سُنا ہے۔ مگر جس قدر مایوسی آج اُن کا کلام سُن کر ہوئی، ایسی حالت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جوش صاحب نے اپنی مرضی سے کلام سُنانا بند کیا تو شکیل صاحب نے جناب محشر امروہوی سے کلام سُنانے کی گزارش کی ہے۔ محشر صاحب اپنی سابقہ روایات کے مطابق مائک پر تشریف لائے ہیں۔ ایک قطعہ سُنانے کے بعد غزل شروع کی ہے فرماتے ہیں ے

" ہمارے زخمِ دل جتنے تھے سب قسمت سے پھل لائے
جو کل تم نے دیئے تھے اُن میں اب کانٹے نکل آئے
یہ میخانہ ہے اے واعظ یہاں کچھ سوچ کر آنا
گئے ہیں باعمل ہو کر یہاں جو بے عمل آئے "

محشر صاحب نے مشاعرے میں کچھ گرمی پیدا کی ہے اور داد و ستائش کی کچھ آوازیں سُنائی دینے لگی ہیں۔ شکیل صاحب نے جناب ایاز جھانسوی سے کلام سُنانے کی درخواست کی ہے۔ سنیئے ایاز شانِ محمودی کے خلاف اپنے اشعار سے کس طرح بُت و بُت خانے تعمیر کر رہا ہے۔

" مہکی ہیں فضائیں کس کے لئے چھائی ہیں گھٹائیں کس کے لئے
میخانے میں جب ساقی ہی نہیں میخانے میں جائیں کس کے لئے
جب مجھ سے نگاہیں ملتے ہی تم آج خفا ہو بیٹھے ہو
پھر یہ تو بتاؤ کل تم نے مانگی تھیں دُعائیں کس کیلئے "

ترنم لحنِ داؤدی کا آئینہ دار، شعر بالکل صاف اور بامعنی، داد ہے کہ جھولیاں بھر بھر کر دی جا رہی ہے۔ ہال میں پہلی بار داد نے اپنی اصلی شکل دیکھی ہے۔ سنیئے ایاز کیا کہہ رہا ہے ے

" ہنگاموں سے وہ ڈر جاتے ہیں تنہائی سے گھبرا جاتے ہیں
ہم شہر اُجاڑیں کس کے لئے ویرانے بسائیں کس کے لئے
ایک ایک جفا ہم نے تیری ہنس ہنس کے گوارا کر لی مگر
اب دیکھنا یہ ہے دل میں ترے باقی ہیں وفائیں کس کیلئے
وہ دیر و حرم کے دیوانے ہم طرزِ جنوں کے شیدائی
وہ ہوش گنوائیں کس کے لئے ہم ہوش میں آئیں کس کیلئے "

ایازؔ صاحب بہت معقول قسم کی داد پاکر اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور اب جناب تغلقؔ رہنوائی مائیک پر تشریف لائے ہیں مطلع فرماتے ہیں ؎

"کسی صورت جنوں کے فسانے سے شرح بیاں کر لیں
زباں پر گو نہ ہو قدرت نگاہوں کو زباں کر لیں"

ایک صاحب فرما رہے ہیں بڑی کڑک غزل ہے۔ میں نے بہری پرشادجی سے پوچھا یہ کڑک کیا بلا ہے؟ تو فرمانے لگے یہ بمبئی کی زبان ہے۔ اس کے معنی ہیں بڑی خشک قسم کی غزل ہے۔ دیکھا تو مطلع کے بعد جو شعر تغلقؔ صاحب نے سنایا اس پر ہوٹنگ ہو رہی تھی۔ اب شکیلؔ صاحب نے اعلان فرمایا کہ محترمہ زہرہؔ دیولالوی کلام سنا رہی ہیں۔ دیکھا تو اسٹیج پر جو زنانہ گیلری بنی ہوئی ہے اس میں سے ایک محترمہ مائیک کی طرف تشریف لا رہی ہیں جن کے چہرے سے یادؔ دہلوی کا چہرہ ہیں۔ آپ نے ایک قطعہ تحت اللفظ میں سنا کر غزل ترنم سے شروع کی ہے۔ فرماتی ہیں ؎

مٹ کے سارے صنم رہ گئے عاشقانِ حرم رہ گئے

ہائے کم بخت دل اور فگار ایم۔ اسے کہاں یاد آیا۔ اُن کا ایک قطعہ ہے۔

پڑھ رہے تھے جناب فنا اُن کی زلفوں میں خم رہ گئے
تو علی بیچ میں بول اُٹھے بحر کے رکن کم رہ گئے۔

زہرہؔ صاحبہ کا ترنم اچھا نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ وہ تحت میں ہی کلام سنایا کریں۔ آپ کا مقطع بھی سن لیجئے۔ فرماتی ہیں ؎

"چل دیئے سارے زہرہ جبیں نام کے اب صنم رہ گئے"

اب اعلان ہوا ہے کہ جناب صباؔ افغانی کلام مرحمت فرما رہے ہیں۔ آپ کے فلمی گانے تو اکثر سنے تھے خواہش تھی کہ انھیں کسی ادبی مشاعرے میں سنا جائے۔ آیئے آپ بھی انھیں میرے ساتھ سنیئے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

"سامنے اُن کو پایا تو ہم کھو گئے آج پھر حسرتِ گفتگو رہ گئی
ان سے کہنا تھی روداد شامِ الم دل کی دل میں ہی آرزو رہ گئی
عشق کے سایئے میں اک نفس ڈھل گیا ان کی محفل میں یہ دور بھی چل گیا
اک تصور سے سارا دل جل گیا، صنبد غم کی مگر آبرو رہ گئی
تیرے نقشِ قدم بھی بجا بجا تیری محفل تیرا آستاں بھی ملا
ہاں مگر تو کسی کو نہیں مل سکا ہو کے ناکام ہر جستجو رہ گئی
دل میں حسرت ہے آغوش کا اک گلستاں چمن گئی ہیں بہاروں سے رنگینیاں
اب گلوں میں وہ پہلی سی نکہت کہاں عارضی رونقِ رنگ و بو رہ گئی
ناز صاحب یہ ہم کو انھیں کی قسم وہ تو الفت میں نکلے نہ ثابت قدم
بیکسی کے اندھیروں میں آ شامِ غم ایک ہم رہ گئے ایک تو رہ گئی
اللہ اللہ یہ تیرے حسن کی اک جھلک روشنی ہو گئی تا زمیں از فلک
ایک بجلی سی لہرائی کچھ دیر تک پھر مچل کر مرے روبرو رہ گئی
آنکھ سے آنکھ اور دل سے دل جب ملا جانے ان کی نگاہوں نے کیا کر دیا
میری آنکھوں میں اس روز سے اے صباؔ کھینچ کے تصویر جام و سبو رہ گئی"

صباؔ صاحب نے اس غزل پر خوب داد پائی ہے اور غزل ہے بھی قابلِ تعریف۔ صباؔ صاحب اپنی جگہ پر تشریف لے آئے تو اعلان ہوا کہ اب جناب ظفرؔ گورکھپوری کلام سنائیں گے۔ ظفرؔ صاحب مائک پر تشریف لے آئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ میری نظم کا عنوان ہے "مسکراتے زخم" جو "تو ممبا" سے متعلق کہی گئی ہے۔ چونکہ نظم تو ممبا سے متعلق ہے اس لئے کچھ داد لے گئی ورنہ نظم بس نظم ہی سی تھی۔ اب اعلان ہوا ہے کہ مس احمدی تبسمؔ پونوی کلام سنا رہی ہیں۔ یہ کم عمر بچی سمٹی سمٹائی سی مائک پر تشریف لائی ہیں اچھے انداز اور اچھے ترنم سے مطلع پڑھا ہے ؎

"اُن کی محفل سے جو ہم رنج و الم لے کے اُٹھے
نقش ہیں آج بھی دل پر وہ ستم لے کے اُٹھے
آنکھیں بھیگی ہوئی پلکوں پہ لرزتے آنسو
یہ دیا تم نے ہمیں اور یہ ہم لے کے اُٹھے"

اگر تبسمؔ صاحبہ مشورہ قبول فرمائیں تو یہ شعر غزل سے حذف کر دیں۔ تبسمؔ صاحبہ ارشاد فرما رہی ہیں ؎

"فرصتِ رنج نہ دی جورِ مسلسل نے کبھی
شب کٹی رو کے سحر دامنِ نم لے کے اُٹھے
رُک گیا دورِ مئے ناب کا ہم سے پہلے
ہم تصور میں فقط ساغرِ جم لے کے اُٹھے
اور بھی بڑھ گئی بیمار کی جاں مشکل میں
مرنے والے سے وہ جینے کی قسم لے کے اُٹھے"

اس شعر پر تو داد نے شورِ قیامت کا سا دھارن کر لیا ہے۔ اس وقت تک کسی شعر پر اتنی داد کسی شاعر کو نہیں ملی۔ تبسمؔ سے یہ شعر کئی بار پڑھوایا گیا ہے۔ سنیئے تبسمؔ صاحبہ مقطع فرما رہی ہیں ؎

"جیتے جی ایک تبسمؔ بھی میسر نہ ہوا
اور اُٹھے تو بڑی دولتِ غم لیکے اُٹھے"

تبسمؔ صاحبہ بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے آئی ہیں۔ اب اعلان ہوا ہے کہ جناب سحرؔ جلگاؤں کلام سنا رہے ہیں سحرؔ صاحب نے چار مصرعے ارشاد فرمائے ہیں ؎

"آنکھوں آنکھوں میں کوئی بات بھی ہو جاتی ہے
ورنہ پھر جھوم کے برسات بھی ہو جاتی ہے
یوں تو ہر روز نہ ملنے کی قسم کھاتے ہیں
ویسے ہر روز ملاقات بھی ہو جاتی ہے"

داد دینے والے حضرات میں سے کوئی صاحب یہ بتانے کی تکلیف گوارا کریں گے کہ پہلے دو مصرعوں میں کیا ربط ہے۔ اب جناب سحرؔ نے غزل شروع کی ہے۔

"وہ رنگین نظروں سے اوجھل دیکھنے والے دیکھ کے چل"

جناب علی سکندر وجدؔ کی اس زمین میں ایک مشہور غزل ہے۔ سحرؔ صاحب نے اس زمین میں غزل کہی تو کچھ برا نہیں کیا۔ مگر وجدؔ صاحب کے ترنم کی نقل فرمائی گئی ہے یہ بھونڈا پن ہے اور یہی بھونڈا پن ہوٹنگ کا کارن بن گیا ہے۔ سحرؔ صاحب ہوٹنگ کے شور میں فرما رہے ہیں "مقطع سن لیجئے۔" ارشاد ہوا ہے ؎

"وہ بھی سحرؔ کیا جھوم رہے ہیں بھا گئی اُن کو میری غزل"

ایک آواز آئی ہے "جھوم نہیں رہے ہوٹنگ کر رہے ہیں۔" اس پر ایک قہقہہ لگا ہے اور سحرؔ صاحب اپنی جگہ تشریف لے آئے ہیں اور شکیلؔ صاحب نے بڑے اچھے تعارف کے بعد شہریار پرواز کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے۔ سنیئے پروازؔ صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

"یہ کہہ کر دل کو ہم بہلا رہے ہیں
ابھی کچھ دیر میں وہ آ رہے ہیں
تغافل ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے
زمانے ہیں کہ بیتے جا رہے ہیں

ذرا یہ راز آئینے سے پوچھو
مہ و خورشید کیوں شرما رہے ہیں
سمجھتے ہیں کہ اِک دھوکہ ہے الفت
مگر ہم ہیں کہ دھوکہ کھا رہے ہیں "

پرواز صاحب بہت اچھی داد پا کر اپنی جگہ تشریف لے آئے ہیں۔ اب اعلان ہوا ہے کہ جناب شعری بھوپالی کلام عطا فرما رہے ہیں۔ شعری مشاعروں کی نبض پہچانتے ہیں انھوں نے داد حاصل کرنے والا پُرانا کلام سُنانا شروع کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

"امیدوں کے خلاف انساں اگر ناکام ہوتا ہے
سحر کا وقت بھی اُس کی نظر میں شام ہوتا ہے
قیامت ہے یہ کہہ کر اُس نے لوٹایا ہے قاصد کو
کہ اُن کا تو ہر اِک خط آخری پیغام ہوتا ہے "

داد پانے کے بعد ارشاد ہوا ہے۔

" محبت مکاں ہے محبت مکیں ہے
حسینوں کا دُنیا میں کوئی نہیں ہے
بہت مہ جبیں ہے بہت نازنیں ہے
مرا عشق تم سے زیادہ حسیں ہے
تم اپنی نظر سے بھی خود کو نہ دیکھو
محبت کو یہ بھی گوارا نہیں ہے
تڑپ دونوں جانب برابر ہے لیکن
نہ اُن کو یقیں ہے نہ مجھ کو یقیں ہے
سکونِ اَلم کی دُہائی ہے شعری
کئی روز سے اُن کو دیکھا نہیں ہے "

شعری خوب خوب داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر آرہے تھے کہ سامعین کے پُر زور اصرار سے انھیں دوسری غزل سُنانی پڑی ہے فرماتے ہیں ؎

" نظر سے نظر نے ملاقات کر لی
رہے دونوں خاموش اور بات کر لی
زمانے میں اُس نے بڑی بات کر لی
خود اپنے سے جس نے ملاقات کر لی
عجب حال ہے اپنا دیوانگی میں
کہیں دن گزارا کہیں رات کر لی
سرِ بزم اُس نے ہمارے علاوہ
اِدھر بات کر لی، اُدھر بات کر لی "

شعری غزل سُنانے اور خوب خوب داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر آرہے تھے کہ دل لکھنوی نے فرمایا کہ شعری نے یہ دھندے والی بات کی ہے۔ واللہ کیا اسلامی ہاتھ دکھایا ہے۔ اس پر اسٹیج پر بیٹھے ہوئے اصحاب نے ایک قہقہہ لگایا ہے اور شعری صاحب فرمارہے ہیں کہ شاعر میں ایسے اشعار ہی کامیاب ہوتے ہیں"۔ اب جناب اصغر مرزا پوری تشریف لائے ہیں۔ اُن کا مطلع ہی سُن لیجئے ؎

" دردِ دل بڑھ کے راحت رساں ہو گیا
دشمنِ جاں بھی آرامِ جاں ہو گیا "

اصغر صاحب کے بعد جناب اکمل حیدر آبادی مائک پر تشریف لائے ہیں۔ ان کا بھی مطلع ہی سُن لیجئے۔ فرماتے ہیں ؎

" نہ جام و ساغر سے اُس کی یاری نہ اُس کا صہبا سے دوستانہ
تری نگاہوں سے جو بھی پی لے وہ بھول جائے خراب خانہ "

اکمل صاحب کو غزل پر اچھی داد ملی ہے۔ اب اعلان ہوا ہے کہ ہندوستان کی مشہور شاعرہ روحی دہلوی کلام سُنا رہی ہیں۔ جناب خمار بارہ بنکوی کی فرمائش پر روحی صاحبہ غزل سُنا رہی ہیں۔

ہم محبت میں آہ کرتے ہیں   جیسے کوئی گناہ کرتے ہیں
وہ جدھر بھی نگاہ کرتے ہیں   سارا عالم تباہ کرتے ہیں
کھا چکے ہیں فریب دُنیا کے   پھر بھی دُنیا کی چاہ کرتے ہیں
ہم مزاجِ گل و سمن پا کر   خار و خس سے نباہ کرتے ہیں
دل کو بھی کچھ خبر نہیں ہوتی   دل میں کچھ یوں نگاہ کرتے ہیں
ہم فرشتے نہیں ہیں اے واعظ!   آدمی ہیں گناہ کرتے ہیں "

داد تو روحی کو ہر شعر پر مل رہی ہے مگر اس شعر پر تو داد نے شورِ قیامت کا سماں باندھ دیا ہے کئی بار روحی صاحبہ نے یہ شعر سُنانے کے بعد مقطع سُنایا ہے ؎

"بے وفا زندگی سے ہم روحی   زندگی بھر نباہ کرتے ہیں "

دہلی میں کڑاکے کی سردی تھی اور بمبئی آتے ہی رات کو بھی پنکھے چلانے پڑے۔ موسم کی اس اچانک تبدیلی سے روحی صاحبہ نزلہ کو زکام میں بُری طرح مبتلا ہو گئی ہیں۔ اِس لئے گزشتہ سال کی طرح اپنا رنگ تو نہیں جما سکیں تاہم اُن کی یہ غزل اتنی کامیاب رہی کہ سامعین کے اِصرار پر انھیں ایک دوسری تازہ غزل سُنانی پڑی۔ اِرشاد ہوا ہے۔

" کانٹوں کی خلش کو جو گوارا نہیں کرتے
پھولوں کے تبسّم کی تمنا نہیں کرتے "

صاحبِ صدر شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، ایاز جھانسوی، شعری بھوپالی اور دوسرے شعراء نے مطلع پر خوب خوب داد دی ہے مطلع کے بعد ارشاد ہوا ہے ؎

" ہم سجدہ گزارِ درِ مے خانۂ دل ہیں
ہم کعبہ و بت خانے میں سجدہ نہیں کرتے
بربادِ تمنا ہیں مگر اہلِ تمنا
کچھ بات ہے جو ترکِ تمنا نہیں کرتے "

داد ہے کہ سامعین کے اہلِ ذوق ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔ روحی فرما رہی ہیں ؎

" جو ہمت و تدبیر پہ رکھتے ہیں بھروسہ
وہ شوئے تقدیر کا شکوہ نہیں کرتے
جب تک نہ ہو ساقی کی نگاہوں کا اشارہ
میخوار طوافِ مے و مینا نہیں کرتے
جو عشق کے آداب سے واقف ہیں وہ روحی
مر جاتے ہیں پر حسن کو رُسوا نہیں کرتے "

روحی داد و ستائش کی آوازوں میں اپنی جگہ تشریف لے آئی ہیں اور شکیل صاحب نے اعلان کیا ہے کہ اب نواب بیگم سیدہ اختر حیدر آبادی کلام سُنا رہی ہیں۔ محترمہ مائک پر تشریف لائیں تو سامعین میں ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا ہے سیدہ اختر کیل کانٹے سے لیس ہیں دو چوٹیاں پابوسی کر رہی ہیں، لباس کافی بھڑکیلا اور چست ہے جس سے اُن کے جسم کی بناوٹ عجیب کیفیت دکھائی دے رہا ہے۔ بلوز کی سلیب جالی کی ہیں۔ سُنئے سیدہ اختر ارشاد فرما رہی ہیں ؎

" حوادث کو خاطر میں کب لا رہی ہوں
جدھر چل پڑی ہوں چلی جا رہی ہوں "

پھبتیوں کا ایک سیلاب ہے کہ رکنے میں نہیں آرہا ہے۔ مختار صاحب فرما رہے ہیں "ادھر چل پڑی ہوں [illegible] رہی ہوں" اس مصرعہ کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اسے دوبارہ سہ بارہ عنایت فرمائیے اور سیدہ ہیں کہ یہ مطلع بار بار پڑھ رہی ہیں۔ اس کے بعد ارشاد فرماتی ہیں ؎

"ہر اک گام جادہ ہر اک گام منزل
ادھر آرہی ہوں اُدھر جا رہی ہوں"

مختار صاحب ہیں کہ سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کر رنگ باندھ رہے ہیں اور سامعین ہیں کہ اُن کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہو رہا ہے اور سیدہ اگلا شعر فرما رہی ہیں ؎

"مبارک یہ سود و زیانِ محبت!
جو کچھ کھو رہی ہوں وہی پا رہی ہوں"

مشہور فلمی گانے ؏

"بگڑی بنانے والے بگڑی بنا دے
نیا ہماری پار لگا دے"

کی دُھن پر اختر صاحبہ غزل سُنا رہی ہیں اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اُنھوں نے شعراء اور سامعین سب کی کوفت دُور کر دی ہے۔ سُنیئے سیدہ صاحبہ کس قدر اچھا شعر فرما رہی ہیں ؎

"جواب محبت اب آئے نہ آئے
سوالِ محبت کئے جا رہی ہوں"

ہر شعر مختار صاحب نے اختر صاحبہ سے چار مرتبہ پڑھوایا ہے اور جی بھر کر لطف اُٹھایا ہے۔ سیدہ ارشاد فرما رہی ہیں ؎

"سرورِ محبت کو ہمراہ لے کر
دو عالم پہ چھائی چلی جا رہی ہوں
یہ آزادیاں ہیں کہ چنگاریاں ہیں
ہر اک گام اک آگ سی پا رہی ہوں"

اختر صاحبہ غزل سُنا کر اور شعراء و سامعین کو پیٹ بھر ہنسا کر اپنی جگہ تشریف لے آئی ہیں مگر مختار صاحب اور سامعین نے سینما ہال کے چوتھی کلاس والوں کی طرح سیٹیاں بجا بجا کر اور پُرزور تالیاں بجا بجا کر سیدہ کو ایک دوسری غزل سُنانے پر مجبور کر دیا ہے۔ سیدہ فرما رہی ہیں کہ آپ لوگ ہوٹنگ کر رہے ہیں۔ اس پر مختار صاحب فرمانے لگے کہ آپ غلط کہیں، یہ تو داد دے رہے ہیں۔ آپ ہماری داد کو ہوٹنگ کہہ کر ہماری توہین نہ کیجئے اور دوسری غزل مرحمت فرمائیے۔ اس پر سیدہ صاحبہ نے ایک غزل اور سُنائی ہے اور اس پر بھی ویسی ہی داد پائی ہے جیسی کہ پہلی غزل پر پائی تھی۔ اب جناب عبداللہ ناصر صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ یہ بمبئی کے مزاحیہ شاعر ہیں۔ آپ نے وہی پُرانے قطعات و اشعار سُنائے ہیں جو اکثر اوقات مشاعروں میں سُناتے رہے ہیں۔ سُرسنگار کے گزشتہ مشاعروں میں جو کلام اُنھوں نے سُنایا وہی اب کی مرتبہ سُنایا ہے مگر اب کے داد کچھ نہیں ملی ہے۔ اب اعلان ہوا ہے کہ جناب سلامت خیرآبادی کلام عطا فرما رہے ہیں۔ سنیئے سلامت صاحب کتنے اچھے اشعار مرحمت فرما رہے ہیں ؎

"دولت کے لئے اچھے اچھے ایمان بدلتے رہتے ہیں
یہ دور ہی ایسا آیا ہے انسان بدلتے رہتے ہیں
کل تیر و تفنگ کی طاقت تھی ہے ایٹم بم کا آج چلن
انساں کی ہلاکت کے تیزی سے سامان بدلتے رہتے ہیں
وہ بُلبل ہو کہ پروانہ ہیں جتنے مُنہ اُتنی باتیں
ہر لب پہ فسانہ میرا ہے عنوان بدلتے رہتے ہیں
اک آتا ہے اک جاتا ہے اور محفل کا ہے رنگ وہی
ساقی کی نوازش جاری ہے مہمان بدلتے رہتے ہیں"

سلامت صاحب کو غزل پر بہت اچھی داد ملی ہے۔ اب جناب رمیش رام پوری مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

"سرِ راہ اُن سے نظر ملی تو دلوں کے زخم اُبھر گئے
میں نظر اُٹھا کے جھجک گیا وہ نظر جھکا کے گزر گئے
اُنھیں اعتماد ہے آپ پر اُنھیں گیسوؤں کی ہو فکر کیا
جو بکھر گئے تو بکھر گئے جو سنور گئے تو سنور گئے
کبھی اتفاق سے وقتِ شب جو نقاب رُخ کی اُلٹ گئی
کہیں ذرہ ذرہ چمک اُٹھا، کہیں جانے [illegible] بکھر گئے"

رمیش صاحب کو ان تین اشعار پر بہت داد ملی ہے۔ اب اعلان ہوا ہے کہ جناب راز اِلہ آبادی کلام سُنا رہے ہیں۔ راز صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں اور پورے اعتماد کے ساتھ جم کر مطلع پڑھا ہے ؎

"آشیاں جل گیا گلستاں لُٹ گیا ہم قفس سے نکل کر کدھر جائیں گے
اتنے مایوس صیاد سے ہو گئے اب رہائی ملی تو کدھر جائیں گے"

داد کا ریلا ہے کہ تھمنے میں نہیں آرہا۔ کسی شاعر کو اتنی داد نہیں ملی جتنی کہ راز صاحب کو مطلع پر مل گئی ہے۔ چار بار مطلع پڑھنے کے بعد ارشاد ہوا ہے ؎

"اور کچھ دن یہ دستورِ میخانہ ہے تشنہ کامی کے یہ دن گزر جائیں گے
میرے ساقی کو نظریں اُٹھانے تو دو جتنے خالی ہیں سب جام بھر جائیں گے"

داد کا اب بھی وہی حال ہے۔ اگر راز صاحب بُرا نہ منائیں تو دوسرے مصرعہ میں "سب" کی جگہ "پیمانے" کر دیں تو بہتر رہے گا کیونکہ "آنے" کے بعد "سب" زائد ہے۔ راز نغمہ سرا ہیں ؎

"اے نسیمِ سحر تجھ کو اُن کی قسم اُن سے جا کر نہ کہنا مرا حالِ غم
اپنے مٹنے کا غم تو نہیں ہے مگر ڈر یہ ہے اُن کے گیسو بکھر جائیں گے"

داد حسبِ سابق مل رہی ہے۔ بلکہ یوں کہئے اس مشاعرہ میں سب سے زیادہ کامیاب راز اِلہ آبادی رہے ہیں۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں بھی "ڈر" کی جگہ "غم" بہتر رہے گا (راز صاحب سے معذرت کے ساتھ) داد و ستائش کی آوازوں میں راز صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

"اشکِ غم لے کے آخر کہاں جائیں ہم آنسوؤں کی یہاں کوئی قیمت نہیں
آپ ہی اپنا دامن بڑھا دیجئے ورنہ موتی زمیں پر بکھر جائیں گے
کالی کالی وہ زلفیں وہ مشکیں دہن۔ وہ تبسم کا عالم وہ چین در چین
ہے کہیں ان کا تصور دل میں اگر اب وہ آئیں بھٹک کر کدھر جائیں گے"

راز پہلی مرتبہ بمبئی تشریف لائے ہیں اور انھیں اتنی کامیابی ہوئی ہے کہ جس پر اکثر شعراء رشک کر رہے ہیں۔ داد و ستائش کی آوازوں پر کچھ سُنائی نہیں دے رہا ہے۔ سنیئے راز صاحب فرما رہے ہیں ؎

"موت آئی نہ تھی ہے شاید اُنھیں جا نہ اُنھیں دنیا اہلِ دل
راز ایسے میں کوئی غزل چھیڑ دو تا نغمہ زندگی کے ٹھہر جائیں گے"

نازؔ کی یہ غزل سن کر کہنا پڑتا ہے کہ گو غزل ہمارے شعری ادب کا ایک گرانقدر سرمایہ ہے۔ یہ صنفِ سخن مختلف ادوار سے گذری ہے لیکن اس کے مزاج دانوں نے کہیں بھی اس کی اصل حیثیت کو متاثر نہیں ہونے دیا حقیقی جذبات یا جذبات کی حقیقت جس خوبصورتی و دلکشی غزل کے پیمانے میں ڈھلی ہے، اس تاثیر و جذبہ کی مثال کسی دوسری صنف سخن میں نہیں ملتی۔ غزل کا انداز طربیہ بھی رہا ہے اور المیہ بھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ المیہ نے بھی دل میں جو کیفیت پیدا کر دی ہے وہ کہیں طربیہ کے خوشگوار پہلو میں دکھائی نہیں دیتی غزل ایک ایسی پری ہے جس کے ہر روپ سے فکر، جذبہ، شعور اور احساس نے پیار کیا ہے۔ رازؔ صاحب سے بہ اصرار صد ہزار ایک غزل اور سنی گئی ہے لیکن نہ تو انھوں نے دل لگا کر پڑھی ہے اور نہ ہی یہ غزل پہلی غزل کی طرح جم سکی ہے۔

اب اعلان ہوا ہے کہ حضرت دلؔ لکھنوی مائیک پر تشریف لا رہے ہیں۔ دلؔ لکھنوی نے چند پرانے قطعات اور دو غزلیں سنائی ہیں اور بے انتہا داد پائی ہے۔ یہ قطعات اور غزلیں اکثر مشاعروں کی رُوداد میں 'شانِ ہند' میں شائع ہو چکی ہیں۔ دلؔ صاحب کے بعد جناب انورؔ مرزاپوری مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ آپ نے اپنی غزل "میں کیسے سوجاؤں" سنائی ہے اور اتنی داد پائی ہے کہ انھیں خود بھی اتنی داد ملنے کا یقین نہیں تھا۔ ایمانداری کی بات بھی یہ ہے کہ انورؔ صاحب کی یہ غزل بہت ہی پیاری ہے اور انھوں نے یہ غزل نہ معلوم کسی عالم میں کہہ لی ہے، ورنہ ایسی غزلیں عام طور پر نہیں ہوتیں۔ یہ غزل سنانے کے بعد انورؔ صاحب کو سامعین کے اصرار پر ایک غزل اور سنانی پڑی ہے اور انھوں نے خوب خوب داد پائی ہے۔ اب اعلان ہوا ہے کہ جناب نازکؔ لکھنوی مزاحیہ کلام سنائیں گے۔ نازکؔ صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ ابھی انھوں نے ایک شعر پورا بھی نہ پڑھا تھا کہ ہوٹنگ شروع ہو گئی ہے اور وہ چُپ چاپ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے ہیں۔ شکیلؔ صاحب فرما رہے ہیں کہ حضرت خمارؔ بارہ بنکوی کلام بلاغت نظام مرحمت فرما رہے ہیں۔ لیجئے جناب خمارؔ نغمہ سرا ہیں ؎

علم و فن کے دیوانے عاشقی سے ڈرتے ہیں
زندگی کے خواہاں ہیں زندگی سے ڈرتے ہیں
یوں تو ہم زمانے میں کب کسی سے ڈرتے ہیں
آدمی کے مارے ہیں آدمی سے ڈرتے ہیں

اس شعر پر بہت زیادہ داد دی گئی ہے۔ سُنئے خمارؔ صاحب کس قدر بہترین شعر سنا رہے ہیں ؎

جب نہ ہوش تھا ہم کو دشمنی سے ڈرتے تھے
اب جو ہوش آیا ہے دوستی سے ڈرتے ہیں
جل کے آشیاں اپنا خاک ہو چکا کب کا
آج تک یہ عالم ہے روشنی سے ڈرتے ہیں

داد ہے کہ کلام کے شایانِ شان دی جا رہی ہے اور خمارؔ صاحب فرما رہے ہیں ؎

جو ملے زمانے کو رنج دہ سر آنکھوں پر
جو ملے ہمیں تنہا اُس خوشی سے ڈرتے ہیں
توبہ اور جوانی میں! اے خمارؔ کیا کہنا
لوگ آپ جیسے بھی آدمی سے ڈرتے ہیں

لیجئے خمارؔ غزل سنانے اور بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں اور اب جناب جاں نثار اخترؔ صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں اور حسبِ ذیل چار مصرعے سنا کر اپنی جگہ پر لوٹ آئے ہیں ؎

یہ تیرے گیت میرے دل کا درماں ہو نہیں سکتے
تو اِن گیتوں سے میرے دل کو بہلائے تو کیا ہوگا
وہ جس کے خون میں جل بجھے ہوں سیکڑوں شعلے
تو اُس کے قلب کو شبنم سے گرمائے تو کیا ہوگا

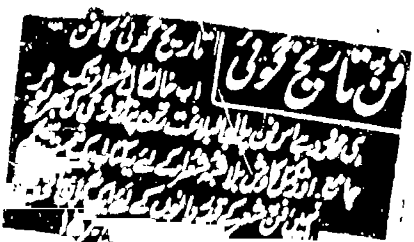
سُنئے صاحبِ صدر فرما رہے ہیں کہ اب حضرت شکیلؔ بدایونی کلام مرحمت فرمائیں گے شکیلؔ صاحب اپنے مخصوص ترنم میں نغمہ سرا ہیں ؎

یہ قفس ہی مجھ کو عزیز ہے یہاں جی تو لوں گا قرار سے
مجھے اب چمن میں نہ لے چلو میں ڈرا ہوا ہوں بہار سے
میں بغیر سجدہ گزر گیا تھا رواں دواں دِرِ یار سے
مرا عشق آج بھی سرگراں ہے اسی گناہ کے بار سے

داد و ستائش کے شور میں شاعرِ شباب شکیلؔ فرما رہے ہیں ؎

مرا عزم ترکِ وفا بجا مگر آہ اس کو میں کیا کروں
کہ وہ خود بھی ہو گئے مطمئن مرے اس طریقۂ کار سے
جو ہے بلبلوں کو غمِ سخن تو گلوں کو چاک ہیں پیرہن
ہے ہر ایک نوحہ گر چمن کوئی خوش نہیں ہے بہار سے

حضرت شکیلؔ نے غزل ختم ہونے ہی مشاعرے کے ختم ہونے کا بھی اعلان فرما دیا ہے۔



آپ کے کُنبے میں جب بھی کوئی

پیدائش

یا

موت ہو

تو اُسے مقامی اندراج دفتر میں درج ضرور کرائیں

یہ معاون ہوتا ہے

پیدائش کا سرٹیفکیٹ کام آتا ہے

- اسکولوں میں داخلے
- نوکری حاصل کرنے
- ووٹ کے حق
- ڈرائیونگ لائسنس
- پاسپورٹ لینے کے لئے
- بیمہ پالیسی کے لئے

موت کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے

- موروثی جائیداد
- بیمے کی رقم
- جائیداد میں حصہ کا تصفیہ کرانے کے لئے

اندراج بروقت کرائیے
اور سرٹیفکیٹ بِلا معاوضہ حاصل کیجئے

پیدائش اور موت کا اندراج کرانا قانوناً لازمی ہے
تاخیر سے کئے گئے رجسٹریشن بھی قابلِ قبول ہوں گے

رجسٹرار جنرل، انڈیا

davp 88/126

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

اردو دُنیا میں خلفشار و سلحشوری

ہمارے مُلک کے جمہوری نظام میں رقہ وارانہ ذہنیت اور غیر سیکولر فکر و کردار کے لوئی جگہ نہیں ہے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی نیز اسی لعنت کے زائیدہ و پروردہ لسانی مناقشے اور علاقائی جھگڑے فساد ایسے عناصر پھیلانے والوں کو رون ملک سے شہ مل رہی ہے۔ 'شہابیت' 'ناریت' 'دیورسیت' وغیرہ جو اشتعال کے دے ہی ہیں' وہ مُلک و قوم کو تباہ و خاکستر کرنے والی تیں ہیں۔ ویسے فرقہ وارانہ کشیدگی اور لسانی زتے شہری زندگی ہی کی وبائیں ہیں' دیہات زندگی بالعموم ان بیماریوں سے محفوظ رہتی ہے ں مضمون میں صرف ایک مرض ہی کا جائزہ جائے گا۔ وہ مرض جس کو لسانی سلخشوری ے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے' ابھی تک ۂ نہیں کیا جا سکا ہے۔ بُنیاد پرست ذہنیت ناپرستی ہی کو قابلِ مذمت کہنے لگتی ہے' پہلے ے مثال پر توجہ مبذول کیجئے!

عزت مآب سید مظفر حسین برنی نے اقبال اور شعرِ اقبال کو ہندوستانی ثقافت کے تناظر میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ظلمت زدہ قوتیں اپنی کمین گاہوں سے حملہ آور ہونے کی کوششوں میں مصروف ہو گئیں۔ ایک نا سمجھ صاحب یہ فرمانے لگے کہ اسلام میں خدا کے علاوہ کسی کی پرستش جائز نہیں ہے لہٰذا اقبال کو وطن پرست کہنا حماقت سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ یہ اعتراض اس حقیقت کا غماز ہے کہ اس نوع کے معترضین فارسی سے قطعاً ناواقف ہیں۔ تعمیر پرستی کسے کہیں گے؟ "شاہجہاں تعمیر پرست بود" یعنی شاہجہاں کو تعمیرات سے والہانہ عشق تھا۔ وطن پرستی سے بھی کچھ مُراد لیا جاتا ہے' یعنی وطن سے والہانہ عشق اور بس!

اب اُردو سے متعلق صورتِ حالات پر نظر ڈالئے امرت رائے نے جو بغایت اُدبیاتی خد و خال کے حامل ہیں اور ہندی افسانوی اَدب میں ممتاز مقام و مرتبہ رکھتے ہیں' ایک معیاری تصنیف A House Divided سپُردِ قلم کی ہے۔ موصوف نے انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کیا ہے اور وہ صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں۔ اُردو کی دانشوری ایسے بڑے تحقیقی و معیاری پیشکش کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اُردو والوں کا مبلغِ علم بس لسانیاتی سلحشوری ہی تک محدود ہے اس کتاب کے ہیے " ہندی / ہندوی کا ارتقاء و نشو و نما" ایسے اَہم موضوع پر کوئی دوسری کتاب نہیں لکھی گئی۔ ماہرینِ لسانیات نے اب تک جو کچھ کہا ہے' اس سب کو تو پیشِ نظر رکھا ہی گیا ہے مزید برآں امرت رائے نے تمام تر ماخذ و منابع تک رسائی حاصل کی اور سبے شمار اردو و فارسی کے مخطوطات بھی دیکھ ڈالے۔ امرت رائے نے بڑے معروضی طریقہ پر یہ ثابت کیا ہے کہ ہند آریائی زبانوں کا آغاز ۱۱ ویں صدی کے اوائل یا کچھ پہلے سے شروع ہوا۔ ہندی بھی ان ہی زبانوں میں شامل ہے۔ شمالی ہند اور دکن تک ہندی / ہندوی میں فارسی' عربی الفاظ بھی داخل ہوتے رہے۔ ۱۸ ویں صدی سے سنسکرت الاصل لغات کا اخراج کیا جانے لگا اور اس طرح سنسکرت اور فارسی' عربی

کے سلطم کو وجود میں آنے سے روکا جاسکے گا
ہندی / ہندوی / دکنی / گجراتی / گوجری نیز
دیگر ہند آریائی زبانوں کی تشکیل و تاریخ پر ـــ
تصنیف ہٰذا میں بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔
برسبیل تذکرہ، اس کتاب کا حوالہ دیا گیا
ہے۔ موضوع کی جانب رجوع کرنے سے پیشتر
درج ذیل فرمودات و ملفوظات پر قارئین توجہ
مبذول فرمائیں:ـــ

(۱) مولوی عبدالحق جن کو آج تک بابائے
اُردو کہا جاتا ہے پاکستان کو ہجرت کر جانے
پر اپنی کینچلی بدل ڈالی:
سنہ ۱۹۵۹ء اسلامیہ کالج لاہور کی بزم فروغ
اُردو میں فرمایا:ـــ

اُردو کو آپ معمولی زبان نہ سمجھیں۔ اس
میں ہماری ثقافت و مذہب اور قومی روایات کا
سرمایہ محفوظ ہے۔ بقیہ وہ سب زبانیں جو مسلمانوں
کی کہی جاتی ہیں بُت پرستوں اور کافروں کی بنائی
ہوئی ہیں۔ یہ اصل اسلامی زبان ہے اور ہمارے
بزرگوں کی بدولت وجود میں آئی"۔
(رسالہ "الشجاع" کراچی عبدالحق نمبر اگست ۱۹۵۹ء)

اور سنیے:ـــ

" پاکستان کو نہ جناح نے بنایا نہ اقبال نے
بلکہ اُردو نے پاکستان کو بنایا۔ ہندؤں اور مسلمانوں
میں اختلاف کی اصل وجہ اُردو زبان تھی۔ ہمارا
دو قومی نظریہ اور سارے ایسے اختلافات صرف
اُردو کی وجہ سے تھے اس لئے پاکستان پر اُردو
کا بڑا احسان ہے"
(۱۵ر فروری ۱۹۶۱ء کو غالب کی برسی
کے موقع پر کہا تھا۔ مزید تفصیل 'قومی زبان'
کراچی' بابت ۱۶ر فروری سنہ ۱۹۶۱ء)

یہی نہیں کہ عبدالحق ہی نے اُردو کے حق
میں پھنکار ناشروع کر دیا تھا' ان کے دست
راست ہاشمی فرید آبادی بھی پاکستان پہنچ کر
پھن اٹھانے لگے۔ سنئے ان کی بھی پھن پھن:ـــ
" قومی زبان کا مسئلہ..... بڑی ملی اور
سیاسی حیثیت رکھتا ہے اور ادھر اس باب میں

عام طور پر تعلیم یافتہ طبقہ میں ایسے خیالات پھیل
گئے ہیں جو نہ صرف مضرت رساں بلکہ غلط نظریات
پر مبنی ہیں۔ ان مضرت رساں نظریات میں
سے ایک یہ ہے " اُردو' ہندؤں اور مسلمانوں
کی مشترکہ زبان ہے۔ دونوں قوموں نے اسے
بنایا اور ہندوستان کے مختلف حصّوں میں پھیلا
دیا۔ ایک خاص بات یاد رکھنے کے لائق یہ ہے
کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں صرف
مسلمانوں میں اس نئی مخلوط زبان کا رواج پایا
جاتا ہے۔ اس میں کسی ہندو شاعر یا نثر نگار کا نام
نہیں آتا۔ کسی مسلمہ ہندو نے... اس نئی زبان
اُردو کے بنانے میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ اسے
بلاشبہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ہی تیار
کیا۔ واقعتاً اُردو ہندوستان کے سب ہی
مسلمانوں کی کوشش کا نتیجہ اور سب کی مشترکہ
زبان ہے۔ کاتب الحروف کا خاندان تین صدی
سے نواحِ دہلی کا باشندہ ہے' لیکن وہاں کے
دیسی کسان' مالی' اہیر ہندؤں کی اصلی بولی نہ بول
سکتا تھا نہ پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔ اسی طرح
خاص دہلی کے ہندو راج مزدور' بنئے اگرچہ ہماری
اُردو بولتے سمجھتے تھے مگر ان کی گھریلو بولی بہت
مختلف تھی اور مسلم اُردو سے جداگانہ چیز تھی"۔
" سندھی اور پشتو اُردو سے اتنی بعید نہیں
جتنی نواحِ لکھنؤ' فیض آباد کے ہندؤں کی دیسی
بولیاں مغائرت رکھتی ہیں"
(" گوجری اردو دسویں صدی ہجری میں
مشمولہ مقالاتِ شیرانی لاہور سنہ ۱۹۶۶ء)

(۲)۔ اور ملاحظہ فرمائیں ایک تحقیقی مقالے
سے اقتباس:ـــ
" انھوں نے انجمن ترقی اردو اور بابائے
اُردو مولوی عبدالحق کی ان تاریخ ساز سرگرمیوں
پر بہت ہی مختصر انداز میں تبصرہ کیا ہے جو ہماری
جنگِ آزادی اور بہ طورِ خاص تقسیم ہند کے
سلسلہ میں کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔
ہمارے لئے تحریکِ آزادی آخری تجزیے میں
کیا ہے؟ قیامِ پاکستان کے لئے انجمن اور مولوی

صاحب نے جن عظیم مشکلات میں جن طاقتور
عناصر کے خلاف اُردو سے جس طرح کام لیا ہے
اس کی کہانی بھی تفصیلی طور پر کتاب کی زینت بنتی
تو اس کی افادیت میں بڑا اضافہ ہوتا"۔
(مقدمہ نگار' جمیل الدین عالی .....
جنگِ آزادی میں اردو کا حصّہ" مصنفہ ڈاکٹر
معین الدین عقیل)

ملحوظ رہے جمیل صاحب انجمن ترقی اُردو
پاکستان' کے جنرل سکریٹری تھے۔ یعنی مولوی
عبدالحق کے جانشین ع
" اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند"

(۳)۔ حسن عسکری جواب جنت نصیب ہو
چکے ہیں نے لکھا تھا:ـــ
" اردو رسم الخط ملّت ابراہیم حنیف کا
پرچم ہے بلکہ یہ رسم الخط مؤذن ہے جو ہر وقت
لا الٰہ الاّ اللہ' پکارتا ہے۔ غازی ہے جو اللہ اکبر
کے نعروں سے تعینات کی فوجوں کو غارت کرکے
واحدیت' اور احدیت کا اقتدار قائم کرتا ہے
(جامعہ دلی' فروری ۱۹۶۷ء صہ ۱۲۰

عبدالحق' ہاشمی' جمیل الدین عالی اور عسکری
کے موضوعی خیالات کے ساتھ آج کل کے
صاحبان کے ملفوظات بھی پیش کئے جائیں
کون غیر مسلم اُردو ادبیات سے مخاطب ہونا
پسند کرے گا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ
اُردو کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتی
ہندی کے گام و عوام برابر پیش رفت حاصل کر
جا رہے ہیں۔ حقیقت تلخ ہوتی ہے' مگر اس
پردہ پوشی بھی نہیں کی جا سکتی۔ آج ہند
تمام تر علوم کی کتابیں بازار میں دستیاب
نفسیات' سماجیات' فلسفہ' ٹکنالوجی' غ
تمام متداولہ علوم۔ ان تصنیفات میں سرکار
اداروں کا تعاون بہت کم نظر آئے گا۔
میں ایسی کتابیں نہیں ملتی ہیں جیسی کہ اکاد
اور فخرالدین احمد میموریل وغیرہ کے مالی
امداد سے شائع ہوتی ہیں۔ اگر صحیح جائزہ
تو ننانوے فی صد سے زیادہ کتابیں معیا

گرمی ہوئی شائع ہوتی ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے، اردو کتابوں کی نکاسی بہت کم ہے۔ اگر ریاستی حکومتیں اور مرکزی سرکار اردو اداروں کو امداد نہ دے تو غالباً بہت تھوڑے ہی آنجہانی نہیں ہوں گے۔

اگر یہ بات صحیح مان لی جائے کہ اردو ہی نے پاکستان بنایا تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو ہی نے پاکستان کو تقسیم کر ڈالا۔ بنگلہ دیش کا وجود میں آنا اردو ذہنیت ہی سے عبارت ہوا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ہال میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر جناح صاحب نے فرمایا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی تو ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ایک بہت بلند آواز فضا میں گونجی No, Never یعنی 'نہیں، کبھی نہیں' یہ آواز مجیب الرحمٰن کی تھی۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی ہی میں بنگالی اراکین نے اس پر اعتراض کیا تھا۔ مگر اردو کے دیوانے بہرے ہوگئے تھے۔ ایوب خاں نے بار بار یہ تلقین کی کہ بنگلہ کو قرآنی حروف میں لکھا جائے مگر زبان کا مسئلہ اتنا سیدھا سادھا نہیں ہوتا۔ بنگلہ دیش کی قومی زبان بنگلہ زبان ہے اور اس کا قومی ترانہ "سونار بنگلہ" رابندر ناتھ ٹیگور کا سپردِ قلم کیا ہوا نغمہ ہے۔ بنگلہ رسم الخط دیوناگری رسم الخط سے مماثلت رکھتا ہے۔

انڈونیشیا کی بھاشا انڈونیشیا، رومن رسم الخط میں لکھی جاتی ہے لہٰذا مسلمانوں ہی میں عربی رسم الخط کا استعمال بہت کم ہے۔ قریب قریب مسلم آبادی کا تین چوتھائی حصہ اپنی زبانوں کے لئے عربی رسم الخط استعمال نہیں کرتا۔

اردو والوں میں ایک عجیب ذہنیت کارفرما رہی ہے۔ غیر مسلم اردو ادیبوں کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ مرنے کے بعد وہ آنجہانی اور ان کا کام آنجہانی۔ اگر بہت مہربانی کی گئی تو ہندو ادیب، ہندو شاعر وغیرہ کہہ دیا گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس پہلو سے بڑی نفرت رہی ہے۔ ارے اردو کے ادبا و شعرا، اردو کے ادبا و شعرا ہیں، آپ انہیں علاحدہ خانوں میں کیوں رکھتے ہیں؟"

بات سے بات نکلتی ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے تحت ترتیب دی جانے والی انسائیکلوپیڈیا کے اردو اندراجات کی انگریزی کی تصحیح میرے سپرد کی گئی تھی۔ بالعموم اردو والے انگریزی نہیں جانتے ہیں، یعنی معیاری۔ اس کو صرفِ نظر کرتے ہوئے میں ایک خاص بات کی جانب توجہ کا طالب ہوں۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر کے کمرے میں دو تین ہندی کے مشہور پروفیسر آئے ہوئے تھے۔ میرا تعارف بھی کرایا گیا۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے نشانِ ہند کی مطبوعہ "ہندی کے مسلمان شعراء" کا ذکر کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ کتاب ہذا کو ہندی میں بھی ترجمہ کیا جائے۔ تھوڑے توقف کے بعد ایک پروفیسر نے جو جواب دیا وہ میرے لوحِ دل پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا "رستوگی جی، یہ مرض ہم ہندی والوں میں نہیں ہے۔ ہم نے کبیر، ملک محمد جائسی، رس خان وغیرہ کو کوی (شاعر) ہی کہا ہے ہم ان کو مسلمان کوی نہیں کہتے" میں لاجواب ہوگیا۔ کیسا اچھا، کتنا صالح رجحان ہے۔ اردو والے پریم چند ہی کو اردو بدر کرنا چاہتے تھے مگر ہندی والوں نے عبدالقدوس گنگوہی کی "الکھ بانی" کو ہندی رسم الخط میں منتقل کر کے اپنا لیا۔ "الکھ بانی" کا اولین نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے جس پر لکھا ہوا ہے "الکھ بانی ور فارسی رشد نامہ می گویند"

انشاء کے زمانے سے متروکات کے دور کا آغاز ہوا۔ دریائے لطافت کی تصنیف ۱۸۰۸ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ۱۸۴۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اسی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ برج موہن دتاتریہ کیفی نے کیا۔ اس تصنیف نے واشگاف الفاظ میں اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا۔ سید علی بلگرامی کا ایک مضمون "زمانہ" جولائی ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔ بلگرامی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ افسوسناک حادثہ سے کم نہیں کہ ہندوی زبان کے لئے وہ رسم الخط اختیار کیا گیا جو اس زبان سے ہم آہنگ ہی نہیں۔ عربی رسم الخط نے فارسی اور پہلوی پر بھی خراب اثرات مرتب کئے۔ مصطفیٰ کمال پاشا عربی رسم الخط سے ترکی زبان کو آزاد کرانے کے باوجود مسلمان ہی رہے۔ اگر اردو کو بھی دیوناگری رسم الخط میں لکھا جانے لگے تو اس سے ہمارے مذہب کو کیا خطرہ پیدا ہوگا؟ بلکہ اس سے قومی یکجہتی کو فروغ ہی حاصل ہوگا۔

اس سلسلہ میں "سنگم" رسالہ یاد آنے لگا خواجہ احمد عباس نے ہندی رسم الخط میں، اردو تخلیقاتِ شعری و نثری پیش کرنے کے لئے اور اردو کو مقبولِ عام بنانے کے لئے "سنگم" کا اجراء کیا تھا۔ خواجہ مرحوم نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اردو کے لئے دیوناگری رسم الخط قبول کر لیا جائے۔ ان کی تمام تر کاوشیں اسی مقصد پر مرکوز تھیں کہ اردو کی مقبولیت میں اضافہ کیا جائے اور اس طرح بالواسطہ طور پر اردو رسم الخط سیکھنے کی ترغیب پیدا ہوگی۔ اردو حلقوں نے ایسی صالح کوشش کو بھی نظر انداز کر دیا۔ ہندی حلقوں میں "سنگم" ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا مگر اردو ادیبوں اور شاعروں کے عدم تعاون نے "سنگم" کو آنجہانی بنا دیا۔

نامور ~~محقق نے کیا خوب کہا ہے کہ "خالص تمیز~~ اردو کی حفاظت علیحدگی پسندی کا ہی ایک حصہ تھی"۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ جس علی گڑھ تحریک نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کو تولد کیا وہی اردو کی حمایت میں بھی آگے تھی۔ اس پر کمال احمد صدیقی نے اپنے مضمون "تازہ بجات زبات اور باسی بجات خیرات" جو "ہماری زبان" میں دو قسطوں میں شائع ہوا، جو کچھ بھی خیالات جولاں سکے ہیں، وہ محض ذہنی خلفشار ہی کے آئینہ دار ہیں۔ مضمون ہذا کی شرحی ہی بے معنی ہے اور اس میں سپردِ قلم کئے ہوئے جوابات معنویت سے خالی ہیں۔ گاندھی جی ... کانگریس کا ذکر ہی بیکار ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستانی وغیرہ کا ذکر ہی بے محل ہے۔ پاکستان کا قیام زبان و مذہب کی بنا پر ہی ہوا اور آج تک پاکستان ایک منصوبہ بند پالیسی پر گامزن ہے۔ پاکستان کے قیام کی پیشین گوئی سرسید نے کی تھی۔ مولانا حالی نے سرسید کی سوانح عمری "حیاتِ جاوید" میں سرسید اور کمشنر شیکسپیئر کے مابین گفتگو

کو من وعن پیش کیا ہے۔ (ص ۱۲۳۔۱۲۴)

"سرسید نے گفتگو کے دوران فرمایا تھا کہ اب چونکہ ہندو دیوناگری رسم الخط اور ہندی کی بات کرنے لگے ہیں لہٰذا ہندو اور مسلمان تعلقات باہمی سے محروم ہو جائیں گے اور ایک ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔ اور وہ دن آ ہی گیا۔

سرسید نے جمال الدین افغانی کی بھی مخالفت کی تھی کیونکہ مغربی استعماریت کا دشمن تھا۔ اور سرسید انگریزوں کے وفادار و فرمانبردار اور انگریزوں نے ہمیشہ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کیا دراصل پاکستان کو وجود میں لانے کا سہرا انگریزوں ہی کے سر ہے۔ مولوی عبدالحق اپنی سادہ لوحی میں جو کچھ بھی سمجھے ہوں۔

اُردو کی مقبولیت کا ذکر اُردو حلقوں میں اکثر و بیشتر کیا جاتا ہے۔ خوش فہمی یا غلط فہمی' کسی کی کارفرمائی ہو یا نہ ہو حالات کی ستم ظریفی ضرور ہے۔ اُردو کے بارے میں فیض احمد فیض کی رائے ملاحظہ ہو:

"اُردو جو ہے' وہ شہری زبان ہے۔ وہ گاؤں میں بولی ہی نہیں جاتی۔ کسی بھی علاقہ کے دیہات میں اُردو نہیں بولی جاتی۔ آپ دہلی سے چند میل باہر چلے جائیں' وہاں لوگ اُردو نہیں بولتے لکھنؤ سے تین چار میل باہر چلے جائیں وہاں بھی اُردو نہیں بولی جاتی۔ وہاں کی زبان اگر ہے تو کہیں کھڑی بولی ہے' کہیں برج' آپ انھیں عوامی بولی کہہ سکتے ہیں مگر اُردو نہیں ہے"

(ص۔۱۹۵۔ فیض کی شاعری' ایک مطالعہ' مصنفہ' ڈاکٹر نصرت چودھری۔ شان پبلشنگ ہاؤس' امیراکدال' سرینگر' ۱۹۸۵ء)

یہ حقیقت ہے' گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ اُن کو دراصل ہندی سے غرض ہے نہ اردو سے کوئی مطلب۔

اگر در عمق تجزیہ (In-depth analysis) کیا جائے' تو یہی افسوسناک حقیقت ابھرے گی کہ اُردو زبان بحران سے دوچار ہے۔ مگر اُردو ادب نئے آفاق و شعور تلاش کر رہا ہے یہ بیش رفت شاعری' افسانہ نگاری' ڈرامہ نگاری وغیرہ ادبیاتی حلقوں ہی تک محدود ہے۔

جو کچھ بھی ہوا ہو' وہ ماضی میں پہنچ چکا ہے ہندی / ہندوی / راجستھانی / ہریانوی / بہار اشتراکی / آسمیہ / اودھی / برج بولی' غرض کہ ایسی دوسری علاقائی زبانیں ہر علاقہ میں کہی جا سکتی تھیں اور آج تک یہی صورتِ حال ہے۔ میرا کے گانے راجستھان سے زیادہ بنگال میں گائے جاتے ہیں۔ کبیر' نانک' سنت گیانیشور' سنت تکا رام' ملک محمد جائسی' رسکھان' عبدالقدوس گنگوہی' وغیرہ کی تخلیقات آج تک ہند آریائی زبانوں کے پردیشوں یعنی ریاستوں میں مقبول ہیں۔ کلاسیکل موسیقی تو انھیں کے گانوں پر محیط ہوتی ہے۔

اب ہندی ادب علیحدہ ہے اور اُردو ادب کا علیحدہ وجود ہے۔

امرت رائے اُردو کو ہندی کا اسلوب (شیلی) نہیں سمجھتے۔ وہ اس کے ادبی وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایک دھارے میں سے کئی دھارے پھوٹ پڑتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواسط تک پہنچتے پہنچتے اس دھارے کا نام ہندی' ہندوی' نہ رہا' ریختہ کہا جانے لگا۔ فارسی میں از ہم ریختہ شدن' کے معنی علیحدہ ہو جانے ہی کے ہیں۔ بالفاظِ دیگر' ہندی / ہندوی سے علیحدہ کی ہوئی زبان ریختہ ہو گئی۔ ریختہ کو اس منزل پر ابھی تک نہیں دیکھا گیا ہے۔ غالب کے زمانے میں "ریختہ" ہی نام تھا۔ بعد ازاں مرورِ ایام کے ساتھ اردوئے معلیٰ' دہلی کی زبان' اردوئے مطلق (لکھنؤ' اودھ) اردوئے مجلیٰ (روہیل کھنڈ وغیرہ) ناموں نے "ریختہ" کو بھی ہٹا دیا۔ آہستہ آہستہ معلیٰ' مجلیٰ' مطلق' خود بخود گر گئے' اور زبان کا نام فقط اُردو رہ گیا۔ اُردو سے مُراد ہے' ہندی کھڑی بولی سے سنسکرت' پراکرت وغیرہ کے بے شمار الفاظ کو زبان بدر کرنے کے بعد' فارسی عربی لغات کو مشمول کرنے پر معرضِ وجود میں آنے والی زبان' قواعد' تذکیر و تانیث وغیرہ کی دروبست ایک سی ہے۔ عوامی سطح پر اُردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی لسانی فرق صریحاً نہیں ہے۔

ادبیاتی ہندی اور ادبیاتی اُردو' دونوں شہری زبانیں ہیں۔ دیہات میں پوربی' اودھی' برج / بھوج پوری وغیرہ رابطہ کی زبانیں مستعمل ہیں ایک حقیقت سے چشم پوشی گناہ کے مترادف ہوگی دیہات میں بالعموم دیوناگری رسم الخط ہی مرّوج رہا ہے۔

اُردو بحیثیت دوسری زبان

دوسری زبان کا مطالبہ دستورِ جمہوریہ ہند کے اعتبار سے کس مقام کا حامل ہے؟۔

دستور میں دفعہ ۳۴۵ کے تحت ریاستی حکومت اپنے کسی مخصوص علاقہ میں ریاستی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کے محدود استعمال کی اجازت دے سکتی ہے۔ مثال کے لئے آسام کی ریاستی زبان' آسمیہ' ہے مگر آسام کے ایک علاقہ کچھار میں بنگالی آبادی ہے لہٰذا کچھار میں ضلعی سطح تک بنگالی کے استعمال کی اجازت ہے گوہاٹی یونیورسٹی نے ایم۔اے کی سطح تک آسمیہ یا انگریزی کو ذریعۂ تعلیم منظور کیا ہے۔ کچھار کے کالجوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے کیونکہ بنگالی طلبہ آسمیہ سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ہائی اسکول اور ہائر سیکنڈری اسکولوں میں ذریعہ تعلیم آسمیہ' بوڈو' انگریزی' بنگالی' وغیرہ ہو سکتا ہے مگر غیر آسمیہ اسکولوں میں آسمیہ بہ طور ایک مضمون بھی لازمی قرار دیا گیا ہے۔

اُترپردیش کے چند اضلاع میں جہاں اُردو زبان والے اشخاص کی معتدبہ آبادی ہے' اُردو کو مراعات دے دی گئی ہیں۔ بہار میں اُردو کو دوسری زبان کا درجہ تو دے دیا ہے مگر وہاں بھی مراعات چند اضلاع ہی کے لئے' دی گئی ہیں۔ کسی بھی ریاست میں انتظامیہ کی سطح پر اور ثانوی تعلیم کی سطح پر ریاستی زبان (ملحوظ رہے' ایک ہی زبان) تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اگر معتدبہ حصہ ریاستی زبان نہ جانتا ہو تبھی کسی دوسری زبان کی اجازت دستوری حیثیت رکھتی ہے اور بس!

دفعہ ۳۴۷ کے تحت صدرِ جمہوریہ کسی ریاست میں کسی دوسری زبان کے استعمال کا بھی

حکم دے سکتا ہے۔ جو لوگ دستوری قوانین سے واقفیت رکھتے ہیں وہ یہ بخوبی سمجھتے ہوں گے کہ جمہوریہ کا صدر صرف مرکزی کابینہ ہی کی سفارش پر کوئی آرڈیننس جاری کر سکتا ہے۔ منہ بولتی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب راجندر پرساد صدر جمہوریۂ ہند تھے تب کئی لاکھ دستخطوں پر مشتمل ایک محضر نامہ نائب صدر جمہوریہ ذاکر حسین مرحوم نے صدر جمہوریہ کو پیش کیا تھا۔ تماشا ہی ہوا کیوں کہ جب ذاکر صاحب صدر جمہوریہ کی مسند پر پہنچ گئے تو انھوں نے بھی اُردو کی طرف رُخ نہیں کیا۔ کیوں؟ اُن کو دستور سے اختیار حاصل رہے نہیں تھا۔

آسام میں بنگالیوں کی آبادی ریاست کی پوری آبادی میں ۳۸ فیصد ہے۔ اگر اُتر پردیش یا کسی اور ریاست کو دو لسانی ریاست بنا دیا جائے تو آسام میں بھی مطالبہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ پر یہاں کئی بار خون کی ندیاں بہہ چکی ہیں۔ اتر پردیش، بہار یا کوئی اور ریاست ہو کہیں کسی دوسری زبان کو ریاستی زبان کے برابر درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

بہار میں بھی جو کچھ دیا گیا ہے وہ محدود مدت کے لئے ہی ہے۔ اُردو زبان کو دوسری زبان کا درجہ انتظامیہ کی سطح پر نہیں دیا جا سکتا۔

دوسری زبان کا مطالبہ کرنے والوں میں بکثرت وہ لوگ ہیں جو ذاتی مفادات کے حصول کے لئے شور و غل مچانے لگتے ہیں۔ کرسی نشین ہو جانے پر، انعامات وغیرہ سے نوازے جانے پر، مالی منفعت کے پروجیکٹ دے دیے جانے پر چوہوں کی طرح اپنے اپنے بلوں میں گھس جاتے ہیں۔

اُردو کو کبھی مشترکہ زبان بتایا جاتا ہے اور کبھی مسلمانوں کے تشخص کے لئے اُردو کی اہمیت کو پیش کیا جاتا ہے۔ مملکتِ اُردو میں غیر مسلم پورے شہری سمجھے جاتے، ہندو مسلم کی تفریق کو روا رکھا گیا ہے۔ ایک دو کرائے کے ٹٹوؤں کو چھوڑ کر کسی غیر مسلم کو مالی منفعت اور مقام و منصب سے دُور رکھا جاتا ہے۔ وقتاً فوقتاً آہ و واہ کرنے والے نکل پڑتے ہیں اور اُن میں ۹۹ فیصد سے زیادہ خود غرضانہ تمائلات کے حامل ہوتے ہیں۔

انگریزی کے علاوہ کوئی ہندوستانی زبان بطورِ ذریعۂ تعلیم سودمند نہیں معلوم ہوتی۔ باہوش ہندو مسلمانوں کے بچے انگریزی ذریعۂ تعلیم والے اسکولوں میں زیرِ تعلیم مشاہدہ میں آئے ہیں۔ اُردو اور ہندی دونوں ہنوز ثانوی تعلیم کے لئے اور کارِ اپنوں کے لئے نا اہل ہیں۔ ذریعۂ تعلیم انگریزی ہی افضل ترین ہے۔ مرکزی سطح پر انگریزی ہی زیادہ مروج ہے اور رہی ہے، اور رہے گی بھی۔

یاددہانی کے لئے اس خطبۂ صدارت کا ذکر کر دینا ناگزیر معلوم ہوتا ہے جو آنند نرائن مُلاّ نے انجمن ترقی اُردو کے ہے پور اجلاس میں پیش کیا تھا۔ اس میں ایک خط مشمول ہے، مگر لکھنے والے کا نام مُلاّ صاحب نے پردۂ اخفا میں رکھا ... وہ خط میرا تھا اور اس خط میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حرف بہ حرف صداقت پر مبنی ہے۔ میں اُردو کو پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہوں۔

اگر کوئی ادارہ یا یونیورسٹی اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنائے، وہ بھی خوش اقدامی ہی تصور کی جائے گی مگر اُردو کے نام پر روپیہ بٹورنے والوں کا محاسبہ ضرور کیا جائے۔ سرکاری گرانٹ ملتی ہے، اس کا بڑا حصہ ایک دو شخص ہی ہضم کر جاتے ہیں۔ تعمیرات کی نگرانی وغیرہ سب خود ہی کرتے ہیں۔ ٹینڈر مشتہر نہیں کیے جاتے [illegible] (زمین کی جانچ) وغیرہ سب پر پانی پھیرتے ہوئے آگے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارتے ہیں۔ اُردو کے فروغ پر، اُردو کے نام پر وصول کی گئی رقوم استعمال نہیں کی جاتیں، اُن کا عشرِ عشیر بھی اُردو کو نہیں ملتا۔ ہر سطح پر اُردو دنیا میں لوٹ پاٹ بھی ہوتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے آجکل ریلوے، سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر، اسپتال وغیرہ میں کرپشن Corruption جاری و ساری ہے۔

کتنے لوگوں کو معلوم ہوگا کہ گجرال صاحب کا ایک مضمون کلکتہ کے معروف اخبار ٹیلیگراف میں شائع ہوا تھا۔ بشمولِ دیگر نکات گجرال صاحب نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ بہار میں اُردو کو دوسری زبان کا درجہ اس لئے مل گیا کیونکہ وزیر اعلیٰ اپنی پوزیشن کو کانگریس پارٹی میں مستحکم رکھنا چاہتے تھے، مزید برآں یہ درجہ صرف نام ہی کا ہے، صرف کچھ اضلاع میں مراعات تک محدود ہے۔

اردو ادب کے فروغ کو دوسری زبان کے کھونٹے سے باندھنے کی کوشش محض خود غرضی کے چٹکلے کر رہے ہیں۔ اُردو حلقے کے باوقار اشخاص میں وہ خد و خال دکھائی نہیں دیتے جو اردو و ادبیات کو مقام و مرتبہ کا حامل کر سکیں۔

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

جہاں آپ کی رقم پہلے سے زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے

اب ۱۱ سالانہ سود حاصل کیجئے

چھ ماہ اور اس سے زائد لیکن

ایک سال سے کم مدت کے لئے میعادی ڈیپازٹ پر۔

●

فکسڈ ڈیپازٹ پر شرح سود

۱۱٪ سالانہ ۲ سال کی مدت کے لئے

۱۰٪ سالانہ :- ایک سال سے زائد لیکن ۲ سال سے کم مدت کے لئے۔

●

سیونگ ڈیپازٹ پر ۶٪ سالانہ سود دیا جاتا ہے۔

ایک ہزار روپے ۶ سال میں ۳۳ ۲۰. روپے بن جاتے ہیں۔

ایک ہزار روپے ۱۰ سال میں ۳۲۶۷ روپے بن جاتے ہیں۔

ہر قسم کے بینکنگ کے کاروبار (جس میں غیر ملکی زرمبادلہ بھی شامل ہے) کے لئے تشریف لائیں۔

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ ۳۶ نیتاجی سبھاش مارگ، بمبئی ۴۰۰۰۰۲

فون: ۲۶۸۲۶۶، ۲۶۴۳۲۸ ٹیلیکس 31 - 66823 Zain in



اقبال پاریکھ

مُناسب آدمی

وہ لوگ جو اپنی بیویوں کو ناپسند کرتے ہیں، ان کے لیے سب سے بڑی الجھن یہ ہوتی ہے کہ وہ اُن سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں۔

اور جب انھیں کوئی ترکیب سجھائی نہیں دیتی تو ان کا ذہنی سکون تباہ ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن فریڈ کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا بلکہ اُسے ایک ایسا مشورہ مل گیا تھا جس کی بنیاد پر وہ اپنی اس بیوی سے چھٹکارہ پا سکتا تھا جس نے اس کی زندگی جہنم بنا رکھی تھی۔ وہ مشورہ اس کے باس مسٹر کلائیو نے دیا تھا۔ وہ ایک سلجھے ہوئے اور نفیس طبیعت آدمی تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے یہاں کام کرنے والوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ انھیں یہ معلوم ہو جاتا کہ فلاں آدمی پریشان ہے، فلاں آدمی کی بیوی بیمار ہے، فلاں کے بچے کو اسکول میں داخلہ نہیں مل رہا ہے یا فلاں کے ساتھ معاشی پریشانیاں ہیں۔ انھیں یہ سب معلوم ہو جایا کرتا تھا اور وہ اسی مناسبت سے ان پریشانیوں کو دور بھی کر دیا کرتے تھے۔

اور انھیں یہ بھی علم ہو گیا کہ فریڈ اپنی بیوی سے تنگ آ چکا ہے کیونکہ اس عورت نے فریڈ کی زندگی جہنم بنا رکھی ہے۔

مسٹر کلائیو کا فلسفہ یہ تھا کہ ان کے یہاں کام کرنے والے ہر شخص کو ہر قسم کے ذہنی بوجھ سے آزاد ہونا چاہیے ورنہ اس کی کارکردگی ہر طرح متاثر ہوتی ہے۔ اُن کا یہ نظریہ واقعی درست تھا کیونکہ دن بدن فریڈ کی کارکردگی کا معیار کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چونکہ اس فرم کا بہت پرانا ملازم تھا اسی لیے اسے ملازمت سے علیحدہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں مسٹر کلائیو نے یہی مناسب سمجھا کہ فریڈ کو کوئی مناسب مشورہ دے دیا جائے۔

انھوں نے ایک صبح فریڈ کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ فریڈ فوراً ہی اُن کے کمرے میں چلا آیا۔

"بیٹھ جاؤ فریڈ!" مسٹر کلائیو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

فریڈ کے بیٹھ جانے پر انھوں نے انٹرکام کا ریسیور اُٹھا کر اپنی سکریٹری سے ہدایت کر دی کہ نہ تو اُن کے کمرے میں کسی کا فون بھیجا جائے اور نہ ہی کسی کو اندر آنے کی اجازت دی جائے گویا مسٹر کلائیو جو کچھ بھی کہنا چاہتے تھے وہ گہری رازداری کا متقاضی تھا اسی لیے انھوں نے یہ احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں۔ فریڈ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسٹر کلائیو اتنا اہتمام کس لیے کر رہے ہیں۔

"میں جانتا ہوں کہ آج کل تم کچھ پریشانیوں میں مبتلا ہو۔" مسٹر کلائیو نے کچھ دیر بعد اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھا نہیں جناب" فریڈ گھبرا گیا

"کوئی بات نہیں! میں جانتا ہوں کہ دنیا میں ہر شریف آدمی کا ایک ہی مسئلہ ہوا کرتا ہے اور وہ مسئلہ ہوتا ہے اس کی بیوی کا ناپسندیدہ ہونا"

"جی؟" فریڈ حیران رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے نجی حالات مسٹر کلائیو کو کس طرح معلوم ہو گئے تھے۔

"شاید تم اس بات پر حیران ہو رہے ہوگے کہ مجھے تمہارے حالات کیسے معلوم ہوگئے" مسٹر کلائیو نے خود ہی بات شروع کی۔ "تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں اپنے یہاں کام کرنے والے ہر شخص کے حالات سے نہ صرف ہمدردی رکھتا ہوں بلکہ دلچسپی بھی رکھتا ہوں اور مجھے ہر وقت ان کی بہبود کا خیال لگا رہتا ہے۔ اسی لئے جب میں نے یہ دیکھا کہ تمہاری دفتری کارکردگی کچھ کم ہونے لگی ہے اور تم کچھ اُلجھے اُلجھے رہنے لگے ہو تو میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کیں اور مجھے یہ پتہ چل گیا کہ تم اپنی بیوی سے پریشان ہو۔ اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے جناب" فرید نے اپنی گردن ہلا دی۔ "آپ کو صحیح معلوم ہوا ہے۔ میں واقعی بہت پریشان ہوں۔"

"ہو سکتا ہے کہ تمہیں میرا یہ فعل ناگوار بھی گزرا ہو کہ میں تمہارے حالات کی کھوج لگانے میں لگا رہا۔ لیکن یقین کرو یہ سب میں نے نیک نیتی اور خلوص سے کیا ہے اور اب میں تمہیں اس کا نہایت مناسب حل بتا سکتا ہوں میرے نزدیک اس سے بہتر حل کوئی اور نہیں ہو سکتا کیونکہ میں نے بھی اپنی بیوی سے اسی طرح چھٹکارا حاصل کیا تھا"

"جی! آپ نے؟" فرید چونکا

"ہاں بھئی! کیا میں انسان نہیں ہوں، کیا میرے ساتھ اس قسم کے حالات پیش نہیں آسکتے؟ دیکھو یہ انسان کی فطرت ہے کہ اُسے اپنا دُکھ سب سے مہیب معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے حالات اتنے خراب نہ ہوں جتنے خراب میرے حالات تھے۔ لیکن میں نے صرف ایک شخص کی مدد سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لی۔

"ایک شخص؟" فرید کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ "وہ کون شخص ہے جناب؟"

"ایسے نہیں! پہلے یہ بتاؤ کہ کیا واقعی تمہارے دل میں اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی شدید خواہش ہے؟"

"ایسی ویسی!" فرید نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔ "اگر میرا بس چلے تو...."

"بس بس!" مسٹر کلائیو نے اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ "یہ سب کام تمہارے کرنے کے نہیں ہیں۔ میں تمہیں اب اُس شخص کا نام اور پتہ بتا دیتا ہوں۔ وہ ایسے کاموں کا ماہر ہے۔ تمہاری کچھ رقم تو خرچ ہو گی لیکن تم ہمیشہ کیلئے ایک عذاب سے نجات حاصل کر لو گے"

"ٹھیک ہے جناب! میں تیار ہوں" فرید نے کہا "آپ برائے کرم اُس کا نام اور پتہ بتا دیں"

تو اس طرح فرید کو اس شخص کا نام اور پتہ معلوم ہو گیا۔ اُس کا نام دانیال تھا اور وہ شہر کے ایک ایسے علاقے میں رہتا تھا جہاں ابھی مکمل آبادی نہیں ہوئی تھی۔

فرید اُس مکان کے سامنے کھڑا ہو کر بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر اُس نے آگے بڑھ کر اطلاعی گھنٹی پر اُنگلی رکھ دی۔ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی تھی دروازہ کھولنے والا ایک ادھیڑ عمر لیکن مضبوط ہاتھ پیروں کا آدمی تھا۔ اُس کے ہونٹوں کے درمیان ایک موٹا سا سگار دبا ہوا تھا اور مکان کے اندر بھی اُس نے سیاہ شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی

"کیا بات؟ کس سے ملنا ہے؟" اُس نے سوالیہ نگاہوں سے فرید کی طرف دیکھا۔

"مسٹر دانیال سے" فرید نے جواب دیا۔ "میں بہت دُور سے آیا ہوں"

"ہوں"۔ اُس نے اوپر سے نیچے تک فرید کو دیکھا "ٹھیک ہے، آؤ اندر آجاؤ"

فرید اس مکان میں داخل ہو گیا۔ اس کے اندر آتے ہی دانیال نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اُس کا مکان اندر سے بہت خوبصورت اور پُرتکلف تھا۔ لیکن اس بڑے مکان میں دانیال کے علاوہ اور کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ فرید کو اپنے ساتھ ایک ایسے کمرے میں لے آیا جہاں ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ میز کے عقب میں گھومنے والی ایک آرام دہ کرسی تھی اور سامنے کی طرف دو اور کرسیاں تھیں۔ وہ شخص گھومنے والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا جبکہ فرید نے اُن دونوں میں سے ایک کرسی سنبھال لی۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟" دانیال نے پوچھا۔

"مسٹر کلائیو نے" فرید نے جواب دیا "شاید تم اُن سے واقف ہو گے۔ وہ میرے باس ہیں۔ میں اُن ہی کے یہاں کام کرتا ہوں"

"میں بہت اچھی طرح سے اُن سے واقف ہوں" دانیال مسکرا دیا۔ "وہ میرے پُرانے کرم فرما ہیں۔ انھوں نے اب تک کئی آدمی میرے پاس بھیجے ہیں اور اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کا کام نہ ہُوا ہو۔ اور تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تم یہاں کس کام سے آئے ہو۔ اب تم مجھے اپنا پتہ بتا دو اور یہ بتا دو کہ تمہاری بیوی گھر میں کس وقت ہوتی ہے تاکہ میں اُس سے نمٹ لوں اور تم بے فکر ہو جاؤ"

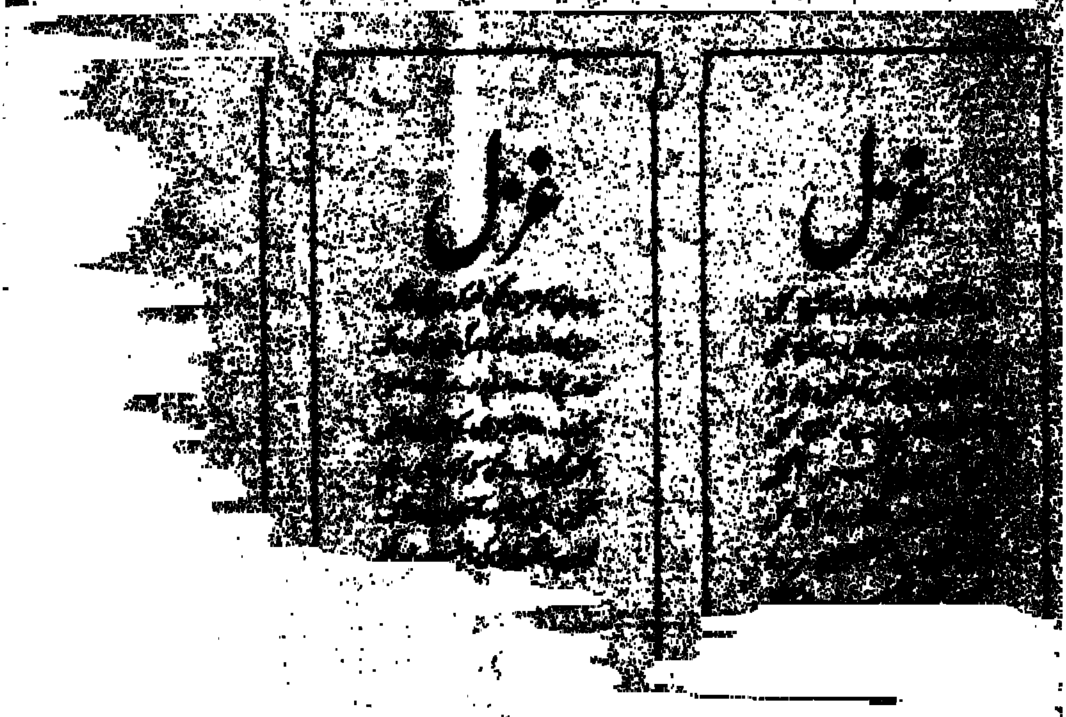
فرید نے اُسے اپنی بیوی کا نام، اپنے گھر کا پتہ اور وہ وقت بتا دیا جس وقت اُس کی بیوی گھر پر اکیلی ہوتی تھی۔

"اور ہاں! شاید مسٹر کلائیو نے تمہیں میرا اُصول بتا دیا ہو گا کہ میں اپنا معاوضہ ہمیشہ ایڈوانس لے لیتا ہوں"

"جی، مجھے بتا دیا تھا۔ اور میں تمہاری پوری فیس اپنے ساتھ لیتا آیا ہوں۔ یہ تمہاری مہربانی ہو گی۔ تم نے اگر مجھے اِس عذاب سے نجات دِلا دی تو میں ہمیشہ تمہارا احسان مند رہوں گا"

"احسان کی کوئی بات نہیں، یہ تو میرا فرض ہے میرا پیشہ ہی ایسا ہے"

فرید نے اپنی مختلف جیبوں سے نوٹ نکال کر میز پر ڈھیر کر دیے۔ دانیال مسکراتے ہوئے نوٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے اپنی میز کی دراز کھول کر، کچھ کاغذات اُس دراز سے نکال کر میز پر رکھ دیے۔ پھر اُس نے اُن کاغذات کو اُڑنے سے بچانے کے لئے اُسی دراز سے ایک ریوالور نکالا اور کاغذات پر رکھ دیا۔ ریوالور کو دیکھ کر فرید کا دل زور


غزل
غزل

ہندی و اردو ... مترجم

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

...ے اردو افسانوں کے دو مجموعے "ممان سرورز" اور "ھم بار کہا دِل نے"
...تر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے انعامات سے نوازا۔ اور جنھیں "نیشنل لٹریری سرکل" مرادآباد کی ط...
...ر سو روپے کا چیک اُن کی چالیس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں پیش کیا گیا۔ اب - - -

"کرنوں کے پدچن"

...ب میں ایک نرالے انداز سے ہندی ساہتیہ میں قابلِ فخر اور یادگاری اضافہ کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔
...س نادرِ روزگار تصنیف کے باعث ڈاکٹر اودے سرن ارمان کا نام نامی ہندی ساہتیہ میں ہمیشہ ...
... اور کوئی بھی ہندی ساہتیہ کا مورخ "کرنوں کے پدچن" اور "ڈاکٹر اودے سرن ارمان" کے ذکر کے بغیر
...کو مکمل نہ کہہ سکے گا۔

...ک انقلابی ذہن، جو خدا کے وجود کو سائنس کی روشنی کے ساتھ ساتھ تسلیم کرتا ہے مگر اندھ وشواس کے گورکھ...
...ے انہاک کے ساتھ بغاوت کرتا ہے۔ قدامت اور جدیدیت کا یہ سنگم "کرنوں کے پدچن" میں انتہائی اہم موضوعات پر...
...آئے واقعات کی روشنی میں ایسے ایسے مسائل پر مدلل بحث کرتا ہوا قاری کے دل و دماغ پر اپنے نقوش اس ...
...چھوڑتا ہے کہ قاری بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ع۔ جو کہا تو نے وہ میرے دل میں تھا۔

...کرنوں کے پدچن" میں آپ ارمان صاحب کی یادداشتوں میں بڑی انمول باتیں پائیں گے۔ ...
...میں اپنی طرز کی یہ واحد کتاب پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔ قیمت: -/۵۰ ...

...ملنے کا پتہ

شان ہند پبلی کیشنز

فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرور تونسوی

مس کجن کا دلال

پچاس پچپن سال پہلے مشہور ایکٹریس مس جہاں آرا، کجن اور ماسٹر نثار کی جوڑی فلمی دنیا میں تہلکہ مچائے ہوئے تھی۔ جس فلم میں بھی یہ دونوں مشہور فلمی ہستیاں بطور ہیروئن اور ہیرو ہوتے وہ فلم ضرور سپرہٹ ہوتی اور سینماؤں پر فلم بینوں کا ہجوم غفیر ہوتا۔

مس کجن کو یار لوگوں نے شاعرہ بھی بنا رکھا تھا۔ جس طرح عموماً شاعرات اپنے شوہروں اور اپنے عاشقوں سے مانگے کا کلام حاصل کرکے اپنی دنیائے شاعری میں اجالا کئے رکھتی ہیں، اسی طرح سے مس کجن بھی ایسی ہی شاعرہ تھیں۔ اس وقت کے اکثر رسائل میں بطور شاعرہ غزلیں پیش کی جاتی تھیں۔ اس وقت فلمی رسائل بہت کم ہوتے تھے مگر جو تھے وہ محض مس کجن کا کلام شائع کرنا اپنے لئے فخر سمجھتے تھے اور ویسے بھی مس کجن اچھے رسائل و جرائد کو کچھ مالی امداد بھی دیتی تھیں جو ان کا کلام شائع کرتے تھے۔

ان دنوں کلکتہ فلمی دنیا کا گڑھ ہوا کرتا تھا [illegible] ماسٹر نثار [illegible] کلکتہ سے [illegible]

کلکتہ سے شائع کرتے تھے۔ طنز و مزاح میں یہ ہفت روزہ اپنا جواب آپ تھا۔ میں نے فلمی تبصرے لکھنے والے صرف تین حضرات ایسے دیکھے جو اس فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ، آغا خلش کاشمیری اور عنایت دہلوی مرحوم۔ عنایت دہلوی کسی کا فلمی تبصرہ لکھتے ہوئے طنز و ظرافت کے ایسے ایسے نادر نمونے پیش کرتے تھے کہ پڑھنے والے مدتوں یاد رکھتے۔ "چوپٹ" میں ویسے تو ہر سطر پڑھنے سے تعلق رکھتی تھی مگر "فلمی تبصرہ" ایک ایسا مستقل کالم تھا جسے پڑھنے کے لئے عوام بے تاب رہتے تھے۔

میں ان دنوں جالندھر سے ماہنامہ "حشر" شائع کرتا تھا۔ مسٹر عنایت دہلوی سے خط و کتابت رہتی تھی۔ عنایت دہلوی ایسا ساحرانہ انداز میں خط لکھنے والا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ عنایت صاحب نے مجھے لکھا کہ وہ مس کجن کی غزل بھجوا رہے ہیں آتے "حشر" میں اہتمام سے پہلے صفحہ پر شائع کر دیجئے۔ غزل ایسی تھی کہ جس کی اشاعت سے "حشر" کی [illegible] میں ایسا اضافہ ہوا کہ [illegible] کہ مس کجن کا کلام "حشر" میں [illegible] شائع کیا جا[illegible]

میں نے مسٹر عنایت دہلوی سے درخواست کی کہ وہ مس کجن کا کلام بھجوایا کریں تو انہوں نے مس جہاں آرا کجن کا پتہ تحریر فرمایا کہ انہیں براہ راست لکھا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا [illegible] دنوں بعد انتہائی خوبصورت لفافے میں مس کجن کی چند غزلیات اور انتہائی دلکش لیٹر پیڈ پر [illegible] کیا ہوا مس کجن کا خط موصول ہوا اور [illegible] دن ایک صد روپیہ کا منی آرڈر بھی [illegible] ہوا تھا۔ "ماہنامہ حشر کا اعزازیہ [illegible] بھجوایا جا رہا ہے" جبکہ ان دنوں "حشر" کا سالانہ چندہ ڈیڑھ روپیہ تھا۔ ان دنوں [illegible] جاتا تھا کہ جس کے پاس ایک سو روپیہ [illegible] ایک بوتل شراب کا نشہ ہر وقت رہتا [illegible] صد روپیہ بلاشبہ ان دنوں آج کے [illegible] سے زیادہ وقعت رکھتا تھا۔ مگر ایک [illegible] کا کم" اور مس کجن کے خط کا نشہ [illegible] کیونکہ اس وقت مس کجن فلمی دنیا کی [illegible] ہستی تھی جس تک رسائی [illegible] بات تھی۔

پھر کچھ [illegible] مس کجن [illegible] کا سلسلہ کئی سال تک [illegible] رہا۔

[illegible]

[illegible] سے لاہور

[illegible] حت میں ملتان جاؤں

[illegible] "سہیل" جاری کئے ہوئے

[illegible] یاست" کا میں ایک مدت سے خریدار

[illegible] اور سردار دیوان سنگھ مفتون میرے

[illegible] مہربان چلے آئے تھے۔ لہٰذا میں ان

سے ملاقات کے لئے لاہور پہنچا۔ سردار صاحب

[illegible] پہلے ہی خط کے ذریعے اطلاع دے دی

[illegible] کہ وہ مقدمے کے سلسلے میں لاہور آئے ہیں

اور لاہور اسٹیشن کے سامنے ہی ہوٹل "برگنزا"

میں قیام پذیر ہوں گے۔

سردار صاحب دو دن لاہور میں رہے

[illegible] میں نے زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ

گزارا۔ باتوں باتوں میں مسٹر عنایت دہلوی کا

ذکر آیا تو سردار صاحب فرمانے لگے "ارے وہ

مس کجن کا دلال!"

میرے لئے یہ انکشاف نہ صرف حیرت

انگیز ہی تھا بلکہ کافی حد تک پریشان کن بھی۔ سردار

صاحب کو ہر وقت اخبار نویس اور ان کے مداح

گھیرے رہتے تھے اس لئے اس موضوع پر

تفصیلی گفتگو نہ ہو سکی۔ سردار صاحب صبح چار

بجے بستر چھوڑ دینے کے عادی تھے۔ لہٰذا میں صبح

پانچ بجے ان کے ہوٹل پہنچا تو وہ اخبار دیکھ رہے

تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے "اتنی جلدی

آپ آ گئے! کیا ملتان جانے کی تیاری ہے؟"

عرض کیا کہ ملتان تو کل جاؤں گا۔ سوچا صبح

صبح آپ اکیلے ہوں گے لہٰذا کچھ بات چیت کا

وقت مل سکے گا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں

تو میں نے مسٹر عنایت دہلوی کا ذکر چھیڑا کہ کل

آپ نے انہیں مس کجن کا دلال کہا تھا۔ کیا اس

سلسلہ میں آپ کچھ تفصیل سے بتانا پسند کریں

گے۔ فرمانے لگے سید صاحب مفت کی شراب

اور مفت کی عیاشی آدمی کو ایسے ذلیل کردار

بنا دیتی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ آپ کے

دوست عنایت دہلوی میرے آپ سے زیادہ دوست

[illegible] ہیں اور آپ سے بہت پہلے کی مجھ سے

[illegible] سکتے ہیں۔ [illegible] جسن ہے مگر مس

کجن نے ان کی تمام صلاحیتیں ختم کر کے رکھ دیں

شروع شروع میں یہ صاحب مس کجن کو

غزلیں لکھ کر دیتے رہے اور معاوضہ میں دس

پانچ روپے نقد اور اچھا کھانا اور شراب کے

دو چار جام پر شاکر و صابر تھے۔ مگر مس کجن

کی اداؤں میں ایسے کھوئے کہ انہیں غزلیات

عطا کرنے کا معاوضہ عیاشی میں وصول کرنے

لگے۔ مس کجن بطور شاعرہ مشہور ہو چکیں تھیں

رسائل و جرائد کے مدیر ان سے کلام برائے

اشاعت طلب کرتے تھے اس لئے وہ عنایت

صاحب کی خوشامد کرتیں کہ انہیں غزلیں کہہ دیں

اور ادھر عنایت صاحب کجن پر لٹو ہو چکے تھے لہٰذا

معاوضہ میں عیاشی کے ساتھ ساتھ کھانا اور

شراب بطور الاؤنس ملنے لگا۔

لہٰذا عنایت صاحب کے ذریعہ کجن نے مالدار

آسامیوں کو پھانسنا شروع کیا۔ عنایت صاحب

مرغن کھانوں اور شراب کے عادی ہو چکے

تھے اور ہر روز انہیں جیب خرچ کے لئے بھی

معقول رقم چاہئے تھی۔ لہٰذا انہوں نے یہ

خدمت انجام دینا بخوشی منظور کر لیا اور اس

طرح سے ان کی بالائی آمدنی میں اضافہ بھی

ہونے لگا مگر اس لعنت کی شراب، مرغن کھانوں،

جیب خرچ ضرورت سے زیادہ اور کبھی کبھار کی

عیاشی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ وہ شراب کے

اس قدر رسیا ہو چکے تھے کہ انہیں پتہ بھی نہ

چلا کر جگر کافی حد تک جواب دے چکا ہے

اور ڈاکٹروں کی ہدایات کے باوجود وہ لعنت کی

ان راحتوں کو خیرباد نہ کہہ سکے۔

مس کجن کو یار لوگوں نے شاعرہ بھی بنا

رکھا تھا۔ جس طرح عموماً شاعرات اپنے شوہروں

اور اپنے عاشقوں سے مانگے کا کلام حاصل

کر کے اپنی دنیائے شاعری میں اجالا کئے رہتی ہیں

اسی طرح سے مس کجن بھی ایسی ہی شاعرہ تھیں

مس کجن پر ملک بھر کے رئیس زادے

مرتے تھے مگر کلکتہ کے سیٹھ .... نے انہیں

مستقل طور پر داشتہ کے طور پر رکھا ہوا تھا اور

کجن کے جملہ اخراجات وہی ادا کرتے تھے۔ مستقل

طور پر ماہانہ پر رکھی داشتائیں ادھر ادھر تانک

جھانک کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتی ہیں۔ لہٰذا کجن

سیٹھ صاحب کے علاوہ ادھر ادھر جھک مارنے

اور روپیہ بٹورنے کے لئے مسٹر عنایت کو بطور

دلال استعمال کرنے لگیں۔ کیونکہ سیٹھ صاحب

جانتے تھے کہ مسٹر عنایت [illegible] کے شاعری

ایک فلم کی شوٹنگ میں مس کجن خاصی

بلندی سے ایسی گریں کہ خاصی چوٹیں آئیں اور

باوجود اس وقت کی مطابق بہترین علاج معالجہ

کے وہ اچھی نہ ہو سکیں۔

داشتائیں جب تک تندرست اور تر و تازہ

رہیں ان کے [illegible]

دل و جان [illegible] جب یہ [illegible]

حدوں سے گزر جائیں یا علالت کے باعث [illegible]

آ کی ہی ہو کر رہ جائیں تو انہیں [illegible]

کر ان کے عاشق پیچھا چھڑا کر [illegible]

ایسا ہی مس کیجن کے ساتھ ہوا۔
اسی علالت کے باعث اس جہانِ فانی
سے چل دیں۔

مس کیجن کے انتقال کے بعد مسٹر عنایت
بھی بے یار و مددگار ہو گئے۔ مفت کی اعلیٰ
کی شراب، مرغن کھانے، عجیب خرچ کے
ضرورت سے زیادہ روپیہ اڑ گیا ہے ماہ کے

اعلیٰ شراب کی جگہ دیسی ٹھرا۔ بہترین قسم کے سگریٹ
کی جگہ چار مینار کا سگریٹ۔ مرغن کھانوں کی جگہ
معمولی سڑک چھاپ ڈھابہ پر بھیجے کے گوشت
کے ساتھ خراب آٹے کی چپاتی۔ جس کا نتیجہ یہ
ہوا کہ عنایت صاحب کی بیماری بڑھنے لگی۔ جگر
نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ سگریٹ اور
شراب چھوڑنے تو بن آئی مرجاتے اور آخر کار

افسوس! ... کا ...
"قلمی چہرہ" لکھنے میں اپنا جواب آپ
خط لکھنے میں ساحرانہ ڈھنگ کا مالک اور ایک
نہایت ہی پیارا انسان اور خالی دست عنایت
دہلوی محض مفت کی شراب اور مفت کی
عیاشی کی نذر ہو گیا۔

رہے نام اللہ کا۔

غزل

اُس نے کنگھی کچھ ایسے کی ہوگی
مانگ سے کہکشاں بنی ہوگی
منتظر رات ادھ مری ہوگی
صبح کی آس بھی اٹکی ہوگی
صبح تک تو ضرور آئیں گے
چشمِ نم راہ تک رہی ہوگی
کھولے تالاب کی طرف کھڑکی
گوری لہریں نہارتی ہوگی
لہر پہ چاند گا رہا ہوگا
تال میں لہر ناچتی ہوگی
وہ گگن کا ہو یا ہو دھرتی کا
چاند ہوگا تو چاندنی ہوگی
حال کی بات مان لے ناقیؔ!
اب ضرورت اسے تری ہوگی

یوسف ناقیؔ سلیمانی

غزل

جو مجھے زخمِ شناسائی دے
کب وہی شخص شکیبائی دے
موج در موج بھنور کا عالم
لطف کیا کیا تری انگڑائی دے
موسمِ ہجر گراں بار نہ ہو
گلِ اُمید وہ رعنائی دے
محفلوں میں وہی رسوا پن
میری خلوت مجھے تنہائی دے
مندمل زخم ہوئے جاتے ہیں
ان کو ذوقِ نمو پروائی دے
فتحمندی نے سنگسار کیا
اے خدا اب مجھے پسپائی دے
معجزہ عشق میں یہ ہو اختر
خود کو دیکھوں تو وہ دکھلائی دے

اختر شاہجہاں پوری

غزل

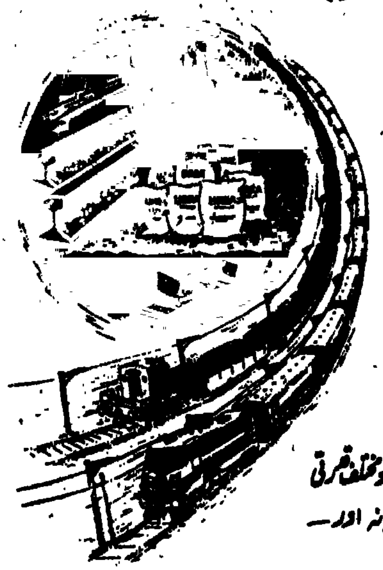
اچھا ہو اگر کام تو سوچا نہیں کرتے
سچی ہو اگر بات تو دہرایا نہیں کرتے
سمجھے گا زمانہ کہ خطاوار تمہیں ہو
دامن ہو اگر پاک تو دھویا نہیں کرتے
کیا پوچھتے ہو غم بھرے ماضی کی کہانی
رہنے بھی دو زخموں کو کریدا نہیں کرتے
زینت ہے یہی رنگ بھی شاداب چمن کی
ٹہنی سے کسی پھول کو توڑا نہیں کرتے
کر جاؤ کچھ ایسا کہ رہے یاد ہمیشہ
پتھر پہ فقط نام ہی لکھا نہیں کرتے
غیروں کو بھنک تک نہیں دیتے کبھی اس کی
اپنوں سے مگر بات چھپایا نہیں کرتے
ہوتا ہے یقیں جن کو رفیق دستِ عمل پر
ہاتھوں کی ریکھاؤں کو دیکھا نہیں کرتے

ڈاکٹر کے۔ رفیق

ماہنامہ شانِ ہند

نادرن ریلوے

آپ کی روزمرہ زندگی سے وابستہ ہے



ذرا سوچئے۔

■ نادرن ریلوے ان گنت طریقوں سے آپ کی زندگی کو آرام دہ بناتی ہے۔ سماجی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو ریلوے سے مربوط نہ ہو۔

ایک حیات بخش وسیلہ جو کروڑوں کو غذا، ایندھن اور انرجی فراہم کرتا ہے۔ ریلوے مختلف علاقوں کو باہم جوڑنے والی مضبوط کڑی ہے۔



● نادرن ریلوے آپ کے فرصت کے لمحات کو زیادہ پرلطف بناتی ہے۔ یہ آپ کو مختلف قدرتی مناظر، راجستھان کے تپتے ہوئے ریگستانوں سے ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں، پنجاب، ہریانہ اور اترپردیش کے سرسبز و شاداب میدانوں میں لے جاتی ہے۔

■ تقریباً ۱۲۵ سالوں سے ریلوے ہر طرح قومی ترقیاتی پروگراموں، نقل و حمل، زرعی ترقی، بجلی کی پیداوار، صنعتی ترقی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔

■ نادرن ریلوے روزانہ ۹۰۰ میل، ایکسپریس اور پسنجر ٹرینوں میں ۱۱ لاکھ مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچاتی ہے اور روزانہ چھ سو مال گاڑیوں میں ۱۲ لاکھ ٹن مال ڈھویا جاتا ہے۔

نادرن ریلوے کی روزانہ کارگزاریوں میں شامل ہیں —— ■ ۴۷,۰۰۰ ٹن اناج کی شمال کے زرعی علاقوں سے مختلف حصوں کو ترسیل۔
■ ۶۲,۰۰۰ ٹن کوئلہ صنعتی کاموں کیلئے پہنچانا۔ ● ۱۵,۰۰۰ ٹن پیٹرولیم کی پیداوار کی آمدورفت۔ ■ ۱۷,۰۰۰ ٹن کھاد ڈھونا۔

یہ سب ملک میں خود اعتمادی اور خودداری کی فضا تیار کرنے میں معاون ہیں۔
خاموشی سے، مگر یقینی طور پر نادرن ریلوے کروڑوں باشندوں کے بہتر مستقبل کے لئے سرگرم ہے۔
ریل پٹریوں کا مضبوط جال، زندگی کو قائم رکھنے والی رگوں اور نسوں کی طرح کام کر رہا ہے۔

نادرن ریلوے

بابِ انتقاد

اَنمول ـ سنہ ۱۹۸۶ء اشاعت ـ ڈیمائی سائز
صفحات: ۱۲۸، قیمت: چالیس روپے

اَوتار ـ سنہ ۱۹۸۷ء اشاعت ـ ڈیمائی سائز
صفحات: ۱۱۲، قیمت: چالیس روپے

شعری شہ پاروں کے یہ دونوں نادر نمونے جناب دیپک قمرؔ کی غزلیات کے مجموعے ہیں جنھیں زمانۂ جدید کی طباعتی خوبیوں سے سنوار کر بڑے اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کاغذ اعلیٰ، کتابت اور طباعت روشن اور قابلِ تعریف۔ گردپوش آرٹ کے سادہ مگر بامعنی شاہکار۔

زبان کی سادگی اور بیان کی ندرت کا سنگم، اِن دونوں مجموعوں میں جو دیکھنے میں آیا وہ موجودہ دور کے شاعروں کے کلام میں شاید و باید ہی ملتا ہے۔ اگر ہمارے اُردو ادیب، شعراء اور نقاد دیپک قمرؔ کی طرح ایسی آسان زبان کا استعمال کرتے تو اُردو ہندی کا جھگڑا ہی نہ اُٹھتا۔ مہاتما گاندھی جس زبان کو ہندوستان کی زبان سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اُن کی یہ "ہندوستانی" ہمہ ہندوستان کی زبان ہو، وہی زبان دیپک قمرؔ نے اپنے شعری شہ پاروں میں استعمال کی ہے۔ جس کی وجہ سے دیپک قمرؔ کا کلام قاری کے دل و دماغ پر فوری اثر کرتا ہے اور پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ شاعر نے اس کی دلی ترجمانی کی ہے۔

جناب مالک رام، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر بشیر بدر، ڈاکٹر محمد حسن، نظام صدیقی، راج نرائن رازؔ، ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہینؔ، مناظر عاشق ہرگانوی، کرشن ادیبؔ، عتیق صدیقی، ڈاکٹر رفیعہ حامد اور پروفیسر قمر رئیس ایسے اُردو زبان کے رکھوالوں نے دیپک قمرؔ کے کلام کو جن مناسب الفاظ میں سراہا ہے وہ آنے والے اُن دنوں کی نشان دہی کرتا ہے جب دیپک قمرؔ کا شمار مُلک بلکہ اُردو زبان کے مقبول شعراء میں ہوگا۔

شعری مجموعوں کی بہتات نے برسات کے باعث خودرَو پودوں کو بھی مات دے دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لائبریریوں کے منتظمین نے شعری مجموعوں کی خریداری بند کردی ہے۔ اور تو اور "امریکن کانگریس لائبریریز بورڈ" بھی شعری مجموعوں کی خریداری بڑے غور و خوض کے بعد کرتا ہے۔

مگر دیپک قمرؔ کے دونوں مجموعے "انمول" اور "اوتار" اِس قابل ہیں جن کی ضرورت نہ صرف لائبریری میں محسوس کی جانی چاہیئے بلکہ ہر شعری ذوق رکھنے والے کی ذاتی لائبریری میں بھی یہ شعری شاہکار اِس امر کی دلالت کریں گے کہ کسی سخن شناس نے اپنے سلیم الذوق ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

شعر کا وزن یا علمِ عروض
سنہ ۱۹۸۷ء ـــ ڈیمائی سائز
ڈارون اسٹریٹ، لندن

جناب محبوب سیالکوٹی لندن میں اُردو شاعری کی شمع بڑے اچھے ڈھنگ سے روشن رکھے ہوئے ہیں۔ صنفِ رُباعی میں انھیں خاصا ملکہ حاصل ہے اور انھیں شہنشاہِ رباعیات کہا جاتا ہے۔ اُن کی رُباعیات کا مجموعہ "رُباعیاتِ محبوب" لندن میں ہی شائع ہوا ہے اور اب اُنھوں نے "شعر کا وزن" یا "علمِ عروض" کتاب شائع کی ہے۔

پہلے حصّے میں شعر کے وزن کے تحت الفاظ مکتوبی، ملفوظی، حرفوں کے گرانے کا بیان، نون غُنّہ، حرفوں کے کم کرنے کا بیان پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے میں زحافِ تسکین، زحافِ حذف، زحافِ تشعیث، زحافِ شطر، زحافِ جدع کی تشریح کی گئی ہے۔ تیسرے حصّے میں بحروں کے بیان کے تحت سببِ خفیف، سببِ ثقیل، بحرِ سالم اور غیر سالم بحروں کے نمونے پیش کئے گئے ہیں اور چوتھے باب میں شجرۂ اخرب اور شجرۂ اخرم کی تفصیل دی گئی ہے۔

کتاب لندن میں چھپی ہے اس لئے کاغذ، بائنڈنگ، چھپائی وغیرہ خوب ہے اور لاجواب ہے۔ کتابت کسی ہندوستانی یا پاکستانی کاتب کی ہے اس لئے اس میں دیسی پن پایا جاتا ہے۔ کتاب بہت ہی خوبصورت ہے چونکہ مضمون نگار علمِ عروض سے نابلد ہے اس نے "شعر کا وزن" کی نسبت فنی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔

سرور تونسوی

مکتوب الیہ

بھائی صاحب نمستے۔
انتظار سے آنکھیں پتھرانے لگی ہیں
آج 'شان ہند' بابت فروری ۱۹۸۸ء ملا ہے۔
آپ نے کئی ایک کی خبر لی ہے۔ اداریہ نگاری
میں آپ کا اپنا مقام ہے۔

آپ کا
تاراچرن رستوگی

محترمی و مکرمی جناب سرور صاحب
آداب و تسلیمات!
چند ہی گذرے برادر مکرم جناب تابش
صاحب کا نوازش نامہ موصول ہوا جسے پڑھ کر
معلوم ہوا کہ آپ کی تصنیف "بہ کوئے یار" ...
پر اتر پردیش اکادمی کی طرف سے ڈیڑھ ہزار
روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا ہے' از حد
مسرت ہوئی۔ ناچیز کی طرف سے خلوص و احترام
کے ساتھ دلی مبارکباد پیش خدمت ہے۔ براہ
کرم قبول فرمائیں۔ یقیناً آپ کی تصنیف اس سے
بھی بہتر اور بڑے انعام کی مستحق تھی مگر آج کل
کس کا کیا حق بنتا ہے' اس طرف کون دھیان دیتا
ہے اور کون انصاف کرتا ہے۔ ابھی دوسری
اکادمیوں کے نتائج آنے شاید باقی ہیں۔
سحر یدھی

مکرمی جناب سرور صاحب' آداب!
آپ کی علالت کا جان کر تشویش ہوئی
مگر یہ جان کر قدرے راحت بھی کہ اب آپ
رو بصحت ہیں۔ پرماتما کرے کہ آپ ہمیشہ
صحت مند رہیں اور اُردو اور ادب کی آبیاری
کرتے رہیں۔
پچھلے دنوں اخبارات کے وسیلے سے' اور
کئی ایک احباب کی معرفت ایک اچھی خبر ملی تھی
جس کی بیحد خوشی ہوئی تھی' مگر آپ کو مبارکباد
کا خط نہ لکھ سکا' حیف' دیر آید' درست آید۔
یو۔ پی سرکار سے ایوارڈ کے لئے بہت بہت
مبارکیں قبول فرمائیے۔

نیاز مند
کیول کرشن رینجی

سرور صاحب آداب!
ایک معتبر اطلاع ہے کہ حکومتِ ہند کے محکمۂ خارجہ نے آپ کی تصنیف لطیف
"بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر" کی وافر تعداد میں خریداری کی ہے تاکہ ممالکِ غیر میں ہندوستانی
سفارت خانوں کی لائبریریوں میں یہ فقید المثال اور زبانِ اردو کی آبرو ایسی کتاب
موجود رہے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو زبان میں ایسی دلچسپ اور حرف حرف
سچائی پر مبنی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ اور پھر جس نفیس انداز میں آپ نے یہ کتاب شائع
کی ہے اس کی مثال تو دوسرے ممالک کی کتابوں میں بھی نہیں مل سکی۔
"بہ کوئے یار" کی اس عالمی مقبولیت پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

نیاز مند
طارق صدیقی
ماہنامہ 'آگرہ'۔

محترم سرور صاحب
آداب!
آپ کی علالت کے باعث 'شان ہند'
کی اشاعت میں ایک بار پھر تاخیر ہوئی۔
اللہ کا شکر ہے کہ اب آپ صحتیاب ہیں
محترمہ روحی صاحبہ کی تلاش و انتخاب حاصل مطالعہ
"مراجعت" قارئین کے لئے یقیناً اچھی تفریح ہے
اگر مناسب ہو تو یہ کالم مستقل طور پر قائم ر[illegible]
آپ کا خادم
یوسف ثانی سلیما[illegible]

مکرمی جناب سرور تونسوی' آداب محبت!
شان ہند کے سبھی تک کے شمارے موصول ہو چکے ہیں۔
خیال رکھیں' حالات حاضرہ پر آپکے اداریے پسند آئے [illegible]
پارٹی کو [illegible] اور اب کرانتی کاری مورچہ جو دی پی [illegible]
ہماچل میں ایک شاخ ہے اسمیں شامل ہو گیا ہوں [illegible]
وال سابق چیف منسٹر ہیں جن کی [illegible]
[illegible]
دیر ہوئی آپکی صحت اور [illegible] کیلئے دعا گو ہوں
آپ کا عزیز
[illegible] (سابق ایم ایل [illegible]
بجار' کلو (ہماچل پردیش)

[illegible] محفوظ رکھیں

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 JUNE 1988

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

Delhi Postal

NOOR MOHAMMADI HOTEL

جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے



● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مداحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نور محمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سالہ تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنا دیا ہے۔ آپ یہاں تشریف لا کر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے

نور محمدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 183/181 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115

جولائی ۱۹۸۸ء

دہلی

شانِ ہند



دوسری بیوی کا نام گل بانو تھا۔ وہ بہت حسین اور دراز قد اور
پرکشش عورت تھی۔ یاسمین سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ ستو کا
سِن تھا۔ وہ فرحشاں کے لئے روایتی سوتیلی ماں ثابت ہوئی۔ ندیم فضل
اپنی دوسری بیوی کی بھری جوانی میں کچھ ایسا کھویا کہ......
پڑھیے علی ندیم کی کہانی "شحنہ" ۔ اسی شمارے میں۔

شانِ ہند

دہلی

جولائی سنہ ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹

شمارہ ۷

چیف ایڈیٹر — سرور تونسوی

معاون ایڈیٹر — مطرب صحرائی

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر

وِدّیا پرکاش سرور تونسوی

طباعت۔ خواجہ پریس جامع مسجد دہلی

مقام اشاعت۔ دفتر ماہنامہ شانِ ہند

بلیماران ۔ ۔ ۔ گلی دہلی

خطاط

سبطین حیدر

محمد عمران

حسن کار

مصطفٰے آرٹسٹ

غزل

شیخ باقر حسین صاحب وفا اکونٹنٹ ڈسٹرکٹ بورڈ اناؤ

نگاہِ شوق کا کچھ سدِ باب ہو نہ سکا
ترے حجاب کے صدقے حجاب ہو نہ سکا

وہ پردہ دار ازل بے نقاب ہو نہ سکا
جہانِ عشق میں کچھ انقلاب ہو نہ سکا

کہیں کہیں سے تمہیں دیکھ ہی لیا ہم نے
حجاب تم سے بہ طرزِ حجاب ہو نہ سکا

کسی کے حسن پہ ترجیح دوں کسے یارب
اُدھیڑ بُن یہ رہی انتخاب ہو نہ سکا

محال کو نظر انداز کر دیا ہوتا
یہی تو اے نگہِ انتخاب ہو نہ سکا

جنابِ شیخ پہنچیں گے بہشت میں کیونکر
یہاں تو اُن سے یہ کارِ ثواب ہو نہ سکا

بنائیں صانعِ قدرت نے صورتیں کیا کیا
تمہارے حسن کا لیکن جواب ہو نہ سکا

فضول میری گذارش ہے التجا بے کار
کسی سوال کا تم سے جواب ہو نہ سکا

خموش رہ گیا میں باز پرسِ محشر میں
جواب دے نہ سکا یا جواب ہو نہ سکا

بنا بنا کے مٹانے میں مصلحت کیا ہے
یہی سوال ہے جس کا جواب ہو نہ سکا

ہر اک خطا کا کوئی عذر سوچ رکھا تھا
بروزِ حشر مگر کچھ جواب ہو نہ سکا

یہ سرکشی تھی کہاں جب ہوا سوالِ الست
بجز بلٰی کوئی ہم سے جواب ہو نہ سکا

گزر گیا مرے جھگڑے میں دن قیامت کا
گناہ اتنے تھے جن کا حساب ہو نہ سکا

بنائیں صورتیں کتنی بگاڑ دیں کتنی،
تمام ہو گئی دنیا حساب ہو نہ سکا

قصور کس کا ہے اے خالقِ شباب بتا
جو بیخطا مرا عہدِ شباب ہو نہ سکا

بہارِ حسن کی رعنائیاں ارے تو بہ
ترے شباب سے بہتر شباب ہو نہ سکا

فقیر میں جو ہوا کاسۂ گدا یہ بنا
غرض جدا کبھی جامِ شراب ہو نہ سکا

ہزار حیف مقدر پہ لیے مِکش کے
شراب پی کے جو غرقِ شراب ہو نہ سکا

مجھے بگاڑ کے کچھ تو ہی بن گیا ہوتا
یہ کام بھی دلِ خانہ خراب ہو نہ سکا

مٹا کے نام وفا تم نے کر دیا روشن
خراب ہو کے بھی عاشق خراب ہو نہ سکا

اڈیٹوریل

ہندو فرقہ پرستی کے موجودہ رجحانات اور اُنکے اسباب؟

مُسلم قائدین اور عوام کا رویّہ ــــــ اور

حکومت کا رویّہ.....

حکومت نے اپنے رویّہ سے یہ غلط نظریہ عوام کے سامنے رکھا ہے کہ وہ ہندوؤں کو فرقہ پرست سمجھتی ہے اور اقلیتوں کو سیکولر

آل انڈیا اردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹ
م (برائے قومی یکجہتی) پٹنہ (بہار) جس کے
. ڈاکٹر خلیق انجم، ورکنگ صدر شمائل نبی اور
ل سکریٹری ریاض عظیم آبادی، ڈاکٹر اعجاز
ارشد ہیں۔

اس فورم کے ۲۵ ممبران ہیں۔ اس فورم کو حکومت بہار نے ایک لاکھ روپئے کی گرانٹ دی ہے۔ اس فورم کی اکثر ریاستوں میں شاخیں قائم ہوچکی ہیں۔ چنانچہ ان شاخوں کے سربراہوں کے نام، فورم کے صدر، ورکنگ صدر اور جنرل

سکریٹری صاحبان کی طرف سے ایک سرکلر جاری کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:۔
"ملک کے موجودہ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم بلا تاخیر میدان عمل میں آجائیں۔ شریمتی اندرا گاندھی کے

نل کے [illegible] فرقہ پرستی [illegible] کو ہی کے [illegible] ہے ہوتے ہیں۔ ہندو سکھ اختلافات، بابری مسجد [illegible] میرٹھ کے فسادات ایک طرف اقلیتوں میں عدم اعتماد کا احساس پیدا کیا تو دوسری طرف فرقہ پرستوں کو اکثریتی فرقے کے جذبات بھڑکانے کا موقع فراہم کیا ہے۔ وشو ہندو پریشد اور آر۔ ایس ایس کے لوگ مستقل زہر افشانی کر رہے ہیں اور کوئی ان کی زبان کو لگام دینے والا نہیں۔ اقلیتوں کے اپنے مسائل ہیں، وہ فرقہ پرستی کا جواب فرقہ پرستی سے دینا چاہیں یا خاموش رہیں۔ مسلمان عام طور پر شکایت کرتے ہیں کہ پنجاب کے فسادوں سے نپٹنے میں حکومت نے جس طرح کام کیا اس طرح میرٹھ کے بلوائیوں سے نپٹنے میں نہیں کیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اکثریتی فرقے کو مذہبی جنون میں مبتلا کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔"

یہ اس فورم کا آخری [illegible] حکومت کے خلاف چارج شیٹ ہے جو قومی یکجہتی کی علمبرداری کا دعویٰ کرتی ہے اور جسے سرکاری حمایت دی گئی ہے۔ حالانکہ دُنیا جانتی ہے کہ قومی یکجہتی کے داعی ہی فرقہ پرستی کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

اس سرکلر میں ممبران سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ حسب ذیل مسئلوں پر اپنی رپورٹ فورم کے ہیڈ آفس میں بھجوا دیں۔

الف۔ ہندو فرقہ پرستی کے موجودہ رجحانات اور اُن کے اسباب۔

ب۔ مسلم قائدین اور عوام کا رویّہ۔

ج۔ حکومت کا رویّہ۔

ایڈیٹر شانِ ہند بھی بدقسمتی سے اس فورم کا ممبر ہے۔ اس لئے اسے بھی اپنی رائے دینے کا حق ہے اور یہ رائے فورم کے ہیڈ آفس یا دلی شاخ کے سربراہ کو بھجوانے کے بجائے عوام کے سامنے رکھی جا رہی ہے۔ تاکہ کچھ غلط فہمیاں جو یہ فورم پھیلا رہا ہے اسکی اصلیت سے عوام واقف ہو سکیں۔

سب سے پہلے تو ہم قطعی صاف الفاظ میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ فرقہ پرستی ہمارے

[illegible] سے خارج [illegible] ہمارے [illegible] کا دشمن سمجھتے ہیں۔

ہندو فرقہ پرستی کے موجودہ رجحا[نات] اور اُن کے اسباب۔

یہ امر مسلّم ہے کہ عام ہندو پیسہ کمانے میں مگن رہتا ہے۔ اُسے مذہب سے صرف اتنا ہی واسطہ ہے کہ صبح اشنان کرتے کرتے رام رام الاپ رہے اور بھگوان کی تصویر کے سامنے دست بستہ رہ کر۔ کاروبار کی ترقی اور زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کے لئے دُعائیں مانگے۔ رسماً مندر میں روزانہ یا جب اُسے موقع ملے بھگوان مورتی کے سامنے ماتھا ٹیکے۔ سیاسی طور پر جو ہندو روپیہ کمانے کو ترجیح دیتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ سیاسی طور پر کسی جماعت میں حصّہ لیکر وقت برباد کرے۔ ہندو سبھا اور آریہ سماج کو عام طور پر فرقہ پرست کہا جاتا ہے حالانکہ ان کی فرقہ پرستی محض ہندو عوام میں ایکتا اور ہندو سنگٹھن کا پرچار کرنے تک محدود تھی۔ آر۔ ایس۔ ایس ایسی جماعتوں کے خلاف بھی یہی کہا گیا کہ یہ فرقہ پرست جماعتیں ہیں حالانکہ آر۔ ایس۔ ایس کا جنم ہی مسلم لیگ کی خرمستیوں کے باعث ہوا۔ اسلام ایسے مذہب جس کا بانی خاتم الانبیاء کہلایا اور جسے تمام عالم کے لئے رحمت قرار دیا گیا، اُسی اسلام کے ترجمان علماء نے عام مسلمانوں کے ذہن میں یہ بٹھا دیا کہ مسلمانوں کے علاوہ ہر انسان کافر ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تو مذہبِ اسلام کے عالمِ وجود میں آنے سے پہلے معلوم کب سے یہ دُنیا قائم ہے اور نہ معلوم کتنے نبیوں اور پیغمبروں نے اس دُنیا میں انسانی شکل میں جنم لیا۔ اور خدا یا بھگوان کا پیغام اُس کی مخلوق تک پہنچایا۔ اسلام کے کچھ خود ساختہ اور زیادہ تر جاہل عالموں نے اسلام کو اس ڈھنگ سے عوام کے سامنے پیش کیا کہ عام مسلمانوں نے فرقہ پرستی کو مذہب کا حصّہ سمجھ لیا اور اس کے نتیجے میں ہندو

> ہندو سبھا اور آریہ سماج کو عام طور پر فرقہ پرست کہا جاتا ہے حالانکہ اُن کی فرقہ پرستی محض ہندو عوام میں ایکتا اور ہندو سنگٹھن کا پرچار کرنے تک محدود تھی۔ آر۔ ایس۔ ایس ایسی جماعتوں کے خلاف بھی یہ کہا گیا کہ یہ فرقہ پرست جماعتیں ہیں حالانکہ آر۔ ایس۔ ایس کا جنم ہی مسلم لیگ کی خرمستیوں کے باعث ہوا۔ اسلام ایسے مذہب جس کا بانی خاتم الانبیاء کہلایا اور جسے تمام عالم کے لئے رحمت قرار دیا گیا اسی اسلام کے ترجمان علماء نے عام مسلمانوں کے ذہن میں یہ بٹھا دیا کہ مسلمانوں کے علاوہ ہر انسان کافر ہے۔"

میں بھی [illegible]
پر نظر کریں جسے عام طور پر ہندو فرقہ پرستی کہا جاتا ہے
وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس ایسی
جماعتیں جواب ہے اُن مسلم تنظیموں کا جو خفیہ طور پر
مسلمانوں کو مذہبی تعصب / حب الوطنی سے نفرت اور
ہندوؤں سے نفرت کرنے اور دو قومی تھیوری کو عمل
میں لانے کے لئے کوشاں تھیں۔ یہی وجوہات ہیں
ہندوؤں میں فرقہ پرستی کے رجحانات اور اُن کے
اسباب کے۔

مسلم قائدین اور عوام کا رویّہ

کچھ ہی دن ہوئے کہ بہرام پور میں ہندو مسلم جھگڑا ہوا۔ اس سلسلے میں ایک مسلم دانشور جناب اصغر علی انجینئر نے مسلم عوام اور مسلم رہنماؤں سے جو کچھ ایک بیان میں کہا ہے وہ بڑی اچھی طرح سے مسلم قائدین اور عوام کے رویّے کا آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

"اس بات میں شک نہیں کہ جھگڑا زیادہ تر اس وجہ سے شروع ہوا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام مسلمان اپنے اس حق پر زور دے رہے تھے کہ انھیں ایک ایسی مسجد میں نماز ادا کرنے دی جائے جو بھارت سرکار کے آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ نے ۱۹۱۰ء میں بطور ایک تاریخی عمارت اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ اس کے برعکس وشو ہندو پریشد کی لیڈرشپ کے زیرِ قیادت ہندوؤں نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ وہ اس کا درود هر کریں گے اور مسلمانوں کو یہاں نماز ادا کرنے سے روکیں گے۔
پشچمی بنگال کی سرکار نے کہا کہ جس عمارت کو مسلمان ایک مسجد کہہ رہے ہیں، وہ دراصل نواب مرشد علی خان کی قبر ہے۔ اس طرح یہ ایک اتہاسک عمارت ہے جس پر کوئی فرقہ دعویٰ نہیں کر سکتا جو بھی [illegible] مسلمانوں سے [illegible] کہ انھیں یہ سوال کبھی نہ کھڑا کرنا چاہئے تھا۔ چاہے یہ مسجد ہی تھی مسلمانوں کو پچھلے سال بابری مسجد کے سوال پر بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ میں اپنی ذاتی تحقیقات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے سال کے میرٹھ فساد کے لئے بابری مسجد بڑی حد تک ذمہ دار تھی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ مسلم لیڈرشپ نے میرٹھ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا شاید وہ کرنا نہیں چاہتی۔ یہ صاف ہے کہ مسلمانوں کو ایک دم سے اِن پرانی تاریخی مسجدوں سے محبت نہیں ہو گئی انھیں بعض مسلم لیڈر دیدہ و دانستہ اُبھار رہے ہیں کہ وہ اپنا دعویٰ کریں کہ انھیں اُن مساجد میں نماز ادا کرنے کا حق ہے یہ مسلم لیڈر بھی غالباً دوسرے فرقوں کے لیڈروں کی طرح ہی عمل کر رہے ہیں جو اپنے حق کا دعویٰ کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کے لیڈر سیاسی اور آرتھک طاقت میں زیادہ حصہ حاصل کرنے کی غرض سے ان لوگوں کو فرقہ وارانہ لائنوں پر اکٹھا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے اگر فرقہ وارانہ جھگڑوں میں اگر چند لوگوں کی جانیں جاتی ہیں تو کسے اس کی پرواہ ہے۔ مسلمان لیڈروں کا کہنا ہے کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کی رکشا کے لئے لڑ رہے ہیں لیکن اگر کوئی گہرائی میں جا کر غور سے دیکھے تو اُسے نظر آجائے گا کہ اپنے فرقے کے حقوق کی رکشا کی بجائے وہ اپنے ذاتی مفاد کے تحفظ کے لئے لڑ رہے ہیں چاہے ایسا کرتے ہوئے بے گناہ لوگوں کی قربانی بھی دینی پڑ جائے۔ ضرورت ہے کہ عام مسلمان اور مسلم بُدھی جیوی خاص طور پر اس بات کو سمجھیں۔ حق یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے سامنے کئی دوسرے اہم ترین مسائل ہیں لیکن مسلم لیڈروں نے آج تک کبھی بھی اُن پر توجہ نہیں دی۔ وہ صرف انھیں حقوق کی بحالی پر زور دیتے ہیں جن کا تعلق مسلم پرسنل لاء اور پرانی بوسیدہ مساجد میں نماز ادا کرنے تک ہی سمٹ ہے خاص کر اُن میں جو آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ نے اپنے ادھیکار میں کر رکھی ہیں صرف اس لئے کہ اُن سے مسلمانوں کے دھارمک جذبات کو بھڑکایا جا سکتا ہے لیکن مسلمانوں نے دیا یک ناخواندگی اور انتہائی پسماندگی پر اپنی نظریں بند کر رکھی ہیں۔ یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں ہمارا شٹر کے دلتوں سے بھی زیادہ ناخواندگی ہے۔ بہت کم مسلمانوں کو باقاعدہ ادیوگک سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ نوٹ ہے کہ آرتھک اور تعلیمی اداروں کی عدم موجودگی کی وجہ سے زیادہ تر مسلمان مجرمانہ سرگرمیوں کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں اور بدمعاش لوگوں سے ملتے جاتے ہیں۔ یہ وہ عناصر ہیں جو شہروں میں آپ کو ملتے ہیں اور جب بھی کوئی فرقہ وارانہ نازک موقعہ آجاتا ہے تو یہ سب سے پیش پیش ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی وجہ سے بھولے بھالے اور بے گناہ مسلمانوں کو مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں کے کچھ عناصر اورنگ آباد میں سرگرم تھے جس کا پورا پورا فائدہ شیو سینا نے اُٹھایا۔ گویا کہ سب بدمعاش اور غنڈے صرف مسلمانوں میں ہی ہیں۔ شیو سینا نے ہندوؤں کو مسلم غنڈوں سے نجات دلانے اپنے چناؤ کا ایک نعرہ بنا رکھا تھا۔ شیو سینا نے اپنے اس ہندو کارڈ

حکومت کا رویہ

حکومت کا رویہ اس قصہ اس کی ہے کہ اس بکھیڑا کتنا وقت ضائع کرتا ہے۔ حکومت نے اپنی حماقتوں سے قومی یکجہتی کو فرقہ پرستی میں بدل کر رکھ دیا ہے جس کا ثبوت زیر نظر سرکلر ہے جہاں ہندو کا نام آیا، حکومت اور مسلمان اسے سیکولرازم کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ہندو اگر مندر میں جاتا ہے

یا ہندوؤں کو انسان ... کی تلقین کرتا ہے تو اسے سیکولرازم کا دشمن کہا جاتا ہے ہر مسلمان فخر سے کہتا ہے کہ وہ خدا کے کرم سے مسلمان ہے۔ اس کا یہ اعلان قومی یکجہتی سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی ہندو یہ کہہ دے کہ وہ ہندو ہونے پر فخر کرتا ہے اور وہ ہندوؤں کو اپنی مذہبی اقدار پر چلنے کی تلقین کرتا ہے تو اسے فرقہ پرستی کہا جاتا ہے۔

حکومت نے اپنے رویے سے یہ غلط نظریہ عوام کے سامنے رکھا ہے کہ وہ ہندوؤں کو فرقہ

... نظریے کے زیر تحت ... جا رہا ہے۔ آج شاید ہی کوئی ... اندرونی اور بیرونی طور پر ... اور جو ایسے بے وقوف ہیں کہ ... سمجھتے ہیں انھیں کوئی پوچھتا نہیں ... کاش! ہماری حکو... کو اصل معنوں میں عوام کے دل ... کی کوشش کرتی۔

قصہ

دلی اردو اکادمی کا

پہلے یہ خط ملاحظہ فرمالیجے:۔

سرور صاحب! آداب و تسلیم!

میں نہ تو اردو اکادمی دلی کا ترجمان ہوں اور نہ مخالف۔ اسی طرح نہ تو مجھے آپ کی خوشنودی کی ضرورت ہے اور نہ ہی آپ کی ناراضی میرے لئے نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔ دلی اردو اکادمی سے متعلق "شان ہند" میں آپ کی مطبوعہ تحریریں میری نظر سے گذرتی رہتی ہیں لہٰذا اس ضمن میں مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے

"رخت سفر" کتاب میں نے بازار سے منگا کر دیکھی ہے۔ واقعی اس پر ناشر کا نام نہیں ہے۔ مگر کتاب کے مبینہ ناشر قریشی صاحب مالک سیما آرٹ پریس سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ کتاب پر پرنٹر کے ساتھ پبلشر کا نام لکھنے سے رہ گیا اور اصولاً کتاب

برائے انعامی مقابلہ اردو اکادمی میں دیتے وقت ہی یہ لکھ دیا تھا کہ کتاب کا پبلشر سیما آرٹ پریس ہے لہٰذا یہ انعامی کمیٹی کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کسی بھی کتاب کو بہترین کتاب قرار دے اور یہ فیصلہ خواہ سو فیصد غلط ہی کیوں نہ ہو کوئی اُسے چیلنج نہیں کر سکتا۔

چنانچہ اردو اکادمی نے ضابطے کے تحت اس کتاب کو بہترین ناشر کا انعام دے دیا۔ آپ از خود اس کی تحقیق فرمائیں گے تو یقیناً آپ کو اس

صورت حال کا علم ہو جا... اسی طرح جناب جا... کی کتاب پر جو مالی مدد دی ... کے تحت دی گئی ہے۔ ... ہند۔ کے دلی کے اسکولوں ... پر پابندی عائد کی بات تو یہ اپنے ... گوپی چند نارنگ سے کہ ... نہیں فرماتے۔ کیونکہ جس کے ... حکم دیا نارنگ صاحب اُس ... چیئرمین ہیں اور چیئرمین صا... سے ہی تجویز منظور کی گئی ... سرور صاحب یہ ... کہ آپ ہائی بلڈ پریشر کے مریض ... کو کسی بھی خود غرض یا مطلب ... اپنی مطلب براری کے لئے کر ... میز کا دیا اور آپ نے لکھ د... دوستانہ درخواست کرتا ہو... اس سلسلہ میں خود تحقیق ... آپ کو بخوبی علم ہو سکے گا کہ ... نقوی سکریٹری دلی اردو اک... کام ضابطے کے خلاف نہیں ... یہ تو ان کے دشمن بھی تسلیم کر... یہ مکتوب گرامی ہمارے ... دیرینہ کرم فرما کا ہے۔ انھوں ... اس کی اشاعت کے لئے منع ... شائع کر رہے ہیں اور مکتوب ...

زنو بی چند نارنگ ان سے ناراض ہو جائیں گے۔

شان ہند کی گزشتہ اشاعت میں تفصیل سے یا گیا تھا کہ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ن، بورڈ کمیٹی دلی اُردو اکادمی سے جس حقیقت سے آگاہ فرماتے ہوئے وثوق سے کہا کہ مندرجہ دونوں معاملات میں کسی قسم کی بددیانتی نہیں بلاجو کچھ بھی ہوا وہ ضابطے کے تحت اور ایوارڈ کے متفقہ فیصلہ سے جس میں ڈاکٹر گوپی چند چیئرمین پروگرام کمیٹی جس کے تحت رسائل اور کتب کا کام بھی ہے، جناب انور دہلوی چیئرمین کمیٹی اور جناب خلیق انجم چیئرمین پبلشنگ کمیٹی شریک تھے۔

مندرجہ بالا مکتوب گرامی ملنے کے بعد ہم نے سند سے ان دونوں واقعات کی تحقیقات واکادمی کے کچھ ممبران سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ہمیں جو اطلاعات دی گئیں وہ محض سید شریف الحسن نقوی کے عہدۂ ملازمت کی توسیع میں رخنہ ڈلوانے کے لئے تھیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب نے تو ڈاکٹر جاوید وشسٹ کے بارے میں فرمایا کہ اُردو اکادمی نے ان کی کتاب پر معمولی سی مالی امداد دے کر کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ تو بہت زیادہ کے مستحق ہیں۔

یہ ہمیں علم ہے کہ جب بھی سید شریف الحسن نقوی سکریٹری اُردو اکادمی کے عہد ملازمت میں توسیع کا موقعہ ہوتا ہے تو یار لوگ ہر قسم کی چالیں چل کر اس میں رخنہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ہندی اخبارات کی خدمات بھی حاصل کی جاتی ہیں۔ یہ تو ہمارے لیفٹیننٹ گورنر کی تجربہ کاری اور اعلیٰ انتظامی قابلیت کا نتیجہ ہے کہ وہ ایسی چالوں کو بھانپ لیتے ہیں اور وہ وہی کچھ کرتے ہیں جسے وہ بہتر سمجھتے ہیں۔

ہمیں دلی خوشی ہے کہ ہم دو معاملات کے بارے میں ہم اُردو اکادمی کی بددیانتی (محض غلط اطلاعات کی بنا پر اور کتاب "زرفت سحر" کو دیکھ کر کیونکہ اس پر ناشر کا نام تھا ہی نہیں) قرار دے رہے تھے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے زمان، مندرجہ بالا مکتوب گرامی اور خود اپنی تحقیقات پر اُسے قطعاً غلط پایا کیونکہ اُردو اکادمی کی خدمات کے سلسلہ میں جس قدر شان ہند نیک نیتی سے اعتراف کرتا رہا ہے شاید ہی کسی دوسرے اخبار یا رسالے نے اُردو اکادمی کی خدمات کا اعتراف کیا ہو۔ اور ہمیں حیرت تھی کہ سید شریف الحسن نقوی ایسے قابل منتظم کے ہوتے ہوئے یہ بے ضابطگی کیسے ہو گئی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ محض یار لوگوں کی لگائی ہوئی آگ تھی حالانکہ ان دونوں معاملات میں ضابطہ کی پابندی پورے طور پر کی گئی۔

اُردو میلہ

طنز و تبسم

بشکریہ "منصف" حیدرآباد

یہ جشن جو اُردو کا ہوا دلی میں
تقسیم کرو اور بٹا نے چھوڑو
شخصیتیں جمع ہوئی تھیں یکجا
ہی انداز میں اُردو کی ہوئی کانفرنس
میں شامل تھے حکومت کے نمائندے بھی
اک سے اک بڑھ کے ہوئیں تقریریں
کھائے ہے اور موج اڑائے دو دن
اخباروں میں روداد اس کی
ٹی وی سے بھی تشہیر زبردست ہوئی۔
جشن ہے کیا یہ تو بتاؤ یارو
لفظوں سے اُلو نہ بناؤ یارو

کون سے حل ہوئے اُردو کے مسائل اس سے
کونسی پالیسی تبدیل حکومت کی ہوئی
جشن سے فائدہ کیا اُردو زباں کو پہنچا
بات موسیقی کی محفل پہ ہی کیوں ختم ہوئی
محفل رقص بھی ہوتی تو بہت اچھا تھا
اسی آئیٹم کی کمی ہوتی ہے محسوس بہت
جشن والوں کے لئے یہ کوئی مشکل تو نہ تھا
فلمی دنیا سے کئی آرٹسٹ آ سکتے تھے
ناچ بھی سکتے تھے قوال بھی گا سکتے تھے
ہوتی پائل کی بھی جھنکار جو رقص سے پر
بدنصیب اُردو کی تقدیر چمک جاتی تھی
دھوم عالم میں تو کیا تا بہ فلک جاتی تھی

چپ ہے کچھ ہو نہ ہو شہرت تو ہوئی لوگوں کی
پیسہ پانی کی طرح بہہ گیا بہہ جانے دو
کہیں شہرت بھی ملا کرتی ہے دولت کے بغیر
مقصد جشن ہے کیا یہ تو بتاؤ پہلے
اہل اُردو کو مبارک ہو یہ جشن اُردو
کام تو ہو گیا اتنے بڑے پیمانے پر
بحث کیا اُردو کو حق اس کا ملے یا نہ ملے
جس کو بے گھر ہوئے چالیس برس بیت گئے
سب پرستار ہیں، ہمدرد ہیں اُردو کے مگر
کسی اسکول نہ دفتر میں نشاں ہے اس کا
جو زبانوں پہ ہے نام اُردو زباں ہے اس کا
یہ ڈرامے ہیں فقط بچوں کو بہلانے کے
اس سے ہی ذہن حکومت کا پتہ چلتا ہے
تھرمامیٹر سے حرارت کا پتہ چلتا ہے

آنکھوں دیکھا کانوں سنا

سرزمینِ گنگوہ کی شعری نشست

جناب زبیدؔ اختر کے دولت کدہ پر ماہانہ
[ادبی] نشست مورخہ ۲۵ جون ۸۸ء کی مختصر
[ر]پورٹ مندرجہ ذیل ہے جو اس ماہانہ شعری نشست
[کی] کامیابی کی مظہر ہے۔

صدارت:۔ حضرت خوشترؔ مانوی
نظامت:۔ جناب حافظ محمد نسیم انور ایوبی

نشست کا آغاز حافظ محمد اعظم حسن نے
[جن]اب حقؔ بنارسی کی غزل سے اپنی مترنم آواز میں
[کی]ا جس سے یہ مصرعۂ طرح لیا گیا تھا:۔
"ہم وفا کے مجرم ہیں لیا سزا ہماری ہے"
شریکِ نشست شعرائے کرام کے منتخب
اشعار پیش ہیں۔

[illegible]

اب میری آنکھوں میں اب بھی میرے ہونٹوں پہ
خواب بھی تمہارے ہیں بات بھی تمہاری ہے

زاہد قریشی:۔
زندگی کی ہر ساعت ہم نے یوں گزاری ہے
گویا ہم پہ پھولوں کا حق آبیاری ہے
ابکہاں سے لائے گا کوئی دل جگر جاناں
کس کو نذر جم دوراں تجھ سے شکاری ہے

مولانا محمد الیاس نغزؔ مظاہری:۔
ہم دل کر بھی حال یہ کر سکے نہ سمجھوتہ
حق کی راہ میں ہم کو موت اپنی پیاری ہے
ہم تو اپنے نغمے کا خون دے کے چھوڑ کا لی
دل سے شہنشاہو ! اب تمہاری باری ہے

قاضی منصور حسرتؔ:۔

کل تمہارے ساتھ اور یہ تعلق ضبط جس کا تھا
آج کیوں مگر تیرا ارتقاء عاری ہے
کتنی چھپاری تو جوئے روشنی کی حسرت میں
تیرا نقش پا لے کر زندگی سنواری ہے

نیرؔ قریشی گنگوہی:۔
تلخیوں کے آنگن میں زندگی گزاری ہے
ہم نے نصیبوں کو جبر ہی ہو جیسے یہ تاج
میرے ایسے زخموں کو آپ پیتے رہئے دو
سب نصیب نوازش بھی دل پہ جو بھاری ہے

حکیم کاشفؔ انجمی:۔
ہم نے شبھا نے ظلمتوں کو آئینہ دکھایا ہے
آج ہم عالم میں روشنی ہماری ہے
بے وفا کا مقتل ہے سر کہاں جھکے گا
وہ یہاں سے جنتا جیسی کی جان پیاری ہے

راجندر نرائن سکسینہ بسمل شمس آبادی

مُشاعرے کی کامیابی کے گُر

اپنا مُشاعرہ جو بنانا ہو کامیاب
باتیں یہ گُر کی دھیان سے سُن لیجیے جناب

بُلوا رہے ہیں آپ جو شعرائے باصفات
لازم ہے شاعرائیں بھی ہوں اُن میں بانسات

کچھ شاعرانِ ذی صفت و باکمال میں
ایسے بھی ہوں جو آئے ہوں ٹی وی پہ حال میں

رکھنا ہے یہ خیال بھی اے مہرباں ضرور
مہمان شاعروں میں ہوں یہ خوبیاں ضرور

خوش وضع خوش لباس بھی ہوں دیدہ زیب ہوں
طور و طریق اُن کے جو ہوں دلفریب ہوں

اِس دورِ شاعری کے نئے آبرو بھی ہوں
انداز میں ہو اُن کے کشش خوش گلو بھی ہوں

اشعار جب پڑھیں وہ تو ہو ہاؤ بھاؤ بھی
لَے میں گلے اُتار ہو گانے چڑھاؤ بھی

مائک پہ آ کے شعر کہیں اِس ادا کے ساتھ
پنڈال میں ہو شور بپا "واہ وا" کے ساتھ

مانیں نہ آپ مری اِس صلاح کا
قدریں بدل گئیں، وہ زمانہ بدل گیا

شعر و ادب کا آج وہ معیار بھی نہیں
اور اہلِ فہم بیس میں دو چار بھی نہیں

جھک کر نظر اُٹھی تو عجب انقلاب تھا
وہ دن ہُوا ہُوئے کہ پسینہ گلاب تھا

یہ بات سچ ہے آپ اسے لائیں یقین میں
اگلی سی بات اب وہ نہیں سامعین میں

سمجھیں وہ شعر کتنوں میں ہے یہ صلاحیت
قوالیوں کی صرف ہے سُننے کی اُن کو لت

اُن کی بلا سے شعر ہو مہمل اگر تو ہو
شاعر میں گا کے پڑھنے کا لیکن ہنر تو ہو

اتنا ہے تنگ اُن کے تخیّل کا دائرہ
قوالیوں کی بزم ہے اُن کو مشاعرہ

مَیں چاہتا نہیں تھا کہ لب اپنے وا کروں
لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے، کیا کروں

شاعر جہاں پہ ہوتے نہیں اس طرح بہم
ہوتے ہیں سُننے والے وہاں شاعروں سے کم

کالوں کی خوف میں گھڑی گھڑی گذارنا بھاری ہے
زندگی میں پل پل کا اضطراب جاری ہے
فلسفہ محبت کا تُم اگر سمجھ پاؤ
یار میں تمہاری ہے جیت بھی تمہاری ہے

ہنس کوثری:۔

بیسویں صدی تجھ میں اتنی فرسا ری ہے
ہنس جائے ہر انساں کچھ زخم کاری ہے
اتنا بوجھ کاموں کا پڑ گیا ہے بچوں پہ
صبح اُٹھ کے کہتے ہیں آج کس کی باری ہے

واحد سہارنپوری:۔

ہم نے بزمِ عالم کی یوں فضا سنواری ہے
تیرگی سے اُلجھے ہیں روشنی اُبھاری ہے
سچی بات کہنے سے فن بسر نہیں رہتا
کون پھر زباں کھولے سب کو جاں پیاری ہے

اقبال قدوسی:۔

رفعتیں ہیں لرزیدہ پستیوں کی باری ہے
اہلیت کے آئینے پر کیسی سنگ باری ہے
اعتبار کیا کیجیے، معتبر بھی شامل ہیں
رہزنیت کے چولوں میں لوٹ مار جاری ہے

مولانا خادم عبدالاحد

آپ کو محبت سے ایک بار دیکھا تھا
دل کا حال کیا کہوں اک نشہ سا طاری ہے
کیا کسی کو سمجھائیں ہم تمھیں ہیں دونوں ہی
اُن کا غم بھی پیارا ہے زندگی بھی پیاری ہے

بشیر دیوبندی:۔

اک عجیب شفقت ہے اُس کے زم لہجے میں
زیرِ لب تبسم ہے بات بات پیاری ہے
حادثوں کی شدت نے حوصلے کئے پیدا
ہم سے گردشِ دوراں بار بار ہاری ہے

ڈاکٹر عرشی قدوسی:۔

دل میں آتشِ غم ہے لب پہ آہ و زاری ہے
ہم نے تیری فرقت میں اِس طرح گزاری ہے
کردار و عمل سے تو پیدا کر مقام اپنا
اے بشر تو خاکی ہے نوری ہے نہ ناری ہے

مقصود حسن شادان:۔

طائرانِ گلشن پہ کس کا خوف طاری ہے
چہرۂ گلستاں پہ کیسی سوگواری ہے

خواجہ اشفاق قدوسی:۔

اپنی عیش و عشرت میں سب بے خبر پڑوسی ہے
سینہ جو سسکتا ہے اُن سے کیسے شب گزاری ہے

ڈاکٹر منور نعیم ایرجی:۔

زخمِ دل مہکتا ہے فصلِ نو بہاری ہے

لیکن تیری محبت کی ادا کتنی پیاری ہے

اسرار عارف رشید فردوسی:۔

کانٹوں سے تعلق ہے پھولوں سے بھی یاری ہے
ہم کو عظمت گلشن جان سے پیاری ہے

اختر دیوبندی:۔

عشق ہوں میں ٹھوکریں میری نامداری ہے
حسن میرے جلووں کا آج تک بھکاری ہے

ہم کرشن گوئل:۔

غم دیئے دوانے وہ زندگی بھی کا اب اٹھی
ہم مرے ہیں جیتے جی موت ہمت باری ہے

نور صابری گنگوہی:۔

موسے جس گر ہوں مائیں گلستاں کو
یوں بھنور میں کشتی کو ہم نے خود اتاری ہے

دنیش شرما جوہر

دیر کا حرم کا ہر رشتہ ہم سے چھوٹ گیا
مقصد بتاں دل میں جس گھڑی اتاری ہے

شاہد گنگوہی:۔

پیاسی پیاسی نظروں کو جستجو ہے اک تیری
دل کی دھڑکن دھڑکن میں ہر آہٹ تمہاری ہے

یٰسین اکرم گنگوہی:۔

راحتوں کے گلشن میں پھولوں سے وہ یاری ہے
مقصدوں کے آنچل کو اوڑھ جو بھی ناری ہے

مشاعرے میں شرکت کرنے والے جن شعرا حضرات کی غزلیات اس وقت حاصل نہ کی جاسکیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

جناب مولانا دلشاد ثاقب۔ جناب عرفان عظیم۔ جناب راشد کمال۔ جناب حافظ الیم ظفر۔ جناب ڈاکٹر مقتضی شیدا فاروقی تھانوی۔ جناب قاضی ریاست انجم۔ جناب قاضی مشکور ماہر۔ جناب سید ظہیر حسن سلطان۔ جناب پرتاپ آذر۔ جناب شبیر گنگوہی جناب ڈاکٹر بدرالدین عالم۔ جناب حافظ انعام گنگوہی۔

آئندہ نشست فضیل شفائی کے مصرعہ طرح "دھوپ کی قسم تو بلا وجہ نہ کر دو چھاؤں میں" پر مورخہ ۳۰ جولائی کو جناب زبیر اختر کی نشست گاہ پر منعقد ہوگی۔

●

غزل

دلوں میں زخم لبوں پر ہنسی زیادہ ہے
ہمارے عہد میں بے چہرگی زیادہ ہے
سبھی لبوں پہ تبسم سجے ہیں لیکن
جو شہر دل ہے وہاں تیرگی زیادہ ہے
وہیں پہ صبح پتنگوں کی لاش پاؤ گے
اسی گلی میں جہاں روشنی زیادہ ہے
خزاں جو آئی تو پہلے اسی کو چھین لے گی
وہی جو شاخ شجر پر ہری زیادہ ہے
ابھی محاذ پہ جانے کی بات مت کرنا
ابھی تمہاری صفوں میں کمی زیادہ ہے
ابھی ہے صبر کا مفہوم جاننے کی گھڑی
کہ دوستوں میں ابھی بددلی زیادہ ہے

انور جلالپوری

غزل

اٹھایا آپ نے جو آستاں سے
تو اٹھ جاؤں گا میں شاید جہاں سے
مکاں سے یا فسونِ لامکاں سے
مجھے آواز دی تم نے کہاں سے
ابھی تنکے اٹھا رہی کب تھا نشیمن
کہ بجلی گر پڑی ہے آسماں سے
مرے ہمراز نے رسوا کیا ہے
عشق محفوظ رکھے رازداں سے
تمہارے در کو کیسے چھوڑ دوں میں
سکون قلب ملتا ہے یہاں سے
عروج اپنے مقدر کو تو دیکھو
یہ کتنی دور ہے وہم و گماں سے

عروج نفیسی جھانسوی

غزل

وہ دل نہیں ہے کہ جس میں نام سکوں ہے بے کلی نہیں ہے
وہ جان کیا ہے جو سوزِ الفت میں غم سراپا بنی نہیں ہے
قدم قدم پر نفس نفس پر پکارا جس کو دل حزیں نے
وہ سب کے سب بے خبر ہیں جیسے پکار دل کی سنی نہیں ہے
چمن ہے رنگیں بہار رنگیں بہار کی ہر ادا ہے رنگیں
ازل سے دل جس کو ڈھونڈتا ہے چمن میں وہ پھول کیوں نہیں ہے
عجب ہے ہستی ہماری ہستی ہماری دنیا ہے غائب دنیا
مسرتوں کا تو ذکر کیا ہے مصیبتوں کی کمی نہیں ہے
یہ میں نے مانا مرے مقدر میں عیش و عشرت نہیں ہے لیکن
تری قسم ہے ترے خزانے میں مسرت کی کمی نہیں ہے
عجب زمانہ ہے یہ زمانہ کہ نام غم کا نہیں ملتا
ہیں غنچہ و گل فسردہ خاطر کسی کے لب پر ہنسی نہیں ہے

بینا رانی ناز

ہندی و اُردو افسانہ نگاری میں عالمی شہرت کے مالک

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

جن کے اُردو افسانوں کے دو مجموعے "مان سروور" اور "ھم بار کہا دل نے" کو بہار اور اُترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ نے انعامات سے نوازا۔ اور جنھیں "نیشنل لٹریری سرکل" مُراد آباد کی طرف سے ۵۱ سو روپے کا چیک اُن کی چالیس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں پیش کیا گیا۔ اب ـ ـ ـ ـ

"کِرنوں کے پدچِن"

کے رُوپ میں ایک نرالے انداز سے ہندی ساہتیہ میں قابلِ فخر اور یادگاری اضافہ کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔

اِس نادرہُ روزگار تصنیف کے باعث ڈاکٹر اودے سرن ارمان کا نام نامی ہندی ساہتیہ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور کوئی بھی ہندی ساہتیہ کا مورّخ "کرنوں کے پدچن" اور "ڈاکٹر اودے سرن ارمان" کے ذکر کے بغیر اپنی ریسرچ کو مکمل نہ کہہ سکے گا۔

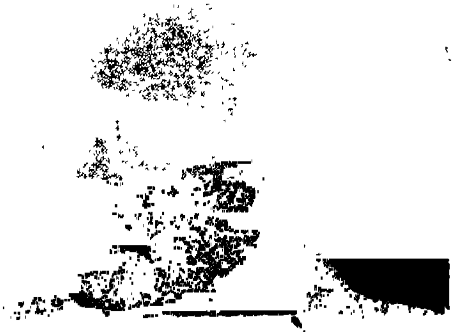
ایک انقلابی ذہن، جو خدا کے وجود کو سائنس کی روشنی کے ساتھ ساتھ تسلیم کرتا ہے مگر اندھ وشواس کے گورکھ دھندے سے پوُرے انہماک کے ساتھ بغاوت کرتا ہے۔ قدامت اور جدیدیت کا یہ سنگم "کرنوں کے پدچن" میں انتہائی اہم موضوعات پر زندگی میں پیش آئے واقعات کی روشنی میں ایسے ایسے مسائل پر مُدلّل بحث کرتا ہوا قاری کے دِل و دماغ پر اپنے نقوش اس سُبک روی سے چھوڑتا ہے کہ قاری بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے ؎ جو کہا تو نے وہ میرے دِل میں تھا۔

"کرنوں کے پدچن" میں آپ ارمان صاحب کی یادداشتوں میں بڑی انمول باتیں پائینگے۔ ہندی رسم الخط میں اپنی طرز کی یہ واحد کتاب پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔

قیمت : -/۵۰ روپے

تقسیم کار :- **شانِ ہند پبلی کیشنز**

فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔



جمود

ڈاکٹر حقیر آستانی

جمود سا
میری زندگی کے نشیب میں ہے فراز میں ہے
بکھرے آئی
جمود بن کر
مری تمنا کی ضوفشانی
جسے ارادہ سمجھ لیا تھا
وہ تجسس رہِ طلب میں
خوشی کا نقشہ سمجھ لیا تھا
نمودِ عشق و صدا وہی ہے
فتور کا سلسلہ وہی ہے
جنون کا آسرا وہی ہے
مگر وہ شام و سحر نہیں ہیں
وہ گھونسلے، بام و در نہیں ہیں
وہ آشیانے، وہ گھر نہیں ہیں

چلو وہ قصے، وہ عہدِ ماضی
تمام ہوا ایک خواب بن کر
مگر یہ تخمین ہے، کیا نہیں ہے؟
(اگر نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟)
ہمیں پہ برسے وہ کالا بادل
مصیبت بے حساب بن کر
نشاط ٹوٹے سراب بن کر؟
جمود پھوٹے حباب بن کر

جمود سا
میری زندگی کے نشیب میں ہے فراز میں ہے

702, Gold Crown
J. P. Road
Andheri (W)
Bombay-400 061

سدیدیات

ڈاکٹر انور سدید

اپنی ذاتی سوانح عمری لکھنا بھی عجیب ب عمل ہے۔ یعنی اس عمل میں یہ بات واضح ہی ں ہوتی کہ سوانح نگار اپنی ذات سے پردہ اٹھا رہا ہے یا اپنے اعمالِ قبیحہ کو الفاظ کے پھولوں میں انے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اپنے ماضی کی یافت کر رہا ہے یا پڑھنے والوں کو اپنی مثبتہ رائیوں سے مسحور کر رہا ہے۔ اُس کا مخاطب اُس پنا عہد ہے یا وہ مستقبل کے قاری کو مرعوب کرنے ادہ رکھتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گناہ گار شیشے کے گھر میں کھڑا ہے اور سروں پر پتھر پھینک رہا ہے۔ بعض سوانح نگار نے کی طرف حسرت کی نظر سے تکتے اور رحم کی بھیک مانگتے نظر آتے ہیں اور بعض اپنے ایسے کارنامے واتے چلے جاتے ہیں جو ان سے کبھی سرزد ہی ں ہوئے۔ بعض سچ اور صرف سچ لکھنے کا دعویٰ تے ہیں لیکن سوانح عمری کو دروغ کا پلندہ بنا ہم لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی بارات" سے لے کر دیوان سنگھ مفتون کی "ناقابلِ فراموش" تک، اور وزیر آغا کی "شام کی منڈیر" کے پہلو بہ پہلو سرور تونسوی کی سوانح عمری "بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" پر نظر ڈالیں تو احساس ہوتا ہے کہ جتنے مصنف ہیں شاید اتنے ہی سوانح نگاری کے اسلوب ہیں اور جو شخص بھی سوانح عمری لکھنے کے فرض سے عہدہ برآ ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اُس نے زمانے کو اپنی فتح یابیوں کے قصے سُنا کر عہدِ آئندہ کو تجربات کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے، مستقبل کے لوگوں کے لئے فلاح کا راستہ ہموار کر دیا ہے اور اب اس کے لئے کسی غلطی کا کوئی امکان باقی نہیں۔ خود نوشت سوانح نگار کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنے سے ہی زندگی پھولوں کا مرغزار بن جائے گی۔

ہر چند سوانح حیات افسردہ اور مُردہ واقعات کی فہرست نہیں ہوتی لیکن بعض لوگ جب خود نوشت سوانح حیات لکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ساری زندگی مُردوں کی طرح بسر کی ہے اور اپنے حصارِ ذات سے باہر نکل سکے لیکن معدودے چند ایسے سوانح نگا آتے ہیں جو اپنی حیاتِ مستعار دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ سانس خود لیتے ہیں دوسروں کے لئے بسر کرتے ہیں۔ دیوان سنگ کی "ناقابلِ فراموش" پڑھ کر مجھے کچھ ایسا ہوا تھا کہ سردار صاحب عمر بھر دوسروں آتے رہے۔ جہاں بدی کا غلبہ نظر آتا اور کے داغدار ہونے کا خطرہ پیدا ہوتا وہ تلو کر دیتے اور پھر "ہر چہ بادا باد" کہہ کر میدا میں کود پڑتے۔

آج ہی میں نے سرور تونسوی کی "بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" ختم کی لگا جیسے دیوان سنگھ مفتون کی روح سر کے قالب میں سما گئی ہے۔ یا سرور تو روپ میں دیوان سنگھ مفتون نے دو پالی ہے۔ اپنی ذات کو نظر انداز کرنے اور کے لئے اپنے آرام کو تج دینے اور اپ

سے زندگی بھر اپنائے رکھا وہی تسلیق
سَرور تونسوی کے عملی بیم کا حصّہ ہے اور وہ خیر کے مظاہر کے میں میدانِ عمل میں کودتے ہیں تو بھیبہ انجام و عواقب کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ وہ "یار کے کوچے" سے "مجرموں" کی طرح گزر رہے ہیں لیکن معلوم یوں ہوتا ہے کہ یار کے پورے کوچے نے انداز مجرمانہ اختیار کر رکھا ہے اور اب وہ جس طرف بھی نظر ڈالتے ہیں ناہمواریاں ہی ناہمواریاں نظر آتی ہیں۔ اِن کے تجربات بوقلموں ہیں اور اُن کا اظہار اتنا بیساختہ ہے کہ سچ' جھوٹ نظر نہیں آتا اور سچ لکھتے وقت سَرور تونسوی پر خوف طاری نہیں ہوتا

اہم بات یہ ہے کہ سَرور تونسوی صاحب نے ادیبوں اور شاعروں کے معاشرے کو خصوصی اہمیت دی ہے اور ان لوگوں کے اعمال' اقوال اور افعال کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھا ہے جو معمارِ قوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور رُوح کے عذاب کو جھیلنے اور شاعری میں ڈھالتے ہیں۔ سَرور تونسوی نے ایسے ہی ملمع بازوں اور ریاکاروں کی کھال کھینچی ہے اس نقارخانے میں شعرا' ادبا' علما' چور' اچکے' بدمعاش' ڈاکو' دلال' اٹھائی گیرے' بھڑوے' سب ایک ہی صف میں کھڑے ہیں اور سَرور تونسوی کی عدالت میں اُن کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ اِس آئینہ خانے میں نریش کمار شاد سے ملاقات کیجئے:۔

"نریش کمار شاد' دانشوری کی معنوی قدروں کا مالک تھا مگر شراب نوشی کی لت کے باعث اُسے خودکشی کرنی پڑی یا خودکشی کے پردے میں وہ موت سے ہم کنار کر دیا گیا۔ شاید ہی دلی کا کوئی ایسا کھاتا پیتا آدمی ہوگا جس کے ہاں سے نریش کمار شاد نے یہ کہہ کر روپیہ نہ اینٹھا ہو کہ اُس کا اکلوتا بیٹا ایکسیڈنٹ میں موت کا شکار ہو گیا ہے (خدا اس بچے کو طویل عُمر دے) لہٰذا اس کے کفن دفن کے لئے مدد کی جائے اور اس قابلِ نفرت جھوٹ سے حاصل کیا ہوا پیسہ شراب نوشی کی نذر ہوتا اور جن بد سے بدترین مناظر میں دہلی کے عوام ہی نہیں مُلک کے اکثر مقامات پر نریش کمار شاد کو دیکھا گیا' اس کی تفصیل میں جانا

سَرور تونسوی صاحب نے یہ ناخوشگوار فریضہ بدیع الزماں خاور کی کردار کشائی میں بڑی جرأت سے ادا کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"بدیع الزماں خاور بانکوئی دفتر 'شانِ ہند' میں میرے ساتھی تھے۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ وہ شراب کی لت میں اِس بُری طرح غرق ہو چکے ہیں کہ وہ چوری' خیانت' بددیانتی اور جھوٹ بولنے کو بھی بُرا نہیں سمجھتے۔ ایک اچھا شاعر' اچھا ادیب اور دفتری کام پر پوری طرح حاوی' خاور بانکوی جب شراب کی لت کے باعث دفتر سے کتابیں چوری کرکے بازار میں فروخت کرتا یا دفتری ادائیگیوں میں ہیرپھیر کرتا اور کاتب سے ایک روپیہ اُدھار مانگ کر کچی شراب پیتا تو مجھ ایسے ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک بھی اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا۔"

سَرور تونسوی نے شراب کو شاعری کا جزو قرار نہیں دیا' بلکہ اس کے معائب گنوائے ہیں' اور لکھا ہے کہ شراب کی لت پڑ جائے تو پھر دُنیا کی ہر لعنت آپ کے استقبال کے لئے بے قرار ملے گی۔ جھوٹ' دھوکہ' فریب' چوری ایسی بدعتیں تو معمولی ہیں' شراب نوشی کی لت تو بیوی' بیٹی' حتّٰی کہ بہن سے پیشہ کرانے کو بھی بُرا نہیں سمجھتی ہے۔ بے غیرتی' خودغرضی اور جنسی بے راہ روی شراب کی خاصیتیں ہیں۔ سَرور تونسوی نے اس قسم کا ایک کردار عاجز صاحب کی صورت میں دکھایا ہے جو پہلے مُفت کی پیتے رہے۔ مفت کی شراب پینے کی عادت نے عاجز صاحب کو مفت عیاشی کے چسکے پر ڈال دیا اور پھر یہ چسکا انھیں باقاعدہ ایک پیشہ ور دلال کے روپ میں لے آیا اور اسی بدنامی کے عالم میں عاجز صاحب چل بسے۔

سَرور صاحب نے ایک یہ حقیقت بھی بیان کی ہے کہ دہلی میں ایسی ہزاروں لڑکیاں ہیں جنھیں اُن کی فرموں کے مالکان کی شیطانی خواہشات کو پورا کرکے شراب نوشی کی لت کو پورا کرنا پڑتا ہے اور یہ لت بھی اُنھیں مالکان ہی ڈالتے ہیں اور اپنے ہاں کی مُلازم لڑکیوں کو کوکاکولا یا دوسرے مشروبات میں پہلے پہلے تھوڑی تھوڑی شراب کی ملا کر پلاتے ہیں' رفتہ رفتہ اس مقدار میں اضافہ جاتا ہے کچھ عرصہ بعد یہ لڑکیاں شراب کی اور مالکوں کی ہوس کی غلام بن چکی ہوتی ہیں۔

ہم یہاں تک پہنچے تو اُن شاعروں کے میں معلومات حاصل کرنے کو جی کرآیا جو شاعر پڑھنے کے لئے پاکستان سے ہندوستان جاتے اور واپس آکر سفرنامے لکھتے ہیں۔ اس باب سچی رپورٹ فراہم کرنے سے سَرور تونسوی نے ہمیں مایوس نہیں کیا۔ وہ پروین شاکر کے تو بے مدّاح ہیں اُن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"ہندوستان میں پروین شاکر نے گفتار' کردار' کلام اور حسنِ اخلاق سے نسوانی وقار بخشی اور پاکستانی شاعرہ کی حیثیت میں پاکستان کی نمائندگی کی۔"

لیکن ایک اور شاعرہ کے بارے میں کی رائے اچھی نہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

"پچھلے دنوں دہلی کلاتھ ملز کے مشاعرہ میں دوسری پاکستانی سرکردہ شاعرہ تشریف لائیں اُن کی شراب نوشی کے باعث بے شک وہ داستان تو بن گئیں مگر افسوس ہے کہ انھوں نے اپنے مُلک کا وقار قائم نہیں رکھا۔ پاکستان کئی شاعر کئی ماہ ہندوستان میں رہے اور مشاعرے پڑھنے کے لئے ہر ممکن جتن کرکے دعوت نامے حاصل کئے اور بڑے ہر مشاعرے میں یہ کہتے رہے کہ ان کی ٹکر کا کوئی شاعر نہیں ہے مگر شراب نوشی کے بے غیرتی اور گداگری اُنھوں نے فرمائی ہوئے بے شک اس کا یقین ہو گیا کہ میں واقعی پاکستان میں کوئی شاعر ان کی ٹکر کا

افسوس کہ سَرور تونسوی نے مذکورہ شاعرہ اور شاعر کا نام چادر راز چادر دیواری چھپائے رکھا ہے۔ اگر بتا دیتے تو ہم بھی کی کوشش کرتے کہ ان کی ٹکر کا شاعر کیا پاکستان میں نہیں ہے؟ لہٰذا اب تو ہم یار بہ اندازِ مجرمانہ" ہی گزر رہے ہیں۔—



نسخہ

علی ندیم

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں سونے کے لیے بستر پر لیٹ چکا تھا اور بیوی سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک اطلاعی گھنٹی بجی۔ "کون ہو سکتا ہے؟" بیوی نے میری طرف حیرت سے دیکھا، "اتنی رات گئے کون آیا ہوگا؟"

میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ باہر وزیر خان کھڑا تھا۔ مجھے وزیر خان کو اس وقت دیکھ کر اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی حیرت اس کے چہرے پر شادمانی کی لہروں کو دوڑتے دیکھ کر ہوئی تھی۔ اس کی چنگیز خان جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں طاقت ور برقی قمقموں جیسی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے پہلی بار اُسے اس قدر خوش و خرم دیکھا تھا۔ اسے خوشی سے اس قدر سرشار دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے نام ہزار روپیے کے انعامی بانڈ کا پہلا انعام نکل آیا ہو۔ اس کے پاس بہت سارے انعامی بانڈ رکھے ہوئے تھے وہ حد سے زیادہ کنجوس اور لالچی شخص بھی تھا۔ ہر ماہ کسی نہ کسی طرح ایک معقول رقم پس انداز کر کے کوئی انعامی بانڈ خریدتا ہی رہتا تھا۔ آج مہینے کی پہلی تاریخ تھی اور آج ہی کسی انعامی بانڈ کی قرعہ اندازی ہونے والی تھی۔ شاید اس کے نام پہلا انعام نکل آیا تھا اور وہ مجھے خوشخبری سنانے چلا آیا تھا

وزیر خان نے مجھے بڑی گرمجوشی سے سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد پوچھا۔ "وزیر خان! کیا انعامی بانڈ میں پہلا انعام نکل آیا ہے؟"

"پہلا انعام سے بھی بڑھ کر خوشی کی بات ہے صاحب جی"۔ اس نے جواب دیا۔

"اچھا" میں نے حیرانی سے دیکھا "کیا تمہارے ہاں بیٹا ہوا ہے؟"

"یہی سمجھیے" اس کی زبان فرطِ خوشی سے لڑکھڑا رہی تھی۔

وزیر خان نے پانچ سال پہلے دوسری شادی کی تھی۔ اس کی پہلی بیوی یاسمین کو مرے سات برس ہو چکے تھے۔ اس کی دوسری بیوی گل بانو تھی۔ اس سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کی پہلی بیوی سے صرف ایک لڑکا تھا جو دو سال سے لاپتہ تھا۔ میں نے اُسے اندر لا کر بٹھایا۔ "یہی سمجھیے کیا مطلب؟"

"میرے بیٹے شربت خان کا پتہ چل گیا ہے"۔

"شربت خان کا پتہ چل گیا ہے" کہاں ہے شربت خان؟"

وزیر خان کی زبانی یہ خبر سن کر مجھے واقعی بہت خوشی ہوئی تھی۔ وزیر خان کا وہ ایک ہی بیٹا تھا اور وہ اس کی مرحوم بیوی یاسمین کی نشانی تھا۔ وزیر خان کو اپنی بیوی یاسمین سے بڑی شدید اور جذباتی محبت رہی تھی۔ ان دونوں

پسپتی ہے۔ یہ دوان چڑھتی ہوئی جوانی کی
عد میں پہنچی تھی۔ جب ان دونوں نے خواب
منزل پر قدم رکھا تھا، تب ان کی محبت کی راہ
حالات نے ایک دیوار کھڑی کردی تھی، مگر
یر خان حالات کے سامنے سینہ سپر ہوگیا تھا۔
نے یاسمین کے حصول کے لئے بڑی جدّوجہد
تھی اور خون خرابے پر تل گیا تھا۔ آخر اُسی کی
یت ہوئی۔ محبت کی جیت ہوئی اور ان دونوں
شادی ہوگئی۔ شادی کے دس برسوں بعد
ربت خان پیدا ہُوا تھا۔ اولاد کے لئے اس نے
ی منتیں مانی تھیں۔ جب شربت خان دس سال
کا ہُوا تب یاسمین نے اسے دائمی مفارقت
دے دی تھی۔ وزیر خان دو سال تک اپنی بیوی
موت کے غم میں پاگل سا رہا تھا۔ یاسمین کی
موت نے اس کی زندگی ویران کردی تھی۔ پھر
ایک روز اسے جانے کیا سُوجھی اُس نے اپنے
لک جا کر ایک نوجوان بیوہ سے شادی کرلی اور اسے
کراچی لے آیا۔ دوسری بیوی کا نام گُل بانو تھا
وہ بہت حسین، دراز قد اور پُرکشش عورت تھی۔
یاسمین سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ سترہ کا سِن تھا
وہ شربت خان کے لئے روایتی سوتیلی ماں ثابت
ہوئی تھی۔ وزیر خان اپنی دوسری بیوی کی بھرپور
جوانی میں کچھ ایسا کھویا کہ اُس نے اپنے بیٹے پر
ہونے والے مظالم کی ذرّہ برابر بھی پرواہ نہیں
کی تھی۔ اسے اس وقت بھی ہوش نہیں آیا تھا
جب ایک روز اچانک شربت خان گھر سے غائب
ہوگیا تھا۔ وہ جیسے خوش تھا کہ ایک آدمی کے
اخراجات تو بچے۔ مگر جب اُس نے کسی سے
سُنا کہ اس کا بیٹا کراچی کینٹ اسٹیشن پر بھیک
مانگتا دیکھا گیا ہے اور وہ معذوروں کی سی اداکاری
کرکے اچھی خاصی بھیک وصول کرلیتا ہے تو وزیر
خان کے دل پر گھونسہ سا لگا تھا۔ پھر اس کی
نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ وزیر خان نے اُسے
تین چار مہینے تک تلاش کیا، پاکستان کا کونا
کونا چھان مارا۔ کراچی سے ڈھاکہ تک گیا تھا۔ شربت
خان نہیں ملا۔

مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے
بیٹے کی تلاش برابر جاری رکھی۔ اسے کوئی
اطلاع دیتا کہ اس کا بیٹا صدر میں نظر آیا تھا
وہ صدر کی خاک چھان کر آتا۔ کسی نے بتایا کہ
سیہون شریف میں دکھائی دیا تھا، وزیر خان
دوسرے ہی دن سیہون شریف پہنچ جاتا، وہاں
شربت خان کا نام و نشان نہیں ہوتا تھا۔ وہ
خبریں اور اطلاعات جھوٹی ثابت ہوئی تھیں۔
وزیر خان کی محلّے میں پھولوں کی دوکان
تھی۔ وہ رہتا بھی اسی محلّے میں تھا۔ اس سے
محلہ داری بھی تھی۔ میں نہ صرف وکیل تھا بلکہ
اس محلّہ کا کونسلر بھی تھا۔ میرے اس سے گہرے
اور دیرینہ مراسم بھی تھے۔ اس کی پہلی بیوی
اکثر میرے گھر آیا کرتی تھی۔ اس کی دوسری
نوجوان بیوی گُل بانو کا بھی آنا جانا تھا۔ وزیر خان
اس لئے بھی مجھے بتانے آیا تھا کہ میں نے بھی
شربت خان کی تلاش میں کوئی کسر نہ چھوڑی
تھی۔ میں اُس کے لئے بڑا فکرمند رہتا تھا۔
"کل جمعرات ہے۔ شربت خان کل کلفٹن
کے مزار پر آئے گا۔ ہمیں کل چل کر وہاں سے
اُسے لانا ہوگا"
"کیا شربت خان گھر پر نہیں ہے؟"
"نہیں جی"! وزیر خان کہنے لگا۔ "کچھ دیر
پہلے میرا دوست ملاوت خان آیا تھا۔ اُس
نے مجھے بتایا کہ وہ گذشتہ دو جمعرات سے شربت
خان کو کلفٹن کے مزار پر بھیک مانگتا ہوا دیکھ رہا
ہے۔ اُس نے شربت خان سے گھر چلنے کے لئے
کہا بھی تھا، مگر وہ تیار نہیں ہُوا۔ ملاوت خان کہہ
رہا تھا کہ وہ بھکاریوں کے ماحول میں پوری طرح رچ
بس گیا ہے۔ معذور بن کر بھیک مانگتا ہے اور اسے
بھیک بھی خوب ملتی ہے"
"یہ تو بڑی کثیف بلکہ زہر آلود زندگی ہے"
میں نے چونک کر کہا "جو ایک بار اس کثافت کی
دلدل میں دھنس گیا، اُس کا باہر آنا بہت مشکل
ہوتا ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر اُسے اس گھناؤنے
ماحول سے نکالنا ہوگا۔ ورنہ تم ساری زندگی کے

لئے اپنے بیٹے کو کھو بیٹھو گے۔"
"اگر مجھے اس کا ٹھکانہ معلوم ہوتا تو میں
ابھی اور اسی وقت جا کر اُسے لے آتا" وزیر خان
نے غصّے سے اپنی مٹھیاں بھینچ کر کہا۔
"تمہارا دوست اسے زبردستی اپنے ساتھ
لے کر کیوں نہیں آیا؟"
"میرے دوست نے اسے پہلے تو بڑے
پیار سے سمجھایا تھا۔ جب وہ نہیں مانا تو اُس نے زبردستی
کی تھی لیکن ایک بہت خوفناک آدمی وہاں آگیا تھا
اس کے گروہ کے اور افراد بھی اُس کے ساتھ تھے
شربت خان نے اُس آدمی سے ملاوت خان کی
شکایت کی تو میرے دوست کو اپنی جان بچانا
مشکل ہوگیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر نکل
آیا تھا" وزیر خان نے بتایا۔
"ایک بہت بڑا گروہ ہے جو بچوں کو اغوا کرکے
اُن سے بھیک منگواتا ہے اور اسے روزانہ لاکھوں روپے
کی آمدنی ہوتی ہے ان بھکاریوں سے" میں نے کہا۔
اس گروہ میں ایک سے ایک گھاگ شخص پڑا ہوگا مگر
ڈرنے اور خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے
کیسا ہی خطرناک شخص کیوں نہ ہو، کتنا ہی بڑا گروہ
کیوں نہ ہو، وہ قانون سے ٹکرا کے جیت نہیں سکتا
اور پھر مجرم اندر سے بڑے کمزور ہوتے ہیں"۔
"تو کل آپ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں نا؟"
"کیوں نہیں" میں نے جواب دیا۔ "وہ تمہارا
ہی نہیں میرا بھی بچہ ہے اور اس مُلک و قوم کی امانت
ہے۔ اگر اس پر اس گھناؤنے ماحول کا سایہ پڑا
رہا تو ایک دن وہ بھی دوسرے معصوم بچوں کو اغوا
کرکے بھکاری بناتا رہے گا۔"
دوسرے دن سُورج ڈوبنے کے بعد میں
وزیر خان اور ملاوت خان کلفٹن کے مزار پر پہنچے
مزار سے کسی قدر فاصلے پر ہم لوگ ٹھٹک کر رک گئے
مزار پر عقیدت مندوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ آج عرس
بھی تھا۔ جمعرات کا دن بھی تھا۔ بڑی رونق تھی۔ مرد
بچے، لڑکیاں اور عورتیں بھی تھیں۔ میلے کا سماں تھا۔
کوئی چالیس، پچاس گز کے فاصلے پر اور مزار کے
احاطے کے باہر شربت خان اور بہت سارے

ر جن میں ہر عمر کے بھکاری ہر وقت بھٹے رہتے، بھیک مانگ رہے تھے۔ ان میں کوئی چادر بچھائے بیٹھا تھا تو کوئی کھڑا ہوا تھا۔ اندھے، لولے لنگڑے اور معذور بھی تھے۔ شربت خان زمین پر چادر بچھائے بیٹھا تھا۔ اس کے بائیں پیر پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا اور پیر کی ساتھ ہی ایک لاٹھی بھی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنی پلاسٹر والی ٹانگ دکھا دکھا کر گڑگڑاتا کرتا ہوا بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کی آہ و زاری اور زخمی ٹانگ کی وجہ سے خوب بھیک مل رہی تھی۔ خاص کر عورتیں کچھ زیادہ ہی اس پر ترس کھا رہی تھیں اس لئے کہ اس کی آہ و بکا سے دل پسیج جاتا تھا۔

اس کی چادر پر دس پندرہ روپے کی ریزگاری تھی۔ جو لوگ اسے نوٹ دیتے تھے وہ ان نوٹوں کو جیب میں رکھ لیتا تھا اس لئے کہ سمندر کی ہوا چل رہی تھی اور نوٹ کے ہوا میں اڑ جانے کا خطرہ تھا۔ دو ایک نوٹ اڑتے اور ان کے پیچھے فقیر لڑکے بھی نظر آ رہے تھے۔ اور اس نوٹ کے پیچھے ان میں جھگڑا بھی ہو رہا تھا۔

میں نے شربت خان کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔ وہ ان دو برسوں میں بڑی حد تک بدل گیا تھا۔ دو سال پہلے وہ ایک معصوم، سیدھا سادہ اور بھولا بھالا سا لڑکا تھا۔ اس کے رخسار بھرے بھرے سرخ اور پھولوں جیسے تھے۔ ہونٹ گلابی سے اور آنکھوں سے معصومیت جھانکتی تھی۔ مگر اب اس کے چہرے پر سختی سی آ گئی تھی اور کھنچا کھنچا سا ہو گیا تھا۔

میں نے وزیر خان کی طرف دیکھا۔ بیٹے کو دیکھ کر اس کی عجیب و غریب کیفیت ہو رہی تھی اور سینہ بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ وزیر خان نے بیٹے کو ہر ممکنہ جگہ پر تلاش کیا تھا مگر وہ کہیں نہیں ملا تھا۔ آج وہ سامنے تھا وہ دو برس سے بیٹے سے جدا تھا اور تڑپتا رہا تھا۔ آج وہ سامنے تھا۔ اس کا رواں رواں اپنے بیٹے کو آغوش میں لینے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم تینوں نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اور پہچان کر بُری طرح چونکا تھا۔ وہ حد درجہ خائف اور سراسیمہ ہو گیا تھا۔ اگر وہ ٹانگ کے پلاسٹر کی وجہ سے مجبور نہ ہوتا تو شاید بھاگ کھڑا ہوتا۔ چند لمحوں کے بعد وزیر خان اپنی محبت کی نشانی کو سینے سے لگائے رہا مگر شربت خان پر باپ کی اس شفقت، محبت کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بیزار اور پریشان سا دکھائی دے رہا تھا جیسے وزیر خان باپ نہ ہو کوئی مصیبت ہو۔

"چلو میرے بیٹے ... گھر چلو" وزیر خان نے اسے اپنے سینے سے الگ کر کے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا" اس نے تڑ سے جواب دیا تھا۔

اس کا ٹکا سا جواب سن کر وزیر خان کا چہرہ زرد سا ہو گیا۔ اس کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا کہ بیٹے کا جواب اس کے دل پر گھونسے کی طرح لگا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ معصوم سا لڑکا اس قدر بدل جائے گا۔ اس کے چہرے کے نقوش ہی تبدیل نہیں ہوئے تھے بلکہ اس کا دل بھی بدل گیا تھا۔ آواز بھی بدل گئی تھی۔ بیٹے کے لہجے میں اپنے باپ کے لئے تلخی اور سارے جہان کی نفرت بھری ہوئی تھی۔ وہ ہم سب کو ایک اجنبی کی طرح دیکھ رہا تھا۔

"اپنے گھر کیوں نہیں جاؤ گے شربت خان" میں نے دخل دیا۔ "کیا تمہیں بھیک مانگنا اور اِس طرح کی زندگی گزارنا اچھا لگتا ہے؟"

"وہ گھر نہیں جہنم ہے" اس نے انداز سے جواب دیا جیسے اس کے منہ میں کڑوا بادام آ گیا ہو۔ میری ماں مجھے مارے گی، گھر کا سارا کام کروائے گی۔ کپڑے اور جھوٹے برتن دھلوائے گی۔ کھانے کو بھی صرف دو وقت دیتی ہے اور پیٹ بھر کے کھانے کو نہیں ملتا ہے۔ اس گھر سے یہ زندگی اچھی ہے"

"اب ایسا نہیں ہو گا شربت خان" میں نے اسے بہت سمجھایا۔ "اب تم سے گھر کا کوئی کام نہیں لیا جائے گا۔ اب تم ایک نئی زندگی کا آغاز کرو گے۔ تم اسکول میں پڑھو گے۔ کھانے کو بھی پیٹ بھر کے ملے گا۔ اب تمہاری ماں تم سے گھر کا کوئی کام نہیں لے گی۔

"ہاں بیٹے" وزیر خان نے میری باتوں کی تائید کی۔ "وکیل صاحب نے جو کچھ کہا میں اس پر عمل کروں گا۔ تم سے گھر کا کوئی کام نہیں لیا جائے گا۔ تمہیں تینوں وقت پیٹ بھر کے کھانے کو ملے گا"

"میں نہیں آؤں گا" اس نے تکرار کی۔ میں یہاں بہت اچھی طرح سے ہوں۔ حاکم خان نے میرا بہت خیال رکھتا ہے"

"حاکم خان نے تمہیں بھکاری بنا دیا ہے اور ہم ایک بڑا آدمی بنانا چاہتے ہیں۔ تم جب تک بھیک مانگ کر دیتے رہو گے، اس وقت تک وہ تمہارا خیال رکھے گا۔ تم بیمار پڑ گئے تو تمہارا خیال بھی نہیں کرے گا اور تم کسی دن سڑک کے کنارے سسک سسک کر مر جاؤ گے۔ گھر جا کر رہو گے تو کوئی تمہارے آرام کا خیال کرنے والا ہو گا۔ ایک اچھی اور عزت کی زندگی تو گزارو گے"

ہم تینوں مل کر شربت خان کو سمجھا رہے تھے کہ ایک لمبا چوڑا آدمی شربت خان کی پشت پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے باری باری ہماری شکلیں دیکھیں اور پھنکارا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون ہو تم لوگ؟"

"تم کون ہو؟" وزیر خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں

"ہم اس لڑکے کا آدمی ہے۔ یہ لڑکا ہمارا ہے اور یہ جگہ بھی ہمارا ہے۔" اس نے گھورتے ہوئے اکڑ کے جواب دیا۔

"ہم اس لڑکے کا باپ ہے اور یہ دو لوگ اس کا چچا ہے"

"بکو مت" وہ گرجا۔ "اس کا کمائی دیکھ کر باپ اور چچا بن گیا۔ یہ تم لوگ آج کہاں سے پیدا ہو گیا؟"

"وکیل صاحب! اس کو بتائیں گے کہ ہم لوگ کہاں سے پیدا ہو گئے ہیں! یہاں کیسے آ گئے ہیں؟" طلاوت خان غصے سے بولا۔

"اچھا تو تم ہو حاکم خان" میں نے درشت لہجے میں کہا "تم نے شربت خان کو اغوا کیا، اسے بھکاری بنایا، اس کی زندگی تباہ کی۔" میں نے

لفسن عمرا دحقارت سے اُسے گھورا۔ میں ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں"۔

"جی جی!" وہ ایک لمحہ کے لئے گھبرا سا گیا اس کی ساری اکڑ فوں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ہم نے اسے اغوا نہیں کیا۔ یہ ہمیں اسٹیشن پر ملا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی سوتیلی ماں کے ظلم سے گھر سے بھاگ کر لاہور جا رہا ہے۔ وہ مر جائیگا مگر اب کبھی گھر نہیں جائیگا۔ پھر ہم اسے لے آیا اس روز سے یہ ہمارے پاس ہے۔ اس نے خود ہی یہ کام کرنا پسند کیا ہے"

"کیا یہ سچ کہہ رہا ہے قربت خان؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" شربت خان گردن ہلا کر اقرار کیا۔

"اب تم تو دو گیارہ ہو جاؤ" ملاوت خان نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔ "اگر تم نے اپنے ساتھیوں کو بلانے کی حماقت کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ ہم لوگ مسلح ہو کر آئے ہیں"۔ ملاوت خان نے کمر سے پستول نکال کر اُسے دکھایا۔

حاکم خان کی نظر جیسے ہی پستول پر پڑی اُس کی سٹی گم ہو گئی۔ اُس نے چشم زدن میں زمین سے چادر کو سمیٹ کر اٹھا لیا اور خربت خان کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ ساری رقم نکال لی جو اُسے بھیک میں ملی تھی۔ پھر وہ ساری رقم لے کر چمپت ہو گیا ملاوت خان اس رقم کے لئے حاکم خان کے تعاقب میں جانا چاہتا تھا مگر میں نے اُسے روک لیا۔

پھر ہم شربت خان کو وہاں سے لے آئے اُسے گھناؤنے ماحول کے دلدل سے نکال لائے تھے۔ میں سارے راستے وزیر خان کو سمجھاتا رہا کہ اب اُسے اور اس کی بیوی کو کس طرح کا سلوک خربت خان کے ساتھ کرنا چاہئے۔ اگر پھر وہی کہانی دوہرائی گئی تو پھر شربت خان ہاتھ سے نکل جائیگا اگر دوبارہ نکل گیا تو وہ پھر کبھی ہاتھ نہیں آسکے گا۔

خربت خان نے راستے میں مختصر طور پر بتایا تھا کہ اُسے روزانہ بھیک میں سو روپے سے زیادہ رقم مل جاتی ہے مگر اس کے لئے جگہ اور بہروپ بھرنا شرط ہے۔ جتنی اچھی اداکاری کی جائے گی اور جس قدر معذور بنتا جائے گا اسی قدر زیادہ بھیک ملے گی اور وہ حاکم خان کو ہر مہینے چار ہزار کی رقم بھیک میں وصول کر کے دیتا تھا۔

تیسرے دن مجھے کسی کام سے اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا۔ پندرہ دن بعد میں عوامی ایکسپریس سے کراچی پہنچا۔ اپنا چھوٹا سا اٹیچی خود ہی اٹھائے، اسٹیشن کی عمارت کی سیڑھیاں اتر کے رکشا اسٹینڈ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک مانوس سی آواز گونجی "اللہ کے نام پر اس غریب اندھے کو ایک روپیہ دیتے جاؤ، میرے چھوٹے چھوٹے تین بھائی ہیں، چار جوان بہنیں ہیں۔ میری ماں اندھی ہے۔ وہ ٹی بی کی مریض ہے۔ میرا بوڑھا باپ دونوں پیروں سے معذور ہے۔ گھر میں راشن نہیں ہے۔ دو دن سے فاقہ ہے۔ صرف ایک روپے کا سوال ہے بابا"۔

میں نے اپنا شک دُور کرنے کے لئے پلٹ کر دیکھا تو وہ خربت خان ہی تھا جو خستہ حال نظر آ رہا تھا اور بھکاریوں کے میلے کچیلے اور متعفن لباس میں ملبوس تھا۔ وہ اندھا بنا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی جسے وہ زمین پر ٹیک کر اُس کے سہارے کھڑا ہوا تھا اور سچ مچ کا اندھا فقیر دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کی آواز میں بڑا سوز و گداز تھا۔ اس کے قریب سے گزرنے مسافر اسے دل کھول کر خیرات دے رہے تھے۔ شاید ہی کسی نے پچیس، پچاس پیسے دیئے ہوں۔ جو بھی دے رہا تھا "ایک روپیہ، دو روپے۔ دو ایک مسافر عورتوں نے تو اُسے پانچ اور دس کے نوٹ بھی دیئے تھے۔

میری کنپٹی پر جیسے زور سے کوئی پتھر آ کر لگا تھا میرا دماغ سنسنا گیا اور مسیکر ہیں یہ لگا۔ مجھے سمجھتے ہو سکتے دیر نہیں لگی کہ وزیر خا نے شربت خان پر ظلم و ستم کا سلسلہ پھر کر دیا ہوگا۔ وہی کہانی دوہرائی گئی ہوگی۔ تنگ آ کر گھر سے بھاگ کر حاکم خان کے پا ہوگا اور حاکم خان نے اُسے پھر سے بھیا کے دھندے پر لگا دیا ہوگا یا پھر خربت خا عادت سے مجبور بھیک مانگ رہا ہوگا۔

میں نے شربت خان کے پاس نفرت، غصے سے چیخ کر کہا۔ "شربت خا جو رہا ہے؟"

شربت خان نے جیسے ہی میری گھبرا کے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ جیسے ہی نظر مجھ پر پڑی اس کے چہرے کا رنگ "آپ"! اس کی آواز حلق میں اٹک

"ہاں میں!" میرا جسم غصے سے کا تم نے اسکول میں پڑھنے کے بجائے بھیک شروع کر دیا۔ کہاں ہے حاکم خان کا بچہ ..... کمینہ..... میں اسے پولیس کے حوا چھوڑ دوں گا"۔

وہ چند لمحوں کے بعد سنبھل کر بو خان مجھ سے بھیک نہیں منگوا رہا ہے۔ ا بعد سے میں نے اُس کی شکل تک نہیں د

"تو کیا تم نے خود سے بھیک مانگ کر دیا ہے؟"

"نہیں" اُس نے نفی میں سر ہلا میرا باپ مجھ سے بھیک منگوا رہا ہے۔"



ریضِ رقابت

انگریزی سے ترجمہ

محبت بڑا طاقتور جذبہ ہے۔
اور محبت کرنے والے جب کوئی غیر متوقع
، اپنے محبوب کی طرف سے دیکھ لیتے ہیں تو پھر
یں یقین نہیں آتا۔ وہ اپنی آنکھوں کو نامعتبر اور
. ناقابلِ بھروسہ سمجھنے لگتے ہیں۔ جس طرح مجھے
ں آنکھوں پر یقین نہیں آرہا ہو۔ میں سوچ بھی نہیں
لتی تھی کہ میرا شوہر، میرا ہیرو "نی" مجھے
ل کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے
رہا تھا۔ اور میں چپ چپ کر صورتِ حال کا جائزہ
لہ رہی تھی۔ مجرم اپنے رویّے سے ہی اپنے جرم
اظہار کردیتا ہے۔ اُس کی گھبراہٹ، اُس کی
بے چینی یہ ظاہر کردیتی ہے کہ اُس کے اعصاب
ں کے قابو میں نہیں ہیں اور یا تو وہ کوئی جرم کرچکا ہے
پھر کسی جرم کا ارادہ ہے۔

ہیری کچھ ایسی ہی بے چینی ظاہر کررہا تھا۔ پریشان پریشان سا، اُلجھا ہُوا۔ اس کے چہرے سے اُس کی گھبراہٹ کا اظہار ہورہا تھا اور یہ گھبراہٹ اِس لئے تھی کہ اُس نے میرے لئے بہت عرصے کے بعد کافی تیار کی تھی اور کافی میں کچھ شامل کردیا تھا۔

یہ میرا وہم نہیں تھا، حقیقت تھی۔ بلکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میں اُس وقت باورچی خانے کے دروازے پر تھی، جب میں نے اُسے کافی میں کچھ ملاتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ ملاوٹ اُس نے اپنی جیب سے شیشی نکال کر کی تھی۔ اس نے اُس شیشی سے چند قطرے کافی میں ٹپکا دیئے تھے۔ پھر بڑی احتیاط کے ساتھ اس شیشی کو دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

میں جانتی ہوں کہ اُس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اس لئے کہ وہ مجھے مارنا چاہتا تھا۔

اِس کی وجہ رقابت ہے۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو صرف محبوب وغیرہ کے رشتوں پر منطبق نہیں ہوتا بلکہ ہر رشتے پر ہوسکتا ہے۔ یہ رقابت، یہ حسد دُوسرے رشتوں کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ مثلاً باپ بیٹے، ماں بہن، ہر ایک کے ساتھ۔ میرے اور ہیری کے درمیان اس رقابت کی وجہ جیک تھا جو ہماری اکلوتی اولاد تھا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ بات حیران کرنے والی ہو کہ بیٹا رقابت کی وجہ بن گیا تھا۔ لیکن یہی حقیقت تھی ہمارا بیٹا ہمارے درمیان ایک دیوار کی طرح آکر کھڑا ہوگیا تھا۔

ہمارے یہاں شادی کے بہت عرصے کے بعد جیک پیدا ہُوا تھا۔ شروع شروع میں تو ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی رضامندی اور تعاون کے ساتھ اس کی پرورش کرتے رہے۔ پھر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا ہم دونوں میاں بیوی کے درمیان خلیج پیدا

ہوتی چلی گئی۔ بات بہت معمولی سی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں جیک سے زیادہ محبت کرتی ہوں جبکہ ہیری یہ سمجھتا تھا کہ وہ اُس سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں نے جیک کو اپنانے اور اُسے ایک دوسرے سے برگشتہ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

ممکن ہے یہ بات بہت معیوب سی دکھائی دیتی ہو کہ ماں اور باپ اپنی ہی اولاد کو ایک دوسرے سے بدظن کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں، لیکن میں نے کہا نا کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو بعض اوقات ہونی اور اَن ہونی کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہنے دیتا۔

میں جیک کو ہیری کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرتی رہتی تھی اور دوسری ہیری بھی جیک کو میرے خلاف اُکساتا رہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم دونوں کی اس چپقلش میں جیک کی ذہنی حالت کیا ہو گئی ہو گی لیکن جیک کے رویے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر اعصابی مریض بنتا جا۔ ملے میرے سامنے وہ اپنے باپ کی بُرائی خاموشی سے سن لیا کرتا اور شاید ہیری کے سامنے بھی وہ اسی طرح اُس وقت خاموش رہتا ہو گا جب ہیری میری بُرائی کرتا ہو گا۔

میں اس وقت جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں نے ہیری کو جیک سے اپنی بُرائی کرتے ہوئے کبھی نہیں سُنا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ میری بُرائی نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں باپ بیٹے مجھ سے چھپ کر باتیں کرتے تھے اور جب میں اُن کے قریب پہنچ جاتی تو وہ فوراً خاموش ہو جاتے۔

اس وقت میں ہیری سے بہت بُری طرح اُلجھ پڑی، اُسے اول فول سنانے لگی۔ میں تو ایک عورت تھی نا۔ اسی لئے سوائے شور کرنے کے اور کیا کر سکتی تھی۔ میری چیخ و پکار سن کر جیک میری طرف دیکھتا ہوا ایک طرف چلا جاتا جبکہ ہیری مجھے مطمئن کرنے کے لئے طرح طرح کے بہانے بنانے لگتا۔ لیکن اُس وقت ...... مجھے بس اس بات کی خوشی ہوتی کہ جیک نے بڑی ہمدردانہ نگاہ سے میری طرف دیکھا تھا۔ وہ میرے لئے دُکھی تھا اور اس کا یہی دُکھ میری جیت تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے باپ سے کہیں زیادہ ذہنی طور پر مجھ سے قریب ہے۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے۔ میں ہیری کی مدد اور اس کے سہارے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میری کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ میں ایک غریب گھرانے کی یتیم لڑکی تھی۔ میرے پاس اپنی کوئی چیز نہیں تھی جبکہ یہ گھر ہیری کا تھا، گھر میں تمام فرنیچر ہیری کا تھا۔ میرے جتنے لباس تھے، وہ سب ہیری کے تھے۔ میرے پاس تو اپنی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ دوسری طرف میرا جیک بھی ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ میں اُسے لے کر الگ ہو سکتی۔

مجھے یاد آیا کہ میرے اور ہیری کے درمیان اختلاف کی وجہ صرف جیک ہی نہیں تھا بلکہ ہیری کا اپنا مزاج بھی تھا۔ شادی کے بعد چند برسوں تک تو وہ بہت نرم گفتار اور خوش مزاج رہا تھا، پھر رفتہ رفتہ اُس میں تبدیلی آ گئی۔ اُس کی نرم گفتاری، زشت گوئی اور خوش مزاجی، سخت گیری میں تبدیل ہو گئی۔

جیک کی پیدائش کے بعد تو اس کا رویہ اور بھی تبدیل ہو گیا۔ وہ بات بات پر مجھے جھڑکنے اور پاگل کہنے لگا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تم پاگل ہوتی جا رہی ہو۔" اُس نے ایک دن کہا تھا "تمہیں کسی اسپتال میں داخل کرانا ہو گا۔"

میں اُس کی باتیں سن کر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ یہ کیسا شوہر ہے جو اپنی بیوی کے لئے اس قسم کی باتیں کیا کرتا ہے۔ اس انداز سے اس کی توہین کرتا ہے۔ لیکن میں تو ایک مجبور، کمزور اور غریب عورت تھی اس لئے خاموش ہو کر رہ جاتی۔ اُس وقت میں سوچتی کہ کاش جیک اگر بڑا ہوتا تو میں اُسے لے کر اس شخص سے کہیں دُور چلی جاتی۔

اور اب جیک بڑا ہو گیا تھا۔ اُس کی نشوونما بہتر طور پر ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ پیروں سے مکمل مرد دکھائی دیتا اور میں اُسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق بہت پہلے سے اسے ہیری کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا تھا۔ میں یہ چاہتی تھی کہ جب وہ جوان اور باشعور ہو جائے گا تو

غزل

اک آہ دلِ بیتاب سمجھ سوچ
یہ غیر کی محفل ہے خدارا نہ
تعمیر کیا میں نے جسے خونِ جگر
اک آدھ نظر ہی وہ ذرا ناز
یہ بزم ہے دشمن کی مدارا ادب ا
لب ہی لے زباں روک لے خاموش
ان کہنہ روایات میں اب خاک
ان کہنہ روایات کا کچھ رد و بدل
فرض اپنا ادا کر ابھی کیا سوچ
اے دل یہی لازم ہے نہ دیکھو آج نہ
ایثار کسی کا کبھی ہوتا نہ
پروانے کی مانند ذرا شمع پہ
جذباتِ خمار آں سے چھلکتے ہیں
اندازِ بیاں دیکھو ذرا رنگِ غزل

مدن موہن شرما جـ
[redacted]

اُسے اپنی ماں کی اہمیت کا احساس
اپنے ساتھ کہیں لے جائے۔
ہو سکتا ہے کہ ہیری نے بھی
محسوس کر لیا ہو کہ جیک لاشعوری
دُور ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے اُس
کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ جب
تو جیک صرف اسی کا ہو کر رہ جا
تھا کہ میں نے اُسے اپنی کافی میں
دیکھ لیا تھا۔ اور اب وہ کسی بھی لمحے
تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا
اگر میں کافی پینے سے انکار کر دیتی؟

ذہ ہوجاتا کہ میں نے شاید اسے ...
لیا ہے اور اگر کافی پی لیتی تو خود میری زندگی
ا۔ میرے سارے ارادے ناکام ہوجاتے۔
ر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ یہ ایک
ہ تھی جو مجھے بھی بچا لیتی اور میری کے ارادے
ہوجاتے۔ میں نے باورچی خانے کے
سے پلٹ کر جانا چاہا کہ ٹھیک اسی وقت
مجھے آواز دے دی۔
ا لیشا، کہاں ہو تم، جلدی آؤ، تمہاری
چکی ہے۔"
رے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اپنی
مل کرنے کے لئے کسی طرف جا سکتی۔
جلدی سے پلٹ کر کچن میں داخل ہوگئی۔
ہاری کافی تیار ہوچکی ہے۔" اس نے
پی لو۔"
نے محسوس کیا کہ اس وقت اس کی
ش تھی اور وہ مجھ سے نگاہیں بھی چرا رہا
مجرم ضمیر شاید اُسے پشیمان کر رہا تھا۔ میں
ادی۔
ی کے ساتھ تم پنیر بھی کھا لو تو بہتر ہے۔"
ر کے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ ڈبا
تھ سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ اس کے لعاب

اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ بہت بوکھلایا ہوا تھا اور اسی بوکھلاہٹ میں الٹی سیدھی حرکتیں کئے جا رہا تھا۔

"تم ایسا کرو، پنیر کا ڈبا کاٹ کر رکھو، میں جب تک نہا دھو کر آتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے" اس نے جلدی سے گردن ہلا دی۔ "تم جلدی سے ہو آؤ۔"

لیکن میں غسل خانے میں جانے کے بجائے کمرے میں آ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری اپنا پستول کہاں رکھتا ہے۔ یہ مکان چونکہ آبادی سے کچھ فاصلے پر تھا اس لئے پستول ہر وقت بھرا ہوا رہتا تھا تاکہ کسی چور یا ڈاکو کے آنے کی صورت میں اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔

میں نے الماری کی دراز سے پستول نکالا، اور دبے پاؤں باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد باورچی خانے میں میری کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے ہلاک کر دیا تھا۔ لیکن میرے اس عمل کو قتل نہیں کہا جا سکتا کیونکہ میں نے اپنی جان بچانے کے لئے ایسا کیا تھا اور اب مجھے جیک کا انتظار تھا۔ وہ صبح اٹھ کر کہیں چلا گیا تھا اس کے آنے کے بعد میں بتا دیتی کہ یہ سب کیسے ہوا ہے۔

مجھے امید تھی کہ جیک تمام معاملات کو سنبھال لیتا۔

میں باورچی خانے سے نکل کر اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر بعد ایک گاڑی رُکنے کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ جیک اور ایک آدمی گاڑی سے اُتر کر مکان کی طرف چلے آ رہے تھے۔ اُس آدمی کی صورت مجھے کچھ جانی پہچانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھا۔

وہ دونوں قریب آ گئے۔ پھر میں نے اُس آدمی کی آواز سُنی۔ وہ جیک سے پوچھ رہا تھا۔" تو وہ دوا شروع کر دی جس کے لئے میں نے کافی میں ملا کر دینے کو کہا تھا؟"

"میں نے آج ڈیڈی کو وہ دوا دے دی تھی۔" یہ جیک کی آواز تھی۔" ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ممی کی کافی میں ملا دی ہو۔"

پھر اُس وقت مجھے یاد آیا کہ جیک کے ساتھ آنے والا دُوسرا آدمی ڈاکٹر تھا جو میرا علاج کر رہا تھا اور میں شاید پاگل تھی۔ ہاں میں پاگل ہی تو ہوں۔ بے چارہ میری تو بہت اچھا آدمی تھا۔

اس نے تو ہمیشہ میرا بہت خیال رکھا تھا۔ ...

ضمیمہ

اُردو دُنیا میں خلفشار اور سلحشوری

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

میرا مضمون "اُردو دنیا میں خلفشار و سلحشوری" جو اکتوبر ۱۹۸۷ء کے اواخر میں دیا گیا، مدیر "شانِ ہند" کی علالت کی وجہ سے "شانِ ہند" شمارہ جون ۱۹۸۸ء میں مشمول ہو سکا۔ معلّم اردو دسمبر ۱۹۸۷ء میں میرا مضمون "گھر جو تقسیم ہو گیا" خلاصہ و ناقدانہ مطالعہ" مع کتابت میں در آئے اغلاط کی تصحیح معلّم اُردو مارچ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اسی اثنا میں لکھنؤ میں اُردو رابطہ کمیٹی نے ایک اجلاس منعقد کر کے بہکے بہکے جذبات کو ہوا دینے کی کوشش کی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایک وفد جو سیّد حامد، خلیق انجم، راجیشور راؤ، راج بہادر گوڑ وغیرہ پر مشتمل تھا مرکزی حکومت کے ایک وزیر سے ملا۔ کچھ باتیں بڑی عجیب غریب معلوم ہوئیں لہٰذا تکذیب کے لئے قارئین کرام کی توجہ درج ذیل حقیقت کی جانب مبذول کرانا ضروری معلوم ہوا۔

(۱) راجیشور راؤ یا کسی کمیونسٹ لیڈر کا یہ کہنا کہ عبد الحق صاحب سیاسی آدمی نہیں تھے کمیونسٹ نظریات سے ناواقفیت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ لینن نے متعدد جگہ لکھا ہے کہ کوئی شخص غیر سیاسی نہیں ہو سکتا۔ گوڑ صاحب کو میں نے ایک خط اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے لکھا تھا۔ جواب ملا کہ کہنا یہ تھا کہ عبد الحق متعصبانہ ذہنیت کے شخص نہیں تھے۔ مجھے اس بات پر شکوک ہیں۔ عبد الحق کے خیالات سرسیّد اور ان کے جانشین محسن الملک وغیرہ سے عبارت ہیں۔ محسن الملک ہی کے ہاتھوں وائسرائے نے مسلم لیگ کی تشکیل کرائی وہ مسلم لیگ جس کی بابت سکریٹری آف اسٹیٹ مارلے .... نے وائسرائے کا محافظ دستہ قرار دیا

ملاحظہ ہو

ص ۴۴۵

چاہے کتنی صفائی پیش کی جائے یہ حقیقت ہے کہ باطنی اعتبار سے عبد الحق صاحب لیگ سے وابستہ ہی سمجھے جائیں گے۔

نہ جانے کیوں، ایک کمیونسٹ صاحب ..... ملک مارا کرامت راہی نے جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں، کیوں ایسی کتاب لکھ دی ہے اس کتاب کے لکھنے سے امرت رائے کے خیالات پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ اگر امرت رائے نے یہ لکھا ہے کہ اُردو کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ بس یہ علاقہ ایک محدود طبقے کی نفسیات ہے پروفیسر مسعود حسن نے بھی ایسا ہی کچھ لکھا ہے ملاحظہ ہو:۔

"اُردو کا گھر نہ دلّی ہے، نہ لکھنؤ نہ حیدرآباد، اور اس کی حیثیت ایسے تاجدار کی ہے جس کا کوئی علاقہ نہ ہو۔"

(بازیافت کشمیری یونیورسٹی ۱۹۸۲ء میں مشمول مضمون)

اُردو زبان کیا پاکستان بنا سکتی ہے پاکستان کے بنوانے والوں میں افسوس کہ کمیونسٹ پارٹی کا بھی ہاتھ تھا۔ جیسے ...

(ب [illegible])

[illegible] کیا۔ پاکستان بننے سے پہلے
ے شائع ہونے والا ہفتہ وار
ہو گیا اور آخری صفحے پر
ستان میں شامل ہونے والے حصّوں کی
چھپی گئیں۔ ایک تصویر ابھی تک ذہن پر ثبت
لہلہاتے کھیت، دریا کا کنارہ کی تصویر بنی تھی
نیچے لکھا تھا:

رجو اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ تھے اور
چلا رہے تھے اور نوز [illegible] میں مشغول
ہنسے جھگڑے میں پھنس گئے۔ [illegible] الواقع
چھوڑ گئے مگر ہم لوگ اپنی مستقیم راہ پر
سنزن رہے۔

اگر کوئی اختراکی مضمون نگار اُردو کی
کچھ لکھتا ہے تو اس کو اس امر کو بھی روشنی
لے آنا چاہئے کہ پاکستان کی تشکیل میں کمیونسٹ
کا بھی ہاتھ تھا۔

(۲) اُردو کے مسئلے کو سڑک پر لانے کی بات
میں کہی گئی۔ بابری مسجد سے بھی مسئلہ کو
کیا گیا جو فی الواقع بڑا غیر ذمہ دارانہ اقدام تھا۔
خدانخواستہ ایسا کیا گیا تو نتائج سامنے آکر
گے۔

اصغر علی انجینئر صاحب کا ایک مضمون
میں شائع ہوا تھا جس
مذکورہ مسئلے کا قابلِ تعریف تجزیہ کیا گیا ہے کہ
مراد آباد، الٰہ آباد وغیرہ کے فسادات کے
منظر میں اقتدار پر چھائے رہنے والے مسلم حضرات تھے
اُردو، ہندی۔ اجودھیا، رام جنم بھومی / بابری
مسجد وغیرہ مسائل پر جذبات کو برانگیختہ کرنے والے
فی الواقع ملک دشمن عناصر کے تحت آتے ہیں
لیکن نہیں سمجھے کر سے۔

تھا جو منظر کا محرک خود وہ پس منظر میں تھا
خون میں ڈوبی [illegible] سڑکیں وہ گھر میں تھا،
(نازش پرتاب گڑھی)

سیّد ضمیر حسن جعفری بنام مدیر "ظرافت"

محبی ضیاء الحق قاسمی صاحب

السّلام علیکم

"ظرافت" برابر مل رہا ہے۔ یہ آتا ہے تو گویا ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آتا ہے۔ چاندی کا ایک ایسا ہی سیل حیدرآباد دکن سے "شگوفہ" کی صورت میں گاہے گاہے دل و جاں کی طراوت کا باعث ہوتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ زمانے میں مسکراہٹ کتنی کمیاب ہو گئی ہے۔ "ظرافت" جیسا پرچہ نکال کر آپ لوگوں سے نیکی کر رہے ہیں، روشنی بانٹ رہے ہیں —

ضیاء جو تھہرے!

اس شمارے میں کنور مہندر سنگھ بیدی کے بارے میں بھائی دلاور فگار کا قطعہ بہت خوب تھا۔ اس شخص کو خوب سوجھتی ہے۔ یہ غیر معمولی ذہانت کی چمک ہے۔ کنور مہندر سنگھ کو آپ نے سفیرِ محبت لکھا، تو بہت درست لکھا۔ میں نے ان کو جوانی میں بھی دیکھا ہے کنور صاحب ہمارے ضلع جہلم میں افسرِ مال تھے۔ غالباً یہ ملازمت میں اُن کی پہلی تعیناتی تھی۔ میں نے ایڑی سے لے کر پگڑی تک اُن جیسا البیلا اور نوجوان خالصہ کوئی نہیں دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں نستعلیق، رسکی پگڑی "باندھنے کی مہم" میں "خالصہ پنتھ" کنور مہندر سنگھ کی تخلیقی حسن کاری کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جہلم میں دو ایک مشاعرے بھی کنور صاحب کی اُردو دوستی کی یادگار ہیں۔ وہ زمانہ تھا کہ جہلم میں افسروں کی دلچسپی اور سرپرستی کے بغیر کسی مشاعرہ کا انعقاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ میں ۱۹۳۹ء کی بات کر رہا ہوں۔ کنور صاحب ان مشاعروں میں ڈپٹی کمشنر فیض الحسن بدرالدین طیب جی کو بھی لے آتے جو بمبئی کے رہنے والے تھے اور بعد میں بھارت کے سکریٹری خارجہ بھی رہے۔ کراچی میں آپ نے اور گلنار آفریں نے جس تپاک سے کنور صاحب کی پذیرائی کی اس پر آپ قابلِ مبارکباد ہیں۔ آپ نے ایک ادبی خدمت انجام دی۔ یہ گلنار بھی عجب نار ہے۔ اس کا افسانہ دیکھو تو افسانہ نگار ہی لگے اور شاعری دیکھو تو لگے کہ بس شاعرہ ہی شاعرہ ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ عرصہ سے "ظرافت" کے لئے کوئی چیز پیش نہ کر سکا۔ گرہ میں کچھ ہوتا تو پیش کرتا۔ البتہ میرا دل اور میری وفا قبول کیجئے۔

والسّلام

آپ کا:-
سیّد ضمیر حسن جعفری

ہی جاتا لیکن اگر ایسا نہ ہو کہ ہم خون کے سیلاب کی لپیٹ میں آ ہی جائیں۔ اگر مسلم کو کرنا ہے جو دیا جا تو مستقل ایک ہی مسئلہ سامنے رہتا ہے' وہ ہے غریبی۔ غیر ذمہ دارانہ انتظامیہ سے ٹکر لینے کی ضرورت ہے نہ کہ ایسی بے تکی باتوں میں الجھنے کی کاوشات سے۔

(۳) یہ عجیب بات ہے کہ "مسلم مجلس" کو غیر سیاسی جماعت کہا جاتا ہے۔ وشو ہندو پریشد اور

مسلم مجلس کو دونوں کو غیر سیاسی نہیں کہا جا سکتا

بہر حال ان باتوں سے قطع نظر اردو زبان و ادب کے کچھ مسائل ہیں اور بس۔ اردو بطور مضمون نصاب میں اس طرح مشمول رہے کہ پڑھنے والے طلبہ انگریزی اور ہندی مضامین پڑھ سکیں یعنی انگریزی اور دوسری زبانوں کے زمرے میں اردو کو شامل نہ کیا جائے۔ اور جہاں اردو بولنے' پڑھنے والوں کی معتد بہ تعداد ہو ضلعی سطح تک اردو کے استعمال کی اجازت دے دینا چاہیے۔

اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے حکومت فی الواقع بہت کچھ کر رہی ہے مگر مستحق اداروں و مضمون نگاروں کے تصرف میں آگئی ہے جس پر اگر ضرورت ہوئی' ایک مضمون علیحدہ کا بحث کیا جائے گا۔ ملحوظ رہے' اردو پر غاصبانہ قبضہ کب تک قائم رہ سکتا ہے؟ غاصبوں پر بھرپور مضمون مجھیں لکھنا ہی نہ پڑے۔ اور یہی غالباً اردو کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

غزل

اپنی جبیں ہے اور ترا آستاں نہیں
جائیں کہاں کہ اپنا کوئی مہرباں نہیں
تم ہی سمجھ سکو گے زباں اضطراب کی
تم سا نظر شناس نہیں نکتہ داں نہیں
مجھ کو حصارِ برقِ نظر میں اُلجھا دیا
تجھ سا تو کوئی اے دلِ آفت نشاں نہیں
جب وہ ہیں مہرباں تو بدل جائے کائنات
اب مجھ کو خوفِ حضرتِ پیرِ مغاں نہیں
ڈوبی ہوئی سکوت میں ہے چشمِ مضمحل
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں
لے جاؤں اب کہاں دلِ شوریدہ حال کو
وہ جلوہ گاہ نہیں' وہ ترا آستاں نہیں
مقصودِ عشق کو ہی نہیں اذنِ عرضِ حال
مدت ہوئی ہے لذتِ سود و زیاں نہیں

زبیدہ احمد جلال

غزل

مرے احباب کو شہرت ملے گی کب؟
مجھے اس رنج سے راحت ملے گی کب؟
نہ دیکھا کر بہت اونچی حویلی کو
تجھے خیرات میں عزت ملے گی کب
وہ جن کے پیار میں ہستی لٹا دی
ہمیں ان سے مگر چاہت ملے گی کب؟
کمائی چھوڑ دی اس آرزو میں بھی
ہمیں اجداد کی دولت ملے گی کب؟
سزا ہو گی ہماری فرد عصیاں پہ
ہمیں کہنے کی کچھ مہلت ملے گی کب
رہیں گے کب تلک دوزخ میں ہم یا رب
ہماری گمشدہ جنت ملے گی کب؟
ہر اک شے کھو چکی جب ذائقہ اختر
تو پھر کیا سوچنا لذت ملے گی کب

اختر شاہجہانپوری

غزل

آپ کے طرزِ تغافل کا کوئی شکوہ نہیں
آپ نے شاید ہمارا دکھ سمجھا نہیں
باغباں کی کارپردازی مرا شیوہ نہیں
اہلِ گلشن میں کوئی خوددار پوچھا نہیں
تو بھی کے جابجا ہے پا نہیں سکتا ہوں میں
مسجد و ساقی میں سے تجھ سا کوئی یکتا نہیں
کو بہار و دشت کو پامال کر دیتا ہوں میں
میں وہ طوفاں ہوں جو کبھی رکتا نہیں
تم نہیں ہو تو تمہاری یاد ہے جو بہ نشاط
کون کس کا اس جہاں میں آشنا ہوتا نہیں
ہر قدم ناکامیاں' ہر موڑ پر دشواریاں
ایک تنہا دل کی خاطر بزم ہے یکجا نہیں
دشتِ غم میں چشمِ تنہا ہی سہی
دل کی کشتی کی جگہ انجم کر دیتا نہیں

خلیل انجم کاظمی

شورش کاشمیری

شورش صاحب علالتِ طبع کے باعث "بہ کوئے یار" کا مستقل کالم نہ لکھ سکے۔ لہٰذا "شانِ ہند" کا یہ شمارہ "بہ کوئے یار" کے بغیر حاضرِ خدمت کرنے میں ادارہ مجبور ہے۔

مُطرب صحرائی
اسسٹنٹ ایڈیٹر

چند یادیں

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایک دن مجھے فون کیا "کہاں ہو' جیتے ہو' مر گئے ہو' توند کیوں بڑھ رہی ہے بڑے یہ ہو اور "بڑے وہ ہو۔ اور تان اسی پر ٹوٹی کہ۔ "میرے جینے کی برف بکوا دیا کرو۔ لیکن اگلے دن معلوم ہوا کہ برف خانے ہی پر دو ہزار بھیج چکے ہیں شہاب کے ہاں گئے اور اپنا حصہ واپس کر آئے۔ مجھ سے کہنے لگے "سخت بخار تھا' اٹھ نہ سکا بوجھ کے چھوڑ دیا۔"

موت سے کوئی تین دن پہلے کافی ہاؤس میں تشریف لائے۔ ہم معمول کے مطابق منڈلی لگائے بیٹھے تھے میرا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"اٹھو"! میں نے اعتراض کیا۔ ایک گالی' دو گالیاں — تین گالیاں۔ اور پھر "یار! اس قدر سے تو یں مر ہی جاؤں تو اچھا سہی"!

اور کرم آباد میں مجھے ریڈیو نے بتایا کہ آج سعادت حسن منٹو انتقال کر گئے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

پچھلے دنوں جوش ملیح آبادی لاہور تشریف لائے تھے۔ معلوم ہوا ابھی تک طبیعت میں جوش بھی ہے اور خروش بھی' لیکن ہوش نہیں اگرچہ دیوانہ بکارِ خویش ہشیار' آپ کا ارشاد تھا "میرا ہندوستان اب مر چکا ہے۔ نیا ہندوستان ہے اور میں ہوں۔ اُن کے چہرے پر غازہ و مینا کی کرامات بدستور ہیں اس عمر میں بھی کہ چہرے پر جھریوں کا مدھم سایہ ہے۔ ایک ہی نصب العین ہے۔

"دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مےِ ناب و سفینۂ غزل است"

اور یا پھر یہ آرزو؟ دعا؟ یا خواہش؟

"معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب"

ایک دوست کے مکان پر چائے پی رہے تھے۔ نوکر نے چائے پیش کی۔ کہا "شیر کو گھاس کھلاتے ہو" زوجۂ محترمہ پاس تشریف فرما تھیں شوکت تھانوی نے کہا۔ صاحب وہ نظم سنائیے کیا نکالا ہے مینڈکوں کا جلوس "مسکرائے اور کہا

"بھائی بیوی پاس بیٹھی ہے"

کسی نے کہا

آپ خدا سے تو ڈرتے نہیں لیکن بیوی سے ڈرتے ہو؟

کہنے لگے

جی ہاں! خدا کو تو محض سنا ہی ہے
مگر بیوی کو خود دیکھ رہا ہوں۔

"صدقِ جدید" میں "مشاعروں کو سلام" کے عنوان سے آپ کی ایک نظم نقل ہوئی ہے جس میں "ملحدانہ جلال" کی پوری شوخیاں موجود ہیں اس کے جواب میں لکھنؤ کے مہتہ امر ناتھ موہن جو بظاہر غیر معروف ہیں اسی پایہ کی ایک نظم ہے

...ں نظمیں درج ذیل ہیں۔

شبیر حسن جوش

ز خاکِ کعبہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

...دل میں ہے کُھل کر اُسے بیان کر دوں
اگر خفا نہ ہوں بندے سے مُصلحانِ کرام

...ے نہیں ہوتے ہیں دین کے پابند
کہ شاعروں کو نہیں فرصتِ دُرود و سلام

...عا کی سبھا ہے نہ محفلِ میلاد
نہ یہ فسانۂ رحمٰن ہے نہ قصّۂ رام

...وں کا نہ بھولے سے اہتمام کریں
مُناظرے کے اکھاڑے کے رستم و بہرام

...، دیر کے والی حرم کے وارث ہیں
وہ لوگ آ کے خرابات میں بنیں نہ امام

...کے چہرہ پہ غازہ نہیں نہ تقوٰی کا
ادب کے مُنہ میں لگائیں نہ بندگی کی لگام

...ے دین و ادب میں بپا ہے جنگِ عظیم
حلال دین میں جو شے ہے وہ ادب میں حرام

...بہشت کے باہر کہیں مجال نہیں
یہاں ہر ایک گلی میں ہے "وجہِ ذو اکرام"

...جو چیز روا ہے وہ ناروا ہے یہاں
وہاں جو چیز سزا ہے یہاں وہ ہے انعام

...حکم کی، یہاں ذہن کی سرافرازی
وہاں ہے اکلِ مُسلسل یہاں شرابِ مُدام

...بہشت میں لگتی ہے جان کی بازی
وہاں بہشت کا ہوتا ہے روز و شب نیلام

...شراب پہ کُھلتا نہیں درِ اِشراق
یہاں رباب پہ ہوتی ہے بارشِ الہام

...بیان نہ کرو وصفِ منبر و محراب
کہ ہے یہ حجرۂ رنگینیِ حافظ و خیام

...فلک ہے غزل خواں بہ یک ترانۂ کیف
وہیں زمین ہے رقصاں بہ یمِ گردشِ جام

...بنا سمجھتے ہیں بادشاہوں کو
جنابِ پیرِ مُغاں کے کمترین غلام

...ہے کہ خدا دے انھیں بھی عقلِ سلیم
جو شاعروں کو سمجھتے ہیں بندۂ بے دام

...نہ دکا سی کے گھومنے والے
بساطِ شعر و سخن پر کریں نہ مشقِ خرام

سخن کو طول نہ دو جوش کُھل کے یہ کہہ دو
اگر یہی ہے روش تو مشاعروں کو سلام

مہندر ناتھ جوش

کافروں کی مسلم آئینی کا نظارہ بھی کر!

جنابِ جوش نے جو کچھ کہا بجا لیکن!
ملے گا شعر و سخن کو نہ اِس سے اِستحکام۔

مشاعروں سے ہیں پہلے ہی لوگ مُتنفّر
وہ ہوں گے ایسی وکالت سے اور بھی بدنام

جو ٹوٹ جائیں گے صوم و صلوٰۃ کے بندھن
نہ مانے جائیں گے گر دین و شرع کے احکام

نہ بچے گا دھرم کا رہے گا نہ خوفِ دینِ متین
بدی لگائے گی نیکی پہ سینکڑوں اِلزام

بڑھو نہ زُہد و عبادت کا قافیہ ورنہ
بگڑ ہی جائے گا سوسائیٹی کا نظم و نظام

رہے گا ذوقِ تخیّل شراب کا قیدی
سُرور و کیف کا بندہ، سبوچے کا غلام

گناہ رُتبہ کرے گا ثواب کا حاصل
کریں گے رند ہی ٹھیکہ بہشت کا نیلام

مذاقِ شعر و سخن کا اُڑائیں گے لڑکے
مچے گا علم و ادب کے جہان میں کُہرام

بنے گا مالکِ دنیا و دین پیرِ مُغاں
رہِ نجات دکھائیگا ساقیِ گلفام

حلال کوئے صنم کا طواف ٹھہرے گا
طوافِ دیر و حرم پر لگے گی مہرِ حرام

اُکھاڑ پھینکے گی الحاد کی اِسے آندھی
ہے یہ جو حجرۂ رنگینِ حافظ و خیام

اگر رہے گا چلن شعر و شاعری کا یہی
اگر یہی ہے خراباتِ شاعری کا نام

اگر یہی ہے سخن سنجیوں کا سرمایہ
شراب و شاہد و پیمانہ و صراحی و جام

وصال و ہجر و غبغب و گُل و بُلبل
یہ دامِ زلفِ صنم، طائرِ دلِ ناکام

بچشمِ مست و سیہ جلوہ ریزِ میخانہ
بدستِ ابروئے خمدار تیغِ خوں آشام

مُنزّہ ہونے نہ پائے گی شعر کی خصلت
رَوِشِ خواص کی سدھرے گی اور نہ خلقِ عوام

جواب سچ ہی ہے کہدی ہے یہ ملائم نے
کسی سے جھگڑا ہے ہم کو نہ خواہشِ انعام

مشاعروں کا اگر ہے کمال بے دینی
تو دینداری کا ایسے مشاعروں کو سلام

بابِ انتقاد

نام کتاب: "نغمۂ نور"
مصنف: ڈاکٹر ہنومان پرساد سریواستو جگر بستوی
قیمت: چودہ روپے۔
ملنے کا پتہ: مصنف، بھگوداکوٹی، کاشتا پرشاد مارگ، بستی (یو۔ پی)

ڈاکٹر ہنومان پرشاد سریواستو جگر بستوی ایک معمر اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنا دیوان "نغمۂ نور" قدما، کی روش اختیار کرتے ہوئے اُس وقت شائع کروایا ہے جب وہ فکر اور فن دونوں کی پختگی کی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ یہ دیوان مختلف اصنافِ سخن کے نمونوں کا حامل ہے۔ لیکن اس کے بیشتر صفحات غزلیات پر مشتمل ہیں۔ بنیادی طور پر جگر بستوی غزل کے شاعر ہیں۔ اور اُن کی غزلیں ہی اُن کے فن کی پرکھ کی اصل کسوٹی ہیں۔

ڈاکٹر جگر بستوی کا اندازِ غزل گوئی مکمل طور پر کلاسیکی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زوال اور جدیدیت کے رجحان کے عروج کے ساتھ صنف غزل کی لفظیات میں جو زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں اُن سے جگر بستوی بالکل ہی متأثر نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنا کلاسیکی اندازِ کلام نہیں بدلا۔ وہ بہ بانگِ دہل یہ اعلان کرتے ہیں کہ ؎

ہم نہ بدلیں گے انداز اپنا جگر
آپ بدلیں زمانہ بدلتا رہے۔

جگر بستوی غزل کے قدیم مروجہ لفظیات کے فنکارانہ استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اُردو غزل کے پرانے علامتی الفاظ ہی سے اپنی غزل گوئی کا محل سجایا ہے لیکن انھیں الفاظ کے سہارے وہ ہر طرح کے موضوعات کا احاطہ کر لینے کا فن جانتے ہیں۔ مگر حجریات سے تعلق رکھنے والے اشعار "نغمۂ نور" میں تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ مجروح سلطانپوری نے اس دیوان کے پیش لفظ میں صرف اسی نوع کے کچھ اشعار کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور ان شعروں کے قابلِ تعریف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جگر بستوی نے کلاسیکی غزل کے ماہر فنکار کی طرح ہر قسم کے خیالات و موضوعات کو شعروں کے پیکر میں ڈھالا ہے۔

تغزل ڈاکٹر جگر بستوی کے کلام کی جان ہے حسن و عشق کا وہ موضوع جو روزِ ازل سے غزل کا اہم ترین اور محبوب ترین موضوع رہا ہے، موصوف کی غزل گوئی کے آسمان پر بھی مست اور متوالی گھٹا کی طرح چھایا ہوا ہے۔ وہی معاملاتِ محبت ہیں جو ہر غزل گو کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں لیکن ایک اچھے اور کامیاب فنکار کی طرح جگر بستوی نے انھیں سادگی و پُرکاری کے ملے جلے انداز میں کچھ اس طرح ادا کیا ہے کہ اُن میں ایک نیا نکھار آگیا ہے

یہ سچ ہے کہ حسن و عشق کے مضامین کی رنگینیوں سے ڈاکٹر جگر بستوی کی غزلیں بھرپور طور پر معمور ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن کی غزل گوئی غمِ روزگار سے لاتعلق ہے۔ موصوف کی غزلیات میں گرد و پیش کے ماحول اور آج کے حالات کے تلخ حقائق پر مبنی اشعار بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے ؎

سجاتے کیا گلوں کی انجمن کو
چمن والوں نے خود لوٹا چمن کو

کج کلاہانِ بہاراں آج ہیں نا آشنا
کل بھرے گلشن کی صورت ہو گئی ریگستان کی

کہاں ہیں وہ ضیائیں جن سے ظلمـ...
یہاں تو دن میں بھی ہر سو اندھیر...

جگر بستوی کی غزلوں کے ذ...
توجہ ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر میں ا...
ایک فنی خوبی کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔ موصو...
پوری پوری بندش کی تکرار اس طرح کر...
ناپختہ کار اس کی جرأت کرے تو بہت بڑا...
کے شعر میں یہ تکرار لطف کے خزانے بھر د...

اِک حادثۂ وقت ہے برباد...
بربادیٔ گلشن کا سماں یاد...

وہ پوچھ رہے ہیں مری رُود...
رُوداد محبت مجھے اب یاد...

بندش کی تکرار کے علاوہ کبھی ک...
کئی الفاظ پر مشتمل فقرے کی تکرار بھی وہ اس...
کر شعر نگینے کی طرح دمک اٹھتا ہے۔ ایک...

"کچھ یاد نہیں کب سے ہوں ویرا...
کچھ یاد نہیں کب سے چمن بھو...

ڈاکٹر جگر بستوی کا دیوان "ن...
لیکن اس میں اچھے شعروں کی تعداد کا...
نے دیوان مذکور کے پیش لفظ میں یہ درست...
جو آپ کو متوجہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے" اس...
ملیں گے۔

ڈاکٹر ...

مِن مکتوب الیہ

محترمی سرورؔ صاحب، تسلیم !

گذشتہ ماہ آپ کے علیل ہونے کی خبر ملی تھی، خدا کا شکر ہے کہ اب آپ رُو بصحت ہیں۔ آج ٹی وی پر آپ کو "بزم" کے پروگرام میں دیکھا اور سُنا۔ کُمار پاشی صاحب کو بھی دیکھا اور سُنا۔ آپ کو رُو برُو دیکھ کر بڑی مسرّت ہوئی۔

آپ کا

زبیر احمد ہلال

محبی سرورؔ تونسوی صاحب

تسلیمات !

گرامی نامہ اور آپ کی سوانحی کتاب ملی۔
...ں کرم کے لئے بے حد شکر گزار ہوں۔ یوں سمجھیے
...گزشتہ چند روز میں نے آپ کی معیت میں گزارے
...یہ کتاب پہلے سرسری طور پر دیکھ چکا تھا اور اس
...کا ذکر ایک انگریزی مضمون میں بھی کیا تھا۔ لیکن اب
...اس کا ایک ایک لفظ مزے لے لے کر پڑھا اور آپ
...کے کردار کا نقش دل پر مرتب ہوتا چلا گیا۔ میں نے
...پر جو کالم "حریت" کے لئے لکھا ہے اس کی ایک نقل
...ارسال کر رہا ہوں۔ انگریزی کا تراشہ بھی مرسل ہے۔
آپ نے ادبی معاصرے کے واقعوں کو خوب
...بیان کیا ہے۔ ہمارے یہاں اقبال ساجد بیتے
...گئے۔ اس پر جو کالم میں نے لکھا وہ ادبی حلقوں
...میں پسند کیا گیا۔ اس کی نقل ارسال ہے۔ آپ چاہیں
...تو ...ان ہند میں شائع کر دیں۔ آپ کی کتاب میں جس
...کی شراب نوشی کا ذکر ہے وہ شاید اقبال ساجد
...تھا۔

دلی میں مختصر سی ملاقات ہوئی لیکن دوستوں
...کی محبت نے میرا دل موہ لیا۔ افسوس کہ آپ سے طویل
...ملاقات کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ یار زندہ ....
...صحبت باقی۔

اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

مخلص

انور سدید

برادر محترم سرورؔ صاحب، تسلیم و نیاز !
امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔
فروری، مارچ اور اپریل کے شمارے موصول ہوئے

تاخیر سے موصول ہوئے۔ آپ کی علالت کی خبر سے واقعی بہت دُکھ ہوا۔ خدا کرے آپ رُو بصحت ہوں۔ حسبِ معمول آپ کے خصوصی کالم "بہ کوئے یار" اور "بُلبُل چہ گفت" اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو زبان کے سلسلہ میں آپ کے نظریے سے مجھے کہیں کہیں اختلاف ہے۔ اردو ایک زندہ زبان ہے۔ جس طرح ہمارے ملک میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہیں بالکل اسی طرح اردو زبان کی جڑیں بھی بہت مضبوط ہیں۔ ہندوستان ایک ترقی پسند ملک ہے اور اُردو زبان ایک ترقی یافتہ زبان۔ جوں جوں ہمارا ملک ترقی کرتا جائے گا اُردو زبان بھی ترقی کرتی رہے گی۔ لہٰذا اُردو زبان کا مستقبل وہی ہے جو خود ہندوستان کا ہے۔ یعنی اُردو کے مستقبل کو ہندوستان کے مستقبل سے جدا نہیں کیا جا سکتا — آپ کا یہ کہنا کہ ہندوستان کے اردو دانشور مسلمان اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں۔ یہاں مجھے اختلاف

ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی دانشور مسلمان اُردو کے بارے میں ایسا نہیں سوچتا۔ اُردو کے مسلمان دانشوروں نے ہمیشہ یہی بیان دیا ہے کہ اُردو زبان صرف مُسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے بلکہ اس کی ترویج و ترقی میں دوسری قوم کے دانشوروں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے اور لے رہے ہیں۔ یہ تو اہلِ سیاست کا کرم ہے جو زبان کو بھی فرقوں کے خانوں میں تقسیم کرتے ہیں اور زبان کے نام پر فرقہ وارانہ کشیدگی کو فروغ دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے اُردو زبان آج ہندوستان کی ایک ایسی زبان بن گئی ہے جسے دوسری زبان کے لوگ مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے چند مقتدر سیاستدانوں کی نظر میں اس زبان پر یہ الزام ہے کہ اس نے ملک کو تقسیم کروایا۔ کچھ نے کہا یہ زبان باہر سے آئی ہے یا پاکستانی ہے وغیرہ وغیرہ — بہرحال! یہ تمام باتیں اُن لوگوں کی طرف سے ہو رہی ہیں

جو عوام کے دو ٹوں کے بل پر اپنے اقتدار کی
کرسیاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ مگر اس میں دو رائے
نہیں ہو سکتی کہ ان کے یہ غلط اور بے بنیاد پروپگنڈے
اُردو زبان کی ترویج و ترقی میں آج بھی بُری طرح
حائل ہیں۔

اُردو زبان قومی ایکتا کی نمائندگی کرتی ہے مگر کچھ لوگوں نے مذہب کے نام پر اس دھارے سے الگ ہو کر ایک کانفرنس منعقد کروائی۔ یہ چند سال پہلے کی بات ہے۔ اس کانفرنس کا کچھ خاطر خواہ نتیجہ تو نہیں نکلا مگر مسلم اور غیر مسلم اُردو دانشوروں کے درمیان ایک خلیج آ گئی۔

بہرحال! جہاں تک اُردو کی ترویج و ترقی کا مسئلہ ہے ہمیں اس سلسلے میں حکومت کی چشمِ کرم کا محتاج نہیں ہونا چاہیئے اور ہر اُردو دانشور کو خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو، مل جُل کر کام کرنا چاہیئے۔ اسی میں اُردو کا بھلا ہے ترقی ہے۔ میری نظر میں اُردو کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے نامور اُدبا و شعراء ہی اپنی اولاد کو اُردو سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں اُردو زبان اُن کے بچوں کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ آپ کے "شانِ ہند" میں بڑے بڑے شعراء و اُدباء کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ ذرا اُن سے یہ سوال کریں کہ کیا اُن کے بچے بھی اُردو پڑھتے ہیں؟" اگر اُن کا جواب نفی میں ہے تو اُن کی کوئی تخلیق آپ "شانِ ہند" میں شائع مت کیجیے گا ـــــ میں تو یہی مشورہ دوں گا ـــــ!

طالبِ دُعا
خلیل انجستم

برادرِ مکرم مشتہور صاحب
تسلیمات!

اگرچہ آپ نے اپنے خط میں تذکرہ نہیں کیا تھا لیکن "شانِ ہند" کے تازہ شمارے (اپریل ۸۸ء) سے معلوم ہُوا کہ آپ کا مزاج کچھ ناساز ہے۔ تشویش ہوئی۔ خدا کرے اب آپ بالکل اچھے ہوں۔ آپ جیسے زندہ دلانِ ادب کو کبھی بیمار نہیں پڑنا چاہیئے۔

ادھر میری طبیعت بھی کچھ بے لطف رہی۔ کچھ اپنے بچوں اور عزیزوں سے ملنے اور ذاتی کاموں کے سلسلہ میں مسلسل سفر میں بھی رہا۔ لیکن یہ تو کاروبارِ زندگی ہے، سب کچھ چلتا ہی رہتا ہے۔ والسّلام

آپ کا
علی جواد زیدی، لکھنؤ۔

برادرِ مکرم مشتہور صاحب، آداب!

امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ آپ کو جان کر مسرت ہوگی کہ پنجاب سرکار (بھاشا وبھاگ) نے "اندازِ جگر" (دیوناگری) کو گورمکھی لپی میں چھاپنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دیوناگری مجموعے کو آپ کی موجودگی میں سابقہ صدرِ جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے راشٹرپتی بھون میں ریلیز کیا تھا۔ ہمارے محکمے کی طرف سے سرکاری طور پر جاری کئے گئے پریس نوٹ کی نقل خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔

آپ کا
جگر جالندھری۔

برادرم نمستے!

کل رات آپ کو ٹی وی پر دیکھا۔ چہرہ پہچاننے میں تاخیر سی ہوئی۔ فی الواقع آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ دُعا گو ہوں کہ آپ پوری طرح صحت یاب ہو جائیں۔

آپ کا
رستوگی۔

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 JULY 1988
Regd. with the Registrar of Newspaper at R.NO. 644/57
Delhi Postal

NOOR MOHAMMADI HOTEL

جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے



● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مداحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نور محمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنا لیا ہے، آپ یہاں تشریف لاکر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نور محمّدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115

شاعر

ہم اپنے سر پہ کھلا آسمان رکھتے ہیں
کشادہ دل میں کشادہ مکان رکھتے ہیں



اور میری فکر مگر اس شخص کی فکر ہے جو اپنے وطن میں بے وطن، اپنی
قوم میں اجنبی اور اپنے رشتہ داروں اور دوستوں میں تنہا اور دلگیر ہے

جبران خلیل جبران

اندر دیکھئے۔ فرقہ وارانہ فسادات۔ پہل کون کرتا ہے؟ ۔ اس ماہ کی ایک

شانِ ہند دہلی

اگست سنہ ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹

شمارہ ۸

چیف ایڈیٹر: سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر: مطرب صحرائی

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر: ودیا پرکاش سرور تونسوی۔
طباعت: خواجہ پریس جامع مسجد دہلی۔ مقام اشاعت: دفتر
ماہنامہ "شانِ ہند" فلیٹ ۵ الصادق مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی۔

خطاط: سبطین عسکری، محمد عمران

حسن کار: مصطفیٰ آرٹسٹ

غزل

اسمٰعیل احمد مینائی تسنیم
نبیرۂ حضرت امیر مینائی

بیکار بالآخر ہوئے سب میرے ارادے — اب تیری ہی مرضی جو بنا دے وہ بنا دے
بیہوش کو شائد یہ عمل ہوش میں لادے — سر زانو پہ رکھ کر کوئی دامن کی ہوا دے
کیا چیز ہے درکار مجھے تو ہی بتا دے — مجھکو نہیں معلوم ہیں خود اپنے ارادے
تسکیں نہیں ہوتی ہے کبھی ذوقِ طلب میں — دیوانہ بھی کہتا ہے کہ دیوانہ بنادے
سوتوں کو تو ہر ایک ہے دنیا میں جگاتا — جب جانوں کہ تو جاگنے والوں کو جگادے
کیا اُس کے گلے میں نہیں اک طوقِ غلامی — آزاد وہ کب ہے جسے صیّاد اُڑادے
آنکھوں میں ہے ساقی کے عجب اک مے گلگوں — جو جام میں رکھی رہے اور مست بنادے
اطراف کے پردوں کو تو میں کچھ نہیں کہتا — ہاں بیچ کے اس پردے کو البتہ ہٹادے
اب سوچ کے روتا ہوں انہیں ظلمتِ شب میں — ہنسکر کبھی کہتا تھا جنھیں اپنے ارادے
آزادی مطلق ہے اسیری کے مرادف — مجبور بنانا ہو تو مختار بنادے

تسنیم کہ ہے واقفِ اسرارِ حقیقت
اشکوں کے بہانے کہیں گوہر نہ لُٹادے



فرقہ وارانہ فسادات پہل کون کرتا ہے؟

فرقہ وارانہ فسادات کے نزول کی وجوہات اور اُن کے نتائج سرکاری رپورٹوں کے حوالے سے۔

مراٹھی ہفت روزہ "شودھن" نے مسلم شانتی مارگ، ۱۵ مئی ۱۹۸۹ء کے اپنے شمارے ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں جناب وبھوتی نارائن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس غازی آباد یو۔ پی کا مضمون شائع کیا ہے جس میں فرقہ وارانہ فسادات کے نزول کی وجوہات اور اُن کے نتائج سرکاری رپورٹوں کے حوالے سے پیش کئے گئے ہیں۔ جناب وبھوتی نارائن رائے انڈین پولیس سروس کے ایک تجربہ کار افسر ہیں لہٰذا اُن کے تاثرات ہر ہندوستانی کے لئے قابلِ توجہ اور باعثِ فکر و عمل ہیں۔

اس مضمون کا اردو ترجمہ جناب محمد باقر بیتاز کلیان نے کیا ہے جسے ہم "نوزائیدہ" کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

"ہمارے ملک میں ۱۹۴۷ء کے بعد ہونے والے تمام فرقہ وارانہ فسادات کا خاکہ

۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند کے فوراً بعد ہونے والے فسادات سے بالکل مختلف ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جتنے بھی فسادات ہوئے اُن میں سیاسی برتری حاصل کرنے کی ہوس دن بدن بڑھتی جاتی نظر آرہی ہے۔

فسادات برپا ہونے اور اُن کے پس پردہ انجام دی جانے والی کارگزاریوں کو اس ڈھنگ سے ہندو سماج سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا عام طور پر ہندو سماج کی بڑی اکثریت اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ ہمیشہ فساد کی ابتدا مسلمانوں کی طرف سے شروع ہوتی ہے۔ اور فساد میں قتل ہونے والوں میں ہندوؤں کی تعداد بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ ہوتی ہے انہیں بے ہودہ غلط فہمیوں اور بے بنیاد خیالات کے نتیجے میں ہندو سماج کے ہر فرد کے دل میں مسلم دشمنی کا ایک غلط جذبہ چھپا ہوا نظر آتا ہے۔

فسادات میں پہل کون کرتا ہے؟ اس سوال کے جواب یا دو رائیں قائم ہو سکتی ہیں۔ ہر ہندو مسلمانوں کو اور ہر مسلمان ہندوؤں کو اس کا مجرم تصور کر سکتا ہے لیکن ان فسادات میں مارے جانے والے یا نقصان اُٹھانے والے افراد کے بارے میں دو رائیں قائم نہیں ہو سکتیں کیونکہ سرکاری رپورٹوں کے مطابق اب تک ہونے والے تمام فسادات میں بہ نسبت ہندوؤں کے مرنے والوں میں مسلمانوں ہی کی تعداد زیادہ ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہونے والے فسادات کا جائزہ لیا جائے تو سرکاری فائلوں کے مطابق نصف سے زیادہ فسادات میں جن لوگوں کو اپنی جانیں گنوانا پڑیں اُن میں ۹۰ فیصد مسلم سماج کے لوگ ہیں۔ سرکاری رپورٹوں میں گھائل افراد میں ۸۵ فیصدی مسلم قوم کے لوگ ہیں۔ اسی طرح مالی نقصان کے بارے میں سرکاری رپورٹوں میں ۳/۴ حصہ مسلم سماج کا نقصان درج کیا گیا ہے یہی نہیں بلکہ ان فسادات یا فسادات کے بعد جن افراد کو گرفتار کیا گیا ہے اُن میں بھی مسلم قوم کی اکثریت نمایاں نظر آتی ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد سب سے بڑا فرقہ وارانہ فساد احمد آباد میں ہوا۔ جس کی تفتیش کے لیے حکومت کی طرف سے جسٹس جگموہن ریڈی کی صدارت میں قائم شدہ کمیشن نے سرکاری ریکارڈ کی بنیاد پر جو تحریری رپورٹ پیش کی ہے اس کے مطابق اس فساد میں کل ۶۷۴۲ مکان اور دوکانیں نذر آتش کی گئیں جن میں سے ۶۰۷۱ مکانات مسلمانوں کے اور باقی صرف ۶۷۱ مکان یا دوکانیں ہندو سماج کی ملکیت تھیں۔ اسی طرح دوران فساد کل ۴ کروڑ ۳۲ لاکھ ۶۴ ہزار ایک سو ۶۸ روپے کا نقصان ہوا ہے اس میں ہندو سماج کا حصہ صرف ۵۷ لاکھ ۸۵ ہزار ۱ سو ۵۴ روپے کا تھا مگر مسلمان سماج کو ۳ کروڑ ۷۴ لاکھ ۸۰ ہزار ۲۴۳ روپے کا گراں بہا سرمایہ فساد میں قربان کرنا پڑا۔ اس فساد میں مارے جانے والوں کی کل تعداد رپورٹ میں ۵۱۲ درج کی گئی جن میں ۴۱۳ مسلمان اور صرف ۲۴ ہندو تھے۔ باقی ۷۵ افراد کے مذہب کی شناخت نہ ہو سکی۔

احمد آباد کے بعد دوسرا بڑا فساد ۱۹۷۰ء میں بھیونڈی میں واقع ہوا جو ۱۹۴۷ء کا المیہ کہا جاتا ہے۔ اس کی تفتیش کے لیے "مادن" کمیشن مقرر کیا گیا۔ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق اس فساد میں کل ۷۸ افراد قتل ہوئے جن میں ۵۹ مسلمان اور ۱۷ ہندو تھے دو مقتولین کی شناخت نہ ہو سکی کہ وہ ہندو تھے یا مسلمان تھے۔ کمیشن کی رپورٹ میں یہ المناک بات بھی درج ہے کہ اس خونریز فساد میں ۹ خواتین سے زنا بالجبر کیا گیا جو بدقسمتی سے سب کی سب مسلمان تھیں اور ہندو سماج کی ایک خاتون بھی اس المیہ کا شکار نہ بن سکی۔ بھیونڈی کے فساد کا بدترین عمل جلگاؤں میں ظاہر ہوا جہاں سرکاری رپورٹ کے مطابق مرنے والوں کی تعداد ۱۰۴ ہے جن میں ۱۰۰ مسلمان اور صرف ایک ہندو تھا نیز مسلمانوں کا مالی نقصان ۳ کروڑ ۴۳ لاکھ ۹ ہزار ۹ سو ۶۷ روپے تھا جبکہ ہندو سماج کا نقصان صرف ۳۴ ہزار ۷ سو ۵۲ روپے پر مشتمل تھا۔

۱۹۷۹ء میں رانچی، ہٹیا اور نوسکرا میں واقع شدہ فساد میں ۱۸۸ افراد مارے گئے جن میں مسلمان ۱۶۷ اور ہندو ۲۰ تھے۔ ایک فرد کی شناخت نہ ہو سکی۔ اسی طرح جمشید پور میں، علی گڑھ، بنارس اور بمبئی وغیرہ شہروں میں بھی فسادات ہوئے سرکاری رپورٹیں ان مقامات کے فساد زدگان، نقصان اُٹھانے اور مرنے والوں کا تناسب ہندو جبالپور دیگر مقامات کے فسادات کی طرح یکطرفہ مسلم قوم کی اکثریت کا اظہار کرتی ہیں۔ البتہ مقامات ایسے بھی ہیں جہاں مقتولین میں غیر مسلم ۷۰ فیصد کی تعداد کے حامل ہیں مگر وہاں بھی جن لوگوں کو فساد کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور کمال یہ ہے کہ انہیں گرفتار شدہ مسلمانوں کے مکانوں پر حملے کر کے انہیں زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا گیا۔ بھارت کے اکثریتی فرقے کی طرح بھارتی پولیس بھی اسی نظریے کی قائل ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کی پہل مسلمانوں ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ اسی تعلق سے پولیس کی طرف سے شروع ہی سے مسلمانوں کو دبایا جاتا ہے کیونکہ عام پولیس والوں کا یہ گمان یقین کی حد تک پہنچ چکا ہے کہ مسلمانوں کو دبا کر رکھنے سے فساد پر جلد قابو پایا جا سکتا ہے۔

سرکاری رپورٹوں میں شائع ہونے والی معلومات کے مطابق فسادات میں مرنے والوں، نقصان اُٹھانے والوں اور گرفتار ہونے والوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی خبریں پڑھنے کے بعد بھی ہندو سماج کے دماغ سے "فسادات مسلمانوں کی طرف سے شروع کئے جاتے ہیں" والی

میں جانی اور مالی نقصان ہندو سماج کا زیادہ ہوتا ہے۔" یہ غلط فہمی دُور نہیں ہوتی یہ اس ملک کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے "مسلم قوم بذات خود ایک خونخوار قوم ہے اور دوسری قوموں کا خون خرابہ کرنے میں آگے پیچھے نہیں دیکھتے" اس قسم کے غلط اور بے بُنیاد خیالات بچپن ہی سے ہندو بچوں کے دل و دماغ میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں — ہندو سماج میں آج بھی یہ تذکرہ زبان زد عام ہوتا ہے کہ ایک ہندو فرد کے گھر میں سبزی کاٹنے کی چھری کے سوا کوئی قابل اعتراض ہتھیار نہیں مل سکتا لیکن اس کے برخلاف ہر مسلمان کا گھر خطرناک ہتھیاروں سے بھرا ہوا ملے گا۔

دوسری غلط فہمی جس میں ہندو قوم مبتلا ہے یہ ہے کہ فسادات کی ابتدا ہمیشہ مسلمانوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ نہ صرف ہندو عوام ہی بلکہ اس فرقے سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے افسران، دانشور، معلمین، اخبار نویس، نیز پولیس کے عملے کے ہندو، نیز سرکاری دفتروں کے غیر مسلم عہدیدار بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اور اس غلط خیال کے ثبوت کے طور پر ان کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ فساد ہمیشہ اُسی محلے سے شروع ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا غلط فہمی دُور کرنے کے لئے اس حقیقت کو سمجھنا اور ماننا پڑے گا کہ ہر بار برپا ہونے والے فساد میں سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان مسلمانوں ہی کا ہوتا ہے اس سے ہر مسلمان واقف ہے۔ پھر فساد کے نتیجے میں گرفتار کئے جانے والوں میں بھی مسلمانوں ہی کی زیادہ تعداد ہوتی ہے اس بات کو بھی اب ہر مسلمان سمجھ چکا ہے ایسی صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ مسلمان جان بوجھ کر فساد کی پہل کر کے اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو جانی و مالی پریشانی نیز گرفتاری کی مصیبت میں ڈالنا پسند کریگا؟ اس سوال کا جواب اگر انکار ہی ہے اور حقیقت میں انکار ہی کرنا پڑے گا تو اس بات سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ کسی فساد کا مسلمانوں کی طرف سے شروع کئے جانے کا الزام قطعی غلط اور بے بُنیاد ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ ہندو سماج اس حقیقت کو ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوتا۔

فساد کی پہل کس طرف سے ہوتی ہے؟ اس نکتے کو جاننے سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ فساد کسی ایک فرقے کی طرف سے ایک پتھر مخالف گروپ کی طرف پھینکنے سے نہیں ہوتا۔ بلکہ جن دانشوروں نے فسادات کی چھان بین کا فرض انجام دیا ہے وہ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ فساد سے پہلے ایک عرصے تک اس شہر کی فضا مکدر رہتی ہے۔ غلط افواہیں، جھوٹا پروپیگنڈہ، نیز ایک دوسرے پر کیا جانے والا شک اس تناؤ کو بڑھاتا رہتا ہے۔ فضا دن بدن مخدوش ہوتی جاتی ہے اور ماحول اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ کسی نے شرارتاً بھی اگر پتھر مخالف گروپ کے آدمی پر پھینکا تو یہ ہنگامہ خیز ماحول فساد کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

ایسی صورت میں پہلا پتھر جس سماج کے آدمی نے پھینکا ہو اُس پر فساد کی پہل کی ذمہ داری ڈالنا بعید از انصاف، اور حقیقت سے آنکھیں بند کر کے کیا ہوا فیصلہ ہے جس میں بدقسمتی سے آج ہندو سماج کی اکثریت مبتلا ہے۔ اس ضمن میں حقیقت کو سمجھنے کے لئے سنہ ۷۰ کے بھیونڈی فساد کی سرکاری رپورٹ کا مطالعہ کرنا بے حد مفید ثابت ہوگا۔

بھیونڈی کا ماحول فساد شروع ہونے

ہر بار برپا ہونے والے فساد میں سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان مسلمانوں ہی کا ہوتا ہے۔

سے سال [illegible] پہلے ہی سے نکتہ [illegible] بن چکا تھا بلکہ [illegible] مہیا کر دیا جس نے [illegible] دبا تھا [illegible] ہندو [illegible] کے خلاف [illegible] اسی پر [illegible] مسجد کی طرف [illegible] مسجد کے صحن میں [illegible] مسلم نوجوانوں نے جلوس پر پتھر [illegible] اس حقیقت کو سرکاری رپورٹ [illegible] کے بعد بھی اگر کوئی فساد کی [illegible] کا الزام مسلمانوں پر [illegible] تو اس کی عقل کا ماتم [illegible] جا سکتا ہے۔

حیدرآباد کے فساد کی سرکاری [illegible] [illegible] جلوس میں شامل [illegible] تماشائیوں سے کسی [illegible] نے جلوس پر پتھر پھینکے اور اس کے جواب [illegible] چھوڑ دیا [illegible] طرف سے [illegible] ہو رہا ہے۔ پھر تو [illegible] قیامت خیز جان کنی کا خونی [illegible]

> **اس مقام پر بھارت کے ہندو سماج کو یقین سے یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ جب تک وہ اپنے دماغ میں بسی ہوئی مسلم سماج کے متعلق غلط فہمی اور شکوک و شبہات کو دور نہیں کرتے اس وقت تک فرقہ وارانہ فسادات میں کمی واقع ہونا امر محال ہے۔**

وبھوتی نارائن رائے

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس

(ہفت روزہ "شودھن" مراٹھی)

(۱۵ جولائی ۱۹۸۸ء صفحہ ۲۰۴)

ہوگیا۔

اس مقام پر بھارت کے ہندو سماج کو یقین سے یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ جب تک وہ اپنے دماغ میں بسی ہوئی مسلم سماج کے متعلق غلط فہمی اور شکوک و شبہات کو دور نہیں کرتے اس وقت تک فرقہ وارانہ فسادات میں کمی واقع ہونا امر محال ہے۔ ہر فساد کے موقع پر اقلیتی فرقے ہی کو اکثریتی فرقے کی زیادتیوں کا شکار بننا پڑتا ہے اس حقیقت سے کوئی عقل مند انکار نہیں کر سکتا۔ آئین ہند نے اقلیتوں کو مساویانہ حقوق عطا کئے ہیں مگر فساد زدہ علاقوں میں متعین شدہ پولیس یا فوج جو اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اکثریتی فرقہ کا ساتھ دیتے ہیں حالانکہ ایسے موقعوں پر اقلیتی فرقے کے افراد کو اکثریتی فرقے کے مظالم سے بچانا ان جوانوں کا فرض منصبی ہونا چاہئے۔ مگر ان تمام ذہنی فرقہ واریت کا تعصب انہیں مجبور کر دیتا ہے یہی ہمارے عظیم ملک کی بدقسمتی ہے اور اس کے باشندوں کی بدقسمتی ہے یہ ذہنیت جس قدر جلد ہماری پولیس کے دل و دماغ میں پیوست ہو جاتی ہے اتنی ہی جلد ہمارے ملک سے فرقہ وارانہ فسادات کا خاتمہ ہوگا۔

خدا کرے اہل بھارت بہت جلد اس غلط فہمی سے باز آجائیں۔ فقط۔

(ہفت روزہ "شودھن" مراٹھی، مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۸۸ء ۲۰۴)۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہندوستانی پولیس میں جناب وبھوتی نارائن رائے ایسے قابل قدر اور سچائی کا ساتھ دینے والے افراد موجود ہیں۔

جناب وبھوتی نارائن رائے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ

آنند جوگلیکر نے سرکار کے مختلف عہدوں سے اقتباسات دیتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے جو اسباب بتائے ہیں اور جن دلائل و براہین سے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ یہ فسادات شروع کیسے ہوتے ہیں اور پھیل کیسے جاتے ہیں وہ اپنی جگہ قطعاً سو فیصد درست ہیں مگر ان کے علاوہ بھی کچھ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے ان فسادات کو ہوا ملتی ہے۔ یہ انگریز کی حکومت کی پیداوار ہیں۔ اس کی حکومت اسی اصول پر مبنی تھی کہ لڑاؤ اور حکومت کرو لہٰذا وہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کرانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا تھا جیسا کہ ۱۹۲۲ء میں ملتان (موجودہ پاکستان) میں پہلا فرقہ وارانہ فساد محض انگریز کی بدولت ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک دروازے کے اندر کسی انگریز ڈپٹی کمشنر نے اینٹ پھینک دی اور ایسا فساد بھڑکا کہ ملتان جہنم کا نمونہ بن کر رہ گیا۔

چونکہ کانگریس کو حکومت انگریز سے منتقل ہوئی اس لئے کانگریس والوں نے بھی اپنے پیش رو کی ان خصلتوں کا تجزیہ کیا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ انگریزوں کی حکومت کا راز اسی میں مضمر ہے کہ لڑاؤ اور حکومت کرو لہٰذا کانگریس نے بھی اس آزمودہ نسخہ پر کافی حد تک عمل کیا اور فرقہ وارانہ فسادات کو ایک ایسا ذریعہ سمجھا جس سے اسے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے ووٹ آسانی سے مل سکتے تھے۔

بہرحال اگر حکومت صدق دل سے چاہے تو فرقہ وارانہ فسادات کا ہونا ناممکنات میں سے ہے مگر جب تک اقلیتوں کے ووٹوں کا پلڑا کسی بھی پارٹی کی جھولی میں حکومت کی ہیبت ڈال سکتا ہے تب تک حکومت کو ووٹ پالیسی پر عمل کرنا ہی پڑے گا۔

اگر ہم سب مل کر فرقہ وارانہ فسادات کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو اقلیتوں اور اکثریت کو شیر و شکر ہو کر رہنا ہوگا۔ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ہونی ہی چاہئے مذہبی معابد کی عزت و حرمت ہونی چاہئے، باہمی محبت و یگانگت کے تعلقات کو بڑھاوا دینا چاہئے اور سب سے بڑھ کر ووٹ کی پالیسی کو ختم کرنا چاہئے۔ یاد رکھئے کہ فرقہ وارانہ فسادات کا خاتمہ ہم خود ہی کر سکتے ہیں۔ کوئی بیرونی طاقت یا ہماری حکومت انہیں ختم نہ کر سکے گی۔

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

کبھی اِضطراب کبھی خلش یہی داستانِ بشر رہی
یہی اُس کا زادِ سفر رہا، یہی اُسکی رختِ سفر رہی

وہی ٹیس جس نے کہ ڈس لیا، رگِ زیست کو رگِ جان کو
وہی بن کے دل کا سکوں رہی، وہی بن کے نورِ نظر رہی

جسے کھوجتے رہے رات دن، جسے ڈھونڈتے رہے چار سُو
وہ ترا ہی نقشِ قدم رہا، وہ تری ہی راہگذر رہی

ترا خواب پُورا نہ ہو سکا تو یہ اتفاق کی بات ہے
مگر ایک اور بھی بات ہے، تری جستجو میں کسر رہی

وہی خاک جس کو نصیب تھیں، تری صحبتیں تری قُربتیں
وہی خاک رشکِ جناں بنی، وہی رشکِ شمس و قمر رہی

مَیں فقیر ہُوں مَیں حقیر ہُوں ترے آستانے پہ سرنگوں
ہے کرم ترا مری ذات پر مجھے کچھ نہ کچھ تو خبر رہی

702, Gold Crown
J. P. Road
Andheri (W)
Bombay-400 061

ڈاکٹر انور سدید

مندر میں محراب
تیسرے کام کا سفرنامہ

سدیدیات

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی ایک طویل عرصے سے اپنی پُراسرار ڈاڑھی سے پہچانے جاتے رہے ہیں لیکن اب اُن میں چند نئے زاویوں کا اضافہ ہوگیا۔ مثلاً ایک زاویہ یہ ہے کہ اُنھیں پنجاب یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کر دی ہے۔ اس کی تقریب ایک مقامی ہوٹل میں ہوئی تھی اور لوگوں نے مبارکباد مولانا محمد عبداللہ قریشی کی خدمت میں پیش کی کہ جن کے عملی تعاون کے بغیر محمد دین فوق پر کوئی کام مکمل نہیں ہو سکتا۔ دوسرا اجمل نیازی کا سفرنامہ ہند "مندر میں محراب" کے نام سے چھپ گیا ہے۔ اس کتاب کی تقریب رونمائی ابھی منعقد نہیں ہوئی لیکن اس کی پشت پر جو تصویر چھاپی گئی ہے اُس سے اجمل نیازی کی رونمائی ہو گئی ہے۔ "مندر میں محراب" اُردو کا شاید پہلا سفرنامہ ہے جس پر ہر شخص بڑی نظر ڈال رہا ہے۔ ہاں عطاءالحق قاسمی کی بات الگ ہے وہ دوستوں کی تعریف میں تنقیدی دیانت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے اور دوست اگر دوبئی، قطر یا دوحہ کا ہو تو گویا تعریف کا دبستان کھل جاتا ہے اور اگر بڑا سرکاری افسر ہو تو اُن کی تحسین دو آتشہ ہو جاتی ہے یعنی وہ مضمون آرائی بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ممدوح کی رنگین تصویر بھی چھاپتے ہیں۔ اجمل نیازی اُن کے اس معیارِ دوستی پر پورے نہیں اُترتے یعنی نہ تو وہ دوبئی، قطر یا دوحہ میں ملازم ہیں اور نہ ہی اُنھیں بڑا سرکاری عہدہ حاصل ہے۔ اُنھوں نے عطاءالحق قاسمی صاحب سے بزورِ انتساب تحسین حاصل کی ہے اس لئے اکثر لوگوں نے اسے تحسین فہما نہیں کیا اور اجمل نیازی کو جو بے داد "مندر میں محراب" لکھنے پر دی جا رہی ہے اُس پر عطا کی تعریف نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔

خامہ بگوش کے بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ بے پر کی خوب اُڑاتے ہیں۔ پچھلے دنوں ہمیں دلّی میں ایک محفل میں شریک ہونے کا موقع ملا تو انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس محفل میں خامہ بگوش کی "بے پرکیاں" اس طرح سنائی جا رہی تھیں جس طرح امجد اسلام امجد خواتین کی محفل میں دانش لطیفے سناتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شعر پر داد ملی تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ترقی پسندی کا یہ مطلب نہیں کہ اتفاقی طور پر اچھا شعر کہا جائے۔"

"شہاب نامہ ابھی آپ بیتی نہ سہی، اچھا ناول ضرور ہے۔"

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لسانیات ہی کے نہیں نسانیات کے بھی ماہر ہیں۔

"انشائیہ کی بنیاد" نامی کتاب کا ڈاکٹر سلیم اختر کا تذکرہ ہونے لگا۔ تو اس جملے نے بحث کو قہقہہ میں تبدیل کر دیا۔

انشائیہ پڑھنے سے دنیا اور انشائیہ پر تنقید کرنے سے عاقبت خراب ہوتی ہے۔

ان "بے پرکیوں" میں خامہ بگوش صرف بے پر کی نہیں اُڑاتے بلکہ وہ جھوٹ اس طرح لکھتے ہیں کہ

نظر آنے لگتا ہے۔ لوگ اُسے کثیف طنز بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اب کہ ہم نے ان کا ایک انشائیہ تلاش کیا ہے جو زاویہ بدل بدل کر دیکھنے سے بھی انشائیہ ہی بنتا۔ لکھتے ہیں کہ:

"ہمارے خیال میں ادب کو سب سے زیادہ نقصان سفرناموں نے پہنچایا ہے۔ ہر وہ شخص جو کچھ نہیں لکھ سکتا سفرنامہ ضرور لکھتا ہے۔ اس لئے کہ سفرنامہ لکھنے کے لئے اتنی لیاقت بھی درکار نہیں ہوتی جتنی نثری نظم لکھنے کے لئے ضروری ہے۔"

اجمل نیازی کا سفرنامہ پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ سفرنامہ لکھ کر ادب کو نقصان پہنچانے کا کام سرانجام دے ہی ڈالا ہے۔

انھوں نے اخلاقیات کا بیڑہ غرق کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور ایک سنجیدہ اور سچی صنف ادب میں قدم رکھا ہے تو سنجیدگی اور سچائی کو بھی روند ڈالا ہے۔ اجمل نیازی کا طریقہ واردات عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد سے قدرے مختلف ہے۔ یہ دونوں لطیفہ آرائی مجلس میں کرتے ہیں اور لطیفے کا حلیہ بگاڑنے سے گریز کرتے ہیں۔ اجمل نیازی نے چن چن کر پرانے اور فحش لطیفے اس کتاب میں جمع کئے ہیں اور ان کا حلیہ یوں بگاڑا ہے کہ لطیفہ اجمل نیازی کی غزل کا شعر بن گیا ہے جسے سن کر اسٹیج سیکرٹری پناہ مانگنے لگتا ہے اور خواہش دوپٹے میں منہ چھپا لیتی ہے۔ کیا مضائقہ ہے اگر یہاں ایک لطیفہ اقتباس کر دیا جائے جو قدرے مہذب ہے۔ تاہم اگر آپ اسے دس پندرہ مرتبہ پہلے بھی سن چکے ہیں تو اجمل نیازی کا دل رکھنے کے لئے ہی آخر تک ضرور پڑھیں۔

ایک سردار صاحب دفتر جانے لگے تو بیوی نے کہا کہ پاجامے کا ناڑا (ازاربند) گندا ہے۔ بیوی نے کہا کہ آج اس کے ساتھ چلے جاؤ کل پاجامے بدل لینا تو ناڑا بھی بدل دوں گی۔ سردار صاحب چلے گئے اور اس روز دفتر سے گھر لوٹتے ہوئے دیر کر دی جب پانچ بجے کے بعد پہنچے تو بیوی نے کہا۔

"کیا بات ہے کہاں رہ گئے تھے؟"

سردار صاحب نے کہا۔ بڑی گڑ بڑ سے پیدل چل کر آیا ہوں۔ ابھی بس آدھے راستے پر تھی کہ ایک اسٹاپ پر کنڈیکٹر نے کہا۔ "چلو بھئی گندے نالے والے اتر جائیں۔" میں اتر پڑا اور چلتا ہوا آیا۔ بہت سی لوگ اور بھی اترے۔ انھیں بھی بیویاں پاجاموں میں صاف نالے ڈال کر نہ دیتی ہوں گی لیکن نہ جانے کنڈیکٹر کو کیسے پتہ چلا کہ میرے پاجامے میں گندا نالا ہے۔"

لطیفے کی ساری خوبی اس کے بیان کرنے میں ہوتی ہے لیکن اجمل نیازی اسے اس طرح لکھتے ہیں کہ اختتام تک پہنچتے پہنچتے اشفاق احمد کا ٹی۔ وی ڈرامہ بن جاتا ہے اور اجمل نیازی تقریر کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے بعض لطیفوں کو تو بے چہرہ ہی رہنے دیا ہے۔ مثلاً متذکرہ بالا لطیفے میں "سردار جی" کی جگہ واحد متکلم اجمل نیازی کو بھی ڈال سکتے تھے۔ ایک جگہ خود انھوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ:

"مجھے تو سکھ اپنی برادری کا گم شدہ آدمی سمجھتے تھے۔ ایک آدھ نے تو پوچھ بھی لیا جناب پگڑی کہاں ہے؟"

گویا لطیفے میں لطف موقع جو پیدا ہوا تھا وہ اجمل نیازی نے خود ضائع کر دیا ہے۔ تاہم اس سے یہ نہ سمجھئے کہ انھوں نے لطیفے گھڑے ہیں تو ان کی واقعاتی صداقت کو کرداروں کی آمیزش سے حقیقی ثابت نہیں کیا۔ بعض مقامات پر وہ ہمیں سیاسی مخبر نظر آنے لگتے ہیں اور سیاسی شخصیتوں کی دیگر فتوحات کا سراغ بھی لگا آتے ہیں۔ اس قسم کا ایک واقعہ انھوں نے شملہ کانفرنس کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"شملہ معاہدہ میں کچھ طے نہیں ہو پایا تھا تو اندرا بھٹو اکیلی ملاقات ہوئی اور معاہدہ ہو گیا۔ بھٹو پاکستان آ کر اسے اپنی جیت کہتا رہا۔ اندرا گاندھی بھارت والوں کو بتاتی رہی کہ اس نے پاکستان کے جرنیلوں کو میدان میں اور پاکستانی سیاست کو میز پر شکست دی ہے۔ جرنیلوں کو شکست دینے کے لئے بھی اس میدان کو میز کو بستر بنا کے دکھلایا اور کچھ یوں نقشہ کھینچا کہ ہمسائیگی اور ہم بستری میں کوئی فرق نہ رہا۔ مسلمان تو آج بھی یوں پکار انگریزوں سے صد سالہ غلامی کا بدلہ لیتے رہے ہیں وہ بھٹو کی اس بات سے اتنے خوش تھے کہ کشمیر حاصل کرنے کے بھی تیار ہوں گے۔ بھٹو صاحب کے مرنے کے بعد اندرا کی بے قراریاں قابل غور تھیں۔ جنرل ضیاء نے اندرا کو اپنی بڑی بہن کہا تو وہ ان کی پکی دشمن ہو گئی۔"

اس قسم کی بے تکلفی اجمل نیازی نے ادبی شخصیات کے ساتھ بھی برتی ہے ان میں سرفہرست تو فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، گوپی چند نارنگ ہیں۔ اور ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جن کا بوجھ تو راوی کی کمزور گردن پر ہے لیکن سہو نفسیات اجمل نیازی کی سامنے آتی ہے۔ بہت سے غیر محتاط بیانات کے ہجوم میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

"کشور ناہید ہماری ادبی دنیا کی کھڑپینچ سیاست دان خاتون ہے۔ وہ ادبی سیاست بلکہ ادبی حکومت کی ماہر ہے۔ وہ ایک بڑے ادبی گروہ کی مالک ہے۔ یہ گروپ اپنے آپ کو ایک پوری ریاست سمجھتا ہے۔ اب اس کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور ایک آدھ ناکام بغاوت بھی ہو چکی ہے جس کو فوجی زبان میں "کو" کہتے ہیں۔ حکمرانی کے معاملے میں کشور ناہید اندرا سے کم نہیں۔ اس کے یہی چلن اور چالیں رہیں تو وہ کسی نہ کسی دن کسی ملک کی وزیر اعظم ہوں گی۔ کشور بڑی شے ہے۔ بڑے بڑے اس کے مارے ہیں۔ ایسی عورت کم کم ہوتی ہے ادیبوں کے کام آنے والی۔ دوست ادیبوں کے بہت کام آنے والی۔"

اس کھڑپینچ سیاست دان ادیبہ کو اجمل نیازی نے مشورہ دیا ہے کہ "جب وہ بھارت جائے تو کشور پر لازم ہے کہ گوپی سے ہوشیار رہے بلکہ براہ کرم اس سے پردہ کرے۔"

گوپی کا ذکر آیا تو سن لیجئے کہ اجمل نیازی کی اس سے مراد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہے اور ان کے بارے میں بہت کچھ تحریر کر دیے کہ انھوں نے سفرنامے کو زرد صحافت کا نمونہ بنا دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"جامعہ کے علاوہ گوپی ادبی منافقت جامع

خوشبو پھیلانے کا پروگرام بنا چکا ہے۔ اُردو ادب کے حوالے سے پاکستان کے پھیلاؤ قوں میں بھی یہ بدبُو پھیلائی جا رہی ہے۔ ایک دفعہ گوپی کے ڈپٹی سی بننے کی افواہ اُڑ گئی تو ایک مخلص ہندو پروفیسر بے ساختہ کہا: "واہ واہ! میرے سفلہ پر در بھگوانا! کمانے کے سارے دانت گوپی جی نے اپنے لئے رکھے ہوئے ہیں۔ اُس کے دماغ میں بھی ہر طرف دانت لگے ہوئے ہیں۔"

سُنا گیا ہے کہ بھارت جا کر بہت سے پاکستانی اپنے اوڑھا ہوا تقدّس کا لبادہ اُتار ڈالتے ہیں۔ ہر چند اجمل نیازی نے اپنی ناظر دو فقرا پر مرکوز رکھی تاہم اس سفرنامے میں انھوں نے بہت کچھ اپنے بارے میں بھی لکھ دیا ہے مثلاً ایک باب میں انھوں نے طوائفوں کے بازار کی سیر کا احوال لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"یکّے والے نے پان مُنہ میں رکھا اور کہا۔ "میں یہاں ٹھہرتا ہوں۔ آپ ہو آئیے۔" ہو گئے یکی ادائیگی میں اتنی بلاغت تھی کہ ہم لکھنؤ والوں کے ایک بار اور قائل ہو گئے۔ ایکبار نظر اٹھی تو چلمیں سر اٹھیں اور ان کی اوٹ سے کچھ عورتوں نے جھانک کر دیکھا۔ پھر انھوں نے پان کی پیک پھینکی جو سیدھی اپنے نشانے پر پہنچی یعنی ہم نے معمولی پھیلائی ہوتی تو اس جنّا بیت سے بہا سے محروم رہتے۔ میں نے ایک اچھی بھلی عمر کی عورت سے پوچھا اب بھی لوگ آپ کے پاس اپنے بچے اس مقصد کے لئے بھیجتے ہیں؟ یہ فقرہ بڑا مزے دار تھا۔ ہاں بھیجتے ہیں مگر بچے ذرا ڈھیٹ ہوتے ہیں۔"

اب یہاں اجمل نیازی کی استغفار نگاری کی داد دیجئے۔ یہ منظر آنکھوں دیکھا نہیں بلکہ برتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

"اس بازار میں ہوٹل کا کھانا ٹھنڈا تھا مگر مزیدار تھا۔ ہوٹل پر نام کا بورڈ نہ تھا جیسے اُس عورت کے ماتھے پر نام کی جھلک تھی۔ گو ٹھنڈا سا تھا مگر لذیذ تھا۔ یکے والا ابھی تک پان کھا رہا تھا ہم اس بازار سے بیزار ہو کے قہوہ خانے کہیں اور لے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ یہاں کچھ گھر والے ہیں ایسا بازار لگا ہے کہ خوش ہو جائیں گے آپ!"

اجمل نیازی نے اس سفرنامے میں شاعر ہونے کا فائدہ بھی اٹھایا ہے اور اپنی محرومیوں پر مستند کئی نثری نظمیں سفرنامے کے متن میں شامل کر دی ہیں۔ اس سے نثری نظم کا بیڑا غرق تو نہیں ہوا لیکن سفرنامے کی صنف میں حصّہ داری کا اہل در آیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"میری رات جھلکن میں ہلکی بے نیاز اور حیران آنکھوں والی لڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی اور میں سڑک کے اُس طرف تھا۔ وہ میرا تجسّس آنکھوں میں لگا کر میرے پاس سے گزری اور لڑکی کے جسم سے کھا کر دیکھنے لگی پھر پہلے والی جگہ پر جا کھڑی ہو گئی۔ میں نے اپنی رات کو اس کے پاس چھوڑ دیا اور خود خالی ہو کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ رات رات کے بغیر گزر گئی۔"

غزل

یادؔ دہلوی

تجھے پانا کوئی مشکل نہیں ہے
مرے ساغر میں لیکن دل نہیں ہے

بہر صورت جو دل سے بے خبر ہو
جنوں اُس عشق کا قائل نہیں ہے

کروں کیا امتیازِ شادی و غم
جو ساحل ہو وہ ساحل نہیں ہے

تمہارے محفلِ کیسا تعلق
مگر وہ دوست محفل نہیں ہے

تمہیں غم نے مجھے بخشا ہے اعزاز
خوشی کوئی مرے قابل نہیں ہے

مجھے دیکھو اسیر و یا ...
کسی کو فکرِ مستقبل نہیں ہے

ترا غم ہے خوشی ہے آنچ سے یاد
مرے ... کا خیال ...

حاط حاط

عبدالعزیز خالد

(زبور میں نام دلنواز حضورؐ ہے 'حاط حاط'!)

ایمن آسیبِ جہاں سے ہے گلستاں تیرا
جس کا ہر مُرغ نوا زن ہے غزلخواں تیرا

مژدہ آنکھوں میں ہے دلداری و جاں بخشی کا
صبحِ عیدِ رمضاں ہے رُخِ تاباں تیرا

گو خدا کے تو خزانوں کا ہے خازن لیکن
ہے فقط فقر و توکل سر و ساماں تیرا

کر سکے تیرے لئے جو ترکِ علائق اُس کو
اپنی آغوش میں لے سایۂ داماں تیرا

ہے زبانِ عیسیٰ مریمؑ کی ترے ذکر سے تر
کر سکے وہ کہ بیاں موسیٰ عمرانؑ تیرا

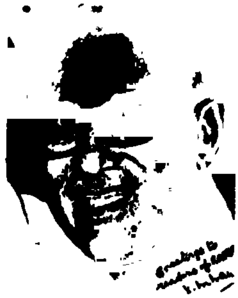
یاد کس مہر سے کرتا ہے تجھے ابراہیمؑ
نام کس فخر سے لیتا ہے سلیمانؑ تیرا

کے عقیدے سے پریشانیٔ خاطر اپنی
جس کا دمساز ہو لب خندۂ پنہاں تیرا

دیکھے ہر آن بجے سرخوشی و پُرسوز و جواں
آرزو تیری، تصوّر ترا، ارماں تیرا

عبدالفیض نے توفیقِ سخن سنجی دی
یہ بھی درا صل ہے بالواسطہ احساں تیرا

گو ہیں کمتر ترے رُتبے سے کہیں لفظ مرے
مثلِ حسّان کے میں بھی ہوں ثناخواں تیرا!



خواجہ احمد عباس



دعویدار

بچہ ایک تھا چار پانچ برس کا ہوگا۔ خوب صورت تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں مگر اُن آنکھوں میں دُنیا بھر کا غم بھرا ہوا تھا جیسے ایک بڑے گمبھیر فلاسفر کو پاکٹ سائز کا بنا دیا گیا ہو جسم بھی لاغر تھا جو تعجب کی بات نہیں تھی کیوں کہ وہ بچپن ہی سے ایک بھکارن کے ہاں پلا تھا، جو اُسے نہ دُودھ دے سکتی تھی، نہ انڈا، نہ کوئی وٹامن نہ پروٹین، نہ مچھلی نہ چکن۔

بچے کا مقدمہ سارے ملک میں شہرت پکڑ رہا تھا۔ ٹیلی ویژن پر جن بھکاری اور لاوارث بچوں کی تصویریں آتی تھیں اُن میں یہ بچہ بھی تھا سارے ملک میں اُس وقت ہمدردی اور شفقت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جب بچے نے اپنی توتلی زبان سے کہا تھا: میری ماں بھگوان کے پاس چلی گئی ہے۔"

اُن ٹیلی ویژن دیکھنے والوں میں دو خوش حال بڑے خاندانوں کی عورتیں بھی تھیں۔ بچے کو دیکھتے ہی اُن کی ممتا اُبل پڑی۔ ایک بمبئی میں تھی، ایک دہلی میں، لیکن دونوں نے فوراً کہا: "یہ تو میرا بچہ ہے۔" اگرچہ ایک نے کہا: "یہ تو میرا حامد ہے۔"

بمبئی میں جو عورت تھی، اُس کا نام تھا مسز لکشمی جے شوریہ۔

اصل میں مسز لکشمی جے شوریہ وزیاگ پٹنم کی رہنے والی تھیں، کیوں کہ اُن کے شوہر مسٹر جے شوریہ ایک سمندری جہاز بنانے والی کمپنی میں انجینئر تھے۔ پہلے وہ دو ہزار روپے ماہوار پر گورنمنٹ کے ملازم تھے۔ اور وزیاگ پٹنم کے شپ یارڈ میں کام کرتے تھے۔

وہاں سے ایک پرائیویٹ فرم کو لاکھوں کا فائدہ پہنچانے کے الزام میں معطل کئے گئے اور پھر اسی پرائیویٹ فرم نے اُن کو زیادہ بڑی تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ ایک بڑی امپورٹڈ کار اور سمندر کے کنارے سجا سجایا فلیٹ مفت۔ اب وہ پہلے سے زیادہ ٹھاٹ باٹ سے رہنے لگے تھے۔ گھر میں ہر قسم کا اعلیٰ سامان تھا۔ جاپانی گڑیا اپنے شیشے کے گھروں میں سے اپنی مُردہ، نیلی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ پلاسٹک کے پھول گل دانوں میں سجے تھے جن میں سے نہ بُو آتی تھی نہ باس اور نہ پانی دینے کی ضرورت تھی لیکن دیکھنے میں پھر بھی اصل لگتے تھے۔ تاہم جب کبھی گھر میں پارٹی ہوتی تھی تو مسز لکشمی جے شوریہ اُن کے پتوں پر پانی چھڑک دیتی تھیں۔ اور پھولوں پر پچکاری سے سینٹ کی پھوار چھوڑ دیتی تھیں۔ گھر میں بس ایک ہی چیز کی کمی تھی اور وہ ایک بچہ تھا۔

لکشمی جے شوریہ نے جیسے ہی بڑی بڑی اُداس آنکھوں والے بھکاری بچے کو ٹیلی ویژن پر دیکھا اُن کو یقین ہو گیا کہ یہ اُن کا ہی کھویا ہوا "گوپال" ہے۔ وہ بچے پر اپنا حق ثابت کرنے کے لئے اپنے شوہر کا تمام رسوخ استعمال کرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔

اِدھر دہلی میں لگ بھگ مسز لکشمی جے شوریہ کی ہی عمر کی بیگم شہناز مغل مرزا کے شوہر کی جائداد ساری دہلی اور نئی دہلی میں پھیلی ہوئی تھی کیوں کہ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ شاہی خاندان سے ہیں۔

اصل میں وہ شاہی خاندان سے تو نہیں تھے

لیکن اُن کے بزرگوں میں سے کوئی بادشاہ سلامت کے حقّہ بردار ضرور رہے تھے جو اپنے حقّے کی آواز کی مناسبت سے گُڑ گُڑ بیگ کہلاتے تھے۔ اور اس لئے محل کے ماحول سے اور محل کی زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ غدر کے بعد جب انگریزوں نے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلا وطن کیا تو بادشاہ کے حقّہ بردار نے کھلم کھلا انگریزوں کا ساتھ دیا اور بادشاہ کے بہت سے راز اور بہت سے خزانے انگریزوں کے سامنے ظاہر کر دیئے جس کے انعام میں انگریزوں نے بہت سی شاہی جائداد اُن کے نام کر دی۔ اور اعلان کر دیا کہ شہزادہ گل گل بیگ (گُڑ گُڑ بیگ) بنا دیا گیا تھا، اُن اصل شہزادوں میں سے ایک ہیں جو آخر وقت تک برٹش گورنمنٹ کے وفادار رہے اب جب کہ وہ صاحب جائداد ہو گئے تھے، انھوں نے اور ان کے بیٹوں پوتوں نے اس جائداد کو سوا سو برس میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ایک حویلی گلی قاسم جان میں اور ایک حویلی گلی ماران میں۔ ایک باغ سبزی منڈی میں۔ (جو اب مغل باغ کہلاتا تھا)

نئی دہلی بننے کا اعلان ہوتے ہی انگریز افسر کے اشارے پر انھوں نے زمین کے بہت سے ٹکڑے خرید لئے۔ اب وہاں اونچی اونچی بلڈنگیں بن گئی تھیں۔ "مرزا ٹیرس"، "مغل پیلس ہوٹل" اور "حویلی اپارٹمنٹس"۔ چند عمارتیں اور بھی تھیں جو یا تو مرزا مغل بیگ کی اپنی تھیں یا جن میں اُن کا بڑا حصہ تھا۔

اُن کا اپنا گھر "گُڑ گُڑ محل" (جس کا نام انھوں نے اپنے جدِ امجد کے نام پر رکھا تھا۔ ایک فرانسیسی آرکی ٹیکٹ نے مغل اسٹائل میں تعمیر کیا تھا۔ اس لئے اس میں مغل نفاست اور نزاکت کے ساتھ یورپین Functionlism کا امتزاج تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھنے میں مغل پیلس لگتا تھا لیکن اندر مشینوں اور شیشے سے کام لے کر بیڈ روم، ڈرائنگ روم، باتھ روم وغیرہ بنائے گئے تھے۔ اس گھر میں بس ایک ہی کمی تھی۔ مرزا مغل بیگ کا کوئی جانشین نہیں تھا۔ ایک بچہ تھا جو گورنس کی غفلت سے یا اس کے بجائے تقاضا کی سے چھ مہینے کی عمر میں ہی کھو گیا تھا۔

مغل بیگ نے تقریباً ایک لاکھ روپے تو بچے کو ڈھونڈنے میں لگا دیئے تھے لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ یہاں تک کہ پانچ سال بعد جب ایک دن وہ جم خانہ کلب میں رمی کھیل رہے تھے اور بیگم صاحبہ گھر میں ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھیں تو اُن کو گھر سے ٹیلی فون آیا۔

"کون شہناز؟ ابھی کتنی بار کہا ہے کہ جب ہم گیم کھیل رہے ہوں تو ٹیلی فون نہ کیا کرو۔ یہاں ہزاروں کی بازی لگی ہوئی ہوتی ہے۔"

مگر شہناز بیگم کا جواب پا کر وہ اچنبھے میں رہ گئے۔ "بھاڑ میں جائے تمہاری ہزاروں کی بازی، ہمارا شہزادہ مل گیا ہے۔"

"ہمارا شہزادہ مل گیا ہے؟ کہاں ملا؟"

"بمبئی میں ہے۔ وہاں ہمیں خود جانا پڑے گا۔ اُسے لانے کے لئے پولیس کمشنر کے نام ایک لیٹر آف انٹروڈکشن لے لینا۔"

اگلے دن سویرے ہی وہ ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچ گئے۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک اور ماں نے دعویٰ کیا ہے کہ بچہ اُس کا ہے۔ وہ لوگ بھی بڑے با اثر معلوم ہوتے ہیں کسی شپنگ کمپنی میں انجنیئر ہیں۔

معاملہ کورٹ میں پہنچا۔

مسز لکشمی جے سُوریہ کو بلایا گیا۔

"آپ کا نام؟" سرکاری وکیل نے پوچھا۔

"مسز لکشمی جے سُوریہ۔"

"آپ کا دھرم؟"

"ہندو۔ برہمن۔"

"معاف فرمائیے گا۔ آپ شادی شُدہ ہیں؟"

"جی، کیا مطلب؟ میرے شوہر جے سُوریہ ہیں شپنگ انجنیئر۔"

"صرف جو بات پوچھی جائے اُس کا جواب دیجئے۔ کتنے سال ہوئے آپ کی شادی کو؟"

"جی چار برس نہیں نہیں، پانچ برس۔"

"ٹھیک ٹھیک بتائیے۔"

"ٹھیک یاد نہیں۔ کوئی چار پانچ برس ہوئے ہوں گے۔"

"اپنی شادی کی تاریخ آپ کو یاد ہے؟"

"جی تاریخ تو یاد ہے اُدم کے دن ہماری شادی ہوئی تھی۔ میناکشی مندر میں۔"

"میں صرف تاریخ اور سن پوچھ رہا ہوں۔ شادی کہاں ہوئی تھی یہ میں نے ابھی نہیں پوچھا۔ کس سن میں آپ کی شادی ہوئی تھی۔ یہ آپ کو یاد نہیں؟"

"ہاں، سن یاد نہیں۔"

"اگر ٦٧ء میں آپ کی شادی ہوئی کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ شادی سے پہلے ہی آپ ماں بن چکی تھیں؟"

"جی نہیں ہماری شادی ٥٧ء میں ہوگی۔"

"ہاں اگر ٥٧ء میں ہوئی ہے تو ٹھیک ہے آپ کو تو یاد ہی نہیں۔ کیا میناکشی مندر میں کوئی ریکارڈ رہتا ہے شادیوں کا؟"

"جی نہیں۔ میرے خیال میں تو ریکارڈ نہیں رہتا۔"

"کیا اسی لئے آپ نے میناکشی مندر چُنا اپنی شادی کے لئے۔ میناکشی مندر کہاں ہے؟"

"مدورا میں۔"

"شادی کے لئے اتنی دُور آپ گئیں، ... میں موجود۔ خیر یہ کیسے ہوا کہ چھ مہینے بعد ہی آپ کا بچہ کھو گیا؟"

"جی وہ آیا لے کر بھاگ گئی تھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ نیوایئر ڈانس ہو رہا تھا اور جب ہم آئے تو آیا بچے سمیت غائب تھی۔"

"آپ نے پولیس میں رپورٹ کی تھی؟ ریکارڈ میں ہونی چاہئے۔"

"جی نہیں، رپورٹ شاید نہیں کی تھی۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اس میں بدنامی تھی۔"

"بدنامی کیوں ہوتی؟"

"کیوں کہ بچہ ذرا جلد ہو گیا تھا —— Premature birth کہتے تھے ڈاکٹر۔"

"کون سے ڈاکٹر صاحب؟"

"ڈاکٹر۔ نام تو یاد نہیں۔"

"شادی کی تاریخ آپ کو یاد نہیں، ڈاکٹر کا نام آپ کو یاد نہیں۔ دُودھ کتنے دن پلایا تھا آپ نے؟"

"دُودھ تو آج کل کوئی نہیں پلاتا۔"

"یقین ہے آپ کو؟ اگر میں لاکھوں عورتوں کو یہاں بُلا کر یہی سوال پُوچھوں کہ انھوں نے اپنے بچے کو دودھ پلایا یا نہیں؟"

"وہ معمولی عورتیں ہوں۔ میرا مطلب تھا کہ سوسائٹی لیڈیز میں کوئی دُودھ نہیں پلاتا۔"

"لیڈی سوسائٹی سے آپ کی کیا مُراد ہے؟"

"لیڈیز جو ہائی سوسائٹی کو Belong کرتی ہیں۔"

"ہائی سوسائٹی کا مطلب؟"

"جو لوگ امیر ہیں۔ خوش حال ہیں۔ جن کے شوہر بڑی پوزیشن رکھتے ہیں۔"

"اچھا، تو آپ کے شوہر کو بُلانا پڑے گا۔"

مسٹر جے سوُر یہ کو گواہوں کے کٹہرے میں پیش کیا گیا۔

"آپکا نام؟"

"ساکانت جے سوُریہ۔"

"کتنے عرصے سے آپ گولڈن شپنگ کمپنی میں ہیں؟"

"کوئی تین برس سے۔"

"اس سے پہلے کہاں تھے؟"

"وزیاگ پٹنم شپنگ یارڈ میں انجنیئر تھا۔"

"کیا تنخواہ ملتی تھی؟"

"وہاں دو ہزار ماہوار۔"

"یعنی اب زیادہ ملتی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کتنی ملتی ہے؟"

"چار ہزار روپے ماہوار۔ فلیٹ اور فرنیچر کا کرایہ علیحدہ ہیں۔"

"یعنی چھ ہزار کے قریب ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں مگر انکم ٹیکس میں چار ہزار پر ہی دیتا ہوں۔"

"وزیاگ پٹنم آپ نے کیوں چھوڑا؟"

"بمبئی سے بہتر آفر آگئی۔"

"کوئی اور وجہ نہیں تھی؟"

"جی ایک انکوائری ہوئی تھی۔ اِس میں کچھ غلط فہمیاں تھیں۔"

"اُن کی بنا پر آپ کو مُعطل کیا گیا تھا؟"

"ہاں آپ کہہ سکتے ہیں۔ دراصل میں خود بھی استعفٰی دینے کی سوچ رہا تھا۔"

"مگر پھر بھی آپ کو مُعطل کیا گیا؟ سچ سچ بتائیے۔"

"جی۔ ہاں۔"

"کِس کمپنی کا نام لیا گیا تھا، اِس انکوائری میں جس کی بنا پر آپ کو مُعطل کیا گیا؟"

"یاد نہیں۔ میں نے کہا نہیں کہ وہ غلط فہمیوں کی بنا پر تھا۔"

"میں یاد دلاتا ہوں آپ کو کیا گولڈن شپنگ کمپنی کا نام لیا گیا تھا اِس انکوائری میں؟"

"جی شاید۔"

"شاید نہیں۔ ٹھیک ٹھیک بتائیے۔ ورنہ مجھے کورٹ سے کہہ کر گورنمنٹ کا ریکارڈ منگوانا پڑے گا۔ یا مینا کشی ٹیمپل کی طرح وہاں بھی ریکارڈ نہیں رکھے جاتے؟ کہئے گولڈن شپنگ کمپنی ہی تھی یا نہیں؟"

"جی ہاں۔ شاید گولڈن شپنگ کمپنی ہی تھی۔"

"شاید نہیں۔ یقیناً۔"

مجسٹریٹ نے وکیل سے پوچھا۔ "آپ ان سوالوں سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

"جناب والا، میں مسٹر جے سوُریہ کا کیریکٹر دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ ماں باپ بننے کے قابل ہیں کہ نہیں۔ بس ایک سوال اور ہے۔ مسٹر جے سوُریہ آپ نے اپنی آیا کے خلاف پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں درج کرائی؟"

مسٹر جے سوُریہ اِس سوال کے لئے تیار نہیں تھے۔ بوکھلا گئے۔ "جی وہ بات یہ تھی کہ ..." کہتے کہتے رُک گئے۔

"ہاں ہاں، بات کیا تھی؟"

"میں اس کو provoke نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"یعنی وہ ایسی باتیں جانتی تھی جو آپ کے کیریر کو تباہ کر سکتی تھیں۔"

"جی ہاں یہی سمجھئے۔"

"کیا آپکے اُس آیا سے کچھ خاص قسم کے تعلقات تھے؟"

"جی نہیں۔"

"ٹھیک ٹھیک بتائیے ورنہ آپ کو تو ہینِ عدالت کے الزام میں بھی دھرا جا سکتا ہے۔"

"جی ہاں۔ یہی سمجھئے۔"

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ وہ آپکے بچے کی ماں بننے والی تھی؟ اگر آپ پولیس میں رپورٹ کرتے تو وہ بات کھل جاتی۔"

مسٹر جے سوُریہ کا رنگ اُڑ گیا۔

"جی ہاں یہی سمجھئے۔"

"مطلب یہ کہ آپ نے اپنے بچے کو قربان کر دیا اپنے کیریر کی خاطر۔ اِس وقت آپ کا خیال ہوگا کہ دوسرا بچہ ہو جائے گا۔ مگر آپکے کوئی دوسری اولاد نہیں ہوئی۔"

"نہیں۔"

"یہ آپ کو قدرت کی طرف سے سزا ملی۔ بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

اب نواب مغل مرزا اور اُن کی بیگم کی باری تھی۔

پہلے بیگم صاحبہ عدالت کے سامنے پیش ہوئیں۔

"آپ کا نام؟"

"مسز شہناز بیگم مغل مرزا۔"

"کیا عمر ہے؟"

"عورتوں کی عمر نہیں پوچھا کرتے۔ یہ بیڈ مینرز کہلاتا ہے۔"

"بیگم صاحبہ، یہ عدالت ہے۔ یہاں آپ کی سوسائٹی کے مینرز نہیں چلتے۔ ٹھیک ٹھیک بتائیے کیا عمر ہے؟"

"کوئی پینتیس چھتیس کی ہوگی۔"

"اگر میں کہوں کہ آپ کی عمر پینتالیس سال

لگے تو آپ کیا کہیں گی؟"
"یہی کہوں گی کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں
میں چالیس سال سے ایک برس بھی زیادہ نہیں
ہوں۔"
"تھینک یو! میں بھی یہی جاننا چاہتا تھا۔
آپ کی شادی مرزا سے کس عمر میں ہوئی؟"
"جب میں تیس برس کی تھی۔"
اور آپ کے شوہر؟ وہ کتنے سال کے تھے؟"
"وہ کوئی باون برس کے ہوں گے۔"
"یہ آپ کی پہلی شادی تھی؟"
"جی نہیں۔" بیگم نے دھیمے سے کہا: "یہ میری
دوسری شادی تھی۔"
"آپ کوئی بچہ بھی ساتھ لائی تھیں؟"
"جی ہاں! ایک لڑکا۔"
"کیا عمر ہے اُس کی اب؟"
"ماشاءاللہ اٹھارہویں برس میں ہے۔"
"وہ کیا کرتا ہے؟"
"اپنے ابا کا ہاتھ بٹاتا ہے اُن کے بزنس میں۔"
"تنخواہ کیا ملتی ہے؟"
"تنخواہ کیوں ملتی۔ برابر کا پارٹنر ہے اپنے
باپ کا۔"
"مگر مرزا صاحب اُس کے باپ تو نہیں ہیں؟"
"اب تو وہی ہیں۔ اور کسی باپ کو وہ جانتا
ہی نہیں۔"
"آپ کے پہلے شوہر کیا کرتے تھے؟"
"اس سے آپ کو کیا لینا ہے؟"
مجسٹریٹ صاحب نے بیگم صاحبہ کو تنبیہہ کی
کہ وکیل صاحب کے سوالوں کے صاف صاف جواب
دیں۔
"اُن کی ہوٹل کی بزنس تھی۔"
"ہوٹل کی بزنس۔ کیا نام تھا اُن کے ہوٹل کا؟"
"اُن کے ہوٹل کا نام۔ اُن کے ہوٹل کا نام
در اصل وہ اُن کا ہوٹل نہیں تھا۔ اُسے وہ پارٹنرشپ
میں چلاتے تھے۔"
"اُن کا پارٹنر کون تھا؟"
"اُن کے پارٹنر تھے مرزا مغل بیگ۔"

"یعنی آپ کے موجودہ شوہر؟"
"جی ہاں۔"
"تو آپ کی ملاقات مرزا صاحب سے پہلے سے
ہو گی؟"
"ہاں۔ ہوٹل میں تو آتے جاتے ملاقات ہو ہی
جاتی تھی۔"
"اگر میں کہوں کہ آپ کے پہلے شوہر آپ کے
موجودہ شوہر کے پارٹنر نہیں تھے بلکہ ملازم تھے۔
تو کیا یہ غلط ہو گا؟"
بیگم صاحبہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بولیں
"جی ہاں۔ آپ ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔ در اصل وہ
ایک قسم کے مینجر تھے۔"
"اچھی طرح یاد کیجئے مینجر تھے یا نان بائی تھے؟"
"تو کیا ہوا؟ مسلمانوں میں ذات پات نہیں
چلتی۔ اُن کے ہاتھ میں ہنر تھا۔"
"وہ تو ظاہر ہے۔ ننھے میاں کے نان کی
شہرت تو بمبئی تک پہنچ چکی تھی۔ جب اُن کے
انتقال کی خبر پڑھی تو ہم کو بھی افسوس ہوا تھا۔
یہ حادثہ کیسے ہوا؟"
"اللہ کی مرضی۔ نان نکال رہے تھے کہ ایک
دن تندور میں جا گرے۔"
"اُس روز پہلی رپورٹ جو پولیس میں
دی گئی تھی اُس میں تو لکھا ہے کسی نے اُنھیں پیچھے
سے دھکا دیا تھا۔"
بیگم صاحبہ اپنے سابق شوہر کی موت کے ذکر
کو برداشت نہ کر سکیں۔ آبدیدہ ہو گئیں اور عطرِ
حنا سے معطر ایک فرانسیسی لیس کا رومال نکال کر
اُنھیں اپنے آنسو پونچھنے پڑے۔
"معاف کیجئے گا بیگم صاحبہ کبھی کبھی عدالت
میں بڑے تکلیف دہ سوال کرنے پڑتے ہیں۔
مگر دہلی کی عدالت میں یہ معاملہ یا حادثہ کافی دنوں
تک کھنچا تھا۔ مرزا صاحب کو بھی عدالت میں پیش
کیا گیا تھا۔"
"جی ہاں۔ مالک کی حیثیت سے گواہی دینی
پڑی تھی اُنھیں بھی۔"
وکیل نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا: "گواہ

کی حیثیت سے نہیں ملزم کی حیثیت سے۔"
اُس کی نگاہ اب نواب مغل مرزا پر گئی جو
گھبرا کر اپنی کرسی سے اُٹھ رہے تھے: "نواب صاحب
تشریف رکھئے۔ ابھی آپ سے چند سوال کرنے ہیں
مرزا صاحب نے بھی اپنی جیب سے ایک سفید
رومال نکالا اور اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگے۔
اب نواب مرزا مغل کو گواہوں کے کٹہرے
میں پیش کیا گیا۔
"آپ کا نام؟"
"آپ جیسے نہیں جانتے۔"
پھر بھی آپ کی زبان سے آپ کا نام جاننا
چاہتا ہوں۔"
"نواب مغل مرزا دہلوی۔"
"یہ مغل مرزا عجیب نام معلوم ہوتا ہے۔"
"ممکن ہے آپ کو عجیب نام معلوم ہوتا ہو۔
کتنے اور مرزاؤں کو جانتے ہیں؟"
"میں تو ایک ہی مرزا کو جانتا ہوں مرزا
اسد اللہ خاں غالب کو۔ اُن کو تو آپ بھی جانتے
ہوں گے؟"
"غالب کو کون نہیں جانتا!"
"اِس لئے کہ غالب سخن فہم اور عظیم
شاعر تھے۔ کوئی حقہ بردار نہیں تھے۔"
"کیا مطلب؟"
"آپ کے جدِ امجد کا نام کیا تھا جو بادشاہ
کے رنگون جلاوطن ہونے کے بعد دہلی میں تر
کی منزلیں طے کر رہے تھے؟"
"مرزا گل گل بیگ۔"
"ایک گل تو ہم سمجھے۔ گل کے معنی گلاب کے پھول
کے ہوتے ہیں۔ اور وہ گل بھی ہوتا ہے جو حقہ میں استعمال
کیا جاتا ہے۔"
"حقہ سے اِس کیس کا کیا تعلق ہے؟"
"حقہ سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا تندور
ہے۔ جہاں روٹیاں اور نان سینکے جاتے ہیں اور
میں کسی وقت انسان کو پھینک دیا جائے تو تندور
کباب بن جاتے ہیں۔ نواب صاحب بڑی اونچی سوسا
میں گھومتے تھے منسٹروں کے ساتھ تاش کھیلتے تھے۔ اسی وجہ سے اِس

ستعمال کرکے انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا: یور آنر،
پنے وکیل کو سمجھائیے۔ سنبھل کے سوال جواب کرے
ورنہ۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟" وکیل نے جلدی سے
ہا: اس کے بھی کباب بنا دیئے جائیں گے؟"

اور پھر اُس نے مجسٹریٹ سے کہا: یور آنر
ں جو الفاظ استعمال کر رہا ہوں، یہ دہلی کی پہلی
لت کی رپورٹ میں موجود ہیں۔ اگر سیشن کورٹ
ں مرزا صاحب کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے رہا
دیا گیا تھا۔ مگر صرف Benefit of doubt
یتے ہوئے شک تو بہر طور رہا اور رہے گا۔"

یہ سب سُن کر نواب صاحب دھیمے پڑے
یل نے اب ترپ کا اِکّا نکالا۔ "آپ کے نان بائی
حادثہ کس سال میں ہوا تھا؟"

"۱۹۶۰ء میں۔"

"شاید اپریل کا مہینہ تھا؟"

"شاید۔" نواب صاحب نے اقرار کیا۔

اور پہلی مئی کو آپ کی شادی خانہ آبادی
م نان بائی کی خوب صورت بیوہ سے ہو گئی اور
ت پانچ مہینے بعد اُن کی گود میں ایک بچہ کھیلنے لگا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے! وہ پہلے بھی شادی
ہ تھی۔"

"مگر عدالت میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے
ں سوری کی موت سے چھ مہینے پہلے سے شہناز
کے تعلقات اپنے شوہر کے ساتھ منقطع ہو چکے
ے۔"

نواب صاحب کو پسینہ آ رہا تھا۔ وہ اپنی
ب رُومال نکال رہے تھے۔ رُومال نکال کر وہ
ی پونچھنے لگے۔

"معاف کیجیے نواب صاحب کہ مجھے بعض ذاتی
ال پُوچھنے پڑے۔ اب آپ تشریف رکھ سکتے
۔ اب میں بیگم صاحب کو پھر تکلیف دوں گا۔"
بیگم صاحبہ پھر گواہوں کے کٹہرے میں پیش
ں۔

"بیگم صاحبہ، آپ کا کہنا ہے کہ یہ بچہ آپ کا کھویا
بچہ ہے؟"

"جی ہاں۔ مگر۔"

"کچھ شک ہے آپ کو؟ آپ کا بچہ کیسے اور
کب کھویا گیا تھا؟"

"کوئی آٹھ مہینے کا ہوگا۔ اُس وقت وہ
یہ نومبر ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ اس کی گورنیس مس ولیم
حسبِ معمول اُس کو پرام میں بٹھا کر پارک میں لے
گئی تھی۔

وہاں پارک کے ایک بنچ پر وہ بیٹھ گئی اور
پرام اپنے قریب کر لیا۔ وہاں اُس کی آنکھ لگ گئی۔
جب آنکھ کھلی تو پرام خالی تھا۔ بچہ اُس میں نہیں
تھا۔ جب مجھے پتہ چلا تو میں نے پولیس میں فون کیا۔
نواب صاحب کو کلب میں فون کیا۔ وہ پولیس افسر
کو ساتھ لے کر آئے۔ اُنھوں نے مجھ سے اور نواب
صاحب سے پوچھا کہ آپ کو کس پر شبہ ہے؟ ہم نے
کہا کہ بچے کو اغوا تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر یقین کے ساتھ
نہیں کہا جا سکتا۔ خدا نے کھیلنے کے لئے ایک کھلونا
دیا تھا۔ شاید اب واپس لے لیا۔"

"روزانہ کتنے وقت کھیلتی تھیں اُس کھلونے
سے آپ؟"

"کوئی وقت مقرر تھوڑا ہی تھا۔ جب وقت
ملتا تھا میں نرسری میں ہو آتی تھی۔"

"تو بچے کا زیادہ تر وقت مس ولیم کے ساتھ
ہی گزرتا تھا؟"

"ہاں یہ سچ ہے بچے ماں باپ کے لاڈ پیار سے
خراب ہو جاتے ہیں۔ نواب صاحب نے مجھے یہی بتایا
تھا۔ اِس لئے مس ولیم کو گورنیس مقرر کیا تھا۔"

"اب مس ولیم کہاں ہیں؟"

"وہ انگلینڈ واپس چلی گئی ہیں۔"

"بس اب مجھے کوئی سوال نہیں کرنا۔"

بیگم صاحبہ اپنی اونچی ایڑی کے جوتوں کو
کھٹکھٹاتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

"اب حضور، فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ کون سی
ماں اِس بچے کی جائز حق دار ہے۔"

وکیل مجسٹریٹ سے یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باہر سے
کچھ ہنگامے کی آوازیں آئیں۔ اگلے ہی لمحے ایک عورت
جو شکل و صورت سے بھکارن لگتی تھی اور شاید پاگل

بھی۔ میلی کچیلی، پھٹی ہوئی ساڑی پہنے عدالت میں بھیڑ
کو چیرتی ہوئی آگے آ گئی۔

"حضور ہماری عرض بھی سُن لیں۔ یہ بچہ ہمارا
ہے۔ پولیس نے زبردستی ہم سے چھین لیا اور کہا تو چرا کر
لائی ہے بچے کو۔ بعد میں کہہ دیا کہ تمھاری ماں تو مر گئی۔"

"تم کچھ بیان دینا چاہتی ہو تو گواہوں کے
کٹہرے میں آؤ۔ اور کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔" وکیل نے
اُس سے کہا اور پھر مجسٹریٹ سے مخاطب ہوا۔

"جنابِ والا، اب تک دو مائیں تھیں، اب
تین ہو گئی ہیں۔ اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔ میں اِس
سے بھی سوال کرتا ہوں۔"

"اپنا نام بتاؤ۔"

"بھکارن حضور۔ بچپن سے یہی نام سُنتا ہے۔"

"تمھارا دھرم اور ذات کیا ہے؟"

"حضور، دھرم میرا روٹی کا ٹکڑا ہے اور ذات
سے بھکارن ہوں۔"

"بچہ تمھارے پاس کیسے آیا؟"

"بچہ جیسے آتا ہے، حضور، ویسے ہی آیا۔ میری
کوکھ سے نکلا۔"

"کیا تمھاری شادی ہوئی ہے؟"

"حضور بھکاریوں کے شادی بیاہ کہاں ہوتے
ہیں؟ مگر ایک بڑا خوب صورت سا صاحب ایک رات
میرے پاس آیا۔ نشے میں دُھت تھا۔ کہنے لگا بھکارن
تجھے کیا چاہیے۔

میں نے کہا ایک بچہ۔ کہنے لگا: ایک بچہ؟ اور
پیسہ نہیں چاہیے۔ ساڑی بھی نہیں چاہیے۔ میں نے
کہا۔ اب نہیں مجھے تو بس ایک بچہ چاہیے۔ کیوں کہ
بچے کے بنا لگتا ہے کہ میں ادھوری ہوں۔"

"تم نے اُس سے کتنا روپیہ لیا؟"

"روپیہ کیوں لیتی۔ صاحب کی مہربانی سے
میں ادھوری سے پوری ہو گئی۔ سرکار، عورت بچہ
جننے کے بعد ادھوری ہوتی ہے نہیں تو اس کا جیون
ادھورا ہی ہوتا ہے۔"

"وہ صاحب تمھیں پھر ملا؟"

"نہیں صاحب۔ میں نے اُس سے ملنے کی
کوشش نہیں کی۔ مگر پھر بھی اُس کی آبھاری ہوں۔"

"کہاں ہے تمہارا بچہ؟" وکیل نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"وہ ہے" بھکارن چلائی اُدھر اشارہ کرتے ہوئے نئے کپڑے پہنے بچہ کورٹ میں بیٹھا یہ سب باتیں سُن رہا تھا۔

جرح ختم ہو گئی۔

وکیل نے مقدمے کا خلاصہ سُناتے ہوئے کہا "یور آنر یہ حضرت سلیمان کے انصاف کی یاد دلاتا ہے۔ وہاں تو دو مائیں تھیں جو ایک ہی بچے کی ماں بننے کا دعویٰ کر رہی تھیں۔ یہاں تین مائیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا کہنا ہے کہ بچہ اُس کا ہے۔ ایک بمبئی کے بڑے انجینئر کی بیوی ہے۔ ایک دہلی کے رئیس کی بیوی ہے۔ ایک بھکارن ہے۔ حضرت سلیمان نے انصاف یہ کیا تھا کہ دونوں ماؤں سے کہا تھا کہ بچے کو تلوار سے آدھا کر کے دونوں کو آدھا آدھا دے دیا جائے۔ فوراً ہی جس عورت نے اس کار سوائی سے بچے کو بچانے کی بات کہہ دیا کہ وہ بچے کی ماں نہیں ہے وہی اُس کی اصلی ماں قرار دی گئی۔ لیکن ہم اِس بچے کے تین ٹکڑے کرنے کو بھی نہیں کہہ سکتے۔ اِس لئے کوئی اور فیصلہ کرنا پڑے گا۔ جو اَب میں آپ پر چھوڑتا ہوں"۔

مجسٹریٹ بولا: "ہم سب جانوروں کی اولاد ہیں۔ جتنا چھوٹا ہوگا، اُتنا ہی وہ جانوروں کے قریب ہوگا۔ بچہ ڈرا ہوا ہرن کا بچہ۔ وہ اپنی ماں کو سونگھ سکتا ہے۔ اِس لئے اِس مقدمے کا فیصلہ بھی اِس بچے کی ناک کرے گی"۔

پھر مجسٹریٹ نے بچے سے مخاطب ہو کر کہا: "بچے یہ تین عورتیں کہہ رہی ہیں کہ وہ تمہاری ماں ہیں تم اُن کے قریب جاؤ اُن میں سے ہر ایک کو سونگھو۔ اور جو تمہاری ماں ہے اُس کو پہچان لو"۔

بچہ پہلے مسز جے شوریہ کے پاس گیا۔

"مائی چائلڈ" انھوں نے کہا اور اُسے اپنے گلے لگا لیا۔ اُن کی چھاتی سے اور اُن کی ساڑی سے بچے کو ایک تیز فرانسیسی سینٹ کی خوشبو آئی۔

"نہیں" اُس نے کہا۔

پھر وہ بیگم منظور مرزا کے پاس گیا۔ انھوں نے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اُن کی اوڑھنی سے اور اُن کے سارے بدن سے عطر حنا کی خوشبو آئی۔ یہ خوشبو بھی بچے کے لئے نئی اور غیر مانوس تھی۔ وہ اُن سے بھی الگ ہو گیا۔

"نہیں" اُس نے پھر کہا۔

بھکارن کی طرف گیا۔ بھکارن نے اِس ڈر کے مارے اُسے گلے نہیں لگایا کہ اُس کے اندر سے میلے کپڑوں اور پسینے کے بھبکے آ رہے تھے۔ لیکن بچے کی ناک کے نتھنے پھڑپھڑا اُٹھے۔ اِس لئے کہ بھکارن کے اندر سے پسینے کی بدبو کے علاوہ ماں کی ممتا کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی آ رہی تھی۔

"ماں" اُس نے کہا اور دوڑ کر گلے لگ گیا۔

بھکارن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے سرکاری وکیل کی آنکھوں میں بھی مجسٹریٹ نے عینک کو رومال سے صاف کرنے کے بہانے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھے انصاف کی دیوی تو اندھی ہوتی ہے۔ اُس میں نہ نظر ہوتی ہے نہ آنسو۔

غزل

ابو البلاغت
پنڈت رتن پنڈوری

موجوں نے ہاتھ دے کے اُبھارا کبھی کبھی
پایا ہے ڈوب کر بھی کنارا کبھی کبھی

کرتی ہے تیغِ یار اشارا کبھی کبھی
ہوتا ہے امتحان ہمارا کبھی کبھی

چمکا ہے عشق کا بھی ستارا کبھی کبھی
مانگا ہے حسن نے بھی سہارا کبھی کبھی

دریائے غم کا ہم کو کنارا نہ مل سکا
دُنیا نے گو کیا ہے کنارا کبھی کبھی

زیبا نہیں ہے آپ کو غیروں پہ التفات
اُٹھے نظر اِدھر بھی خدارا کبھی کبھی

طالب کی شکل میں بھی مطلوب کی جھلک
دیکھا ہے ہم نے یہ بھی نظارا کبھی کبھی

توہینِ حسن تھا مرا مرنا ترے بغیر
گو موت نے تو مجھ کو پکارا کبھی کبھی

یہ بھید کیا ہے راہِ وفا میں نیاز کو
ہوتا نہیں ہے ناز گوارا کبھی کبھی

شوخی ہے حسن کی یہ کہ جذبِ وفا کا سحر
اُس نے ہمیں سلام گزارا کبھی کبھی

گلشن کی آفتوں کا نتیجہ تھا سامنے
اس پر بھی آشیاں کو سنوارا کبھی کبھی

مجھ کو حریمِ ناز میں تو ہوش تک نہ تھا
دعا انہوں نے خود ہی پکارا کبھی کبھی

فریادِ غم روا نہیں دستورِ عشق میں
پھر بھی لیا ہے اس کا سہارا کبھی کبھی

دو روز کے ہم مہمان کے ہنس ہنس کے رو دیئے
فرقت کا وقت یوں بھی گزارا کبھی کبھی

مشکل میں دے سکا نہ سہارا کوئی رتن
ہاں درد نے دیا ہے سہارا کبھی کبھی

इन्द्रप्रस्थ भारती

हिन्दी अकादमी की त्रैमासिक साहित्यिक पत्रिका

संपादक
डा. नारायणदत्त पालीवाल

यदि आप चाहते हैं कि
बेहतर पढ़ने को मिले तो आपकी इस जरूरत को

'इंद्रप्रस्थ भारती'

हिन्दी अकादमी की साहित्यिक त्रैमासिक पत्रिका पूरा करती है, जो महज एक पत्रिका नहीं पूरी किताब है।

जिसमें वर्ष भर में छः सौ पृष्ठों की साहित्यिक [illegible] उपलब्ध कराई जाएगी,
जिसमें देश के विशेषतर लेखक हिस्सेदारी करेंगे।
यह पत्रिका समकालीन साहित्य का रचनात्मक मूल्यांकन और गतिविधियों को प्रस्तुत करती है। एक सौ बावन से अधिक पृष्ठों की इस पत्रिका के एक अंक का मूल्य पांच रुपये, वार्षिक बीस रुपये।

वार्षिक शुल्क मनीआर्डर/चैक/ड्राफ्ट/पोस्टल आर्डर द्वारा इस पते पर भेजें:

सचिव,
हिन्दी अकादमी, दिल्ली
ए-26/27, सनलाइट इंश्योरेंस बिल्डिंग,
आसफ अली रोड, नई दिल्ली-110002.

جمہوریت، سماج واد، سیکولرازم
اتحاد اور سالمیت
امن وامان اور ترقی کے لئے
ہماری مضبوط بنیادیں ہیں۔



p 88/246

کل ہند مشاعرہ

اودے پور اور وزیر

سرور تونسوی

آنکھوں دیکھا کانوں سنا

آج ۲۸ مارچ سنہ ۱۹۴۴ء، سوموار ہے
رات کے ساڑھے نو بجے ہیں۔ بھارتیہ
ہال میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ آس
پاس کے مکانوں کی چھتیں بھی شائقینِ مشاعرہ سے
بھری پڑی ہیں۔ صاحبِ صدر حضرت اعجاز صدیقی
مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ "شاعر" مسندِ صدارت سنبھال چکے
ہیں۔ سامعین بار بار تالیوں سے یاد دہانی کرا رہے
ہیں کہ وقت ہو چکا، مشاعرہ شروع کرائیے۔
پہلے صدر صاحب نے صدارتی تقریر شروع کر دی
ہے جو انتہائی مختصر ہے تاکہ سامعین اور شاعروں
کے درمیان وہ زیادہ حائل نہ رہیں۔ نظامت کے
فرائض جناب نما فاضلی نے سنبھالے ہیں۔ سب
سے پہلے اودے پور کے ایک اچھے شاعر جناب
محمد حسین منیر کو کلام سنانے کے لئے بلایا ہے
منیر صاحب فرما رہے ہیں ؎

"کبوتر ایک بھی لب تک نہ آیا ان کے دانہ و دام کیا
صبح سے بیٹھے ہوئے کو آخر وقت شام آیا
دیکھ کر کان وہ اپنی بانہوں سے لپٹ کے کہنے
یہ بھی شکل ستاروں میں یا سب بے کلام آیا۔"

منیر صاحب نے خراجِ کلام سنا کر خاصی
داد پائی ہے۔ نما صاحب نے بہت اچھے انداز میں
منیر صاحب کو داد دیتے ہوئے جناب عبداللطیف
صاحب لطیف سے کلام سنانے کی درخواست کی
ہے۔ سنیے، لطیف صاحب فرما رہے ہیں ؎

محفل ان کا ہے عارفانہ، نہ شیخ عقوبت کا امتحان کی
وہ مجھ کو پہچانتے ہوئے بھی، وفا کی آزما رہے ہیں
جمال ان کا، شباب ان کا، نہیں خدائی میں کوئی ان کا
کسی کا قسمت بنا رہے ہیں کسی کی دنیا مٹا رہے ہیں
یقین حق کی اگر دیا کہنے والے ان کو نہیں
نہ بس ہر انجمن میں دیکھ کے مسکرا رہے ہیں

لطیف صاحب ابھی داد پانے کے بعد اپنی
جگہ تشریف لے گئے تو نما صاحب نے اودے پور
کے ہی ایک اور شاعر جناب محمد حسین اختر کو کلام

سُنانے کی دعوت دی ہے۔ اختر صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

چشمۂ کوثر ہے ساقی تیرے پیمانے کا نام
قصرِ فردوسِ بریں ہے تیرے میخانے کا نام
چشمِ عرفانِ بصیرت میں ہے تو جلوہ نما
سجدہ گاہِ قدسیاں ہے تیرے کاشانے کا نام
ایک ہی جلوے میں تو نے کھو دیے ہوش و حواس
اب نہ لینا طور پر موسیٰ کبھی جانے کا نام

اختر صاحب نے اس غزل کے بعد ایک اور غزل سنائی ہے

ع۔ "ترا مست تیرے خیال میں غمِ دو جہاں سے گزر گیا"

اور مناسب داد پا کر اپنی جگہ چلے گئے ہیں۔ جناب نریش کمار شاد کی حالت کو دیکھتے ہوئے ندا فاضلی نے اچھا ہی کیا کہ شاد صاحب سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ نریش کمار شاد کھڑے ہو کر مائیک پر فرمانے لگے کہ سب سے پہلے میری شکل دیکھ لیجئے تاکہ میں بیٹھ کر پڑھ سکوں کیونکہ میری.... طبیعت واقعی خراب ہے۔ کچھ تھی ہی' اور کچھ میں نے کی ہوئی ہے۔ ان کی صاف گوئی اور صورت بین حالت پر سب "بر محل" قہقہے لگے ہیں بیٹھے صاحب فرما رہے ہیں ؎

ہر کلی مستِ خواب ہو جاتی
پتی پتی گلاب ہو جاتی
تو نے ڈالیں نہ مہرباں نظریں
ورنہ شبنم شراب ہو جاتی۔

داد پانے کے بعد قطعہ ارشاد فرمایا ہے ؎

جب یہ پوچھا گیا پتنگے سے
حسن جلوے میں یا نگاہ میں ہے
شمع کو دیکھتے ہوئے بولا
غالباً سوزِ بے پناہ میں ہے

شاد فرما رہے ہیں کہ ہمارے لئے ایک بات مشہور ہے کہ شراب پی کر شاعری کرتے ہیں۔ مگر واقعتاً یہ بات نہیں ہے۔ سنئے ؎

شعر گوئی کو کیا شراب سے نسبت
میکشی محض میری عادت ہے
لیکن اے دوست شاعری میری
میرے احساس کی عبادت ہے

شاد آج کلام سنانے کے موڈ میں ہے۔ لیجئے، آپ بھی کچھ سن لیجئے ؎

زہر کو جام کی ضرورت کیا
سرخوشی کی نبات کافی ہے
ایک شاعر کی جان لینے کو
ایک عورت کی ذات کافی ہے

داورِ حشر دیکھتا کیا ہے
میں وہی رندِ لاابالی ہوں
اس سے پہلے کہ تو سوال کرے
میں خود اک جام کا سوالی ہوں

میرے شعروں کا ماجرا مت پوچھ
یہ ندی دو رخوں سے بہتی ہے
ایک مصرعہ شعور لکھتا ہے
ایک مصرعہ شراب لکھتی ہے

داد قرآن قطعات کا حق ہے لہٰذا داد کا شور روزِ قیامت کے شور کو بھی مات کر رہا ہے اور جناب شاد اب ایک غزل سنا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ٹوٹ جائے غمِ دوراں سے یہ امکاں تو نہیں
میرا دل ہے کسی معشوق کا پیماں تو نہیں
شاعری خونِ جگر کا ہے لبالب ساغر
کسی کم ظرف کی تفریح کا ساماں تو نہیں
زندگی تیرا بہر حال ارادہ کیا ہے
تو مری جان، مری جان کی خواہاں تو نہیں

صدر فرما رہے ہیں، کتنی اچھی طرح بنایا ہے شعر کو۔ شاد بے ساختہ فرما رہے ہیں، بن ہی گیا ہے صاحب۔ اس پر ایک قہقہہ لگا ہے۔ شاد فرما رہے ہیں ہمارے صدر بہت بڑے شاعر ہیں اور خود بھی شاعر نکالتے ہیں۔ اس کے بعد مقطع ارشاد فرمایا ہے ؎

تیری دعوت کو یہاں شاد کوئی کیا سمجھے
چاک دل ہی تو ہے چاکِ گریباں تو نہیں۔

غزل پر داد پانے کے بعد شاد صاحب کہتے ہیں کہ اگر آپ تھوڑی سی تکلیف برداشت کریں ایک چھوٹی سی نظم سناؤں۔ ہوا یوں کہ میرے گھر کے سامنے سے ایک لڑکی اغوا ہو گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ لڑکیاں بھی ہوتی ہیں اور لڑکیاں اغوا بھی ہوتی ہیں۔ مگر میری بیوی کی اس سے دوستی تھی اس نے کہا کہ بڑے شاعر بنے پھرتے ہو۔ اس لڑکی پر نظم کہو۔ تو سنیئے "ایک عام سی لڑکی"۔

وہ ایک عام سی لڑکی ہے دیکھ کر جس کو
نہ جانے کیوں مجھے ایسا خیال آتا ہے
کہ اس کے ہنسنے کا انداز یہ بتاتا ہے
کوئی نہیں ہے غمِ دل سے رسم و راہ ابھی
پڑی نہیں کوئی چوٹ ابھی رگِ جاں پر
کسی نگاہ سے الجھی نہیں نگاہ ابھی
وہ ایک عام سی لڑکی ہے جیسے چھائی ہوئی
مرے جوان خیالوں پہ بیخودی کی طرح
خیال آتا ہے کہ پھول بننے والی ہے
وہ کم سنی کہ جو منہ بند ہے کلی کی طرح
وہ دے گی گل تو بچھڑے گی غنچے کی طرح

نظم کے بعد فرمانے لگے کہ میں شرد تو نہ سے بہت ڈرتا ہوں۔ مگر ان کی دوستی کی نذر قطعہ کرتا ہوں ؎

بے غرض دوستوں کی ہمراہی
کس قدر پر خلوص و سادہ ہے
یہ وہ انمول پھول ہیں جن میں
رنگ کم ہے مہک زیادہ ہے

بادہ پیمائیوں میں رات کٹی
نغمہ آرائیوں میں رات کٹی
صبح جاگے تو یہ ہوا محسوس
کتنی تنہائیوں میں رات کٹی

طور پر سب نمائشی تو نہیں
طور کی تہہ میں تیرگی تو نہیں
تو شرافت جسے سمجھتا ہے
وہ کہیں تیری بزدلی تو نہیں

اس کے بعد شاد صاحب نے کسی کا

نظم سُنائی ہے اور داد حاصل بہت پاکر فرمائیے
ب اجازت دیں۔ اگر جو اس بجا ہے تو بسم
لاؤں گا۔ لہٰذا قہقہوں کی آواز میں شاد صاحب
لے جا رہے ہیں اور اناؤنسر نے بہت ہی اچھے
ے جناب منگل سکسینہ سکریٹری ساہتیہ
کو مہندی کو نیتا سُنانے کی درخواست کی ہے
سکسینہ نے بہت اچھی کونیتا سُنا کر خوب خوب
ہے۔ راقم نے کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب
احمد، نیز کئی اناؤنسروں کی اناؤنسنگ مشاعروں
ن ہے۔ اردو اور اس مزاج کو اہمیت
ینے کے موجد کی بھی اناؤنسنگ سُنی ہے۔ مگر جس
ے آج ندا فاضلی اناؤنسر کے فرائض ادا کئے ہے
س کی نوعیت ہی جداگانہ ہے۔ مختصر اور با معنی
ں قدر دل پذیر کہ سامعین شاعر اور کلامِ شاعر
احقہ طور پر واقف ہو جاتے ہیں۔ اچھے شاعروں
ظمین اگر ندا فاضلی کی خدمات اناؤنسر کے لئے
کریں تو یقیناً وہ محسوس کریں گے کہ ان سے
ے کی اہمیت دوبالا ہو گئی ہے۔ لیجئے اب فراز
ں مائیک پر تشریف لائے ہیں اور قطعات سُنا کر
رشاد فرما رہے ہیں ؎

ارباب خرد دیر و حرم دیکھ رہے ہیں
دیوانے ترا نقشِ قدم دیکھ رہے ہیں
گمراہ ہوئے جاتے ہیں یہ کیسا ستم ہے
حالانکہ ترا نقشِ قدم دیکھ رہے ہیں
تقدیر کے بل نکلیں تو کس شکل سے نکلیں
مدت سے تری زلفوں کے خم دیکھ رہے ہیں۔

راجستھان کا یہ نوعمر شاعر قطعات اور غزل
ب خوب داد پاکر اپنی جگہ پر گیا تو اناؤنسر نے
رتن پوری سے کلام سُنانے کو کہا ہے۔ ساحر
ب نے معمولی نوعیت کے قطعات اور غزل سنائی
۔ 'دالو' کو 'دالوں' پڑھتے ہیں۔ لطیف صاحب
ہے ہیں کہ "یہ صاحب تو دون ہی کے ہیں" ساحر
ب اپنے سحر سے سامعین کو مسحور نہ کر سکے تو
ر صاحب نیما پیرو کو سامعین پر چھوڑ دینے
سلے بلایا ہے، مگر محمود صاحب تو خود ہی شمار
خالی میں جیا کچھ جنہی انھوں نے مطلع ؎

یہ حیرانی نہیں جاتی پریشانی نہیں جاتی
الٰہی کیوں جنوں کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

سُنایا تو مجمع اکھڑنا شروع ہو گیا مگر آفرین ہے محمود
صاحب پر کہ انھوں نے پوری غزل سُنا کر ہی دم لیا
ندا صاحب نے بھی سامعین کی پریشانی کو محسوس
کر لیا ہے لہٰذا انھوں نے نہایت ہی مناسب اور
بچے تُلے الفاظ میں رُوحی صاحبہ دہلوی کو کلام عطا
فرمانے کی درخواست کی ہے۔ جناب شفا گوالیاری
نے اپنی صاحبہ سے کسی غزل کی فرمائش کی ہے لہٰذا
وہی غزل عطا ہو رہی ہے ؎

ہم اپنے دل کے مقامات سے ہیں بیگانے
اسی میں ورنہ حرم ہے اسی میں بُت خانے

اس مطلع اول پر جو داد دی گئی ہے، وہ
اس مطلع کا حق ہے۔ داد کا شور تھا تو ارشاد ہوا ؎

کہیں کہیں جو ہیں بدلے ہوئے سے کچھ عنواں
حقیقتاً ہیں یہی زندگی کے افسانے
بقدرِ ظرف ہر اک دل کو رنج ملتا ہے
یہاں سکون سے رہتے ہیں صرف دیوانے

داد نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ صاحبِ صدر
اس شعر کو مکرر پڑھنے کا فرما رہے ہیں۔ سنئے روحی
نغمہ سرا ہیں ؎

یہ غم کے مارے ہوئے آدمی کدھر جاتے
اگر جہاں میں ہوتے نہ آج میخانے

داد ہے کہ یہ شعر اپنا حق وصول کر رہا ہے
داد و ستائش ذرا کم ہوئی تو مقطع ارشاد ہوا ہے ؎

یہی تو چند سہارے ہیں زیست کے روحی
ستارے، پھول، شگوفے، حسین پیمانے۔

معاف فرمائیے مجھ سے بھول ہوئی۔ اور
وہ یہ کہ مشاعرے کے شروع میں متین صاحب کے
بعد جناب صالح محمد ثاقب اودے پوری نے ایک نظم
سنائی تھی جس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے ؎

چمن کے ماہ و سال سے
چمن کی ڈال ڈال سے
چمن کے پات پات سے
چمن کی جمادات سے
چمن کی کائنات سے
قسم خدا کی پیار ہے
چمن کی کائنات پر
نہ آنچ آنے دیں گے ہم

نظم خاصی طویل تھی اور حب الوطنی کے جذبات
سے بھرپور تھی۔ جس پر ثاقب صاحب کو خوب خوب داد
ملی۔

روحی صاحبہ کے بعد اناؤنسر نے جناب محمد علی
صاحب اختر جودھپوری کو کلام سنانے کے لئے کہا ہے
اختر صاحب نے ایک قطعہ سنانے کے بعد غزل ارشاد
فرمائی ہے ؎

وہ زندگی جو تباہ ہو گئی اُسی راہبر کی تلاش ہے
وہ نظر جو مل کے بچھڑ گئی مجھے اُس نظر کی تلاش ہے
ترے کام بس حیات تو مجھے مل گئی غم جاوداں
وہ تری نظر کی تلاش تھی یہ مری نظر کی تلاش ہے
مرے غم کو اپنا بنا لیا مرا درد جس نے سمجھ لیا
مرے حال پر جو ہے نوحہ گر اسی چشمِ تر کی تلاش ہے

اختر صاحب کو مناسب داد ملی ہے مگر ان کو
نظریں سامعین سے شکوہ سنج ہیں کہ بیرونی شاعروں
کی نسبت راجستھان کے شعراء کے ساتھ انصاف
نہیں کیا جا رہا۔ اب جناب ممتاز شکیب تشریف
لائے ہیں۔ ایک اچھا قطعہ سنانے کے بعد انھوں
ہی اچھے ترنم سے یوں غزل چھیڑی ہے ؎

جگر کے خون سے اندھیروں میں زندگی کے لئے
ہر ایک دور میں روشن چراغ ہم نے کئے
جو تجھ پہ آئی کبھی بات تو خدا کی قسم
بہ شانِ عشق ہنسی خوشی مسکرا کے اشک پئے
تجھے خبر نہیں اے زندگی تری خاطر
ہزار بار مرے اور ہزار بار جئے
کریں گے فیصلہ اک روز خود چمن والے
دیا ہے کس نے لہو اپنا فصلِ گل کے لئے
جلا رہے ہیں وہ زندگی میں دل کو شکیب
یہ سوچ کر کہ اندھیرا نہ ہو کسی کے لئے۔

شکیب صاحب کو پوری غزل پر بہت اچھی
داد ملی ہے'

باقی آئندہ

انسان پانی نہیں بنا سکتا پھر وہ اُسے ضائع کیوں کرے؟

پانی زندہ رکھتا ہے، ہر قطرہ قیمتی ہے

احتیاط سے اِستعمال کرنے کے طریقے

۱۔ حوض کا استعمال کم کیجئے۔

—— ہر بار جب آپ بیت الخلاء کو استعمال کرتے ہیں تو ۳ گیلن پانی بہہ جاتا ہے۔ اگر ایک کنبے کے افراد ایک روز میں ۳ بار استعمال کریں گے تو کئی گیلن پانی بہہ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چار افراد کا کنبہ فی روز اس طرح ۳۶ گیلن پانی استعمال کرے گا۔ جب بھی آپ پیشاب کرنے کے لئے بیت الخلاء کو استعمال کریں تو اس مقصد کے لئے پہلے سے رکھے گئے بالٹی سے ۲ مگ پانی استعمال کیجئے۔ ایک پنٹ پیشاب کے لئے ۳ گیلن پانی استعمال کرنا دانشمندی نہیں ہے۔

۲۔ چھوٹی بوتل بچت کرتی ہے۔

فلش ٹائیلٹ میں پانی بچانے کے لئے پانی کو ہٹانا آسان طریقہ ہے۔ پلاسٹک بوتل کو کنکروں سے بھر دیجئے اور ٹائیلٹ ٹینک میں اوپر ٹینک آلات سے دور رکھیئے۔

۳۔ ڈبلیو۔ سی ویسٹ باسکٹ نہیں ہے۔

ہر روز سگریٹ کا ٹکڑا یا چھوٹا کاغذ کا ٹکڑا آپ ڈبلیو۔ سی میں پھینک دیجئے اور فلش کیجئے تو اس کے ساتھ ۳ گیلن پانی فلش ہو جاتا ہے۔ اس پانی کی بچت ہو سکتی ہے اگر ڈبلیو سی میں کچھ بھی نہیں پھینکا جائے۔

۴۔ ٹائیلٹ کو چیک کیجئے۔

کبھی کبھی حوض میں غیر مرئی لیک ہوتا ہے۔ فوڈ کلرنگ کے چند قطرے ڈال دیجئے۔ فلش کے بغیر برتن میں رنگ نظر آئے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ لیک ہے جس سے ہر روز کئی گیلن پانی ضائع ہوتا ہوگا۔ مہربانی کرکے لیک کو بند کیجئے۔

۵۔ نلکے کو مضبوطی سے بند کیجئے۔

ٹپکتا نلکا، یا مضبوطی سے بند نہ کیا گیا نلکہ پانی ضائع ہونے کا موجب بنتا ہے۔ اس لئے استعمال کے بعد مضبوطی سے نلکہ بند کیجئے۔

۶۔ خود کار فلشنگ حوض۔

اگر آپ کے دفتر میں خود کار فلشنگ حوض بیت الخلاء میں ہے تو کام کاج کے اوقات کے علاوہ اس کو باہر سے بند کیجئے۔

اگر پانی بچانے کے لئے آپ کے پاس کوئی تجویز ہے تو بھیج دیجئے۔

جگ پرویش چندر
چیف ایگزیکٹیو کونسلر
دہلی انتظامیہ، دہلی

مستقل کالم

شخصیات، واقعات، تاثرات،

سرور تونسوی

ایلیفنٹ سپلائر

elephant supplier

مشہور فلم ڈائریکٹر کے آصف کو اپنی شہرۂ آفاق فلم "مغلِ اعظم" کے جنگی مناظر فلمانے کے لئے قریباً پچاس ہاتھیوں کی ضرورت تھی۔ لہذا انھوں نے بمبئی میں اپنے مشیروں سے اس سلسلے میں مشورہ کیا کہ جے پور میں جنگی مناظر کی شوٹنگ کے وقت ہاتھیوں کی اتنی بڑی تعداد کو کیسے پورا کیا جا سکتا ہے۔

اتفاق سے سلامت علی مہدی بھی وہاں موجود تھے۔ جھٹ سے کہنے لگے آصف صاحب اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے آپ کو جس قدر ہاتھی چاہئیں میں لکھنؤ سے انتظام کرا دوں گا۔ آصف صاحب نے اس مشکل ترین مسئلے کا حل اس قدر آسانی سے ہوتے دیکھا تو خوش ہو کر فرمانے لگے۔ مہدی صاحب آپ لکھنؤ سے کتنے ہاتھیوں کا انتظام کرا سکتے ہیں؟ سلامت علی مہدی نے بڑے مفکرانہ انداز میں انگلیوں پر کچھ حساب لگاتے ہوئے بڑے گہرے فکر و تردد کے بعد حتمی انداز میں فرمایا کہ چالیس کے قریب ہاتھیوں کا انتظام بخوبی ہو سکے گا۔

آصف صاحب نے فوراً اپنے سیکریٹری عشرت صاحب کو حکم دیا کہ مہدی صاحب کو ہاتھیوں کی بکنگ کے لئے مناسب روپیہ دے دیا جائے اور انھیں فوری طور پر لکھنؤ روانہ کرنے کا بھی انتظام کر دیا جائے۔ اور انھیں جے پور میں شوٹنگ کی تاریخیں بھی بتا دیجئے تاکہ ہاتھی شوٹنگ سے کم از کم چار دن پیشتر پہنچ جائیں۔ تاکہ انھیں جنگی ساز و سامان سے سجایا جا سکے۔

سلامت علی مہدی نے آصف صاحب اور عشرت صاحب کو مزید یقین دلاتے ہوئے ایسا دلاسا دیا کہ گویا ہاتھی ابھی سے جے پور پہنچنا شروع ہو گئے ہوں۔

سلامت علی مہدی ہزاروں روپیہ لئے واپس لکھنؤ آ گئے۔ شراب اور شباب کے رسیا سلامت علی مہدی کی خدا نے سن لی تھی۔ لہذا لکھنؤ میں نوابی انداز کے اللّے تللّوں کے باعث چند دنوں میں [illegible] روپیہ ختم ہو گیا۔

روپیہ ختم ہونے کے بعد سلامت علی مہدی کو ہاتھیوں کی یاد آئی کیونکہ اب شوٹنگ کی تاریخیں سر پر آ گئی تھیں۔ لہذا آپ نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے آصف کو بذریعہ ٹیلی گرام اطلاع دی کہ روپیہ مزید ضرورت ہے کیونکہ ہاتھیوں کے مالک مزید روپیہ مانگتے ہیں۔

آصف صاحب نے ٹیلی گرام ملنے پر عشرت صاحب سے کہا کہ آپ لکھنؤ جائیے اور مزید روپیہ بھی لے جائیے اور ہاتھیوں کی بکنگ اور ہاتھیوں کا وقت پر جے پور پہنچ جانے کے بارے میں تسلی کر لیں۔ لہذا عشرت صاحب نے سلامت علی مہدی کو ٹیلی گرام دیا کہ میں لکھنؤ آ رہا ہوں۔ آپ سب کام پورا کر رکھئے۔

سلامت علی مہدی کو جب عشرت صاحب کا ٹیلی گرام ملا تو انھوں نے فوراً کسی اچھے ہوٹل میں [illegible]

صاحب کی رہائش کے لئے کمرہ بُک کر دیا اور دو چار حوالیوں موالیوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ عشرت صاحب کے ہوٹل میں تم سب کو بلاؤں گا اور تم ہاتھیوں کے بارے میں یہ کہنا جس سے عشرت صاحب کو پورا یقین ہو جائے کہ ہاتھیوں کا مکمل انتظام ہو چکا ہے اور وقتِ مقررہ پر ہاتھی جے پور پہنچ جائیں گے۔

سلامت علی مہدی اور اُن کے حوالیوں موالیوں نے چار باغ لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر عشرت صاحب کا خوب استقبال کیا اور بڑی کر و فر سے عشرت صاحب کو ہوٹل لے جایا گیا۔ چند منٹ بعد سلامت علی مہدی نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ اب عشرت صاحب نہا دھو کر آرام کریں گے، آپ لوگ دوپہر کو اُن کے ہاں آ جائیے اور جتنے جتنے ہاتھی آپ کے ہیں اُن کی تفصیل اُنھیں بتا دیجئے۔ اور جو روپیہ میں نے تمھیں پیشگی دیا ہے وہ بھی اُنھیں بتا دیجئے۔ اور جس قدر روپیہ آپ کو اور درکار ہے وہ بھی ان سے لے لیجئے گا۔ چنانچہ علیک سلیک کرتے ہوئے سلامت علی مہدی نے عشرت صاحب سے اجازت چاہی اور اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لئے ہوٹل سے باہر آ گئے۔ سب ساتھیوں کو اُن کے ڈائیلاگ کی ریہرسل کرائی گئی اور دوپہر کو یہ سب حضرات عشرت صاحب کے کمرہ میں جمع ہو گئے۔

سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے سلامت علی مہدی نے اپنے ایک حواری سے پوچھا: ہاں بھئی تمھارے کتنے ہاتھی ہیں؟ اُس نے جواب دیا۔ کہ حضور میرے آٹھ ہاتھی ہیں جس دن آپ کہیں گے ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے مگر آپ سوچئے آٹھ ہاتھی اور آٹھ ہی ہم مہاوت۔ کالے کوسوں کا سفر۔ راستہ میں کس قدر اخراجات ہوں گے اور آپ نے دیئے ہیں کُل پانچ ہزار۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اتنے روپوں میں کیسے کام چل سکتا ہے۔ کچھ ہُوں ہاں کرنے کے بعد سلامت علی مہدی نے دوسرے صاحب سے ذرا رُعب دار لہجے میں کہا۔ ہاں بھئی تمھارے ہاں کتنے ہاتھیوں کا انتظام ہو سکا ہے۔ دیکھو بھئی تمھاری وہ ہتھنی تو چلے گی نہیں کیوں کہ چلتے وقت اُس کا پچھلا ایک پاؤں لنگڑاتا ہے اُس شخص نے ہاتھ جوڑتے ہوئے نہایت لجاجت سے کہا۔ حضور میں نے تو اپنی سسرال والوں سے بھی ہاتھی جے پور لے جانے کی بات چلا رکھی ہے تاہم بیس ہاتھی ہم لے چلیں گے۔ ہتھنی کے لئے آپ نے یونہی تیخ لگا دی ہے ورنہ وہ بھی ساتھ ہوتی تو اکیس کی تعداد تو ہماری ہی ہوتی۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ اتنے بڑے قافلے کو جے پور تک پہنچنے میں کس قدر اخراجات کی ضرورت ہو گی۔ اور آپ نے ہمیں تھمائی ہے صرف سات ہزار روپلی۔ سلامت علی مہدی نے اُسے ذرا ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ اب بمبئی سے صاحب آ گئے ہیں، تمھاری مرضی کے مطابق روپیہ کا انتظام ہو جائے گا اور اُس کے بعد تیسرے اور پھر چوتھے سے مخاطب ہوئے اور پری پلان کے مطابق بڑی کامیابی سے بات چیت ہوتی رہی اور بیچارے عشرت صاحب دل ہی دل میں خوش کہ واہ واہ اتنے ہاتھیوں کا انتظام ہو گیا۔ لہٰذا اس خوشی میں عشرت صاحب نے سلامت علی مہدی کو اپنے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھلایا اور بیئر بھی پلائی۔

عشرت صاحب نے شام کو فون پر آصف صاحب کو بمبئی اطلاع دی کہ ہاتھیوں کا پورا پورا انتظام ہو چکا ہے۔ میں ہاتھیوں کے ارکان سے مل چکا ہوں۔ لہٰذا میں مزید ادائیگی کرکے آج رات کی گاڑی سے ہی دہلی روانہ ہو رہا ہوں۔ اور کل صبح دہلی سے جے پور چلا جاؤں گا اور آپ کا وہیں انتظار کروں گا۔

آصف صاحب پروگرام کے مطابق اپنا یونٹ لے کر شوٹنگ کے لئے جے پور روانہ ہو گئے۔ اور جے پور پہنچتے ہی سلامت علی مہدی کو ٹیلی گرام دیا کہ فوراً ہاتھیوں کو جے پور کے لئے روانہ کرا دیجئے۔ دوسرے ہی دن آصف صاحب کو سلامت علی مہدی کا ٹیلی گرام ملا کہ ہاتھیوں کا قافلہ جے پور کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ کے۔ آصف نے اطمینان کا سانس لیا اور فوری طور پر احکام جاری کئے گئے کہ ہاتھیوں اور اُن کے مہاوتوں کے لئے رہائش اور خوراک وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔ ہاتھیوں کے جنگی ساز و سامان تیار ہونے لگے۔ دس بارہ دن گزرنے کے بعد کے۔ آصف نے سلامت علی مہدی کو تار دیا کہ ابھی تک ہاتھی نہیں پہنچے۔ سلامت علی کا دو دن بعد جواب بذریعہ تار ملا کہ حکومتِ راجستھان نے اُن ہاتھیوں کو اپنے علاقہ میں داخل نہیں ہونے دیا۔

سلامت علی مہدی ہزارہا روپیہ لئے واپس لکھنؤ آ گئے۔ شراب اور شباب کے رسیا سلامت علی مہدی کی خدا نے سُن لی تھی لہٰذا لکھنؤ میں نوابی انداز کے اللّوں تللّوں کے باعث چند دنوں میں ہی یہ روپیہ ختم ہو گیا۔

کے۔ آصف نے فوراً اپنے اثر و رسوخ سے حکومت راجستھان کے اعلیٰ افراد سے ملاقات کی اور اس صورتِ حال سے اُنھیں آگاہ کیا کہ راجستھانی بارڈر پر ہمارے ہاتھیوں کو روک لیا گیا۔ حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں نے بارڈر پر راجستھانی پولیس سے وائرلیس سے رابطہ قائم کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ یہاں تو کوئی ہاتھی آیا نہ ہاتھی کی ذات۔ ہم نے کسی بھی ایسے قافلہ کو نہیں روکا جس میں اتنی بڑی تعداد میں ہاتھی ہوں۔

کے۔ آصف اور سلامت علی مہدی کے مابین ٹیلی گرام کا سلسلہ دو تین دنوں تک جاری رہا۔ سلامت علی مہدی سے آصف صاحب نے کہا کہ آپ ایسا انتظام کریں کہ راستہ میں ہی سے اُن ہاتھیوں اور مہاوتوں کو پھر سے جے پور آنے کی تاکید کی جائے۔ میں خود راجستھانی بارڈر پر موجود رہوں گا۔ تاکہ ان مہاوتوں کو ہاتھیوں کو راجستھانی علاقہ میں لانے میں کوئی دِقت نہ ہو۔ اب سلامت علی مہدی کے لئے نہ جائے ماندن تھی اور نہ پائے رفتن۔

کے آصف کسی فوری ضرورت کے لئے جے پور سے دہلی تشریف لائے تو وہ قبلہ حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی مدیر شمع سے ملاقی ہوئے اور باتوں باتوں میں اُنھوں نے ایلی فینٹ سپلائر سلامت علی مہدی کا قصہ سُنایا کہ لکھنؤ سے سلامت علی مہدی نے ہاتھی بھجوانے تھے نہ معلوم کیا ہوا کہ وہ آنا کانی کر رہا ہے اور اِدھر شوٹنگ میں صرف دو تین دن رہ گئے ہیں۔ قبلہ حافظ صاحب نے کے۔ آصف

...یا کہ آپ فریب کھا گئے ہیں۔ سلامت علی مہدی ...تو کیا پچاس بکریاں بھی سپلائی نہیں کر سکتا۔ ...کے بھروسے پر نہ رہیے اور اپنا کوئی اور انتظام ... آصف صاحب کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ غصّے میں ایک سانس میں ہزاروں گالیاں دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ میں سلامت علی مہدی کو یہ کر دوں گا وہ کر دوں گا۔ جس پر حافظ صاحب نے فرمایا آصف صاحب اُس سے آپ کیا لے لوگے۔ صبر کرو اور فوری طور پر کوئی دوسرا انتظام کریں۔ چنانچہ آصف صاحب نے جے پور کے قلعہ آمیر پر سیاحوں کو لے جانے والے دس پندرہ ہاتھیوں کا فوری طور پر انتظام کیا اور باقی نقلی ہاتھی کاغذ کے بنوا کر جنگی مناظر کی شوٹنگ کی۔

غزل

میر شفقت علی وفا

اک ایک آثار۔ دل پہ لکھا جا رہا ہوں میں
ذہنوں میں سیکڑوں کے پڑھا جا رہا ہوں میں
پیتا نہیں ہوں اے غمِ دوراں خدا گواہ!
ساقی کی جستجو میں لٹا جا رہا ہوں میں
اہلِ خرد کو بات بتاؤں یہ کس طرح
دیوانہ آج کس کا بنا جا رہا ہوں میں
جس سمت لے چلا ہے غمِ عاشقی مجھے
اے ہم نشیں اُدھر کو چلا جا رہا ہوں میں
مجھ پر شبِ فراق میں کیا کیا گزر گئی
مانندِ شمعِ بزم جلا جا رہا ہوں میں
اب تیری خطاؤں کو تو حُسن بخش دے
شرمندۂ جرم دل پہ ہوا جا رہا ہوں میں
منزل کہاں ہے یہ نہیں شفقت مجھے پتہ
جس سمت جا رہا ہوں چلا جا رہا ہوں میں

غزل

بسمل نقشبندی

صاف جب میں اپنا درپن کر چکا
جانے کتنی بار دشمن کر چکا
وہ مجھے اکثر خفا ہو کر ملا
جب خودی میں اپنی ارپن کر چکا
رام کو کیا رام کرتا وہ بھلا
جو بھی کر سکتا تھا راون کر چکا
پیٹ اِچھاؤں کا خالی ہی رہا
خرچ اپنا سارا دھن کر چکا
سرد ہوتی ہی نہیں غم کی چتا
ہر جتن کے ساتھ چندن کر چکا
اب تو بندھن سے مجھے مکتی ملے
سارے آدیشوں کا پالن کر چکا
جسم اپنا بسمل شوریدہ سر
درد کی بھٹی کا ایندھن کر چکا

غزل

رؤف حاذق

جہاں نقشِ قدم دیکھے ترے اے نازنیں میں نے
وُفورِ شوق میں بڑھ کر وہیں رکھ دی جبیں میں نے
مُرقّعے حُسن کے یوں تو نظر آئے بہت مجھ کو
مگر دیکھا نہیں تجھ سا جہاں میں نازنیں میں نے
یکایک وہ نظر آئے تصوّر میں [illegible]
ادب مانع ہوا مشتاق نظریں پھیر لیں میں نے
خیالوں میں لگا ہوں میں اُنھیں کو [illegible]
اگر بھولے سے بھی اُن کی جفائیں یاد کیں میں نے
ہوا ہے دل میں پھر پیدا خیال ایذا رسانی کا
نہ جانے آج کس ظالم پہ نظریں ڈال دیں میں نے
خیالِ حُسن نے بے چین رکھا عمر بھر مجھ کو
جلا سوزِ محبت سے مگر آہیں نہ کیں میں نے
کسی کا جلوۂ رنگیں تھا یا بجلی تھی اے حاذق
یہی محسوس ہوتا ہے کہ کچھ دیکھا نہیں میں نے

غالبیات کے موضوع پر

ایک بے نظیر تحقیقی کارنامہ

اردو تدوین کی تاریخ میں آج تک کسی کے کلام کو اس طرح تاریخی ترتیب سے مرتب نہیں کیا گیا۔

ایک قدیم شاعر کے کلام کے نامعلوم زمانوں کو معلوم کرنا بے نظیر تحقیقی کارنامہ ہے۔

اور یقیناً غالبیات میں ایک اضافہ ہے۔

دیوانِ غالب کامل

تاریخی ترتیب سے

ترتیب و تہذیب :۔ کالی داس گپتا رضا

کتاب کے شروع میں تقریباً ایک صد صفحات پر مشتمل مقدمہ۔ کتاب کے آخر میں قریباً تیس صفحات پر مشتمل اشاریہ۔

خوبصورت جلد، اعلیٰ کتابت و طباعت، بہترین کاغذ، اور قیمت ایک سو ساٹھ روپے۔

رابطہ مکاتبت: ساکار پبلشرز، پرائیویٹ لمیٹیڈ، ۱۰۷، جولی بھون۔ ۱۔

۱۰۔ نیو مرین لائنز، بمبئی۔ ۴۰۰۰۲۰

بابِ انتقاد

تنویرِ غزل — اقبال آفریدی بھارتی
اشاعت ۱۹۸۸ء — ڈیمائی سائز
ضخامت: ۱۶۰ صفحات۔ قیمت: ۳۰ روپیہ

کتاب ملنے کے لئے ہندوستان و پاکستان کے ایک درجن پتے درج ہیں مگر سب سے آسان پتہ "تنویرِ غزل" کے تخلیق کار اور ناشر جناب اقبال آفریدی بھارتی، فدا منزل، اصالت پورہ، مراد آباد، یو۔ پی کا ہی ہے۔

اقبال آفریدی بھارتی کا کلام ایک سدا بہار نغمات کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے جس میں سے اشعار کی نسبت واقعی بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے ایسے ہی اشعار نے ہماری غزل کی آبرو رکھی غزل گوئی کو موجودہ دور کے اکثر شعراء نے افسوس ناک آوارگی اور جنسی بے راہ روی کا ذریعہ بنایا ہے حالانکہ اصنافِ شعری میں غزل ایک پاکیزہ اور قابلِ قدر صنف ہے۔ یہاں تک کہ اقبال آفریدی بھارتی کے متعدد اشعار ایسے ہیں جنہیں ہر لحاظ سے گوشِ کیا جا سکتا ہے۔

مگر اقبال آفریدی بھارتی اور ان کے مشیروں کی نادانیوں نے ایک اچھے قابلِ مطالعہ شعری مجموعہ کو مذاق کا مضمون بنا کر رکھ دیا ہے۔ شروع کے صفحات میں غالباً پچیس سے زائد نو وارد مبتدی شعراء ادیبوں اور صحافیوں کی ایسی آرا کو جمع کیا گیا ہے جن میں سے اکثر نے اس شعری مجموعہ کی آبرو سے کھیلا ہے۔ اور تو دو چار آراء کسی کام کی تھیں تو انھیں کتابت کی غلطیوں اور مجموعہ کی اشاعت کے ذمہ داروں کی کج فہمی نے بے معنی کر کے رکھ دیا ہے غالباً اقبال آفریدی بھارتی کو خود اپنے اور اپنی شاعری پر بھروسہ نہیں ہے اور وہ اپنے کو شاعر منوانے کے لئے ان بے شمار چھیچھوں کا سہارا لینا ضروری سمجھتے تھے۔ ویسے اُن کا یہ مجموعہ کسی بھی اچھے شعری مجموعہ کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ کاش اقبال آفریدی بھارتی کو خود پر اور اپنی شاعری پر بھروسہ ہوتا۔

اِدارہ

دامِ تزویر (ناول) — ڈاکٹر جلیس سہسوانی
اشاعت ۱۹۸۶ء۔ سائز: $\frac{20 \times 30}{16}$
ضخامت: ۱۰۹ صفحات۔ قیمت: دس روپیہ

لکھائی، چھپائی اور کاغذ واجبی، جلد معمولی، اور گرد پوش بھی چالو قسم کا۔

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے چھپنے والی کتابوں کے بارے میں یہ عام رائے پائی جاتی ہے کہ تھرڈ کلاس کتابوں پر جن کا رطب و یابس ہیں نتھرڈی قسم کی کتابوں کو بھی اس ادارے سے مالی تعاون مل جاتا ہے۔ گو زیرِ نظر ناول "دامِ تزویر" جو تیسرے درجے کے ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اس ادارے سے مالی تعاون حاصل کرنے کا کسی حد تک حق دار تھا۔

ناول کا مقصد پوری کتاب پڑھنے کے بعد ہماری سمجھ میں تو یہی آیا کہ مصنف نے اپنے ماہنامہ اور اپنی تصانیف کے پروپیگنڈے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے بے شک رسائل کے مدیرانِ کرام کو اکثر محترمات کے خطوط موصول ہوتے ہیں اور ان مکتوبات میں مدیر کی بے جا تعریف کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں بعض بد قماش مدیر اپنی خاندانی روایات کے مطابق ان خطوط میں عشقیہ جراثیم ڈھونڈنے کی کوششیں کرتے ہیں اور پھر اپنی خاندانی شرافت کا جو ثبوت دیتے ہیں وہ اکثر محترمات جانتی ہیں۔

بہر کیف یہ ناول مختصر ہی سہی مگر پڑھے جانے کے قابل ہے مگر ہم اس سے متفق نہیں ہیں کہ جناب ویریندر پرشاد سکسینہ کے قول کے مطابق ڈاکٹر جلیس کے ان مکتوباتی ناول کو غبارِ خاطر یا ڈاکٹر اقبال کے مکتوبات بنام بیگم عطیہ فیضی کا ہم پلہ قرار دیں۔

اِدارہ

ہندی و اُردو افسانہ نگاری میں عالمی شہرت کے مالک

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

جن کے اُردو افسانوں کے دو مجموعے "مان سروور" اور "دھر بار کھادل" بہار اور اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ نے انعامات سے نوازا۔ اور جنھیں "نیشنل لٹریری سرکل" مراد آباد سے ۵۱ سو روپے کا چیک اُن کی چالیس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں پیش کیا گیا۔ اب

"کرنوں کے پدچن"

کے رُوپ میں ایک نرالے انداز سے ہندی ساہتیہ میں قابلِ فخر اور یادگاری اضافہ کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اِس نادرۂ روزگار تصنیف کے باعث ڈاکٹر اودے سرن ارمان کا نام نامی ہندی ساہتیہ میں ہمیشہ رہے گا۔ اور کوئی بھی ہندی ساہتیہ کا مؤرخ "کرنوں کے پدچن" اور "ڈاکٹر اودے سرن ارمان" کے ذکر کے ریسرچ کو مکمل نہ کہہ سکے گا۔

ایک انقلابی ذہن، جو خدا کے وجود کو سائنس کی روشنی کے ساتھ ساتھ تسلیم کرتا ہے مگر اندھ وشواس کے سے پورے انہماک کے ساتھ بغاوت کرتا ہے۔ قدامت اور جدیدیت کا یہ سنگم "کرنوں کے پدچن" میں انتہائی اہم موضوعات میں پیش آئے واقعات کی روشنی میں ایسے ایسے مسائل پر مدلل بحث کرتا ہوا قاری کے دل و دماغ پر اپنے نقوش روی سے چھوڑتا ہے کہ قاری بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ع جو کہا تو نے وہ میرے دل میں تھا۔

"کرنوں کے پدچن" میں آپ ارمان صاحب کی یادداشتوں میں بڑی انمول باتیں پائیں گے رسم الخط میں اپنی طرز کی یہ واحد کتاب پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔ قیمت: -/۱۰

تقسیم کار:- **شان ہند پبلی کیشنز**

فلیٹ ۷، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

من کہ مکتوب الیہ

بندہ نواز! تسلیمات
آپ کا دل نواز خط ملا۔ آپ کی تحریر میں کتنی مٹھاس، اپنائیت اور اپنائیت ہے۔ یہ آپ کے باطن کا عکس ہے جو الفاظ میں اُتر آیا ہے۔
"مہابھارت کتھن مالا" آپ بڑے شوق سے شائع کریں۔ لیکن اگر آپ پاکستانی ایڈیشن کا صرف عکس شائع نہیں کرنا چاہتے اور اپنے طور سے اس کی کتابت کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ میں اس میں کچھ ترمیم اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ عندیہ ظاہر کریں تو میں اضافہ شدہ نسخہ آپ کو بھجوا دوں۔
"شانِ ہند" کے دو پرچے ملے۔ اس کی طباعت کتابت اور پیش کش نے متاثر کیا۔ آپ بڑے سلیقے سے اسے مرتب کرتے ہیں۔ آپ کی بیماری کا ذکر بھی اس میں پڑھا تھا۔ خدا کا احسان ہے کہ اس نے آپ کو شفا عطا کی۔ دعا ہے کہ وہ ذات پاک آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ عمر طویل عطا فرمائے۔

خاکسار
عبدالعزیز خالدؔ

محبی سرور تونسوی صاحب! تسلیمات
سب سے پہلے تو مجھے شکریہ ادا کرنا ہے کہ اب "شانِ ہند" بھی باقاعدگی سے ملنے لگا ہے گذشتہ چار ماہ کے پرچے مجھے مل چکے ہیں۔ اس کرم کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔
اپریل اور مئی کے پرچوں میں آپ کی علالت کی خبر پڑھی اور اس سے تشویش پیدا ہوئی۔ خدا آپ کو صحت عطا کرے تاکہ آپ حق گوئی کی روایت کو مزید مستحکم کر سکیں۔

محترم و مکرم سرور صاحب، عقیدت
آپ کی کتاب "بہ کوئے یار" مکتبہ جامعہ بمبئی سے ہمارے اسکول کی لائبریری کے لئے خریدی گئی ہے۔ میرے ساتھیوں کے حلقہ میں چکر لگانے کے ایک ماہ بعد میرے ہاتھ لگی۔ آپ یقین کیجئے، اسے سات مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔
"بہ کوئے یار"..... واقعی ادب میں ایک دستاویزی حیثیت کی حامل ہے ایسی کتاب کے مطالعہ سے محروم رہنا یقیناً بدنصیبی ہے۔ میں آپ کی طرزِ تحریر کا تو پہلے ہی گرویدہ ہوں، مگر اس کتاب میں آپ نے بعض جگہوں پر طنزیہ اور مزاحیہ فقروں سے جو پُر لطف رنگینی پیدا کر دی ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔
یہ حقیقت ہے کہ ایسی کتابیں اتفاق سے ہی معرضِ وجود میں آتی ہیں

آپ کا ناچیز خادم
نوشاد مونس اعظمی

کرشن موہن صاحب کی انعام سے محرومی کی خبر افسوسناک تو ہے لیکن یہ اس دور کی روایت کے مطابق ہے کہ انعامات کی بارش غیر مستحق لوگوں پر کر دی جاتی ہے۔ صورتِ حال ہمارے ہاں بھی اس سے مختلف نہیں چنانچہ مشہور زمانہ ناول "علی پور کا ایلی" انعام سے محروم رہا اور جس کتاب کو انعام دیا گیا وہ خود شہرت کے بوجھ تلے دب گئی۔ ایک انعام کے مصنف قبل از وقت اعلان کر گئے کہ اُن کی موجودگی میں غلام الثقلین نقوی کے ناول "میرا گاؤں" کو اپنی تمام خوبیوں کے باوجود انعام نہیں دیا جائے گا۔ کیوں کہ وہ ان کے مخالفین کے کیمپ کے ادیب ہیں۔ یہ منصف ڈاکٹر مسلیم اختر تھے چنانچہ نقوی صاحب انعام سے تو محروم ہو گئے لیکن ناول چمک اُٹھا اور اب اُس کا ذکر ہر نقاد کر رہا ہے۔ کرشن موہن صاحب کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ تخلیقِ ادب کے تقاضے افادی تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ انعام حاصل کرنے کے طریق مختلف ہیں اور اُنھیں کوئی خوددار ادیب اختیار نہیں کر سکتا۔

میں نے آپ کی آپ بیتی پڑھ کر تاثرات ا...
بھجوا دیئے تھے۔ توقع ہے کہ آپ کو مل گئے ہوں...
خدا کرے جب یہ خط آپ کو ملے تو آپ صحت...
ہو چکے ہوں۔ اپنی خیریت سے مطلع کیجئے گا۔

مخلص
انور سد...

بھائی سرور تونسوی صاحب! آداب
اس خبر سے بے حد مسرت ہوئی کہ بحمدہ آ...
"شگفتہ" صحت یاب ہو کر بدستور اپنی تمام صحت مند...
فعال صلاحیتوں کے ساتھ، خدمتِ ادب میں مشغ...
ہیں۔ دعا ہے کہ مرض کو صحت میں بدلنے والا آپ...
کو اور پائیدار بنائے۔ آمین!

آپ کا
علی جواد زید...

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57 Delhi Pos

جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے



● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نور محمدی ہوٹل کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نور محمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نور محمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نور محمدی ہوٹل اور ان کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنایا ہے، آپ یہاں تشریف لاکر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے

نور محمّدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔آر۔روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115

بھی اِن سے بات کرنا کبھی اُن



وہ بھی عجب دیوانی تھی اور اُس کا بھی یہی حال تھا۔ وہ عشق کماری پنجاب کے ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ اُس کی داستان معصوم خوابوں کا بیان، عبرت کا سامان

آئیے پڑھیے:

شانِ ہند

دہلی

ستمبر ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹

شمارہ ۹

چیف ایڈیٹر: سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر: مطہر صحرائی

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: وِدّیا پرکاش سرور تونسوی ۔
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ "شانِ ہند" فلیٹ ۵، انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

خطاط: سبطین حسین، محمد عمران

حسن کار: مصطفےٰ آرٹسٹ

غزل

حکیم برہم مرحوم بانیٔ اخبار مشرق گورکھپور

کیا رنگ دیکھتے ہو دلِ داغدار کا — رہتا یہاں خزاں میں ہے عالم بہار کا
عالم شباب کا ہے زمانہ ابھار کا — آیا ہے باغِ حسن میں موسم بہار کا
ہر پھول کہہ رہا ہے حسینوں کے ہار کا — جوبن لٹا ہے آج عروسِ بہار کا
زلفیں ہٹا رہا ہوں ترے رخ سے اس لئے — منہ دیکھوں پھر کبھی نہ شبِ انتظار کا
بوسہ لیا جو خواب میں، میں نے بگڑ گئے — بولے ہٹو یہ کون سا موقع ہے پیار کا
سرمہ بنا ہے چشمِ ملائک فریب میں — اللہ رے عروج ہمارے غبار کا

برہم بتوں کے عشق میں دل ہو گیا تباہ
توبہ مری جو نام بھی لوں ان کے پیار کا

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | حالاتِ حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

ا ڈ ی ٹ و ر ی ل

وزیرِ اعظمِ ہند



راجیو گاندھی کے نام

کھلا خط

مُلک کی اکثریت دن دن یہ سوچنے پر مجبور ہو رہی ہے کہ کیا آپ اپنے فرائضِ منصبی کو ذمّہ داری کیساتھ نبھا رہے ہیں؟ اور کیا آئندہ آپ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

مُحترمُ المقام راجیو گاندھی صاحب!

محترمہ اندرا گاندھی کی شہادت کے بعد جب وزارتِ عظمیٰ کی ذمّہ داری آپ کو سونپی گئی تو ہندوستان کی ہر ماں نے دل کی گہرائیوں سے آپ کو دُعائیں دیتے ہوئے خُدا سے یہ التجا کی کہ اندرا جی کی نشانی کو خُدا عُمرِ خضر عطا فرمائے اور راجیو دُنیا کی ہر گرم ہوا سے محفوظ رہے اور ہر کامیابی اس کے قدموں کو چومے۔

ملک کے ہر فرد نے خواہ وہ حزبِ مخالف کا رُکن ہی کیوں نہ ہو، اپنے دل میں یہ محسوس کرتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا کہ ملک کی باگ ڈور ایسے نوجوان کے ہاتھوں میں آ گئی ہے جسے کسی قسم کی آلودگی چھو تک نہیں گئی ہے اور جو ڈکشنری میں لکھے گئے "مسٹر کلین" کے معنوں کا صحیح آئینہ دار ہے۔

محترمہ اندرا جی کے شہید ہونے پر جو فرقہ

> مُلک کے عوام یہ کھُلے بندوں کہنے پر مجبور ہیں کہ آپ نے اپنے ایسے اسکولی دوستوں کو نوازتے ہوئے مُلک کے نظم و نسق کے لئے منتخب کیا جو بہترین نسل کے کتّوں، بہترین ماڈل کی کاروں اور بہترین قسم کی شراب کا انتخاب کرنے کے علاوہ عیش و آرام کی زندگی گزارنے کے ہر انداز سے واقف ہوں گے مگر کسی مُلک کو اچھی ایڈمنسٹریشن دینے کے قطعاً اہل نہ تھے۔

والا فسادات مُلک کے کچھ شہروں میں ہوئے ان پر آپ کے حُسنِ تدبّر، آپ کی نہایت نپی تُلی تقریروں، آپ کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے صُلح کُل اور انسانی بھائی چارے کے الفاظ نے تشدّد کو بہت جلد ختم کر دیا تو ہندوستان کے عوام نے آپ کی سیاسی، سماجی اور انتظامی سوجھ بوجھ کی داد دیتے ہوئے سُکھ کا سانس لیا کہ مُلک کی باگ ڈور ایک ایسے سُلجھے ہوئے نوجوان کے ہاتھوں میں ہے جو مُلک کو ہر مُشکل سے بآسانی نکال سکے گا۔

اگر آپ معاف فرمائیں تو صحافیانہ دیانتداری کے تقاضے کے باعث یہ عرض کروں، کہ اب ہندوستان کی ہر ماں ہی نہیں، ہر عورت آپ کے اندازِ حکومت سے مایوس ہے۔ مُلک کی اکثریت دن دن یہ سوچنے پر مجبور ہو رہی ہے کہ کیا آپ اپنے فرائضِ منصبی کو ذمّہ داری کے ساتھ نبھا رہے ہیں؟ اور کیا آئندہ آپ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ کہ مُلک کی باگ ڈور آپ کے ہی ہاتھ میں رکھی جائے؟

مُلک کے عوام یہ کھُلے بندوں کہنے پر مجبور ہیں کہ آپ نے اپنے ایسے اسکولی دوستوں کو نوازتے ہوئے مُلک کے نظم و نسق کے لئے انتخاب کیا جو بہترین نسل کے کتّوں، بہترین ماڈل کی کاروں اور بہترین قسم کی شراب کا انتخاب کرنے کے علاوہ عیش و آرام کی زندگی گزارنے کے ہر انداز سے واقف ہوں گے مگر کسی مُلک کو اچھی ایڈمنسٹریشن دینے کے قطعاً اہل نہ تھے۔

بوفور توپوں اور اسی قسم کے دیگر متنازعہ واقعات میں مبیّنہ بددیانتی سے متعلق آپ کے غلط رویّہ، حکومت کی طرف سے غیر تسلّی بخش صفائی، اور اپوزیشن کی طرف سے ہر قسم کے سچ جھوٹ کے باعث عوام کے دلوں میں یقین کی حد تک یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ یہ سب کچھ سچ ہے۔

اور جب کسی حکومت کے سربراہ کے بارے میں مُلک کے عوام یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ اُن کے وزیرِ اعظم کے نزدیکی احباب ناجائز فائدہ اُٹھا کر ملکی معیشت کو چلنی کئے جا رہے ہیں تو آپ اِس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ عوام کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔

اگر آپ ناراض نہ ہوں تو یہ صاف گوئی آپ کے لئے مُفید ہوگی۔ بزرگوں کا یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ سوئی کے ناکے سے اُونٹ نکل جانا متوقع ہو سکتا ہے مگر کسی مُلک کے بادشاہ یا سربراہ کے لئے عوام کی رائے زنی سے بچنا مُشکل ہے۔ اور پھر آپ کے مُلک کے عوام تو اب بڑی سُوجھ بُوجھ کے مالک ہو گئے ہیں، جو بات حکومت کے پیٹ میں ہوتی ہے وہ عوام کے ناخنوں میں آجاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ حکومت کے ارکان اور آپ کے قریبی احباب پر لگے ہوئے الزامات کی صفائی عوام کے سامنے رکھتے ہوئے اپنے آپ کو بے عیب ثابت کرتے، آپ نے ایمرجنسی کے سوتیلے بھائی "ہتکِ عزت بل" کو پارلیمنٹ میں پاس کروا کر سارے مُلک کے پریس اور عوام کو ناراض کر لیا اور آخر کار آپ کو بہ ظاہر اُدھار کھاتے ہوئے اس بل کو واپس لینا ہی پڑا۔ گو عوام یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ کی سوچ بچی ہوئی ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے بعض فیصلے مُلک کے لئے دُور رس، مفید نتائج کے ضامن ہیں۔ مگر عام طور پر آپ کے فیصلے وقتی تقاضوں کو عوام کی نظروں سے اوجھل کرنے کے مترادف ہوتے ہیں۔ جو کچھ ہی دنوں بعد پہلے سے بھی زیادہ شدّت کیساتھ اُبھرتے ہیں اور مُلک کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں۔

آپ کے اور آپ کے بعض شرکائے حکومت کی حماقتوں کے باعث آج اپوزیشن کے اُبھرنے کے کچھ نشانات دکھائی دینے لگے ہیں اور یہ نشانات دن دن حقیقت میں تبدیل ہوتے نظر آ رہے ہیں، جنھیں دیکھتے ہوئے ہم ایسے آپ کے دلی بہی خواہوں کو آئندہ جنرل الیکشن تک کانگریس آئی کی مقبولیت میں کمی ہونا یقینی معلوم دے رہا ہے۔

آپ نے اپنے دورِ حکومت میں متعدد بار ارکانِ وزارت میں ردّ و بدل کیا ہے مگر یہ آپ بھی سمجھتے ہیں کہ بار بار کا یہ ردّ و بدل حکومت اور پارٹی کے مستقبل کو بجائے روشن کرنے کے مدھم کر رہا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ یہ ردّ و بدل آپ اپنی سُوجھ بوجھ سے نہیں بلکہ اپنے مُشیروں کے کہنے پر کرتے ہیں۔ اور آپ کے یہ مُشیر ہندوستان ایسے عظیم مُلک کے مزاج سے واقف نہیں ہیں۔ اور جو معتمد حضرات ایسے کاموں کے لئے مفید ہو سکتے ہیں اُنھیں آپ نے اپنے لئے شجرِ ممنوعہ بنا رکھا ہے۔

آپ کا قیام جب راجدھانی میں ہوتا ہے تو ہر روز آپ کی قیام گاہ پر مُلک کے کونے کونے سے عوام آپ سے ملنے آتے ہیں۔ اوّل تو اُن بیچاروں کی اکثریت کو آپ تک پہنچنا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ ایک

تو سیکورٹی (جو انتہائی ضروری ہے) کے باعث اور دوسرے وہ ذمہ دار لوگ جو فریادیوں کو آپ تک پہنچنے کا انتظام کرتے ہیں، انھیں عوام سے کچھ ہمدردی ہی نہیں ہے اور وہ ہر روز سیکڑوں عوام کو ہر روز مایوس اور نااُمید کر کے آپ سے بغیر ملاقات کرائے انھیں واپس کر دیتے ہیں اور یہ نااُمید اور مایوس لوگ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر آپ اور پارٹی کے خلاف پرچار کرتے ہیں۔

ہمارے ذہن میں اِس وقت کئی واقعات عوام کی جائز [illegible] کی تفصیل، حکومت کی بے جا روِش کے درجنوں ثبوت، کانگریس آئی کے خود ساختہ ناخداؤں اور آپ کے بنائے ہوئے غیر ذمّہ داروں کو ذمّہ داری سونپنے کے طفلانہ حماقت کے نتائج کی تفصیل، سرکاری دفاتر میں پانچ دنوں کے ہفتے کی آڑ میں دراصل ہفتے کو چار دن بنا دینے کی بہاڑ جیسی غلطی کے باعث عوام کے لئے مصیبت اور سرکاری کام میں کمی کی تفصیل، اور اس قسم کی متعدد گزارشات ہیں جو ہم آپ تک اس کھلے خط کے ذریعے پہنچانا چاہتے ہیں۔ مگر اوّل تو یہ کھلا خط آپ تک جا ہی نہیں سکتا کیونکہ حکومت کے پریس آفیسر آپ تک ایسی کوئی تحریر بھجواتے ہوئے ڈرتے ہیں جس میں آپ پر تنقید کی گئی ہو۔ دوسرے اگر کسی طرح یہ کھلا خط آپ تک پہنچ بھی جائے تو بھینس کے آگے بین بجانے سے کیا فائدہ؟ آپ کے پاس اِتنا وقت ہی کہاں ہے کہ آپ اِن فروعات پر دھیان دے سکیں اور پھر یہ عریضہ اُردو میں ہے اور آپ کے اور آپ کے اکثر حواریوں کے لئے اُردو کی تعریف محض مسلمان ووٹروں کو خوش کرنے کے لئے کرنی چاہئیے، اُس میں لکھی گئی درخواستوں یا خطوط پر کون دھیان دیتا ہے۔

اِس لئے اور کچھ نہ لکھتے ہوئے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آپ اپنی خاطر نہیں تو کم از کم اُن عوام کے لئے ہی ایسے اچھے کام کیجئے جن سے کانگریس آئی کا نام مِٹنے نہ پائے اور آئندہ الیکشن میں کانگریس (آئی) مقبولیت باقی ہو اور پھر ملک کی سربراہی کی عنان آپ کے ہاتھوں میں دے۔

ادبی/علمی ایوارڈز کی غلط تقسیم

حال ہی میں اقبال ایوارڈ کے لئے اِس سال جناب اختر الایمان صاحب کا انتخاب کیا گیا ہے جس بورڈ نے یہ فیصلہ کیا ہے اس میں علی سردار جعفری، قرۃ العین حیدر، زاہدہ زیدی اور پروفیسر رفیق احمد وغیرہ جیسے حضرات شریک تھے۔

کیا بورڈ کے ممبران دیانت داری سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ نمایاں تخلیقی صلاحیت اور اُردو شاعری میں کمال پانے والوں میں اختر الایمان سب سے نمایاں مقام رکھتے ہیں؟۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ انعامی فیصلہ کرنے والے حضرات کوشش کرتے ہیں کہ ایوارڈ اُن کے کسی عزیز، دوست یا اپنی پارٹی کے کسی ممبر کو دیا جائے اور حیرت تو یہ ہے کہ اُردو والے اِس ناانصافی، دھاندلی بازی اور جانبداری کے خلاف آواز بھی بلند نہیں کرتے۔

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ہمارے ہاں کا ایک اعزازی ایوارڈ ہے مگر اُردو کے سلسلہ میں گذشتہ تین سالوں سے اس کا فیصلہ محض ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی رضا و رغبت پر منحصر رہا۔

کہا جاتا ہے کہ ساہتیہ اکادمی اپنے آپ بازار سے اچھی کتابوں کا انتخاب کر کے لاتی ہے اور بورڈ اُن کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کا انتخاب کرتا ہے کیا ساہتیہ اکادمی کے کارکنان یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ ہر سال واقعی بازار سے اچھی کتابیں خرید کر لاتے ہیں؟ اور واقعی اُن کتابوں سے کسی ایک کتاب کا انتخاب کیا جاتا ہے؟

غالب انسٹی ٹیوٹ جو مرحوم فخر الدین علی احمد کی یاد کو تازہ کئے ہوئے ہے، اُس میں بھی ایوارڈز کی تقسیم میں انعامی فیصلے کرنے والا بورڈ کہیں کہیں اپنی ذاتی پسند کو بھی نظر رکھتا ہے۔

اُردو اکادمیوں کے وہ ممبران جو انعامی فیصلے کرتے ہیں، اُن کی نسبت اگر کچھ نہ ہی لکھا جائے تو بہتر ہے۔

کیا وہ حضرات جو انعامات کا فیصلہ کرتے ہیں انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ اگر انھوں نے کوئی غلط فیصلہ کیا تو وہ عوام کی قسمت خلق پرواہ نہ کریں مگر ایک اور بھی بڑی عدالت ہے جو ان فیصلہ کرنے والوں کا بھی محاسبہ کرتی ہے۔ وہاں یہ حضرات کیا مُنہ دکھائیں گے؟

دلّی اُردو اکادمی کی تشکیلِ نو

پچھلے دنوں دلّی اُردو اکادمی کی تشکیلِ نو کی گئی۔ جو حضرات چھ سال، یا چار سالوں سے اکادمی کے ممبران کی حیثیت سے اکادمی کی خدمت کر رہے تھے اُنھیں سبکدوش کر کے کچھ نئے حضرات کو لایا گیا ہے

اُمید ہے کہ نئے ممبران خصوصاً جناب ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عنوان چشتی، جناب ظفر پیامی اور بلراج کومل وغیرہ ہم اپنی شاندار روایات کے مطابق اکادمی کو بہتر سے بہتر بنانے میں معاون ثابت ہوں گے۔

ہمیں دلی افسوس ہے کہ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے اکادمی کی ممبرشپ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ جبکہ جب سے اکادمی وجود میں آئی ہے، آپ اس کے ممبر منتخب ہوتے آئے ہیں۔ کنور صاحب نے اس خیال سے کہ اُن کی جگہ بھی کوئی نئے صاحب آئیں اور اکادمی کی خدمت کریں، اصولی طور پر استعفیٰ دے کر اُن حضرات کے لئے رہنمائی کی ہے جو اکادمی کی ممبرشپ کے لئے سفارشوں سے سکریٹری اکادمی اور وائس چیئرمین صاحب کا قافیہ تنگ کئے ہوئے ہیں۔

اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اُردو اکادمی نے جناب کپور، سیندر سنگھ بیدی سحر کا الگ ہونا اکادمی کے حق میں اچھا نہیں ہے۔

ٹی۔وی رکھنے والے حضرات کو چاہئے کہ وہ اس کنجرپن کے خلاف وزیرِ اعظم کو خطوط لکھیں کہ یہ بے حیائی بند کی جائے۔

پاپا ہمیں بھی "مالاڈی" لادو

شبو اور سیریل کے بعد نرودھ "مالا ڈی" کا پرچار جس بے حیائی اور غیر ذمّہ داری سے کیا جاتا ہے شاید اُس سے دُور درشن کے ذمّہ دار حضرات بے خبر نہیں ہیں۔ لہٰذا اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ جب ٹی وی پر اس کنجرپن کا انتہائی بے حیائی سے ذکر ہوتا ہے تو اسّی فیصد ٹی۔وی بند کر دیئے جاتے ہیں تاکہ ٹی۔وی دیکھنے والے بچّوں کے کان اور آنکھیں ایسے بے حیائی کے آئینہ دار اشتہاروں کو نہ سن سکیں اور نہ دیکھ سکیں۔

پچھلے دنوں رہوتک سے آئے ایک صاحب نے دفتر "شانِ ہند" میں بتایا کہ اُن کی چھ سالہ بچی ٹی۔وی پر یہ پرچار سُننے کے بعد ضد کرتے ہوئے کہنے لگی کہ پاپا ہمیں بھی ڈی مالا لادو۔ ہم بھی یہ مالا پہنیں گے۔

ہمارے خیال میں دُور درشن پر اس قسم کے گندے اشتہار دکھانے والے اور اس قسم کے اشتہار چلانے والے سب خدا کے فضل سے بال بچے دار ہوں گے کیا انھیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ جب اُن کے اپنے بچّے اس گندگی کو اپنے دماغوں میں بھر لیں گے تو کچھ عرصہ بعد اُن کا کیا حال ہوگا۔

کاش دُور درشن سے متعلقہ وزیر جناب بھگت صاحب کو یہ خیال آتا کہ جس بھارت کی پراچین تہذیب کو دنیا مانتی ہے وہ اور اُن کے ساتھی وزیر بس نہیں کرتے اسی بھارت کے بچّوں کے لئے دُور درشن کا یہ اقدام کنجرپن کو بڑھاوا دے گا۔

داراشکوہ لائبریری

دِلّی اُردو اکادمی نے اپنی مرکزی لائبریری کا نام "داراشکوہ لائبریری" رکھا ہے جس کا افتتاح پچھلے دنوں جناب کپور صاحب سابق لیفٹننٹ گورنر دہلی نے فرمایا تھا۔ اس لائبریری میں اس وقت کئی نایاب و نادر اردو کتابوں کے علاوہ عام مطالعہ کی ہر موضوع پر ساڑھے سات ہزار کتابیں جمع کر لی گئی ہیں اور اکادمی مزید کُتب کی فراہمی کے لئے کوشاں ہے۔

جناب کپور صاحب ایل۔جی نے تو وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اس لائبریری میں ایک لاکھ کتابیں جمع کرنے کے لئے روپیہ دینے میں دریغ نہیں کریں گے۔ اُمید ہے کہ نئے لیفٹیننٹ گورنر جناب بھنڈاری صاحب بھی اپنے پیشرو کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے داراشکوہ لائبریری کو راجدھانی کی ایک پُرشکوہ لائبریری بنانے میں فراخ دلی سے کام لیں گے اور اس لائبریری کے شایانِ شان بلڈنگ بنوانے کی بُنیاد بھی رکھیں گے۔

ناانصافی ہوگی اگر داراشکوہ لائبریری کی لائبریرین مسز نزہت مہدی رضوی کی تعریف نہ کی جائے۔ جو لائبریری کو ہر انداز سے سنوارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی ہیں اور شائقینِ علم و ادب کو لائبریری میں ہر قسم کی سہولیت بہم پہنچانا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔

رجّو سے خطاب



ڈاکٹر حقیر آستانی

مَیں ہُوں اپنے اندر پاگل، اپنے اندر پاگل تُم
مَیں ہُوں اِک ہیجان سراپا، ایک مُسلسل ہلچل تُم
ہم دونوں کی ایک کہانی، کتنے ہی یُگ بیت گئے
مَیں ہُوں اک آوارہ بادل، اک لہراتا آنچل تُم
مَیں ہُوں ایک سمندر جس پر بکھر گئیں تُم لہر لہر
چین میسّر مجھے کہاں، رہتی ہو سدا ہی بے کل تُم
میری رُوحِ رواں ہے تم سے، دھڑکن ہو میرے دِل کی
اِن آنکھوں کا نُور تمھی ہو، تارہ تُم ہو، کاجل تُم
گھر کی ساری چہل پہل ہو، گھر کی رونق ہے تُم سے
ہر منزل ہے سہل تمھی سے، ہو ہر مُشکل کا حل تُم

شہ رگ ہو تُم، جان ہو میری، بسکہ رگِ جاں ہو میری
لمحہ لمحہ ساتھ تمھارا، پاس ہو میرے پل پل تُم

702, Gold Crown
J. P. Road
Andheri (W)
Bombay-400 061

میر شفقت علی وفا فیروز آبادی

فیروز آباد کا خطہ جہاں ہر عورت کے سہاگن بنے رہنے کی دعائیں مانگی جاتی ہیں، اُس سرزمین نے دُنیائے ادب میں بھی ایسی ہستیوں کو جنم دیا ہے جو اُردو ادب کی عروس کو سدا سہاگن رکھنے کی ضامن ہیں۔ حکیم نوشاہ اکابری مارہروی، جناب عظیم فیروز آبادی اور دیگر کئی علم نواز نیز ادب پرور ہستیوں اور اساتذہ کے اسمائے گرامی دُنیائے ادب میں ماہِ رُوشن کی طرح ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

جمیل افغانی اور اُن کے ہمعصر کئی شعرانے فیروز آباد کا نام پورے ملک میں رُوشن کیا ہے۔ ایک ایسا بھی دُور تھا جب جمیل افغانی کے لئے ایک ہی وقت میں درجنوں مشاعروں کے دعوت نامے دفتر "شانِ ہند" میں موصول ہوتے تھے۔

فیروز آباد کی ان عظیم روایات کو زندہ رکھتے ہوئے عزیز محترم حاجی شفقت علی وفا نے بھی دُنیائے شاعری میں قدم رکھا ہے۔ چونکہ وفا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری کر رہے ہیں اس لئے یہ فیروز آباد کے اکثر شعرائے کرام کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے دنیائے ادب میں اپنا مقام بنا رہے ہیں اور کئی رسالوں اور اخبارات میں ان کا کلام چھپ رہا ہے۔

وفا ایسی مشہور کاروباری ہستی کے فرزند ارجمند ہیں جو فیروز آباد میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ اور زبان اُردو کی بقاو حیات کے لئے یہ خاندان ہمیشہ کمربستہ رہا۔ غالب لائبریری فیروز آباد بھی وفا صاحب کی اُردو سے وفاداری کے تحت ہی چل رہی ہے اور ڈاکٹریٹ کے لئے بھی جو موضوع وفا صاحب نے انتخاب کیا ہے وہ بھی خالص شاعرانہ ہے۔

جو مُبتدی ہے

کیا سبب تھا آج وہ تنہائی میں ۔۔۔ دیر تک کیوں آئینہ دیکھا کئے

معلوم ہو رہا ہے مجھے تیز دھوپ میں ۔۔۔ دم توڑنے ہی والی ہیں پرچھائیاں مری

مسکرا کر یہ پوچھنا اُس کا ۔۔۔ دلِ خانہ خراب کیسا ہے؟

کس کس پہ آج دیکھیں برقِ ستم گرے گی ۔۔۔ کس کس کا آج دیکھیں خانہ خراب ہوگا

ایسے اشعار کہہ سکتا ہے، وہ آئندہ دُنیائے شاعری میں جو مقام حاصل کرے گا، اُس کا اندازہ ابھی سے کیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں ہم وفا صاحب کی تین غزلیں شائع کر رہے ہیں جن سے قارئینِ کرام خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ نوجوان مستقبل میں اُردو شاعری کا ایک تابناک ستارہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اِدارہ

کیا میری تباہی کے یہ سامان ہوئے ہیں
وہ خانۂ دل میں مرے مہمان ہوئے ہیں
شاید مرا خیال بھی آنے لگا اُنھیں
جو روبروئے آئینہ حیران ہوئے ہیں
دیکھا مری طرف جو سنبھلے غیر دیکھ کر
ہم اِس ادا پہ آپ کی قربان ہوئے ہیں
ابرِ بہار چھایا تو سمجھانے آگئے
واعظ بھی اِن دنوں بڑے نادان ہو گئے ہیں
جو کچھ خطا ہوئی ہے وہ ہم سے خطا ہوئی
کیا بات ہے جو آپ پشیمان ہوئے ہیں

کچھ بھی نہیں ہے دَیر و حرم سے ہمیں غرض
عاشق تجھی پہ ہم تو مری جان ہوئے ہیں
نوشاہ کا حسین وہ فیضِ کرم ہوا
یعنی وفا بھی صاحبِ دیوان ہو گئے ہیں

شاید اب ہم کو تمنا موت کی ہونے لگی
جیسے شرمندہ بہت کچھ زندگی ہونے لگی
کچھ سبب اِس کا بتاؤ کچھ کہو تو منہ سے تم
بات کیا ہے؟ کس لئے اب بے رُخی ہونے لگی

اب لگا ہوں سے لگا ہیں تم بچاتے کیوں [illegible]
سوچتا ہوں کس لئے شرمندگی ہونے [illegible]
کیا تمہیں رُسوائیوں کا خوف پیدا ہو گیا
آنے جانے میں تمہارے کیوں کمی ہونے [illegible]
برق نے جب سے جلایا ہے ہمارا آشیا[ں]
ہر طرف صحنِ چمن میں روشنی ہونے [illegible]
میں نے جب اپنی تباہی کی سُنائی داستا[ں]
سنگدل کی آنکھوں میں بھی نمی ہونے [illegible]
اے وفا وہ بھی ہماری غزلوں کو پڑھنے [illegible]
کس قدر مقبول اپنی شاعری ہونے [illegible]

در کعبہ پہ سرِ شوق کو خم رکھنا [illegible]
تیری تصویر مگر دل میں صنم رکھنا [illegible]
درد رکھتا ہے دِلوں میں تیرا غم رکھنا [illegible]
ہم کو ہر طور محبت کا بھرم رکھنا [illegible]
ساقیا اب کے برس اپنا ارادہ [illegible]
لاج موسم کی ہمیں تیری قسم رکھنا [illegible]
جا کے صحرا میں ہمیں کھو کے بھلانا [illegible]
اب سنبھل کر رہِ وحشت میں قدم رکھنا [illegible]
تیری نظروں کے اشاروں پہ ابھی [illegible]
ہم کو اپنا سرِ تسلیم ہی خم رکھنا [illegible]
اور تو التجا کوئی بھی نہیں ہے تم [illegible]
بس مرے حال پہ کچھ چشمِ کرم [illegible]
ہاں لگانی ہے انھیں جان کی [illegible]
کوئے جاناں میں وفا ہیں کو قدم [illegible]

تپِ دِق سے جنگ

۱. اگر آپ دو ہفتے سے زیادہ سے کھانسی میں مبتلا ہیں یا اپنے تھوک یا بلغم میں خون پاتے ہیں تو آپ پھیپھڑوں کی تپ دق کا شکار ہو سکتے ہیں۔

2. اپنا طبّی معائنہ کرائیں، خاص طور پر بلغم کا۔ یہ معائنہ پرائمری ہیلتھ سینٹر، ڈسپنسری یا ٹی بی سینٹر میں کرا سکتے ہیں۔

1 2



4 3

3. تپ دق کا مکمّل علاج ہو سکتا ہے بشرطیکہ ڈاکٹر کی تجویز کی ہوئی دوائیں پابندی سے متعیّنہ مدّت تک کھائی جائیں۔

4. پرہیز علاج سے بہتر ہے، اس لئے اپنے بچّے کو بی سی جی کا ٹیکہ لگوائیں۔

سینٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو (ڈی۔جی۔ایچ۔ایس)
وزارتِ صحت و خاندانی بہبود، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی 110002

davp 88/347 URDU

گوشۂ عقیل صدیقی

گزشتہ سے پیوستہ

آنکھوں دیکھا کانوں سُنا

بائیس سال پہلے

کُل ہند مُشاعرہ

اُودے پور اُردو سمپوزیم

سرور تونسوی

اور اب جناب راز جے پوری مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

راز کیسا یہ انقلاب آیا — ظلمتیں لے کے ماہتاب آیا
آئیں حصے میں نام کو خوشیاں — غم جو آیا تو بے حساب آیا۔

اس کے بعد راز صاحب نے غزل سنا کر بہت خوب داد پائی ہے۔ مطلع آپ بھی سن لیجئے ؎

میں سناؤں تمھیں اپنے دل کے افسانے
چھلک رہا ہیں تمھاری نظر کے پیمانے

ندا صاحب اعلان فرما رہے ہیں کہ اب جناب ساغر اجمیری کلام سنا رہے ہیں۔ سنیئے جناب ساغر پرانی شراب پیش کر رہے ہیں ؎

جنھیں چشمِ ساقی پہ ناز تھا وہی میکشی کو ترس گئے
جنھیں میکدے پہ غرور تھا وہ تو جام ہی کو ترس گئے۔
تھے جہاں اندھیرے حیات کے انھیں آج روشنی مل گئی
جہاں روشنی تھی حیات کی وہیں روشنی کو ترس گئے۔

پرانی شراب زیادہ نشہ آور ہوتی ہے۔ لہٰذا ساغر صاحب کے ان دو اشعار پر ہی اکتفا کیجئے۔ اب جناب شنکر عزوری مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ ایک نظم جو معمولی نوعیت کی ہے سنائی ہے اور اس کے بعد غزل سنا رہے ہیں۔ مطلع آپ بھی سن لیجئے جو دو شعروں کے برابر ہے ؎

وقت آتا نہیں ہے کبھی لوٹ کر روز تازہ ستم ڈھاؤ اے دشمنو
پھول بن بن کے مہکیں گے گل ہر طرف دل کے جلتے ہوئے گھاؤ اے دشمنو

اب ندا صاحب نے نہایت مناسب انداز میں راجستھان کے مشہور شاعر حضرت عارف نقشبندی بیکانیری کو کلام سنانے کی تکلیف دی ہے۔ سنیئے عارف صاحب پہلے قطعات سنا رہے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ فرمایئے ؎

زندگی کے نگار خانوں میں
جھمگٹا ہے پری جمالوں کا
بجلیاں کوندتی ہیں چاروں طرف
حوصلہ دیکھیے جینے والوں کا

اس قطعہ کے بعد غزل عطا ہوئی ہے ؎

کیا تعلق ہے انھیں گردشِ ایام کے ساتھ
سایۂ زلف میں سوتے ہیں جو آرام کے ساتھ
تجھ کو ہو جائے گی معلوم حقیقت اے دوست
دو قدم چل تو سہی گردشِ ایام کے ساتھ
تیرے انفاسِ معطر کا ہے اب تک احساس
تیری زلفوں کی مہک آتی ہے ہر شام کے ساتھ
اشک برساتی ہے شبنم مرے حالِ غم پر
پھول کھلتے ہیں گلستاں میں ترے نام کے ساتھ
خود بخود پاؤں اٹھا کرتے تھے منزل کی طرف
اب تو جی بیٹھا جاتا ہے ہر اک گام کے ساتھ
ساتھ چھوٹا ہے سوئے عشق میں جب سے تیرا
زندگی آنکھ دکھاتی ہے ہر اک گام کے ساتھ
کس کی آمد کی خوشی میں ہے چراغاں عارف
صبح کا نور سمٹ آیا ترے بام کے ساتھ

عارف صاحب کو پوری غزل پر مناسب داد دی گئی ہے۔ اور یہ غزل زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ عارف

[illegible]

[illegible] کلام سُنانے کی دعوت دی ہے
[illegible] عزیزی صاحب۔ جونہی آپ ایک
[illegible] کی سوتو بانہ ڈاڑھی پر سامعین
[illegible] اناؤنسر نے بے ساختہ کہا کہ انور
[illegible] ہیں کہ ؎

[illegible] یہ تو ڈاڑھی کے اضافے پہ نہ جا
[illegible] کو بڑھ خدا کے لئے یہ نہ جا

[illegible] کی آوازیں سنئیں تو سالک صاحب
[illegible] ؎

[illegible] وہ تڑپا کہ آہ کر بیٹھے
[illegible] میں کیا گناہ کر بیٹھے
عشق کرنے کا یہ صلہ پایا
[illegible] دنیا تباہ کر بیٹھے
[illegible] تو مفت میں ہوئی بدنام
ایک دن ہم ہی آہ کر بیٹھے

[illegible] تو ان اشعار کا حق ہے ہی۔ اہل راجستھان
سرزمین راجستھان پر کس قدر اچھے شاعر
راجستھانیوں کی بے اعتنائیوں کا شکار
سنئیے سالک صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

جس کو دو بھر ہو زندگی اپنی
آپ سے رسم و راہ کر بیٹھے
[illegible] کلیم یہ تھا
اعتبارِ نگاہ کر بیٹھے
چوٹ کھائی تھی کل کی قسمت میں
اُن کی جانب نگاہ کر بیٹھے

واہ واہ سالک صاحب۔ ع۔ اللہ کرے
[illegible] زیادہ۔

جرم یہ ہے کہ اپنے دل کو ہم
حسن کی جلوہ گاہ کر بیٹھے
حسرتِ دل یہ کس جگہ جو سے
آپ اُمید [illegible] کر بیٹھے
ہم ہیں وہ اہلِ دل جو اے سالک
جادۂ غم میں چاہ کر بیٹھے

[illegible] کی واہ واہ اور آہ کی آوازوں میں

[illegible] راجستھان سے ایک اور اچھے شاعر جناب [illegible]
سے کلام سُنانے کی درخواست کی ہے۔ سنئیے آزاد
صاحب فرما رہے ہیں ؎

خرد آبادۂ تخریبِ جاں ہے
جنونِ عشق تیرا امتحاں ہے
جلانے پر تلی ہے برق سوزاں
مجھے فکرِ نشیمن آشیاں ہے
بھٹکتا ہوں سرابِ رنگ و بو میں
خداوندا مری منزل کہاں ہے
ہوس کی زندگی ہے چند روزہ
حیاتِ عشق لیکن جاوداں ہے
کوئی کچھ بھی کہے آزاد لیکن
زبانِ ہند تو اُردو زباں ہے

آزاد صاحب مناسب داد و ستائش کے بعد
اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں اور ندا صاحب نے
راجستھان کے ایک اور نوجوان شاعر صاحبزادہ حامد
رشید خاں صاحب ٹونکی سے کلام سُنانے کی گذارش
کی ہے۔ حامد رشید صاحب فرما رہے ہیں ؎

ذوقِ نظر کی داد تجھے اے گلچیں دینے آئے ہیں
غنچے کلیاں پھول فسردہ اچھے باغ لگائے ہیں
آئی یہ خوشی کہ راس ہمیں حسرت ہی کوئی ہے نہیں
حیرت تو یہ ہے اکثر غم بھی راس ہم کو آئے ہیں
تیرۂ شب سے ڈرنے والو ساتھ ہمیں بھی لیتے جاؤ
ان ہی اندھیروں میں تو ہم نے خون سے دیپ جلائے ہیں

حامد رشید خاں صاحب مناسب داد پا کر
مائیک سے ہٹے تو ندا صاحب نے مناسب تعارف
کے ساتھ صاحبزادہ فضل المتین صاحب اجمیری سے
کلام سُنانے کی التجا کی ہے۔ سنئیے متین صاحب
کیا راز افشا فرما رہے ہیں ؎

رازِ محبت افشا ہوگا ۔ محفل محفل چرچا ہوگا
تم جو یونہی خاموش ہوگئے ۔ بات بڑھے گی چرچا ہوگا
ترکِ تعلق کا ہے ارادہ ۔ آج تو اُن کو آنا ہوگا
دیکھیں گے ہم شہر تمہارے ۔ کوئی تو آخر تم سا ہوگا
کیسی آہٹ کوئی نہیں ہے ۔ سُوکھا پتہ کھڑکا ہوگا
ساحل پر خاموشی کیسی ۔ کوئی سفینہ ڈوبا ہوگا

[illegible]
ظالم کیا واقعاتی شاعری کر رہا ہے ؎

بالوں کا ہر اڈہ ہو یا رخساروں کے چاند
روپ دھنش میں ہر دم کوئی نیرنگ رہتا ہے
بات تمہاری اور ہے لیکن اس میں جھوٹ نہیں ہے
ہر عورت کے دل میں کوئی گھر دوار بنا ہے

مہندی لگے ہاتھوں میں نوے کی کالونج
آنکھوں کے ہرن قید میں گھبراتے ہیں
روتے ہوئے بچے پہ نظر پڑتے ہی
چولی کے کئی ٹانکے اُدھڑ جاتے ہیں

داد ہے کہ ریلوے اسٹیشن تک شور سنائی
دے رہا ہوگا۔ اب ندا صاحب ایک نظم "کھلے خواب"
سُنا رہے ہیں۔ آپ بھی سنئیے ؎

سُنا ہے میں نے کئی دن سے تم پریشاں ہو
کسی خیال میں ہر وقت کھوئی رہتی ہو
گلی کے موڑ تک جاتی ہو لوٹ آتی ہو
کہیں کی چیز کہیں رکھ کے بھول جاتی ہو
کچن میں روز کوئی پیالی توڑ دیتی ہو
مسالہ پیس کے یونہی چھوڑ دیتی ہو
نصیحتوں سے خفا مشوروں سے اُلجھن سی
کمر میں درد کی لہریں رگوں میں اینٹھن سی
یقین جانو بہت دور بھی نہیں وہ گھڑی
مرے فسانے کا عنواں بدل چکا ہوگا
مرے پلنگ کی چوڑائی گھٹ چکی ہوگی
تمہارے جسم کا سورج پگھل چکا ہوگا
سُنا ہے میں نے کئی دن سے تم پریشاں ہو

اس نظم پر خوب خوب داد دی گئی ہے اور اصرار
کیا جا رہا ہے کہ ندا صاحب ایک نظم اور سنائیں۔ لیجئے
وہ نظم پیش کر رہے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

وہ شوخ شوخ نظر سانولی سی اک لڑکی
جو روز میری گلی سے گذر کے جاتی ہے
سُنا ہے وہ کسی لڑکے سے پیار کرتی ہے

بہار ہو کہ تلاشِ بہار کرتی ہے
نہ کوئی میل نہ کوئی لگاؤ ہے۔ لیکن
نہ جانے کیوں بس اسی وقت جب آتی ہے
کچھ انتظار کی عادت سی ہو گئی ہے مجھے
اک اجنبی کی ضرورت سی ہو گئی ہے مجھے
مرے دو راندے کے آگے یہ حوس کا چھپتر
گلی کے موڑ پہ اکھڑا ہوا سا اک پتھر
یہ ایک جھکتی ہوئی بد نما سی نیم کی شاخ
اور اس پہ جنگلی کبوتر کے گھونسلے کا نشاں
یہ ساری چیزیں کہ جیسے مجھی میں شامل ہیں
مرے الم میں مری ہر خوشی میں شامل ہیں
میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی یونہی گذرتی رہے
ادا و ناز سے لڑکے کو پیار کرتی رہے

ندا صاحب داد و ستائش میں نہائے ہوئے خلیل تنویر صاحب سے کہہ رہے ہیں کہ اب آپ اپنا کلام سنا دیجئے۔ خلیل تنویر صاحب نے ایک نظم "پاگل" سنائی ہے جس پر انھیں اچھی داد ملی ہے۔ اب انھوں نے "احساس زوال" کے عنوان سے دوسری نظم سنائی ہے اور اس پر مناسب داد پائی ہے۔ اب اعلان ہوا ہے کہ جناب وحید اللہ خان صاحب وحید جودھپوری کلام عنایت فرما رہے ہیں۔ وحید صاحب کا مطلع سماعت فرمائیے ؎

بندۂ عشق ہوں میں بندۂ بے دام نہ کر
جوہرِ ذاتِ انسان کو بدنام نہ کر

ندا فاضلی نے بڑے اچھے الفاظ کے ساتھ جناب شفا گوالیاری سے درخواست کی ہے کہ اب وہ کلام سے شاد کام کریں۔ سنئے شفا صاحب اپنے مخصوص تحت اللفظ میں فرما رہے ہیں ؎

یاد ان کی زندگیٔ مختصر کے ساتھ ہے
مرحبا منزل ہماری رہگذر کے ساتھ ہے
رہروِ گم کردہ منزل کا نہیں اتنا ملال
خیر اس کی مانگیے جو راہبر کے ساتھ ہے

داد و ستائش کی آوازوں میں ہی شفا صاحب فرما رہے ہیں ؎

خوفِ تشہیر احترامِ حسن خودداریٔ عشق
کشمکش کی ایک دنیا چشمِ تر کے ساتھ ہے
قافلے والو! خبر تو لو کہ اپنا قافلہ
راہزن کے ساتھ ہے یا راہبر کے ساتھ ہے

داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے اور شفا صاحب فرما رہے ہیں ؎

ہے زوال انسان کو انسانیت ہے لازوال
اے شفا اک معتبر نا معتبر کے ساتھ ہے

شفا صاحب مائیک سے ہٹے تو قہقہوں کی چھاؤں تلے پروفیسر غلام احمد صاحب فرقت کاکوروی مائیک پر آتے دکھائی دیئے۔ آپ نے اپنی مشہور نظم "بچوں کی پیدائش" سنا کر وہ داد پائی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ خدا خدا کرکے سامعین نے فرقت صاحب کو مائیک سے ہٹنے دیا تو ندا صاحب نے جناب ہاشم علی خان راز چھپوری سے کلام سنانے کی گزارش کی ہے۔ سنئے راز صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

جس کو دیکھو کہہ رہا ہے زندگی ناکام ہے
زندگی صحرا کی ایک ڈھلتی ہوئی سی شام ہے
زندگی خود تو نہیں بنتی بگڑتی دوستو!
زندگی پر کس لئے اتنا بڑا الزام ہے

یادِ ماضی کو کیا کہوں ہمدم
بھولی بسری سی اک کہانی ہے
کل کی باتوں کو راز رہنے دو
کل تو بچپن تھا اب جوانی ہے

راز صاحب قطعات پر اچھی داد پا کر اپنی جگہ گئے تو امجد جودھپوری کو مائیک پر بٹھا دیا گیا ہے اور خدا معلوم انھوں نے کیا کیا سنایا۔ خدا خدا کرکے انھوں نے مائیک چھوڑا تو ندا صاحب نے حامد سعید خان صاحب ساحل ٹونکی کو کلام سنانے کی زحمت دی ہے۔ سنئے ساحل صاحب کس قدر بہترین غزل عطا فرما رہے ہیں ؎

اس تیرگیٔ شامِ الم سے مفر تو ہو
وہ چاہے صبح تو نہ ہو لیکن سحر تو ہو
منزل تو اتنی دور نہیں راہرو۔ مگر
دل میں خلوصِ نیتِ عزمِ سفر تو ہو
اے ذوقِ سجدہ یہ تری غیرت کو کیا ہوا
سر جس جگہ جھکے وہ کوئی سنگِ در تو ہو
ہر چند لاعلاج نہیں ہے مریضِ غم
لیکن مرض شناس کوئی چارہ گر تو ہو
ہر شب کے بعد ہوتی ہے رسماً سحر تو کیا
کوئی سحر ہماری برنگِ سحر تو ہو
ہر چند سازگار زمانہ نہ ہو مگر!
ساحل گرہ میں اپنی متاعِ ہنر تو ہو۔

ساحل صاحب کے بعد پروفیسر شہاب جعفری کو نہایت اچھے ڈھنگ سے متعارف کرانے کے بعد ندا صاحب نے کلام سنانے کی دعوت دی ہے۔ شہاب صاحب نے ایک اچھی غزل سنانے کے بعد اپنی مشہور نظم "سورج کا شہر" سنا کر خاصی داد پائی ہے۔ افسوس ہے کہ شہاب صاحب نے بارہا وعدہ فرمانے کے باوجود نظم اور غزل کی نقل مہیا نہیں کی۔ اب نقیب الشعراء یہ نوید جانفزا دے رہا ہے کہ صدرِ مشاعرہ حضرت اعجاز صدیقی کلامِ بلاغت نظام عطا فرما رہے ہیں۔ سنئے ؎

لوگ کس لئے آخر ٹھوکریں وہ دیوں چل کر ساتھ آئے ہیں
ہم تو خود ہی رہبر تھے خود ہی اپنی منزل تھے جب قدم اٹھائے ہیں
میکشو ابھی تک تو بات صرف بیتی ہے رقصِ جام و مینا تک
ان کا ذکر بھی چھیڑو جن کی مست نظروں نے میکدے بنائے ہیں
جذب و شوق کے مارے خلوتِ محبت تک جب اوان جو وہاں پہنچے
دھڑکنیں بڑھیں دل کی سانس تیز تیز آئی پاؤں لڑکھڑائے ہیں
ہم نصیب بیداری ہائے رے یہ سرشاری نیند آئی جاتی ہے
عارضوں کی رنگت ہے انکھڑیوں کا جادو ہے گیسوؤں کے سائے ہیں
میکدہ جب ان کا ہے وضعِ میکشی ان کی اعتماد کیا جائے
جام خوب چھلکائے مستیاں بکھیری ہیں جھکم یہ غم لنڈھائے ہیں
ہم سے آنسوؤں میں بھی دلکشی نہیں پیدا روشنی نہیں پیدا
مسکرانے والے تو دار کی بلندی پر جا کے مسکرائے ہیں
جو لبِ محبت پر آئے اس کو آنے دیں اعتبار رہنے دیں
دل کی واردانوں میں آپ نقدِ معنی کی قید کیوں لگائے ہیں
دیکھنا فقط یہ ہے ان میں اپنی نکہت ہے ان میں اپنی خوشبو ہے
موسمِ بہاراں نے پھول یوں تو کتنے ہی باغ میں کھلائے ہیں
روشنی کے شیدائی ہم بھی اور تم بھی ہو فرق صرف اتنا ہے
تیرہ رہگذاروں میں تم دیئے جلاتے ہو ہم نے دل جلائے ہیں

نفسی ہے پوزیدہ زندگی سے ہیں پیدا نظر آرہا ہیں اعجاز ... دنیا میں آدمی نہیں شاید آدمی کے سالے ہیں۔

صاحبِ صدر کو ہر شعر پر داد جھولیاں بھر کر دی گئی ہے۔ اب دورِ اوّل تو ختم ہو چکا ہے اور سامعین ویسے ہی جمے بیٹھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مشاعرہ جاری رہے۔ لہٰذا دیکھا تو شاد صاحب اپنے ہوش و حواس سنبھالے از خود ہی مائیک پر آ کر بیٹھ گئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا نام اب نہیں پکارا جائیگا اور اپنا حال یہ ہے کہ شعر سنانے کا موڈ ہی اب آیا ہے۔ اس کے بعد شاد صاحب نے وہ شعر سنائے ہیں کہ اہلِ ادب پوری مدت تو یاد رکھیں گے اور ایمانداری کی بات بھی یہ ہے کہ شاد آج شعر سنانے کے موڈ میں ہے۔ یوں گھنٹے تک شاد صاحب کلام سناتے رہے۔

اس کے بعد صاحبِ صدر نے مشاعرہ ختم ہونے کا اعلان فرما دیا ہے۔

ایڈز

خود کو کیسے بچائیں



ایڈز انتہائی خطرناک بیماری ہے اور ابھی تک اس کا کوئی علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں بے پناہ افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ لیکن خود کو اس سے بچانا مشکل نہیں ہے بشرطیکہ اس سے متعلق آپ چند حقائق کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

ایڈز کیا ہے؟

ایڈز انگریزی کے چار الفاظ ایکوائرڈ ایمیونو ڈیفی شنسی سنڈروم کے ابتدائی حروف کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک ایسے وائرس کے سبب ہوتا ہے جو انسانی جسم کے خود حفاظتی نظام کو تباہ کر دیتا ہے۔

یہ کیسے پھیلتا ہے

صحت مند آدمی ایڈز کے وائرس کا شکار اس وقت ہی ہوتا ہے جب اس کے جسم میں ایڈز کے مریض کا خون یا مادہ منویہ داخل ہو جائے۔ زیادہ تر افراد ایڈز کے مریض کے ساتھ جنسی اختلاط کے نتیجے میں ہی ایڈز وائرس کا نشانہ بنتے ہیں۔ باقی لوگ متاثرہ مریض کی استعمال شدہ انجکشن سوئی کو استعمال کرنے سے اس خطرناک مرض کا نشانہ بن جاتے ہیں اور ایسے واقعات زیادہ تر نشیلی دوائیوں کے عادی افراد میں عموماً پائے جاتے ہیں۔ ایڈز کے کسی مریض کا خون دیا جانا ایڈز کے پھیلاؤ کے لئے بہت کم ذمہ دار ہے۔

لازمی نہیں ہے کہ ہر وہ آدمی جس میں ایڈز کا وائرس موجود ہے اس مرض کا شکار بھی ہو جائے۔ درحقیقت زیادہ تر معاملات میں ایسا نہیں ہوتا ہے لیکن کوئی بھی آدمی جس میں یہ وائرس موجود ہے اس وائرس کو دوسرے شخص کو منتقل کر سکتا ہے چاہے وہ خود کو مکمل طور پر صحتمند محسوس کرتا ہو اور دیکھنے میں بھی ایسا ہی نظر آتا ہو۔

آپ ان چیزوں سے ایڈز کا شکار نہیں ہو سکتے:

— عمومی سماجی تعلقات جیسے ہاتھ ملانا، چھونا اور بغل گیر ہونا۔
— سوئمنگ پول، ریستوران اور دیگر عوامی مقامات پر۔
— کھانسی، چھینک، تھوک۔
— کپڑوں کے استعمال سے۔
— ٹوائیلیٹ سیٹ، دروازوں کے ہینڈل وغیرہ، کھانا، عینک اور پیالیاں

آپ ایڈز وائرس کا شکار نہیں ہو سکتے جب:

آپ خون کا عطیہ کرتے ہیں۔
آپ ڈاکٹر، ڈینٹسٹ یا کسی دوسرے ہیلتھ کیر ورکر سے انجکشن لگواتے یا علاج کرواتے ہیں۔

ان چیزوں سے بچیں:

— اجنبی افراد کے ساتھ جنسی اختلاط۔ یہ ہمیشہ ہی خطرناک ہوتا ہے۔ اجنبی فرد کے بارے میں آپ نہیں جانتے کہ وہ اس مرض سے متاثر ہے یا نہیں۔
— غیر فطری جنسی اختلاط۔ اس میں بہت زیادہ خطرہ ہے اور اس سے ہر حال میں بچنا چاہیئے۔
— جتنے زیادہ افراد کے ساتھ جنسی اختلاط ہوگا خطرہ اتنا ہی زیادہ بڑھ جائے گا۔
— نشیلی دواؤں کے عادی لوگوں کی استعمال شدہ انجکشن سوئی استعمال نہ کریں۔

یاد رکھئے

ایڈز ایسی بیماری نہیں ہے جس کے خطرے کو محض خوش فہمی میں نظر انداز کیا جا سکے۔ کیونکہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ایڈز کا کنٹرول لوگوں کے رویے اور انسدادی تدابیر پر منحصر ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے لکھیں:

اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل (ایڈز)
ڈائریکٹوریٹ جنرل آف ہیلتھ سروسز، نرمان بھون
نئی دہلی 110011.

ایڈز کا علاج نہیں
لیکن آپ اس سے بچ سکتے ہیں

جاری کردہ: سنٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو
ڈی جی ایچ ایس، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی۔ 110002

davp 88/349 URDU



تحفہ

فضہ شبیر

بھائی جان بھائی جان کے نعرے لگاتی اور دوڑتی ہوئی صبا جاوید کے کمرے میں آئی۔ اور اس کے بال بگاڑتے ہوئے بولی: "آج بھی آپ اتنی دیر سے گھر آئے۔ میں کتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

جاوید نے جوابی کارروائی کے طور پر اس کے سر پر ایک چپت مارتے ہوئے پوچھا: "کیوں آج کیا خاص بات ہے جو آپ ٹائم سے پہلے ہی میرا انتظار فرما رہی تھیں۔"

"اُفوہ! آپ بھول گئے۔ آج تو آپ کو میرے لیے مٹھائی لانا تھی۔"

"کیوں! کیا تمھاری آخری خواہش وغیرہ ہے یہ۔"

"جی نہیں۔ بلکہ آج آپ کی برتھ ڈے، سالگرہ یعنی جنم دن ہے۔"

جاوید ایک دم سے چونکتے ہوئے بولا: "اوہ! ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔"

"اچھا تو اب آپ ڈبل مٹھائی کھلائیے۔ ایک تو اپنی سالگرہ کی خوشی میں اور دوسرے آپ کو یاد دلانے کا میرا انعام۔" صبا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھولتے ہوئے کہا۔

چڑانے والے انداز سے جاوید بولا: "ہوں ڈبل مٹھائی۔ بغیر کسی تحفے کے آگئیں سالگرہ کی مٹھائی کھانے۔"

"جی نہیں۔ یہ کس نے کہا۔ تحفہ تو میں نے کئی دن پہلے ہی لا کر رکھ دیا تھا۔"

"لے آئی ہوگی کوئی سڑی گلی چیز۔"

"میں اپنی پسند سے ایک بہت خوب صورت چیز لائی ہوں۔ اپنی پسند سے معلوم ہے یعنی آپ کی پسند میری پسند تو آپ کو ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مسز حسن نے آواز دی: "صبا، جاوید کیا کر رہے ہو تم لوگ آؤ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

جاوید صبا سے: "چلو چلو تم بھی کیا یاد کروگی ہم تم کو ابھی شاندار سی ٹی پارٹی دیئے دیتے ہیں۔"

مسز حسن ان کے انتظار میں چائے ناشتہ میز پر سجائے بیٹھی تھیں۔ کونے میں ایک خوب صورت سا پیکٹ بھی رکھا تھا جس پر سنہری حروف میں "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" لکھا تھا۔ کونے میں صبا لکھا تھا۔ پیکٹ پر نظر پڑتے ہی جاوید اس کی طرف لپکا مگر اس سے پہلے ہی صبا نے پیکٹ اٹھا لیا۔ اور گردن ہلاتے ہوئے بولی: "اوں ہوں، پہلے مٹھائی۔"

"تو بھرتی کیوں نہیں۔ یہ کیا رکھی ہے۔" جاوید نے مٹھائی کی پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ نہیں۔ آپ اپنی جیب سے لا کر دیجیے۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں چھینے لیتا ہوں۔" مگر صبا نے پیکٹ دونوں ہاتھوں میں لے کر سر سے اونچا کیا اور سہیر پہ چڑھ گئی: "پہلے مٹھائی، پہلے مٹھائی۔"

"صبا یہ کیا بدتمیزی ہے! چلو نیچے اترو اور ٹھیک سے بیٹھو۔" بیگم حسن نے ڈانٹا۔ صبا منہ پھیلا کر نیچے اتری اور پیکٹ گود میں رکھ لیا۔ جاوید نے ہاتھ پیچھے کر کے انگوٹھا دکھایا۔ اور صبا اس کے انگوٹھے پر

کیپٹا اس نے کو ہاتھ بڑھانے لگی اور اسی بیچ جاوید نے پیکیٹ اس کی گود سے اُٹھا کر کھولنا شروع کر دیا۔ پیکٹ سے ایک خوب صورت ڈائری ایک ڈکشنری اور ایک سیٹ پین کا نکلا۔ جاوید کو یہ تحفہ واقعی بہت پسند آیا۔ اُس نے مُسکراتے ہوئے بہن کو دیکھا اور صبا ہنس پڑی: "دیکھا میری پسند آپ کو پسند آئی نہ!" اور شکریہ کے طور پر جاوید نے ہنستے ہوئے بہن کے مُنہ مٹھائی رکھ دی۔

"بھائی جان پلیز آج آپ کالج سے مجھے لے آئیے گا۔" صبا نے آفس جاتے وقت جاوید سے کہا۔

"مگر میرے پاس بالکل ٹائم نہیں کہ میں آفس سے اُٹھ کر تمہیں گھر پہنچاؤں۔"

"آج آپ کو تھوڑی آفس ٹائم میں تھوڑی آنا پڑے گا۔ بس لنچ ٹائم میں ہی مجھے گھر پہنچا دیجئے۔"

"کیوں؟ اُس وقت کیوں۔ جب تک تو تمہاری چھٹی بھی نہیں ہوتی ہے۔"

"اسی لئے تو آپ سے کہا ہے۔ اصل میں آج میں اور امّی اپنے لئے ایک بھابی دیکھنے جا رہے ہیں۔ بھیا پلیز آج آپ انٹرول سے ہی مجھے چھٹی دلا لائیں نہ۔" صبا نے خوشامد سے کہا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ اِس طرح تم اور بھی پڑھائی میں پیچھے ہو جاؤ گی۔" جاوید نے بہن کو چڑاتے ہوئے کہا۔ اور تبھی بیگم حسن نے کمرے سے آتے ہوئے جاوید سے کہا۔ "جاوید، آج تم صبا کو ہاف ٹائم پر گھر پہنچا دینا۔" اور ماں کے کہنے پر جاوید نے آہستہ سے "جی اچھا" کہا اور سلام کر کے آفس چلا گیا۔

جاوید نے چپراسی سے صبا کو گیٹ پر جلدی آنے کے لئے کہلوایا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا آفس سے نکل کر گیٹ کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ گراؤنڈ میں ہی تھا کہ کوئی موٹی سی چیز اُس کی آنکھ پر زور سے پڑی اور اُس نے بے ساختہ اُف کرتے ہوئے آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ "سوری" کی خوب صورت آواز پر نظر اُٹھا کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ گلابی گلابی رنگت، بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں اور ننھا سا دہانہ ماتھے پر چھوٹے چھوٹے گھونگھریالے بال۔ وہ کالج کی سفید یونیفارم میں بھی بے انتہا حسین لگ رہی تھی۔ جاوید کو اس طرح اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ دوسری طرف مُڑ گئی۔ اور تب اُس نے دیکھا اُس کی آنکھ پر پڑنے والی چیز لڑکی کی موٹی سی بھوری چوٹی تھی جو شرٹ کے دامن کو چھو رہی تھی۔ اُس کو آگے قدم بڑھاتے دیکھ کر جاوید شرارت سے بولا: "محترمہ اپنا نام تو بتاتی جائیے کہ میں اِس چوٹ کا بدلہ لے سکوں۔" اُس نے مُڑ کر ایک نظر جاوید پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔ جاوید کی آنکھ میں ابھی تک جلن ہو رہی تھی۔ اُس کو کم کرنے کے لئے اُس نے پائپ سے مُنہ دھویا اور رومال سے مُنہ پونچھتا ہوا گیٹ کی طرف آ گیا۔ گیٹ پر وہی لڑکی صبا سے کہہ رہی تھی "نہیں صبا آج تو میں بالکل نہیں آسکوں گی کیوں کہ آج گھر پہ کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ صبح سے صفائی وغیرہ کر رہی اور بڑی زبردستی سے آج کالج آئی ہوں۔ امّی منع کر رہی تھیں۔ اب اگر کالج سے جانے کے بعد تمہارے یہاں کا پروگرام بنا لیا تو پٹائی ہو جائے گی۔"

جاوید نے دُور ہی سے صبا کو گردن سے باہر آنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل گیا۔ ذرا ہی دیر میں صبا بھی آ گئی اور جاوید نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"سنو چھوٹیا ہم اِسی لڑکی کے گھر امّی کو کیوں نہ لے جائیں۔" جاوید نے صبا سے کہا۔

"اِسی؟ کون سی لڑکی؟" صبا نے پوچھا۔

"وہی جو گیٹ پر کھڑی تم سے باتیں کر رہی تھی۔"

"وہ تو کالج میں ہے۔ وہاں تو ہزاروں لڑکیاں روز آپس میں باتیں کرتی ہیں۔ کچھ نام و پتہ سمجھائیے۔" صبا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے وہی لڑکی۔" جاوید نے یاد دلانے کے لئے تفصیل بتائی۔ "جس کو تم آج گھر پر دھاوا بولنے کی دعوت دے رہی تھی جب کہ خود گھر سے غائب رہتی ہے۔"

صبا نے ہنس کر کہا۔ "ارے وہ تو میں مذاق کر رہی تھی کیوں کہ مجھے پتہ ہے کہ وہ کہیں جانے کے معاملے میں بہت کنجوس واقع ہوئی ہے۔" جاوید جلدی سے بولا: "ہاں ہاں اُسی لڑکی کے لئے کہہ رہا ہوں میں۔"

"مگر آپ کو کیا پتہ کہ وہ کنجوس ہیں کہیں جانے آنے کے معاملے میں۔" صبا نے اصلی بات کو اُڑاتے ہوئے کہا۔ جاوید نے گھر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ "میں اُس کی کنجوسی کی نہیں اُس کے گھر کی بات کر رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔ اُس کا گھر تو شاید کرلے کا ہے ویسے مجھے ٹھیک سے پتہ بھی نہیں۔ شاید اُن لوگوں کا اپنا ہی ہو۔" صبا نے مُسکراہٹ روکتے ہوئے کہا۔

مگر آج اتنے دن کی خاموشی کے بعد بیگم حسن نے اُس کو بُلا کر کہا تھا: "جاوید بیٹا۔ تم کو ٹائم ہو تو بہن کو لے کر ایک چکّر مارکیٹ کا لگا آؤ۔ اب اُس کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئی ہیں اِس لئے میں سوچ رہی ہوں کہ اگلے جمعہ کو رسم کر دوں۔"

جاوید نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیسی رسم امّی؟"

بیگم حسن نے مُسکراتے ہوئے پُرشفقت لہجہ میں کہا: "بنو نہیں صبا نے مجھے بھی بتا دیا تھا کہ بھائی جان بہت خوش ہیں اِس رشتے پر اور منگنی کے لئے ضد کر رہے ہیں۔"

جاوید نے تیار ہو کر آتی ہوئی صبا کو دیکھ کر کہا۔ "مگر امّی مجھے تو کچھ بھی پتہ نہیں۔"

بیگم حسن کے کچھ بولنے سے پہلے ہی صبا نے جلدی سے کہا: "اچھا تو آپ کو یہ نہیں معلوم کہ میری ہونے والی بھابھی کا نام شبینہ ہے۔ یا یہ نہیں معلوم کہ جمعہ کو آپ کی اُن سے منگنی ہو رہی ہے۔ یا یہ نہیں معلوم کہ آپ اِس وقت اپنی منگنی کے لئے شاپنگ کرنے جا رہے ہیں۔"

"اُفوہ!" اُس کی تیزی سے چلتی ہوئی زبان کو روکنے کے لئے جاوید بولا: "مجھے سب کچھ معلوم ہے۔" اور جلدی سے مارکیٹ جانے کے لئے اُٹھ گیا۔

جاوید نے کئی بار یہ کوشش کی کہ صبا کسی طرح سے اُسے شبینہ کے بارے میں کچھ اور بتائے مگر ہر بار صبا نے ٹال دیا

لئے یہ وارننگ بھی دی کہ وہ امی سے یہ نہیں بتائے
! کہ صبا نے شبینہ کا فوٹو اُس کو نہیں دکھایا ہے۔
رنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور باتوں باتوں میں یہ
ی بتا دیا کہ کالج کے گیٹ پر بات کرنے والی اُس
ا سہیلی کی بھی منگنی ہوگئی۔ اور جنوری میں شادی
ں ہے۔

بیگم حسن نے اپنے اکلوتے بیٹے کی منگنی کافی
ھوم دھام سے کی۔ صبا بھی بھائی کی منگنی پر بے حد
ش تھی مگر جاوید کمپنی کی طرف سے اچانک ٹور پر جانے
ا وجہ سے اپنی ہی منگنی میں شریک نہ ہوسکا۔

اکتوبر کا آخری ہفتہ تھا۔ موسم کافی خوش گوار
تھا۔ صبا صبح سے ہی کالج کی چھٹی کرکے گھر کو سجا سنوار
رہی تھی۔ بیگم حسن بھی خوشی خوشی جاوید کی پسند کے کھانے
بنوا رہی تھیں۔ آج وہ اپنے ٹور سے واپس آ رہا تھا۔
سب کام کرکے صبا تیار ہونے لگی۔ ابھی وہ غسل خانے
ہی میں تھی کہ جاوید آ گیا۔ بیگم حسن نے بیٹے کو پیار کیا،
گلے سے لگایا اور اپنے پاس بٹھا کر باتیں کرنے لگیں
جاوید نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بیگم حسن سے پوچھا
امی کیا صبا کالج سے نہیں آئی؟"

"ارے آج وہ کالج گئی ہی نہیں۔ وہ تو ابھی
ابھی نہانے گئی تھی۔"

صبا جاوید کی آواز سن کر جلدی جلدی
نہا کر باہر نکلی اور دوڑ کر بھائی سے لپٹ گئی۔
"بھائی جان آپ جلدی سے میرا انعام نکالئے
تو میں آپ کو ایک خوش خبری سناؤں۔" صبا
نے بے صبری سے کہا۔

"تو پھر تم بغیر انعام کے ہی بتا دو کیا بات
ہے؟" جاوید نے کہا۔ اور صبا جلدی سے بولی۔
جنوری میں آپ کی شادی ہے۔ دس جنوری کو آپ
کی برتھ ڈے کے دن۔ جاوید نے اُس کی طرف دیکھا
منہ چڑایا

صبا اور بیگم حسن شادی کی تیاریوں میں مصروف
تھیں۔ اب شادی میں صرف ہفتہ بھر باقی تھا اور
پردیسی مہمان آنا شروع ہوگئے تھے۔ کوٹھی کی سجاوٹ
وغیرہ شروع ہوگئی۔ صبا کو روزانہ اپنی اور بھابھی کی
چیزوں میں کچھ نہ کچھ کمی نظر آتی اور وہ جاوید کو مارکیٹ
کے چکر لگواتی تھی۔ خدا خدا کرکے شادی کا دن بھی
آگیا۔

شام ہوتے ہوتے بارات دلہن
کے ساتھ اور زیادہ خوشیاں اور چہل پہل لے کر
واپس آگئی۔ عورتیں دلہن کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑی
تھیں اور اُس کی خوب صورتی دیکھ کر حیران رہ گئیں
بیگم حسن خوشی خوشی مبارک باد وصول کر رہی تھیں۔
اور بار بار آ کر اپنی بہو کو پیار کر رہی تھیں۔ صبا
خوشی خوشی سب کو اپنی پیاری سی بھابھی دکھا رہی
تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد بیگم حسن نے صبا سے کہا۔
"صبا اب بھابھی کو لے جاؤ ناشتہ کراؤ اور ذرا دیر
آرام کرنے دو۔"

صبا شبینہ کو لے کر دوسرے کمرے میں آگئی۔
منہ ہاتھ دھلوا کر ہلکا سا ناشتہ کرایا، کافی پلائی،
اور اچھا سا میک اَپ کرکے اُس کو صوفے پر بہت
اچھے اسٹائل سے بٹھا دیا۔ پھر جاوید کے کمرے میں
آئی۔ یہاں پر اُس کے سب دوست جاوید کو گھیرے
بیٹھے تھے۔ ہنسی مذاق کے ساتھ کافی سگریٹ اور
خشک میووں کا دور چل رہا تھا۔ صبا نے جاوید سے
کہا۔ "بھائی جان، آپ کو امی بلا رہی ہیں۔" جاوید
کمرے سے باہر آیا اور صبا اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے
کمرے کی طرف لانے لگی۔

"ارے یہ تمھارے کمرے میں امی کیوں بلا
رہی ہیں؟" جاوید نے پوچھا۔

صبا نے ہنس کر جواب دیا: "آپ بھول گئے
آج آپ کی برتھ ڈے ہے اور ہم آپ کو تحفہ دینے کے
لئے اپنے کمرے میں لے جا رہے ہیں۔"

"مگر دیکھو کوئی ایسی ویسی چیز نہ دینا نہیں
تو مہمان دیکھ کر ہنسیں گے۔" جاوید نے چھیڑا۔

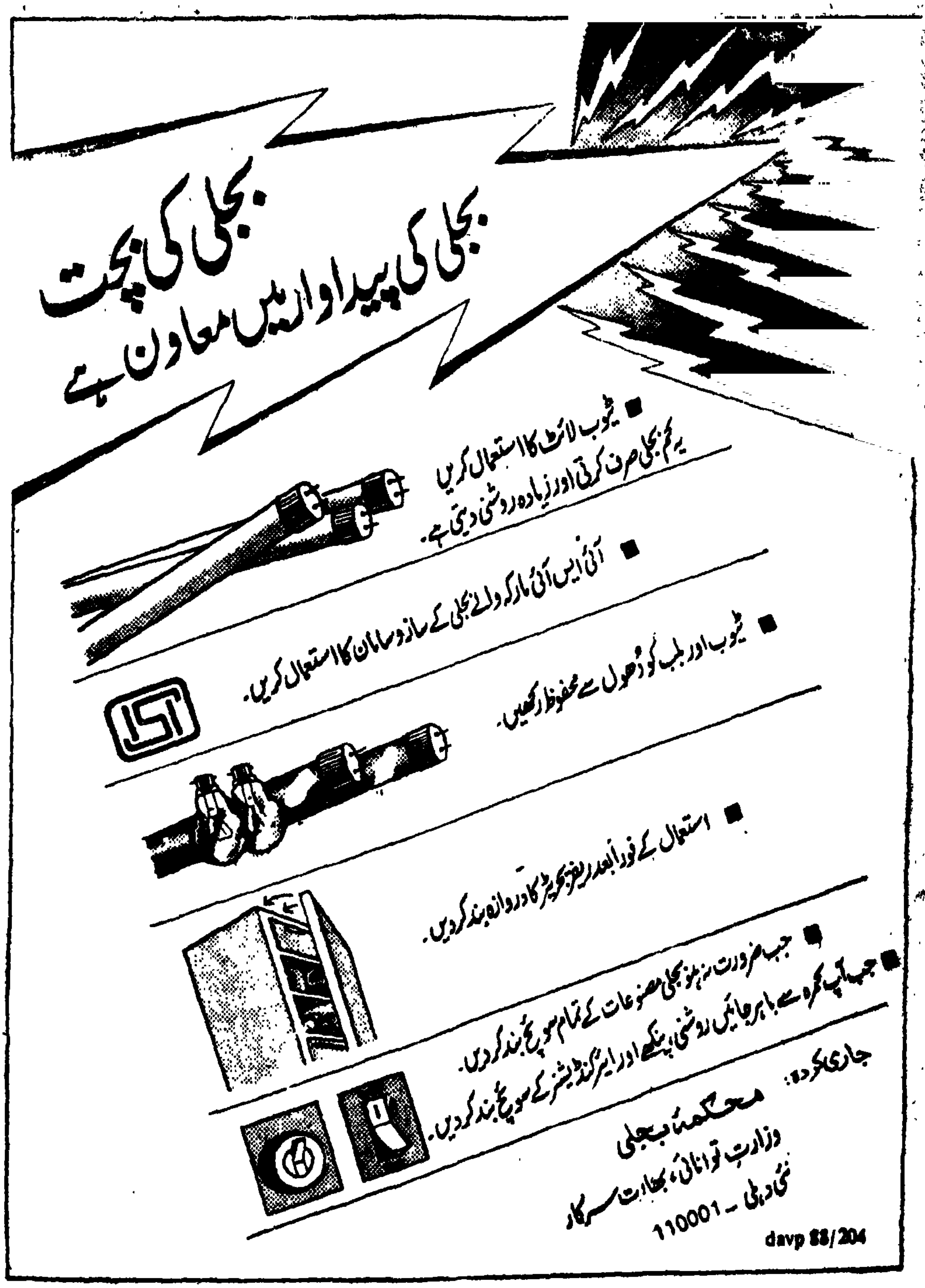
صبا نے ہمیشہ کی طرح چڑنے کے بجائے کہا
"نہیں۔ چیز تو بہت اچھی ہے۔ میری پسند کی ہے۔
اور اُمید ہے کہ آپ اِس تحفے کو بہت زیادہ پسند
کریں گے اور دونوں صبا کے کمرے میں آگئے۔
صبا نے جاوید کو صوفے کے پاس لا کر کھڑا کیا اور ہولے
سے شبینہ کے چہرے پر آنچل پلٹ دیا۔ اور بولی۔
"دیکھئے بھائی جان، تحفہ بہترین ہے نا!"

جاوید نے نظریں اُٹھائیں اور دیکھتا
رہ گیا۔ ایک بار پھر وہی خوب صورت چہرہ اُس
کے سامنے تھا مگر آج وہ اُس کا اپنا تھا اور کالج
کے سفید یونیفارم کے بجائے سُرخ عروسی لباس میں
دمک رہا تھا۔ صبا اُس کی محویت دیکھ کر ہنس پڑی۔
اور شبینہ نے شرما کر سر کچھ اور جھکا لیا۔

سرور تونسوی کے شدید علیل
ہوجانے کے باعث شانِ ہند کا یہ شمارہ
لیٹ شائع ہورہا ہے۔
قارئین کرام سرور صاحب کی صحت کیلئے دعا
فرمائیں۔ اکتوبر کا شمارہ اِسی ہفتہ بھجوایا جارہا ہے۔

مظہر صحرائی
جوائنٹ ایڈیٹر

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔


بجلی کی بچت
بجلی کی پیداوار میں معاون ہے
ٹیوب لائٹ کا استعمال کریں
یہ کم بجلی صرف کرتی اور زیادہ روشنی دیتی ہے۔
آئی ایس آئی مارک والے بجلی کے سازوسامان کا استعمال کریں۔
ISI
ٹیوب اور بلب کو دُھول سے محفوظ رکھیں۔
استعمال کے فوراً بعد ریفریجریٹر کا دروازہ بند کردیں۔
جب ضرورت نہ ہو بجلی مصنوعات کے تمام سوئچ بند کردیں۔
جب آپ کمرہ سے باہر جائیں روشنی، پنکھے اور ایئر کنڈیشنر کے سوئچ بند کردیں۔
جاری کردہ:
محکمۂ بجلی
وزارتِ توانائی، بھارت سرکار
نئی دہلی ـ 110001
davp 88/204



گوری سوئے سیج پر

مِس پرویز اختر تنہا

ہر طرف مہکتی ہوئی عطر بیز ہوائیں، الھڑ دوشیزاؤں کی طرح بل کھاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی ندیاں، گبرو جوانوں کی طرح جھومتے ہوئے مست اور باوقار درختوں کی لمبی قطاریں، سبزے اور فصلوں سے بھرے ہوئے جھومتے لہلہاتے کھیت، اَن چھوئی کلیوں اور پھولوں کے جھنڈ، چوپال کے نغمے، ترنجن کی کنواری خوشبوئیں اور بہت ہی سادہ و معصوم لوگوں سے آباد میرا یہ گاؤں کہ جس کے نغمے پوری دُنیا میں بکھرے ہیں، "ہیر سیال" گاؤں بھی کہلاتا ہے۔

اسی گاؤں میں چودھری اکرم کی بلند و بالا حویلی بھی تھی جو کئی برس پہلے بہت شاد آباد تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے در و دیوار اپنے مکینوں کو ترسنے لگے۔ اب اس حویلی میں چند ملازموں کے ساتھ مَیں رہتی تھی اور میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی اسلم۔

تعلیم سے فارغ ہو کر میں شہر سے واپس آئی تو زمینداری کے تمام اختیارات رحمان بابا نے مجھے سونپ دیئے جو حویلی کے پرانے اور معتبر ملازموں میں سے تھے۔ مَیں نے اب اپنی تمام تر توجہ زمینوں کی دیکھ بھال اور اسلم کی پرورش پر مرکوز کر کے جینے کی نئی راہ نکال لی تھی۔ اس طرح مَیں اپنی خاندانی وجاہت اور روایات سے سسکتے ہوئے اصولوں کو کسی حد تک برقرار رکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

گاؤں میں جہاں پرخلوص لوگوں کی کمی نہ تھی، حافظ جی کا ایک الگ مقام تھا۔ وہ نابینا تھے۔ کبھی کبھی بچے ان سے پڑھنے بھی آجاتے۔ اُن کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی گوری کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن کے پاس تھوڑی سی زمین تھی جس سے بخیر و خوبی بسر اوقات ہو رہی تھی۔ گوری اُن کی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ بڑی پیاری لڑکی تھی، پیاری بھی اور بے حد حسین بھی۔ حُسن کے ساتھ شوخی اور شرارت بھی اُس کے مزاج کا حصّہ تھی۔ اور صرف یہی نہیں، وہ ہاتھ چھُٹ بھی تھی۔ اوّل تو وہ لڑکیوں کے ساتھ کھیلنا اپنی توہین سمجھتی تھی۔ اگر کبھی کھیل بھی لیتی تو جلد اُکتا کر لڑکوں کے ساتھ مِل جاتی۔ اُسے یہ احساس تک نہ تھا کہ وہ ایک لڑکی ہے۔ ہمارے گھر بھی جب اُس کا جی چاہتا بلا روک ٹوک آجاتی۔ پھولوں سے اُس کی چنری بھری ہوتی۔ پھول میرے پاس ڈھیر کر دیتی اور مجھے اپنی شوخ باتیں بتاتی۔ پھر میرے چھوٹے بھائی کو لے کر کھینچے چلی جاتی۔ جب بھی بہار کی ہوائیں چلتیں اور اپنے ساتھ بے آواز پیار کا پیغام لاتیں، تو گوری ہواؤں بلی خوشبو کے جھونکے کی طرح میری لائبریری میں آکر مجھ سے جنگ جُو شہزادوں اور عیّار شہزادیوں کی کہانیاں سُنانے کو کہتی۔ اس دوران پھر کہیں کسی کا ذکر آ جاتا، جھٹ سے ہی وہ بھاگ جاتی۔

کبھی وہ صبح ہی صبح بھاگی ہوئی آتی، انگوروں کی بیلوں سے بسا اور وہ گھر مَیں نے رات کو خواب میں دیکھا تھا۔ مَیں اور اسلم اُس گھر میں رہے اور پھر اسلم نے زور سے مجھے جگا دیا۔"

آج پھر ویسا ہی موسم ہے اور میں گوری کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی ہوں جو زندہ لمحوں کی زنجیر سے آس پاس بے آواز قدموں سے چھم چھم کرتی ہوئی منڈلا رہی ہے اور مجھے آوازیں دے رہی ہے "آپا! ... وہ شہزادے کہاں ہیں؟ مجھے تو ابھی تک کوئی نہیں ملا"۔

تعلیم سے فارغ ہو کر میں نے ایک چھوٹی سی لائبریری بنائی تھی جس میں رفتہ رفتہ نایاب کتابوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ اسلم کی معصوم باتوں اور گوری کی شرارتوں نے میرا دل جیت لیا تھا شہر میں کالج اور یونیورسٹی کی تمام تلخ و شیریں یادیں میرے ذہن سے محو ہوتی جا رہی تھیں۔ یوں بھی اسلم کو ایک سچا اور محنتی طالب علم بنانے کے لئے میں دن رات کوشاں تھی مگر وہ نہ جانے کیسے مجھے جُل دے کر گوری کے ساتھ بھاگ نکلتا۔ وہ مجھ سے کئی سال چھوٹا تھا اور مجھے عزیز بھی بہت تھا۔ اس لئے میں اُسے کم ہی ڈانٹتی پھٹکارتی تھی۔ وہ گوری کے ساتھ کھیلنے نکل جاتا تو بھی میں طرح دے جاتی۔ گوری کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ اُسے لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہئے معلوم نہیں کیوں وہ لڑکوں کے ساتھ کھیل کر خوش ہوتی تھی۔ اس سے گاؤں کی تمام ہی لڑکیاں ڈرتی تھیں کیونکہ وہ کمزور یا بزدل لڑکی نہ تھی۔ وہ باقاعدہ لڑکوں کا مقابلہ کرتی، اُن سے لڑتی، کردیوں کی شکل میں ڈٹ جاتی اور ہمیشہ جیت کر میرے پاس بھاگی آتی "آپا! وہ جو بنتا ہے نا ماجی کا لڑکا مردود اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتا ہے۔ اسلم سے اُس نے ایک ہلکی سی شرط جیت لگائی تھی، میں نے بھی اُس کا بازو مروڑ کر زمین پر پٹخ دیا اور ایسا کہ وہ ساری عمر یاد کرے گا" پھر وہ اسلم سے مخاطب ہوتی "تو بھلا کیوں منہ لٹکائے رکھتا تھا؟ خبردار جو اب کبھی لڑکیوں کی طرح کھیل میں منہ بنایا" اسلم کو وہ "اچھے" بھی کہتی تھی۔

غصے میں تیز ہونے کی وجہ سے وہ کبھی سُرخ ہو جاتی تو بالکل گلاب کا پھول لگتی۔ تپتے ہوئے چہرے کے رنگ میں بولتی جھلکتی وہ لسّی کا گلاس بھرتی اور گھونٹ لیتی۔ ایک ہی سانس میں پی کر چلی جاتی۔ ظاہر ہے اسلم سے اس کی دوستی تو ہونا ہی تھی وہ اسلم سے چند سال چھوٹی تھی مگر بڑی لگتی تھی۔ اپنی فطرتی مادری کی وجہ سے وہ اکثر اسلم کو زیر کر لیتی۔ اسلم میرے پاس پڑھ رہا ہوتا تو وہ آندھی کی طرح آتی اور آتے ہی کہنے لگتی "اوئے اچھے! آخر کیوں تو اتنا پڑھ پڑھ کر اپنی پیاری پیاری آنکھوں کا دشمن بن رہا ہے؟ میں نے تجھے کتنی بار بُلایا مگر تو آیا ہی نہیں!"

اسلم معصوم سی صورت بنا کر کہتا "آپا! کیا تھوڑی دیر کھیل آؤں؟"

میں کچھ سوچتے ہوئے پوچھتی "گوری! یہ تو ایک گھنٹے سے میرے پاس بیٹھا پڑھ رہا ہے۔ آخر تم نے اُسے کب بُلایا تھا؟"

وہ کہتی "آپا! ذرا باہر آ کر تو دیکھیں میں نے غلیل کے ذریعے اس پر گلاب کی کتنی ڈوڈیاں پھینکی ہیں۔ اب میں کیا کروں، اس تک کوئی پہنچی ہی نہیں۔ مجھے کیا پتہ یہ آپ کے پاس بیٹھا ہے۔ چلو اب میرے ساتھ!" وہ اسلم کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی صحن پار کر جاتی۔

بچپن کے یہ معصوم اور شریر دن نت نئی شرارتوں کے ساتھ پر لگا کر اُڑتے گئے۔ مجھے وہ شام خوب اچھی طرح یاد ہے جب میرا اسلم پرائمری پاس کر چکا تھا اور ہائی اسکول کی تعلیم کے لئے اُسے شہر جانا تھا۔ میں نے محسوس کیا گوری کی تیزیوں میں کچھ کمی سی آگئی ہے۔ وہ بار بار اسلم کی چیزوں کو جا کر دیکھتی ہاتھ لگاتی۔ وہ نہ جانے کتنی بار اسلم سے پوچھ چکی تھی کہ کیا واقعی تم جا رہے ہو؟

میرا معصوم اسلم ہر بار اسے جواب دیتا۔ "گوری! میں واقعی جا رہا ہوں، ہاں یہ ضرور ہے مجھے گاؤں بہت یاد آئے گا"۔

اس پر گوری سخت لہجے میں بولی "اور میں؟"

"ہاں گوری تم بھی ضرور یاد آؤ گی" اسلم جلدی سے کہتا۔

رحمان بابا جب اسلم کو لے جانے کے لئے اُس کی چیزیں اُٹھانے لگے تو گوری بولی "ٹھہرو میں ابھی آئی" یہ کہہ کر وہ گولی کی طرح بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ہم سب لوگ اُس کی بے پروائی اور لاابالی پن سے واقف تھے۔ کچھ توقف کے بعد میں نے بابا سے کہا "چلو دیر ہو رہی ہے"۔

ابھی ہم گھر سے تھوڑی ہی دور نکلے تھے کہ گوری جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے کپڑوں اور پھولتے سانسوں کے ساتھ ہمارے راستے میں آکھڑی ہوئی۔ اُس کے چہرے پر غم و غصے کے ملے جُلے تاثرات تھے معاً وہ بول اُٹھی "اسلم! تجھے شہر جانے کی اتنی جلدی پڑی ہے کہ چند منٹ رُک نہ سکا۔ میں نے تجھے نشانی دینے کو جو وہ مٹی کا گھر بنایا تھا نا وہ شانے نے توڑ دیا۔ میں ابھی اُس کا اور اُس کے ساتھیوں کا اچھی طرح ستیاناس کر کے آئی ہوں۔ مجھے ذرا دیر لگ گئی" پھر اُس کا لہجہ دھیما پڑ گیا "اب تم میری طرف سے یہ نشانی لے جاؤ"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے بازو سے چھوٹے چھوٹے گھنگھروؤں والے کنگنوں کی جوڑی میں سے ایک کنگن اُتارا اور اسلم کو دے دیا۔ پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگی "اچھے! میرا کہا سُنا معاف کر دینا ہاں، کل کی بات کو تو بھول ہی جانا"

اسلم کھسیا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

میں نے استفسارانہ لہجے میں پوچھا "گوری کیا کہہ رہی ہو تم، کیا ہُوا تھا کل؟"

ڈرتے ڈرتے اسلم نے قمیص اُٹھائی تو اُس کے بازو پر مجھے سرخ اور نیلے رنگ کا دائرہ سا بنا ہوا نظر آیا جو یقیناً دانت سے کاٹنے کا نشان ہوگا۔ میں دانستہ چُپ رہی۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ اسلم کو گوری کا ساتھی نہ بننے پر یہ سزا اکثر ملا کرتی تھی

یہ دُنیا بھی عجیب چیز ہے۔ یہاں حالات کس طرح بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ کبھی ہم نہ جانتے ہوئے بھی ایسا کچھ کہہ بیٹھتے ہیں کہ دُکھ ساتھ ہو لیتے ہیں اور کبھی جان بوجھ کر اپنی روح کے لئے ایسے عذاب پال لیتے ہیں جو جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ اسلم کے چلے جانے سے میری تنہائیاں بڑھ گئی تھیں۔

سال پہ سال گزرنے لگے نہ جانے کتنی شامیں

ڈھلیں اور کتنی صبحیں گزریں اور کتنے بادل برسے۔ میرا اسلم اب ایک کامیاب طالب علم بن کر شہر سے لوٹا تھا۔ کالج میں داخلے سے پہلے وہ کچھ دن گاؤں میں آتا جاتا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہوا کہ تعلیم کے دوران میں اسلم جب بھی شہر سے ایک دو دن کے لئے آیا گوری سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس اتفاق کی ایک وجہ گوری کی خالہ بھی تھی جو دوسرے گاؤں میں رہتی تھی۔ وہ دمے کی مریضہ تھی۔ گوری کو اکثر اس کے پاس جا کر رہنا پڑتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ گوری اسلم کی غیر موجودگی میں آئی۔ پہلے تو وہ چپ سی رہتی۔ پھر پوچھتی کہ اسلم آیا تھا شہر سے؟ جواب ہاں میں ملتا تو کہتی "شہر جا کر اسلم کے کہیں پَر تو نہیں لگ گئے تاکہ میں اس سے ضرور ملتی۔ نہیں ملا تو نہ سہی! کبھی تو ملے گا وہ۔ پھر کچی جامنوں سے اس کا دودھ جیسا سفید کرتہ نہ رنگا تو گوری نام نہیں۔" پھر وہ بکتی جھکتی چلی جاتی اور خود ہی دوبارہ آ جاتی جنگ جو شہزادوں کی کہانی سننے کے لئے۔

ایک دن میں صحن میں بیٹھی اسلم کے کپڑے استری کر رہی تھی کہ وہ آدھمکی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ حسبِ معمول اس کے کپڑے اور بال تو میلے میلے سے تھے البتہ آنکھوں میں خوب سرمہ لگا ہوا تھا۔ سرخ ڈوروں والی بڑی بڑی آنکھیں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ آتے ہی وہ بولی "آپا کل نہر کے کنارے آندھی کی وجہ سے میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا تھا۔ بابا نے کہا سرمہ ڈال لو۔ تمام رات پھر بھی سو نہیں سکی، اب کچھ ٹھیک ہوں، آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟"

میں نے بتایا کہ اسلم آیا ہوا ہے، اس کے کپڑے استری کر رہی ہوں۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ گیا اور ذرا توقف کے بعد کہنے لگی۔

"کدھر ہے وہ اچھے کا بچہ، شہر کیا گیا، صورت ہی چھپا لی ہم سے، ملے ذرا لیتی ہوں اس کی خبر! بس ذرا منہ دھو لوں۔"

پھر وہ صحن میں لگے ہوئے نل کو چلا چلا کر منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے لگی۔ اس کا معصوم اور بھولا چہرہ نکھر سا آیا۔ نل کے دستے سے منہ پونچھتی ہوئی وہ کچھ کہتی میری طرف آ رہی تھی کہ اسلم دروازے سے داخل ہوا۔ گاؤں آ کر چند دنوں سے اسلم کی صحت قابلِ رشک ہو گئی تھی۔ میرا ننھا سا اسلم اب جوانی کی حدود کو چھو رہا تھا۔ سفید بے داغ قمیص شلوار میں وہ چہرے پر بشاشت لئے قریب آ کر رک گیا۔

گوری اسے دیکھ کر کچھ دیر مرعوب سی بُت بنی کھڑی رہی، پھر ایک دم جیسے پھٹ پڑی۔ "یہ کیا میرا منہ تک رہے ہو؟ ذرا سی بڑی ہی تو ہو گئی ہوں کیا بھول گئے کہ میں گوری ہوں، گوری ہوں۔"

اسلم کے کان کے پاس منہ لے جا کر وہ بولی تو اسلم گڑبڑا سا گیا۔ اور مجھ سے کہنے لگا "آپا! گوری بڑی ضرور ہو گئی ہے مگر اسے عقل ابھی تک

غزل

ابو البلاغت پنڈت رتن پنڈوری

عشق کا سودا کہاں تک کوہ کن کے سر میں تھا
حسنِ شیریں بے ستوں کے ایک اک پتھر میں تھا

بر سرِ مقتل شہادت کا جنوں ہر سر میں تھا
اے ستمگر کون سا جادو ترے خنجر میں تھا

درد دل میں، سر میں سودا، اشک چشمِ تر میں تھا
عالمِ فرقت میں ہر اک گھر کا مالک گھر میں تھا

جنتِ واعظ سے ہوتی کس لئے رغبت مجھے
کوثر و تسنیم کا سنگم مرے ساغر میں تھا

وہ بھی وقت آیا کمالِ شوق کے انجام پر
مجھ میں دلبر جلوہ گر تھا میں دلِ دلبر میں تھا

فردِ عصیاں کی سیاہی اس پہ رحمت کا نزول
کاتبِ تقدیر بھی یہ دیکھ کر چکر میں تھا

گم سے بے گھر ہو کے گھر کی جستجو جاتی رہی
غور سے دیکھا تو میں اس وقت اپنے گھر میں تھا

جوشِ حسن و عشق کا منظر تھا کتنا دل نشیں
کار فرما ایک ہی جذبہ سر و خنجر میں تھا

پردہ اٹھنے پر ہوا رازِ حقیقت آشکار
نورِ مطلق جلوہ فرما نور کے پیکر میں تھا

ہم نے آخر سنگِ کعبہ کی حقیقت جان لی
اس میں تھا جلوہ وہی جو دَیر کے پتھر میں تھا

فرسودشی پر مری، حیران ہیں لوح و قلم
جو مری تقدیر میں تھا، جو مرے خنجر میں تھا

بار ہا دل میں یہ آتا تھا قفس کو لے اڑوں
حوصلہ اتنا ابھی تک میرے بال و پر میں تھا

بن گئی جھکتے ہی جزوِ آستاں میری جبیں
کس قیامت کا اثر یہ تیرے سنگِ در میں تھا

دیدنی تھا میرے اقرارِ معاصی کا سماں
رحمتوں کا ایک جھرمٹ عرصۂ محشر میں تھا

بُت کدے میں چشمِ بینا کی ضرورت تھی رتن
ورنہ نورانی حجابوں میں خدا پتھر میں تھا

…تھی بالوں میں جیسے آگ لگ گئی ہو وہ
یہ تو شہر جا کر اپنی بولی ہی بھول گیا
گوری رکی نہیں اور فوراً ہی چلی گئی۔
اسلم رات گئے تک شہر کی پر شور زندگی
… ہے اور پھر سکون کی خاطر اپنے گاؤں
… اسلم کہنے لگا" جو سادگی معصومیت
… گاؤں میں ہے، اس کے مکینوں
… میں کہیں نہیں۔ پھر اسلم نے
دبی دبی زبان میں گوری کا ذکر بھی کیا۔
… بھولپن اور سادگی کی تعریف کر رہا تھا۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ گوری واقعی بہت

… اس معصومیت …
تمام لڑکے اس سے ڈرتے تھے۔ گوری کسی نہ کسی بہانے انھیں ناک چنے چبواتی رہتی تھی۔ اُسے ہاتھ لگانا تو درکنار، ساتھ چلتے ہوئے بھی لڑکے اس سے لڑتے تھے۔ وہ خود بھی کسی کو اپنے برابر نہ چلنے دیتی تھی۔ گوری اب پہلے کی طرح لڑائی جھگڑوں سے کچھ دور ہو گئی تھی، پھر بھی اس کی دلیری اور نڈرپن کی باتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ بیج بونے سے لے کر پانی دینے تک، وہ سب کام خود ہی کرتی تھی۔ پھولی ہوئی سرسوں ہوتی یا گندم کی سنہری بالیاں، وہ ان میں کسی مست ہرنی کی طرح دوڑتی، خوش ہوتی اور روزانہ معمول کے مطابق میرے پاس شام ڈھلے ضرور آتی۔

… ہو گئی ہو، دیکھو ذرا بن کے سنبھل کے رہا کرو، ڈھنگ کے کپڑے پہنا کرو، گو تم سمیٹ کر رکھا کرو، صاف ستھری رہا کرو۔ اگر اس پر میری کسی بات کا اثر ہوا، تو صرف یہ کہ وہ صاف ستھرے کپڑے پہننے لگی جس سے گوری کا چڑھتا ہوا شباب اور نکھر آیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے لمبے سیاہ بال بھی سنوار لیتی۔ اُسے شاید یہ احساس نہ تھا کہ اس چڑھتی ہوئی جوانی کے سبب بے ڈھنگی چال خود بخود مست ہوتی جا رہی ہے۔ ٹیڑھی میڑھی مانگ کی جگہ سیدھی سادی سنوری ہوئی زلفوں کی لمبی لٹیں حسین ہوتی جا رہی ہیں۔

باقی آئندہ

غزل

اختر شاہجہانپوری

میری سنگساری کو دیکھنے جو آئے ہیں
کیا خبر مجھے اُن میں بے گناہ کتنے ہیں
آئینے کی سرکوبی کر کے ہم بھی پچھتائے
پہلے ایک چہرہ تھا اب ہزار چہرے ہیں
جسے کسی نے بھی پیار سے نہیں دیکھا
بکھر گیا ہے تو کیوں اُسی کے چرچے ہیں
… موسم ہوں گل ہو یا کہ خوشبو ہو
… کی نظروں میں سب کے حوالے ہیں
… بیابانی کے جلتے دُبھی ہیں کچھ
… کر جو ہوشیار رہتے ہیں
… میں کیوں جھگڑا دوستوں کی خاطر ہو
… میں تیرے ہیں نہ میرے ہیں
… اپنی بینائی کام اب نہیں آتی
… مخلص میں نہ مفسوخ ہوئے ہیں۔

غزل

دیپک قمر

خموش دل میں چھپی بے زباں محبت کیا
مہک بغیر کسی پھول کی حکایت کیا
فریب کیا ہے کوئی یہ بھی کہہ نہیں سکتا
نہ جانے تیری حقیقت کی ہے حقیقت کیا
اُسے تو خود ہی سبھی کھیت کاٹنے ہوں گے
کئے پہ اپنے کرے گا کوئی شکایت کیا
ہزاروں سال میں لائے چھپا کے اک موتی
ہمارے دور میں اس پیار کی ہے قیمت کیا
اُڑا کے پتیاں پھینکے گی آنکھ سے اوجھل
ہوا کرے گی ترے پیڑ کی حفاظت کیا
تمہارے ہاتھ کو دھوکا نہ دیں گے پانی کبھی
اُٹھا کے لانے پہ آئے تو دور پربت کیا۔
مسافروں کا یہاں کچھ نہیں سفر کے سوا
کسی کے واسطے پھر راستے کی چاہت کیا۔

غزل

صغیر احمد سحر سندیلوی

ستم فطرت جو ہیں اُن کی ستم رانی نہیں جاتی
کبھی چرخِ فلک کی برق سامانی نہیں جاتی
نہ جانے کس گلستانِ سخن کے یہ عنادل ہیں
زباں تو کٹ گئی ان کی گل افشانی نہیں جاتی
ترقی یوں تو کہنے کو بہت انساں نے کی لیکن
تعجب ہے جو اس کی خوئے حیوانی نہیں جاتی
خزاں کا دور ہو وہ یا کہ ہو موسم بہاروں کا
خوش الحانِ گلستاں کی خوش الحانی نہیں جاتی
وہ چاہے جس قدر اپنا لباسِ رنگ و بو بدلیں
مگر نیرنگیِ جلوہ کی تابانی نہیں جاتی
نقابِ مصلحت کچھ اس طرح ڈالے ہیں چہروں پر
کسی کی شخصیت دنیا میں پہچانی نہیں جاتی
سحر ہم اُن سے اظہارِ تمنا کر کے پچھتائے
زمانہ ہو گیا پھر بھی پشیمانی نہیں جاتی

غزلیں

مجید انجم ساگری

چھپنے لگے ہیں خود اُن کی گہرائیوں میں ہم
گو بیش بیش تھے چمن آرائیوں میں ہم
زلفوں کو اُن کی دیکھ کے محسوس یہ ہوا
اُڑنے لگے ہیں آج تو پُروائیوں میں ہم
وہ تو اُٹھ کے چل دیئے اپنا نقابِ رُخ
اُلجھے ہوئے ہیں حاشیہ آرائیوں میں ہم
ہر زاویۂ نگاہ سے دیکھیں گے ہو بہو
محرابِ کعبہ آپ کی انگڑائیوں میں ہم
انجم وہ خاص مُدعا پھر دل میں رہ گیا
کہنے گئے تھے اُن سے جو تنہائیوں میں ہم

مسلم سندیلوی

سُوئے دل پھر نگاہِ لطف اُٹھی آہستہ آہستہ
یہ کس نے زیست کو آواز دی آہستہ آہستہ
اب ہونگے طے مقامِ آگہی آہستہ آہستہ
محبت بن گئی ہے زندگی آہستہ آہستہ
کرا نے دل کو آدابِ نیازِ عشق کا خوگر
یونہی آتا ہے طرزِ بندگی آہستہ آہستہ
اثر انداز ہیں بزمِ جہاں کی تجربہ گاہیں
بدلتی جا رہی ہے زندگی آہستہ آہستہ
طلسمِ ظلمتِ شب ٹوٹنے ہی کو ہے اے مُسلم
اُفق پر بڑھ رہی ہے روشنی آہستہ آہستہ

نوشاد مونس اعظمی

محفلِ عالم بھی میرے لئے تنہائی ہے
اپنے اعمال کی کیا خوب سزا پائی ہے
دیکھ کے پہلی نظر میں یہی احساس ہُوا
آج ہی کی نہیں برسوں کی شناسائی ہے
شکریہ تیرا صبا تُو نے یہ احسان کیا
خوشبوئے زلفِ صنم لے کے اِدھر آئی ہے
زندگی شاد ہے مسرور ہے غم کوئی نہیں
جب سے اُن آنکھوں میں یکتائی ہی یکتائی ہے
دُور ہو سکتی نہیں گھر کی مرے تاریکی
بن مرے چاند کے سُونی مری انگنائی ہے
دل کھنچا جاتا ہے اک سمت خدا خیر کرے
دیکھئے آج قضا لے کے کہاں آئی ہے
مونس آنکھوں کے دریچوں کو آؤ بند کریں
محفلیں ختم ہوئیں عالمِ تنہائی ہے

پریم سوشیل درد

اک امتزاج ضروری ہے جسم و جاں کے لئے
مکاں مکیں کیلئے ہے مکیں مکاں کے لئے
عذابِ جاں بنے اک برقِ ناگہاں کے لئے
وہ تنکے میں نے چُنے تھے جو آشیاں کے لئے
ہر ایک موج میں پوشیدہ ہو جہاں ساحل
میں منتظر ہوں اُسی بحرِ بیکراں کے لئے
وہ بے نیاز ہیں لمحات کی حقیقت سے
جو بیقرار ہیں اک عمرِ جاوداں کے لئے
مرے خلوص کو مجروح کر دیا تو نے
یہ زخم کم تو نہیں دردِ نیم جاں کے لئے

نعت

عبدالعزیز خالد

سخنوری کے سفر میں یہ کیا مقام آیا؟
صریرِ خامہ سے آوازۂ سلام آیا
جو رزقِ دل تھا وہی سوزِ عشق کام آیا
" زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے!"

بیاضِ رُخ پہ تبسّم اُلکتاب کی تفسیر
وہ بے نظیر ہے وہ ممتنع ہے جس کی نظیر
میں اُس کے لاؤں بہ حیطۂ تحریر؟
" مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے!"

ہے بسکہ حرف زدن بازناں بنائے غزل
حریفِ نعت ہمیشہ نہیں نوائے غزل
کہ تنگ قدِ عبارت پہ ہے قبائے غزل
" بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وُسعت مرے بیاں کے لئے!"

ہوئی اُسی کے لئے زندگی کی پیدائش
اُسی کا صدقہ ہے نوعِ بشر کی افزائش
نزولِ نعمت و تسکینِ ذوقِ آسائش
" زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے!"

میں تشنہ کام ہوں "مُرزا" وہ میرا ساقی ہے
مرے بیانِ تمنا کی بے قراقی ہے
دیا جو میں نے سرِ انجام اتفاقی ہے
" ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے!"

مستقل کالم

شخصیات، واقعات، تأثرات،

سرور تونسوی

میں جانتا نہیں
یہ مانتا نہیں

مُلّا مُرادؒ کا مزار مظفر نگر میں مسجد کے قریب ہی ہے۔ اُن کا انتقال ۱۹۴۷ء کی تقسیم ملک سے کچھ ہی پہلے ہُوا۔

ایک خاتون اُن کی مُریدہ تھیں۔ اس خاتون کا خاوند ہر سال باغ ٹھیکہ پر لیتا تھا۔ ایک سال مظفر نگر سے کافی دُور اُجاڑ بیابان میں "بیری کا باغ" ٹھیکے پرلے کر دونوں میاں بیوی باغ کی رکھوالی کے لئے باغ میں ہی رہنے لگے۔

یہ خاتون ایک روز مُلّا مُرادؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگیں "مُلّا جی! مجھے بیری کے باغ میں بہت ڈر لگتا ہے۔ اجاڑ بیابان جگہ میں ہم دونوں رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رات کو ہر طرف بلائیں جاسے اردگرد چکر لگاتی ہیں کچھ ایسا کر دیجئے کہ میں ڈروں نہیں۔"

مُلّا مُراد صاحب مُسکرائے اور فرمانے لگے "بی بی! تمہیں ایک ورد بتاتے ہیں اسے پڑھ کر اُنگلی پر پھونک لیا کرنا اور جس قدر جگہ میں تو یہ پڑھ کر حصار کرے گی وہاں کسی بَلا تو کیا چیونٹی تک کا گزر نہ ہو سکے گا۔ خاتون کہنے لگیں مُلّا صاحب ہمارا باغ کافی رقبہ میں ہے میں حصار کیسے کروں گی فرمانے لگے نظر سے حصار کر لیا کرنا یعنی چاروں طرف گھوم کر حدِ نظر تک محض نظر سے ہی حصار کر لیا کرنا اور یہ ورد کیا کرنا۔

لوہے کا کوٹ تانبے کی کیاری
جس میں بسم اللہ کی تالی

چنانچہ اس خاتون نے یہ ورد کر کے تا حدِ نظر حصار کرنا شروع کر دیا اور اُسے ڈر لگنا جاتا رہا ۱۹۴۷ء کے فسادات میں یہ عورت اپنے مکان کی بجائے اپنی گلی کا چکر لگا کر یہ ورد کرتے ہوئے حصار کرتی رہی اور واقعی اس کی گلی میں کسی قسم کا کوئی فساد نہ ہوا اور نہ ہی کوئی لوٹ مار ہوئی۔ جب تک یہ خاتون زندہ رہیں اس ورد سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ گھر بھر کو محفوظ سمجھتی رہیں۔

میرٹھ میں خیر نگر پولیس چوکی کے پاس ایک مجذوبہ اماں مریم کا مزار ہے۔ جناب خان صاحب قرار میرٹھی جو ملک کے مشہور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں اور آج کل مظفر نگر میں مقیم ہیں، اُن کا اکثر اوقات میرٹھ میں اماں مریم صاحبہ کے ہاں جانا ہوتا تھا۔ قرار صاحب جب پہلی مرتبہ اماں مریم صاحبہ کے ہاں گئے تو دیکھتے ہی فرمانے لگیں بیٹھ جا مجھے معلوم ہے کہ تو کس لئے آیا ہے۔ پرسوں تمہیں جواب مل جائے گا۔

قرار میرٹھی کے بھائی بمبئی میں رہتے تھے اور وہ کسی خاص ضرورت کے تحت بھائی کے باعث پریشان تھے اور وہ گھر سے بمبئی اپنے بھائی کو ملنے کام نمٹانے کی غرض سے نکلنے کے ارادے میں تھا

مریم کی رہائش گاہ آتے ہی اُنھیں خیال آیا کہ عوام میں اماں مریم کے بارے میں بڑا چرچا ہے کیوں نہ اُن سے ہی دریافت کیا جائے تاکہ اُن کی دلی پریشانی فوری طور پر دُور ہو سکے لہٰذا وہ جونہی اماں مریم کے سامنے گئے تو اُن کے کچھ بتائے بغیر ہی اماں مریم نے یہ حکم صادر کر دیا کہ پرسوں تمہیں جواب مل جائے گا۔

قرار صاحب کا کہنا ہے کہ واقعی پرسوں بمبئی سے اُن کے بھائی کا خط آ گیا اور جس وجہ سے وہ بے حد پریشان تھے' وہ معاملہ بخیر و خوبی انجام پا چکا تھا۔

ایک صاحب علی گڑھ کے کئی بار اماں مریم کے ہاں حاضر ہوئے' مگر وہ اُنہیں کسی نہ کسی طرح ٹال دیتیں۔ قرار صاحب کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ وہ صاحب اُن کی موجودگی میں بڑی مسکین صورت بنائے اماں مریم کے ہاں گئے اور اپنا مدعا بیان کیا۔ اماں مریم خاموش رہیں اور ایک ڈھکی ہوئی طشتری سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا نکالا جس کا نصف قرار صاحب کو دیا جسے قرار صاحب نے بسم اللہ کہہ کر منہ میں ڈال لیا اور مٹھائی کے ٹکڑے کا دوسرا حصّہ اماں مریم نے علی گڑھ والے صاحب کو دیا۔ جونہی یہ صاحب مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں ڈالنے لگے تو وہ انھیں پاخانہ نظر آیا اور وہ اُسے وہیں پھینک کر چلے گئے۔

علی گڑھ کے اس شخص کے جانے کے بعد اماں مریم کہنے لگیں" یہ شخص بہت ہی گناہ گار ہے اور نہایت گندے کام کرتا ہے ہمارے پاس آکر بیٹھا رہتا ہے تو اس کے گناہوں کی سزا ہمیں کمی ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا ہمیں حکم ہوا ہے کہ اس گندے آدمی کو اپنے پاس آنے سے روک دیں۔ اب یہ نہیں آئے گا۔ جس مٹھائی کے ٹکڑے کو وہ پاخانہ سمجھ کر پھینک گیا ہے اُسے دیکھو' وہ دراصل مٹھائی کا ہی ٹکڑا ہے۔ ذرا سی نگاہ بدل دی اور اس کا یہاں آنا بند کر دیا۔

قرار صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ اُنھوں نے اماں مریم سے عرض کیا کہ اماں میں بہت پریشانی میں ہوں کیوں کہ میرا کوئی عزیز کسی دوسرے شہر میں تشویشناک حد تک علیل ہے۔ دعا فرمائیں کہ وہ خیریت سے ہو۔ دو چار منٹ بعد اماں مریم کہنے لگیں کہ مسیحا ہاتھ پیر دباؤ۔ چنانچہ قرار صاحب نے حکم کی تعمیل کی اور اماں مریم ہاتھ پیر دبواتے وقت بالکل خاموش رہیں اور دس منٹ کے بعد فرمانے لگیں کہ تمہارا وہ عزیز بالکل خیریت سے ہے۔ اُس کا حلیہ یہ ہے' گھر کا نقشہ یہ ہے اور وہ اِس وقت اِس قسم کے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ قرار صاحب حیران ہو کر دریافت کیا کہ اماں یہ کون سی بے تار برقی ہے کہ آپ نے نہ صرف یہ کہ اُن کی خیریت کا پتہ دیا ہے بلکہ حلیہ اور مکان کا نقشہ تک بتا دیا ہے' فرمانے لگیں" یہ اللہ کا کرم ہے... اور بس!

ایک صاحب کا بچہ علیل تھا۔ مقدور بھر غریب نے اپنے بچے کا علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا اور آخر کار حکیموں نے جواب دے دیا کہ اس بچے کی بیماری اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہی لہٰذا کوئی دوا اثر نہیں کر رہی ہے۔

غریب باپ نااُمید ہو کر بیمار بچے کو حکیم کے ہاں سے گھر لا رہا تھا' راستے میں ایک صاحب ملے اور ازخود دریافت کی کہ بچے کو کیا تکلیف ہے۔ باپ نے عاجزانہ طور پر اپنی بے کسی کا اظہار کرتے ہوئے بچے کی بیماری اور حکیموں کی طرف سے لاعلاج ہونے کا سب واقعہ سنایا تو یہ صاحب فرمانے لگے اسے فلاں شخص کے پاس لے جاؤ' وہ اس کا علاج کریں گے اور اللہ یقینی شفا دیں گے۔

چنانچہ غریب باپ بیمار بچے کو کندھے سے لگائے اُن صاحب کے ہاں پہنچے اور دروازے پر دستک دی۔ صاحبِ خانہ باہر آئے تو غریب باپ نے نہایت عاجزی اور منت سماجت سے مدعا بیان کیا کہ اس کے بیمار بچے کو حکیموں نے جواب دے دیا ہے۔ کسی نے بتایا ہے کہ آپ اگر اِس کا علاج کریں گے تو خدا رحم فرمائے گا۔

صاحبِ خانہ یقین دلا رہے ہیں کہ وہ طب کی الف ب' سے بھی واقف نہیں ہیں تو بیمار بچے کا علاج کیا کریں گے تو بچے کا باپ مزید شدت سے اصرار کرنے لگا کہ نہیں صاحب! آپ غریب سمجھ کر ٹال رہے ہیں کیوں کہ میں آپ کی فیس ادا نہ کر سکوں گا اور نہ ہی دوا دارو کی قیمت ادا کر سکوں گا۔ خدارا رحم فرمائیے اور میرے بچے کو ایک نظر دیکھ لیجئے۔ میں آپ کی فیس اور دوا کے پیسے جیسے بھی ہوگا ادا کروں گا۔

صاحبِ خانہ کسی طور بھی بیمار بچے کے باپ کو یقین نہ دلا سکے تو مجبوراً تنگ آکر بچے کو ہاتھوں میں لیکر آسمان کی طرف منہ کر کے فرمانے لگے" اے اللہ! میں جانتا نہیں' اور یہ مانتا نہیں" کہہ کر بچے پر دو چار پھونکیں لگا دیں اور بچہ اُس کے باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔

خدا کا کرنا کہ بچہ دو چار دنوں میں ہی ٹھیک ہو گیا اب تو اُن صاحب کی وہ شہرت ہوئی کہ سینکڑوں مریض اُن کے ہاں پہنچنے لگے اور یہ حضرت صرف یہی کہتے" اے اللہ! میں جانتا نہیں اور یہ مانتا نہیں" اور پھونک دیتے۔ جب تک یہ صاحب زندہ رہے اُن کا یہ معمول رہا' جس وقت اور جب بھی کوئی مریض اُن کے ہاں آتا' وہ یہی کہہ کر پھونک دیتے اور خدا کا کرم کہ مریض صحت یاب ہو جاتے۔

رہے نام اللہ کا۔

بابِ انتقاد

نامِ کتاب: "محمد شاہی عہد کی جعفر علی زکی کی ایک
نایاب مثنوی"!
مُرتّبہ: ڈاکٹر عبدالرؤف، ہیڈ شعبۂ اُردو،
کلکتہ یونیورسٹی۔
ڈیمائی سائز، صفحات: ۵۶۔ اشاعت: سنہ ۱۹۸۶ء
قیمت مجلد مع گرد پوشش۔ -/۱۵ روپے۔
ناشِر: نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ، یو۔ پی۔

ڈاکٹر عبدالرؤف کا یہ کارنامہ محض
و ادب میں ہی اضافہ کا مُوجب نہیں ہوگا بلکہ
و زبان کی ساخت اور ارتقاء کے سلسلے میں
ایک اہم کڑی ثابت ہوگا۔ کیونکہ یہ مثنوی۔ جو
ارہویں صدی کے پہلے نصف میں یعنی ۱۷۴۲ء
ے قریب لکھی گئی تھی، جس وقت ابھی اُردو زبان
پنے ابتدائی دَور سے گذر رہی تھی۔ اور جعفر علی
ن زکی کی اس مثنوی سے ثابت ہوجاتا ہے
حافظ محمود شیرانی کا نظریہ کہ اُردو پنجاب کے
ام سے معرضِ وجود میں آئی ہے بالکل درست
ا۔ کیونکہ کہاں پنجاب جو پنجاب اور سندھ کی حدود
ں واقع اور کہاں دکن، جہاں اس زبان میں مثنوی
ی گئی اور آج سے اڑھائی سو برس قبل اُردو میں
رسی کے بجائے' متداول پنجابی زبان کی چھاپ
یادہ تھی۔ اُردو کو برج بھاشا سے منسلک کرنے
اوں کے لئے بھی یہ ایک نیا نظریہ پیش کرتی ہے۔ ہاں
ٹھیک ہے کہ علم العروض کے اوزان وغیرہ کو لے کر
ے ہندوستانی ماحول میں استعمال کرنے کا سہرا
س زمانے کے اُردو شعراء کو تھا۔ پر سوداؔ' دردؔ
غیرہ بعد میں آئے لیکن اُن سے پہلے بھی شعراء
ا بنا سکے جنھوں نے اُن پر واضح کیا کہ ہم کو فارسی
ی بجائے یا کسی دوسری غیر ہندوستانی زبان

کی بجائے' متداول ہندوستانی زبانوں سے استفادہ
کرنا زیادہ مُفید ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے پنجابی اور اُس
زمانے کی شمالی ہندوستان کی ہندی زبانوں کو اپنا نظریہ
قرار دے کر اُردو کی بساط کو فروغ دینے کی کوشش
کی اور کامیاب ہوئے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف نے ایشیاٹک سوسائٹی
کلکتہ کے شعبۂ نسخہ جات سے اس مثنوی کو کھدیڑ کر
نکالا اور اُس کو منصّۂ شہود پر لانے کا فخر حاصل کیا۔
مثنوی کی زبان نہایت سادہ اور دلکش ہے ؎

ہے مشکل عشق کے گھائل کا جینا
نہ جانے بوعلی یہ زخم سینا
بُتاں کو کیا مزہ بخشے ہے یہ
زمنہ میٹھا نہ ہو گڑ گڑ کہے سے
زبان صنع ہو کر کارفرما
سکھادے خاک کو دو آب جینا
نزدیک ہے بے خبر دل کوں عشق کے
گشادہ کار بسمل ہے کھڑک سے

اس مثنوی کے اشعار میں ہندو ایران کی
زبانوں کے حسین امتزاج کو مثیر کیا گیا ہے۔ مثلاً،
"گلستانِ اگن" (آگ کا گلستان)، "رنگ پان" وغیرہ
اور الفاظ کی جمع بالکل پنجابی طریقے سے "اں" کا
اضافہ کرکے بنائی گئی جیسے "محباں" "سرداراں"

"رقیباں" "آنکھاں (آنکھیں) مجھ تن (میرا تن)
"مجھ سنگ" (میرے سنگ) میری طبع کی بجائے "مجھ
طبع"۔ "کوں" بجائے "کو" وغیرہ۔ اور سنسکرت کے
الفاظ کا بھی استعمال ہے مثلاً "برہ" (جدائی) اگن
(آگ) بچن (گفتگو) آنجھو (آنسو) وغیرہ، جس
سے ثابت ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے شروع
میں کوئی ایسی فرقہ پرستی نہ تھی اور ہندوستان تمام
نئی چیزوں کے قبول کرنے کے لئے راضی تھا۔
اِس مثنوی سے زبان و ادبِ اُردو کے ایک نئے زاویے
سے واقفیت حاصل ہوتی ہے جس کے لئے فاضل
مُرتّب کا شکرگزار ہونا پڑے گا۔ شروع میں
پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی کا بیش قیمت مقدمہ
ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پڑھنے والے اُس
زمانے کی پیاری اُردو زبان سے ضرور محظوظ ہوں گے۔

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ۔
(ایم۔ اے۔ ڈی۔ لِٹ۔ کلکتہ)

ہندی و اُردو افسانہ نگاری میں عالمی شہرت کے مالک

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

جن کے اُردو افسانوں کے دو مجموعے مان سروور اور دھر بار کہادل نے کو بہار اور اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ نے انعامات سے نوازا۔ اور جنھیں نیشنل لٹریری سرکل مُراد آباد کی طرف سے ۵۱ سو روپے کا چیک اُن کی چالیس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں پیش کیا گیا۔ اب

کِرنوں کے پدچن

کے رُوپ میں ایک نرالے انداز سے ہندی ساہتیہ میں قابلِ فخر اور یادگاری اضافہ کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔

اِس نادرۂ روزگار تصنیف کے باعث ڈاکٹر اودے سرن ارمان کا نام نامی ہندی ساہتیہ میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور کوئی بھی ہندی ساہتیہ کا مؤرخ " کرنوں کے پدچن " اور " ڈاکٹر اودے سرن ارمان " کے ذِکر کے بغیر اپنی ریسرچ کو مکمل نہ کہہ سکے گا۔

ایک انقلابی ذہن جو خدا کے وجود کو سائنس کی روشنی کے ساتھ ساتھ تسلیم کرتا ہے مگر اندھ وشواس کے گورکھ دھندے سے پوری انتہا کے ساتھ بغاوت کرتا ہے۔ قدامت اور جدیدیت کا یہ سنگم " کرنوں کے پدچن " میں انتہائی اہم موضوعات پر زندگی میں پیش آئے واقعات کی روشنی میں ایسے ایسے مسائل پر مدلل بحث کرتا ہوا قاری کے دِل و دماغ پر اپنے نقوش اس طرح چھوڑتا ہے کہ قاری بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ؎ جو کہا تو نے وہ میرے دِل میں تھا۔

" کرنوں کے پدچن " میں آپ ارمان صاحب کی یادداشتوں میں بڑی انمول باتیں پائینگے۔ ہندی رسم الخط میں اپنی طرز کی یہ واحد کتاب پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔

تقسیم کار:- **شانِ ہند پبلی کیشنز**

فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

من کہ مکتوب الیہ



مکرمی سرور تونسوی صاحب، تسلیم!

آپ نے جولائی کے "شانِ ہند" میں جو خط شائع کیا ہے، وہ کسی سازش کے تحت لکھا گیا ہے ورنہ مکتوب نگار کو اپنا نام ظاہر کرنے میں کیا اعتراض تھا۔ ظاہر ہے جو جھوٹ بولے گا وہ ڈرے گا ہی۔ یہ اخلاقی جرأت کی کمی ہے۔ مکتوب نگار کی معلومات ناقص ہیں اور لگتا ہے اُس نے عمداً غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ایسا اُس نے ایک طرف تو بھڑکانے کے لئے کیا ہے اور دوسری طرف خوشنودی حاصل کرنے کے لئے۔ "یار" کہہ کر طنز کرنا ایک خفیف حرکت ہے۔ میں تو یاروں کا یار ہوں، خواہ ہندو، سکھ، عیسائی ہوں یا سیّد شریف، محسن تونسوی یا خود آپ۔ یہ سب میرے "یار" ہیں، اور میرے لئے قابلِ قدر۔ ان کو "یار" کہہ کر جو طنز کرتا ہے وہ ضرور کوئی حسد کرنے والا شخص ہی ہوگا۔

دوسرے یہ کہ بُک جیوری چیئرمین کے کیا اختیارات اور فرائض ہوتے ہیں، اس کا بھی مکتوب نگار کو علم نہیں۔ چیئرمین کوئی ڈکٹیٹر نہیں ہوتا کہ اکثریت کے فیصلے کو نظر انداز کر دے۔ آپ اپنے مکتوب نگار سے کہیے کہ گیتا یا قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہے کہ یا ہندی کے ریزولیوشن کے وقت وہ وہاں موجود تھا۔ اور اس کو حقائق معلوم ہیں اور اگر حقائق معلوم نہیں تو فضول باتیں کرنے اور عمر کو زید اور زید کو بکر کے خلاف بھڑکانے سے کیا حاصل؟

تیسرے آپ کو یہ اطلاع بھی غلط دی گئی ہے کہ پچھلے سال جب انعامی کمیٹی نے پبلشر کا انعام طے کیا تھا تو میں بھی فیصلے میں شریک تھا۔ میری شرکت یا عدم شرکت سے کیا فرق پڑتا کہ جب میں انعامی کمیٹی کا رکن ہی نہیں تھا۔ بدنیتی اسی سے ظاہر ہے کہ میری شرکت کو فیصلے کے جواز کے طور پہ پیش کیا جا رہا ہے۔ بے شک میں مدعو تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فیصلہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ تاہم اس سے کیا فرق پڑتا ہے کیونکہ سرکار روز فیصلے کرتی ہے اور اکثر لوگ ان فیصلوں سے آئے دن اختلاف کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال! حقائق کو مسخ کر کے پیش کرنے والے کا کچھ مقصد تو ضرور ہوگا!

آئندہ آپ ایسا کوئی مکتوب شائع کریں تو مکتوب نگار کا نام ضرور دیں تاکہ جھوٹ کا پردہ چاک کیا جا سکے۔ میرا طریقہ عموماً ایسے خطوں کے جواب دینے کا نہیں، نہ ہی میرے پاس فضول وقت ہے۔ لیکن اگر کوئی عمداً شرارت کرتا ہے تو اس کو بے نقاب کرنا بھی ضروری ہے۔

مخلص

گوپی چند نارنگ

محترم جناب سرور تونسوی صاحب السلام علیکم!

خدا سے دُعا ہے کہ آپ بخیر ہوں۔ آپ کے خط ملے۔ ہر بار سوچا کہ دلی جا رہا ہوں، وہیں مُلاقات ہوگی اور سارے جوابات نذر کر دوں گا آپ کی خدمت میں، لیکن دلی جانا بھی ہوا تو ہنگامی طور سے۔ کسی سے بھی قاعدے سے مُلاقات نہ ہو سکی۔

"یہ کوئے یار۔۔۔۔۔" ملی، میں نے پڑھی اور میرے علاوہ ریاض میں اُسے متعدد صاحبِ ذوق حضرات نے پڑھا۔ سب کی متفقہ رائے ہے کہ یہ کتاب ایک منفرد کتاب ہے اور آپ کا اسلوب بالکل انوکھا اور بہت جاندار ہے۔ میں نے تو اس سے پہلے ایسی کتاب نہیں پڑھی۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس خط کے ساتھ کتاب کے لئے معمولی سا ہدیہ ارسال ہے، قبول کریں۔ میرے لئے دُعا کریں، میں آپ کے لئے ہمہ وقت حاضر ہوں

آپ کا بھائی

صلاح الدین پرویز

(ریاض، سعودی عرب)

مکرمی سرور صاحب، تسلیمات!

کرم نامہ ملا۔ کتاب کا ایک نسخہ چند معمولی اضافوں کے ساتھ ارسال ہے۔ متن میں ترمیم کا خیال میں نے چھوڑ دیا ہے کیوں کہ اس سے آپ کے لئے بہت مشکل پیدا ہو جاتی۔

نئی کتابت کو ذرا غور سے دیکھ لیجئے گا۔

آپ کی نہایت دلچسپ کتاب مل گئی تھی۔ میں نے ایک ہی نشست میں اسے پڑھ ڈالا۔ اہلِ نظر بجا طور پر اُس کی تعریف و تحسین میں رطب اللسان ہیں۔ آپ کی تحریر بہت دلکش، بہت دل کشا اور بہت بے لاگ ہوتی ہے۔ کہیں تصنع یا تکلف کا شائبہ نہیں۔

یہ اُس کی دَین ہے جسے پروردگار دے

اُمید ہے آپ ہر طرح خیر و عافیت سے ہونگے۔

خاکسار

عبدالعزیز خالد، لاہور

کیا آپ شاعر ہیں ؟
کسی کتاب کے مصنف ہیں ؟
افسانہ نگار ہیں ؟
ناول نویس ہیں ؟
پبلشر ہیں ؟ اور
آپ کی کوئی کتاب چھپنے کے لئے تیار ہے
تو یاد رکھئے صرف ایک ہی نام

روشنی پرنٹنگ پریس

آفسیٹ ورکس

کیو۔۱۷، گلی ۱۸۔ برہم پوری دہلی

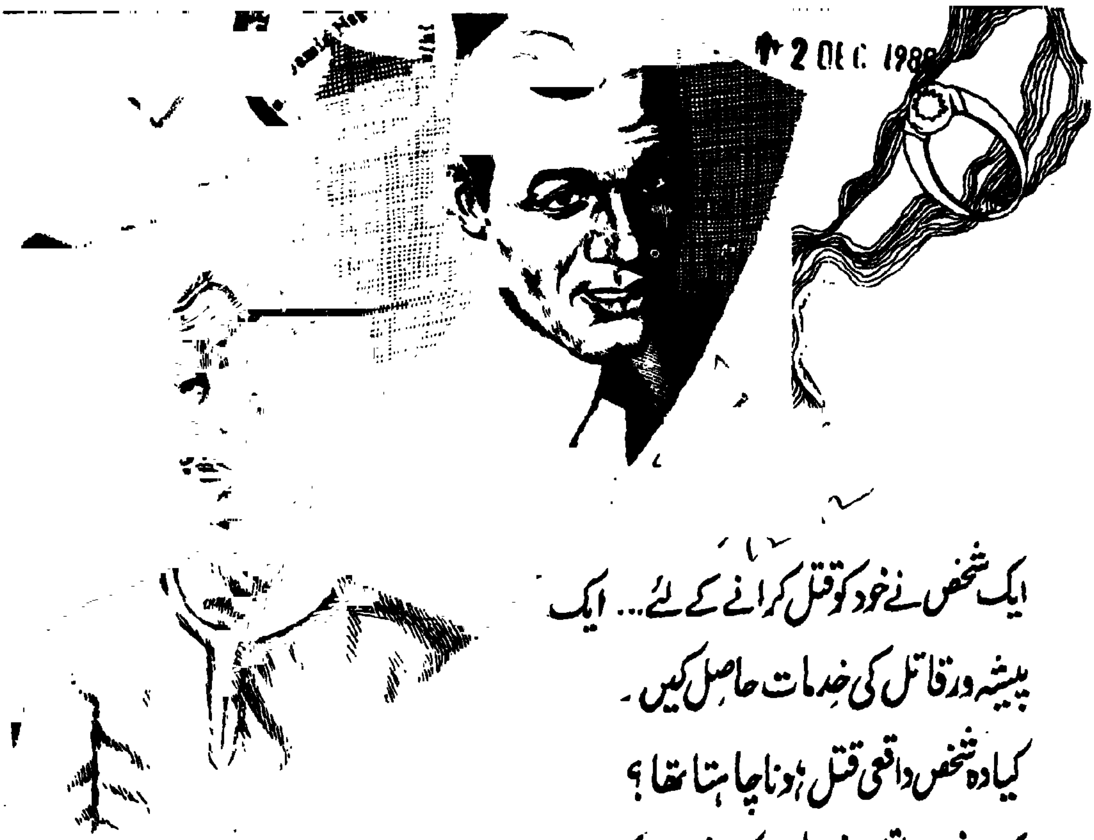
جن کی بے مثال کارکردگی اب چھپائی کی دُنیا میں ایک مثال بن چکی ہے۔
اگر آپ معیاری کام مناسب قیمت اور صحیح وقت پر کرانے کے خواہشمند ہیں تو روشنی پرنٹنگ پریس **آفسیٹ ورکس** کی خدمات ضرور یاد رکھئے۔
پروسیسنگ اور لیتھو پرنٹنگ کا بھی معقول انتظام ہے۔

فون نمبر:- آفس:- ۲۹۲۹۳۶۳۔ پریس:- ۳۲۸۲۵۷۳۔

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 SEP. 1988
Regd. with the Registrar of Newspaper at R.NO. 644/57 Delhi Posta

شانِ ہند

یا ضروری ہے کہ ہنگامۂ محشر بھی ہو
وجہ تخلیقِ جہاں ہو جو سزا کا



ایک شخص نے خود کو قتل کرانے کے لئے... ایک پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کیں۔

کیا وہ شخص واقعی قتل ہونا چاہتا تھا؟

ایک پیشہ ور قاتل نے یہ دلچسپ کہانی بیان کی ہے

کیا حقیقتاً وہ قاتل ہی تھا؟

اندر پڑھیئے:۔ "مدعا"

حفیظ بریلوی

شانِ ہند

دہلی

اکتوبر ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹ — شمارہ ۱۰

چیف ایڈیٹر
سرور تونسوی

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر
وی ایس پرکاش سرور تونسوی
طباعت: خواجہ پریس جامع مسجد دہلی
مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ شانِ ہند
[illegible] انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی

خطاط
[illegible]
محمد عمران

حسن کار
مصطفیٰ [illegible]

آرزو

اُردو میں سانیٹ،

آزاد انصاری مالیگانوی

اے چراغِ بزمِ جاں، اے نغمۂ سازِ زندگی
روشنی تیری ضیا باری سے ہر محفل میں ہے
تیری سینہ تابِ چنگاری نہاں ہر دل میں ہے
تیرے سوز و ساز میں پنہاں ہے رازِ زندگی
بزمِ ہستی میں فروزاں ہے تو مثلِ مہر و ماہ!
دشتِ عالم میں ہے تیری ذات گویا خضرِ راہ!
زورقِ بے بادباں ہے قلزمِ ہستی میں تو
بادۂ جاں بخش سے پر ہے ترا زرّیں ایاغ
تیری تابش سے فروزاں ہے مری سینے کا داغ
جادۂ رفعت دکھاتی ہے مجھے پستی میں تو
تیرے دم سے زندگی کی راہ طے کرتا ہوں میں
تیرے باعث سعی و کوشش پے بہ پے کرتا ہوں میں
ہر نفس مجھ کو پیامِ زندگی دیتی ہے تو
میرے جینے کا سہارا ہے، تو ہی، اے آرزو

کانگریسی لیڈروں کے یومِ پیدائش اور یومِ وفات پر

دُوردرشن کے مُشاعرے

آل انڈیا ریڈیو اور دُوردرشن پنڈت گووند ولبھ پنت کی تعریف کیلئے ہزاروں روپیہ بیکار شاعروں کو بعض شراب نوشی جوابازی اور جھوٹ بولنے پر برباد کر رہے ہیں.

کچھ عرصے سے ہمارے قابلِ تعظیم سابق لیڈر اور معمارِ وطن پنڈت گووند ولبھ پنت کے سلسلے میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ایک مسلسل تقاریب کا جو ایک سلسلہ جاری ہوا ہے یہ سلسلہ ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہر معمارِ قوم سابق لیڈر کے بارے میں اسی قسم کے اچھے پروگرام پیش کئے جائیں تاکہ عوام خصوصاً نوجوان طبقہ اپنے وطن کو آزاد کرانے والوں سے متعارف واقف ہو سکے.

سرکاری طور پر دوردرشن نے اس سلسلے میں ایک مسلسل فلم بنائی ہے جو کئی ہفتوں سے ملک بھر میں بڑی شد و مد سے دکھائی جا رہی ہے۔ یہاں تک بھی کوئی ایسی بات نہیں کہ کسی کو اعتراض ہو، حالانکہ اعتراض کے ہزاروں پہلو ہیں۔ پنڈت

[illegible]
[illegible] ذات و شخصیت کی [illegible] صاف [illegible]
دکھائی دیتا ہے اور اس سلسلے میں پنڈت (آنند) آئن اور ان کی تعبیر و تشکیل کی کالی پنڈت وگیہ پنڈت
اور آئی کی جانشینی ہے۔

[illegible] اس کی یہ خوبی تھی کہ سادہ ہوتا ہوا اور اس وجہ سے کہ ملک کا ہر سرکاری اور غیر سرکاری طبقہ خوشامد اور [illegible] ملک بازوں میں ایک کام ہو جاتا [illegible]

خوش قسمتی سے ہمارے وزیر اعظم راجیو گاندھی وزارت میں ادلی بدلی کرنا پسند کرتے ہیں چنانچہ یہ افواہ بڑے زور و شور سے ہے کہ پنڈت کے۔ سی۔ پنت اور ان کے حواری یہ خیال کئے جا رہے ہیں کہ اس وقت یو۔ پی کی وزارت اعلیٰ پنڈت کے۔ سی۔ پنت کے ہاتھوں میں دی جائے اور یو۔ پی کے موجودہ وزیر اعلیٰ جناب تیواری کو کسی حد تک ان جیسے سمجھے جانے کسی اور عہدے میں لے لیا جائے۔

ویسے تو ہمارے وزیر اعظم کسی بھی سیاسی طاقت کو عمل میں لانے میں دیر نہیں کرتے۔ اگر ان سے بار لوگوں کی اس چال میں آ کر تیواری جی کو یو۔ پی سے ہٹا کر وزارت اعلیٰ کی کرسی پنت کے ہاتھوں میں دے دی جائے تو یہ حماقت وزیر اعظم کے لئے کچھ مہنگی پڑے گی۔ کے۔ سی۔ پنت کو یہاں بہت سے لوگوں میں مقبول ہوں (حالانکہ یہ بھی محض ایک پروپیگنڈہ ہے) مگر راجیو کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس وقت اتر پردیش کی وزارت اعلیٰ کو ان کے ہاتھ سے لینا ایک بہت بڑا خطرہ ہے آئندہ الیکشن کے لئے۔ اور اس حقیقت سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ تیواری جی سے بہتر کوئی وزیر اعلیٰ یو۔ پی کے لئے اس وقت نہیں مل سکتا ہے۔

اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ ویر بہادر [illegible] یو۔ پی کے حالات خراب کر گئے ہیں

ان کی شخصیت شانِ ہند میں ذکر [illegible] جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک اکیلا آدمی کچھ بات ہوا اور ویر بہادر سنگھ بھی ہر گز [illegible] نہیں کر پائے گے

خدا کے فضل سے یو۔ پی کے گورنر جناب جی شنکر دیال شرما اور وزیر اعلیٰ بھی ہیں اور وہ اپنے عہدے کو ہر سیاسی دباؤ سے محفوظ رکھے ہوئے ہیں اور ان کا کانگریس کا بول بالا رکھے ہیں ٹھیک ہے کیونکہ یو۔ پی ہمیشہ سے کانگریس کا گڑھ رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ اور گورنر دونوں میں ہر قسم کا سیاسی، غیر سیاسی اور مجلسی اتحاد ہے۔ ایسی حالت میں جناب تیواری صاحب کو اتر پردیش سے نکالنا کانگریس کے حق میں اچھا نہیں ہے۔

کیا مطلب ہے اس اور کوئی شخص تو اس کا نام ہے کہ جب دو دن پہلے تیواری جی کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ملک کے سرکاری خدمات [illegible] سے کہ وزارت اعلیٰ کا چارج [illegible] اور ایک وقت یہ ہے کہ انہیں محض سیاسی [illegible] اور ان اعلیٰ یا نئی شخصیتوں کی [illegible] جاری ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن پر پنڈت کی ذات و شخصیت کی تعریف کے ہزار بار [illegible]

بڑے شوق سے پوری کی جائیں، مگر آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے ڈائریکٹروں کو یہ تو علم ہونا کہ خوشامد کی بھی کوئی حد ہوتی ہے

ہمارے وزیر اعظم حال ہی میں پنجاب، جموں کشمیر اور دیگر سیلاب زدہ علاقوں کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں اور انہوں نے بے گھر اور بے زر لوگوں کے لئے اربوں روپے خزانے سے دینے کا وعدہ فرمایا ہے مگر ایک ہمارا آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن ہیں جو پنڈت و شخصیت کی تعریف کے لئے ہزار بار وہی پروگرام کو محض خراب کرتی، جوا بازی اور ضیاعت پر لئے کر رہے ہیں۔

اور اس سلسلے میں ہمیں پنجابیوں سے کچھ کہنا ہے۔ وہ یہ کہ ابھی اسی ہفتہ لدھیانہ میں یادِ ساحر لدھیانوی میں ایک دکھ وہ بے خراب نوشی کے گانوں اور شاعروں کے بے وقعت پر ضائع کر دیا گیا اور پھر اسی ہفتہ گوردوارہ تک میں ایک اور مشاعرہ منعقد ہو جس میں جموں و کشمیر کو اس کی پنجاب اور سیلاب کی باتوں سے ناٹک کی طرح تشکیل [illegible] جا رہے تھی جو میں سیلاب کے باعث [illegible] لوگوں میں جو

مُشاعرے بڑے بڑے ہوتے ہیں وہاں کے لوگ گو شاعروں کے نام پر لاکھوں روپیہ محض خراب اور چار چار مشتقیہ اشعار ترنم میں پڑھ کر سنانے والوں کو ہزاروں روپیہ دینے میں اُن ہزاروں بے گھروں کا حق چھینتے ہیں۔
آخر میں جالندھر کا مشاعرہ محض مشاعرہ ہی تھا۔ پنڈت گووند ولبھ پنت کے نام پر دُوردرشن جالندھر نے اپنے دوستوں کو نوازنا تھا اور بس! اناؤنسر بھی ہے، صدر یو۔ پی سے اور اکثر شعرا یو۔ پی سے طلب کر کے ایک گھنٹے کی واہ واہ مچانے کے لیے دُوردرشن نے سیلاب کے ان بُرے دنوں میں ۵۰، ۶۰ ہزار روپیہ برباد کر دیا ہوگا۔
کاش! کوئی سرکاری افسر تو اس کا احساس کرے کہ وہ مُلک کا خادم ہے اور یہ مُلک اُس کا اپنا ہے اور یہاں کا ہر دُکھیارا اُس کا بھائی ہے۔

دِلّی اُردو اکادمی سے ایک گُذارش

اُردو ہفت روزہ "شیرِ پنجاب" ۷۷ سال سے جاری ہے۔ اِس ہفت روزہ کے بانی بھائی امر سنگھ اپنے وقت کے ایک ایسے مانے ہوئے لیڈر تھے کہ جس پر مُلک فخر کرتا تھا۔ آخری دم تک بھائی امر سنگھ جی نے مُلک اور قوم کی جو خدمت کی اُسے بھلانا یقیناً ناانصافی ہے۔ بھائی امر سنگھ کا جاری کردہ "شیرِ پنجاب" اب تک ہر ہفتہ شائع ہوتا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں مُلک اور سِکھ قوم کی خدمت کرنا اپنا فرض اوّلین سمجھتا ہے۔ ہم گذشتہ تین چار سالوں سے اس کوشش میں ہیں کہ اردو اکادمی صحافت کا ایوارڈ "شیرِ پنجاب" کے نئے سردار جنگ بہادر سنگھ کو دے کر اُن کی نہیں، اپنی عزت بڑھائے۔

اِس سال اُردو اکادمی میں کئی نئے ممبران مُنتخب ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُن کا حلقۂ احباب بھی وسیع بلکہ وسیع تر ہوگا۔ اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ایوارڈ کمیٹی کے کچھ ممبران اپنے کسی دوست کو اس اعزاز سے نوازنا اپنا فرض سمجھیں گے۔ اگر ایسا ہُوا، تو یہ مرنجاں مرنج جناب رومیش بھنڈاری ایسے لیفٹننٹ گورنر کے عہد کی قابلِ یادگار ناانصافی ہوگی۔

کیا غالب انسٹی ٹیوٹ انعامی کمیٹی اپنی آبرو رکھے گی؟

غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال "غالب ایوارڈ" تقسیم کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پچھلے کچھ سالوں سے ادبی ایوارڈ اتنے بدنام ہو چکے ہیں کہ عوام میں اُن کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ سو فیصد نہیں تو کافی حد تک حق و انصاف کا ساتھ دیتا آ رہا ہے۔ گو سفارش بازی کی ایک دو مثالوں نے "غالب انسٹی ٹیوٹ" کی شاندار روایات کو بھی بٹہ لگا دیا ہے مگر بیگم عابدہ صاحبہ اور دیگر ممبرانِ انعام کمیٹی کا فرض ہے کہ وہ ایوارڈ کا فیصلہ انتہائی ایمانداری سے کریں۔ خوش نویسی ایوارڈ جمال گیاوی جو کہ دلی میں بیس سال سے مقیم ہیں کا حق ہی نہیں، حقِ اوّلین ہے مگر اُن کے پاس کوئی ایسی سفارش نہیں جو غالب انسٹی ٹیوٹ کے ممبرانِ ایوارڈ کمیٹی کو بتا سکے کہ دلی میں کچھ ایسے اور لوگ بھی موجود ہیں جو اِس فن کو زندگی بخشتے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ اور کچھ اور لوگ لوگ بھی موجود ہیں جو غالب ایوارڈ کے حقیقی حقدار ہیں مگر اُن بیچاروں کے پاس کوئی سفارش نہیں ہے۔

ضامن علی خاں ضامن مُرادآبادی

ضامن مُرادآبادی کو مرحوم لکھتے ہوئے دل و دماغ کو اب بھی یقین نہیں آتا۔ اس چھوٹی سی عمر میں انھوں نے اُردو پرستی، دوستی، انسانیت، تہذیب، سماجی رکھ رکھاؤ، ہندو مسلم اتحاد، اور ہر ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنے کی ضمانت جس دیانت داری اور نیک نیتی سے نبھائی، ایسی صفات اللہ اپنے کسی خاص بندے کو ہی تفویض کرتا ہے۔ خدا نے ضامن صاحب کو بہت کم عمر عطا فرمائی مگر اس حقیقت سے انکار بھی کفرانِ نعمت ہوگا کہ جو کام ضامن مرحوم نے اس چھوٹی سی عمر میں کئے، وہ کروڑوں طویل العمر حضرات مل کر بھی نہ کر سکتے تھے۔ اُردو کی بقا و حیات کو ضامن کی ضمانت حاصل نہ رہنے سے جو نقصان پہنچا ہے، اُسے مُدتوں بھلایا نہ جا سکے گا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ضامن مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دینے کی عزت عطا فرمائے۔

معذرت

۱۵ ار اکتوبر ۲۰۰۰ء کو ہارٹ اٹیک کے باعث میں بیکار محض ہوگیا، جس کی وجہ سے تمام دفتری سرگرمیاں مدھم پڑ گئیں اور اسی وجہ سے "شانِ ہند" کی اشاعت میں بھی التوا رہا۔

میری علالت کے دوران جن بہی خواہوں نے ٹیلی فون، ٹیلیگرام اور خطوط کے ذریعے میری صحت کے لئے دُعائیں دیتے ہوئے مجھے نوازا، میں اُن سب حضرات کا دلی طور پر شکر گزار ہوں۔

اب خدا کے فضل سے میری صحت ایسی ہے کہ میں کسی حد تک دفتری ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے قابل ہوں۔ انشاء اللہ شانِ ہند کی اشاعت بھی جلدی بروقت ہونے لگے گی اور جمع شدہ خطوط کے جوابات بھی جلد از جلد دیئے جائیں گے۔ فقط!

آپ کی دعاؤں کا طالب

سرور تونسوی۔

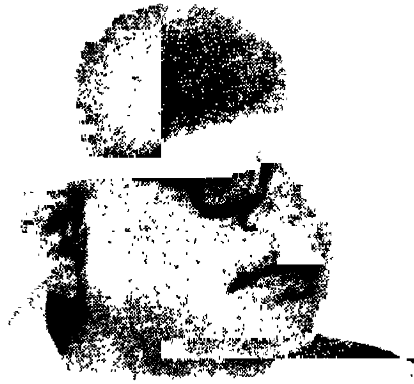
غزل

علی جواد زیدی

نئی بسائی ہوئی بستیوں کا گھیرا۔
چراغ راہوں میں روشن ہیں گھر اندھیرا ہے
رُکو نہیں کہ جواں دھوپ اب اُتار پہ ہے
فریب سایۂ اشجار کا گھنیرا ہے
طویل ہجر کی راتیں کسی سے کٹتی ہیں
محبتوں کی بھی تقدیر میں سویرا ہے
عبور کرنا ہے مجھ کو یہ آگ کا دریا
کہ اُس گلاب نگر میں کسی کا ڈیرا ہے
میں جان بوجھ کے گزرا ہوں قتل گاہوں سے
مرے وجود میں جو کچھ مرا ہے تیرا ہے
کتاب ہاتھ میں اور سر پہ جادوئی دستار
جو شہر بھر کو نچا دے یہ وہ سپیرا ہے
کوئی تو بات ہے کوئی تو ہے کشش ایسی
کہ روز روز اسی اِک گلی کا پھیرا ہے
وجود۔ حُسنِ سراپا، عشرتِ احساس
قیافہ۔ بھولا سا چہرہ، بدن بھرا ہے
بدل رہا تھا زمانہ، وفا نے روک دیا
کہ راہِ عشق میں تیرا ہے کچھ نہ میرا ہے
وہ بادبان اُٹھائے گئے اُچھل زیدی
سمندروں کے کنارے غضب سویرا ہے

چُپ سے بیاں
کی تقریب

حلقۂ شعور ادب
کویت میں اردو کے شاعر عمر خطاب
شعری مجموعے "چُپ سے بیاں تک
رونمائی کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب
میں پاکستانی سفارت خانے کے کونسل
شاہ نے کی۔ اشرف شاد ایڈیٹر
نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی
ٹاور میں منعقدہ اس پُروقار تقریب
کلامِ پاک سے ہوا۔ امجد طار
کلامِ پاک کے بعد عبدالمجید بیگ پر
رسول ﷺ پیش کی۔
تقریبِ رونمائی کا باقاعدہ
یوتھ ایسوسی ایشن کے صدر نعیم ا
اپنے ابتدائی کلام سے کیا۔ مقالہ
برکار، طاہر پرویز، غلام مصطفےٰ بہ
اور باقی احمد پوری کے نام قابلِ ذکر
"چُپ سے بیاں تک"
دوسرا حصہ مشاعرے پر مشتمل تھا
حسین شاہ، اشرف شاد، عمر خطا
برکار، عبداللہ ساجد، باقی احمد
غلام مصطفےٰ بیکس، شاہجہاں جعفر
جبیں زیبا، نعیم اقبال راہی،
امروہوی، عبدالحمید ہوش اور جمیہ
کے نام قابلِ ذکر ہیں
اس تقریب میں بڑی تعد
مقیم ادیبوں، شاعروں، دانشور و
صحافیوں نے شرکت کی۔ نظامت
مصطفےٰ بیکس نے بحسن و خوبی ا



غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

میں بھی ایک لہر ہوں تو بھی ایک لہر ہے
میری تیری لہر کا ایک نام دہر ہے

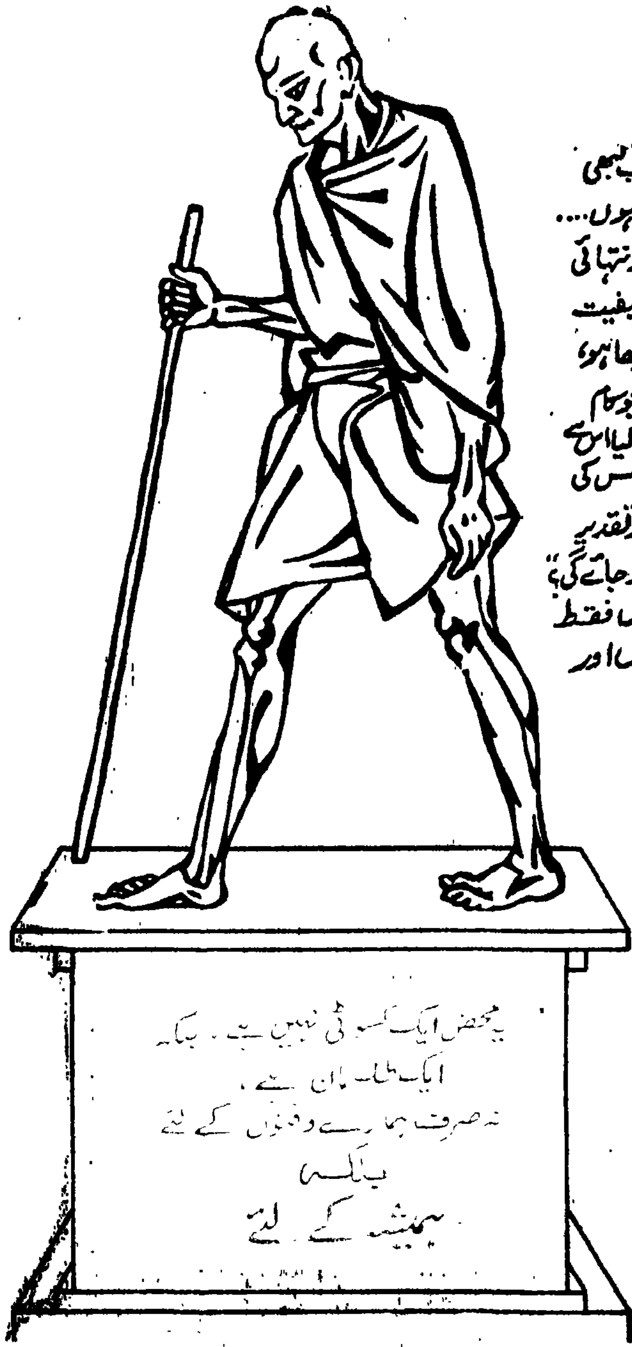
تو بھی اجنبی یہاں، میں بھی اجنبی یہاں
سب ہیں اجنبی یہاں، یہ عجیب شہر ہے

راستوں میں تشنگی، منزلوں میں تشنگی
تشنگی ہی تشنگی وقفِ برّ و بحر ہے

وہ بھی ایک قہر تھا لمحہ جو گزر گیا
لمحہ جو قریب ہے وہ بھی ایک قہر ہے

چین پائیں گے کہاں پوچھیے حقیر سے
موت ہو کہ زندگی ایک جامِ زہر ہے

[illegible] Gold Crown
J. P. Road
Andheri (W)
Bombay-400 061



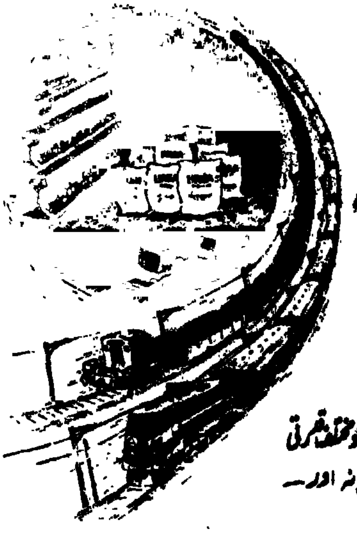
سچی کسوٹی

گاندھی جی نے کہا تھا "جب بھی آپ کسی شک کی حالت میں ہوں.... تو کسی ایسے کنگال ترین اور انتہائی بے بس انسان کے چہرے کی کیفیت یاد کیجئے، جسے آپ نے دیکھا ہو، اور پھر خود سے سوال کیجئے کہ جو کام آپ کرنے کی سوچ رہے ہیں، کیا اس سے اسے کوئی فائدہ پہنچے گا؟ کیا اس کی بدولت اس کی اپنی زندگی اور تقدیر پھر سے اس کے اختیار میں ہو جائے گی؟"
گاندھی جی کے راستے میں فقط یہی کسوٹی ہمارے منصوبوں اور پروگراموں کو با مقصد بنا سکتی ہے۔

davp 88/365

نادرن ریلوے

آپ کی روزمرّہ زندگی سے وابستہ ہے



ذرا سوچئے۔

- نادرن ریلوے ان گنت طریقوں سے آپ کی زندگی کو آرام دہ بناتی ہے۔ سماجی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو ریلوے سے ہم رشتہ نہ ہو۔

ایک حیات بخش وسیلہ جو کروڑوں کو غذا، ایندھن اور انرجی فراہم کرتا ہے۔ ریلوے مختلف علاقوں کو باہم جوڑنے والی مضبوط کڑی ہے۔



- نادرن ریلوے آپ کے فرصت کے لمحات کو زیادہ پرلطف بناتی ہے۔ یہ آپ کو مختلف قدرتی مناظر، راجستھان کے تپتے ہوئے ریگستانوں سے ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں، پنجاب، ہریانہ اور اترپردیش کے سرسبز و شاداب میدانوں میں لے جاتی ہے۔

- تقریباً ۱۲۵ سالوں سے ریلوے ہر طرح قومی ترقیاتی پروگراموں، نقل و حمل، زرعی ترقی، بجلی کی پیداوار، صنعتی ترقی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔

- نادرن ریلوے روزانہ ۹۰۰ میل، ایکسپریس اور پسنجر ٹرینوں میں ۱۱ لاکھ مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچاتی ہے اور روزانہ چھ سو مال گاڑیوں میں ۲ لاکھ ٹن مال ڈھویا جاتا ہے۔

نادرن ریلوے کی روزانہ کارگزاریوں میں شامل ہیں ——

- ۴۰,۰۰۰ ٹن اناج کی شمال کے زرعی علاقوں سے مختلف حصّوں کو ترسیل۔
- ۶۲,۰۰۰ ٹن کوئلہ صنعتی کاموں کیلئے پہنچانا۔
- ۱۵,۰۰۰ ٹن پیٹرولیم کی پیداوار کی آمد و رفت۔
- ۱۷,۰۰۰ ٹن کھاد ڈھونا۔

یہ سب ملک میں خود اعتمادی اور خودداری کی فضا تیار کرنے میں معاون ہیں۔
خاموشی سے، مگر یقینی طور پر نادرن ریلوے کروڑوں باشندوں کے بہتر مستقبل کے لئے سرگرم ہے۔
ریل پٹریوں کا مضبوط جال، زندگی کو قائم رکھنے والی رگوں اور نسوں کی طرح کام کر رہا ہے۔

آنکھوں دیکھا کانوں سنا

سُر سنگار سمسد بمبئی کا کُل ہند مشاعرہ

سرور تونسوی

۷ راپریل ۱۹۶۲ء، رات کے نو بجے ہیں،
بھون، بجلی کے قمقموں سے نئی دلہن بن رہا ہے
ہیں کہ رنگ بھون تک پہنچنا مشکل ہو رہا ہے
و سننے کے لئے سخن فہم حضرات کا جم غفیر ہے
رف نگاہ اُٹھتی ہے کوئی کرسی خالی نظر
تی۔ شری برج نارائن جی، معزز مدعوئین اور
کرام کا خندہ پیشانی سے استقبال کر رہے
وا نو بجے جناب وی۔ شنکر صاحب آئی۔ سی
شریف لائے ہیں۔ چونکہ آپ اس مشاعرے
در مجوّزہ ہیں اس لئے اُن کے اسٹیج پر آتے
ب شعرا حضرات اور معزز مدعوئین اسٹیج پر
لے آئے ہیں۔ "کلام بے لگام" کے خالق
نا شاد دہلوی اور قبلہ حضرت صولت ٹونکی
بی ایڈیٹر شانِ ہند اور روحی صاحب کے ساتھ
پر تشریف لے آئے ہیں۔ ۹ بجکر ۲۵ منٹ
شبہ شکیل بدایونی نے مائک سنبھالتے ہوئے

فرمایا کہ بمبئی میں اُردو مشاعروں کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اس سے مجھے خوشی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہماری بزم مشاعرہ کے صدر جناب وی، شنکر صاحب ہیں۔ صاحب موصوف کی یہ اُردو نوازی ہے ادب پروری ہے کہ آج بھی جب بمبئی میں کوئی مشاعرہ ہو تو ہماری نظریں اُن کی طرف اُٹھتی ہیں اور یہ دہلی میں رہتے ہوئے بھی بمبئی کو نہیں بھلاتے۔ سُر سنگار سمسد کی طرف سے میں تمام شعرائے کرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے دُور دراز کا سفر طے کیا اور ہمارے اس مشاعرے کی رونق بڑھانے کے لئے تشریف لائے، اور مقامی شعرائے کرام کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جو اس مشاعرے میں بمبئی کی پوری طرح سے نمائندگی کریں گے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مشاعرے کی تمام غزلیں ایک طرف ہوتی ہیں اور وی۔ شنکر صاحب کی صدارتی تقریر ایک طرف ہوتی ہے۔ لہٰذا میں جناب شنکر صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ مسندِ صدارت سنبھال کر صدارتی خطبہ عطا فرمائیں۔ لیجئے وی۔ شنکر صاحب مسندِ صدارت پر تالیوں کے شور میں تشریف لے آئے ہیں، اور مشاعرہ کمیٹی کے ایک رُکن نے اُنھیں طلائی ہار پہنایا ہے۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد وی شنکر صاحب فرما رہے ہیں:

"مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس سلسلہ جشنِ موسیقی میں اس "جشنِ سخن" کو اتنی اہمیت دی گئی ہے۔ چھ سال ہوئے جبکہ میرے دوست برج نارائن کے پیشِ نظر یہ مسئلہ تھا کہ شاعری اور موسیقی کے باہمی تعلقات کی وجہ سے بمبئی میں جو ادب اور موسیقی کی تربیت ہو گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ نہایت موزوں ہو گا کہ ان دونوں کے سنگم کی تجدید ہر سال اس شہر میں ہو۔ چنانچہ انھوں نے اس کو کامیابی سے سرانجام دینے کا قصد کیا اور آپ جانتے ہیں کہ برج نارائن صاحب کسی بات کا عزم کرتے ہیں تو اس کو کوئی ہلا نہیں سکتا اور

بخوبی بجا کیوں نہ لائیں جبکہ وہ خود مجسم یک تحریک ہیں۔ بے قراری سیماب کی سی ہے کہ ایک جگہ آپ اُن کو قرار سے نہیں دیکھیں گے۔ گفتار اُن کی دکھیلانہ ہے۔ اور نفی کو حمایت میں بدلنے کی جو خوبی زمانہ ہے وہ بھی خوب اچھی طرح وہ رکھتے ہیں اور رفتار تو بڑی مردانہ ہے۔ کامیابی کی جب اتنی خوبیاں اُن میں موجود ہیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ تحریک کامیاب نہ ہوتی۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ ہر سال آپ حضرات کی سرپرستی اس تقریب پر بڑھتی جاتی ہے۔ شکیل صاحب نے میرے دہلی سے یہاں آنے کی زحمت کا ذکر کیا ہے تو حضرات دہلی کا تو وہ حال ہے جو جوش صاحب نے بیان کیا ہے ؎

" جو دل کی ہے وہ بات نہیں ہوتی ہے
جو دن نہ ہو وہ رات نہیں ہوتی ہے
ہستی کا ہے طوفان وہ اکثر اے جوش
اپنے سے مُلاقات نہیں ہوتی ہے "

تو حضرات جب مجھے اپنے سے مُلاقات کرنی ہوتی ہے تو مَیں دہلی سے باہر جاتا ہوں اور اس میں جو آپ حضرات کا نیاز حاصل ہو اور شعرائے کرام کا بھی نیاز حاصل ہو تو اس سے بڑھ کر میرے لئے دہلی سے بھاگنے کی اور کون زیادہ وجہ ہو سکے گی۔ چنانچہ جب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی میں مشاعرہ ہونے والا ہے تو خواہ دعوت ملے یا نہ ملے کسی نہ کسی طرح مَیں موجود ہو جاتا ہوں۔ مَیں نے آپ سے پہلے ذکر کیا کہ نہایت ہی موزوں ہے کہ یہ سنگم بمبئی میں ہو۔ ممکن ہے کچھ حضرات یہ کہیں کہ جیسے ان دونوں (موسیقی اور شاعری) میں شراب اور شباب کے نشے بھرے ہوئے ہیں تو بمبئی میں اس تقریب کا ہونا غیر واجب ہے اور یہ بات میرے دھیان میں خاص طور پر آئی جبکہ آج بمبئی میں جگہ جگہ شراب بندی ہفتے کے اشتہار دیکھ رہا تھا۔ مجھے راز صاحب کا شعر یاد آیا ؎

اور کچھ دن یہ دستورِ میخانہ ہے تشنہ کامی کے یہ دن گذر جائینگے
اپنے ساقی کو نظریں اُٹھانے تو دو جتنے خالی ہیں سب جام بھر جائینگے

ویسے تو راز صاحب کا ہی شعر ہے ؎

" کھُلی بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں "

لیکن آپ حضرات یہ یاد رکھیئے کہ جس طرح شکیل صاحب نظر سے پیا کرتے ہیں اور راز صاحب نے ساقی کی نظر اُٹھانے کا ذکر کیا، شراب بھرنے کا ذکر نہیں کیا۔ چونکہ بمبئی کو تو شکیل صاحب بددعا دے چکے ہیں، کیونکہ کبھی کسی کا ہاتھ تو جام تک نہیں پہنچے گا۔ تو اس حالت کے اس پہلو سے بھی آج یہ تقریب بمبئی میں کوئی غیر واجب نہیں ہے کیونکہ اب تو وہ زمانہ گیا کہ

" جب وقت ہوا جڑھائی دو گھونٹ ہیں اکٹھی
مُلّا کی دوڑ مسجد، اکبر کی دوڑ بھٹی "

اب تو شاعر صاحبان خالی نظر سے پی پی کر قناعت کرتے ہیں۔

حضرات! شاعر اور مُطرب کا رشتہ مَیں نے آپ سے کہا کہ نہایت باہمی اور گہرا ہے۔ شاعر کی طرف آپ ذرا غور کریں تو دیکھیے گا اُس کی روشنیٔ طبع اُس کو کہاں کہاں لے جاتی ہے اور کس طرح مختلف قسم کی ہستیوں میں ایک نئی جان پیدا کرتی ہے۔ ایک انگریزی شاعر کا قول ہے کہ شاعر کی نظر زمین سے آسمان تک ہر چیز کو دیکھتی ہے اور اُس میں ایک نئی چیز پیدا کرکے جو ہستی نکلتی ہے وہ جیتے جاگتے انسان سے بھی بہتر ہوتی ہے کیونکہ زندگی پھر بھی فانی ہے لیکن شاعر کی یہ نئی ہستی یعنی شاعر کی پیدا کی ہوئی یہ نئی ہستی اب بقا پر ملتی ہے۔ شاعر کی نظر کو دیکھیے تو ہستی کا ہر رنگ اُس میں نظر آتا ہے۔ تاریخ پڑھنی ہو تو ستم ہائے زمانہ کی تاریخ پڑھ لیجئے۔ بیکسی اور لاچارگی کا مرثیہ پڑھنا ہو تو وہ بھی اس میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اور اگر زندگی کی عظمت کا قصیدہ پڑھنا ہو تو اس کی عظمت کا بھی جلوہ اُس کی نظم میں آپ کو ملے گا۔ لیکن آوارگی پہ خیال آمادہ ہوتا ہے تو نقشِ پا کو چوم کر مانندِ غبار عرشِ معلّیٰ میں جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر آپ اُس کی گہرائی، وسعت اور بلندی پر جائیے تو اس کا کلام محض اُس کی زندگی کا نقشہ نہیں ہے بلکہ ساری دُنیا کی زندگی کا نقشہ ہے۔ ابھی تک صرف ایک کمی شاعر کے کلام میں ہے، اور وہ یہ ہے کہ ابھی تک اس نے حُسن اور عشق کا مقدمہ طے نہیں کیا جس دن یہ مقدمہ طے کرے گا اُس دن شاعری ختم ہو جائے گی اس مقدمہ کے غیر فیصل ہونے میں دلچسپی ہے وہ بھی ایک شاعری کی زیبائش ہے اس کا نتیجہ ہے کہ یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ شاعر کے دل میں داغ اتنے ہیں کہ حسرت کو جگہ نہیں یا کہ حسرت اتنی ہے کہ دل میں داغ کی جگہ نہیں ہے۔

حضرات! شاعر کی زندگی کے ان مختلف پہلوؤں پر ذرا آپ غور کریں گے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہر پہلو میں اُس کی ہستی قوم کے لئے ایک ہستی ہے۔ اگر آپ زندگی تک تاریخ میں جتنے آئے ہیں اُن پر غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ شاعر آدمیوں کو فرشتہ وشی کی طرف لے جاتا جبکہ سر دینے کا وقت آتا ہے۔ اور ہمت افزائی ہے جبکہ ہمت دینے کا وقت آتا ہے۔ ہر عالم ہر حال میں شاعر خدمت پر تُلا رہتا ہے۔

اب مُطرب کو دیکھئے۔ غالب کا قول ہے

" محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا "

میرا خیال ہے کہ مُطرب کے ساز پر انگشت نمائی کا اس سے بڑھ کر اور کوئی نشان نہیں ملے۔ مُطرب بھی شاعر کے کلام کو ایک جامہ پہناتا ہے سے آپ حضرات کے اور ہم سب کے دل متاثر ہیں۔ وہ کلام کا رس نچوڑ کر آپ کے سامنے ہنر سے پیش کرتا ہے۔ حضرات! اس تقریب کا آغاز ہوئے کئی برس ہوئے۔ آج یہ تیسرا موقع ہے جب مجھے برج نارائن صاحب نے اس جلسہ کی صدارت کا شرف بخشا ہے۔ میں اُن کا اور آپ حضرات کا ممنون و مشکور ہوں اور شعرائے کرام جنھوں نے ہم سب کی دعوت قبول کی، اُن سب کا بھی ممنون ہوں۔ اب میں یہ جانتے ہوئے کہ آپ حضرات شعرائے کرام کا کلام سُننے کے لئے کس قدر مشتاق ہیں شکیل بدایونی سے درخواست کروں گا کہ وہ مشاعرہ کا کام شروع کریں "

لیجئے شکیل صاحب نے اپنی روایتی مسکراہٹ کے ساتھ مائیک سنبھال لیا ہے اور فرما رہے ہیں:

کامیابی، سامعین کے تعاون پر منحصر ہے
سامعین کرام سے یہ بڑی پختہ توقع ہے
روایات کے مطابق مجھے اپنا تعاون پورے
ں گے۔ اور میں شعرائے کرام سے گزارش
میں نے شعرا کی ترتیب اس انداز سے رکھی
عرہ کسی وقت بھی کمزور نہ ہونے پائے۔
کل چاندپوری سے اس مشاعرہ کو شروع
ں۔ آئیے کامل چاندپوری صاحب۔
کل صاحب فرما رہے ہیں ؎

ب اس ادا سے وہ میرا سلام لیتے ہیں
جیسے مجھ سے کوئی انتقام لیتے ہیں

مطلع پر داد پانے کے بعد کامل صاحب کیسے
یار ارشاد فرما رہے ہیں ؎

ارے دل میں یہ تو فریبِ بادہ کشو!
خالی جام بھی با احترام لیتے ہیں
راہِ عشق ہے ناصح تجھے نہیں معلوم
یاں خرد سے نہیں دل سے کام لیتے ہیں
نام شب تو مناتے ہیں جشن مے کامل
سحر کو اٹھتے ہی اللہ کا نام لیتے ہیں ؎

جناب کامل چاندپوری اچھی داد پانے کے بعد آ گئے ہیں اور شکیل صاحب نے جناب اصغر ں کو کلام سنانے کے لئے کہا ہے۔ اصغر صاحب سنا کر اپنی جگہ پر آ گئے ہیں اور اب جناب ناصر سے شکیل صاحب نے کلام سنانے کو سنئے، ناصر صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

ج کل کے یہ جوان ارجن و طارق کے سپوت
چھین لی جن کی کریا نے کمانوں سے لچک
دیکھ کے آئینہ وہ اپنی ہی آنکھوں سے کہیں
نین لڑتے ہیں تو ہوتی ہے کمر میں لچک

بعد ارشاد ہوا ہے ؎

وہ کہ دانت بھی ٹوٹے نہیں جن کے اب تک
عشق کرتے ہیں وہ بھی بصد شوق سے
کیا ہو کہیں وہ اگر ان سے کہا جبر اور
عشق کرتا ہے کوئی اتنی سے اور غالب

عبداللہ ناصر صاحب مزاح کا کلام سنا کر پر تشریف لے گئے تو شکیل صاحب نے جناب صبا افغانی سے کلام سنانے کی گزارش کی ہے لیجئے صبا صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

تجھ کو دریادلی کی قسم ساقیا مستقل دور پر دور چلتا رہے
رونقِ میکدہ یونہی بڑھتی رہے ایک گرتا رہے اک سنبھلتا رہے

مطلع ہی سے مشاعرے کا رنگ بدل گیا ہے۔ داد کے شور سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ سنئے صبا صاحب فرما رہے ہیں ؎

صرف شبنم ہی شانِ گلستاں نہیں شعلۂ گل کا بھی دور چلتا رہے
چشمِ پرنم سے آنسو بھی بہتے رہیں اور دل سے دھواں بھی نکلتا رہے
شیخ کی چھت پہ یہ زلف بکھری ہوئی رات کی گود میں صبح نکھری ہوئی
اور اس پر قیامت یہ فرقِ نظر دل ہے آخر کہاں تک سنبھلتا رہے

صبا صاحب داد پاتے ہوئے فرما رہے ہیں ؎

جیسے قبضے میں ہے یہ نظامِ جہاں تو جو چاہے تو صحرا بنے گلستاں
ہر نظر پر تری پھول کھلتے رہیں ہر اشارے پہ موسم بدلتا رہے

صبا صاحب بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو حضرت شکیل نے جناب مظفر شاہجہانپوری سے کلام سنانے کی گزارش کی ہے۔ سنئے مظفر صاحب فرما رہے ہیں ؎

جینے کا راز ہم نے محبت میں پا لیا
ہر اہلِ غم کے درد کو دل سے لگا لیا
تم غم کا بوجھ رو کے بھی ہلکا نہ کر سکے
میں نے ہنسی کی آڑ میں ہر غم چھپا لیا

داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے اور مظفر صاحب منہ سے پان کی چھالیہ پھینکتے ہوئے والہانہ انداز میں نغمہ سرا ہیں ؎

اک تم برائے نام بھی کرتے نہیں وفا
اک ہم وفا کے نام پہ خود کو مٹا لیا
ملنے کو اپنے آپ سے بھی ہم ترس گئے
جب سے کسی نگاہ نے اپنا بنا لیا
دل میں ٹھہر گیا مرے شعلوں کا قافلہ
تم نے تو احتیاط سے دامن بچا لیا

داد ہے کہ مظفر صاحب اس عزت افزائی پر خوش ہو رہے ہیں، نیز ارشاد فرما رہے ہیں ؎

دیر و حرم کہاں ہیں ذرا ڈھونڈ کر بتا
میں نے جوابِ حسن سے دل کو جلا لیا
اس ضبطِ غم سے اور بھی صیاد چڑھ گیا
ہم نے تو اب قفس کو نشیمن بنا لیا
نفرت پر سب غبارِ حقِ انسانیت کے ہیں
ہم نے ہی اس کو کافر و مومن بنا لیا

جناب مظفر شاہجہانپوری غزل سنا کر اور خوب خوب داد پا کر مائیک سے اٹھے تو شکیل صاحب نے جناب شفقی بھوپالی سے کلام سنانے کی التجا کی ہے لیجئے شفقی صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور اپنی مخصوص اداؤں کے ساتھ نغمہ سرا ہو گئے ہیں ؎

تمنا ہے کہ یوں بھی انقلاب روزگار آئے
انہیں ہمراہ لے کر گردشِ لیل و نہار آئے
نظر میں خوبیاں لب پر ہنسی باتوں میں بیباکی
کسی کو ان کے وعدوں پر کہاں تک اعتبار آئے

ایک تو کلام اچھا، پھر شفقی صاحب کو داد لینا بھی آتا ہے۔ چنانچہ داد ہے کہ مشاعرہ جاگتا ہوا معلوم دے رہا ہے۔ سنئے شفقی صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

رہے محدود فیضِ رنگ و بو کیوں غنچہ و گل تک
جو آتا ہے تو پھر سارے گلستاں میں بہار آئے
حریمِ شوق و بزمِ حسن بالکل ایک جیسے ہیں
یہاں سے بیقرار اٹھے وہاں سے بیقرار آئے
تصدق تیری رحمت کے جزا دے حشر میں ہم کو
سزا کا جو زمانہ تھا وہ دنیا میں گزار آئے

داد ہے کہ شاعر و سیدان حشر معلوم ہو رہا ہے اور جناب شفقی مقطع فرما رہے ہیں ؎

ابھی تک تو مسلسل کشمکش کا دور دورہ تھا
وطن کو آسودہ اور وقت شفقی سازگار آئے

سنئے شکیل صاحب کس قدر موزوں الفاظ اور اچھے انداز سے جناب سرشار سیلانی سے کلام سنانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ چند سیکنڈ بعد حضرت سرشار سیلانی صحت الفاظ شعروں کی صورت میں موتی لٹا رہے ہیں۔ فرما رہے ہیں ؎

خضر کی دوستی بغیر سہی
اک سفر خضر کے بغیر سہی
آئیے میکدے میں بات کریں
چلئے کعبہ سہی نہ دیر سہی

داد ہے کہ سامعین کے باذوق ہونے کا ثبوت
دے رہی ہے اور سرشار صاحب فرما رہے ہیں ؎

دم سلامت رہے مسیحا کا
دردمندوں کا حال غیر سہی
بات کچھ بن گئی تو کیا کہنا
ورنہ غنچہ بتاں کی سیر سہی

اس شعر نے تو مشاعرہ میں بجلی سی دوڑا دی ہے۔ یہ شعر تین بار سنانے کے بعد مقطع ارشاد فرمایا ہے ؎

شیخ و سرشار جب کے ملتے ہیں
یوں خدا و اسطے کا بیر سہی

سامعین کے اصرار پر سرشار صاحب دوسری غزل سنا رہے ہیں ؎

کور چشمی کی دعا کیوں نہ کریں اہلِ نظر
کور چشموں کو یہاں اہلِ نظر کہتے ہیں
سنگ در کو جو نہ جانے کہ مرا سجدوں سے
آپ کیوں دوسر او دوسرا در کہتے ہیں

داد و ستائش کے شور میں سرشار صاحب مقطع فرما رہے ہیں ؎

ہم کدھر جائیں نجات غمِ دوراں کے لئے
شیخ اُدھر کہتے ہیں سرشار اِدھر کہتے ہیں

سرشار صاحب داد سے جھولیاں بھرے اپنی جگہ پر تشریف لے آئے تو علاؤ الدین صابر مائیک پر تشریف لائے۔ آپ نے اودھی زبان میں اپنا کلام سنایا ہے، مگر اب کے صابر صاحب داد نہ پا سکے۔ اب جناب محشر امروہوی مائیک پر تشریف لائے ہیں اور اپنی ایک پرانی غزل سنانی شروع کی ہے یہ غزل لال قلعہ کے مشاعرۂ جشن جمہوریت کی روداد میں چھپ چکی ہے، تاہم ایک شعر اس وقت بھی سن لیجئے۔ ؎

بھری جوانی میں جس دم تیار نظر ہو جاتی ہے
چیر تسکا د برہمن کوئی ہو مرلیکا سرنگوں جاتی ہے

خمار بارہ بنکوی فرما رہے ہیں "چشم بد دور"
محشر صاحب اس غزل پر خوب داد لے گئے ہیں۔ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور ساحر ہوشیارپوری تشریف لائے ہیں۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ جناب وی۔ شنکر صاحب فرما رہے ہیں "بیدی صاحب ایک گھنٹہ پہلے تشریف لے گئے ہیں"۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے اور بیدی صاحب بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے۔ خلیل صاحب فرما رہے ہیں کہ اب ایسی شاعرہ کلام سنا رہی ہیں جو پہلی ہی مرتبہ اس مشاعرے میں شرکت کر رہی ہیں۔ دیکھا تو جیتن اطہر الٰہ آبادی مائیک پر تشریف لے جا رہی ہیں جیتن صاحبہ مدراس، اعظم گڑھ وغیرہ مشاعروں میں کافی داد پا چکی ہیں، مگر اس مشاعرے میں وہ اپنے

جو اس قائم نہیں رکھ سکی ہیں اور غزل کا پہلا مصرعہ ہونٹوں سے سنا رہی ہیں۔ چونکہ کلام سنانے والی ایک خاتون ہیں اس لئے سامعین احتراماً غزل سن رہے ہیں۔ کوئی شاعر کلام سنا رہا ہوتا تو یقیناً ہوٹ ہو گیا ہوتا۔ لیجئے اب جناب اسد بھوپالی مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور جیتن الٰہ آبادی طرح بیٹھ کر کلام سنانے لگے تو سامعین نے شور مچا دیا

باقی آئندہ

غزل

مجبور جالندھری

برسا نہ آکاش سے پانی
پیاسے لوگ پکارے پانی
جب برسے تو ایسا برسے
ہاتھی بھی لے ڈوبے پانی
کیسی ہے انسان کی فطرت
ہر صورت جھٹلائے پانی
دھرتی نے بس یہ چاہا تھا
اس کی پیاس بجھائے پانی
فصلوں کی تھی یہی تمنا
رم جھم رم جھم برسے پانی
دھوپ جلے انسان نے چاہا
بدلے موسم برسے پانی
کس نے ایسا چاہا تھا کہ
گھر سے بے گھر کر دے پانی
بادل دیکھ کے ڈر لگتا ہے
اور نہ اب یہ برسے پانی
بیتے ساون کا کہنا ہے
کبھی کبھی تو برسے پانی
حد میں ہی اچھے لگتے ہیں
سردی گرمی، چاہے پانی
دعا کرو مجبورؔ کبھی بھی
یہ انسان نہ مانگے پانی

مدّعا



حفیظ بریلوی

فرینک حسبِ وعدہ ٹھیک تین بجے سہ پہر
میں داخل ہوا جہاں میں بیٹھا ہوا اُس کا انتظار
تھا۔ بار میں داخل ہوتے ہی اُس نے چاروں طرف
دوڑائیں، پھر جیب سے رومال نکال کر تین بار
جیسے وہ اُس میں لگی ہوئی گرد جھاڑ رہا ہو۔ یہ
ی پہچان تھی۔

دراصل میں اپنے پیشے میں بڑا محتاط رہتا
۔ ذرا سی بے احتیاطی سلاخوں کے پیچھے پہنچا سکتی
میں نے یہ یقین کر کے کہ وہی میرا مطلوبہ شخص
پنے سر پر تین مرتبہ ہاتھ پھیرتا ہوا اس کی طرف
۔

"آؤ کیبن میں بیٹھتے ہیں مسٹر فرینک" میں نے
کے طور پر دو انگلیوں سے وی کا نشان بناتے
ہاتھ کو اُس کی آنکھوں کے سامنے نچایا۔
کیبن میں بیٹھتے ہی بیرا آدھمکا جسے میں نے
بعد آنے کے لئے کہہ کر ٹال دیا۔

"تم کسے قتل کرانا چاہتے ہو؟" میں نے اُس کے کسی قدر فربہ جسم کو جانچتے ہوئے پوچھا۔

"خود اپنے آپ کو مسٹر قاتل" فرینک نے بھی مجھے نظروں میں تولتے ہوئے جواب دیا۔

"مسٹر مستقبل کے مقتول" میں نے بھی اسی لہجے میں مخاطب کیا۔ "پیشے کے لحاظ سے نہیں بلکہ فطری تجسس کی وجہ سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم کیوں دوسری دُنیا میں جانا چاہتے ہو؟ جب کہ یہ کائنات قدرت کی فیاضی سے مالا مال ہے۔"

"ہوں" اُس نے بُرا سا منہ بنایا "قدرت کی فیاضی جو دوسروں کے لئے تو موسلا دھار بارش کی طرح ہے لیکن مجھ کو بے آب و گیاہ ریگستان بنا رکھا ہے میں قرض کے بوجھ سے دب گیا ہوں جس کی ادائیگی صرف میری انشورنس پالیسی سے ہی ہو سکتی ہے۔ کم از کم میرے قتل کے بعد میرے بیوی بچوں کو عسرت کی زندگی سے تو نجات مل جائے گی۔" فرینک کا لہجہ خاطرانہ سا تھا۔ "تمہارا نشانہ کیسا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ مجھے مرتے وقت کم سے کم تکلیف ہو۔ تم ٹھیک میرے دل کا نشانہ لینا۔"

"بے فکر رہو مسٹر فرینک" میری گولی ٹھیک تمہارے دل ہی کی گہرائی ناپے گی۔ ویسے تم نے اپنی موت کے لئے کسی خاص وقت کا تعین کر لیا ہے یا نہیں؟ میں نے دریافت کیا۔

"ہاں پنچ کا وقت اس نیک کام کے لئے بہت ہی درست ہے۔" فرینک نے سنجیدگی سے کہا۔ اس وقت میری سکریٹری ہی میرے پاس ہوتی ہے۔ ویسے بھی اس کی عینی شہادت انشورنس کی رقم ملنے میں معاون ثابت ہوگی۔"

"تو میں جمعہ کو ساڑھے بارہ بجے تمہیں گولی مار دیتا ہوں۔"

"ٹھیک دلی ہے۔ یہ خیال رکھنا مسٹر قاتل" فرینک نے تاکید کی۔ "پانچ ہزار پیشگی اور پانچ ہزار لفافے میں بند کر کے اپنے دفتر کے کاؤنٹر پر رکھ دوں گا تاکہ تم میں داخل ہوتے وقت اُس کو چیک کر سکتے ہو تاکہ تمہیں

اندازہ ہو جاتا کہ میں تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول رہا۔

"تم تو وہ بلا ہو جو اتنی بڑی رقم کیسے مہیا کرو گے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے مسٹر قاتل کہ میں نے یہ رقم اسی کام کے لئے پس انداز کر رکھی تھی" فرینک نے وضاحت کی۔ "تمہیں زندگی میں ضرور ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہوگا جو اپنے دشمنوں کی موت چاہتے ہیں لیکن میں اپنے بال بچوں کے مستقبل کی خاطر خود اپنی موت کا خواہشمند ہوں۔"

"اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، اگرچہ زیادہ نہیں۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ میں فرینک کے اس ایثار سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ میں نے جب سے اس پیشے میں قدم رکھا تھا، فرینک کی طرح چار کیس مل چکے تھے۔ جن میں سے تین کیس بڑے اطمینان بخش طریقے سے انجام پذیر ہو سکے تھے، البتہ ایک کیس جو ہیئر کا تھا مکمل نہیں ہو سکا تھا کیونکہ ہیئر اپنی موت سے گھبرا کر نہ جانے کہاں فرار ہو گیا تھا۔

"مسٹر قاتل" فرینک نے مجھے مخاطب کیا۔ "ایک بات کا خاص خیال رہے۔ تم قتل کی فیس لے کر اپنے فرض کو بھول نہ جانا۔ اس میں میرے لئے ابدی سکون کا مسئلہ ہے۔"

"اگر فرار نہ ہوئے تو میں تمہیں ٹھکانے لگانے میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا" میں نے اسے دلاسا دیا۔

فرینک نے مطمئن ہو کر اپنی جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر میری طرف دیکھا اور سو سو ڈالر کے نوٹوں کو گن کر میز پر رکھ دیا۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر بیچ باہر چلا گیا۔

وہ چلا گیا تو میں نے رقم اپنے بریف کیس میں رکھی اور اس کے ساتھ ہی گھنے ریشم کا چشمہ اور وگ اتارنا نہیں بھولا۔ پھر میں اپنی اصلی شکل میں نہاتا ہوا اپنے ایجنٹ سیزر تام کی طرف چل دیا۔

میرے کئی ایجنٹ تھے جو تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ معقول کمیشن پر وہ گاہکوں کو میرے پاس بھیجا کرتے تھے باقی اصل کام میری ذمہ داری تھا۔ سیزر تام میرا خاص معاون تھا جسے میں سب سے زیادہ کمیشن دیتا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک عام سا آدمی لگتا تھا۔ اس میں ایک خوبی تھی کہ غالب کی بات بڑی گہری توجہ سے سنتا تھا۔ اس کے جسم پر کسی تبدیلی کے بغیر ایک بیٹھا ہوا جھکاؤ نظر آتی تھی اور وہ پھٹی ہی کپڑوں میں ایسی ایک کیپ بھی۔ وہ اپنا زیادہ وقت مختلف کلبوں اور شراب خانوں میں گاہکوں کی تلاش کرتے ہوئے گزارتا تھا۔

بالآخر میں نے اسے تلاش کر ہی لیا۔ وہ ساحلی بار میں بیٹھا بیئر کی چسکیاں لے رہا تھا۔ میں جونہی اس کے قریب پہنچا، اس نے سوال کیا "کتنی رقم ہاتھ لگی؟"

"پانچ ہزار ڈالر کی پہلی قسط مل گئی ہے۔" میں نے جیب سے رقم کا لفافہ نکالتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس میں سے دو ہزار ڈالر گن کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

میں اپنے ایجنٹوں کو تیس فیصد کمیشن دیتا تھا۔ شاید کچھ لوگوں کو یہ رقم زیادہ محسوس ہو، لیکن میرا خیال تھا کہ اس بزنس میں اگر میرے ایجنٹ مجھ سے زیادہ نہیں تو کم بھی کام نہیں کرتے تھے۔ سیزر اگرچہ دوسرے ایجنٹوں کے مقابلے میں نیا تھا لیکن مجھے اس کی بعض عادات بہت پسند تھیں۔ اس نے پچھلے دو ماہ میں میرے لئے دو گاہک بھیجے تھے جن میں ایک ہیئر تھا جو موت کے خوف سے فرار ہو چکا تھا، اور دوسرا فرینک جو سر دست میرے پاس آیا تھا۔

سیزر نے نوٹ نہ گن کر اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں ٹھونس لئے تھے:

"فرینک سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"بس اتفاقیہ طور پر۔ میں اسی بار میں بیٹھا تھا کہ وہ اندر داخل ہوا اور بیئر کا گلاس لے کر میرے قریب کی میز پر بیٹھ گیا جب اس نے گلاس ختم کر لیا تو مجھ سے نگاہ ملتے ہی سوال کر بیٹھا کہ تم کیا پینا پسند کرو گے؟" میں نے جواب دیا کہ بیئر ہی منگا لو۔ چنانچہ اس نے بیئر کا آرڈر دیا اور دوسری میز پر آ گیا۔ دوران گفتگو میں وہ اپنی مصیبتوں کا حال سناتا رہا، پھر خود ہی اس کا حل بھی نکال لیا" سیزر تام نے بیئر کی چسکیاں لیتے ہوئے تفصیل بیان کی۔

"کیا اسے تمہارا نام معلوم ہے؟"

"نہیں، میں نے اسے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"اس کے باوجود کہ وہ تم سے واقف نہیں تھا، تمہارے پاس آکر اپنا دکھڑا بھی رونے لگا" میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ تعجب کی بات نہیں سیزر؟"

"ہاں، ہے تو!" اس نے فکر مندی سے کہا۔

"تمہیں یقین ہے کہ تم نے کبھی اپنے پیشے میں یا اپنے اور میرے تعلق کے سلسلے میں کسی تیسرے کو نہیں بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں" سیزر نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ کوئی ایک فرد بھی میرے اور تمہارے تعلقات کے بارے میں نہیں جانتا۔ لیکن.... ٹھہرو۔ ایک شخص جانتا تھا۔ وہی مردود ہیئر جو موت کے خوف سے فرار ہو گیا تھا۔

اصولی طور پر میرے ایجنٹ کسی موکل کو اپنا اصلی نام اور پتہ نہیں بتاتے تھے۔ لیکن پھر بھی ہیئر کو ہمارے کام کی نوعیت کے علاوہ اتنی معلومات تو حاصل ہو گئی تھیں جن کی بنیاد پر فرینک سیزر تام کو تلاش کر سکتا تھا، خصوصاً اس صورت میں کہ سیزر کو اپنی ڈاڑھی، اپنی یونیفارم اور کپتانوں والی ٹوپی میں شناخت کیا جا سکتا تھا۔

اس وقت میری چھٹی حس احتیاط کی گردان کر رہی تھی۔ "سیزر" میں نے کہا: "ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ یہ رقم اس وقت تک خرچ نہ کرنا جب تک میں تمہیں اجازت نہ دے دوں۔"

"تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان نوٹوں کو نشان زد کر دیا گیا ہے؟" شاید اسے بھی میرے ذہن میں اٹھنے والے خدشات کا اندازہ ہو گیا تھا۔

دوسرے دن میں اپنی کار میں بیٹھ کر فرینک کے مضافاتی دفتر پہنچ گیا جو کہ سنٹو سیٹی میں تھا۔ سنٹو ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ قصبے میں داخل ہونے والی سڑک پر جو بورڈ میری نظر سے گزرا تھا اس کے مطابق وہاں آبادی تین ہزار بارہ نفوس پر مشتمل تھی۔ میں نے ایک جنرل اسٹور کے سامنے کار روکی اور اس کے لگے ہوئے پبلک بوتھ میں داخل ہو کر قصبے کی ٹیلیفون ڈائریکٹری کا مطالعہ کیا۔ کل بیس صفحات کرسٹو سٹی کے مخصوص تھے جن سے دوسری باتوں کے علاوہ یہ معلوم ہوا کہ کرسٹو سٹی میں پانچ ڈاکٹر ہیں، تین دندان ساز ہیں، آٹھ کیفے اور ریسٹورینٹ، پانچ چرچ اور ایک بینک ہے۔ وکیلوں کے نام پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ ان میں ایک نام فرینک کا بھی تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہاں اس کا دفتر ہے۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ کسی وجہ سے اس نے اپنا پیشہ بتانا مناسب

ہوگا۔

میں جنرل اسٹور سے باہر نکل کر مین روڈ پہ چلتے چلتے ایک حجام کی دوکان پر نظر پڑی جہاں ایک لگا ہوا تھا۔ عبارت پڑھنے سے معلوم ہوا کہ فرینک کے اٹارنی کے الیکشن کا امیدوار ہے۔ میں نے ایک سانس لی اور فرینک کے دفتر کے سامنے سے آہستہ کے ساتھ گزر گیا۔ میں نے دیکھا کہ اندر ایک کلرک نصف درجن آدمی موجود تھے۔ اُن میں فرینک موجود تھا۔ ممکن ہے کہ اندر کی جانب اُس کا ذاتی کمرہ ہو ' وہ بیٹھا ہو۔

آگے جا کر ایک بار دکھائی دیا۔ میں اُس میں ہو گیا۔ میں بار ٹنڈر کے پاس ہی ایک اونچے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ بار مین نے کاونٹر صاف کرتے ہوئے میری طرف دوستانہ انداز میں دیکھا۔ "قصبے اجنبی معلوم ہوتے ہو!"

میں نے سر ہلاتے ہوئے اثبات میں گردن "بیئر کا ٹھنڈا گلاس ہو تو دو' حلق خشک ہو رہا ہے۔"

کے بعد دیگرے تین گلاس حلق میں انڈیلنے کے میں اُس سے کسی حد تک بے تکلف ہو چکا تھا۔ دوران میں مجھے اس سے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ فرینک تک کنوارا ہے۔ وہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کے الیکشن میں تو ہو گیا ہے لیکن اُس کے جیتنے کے امکانات نہیں کیونکہ اُس کا مخالف پہلے ایک ایسی کاونٹی میں کام ہے جس کی آبادی آٹھ ہزار تھی۔ قصبے کے لوگ کے مقابلے میں اُسے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ پھر انکشاف ہوا کہ قصبے کے پولیس چیف جانسن کی فرینک کی بڑی بہن ہے۔ اتنا ہی نہیں' اُس کی ایک بہن اور بھی ہے جس پر جانسن خاصا مہربان رہتا ہے۔

اچانک میری نگاہ بار کے باہر روڈ پر گئی۔ جہاں سی سے بات کر رہا تھا۔ دوسرا آدمی کچھ آڑ میں تھا میں دائیں طرف جھک کر دیکھا تو مجھے حیرت نہیں ہوئی پیٹر سے کے مطابق وہ فرینک تھا۔

یہ وہی پیٹر تھا جسے میں نے صرف تین ہزار ڈالر قتل کرنے کا سودا کیا تھا۔ اُس نے محبت میں ناکامی جب سے یہ خواہش کی تھی لیکن وہ یہ جانتا نہیں چاہتا کہ اُس کی موت کب اور کس وقت آنا چاہیئے۔ بس ایک

بچنے میں کسی طرح کامیاب ہو گیا۔ اچانک اُسے اس طرح گولی مار دی جاتی کہ وہ بغیر تکلیف کے مر جاتا۔ پھر جب میں اُسے ختم کرنے کے لئے نکلا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔ بعد میں تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ مجھ سے سودا کرنے کے بعد اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ زندگی اُسے پھر دلفریب نظر آنے لگی تھی۔ وہ مجھے اور سیزو کو تلاش کرتا ہوا اساحلی بار میں پہنچا۔ مگر ہم دونوں اُسے نہیں ملے تو خوف سے وہ قصبہ ہی چھوڑ گیا کہ کہیں ہم اُس سے کیا ہوا وعدہ اچانک پورا نہ کر دیں۔

جمعے کی صبح میں جلد ہی اُٹھ گیا۔ ناشتہ کر کے میں مین روڈ پر آ گیا۔ راستے میں پولیس چیف کی وردی میں ایک شخص نظر آیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ چیف جانسن ہی ہے۔ فرینک کے دفتر کے سامنے پہنچ کر میں سڑک کی دوسری سمت واقع لائبریری میں گھس گیا۔ میں نے الماری میں لگی ہوئی ایک کتاب نکالی اور کھڑکی کے سامنے میز پر بیٹھ گیا۔ ٹھیک گیارہ بجے چیف جانسن فرینک کے دفتر میں داخل ہوا۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے' مگر پولیس چیف باہر نہ نکلا۔ ایک بجے بٹلر باہر آیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر دوبارہ اندر چلا گیا۔

دو بجے تک میں بور ہو چکا تھا۔ وقت آ گیا تھا کہ میں قصبے کو خدا حافظ کہہ کر اپنا راستہ پکڑوں۔ میں لائبریری سے نکلا اور اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔ پھر میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہوا ہی تھا کہ میری نگاہ پولیس چیف جانسن پر پڑی جو اپنا ریوالور میری طرف تانے ہوئے بیٹھا تھا۔

"تو گویا تم نے فرینک کے دفتر میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا! مگر کہاں؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

اُس نے آگے بڑھ کر میری تلاشی لی' مگر میرے پاس اُس کی توقع کے مطابق کوئی آتشی یا غیر آتشی اسلحہ نہ ملا تو وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے میری غیر موجودگی میں میرے سوٹ کیس کو کھول کر دیکھ لیا ہے' کیونکہ میری ڈاڑھی' چشمہ اور مصنوعی وِگ سامنے بستر پر پڑی تھی۔

"جب تم وعدے کے مطابق فرینک کے دفتر نہیں آئے تو میں سوچنے لگا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ خاص طور پر اس صورت میں کہ باہر کاونٹر پر ایک لفافے میں پانچ ہزار ڈالر بھی تمہارے لئے محفوظ پڑے ہوئے تھے۔ پھر میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ تم کیوں نہیں آئے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اس کی گفتگو سنتا رہا۔

"کیا تمہیں کچھ شبہ ہو گیا تھا؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "فرینک ایک بُلٹ پروف جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ جب تم اُسے گولی مارتے تو وہ اِس طرح فرش پر گر جاتا جیسے سچ مُچ مر گیا ہو۔ پھر میں جہاں چھپا تھا' باہر نکل کر تمہیں حکم دیتا کہ پستول پھینک دو' ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"جواب' تو یہ میری چھٹی حِس کے مطابق ایک فریب ہی تھا۔ مجھے پھانسنے کے لئے" میرا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔

"اصل میں یہ قصّہ پیٹر سے شروع ہوتا ہے" جانسن نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "اب سے کچھ عرصہ قبل ہم تینوں یعنی میں' پیٹر اور فرینک کرسمس کی خوشی میں شراب پی رہے تھے۔ پیٹر' والف کی چھوٹی بہن سے عشق میں ناکام ہو چکا تھا اس لئے وہ غم غلط کرنے کی خاطر کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ بُری طرح بہکنے لگا اور اسی کیفیت میں اُس نے ساری بات اُگل دی کہ کس طرح اُس نے خود اپنی جان دینے کے لئے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں۔ اس کے فوراً بعد ہی اُسے ایک لڑکی مل گئی اور وہ زندہ رہنے کی خواہش کرنے لگا لیکن تمہارے انتظامات مکمل ہو جانے کے بعد وہ خوفزدہ ہو گیا اور بھاگ نکلا۔ اُسے اندیشہ تھا کہ تم معاوضہ لے چکے ہو کہیں اُس کی تاک میں نہ بیٹھے ہو۔ پیٹر کی داستان سُن کر فرینک کو ایک انوکھی ترکیب سُوجھی۔ وہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کے عہدے کا امیدوار ہے۔ اُسے یہ الیکشن جیتنے کے لئے مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔ اُس نے ایک پروگرام بنایا کہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر قاتلوں کے کسی بھی گروہ کو پکڑوا دے تو یہ کامیابی ووٹروں کی نگاہ میں ڈسٹرکٹ اٹارنی

سے حفاظتی صورت کی ضرورت ہوگی جو سوچ کر اس نے تمہیں اور تمہارے ساتھی کو گرفتار کرانے کا منصوبہ بنایا۔"

جانسن چند لمحوں کے لئے خاموش رہا پھر سگریٹ سلگا کر دوبارہ کہنے لگا

"اب میں وہاں چھپا ہوا تمہاری آمد کا منتظر تھا۔ لیکن کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی تم نہیں آئے تو مجھے شک گزرا کہ کہیں تم ہماری چال تو نہیں سمجھ گئے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ تمہیں شبہ کیسے ہوا؟ اور شبہ ہو بھی گیا تو اس کے بعد تمہارا اگلا قدم کیا ہوگا؟ میں نے سوچا کہ فرض کیا جائے کہ تم آج صبح کی بجائے کل ہی کسی وقت قصبے میں آگئے تھے اور تم نے احتیاط کے طور پر فرینک کی بیان کردہ باتوں کی تحقیقات کے نتیجے میں جو کچھ تم نے سنا یا دیکھا وہ تمہیں پسند نہیں آیا اور تم نے جیرت اسی میں سمجھی کہ اس کام پر لعنت بھیجی جائے۔ تو کیا اس فیصلے پر پہنچ کر تم واپس چلے گئے ہوگے، یا ابھی تک یہ دیکھنے کے لئے ٹھہرے ہوگے کہ تمہارے شبہات کس حد تک درست تھے؟ ان سوالوں کے جواب معلوم کرنے کے لئے میں نے قصبے کے اکلوتے ہوٹل میں فون کیا۔ استقبالیہ کلرک کی زبانی مجھے ایک اجنبی کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ ابھی ٹھہرا ہوا ہے۔ چنانچہ میں فرینک کے دفتر کے عقبی دروازے سے باہر نکلا۔ یہاں ہوٹل میں بھی پچھلے دروازے سے اندر آیا اور تمہارے کمرے کی تلاشی لی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بستر کی طرف اشارہ کیا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ تم ان چیزوں کو بین وہ فرینک کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق نظر آؤگے۔"

میں نے ایک طویل سانس کھینچی، کیونکہ بس اب جلد ہی میں گرفتار ہونے والا تھا۔ لیکن یہ گرفتاری قاتل کی حیثیت سے نہیں بلکہ دوسرے جرم میں ہوتی۔ اس اطمینان کی ایک وجہ بھی تھی۔

دراصل میں اور میرے ساتھی قتل نہیں کرا کرتے تھے۔ ہم لوگ فریب بھی ایک انوکھے طریقے سے دیتے تھے۔ ہم نے آج تک کہیں اور کسی کا قتل نہیں کیا تھا۔ اس کام کے سلسلے میں ہم رقم وصول کرتے تھے لیکن پھر اس کے بعد غائب ہو جاتے تھے۔ اب اگر یہ صورت ہوتی تھی کہ کوئی اپنے دشمن کو قتل کرانا چاہتا تھا تو ہم رقم وصول کرکے غائب ہونے سے پہلے قتل ہونے والے کو ایک گمنام خط لکھ دیا کرتے تھے کہ فلاں شخص تمہیں قتل کرانا چاہتا ہے۔ اس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا کہ وہ شخص یا تو پولیس سے رجوع کرتا یا خود اپنے دشمن کے سامنے جا پہنچتا۔ دونوں صورتیں اس کے دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لئے کافی ہوتیں۔ لیکن وہ یہ سب بھی نہ کرتا تو بھی ہوشیار ہو جاتا۔ ویسے ہم خود بھی پولیس کو ویسا ہی گمنام خط بھیج دیتے تھے کیونکہ اگر وہ نہ پہنچے تو ہمارے خط سے پولیس چوکنا ہو جائے۔ پولیس اس طرح کے خطوط پر کارروائی ضرور کرتی ہے چنانچہ ہمارا خط پاکر وہ اس شخص کے پاس ضرور پہنچ جاتی جو ہماری خدمات حاصل کرتا تھا۔ پولیس کے پہنچنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آئندہ کے لئے وہ اس خیال سے توبہ کرلیتا۔ بلکہ شاید دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ کہیں اس کے دشمن کو سچ مچ قتل کر دیا جاتا تو آج انجام کیا ہوتا۔ بہرحال چونکہ گمنام خط کوئی قابل اعتماد ثبوت نہیں ہوتا اس لئے پولیس کسی کو گرفتار نہیں کرتی، محض ذرا دھمکا کر چلی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ میں اور میرے ساتھی زندگی لینے کا نہیں، زندگی دینے کا کام کر رہے تھے اس سلسلے میں ہمیں کبھی کسی موکل سے شکایت موصول نہیں ہوئی اور نہ کبھی کسی نے ہمارے خلاف کوئی قانونی کارروائی کی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے کسی دشمن کو، یا خود کو قتل کرانا چاہتا ہے، وہ اس کا ڈھنڈورا پیٹنا تو پسند نہیں کرتا۔

اب جہاں تک ان معاملات کا تعلق تھا کہ بجائے خود اپنے قتل کا انتظام کرنے والے ہوتے تھے، میں ہمیشہ ان کو خود ذکر کرنے کا موقع دیتا تھا۔ کبھی عجلت سے کام نہ لیتا تھا۔ چند دن کے وقفے کے بعد وہ اپنا ارادہ بدل دیتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خوشامد کرنے لگتا۔ پھر میں یوں اس کی جان بخش دیتا جیسے بادشاہ ہوں۔ ظاہر ہے اس احسان کے بعد رقم کی واپسی کا سوال ہی نہیں۔ اس لئے ہم سے آج تک رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں ہوا۔

میں کرسٹوسبی بھی اس لئے نہیں آیا تھا کہ فرینک کو حسبِ معاہدہ قتل کردوں۔ مجھے شک تھا کہ ہیبر کے توسط سے یہ مجھے ملا ہے، سو اس کو بھی بتا دوں گا کہ وہ آرام سے زندگی بسر کرے مگر میں نے یہ سب کچھ پولیس چیف کو نہیں بتایا تھا۔ اب چونکہ وہ میرے سامنے موجود تھا تو میں نے چاہا کہ وقت نازک ہے اُس کو اصل حقیقت بتادوں۔ وہ سگار کے گہرے گہرے کش لگا کر کچھ سوچ رہا تھا۔

"ہاں تو مسٹر!" جانسن اچانک چونکتے ہوئے بولا۔ "تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم کرنے کے بعد میں جب فرینک کے دفتر میں چھپا ہوا بیٹھا تھا تو کچھ اور بھی سوچ رہا تھا۔" اُس نے اپنے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی نامعقول بیوی کے رویے سے تنگ آچکا ہوں، میں اب اُس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔ لیکن وہ کسی طرح مجھے طلاق دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ میرے پاس بینک میں چار ہزار ڈالر جمع ہیں۔ اور یہ رقم میں اُس شخص کو بطور انعام دینے کو تیار ہوں، جو میری اس اُلجھن کو خوبی کے ساتھ حل کردے۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟" اُس نے میری طرف متوقع نظروں سے دیکھا۔

مینارۂ فلک بوس

حضرت ساقی تونڈیلوی کا مجموعۂ کلام شانِ ہند پبلی کیشنز کے اہتمام میں بہت جلد منصۂ شہود پر آ رہا ہے جس کے لئے فخریہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ آج تک کسی ہمارا شترین اُردو شاعر کا ایسا قابلِ قدر مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا ہوگا

گوری سوئے سیج پر

مِس پرویز اختر تنہا



آنکھوں کے
ے اب کسی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ہونٹوں کے
نے گوشے ہر وقت کسی کے گیت گانے کو بیتاب
ہے ہیں! اُسے واقعی کچھ خبر نہ تھی وہ کسی
جنگلی پھول کی طرح شگفتہ اور معصوم تھی۔ اپنے
سے ناآشنا، اپنی اٹھان سے بے پروا! اُسے
نہ تھی کہ وہ شباب کی اُن حدوں تک پہنچی ہے
کسی غیر مرد کی بلا وجہ پڑتی ہوئی نظروں سے
لڑکیاں اپنا بدن چُرانے لگتی ہیں۔

ایک دن میں برآمدے میں بیٹھی اسلم کی
کے بٹن ٹانک رہی تھی۔ اسلم نہا کر تولیے
چھتا ہوا میری ہی طرف آرہا تھا کہ میں نے
م سے گوری کو گرتے ہوئے دیکھا۔ وہ شاید
سے تیزی میں بھاگتی ہوئی آرہی تھی یا وہاں
ونا سے بے دم ہو کر گر پڑی تھی۔
کو زمہ بھاگی اور میں بھی اٹھ کر اس طرف
۔ میں نے اُسے سنبھالا تو محسوس کیا کہ وہ
زیرِ لب کچھ مسکرا رہی ہے۔ اُس کا نازک جسم کانپ
رہا تھا۔ میں حیران تھی کہ اتنی نڈر اور بیباک لڑکی کو
آج یہ کیا ہو گیا ہے۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد
اُسے ہوش آنے لگا تو وہ چلّانے لگی "آیا کہیں
کا مُردار! میں تو تیرے سو ٹوٹے کر کے تجھے کوّوں
کو کھلاؤں گی۔ ہائے میرے کھیتوں میں جانور چھوڑ
دیئے، میرے سارے کھیت کو خراب کر دیا اِس
کمبخت نے۔ میں ابھی آرہی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے
وہ بار بار میرے ہاتھوں میں اُچھل رہی تھی اور بولے
جا رہی تھی۔

میں سمجھ گئی، پہلی بار شادے والا کالو کے
ساتھ پانی لگانے اور کاٹنے پر اُس کی لڑائی ہوئی
تھی، آج بھی وہی معاملہ ہوگا۔ ہوش میں آنے کے
کچھ دیر بعد اُس نے بتایا کہ شادے مجھے پکڑنا چاہتا
تھا "گوری! تو اب جوان ہو گئی ہے۔ چل میرے گھر
چل کر عیش سے زندگی بسر کر۔ کھیتوں میں کام کرنا
تیرے بس کا روگ نہیں۔" بس! اتنی سی بات
پر میں نے ایک پتھر اُٹھا کر اُس کے سر پہ دے مارا
اور اُس کے ساتھی مجھے پکڑنے بھاگے تو میں اُن کا
پانی کاٹ کر بھاگ آئی۔

دوسرے دن وہ خلافِ معمول میرے پاس
کچھ جھجکی ہوئی آئی اور بولی "آپا! کیا میں بہت بڑی
ہو گئی ہوں؟ ہر کوئی یہی کہتا ہے اور اب تو اسلم بھی
کہنے لگا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "گوری
ٹھیک کہتے ہیں لوگ۔ تم واقعی بہت بڑی ہو گئی ہو
گھر سے باہر کم نکلا کرو۔ رہا زمینوں کا معاملہ [illegible]
اتنے سارے مزارعے آخر کس لئے ہیں [illegible]
چند کھیتوں کی حفاظت نہ کر سکیں گے [illegible]
ہی ان کی آمدنی مل جایا کرے گی۔ میں منشی سے بھی
بات کروں گی۔ پھر دیکھو، وہ شادا اور کالو کتنے بُرے
ہیں! کیا تم اُن کا مقابلہ کر سکتی ہو؟! آخر عورت
ذات ہو۔" اسلم تو خود تمہاری باتیں سن سن کر [illegible]
ہو رہا تھا۔

چند دنوں کو وہ سمجھ گئی [illegible]
[illegible]

میں شکل سکتی ہوں۔ میں تو اسلم کی وجہ سے چپ ہوں۔ وہ شہر چلا جائے تو ان کی ایک بار اچھی طرح مرمت کر دوں گی۔"

میں نے ایک انجانے سے اندیشے کے طور پر کہا "مگر اسلم کا اس معاملے سے کیا تعلق؟"

وہ اپنی رَو میں بولتی گئی "وہ مردود خدا کہتا ہے کہ تو اسلم کے ساتھ شہر بھاگ جانا چاہتی ہے اسی لئے ہر وقت اُس کے گھر میں گھسی رہتی ہے اور اگر تو نہیں جائے گی تو وہ تجھے میٹھی میٹھی باتوں سے بہکا کر لے جائے گا۔" پھر وہ دھیمے لہجے میں بولی "آپا! بھلا اسلم مجھے بھگا کر شہر کیوں لے جائے گا؟ میں تو خود ہی اُس کے ساتھ جہاں وہ کہے چلی جاؤں، مگر آپا.... آپا!" نہ جانے اور کیا کیا کہتی رہی۔

اِن معصوم باتوں سے اُس کے دل کی آواز میرے کانوں تک پہنچی تو میں سناٹے میں آگئی۔ یہ نڈر اور بے باک سی لڑکی شاید اپنے اندر اُٹھنے والی محبت کی تیز و تند لہروں سے ابھی تک ناآشنا ہے میں سوچنے لگی۔ اور یہ بھی کہ ایسے لوگ زندگی میں بہت دُکھ کر گزرتے ہیں۔ میں نے بہت آگے تک سوچ کر اُسے سمجھایا۔ "اچھا اب تو چل! اسلم بھی کھیتوں سے آنے والا ہے، مجھے بھی کئی کام کرنے ہیں۔"

وہ بولی۔

"اُسے آجانے دو آپا! آج اس سے یہ بات بھی ہو جائے گی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ کب لے جائے گا۔ سچ! اُس کے بغیر تو اب میرا کسی کام میں جی نہیں لگتا آپا! وہ دن کتنے اچھے تھے جب ہم دونوں اسکول کے لئے نکلتے تھے۔ اُسے تنگ کرنے میں مجھے بہت مزا آتا تھا آپا! بھلا کیا تھا جو ہم بڑے نہ ہوتے۔ ہاں وہ اچھے تو شہر جا کر اور بڑا ہو کر کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا ہے۔"

میں چپ سی [illegible] لیتے ہوئے کچھ دیر بعد خود بھی چلی گئی۔

ایک دن میں چند ضروری کاغذات تیار کر کے بیٹھی تھی کہ گوری آگئی وہ کچھ چپ چپ سی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کچھ سوچ میں ہوگئی۔

قطعہ

ہاتھ کی یہ انگلیاں دیکھو ہوتی ہیں نا ایک
لیکن ہم جب چاہتے ہیں ان کو کر لیتے ہیں ایک
ایسے ہم ایکتا قائم رکھیں مل کر عروج
تو ہمارا دشمن ہو مضبوط سب بن جائیں نیک

عروج نفیسی جھانسی

"آپا! کیا یہ کتابیں پڑھ کر انسان بہت کم بولنے لگتا ہے؟ میں بھی اب زیادہ نہیں بولا کروں گی۔"

میں چپ سی بستر پر لیٹ گئی۔

وہ بولی "آپا! آپ کا سر شاید دکھ رہا ہے، لاؤ میں دبا دوں؟"

پھر وہ اپنی نرم نرم پوروں سے میرا سر دبانے لگی۔ سکون ملا تو میری آنکھ لگ گئی پھر جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ گوری ایک کرسی پر بیٹھی کسی کتاب پر ہاتھ میں لئے نہایت مدبرانہ شکلیں بنا رہی ہے۔ اُس کے باریک اور گلابی ہونٹ آپس میں جلدی جلدی مل اور بچھڑ رہے تھے جیسے وہ کوئی سبق یاد کر رہی ہو۔ پھر ایک دم وہ نہایت انہماک سے سمٹ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کروٹ بدلی اور اسی وقت باہر ذرا سی آہٹ ہوئی۔ غالباً اسلم آیا تھا۔ کمرے میں اُسے آتے دیکھ کر گوری گھبرا سی گئی۔ وہ کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ پھر اُس کی مصروفیت کی وجہ مجھ پر ظاہر ہو گئی۔ جب وہ گھبرا کر کرسی سے اُٹھی تھی تو اسلم کی بڑے سائز کی ایک تصویر اُس کے پیروں میں گر پڑی تھی۔

گوری کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے اسلم بولا "اچھا تو کب کی مجھے راستے میں ملی تھیں کہ گھر جا رہی ہو اور تم یہاں میری آپا کو تنگ کرنے آ گئی ہو؟"

کچھ دیر رک کر وہ بولی "گھر ہی میں تو ہوں، کیا یہ میرا گھر نہیں ہے؟ آپا! اسے بتا دیں ذرا! تم کیا سمجھتے ہو آپا صرف تمہاری بہن ہے اور یہ تمہاری تصویر بھی کوئی اتنی اچھی نہیں ہے جیسے اندر رکھا

جیتی جاگتی ہیں! ہونہہ نہ جانے شہر جا کر کیا سمجھنے لگے ہیں خود اپنے کیا کو!"

یقیناً اس کا لہجہ سخت تھا اور میرے نزدیک قابلِ اعتراض بھی لیکن میں نے ہنس کر بات ٹال دی میرے اسلم ایسی بڑی اور سیاہ آنکھوں والا گبرو جوان تو پورے گاؤں میں نہ تھا۔

گوری کی بات سن کر اسلم نے کہا۔ "اگر میری تصویر اتنی خراب ہے تو اسے ہاتھ میں لئے کیوں کھڑی ہو؟"

گوری کو شاید اسلم سے یہ سننے کی توقع نہیں تھی۔ وہ رُخ موڑ کر بولی "میں جاتے جاتے اسے تالاب میں پھینک دوں گی۔ کیونکہ گھر میں رکھنے کے قابل نہیں ہے۔" پھر اُس نے اسلم کی تصویر کو اپنے آنچل میں لپیٹ کر سینے سے لگا لیا اور غائب ہو گئی۔

میں نے سوچا کہ گوری کے اندر کی کمزور اور چاہت کی دیوانی عورت اب پوری طرح اپنے اظہار پر آمادہ ہے۔ چاہت کی بے باک لہروں کو اب آگے بڑھنے سے وہ روک نہیں سکتی۔ رات گئے تک میں اور اسلم کالج کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے باتوں باتوں میں اسلم کے دل کو ٹٹول کر دیکھ لیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ چاہت کے جن نرم اور گداز جذبات سے گوری کا دل دھڑک رہا ہے بچپن کی ساتھی ہونے کے باوجود اسلم کے دل پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ اُس کے سپنوں کی رانی کوئی اور ہی ہے۔ غالباً اُسے شہری لڑکیاں پسند تھیں۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا کہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اسلم کو گوری ایسی پیاری بیوی کی ضرورت ہوگی۔ موناہر صورت اُس کے لئے ٹھیک رہے گی۔

پھر اسلم کے جانے کا دن آگیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اُس دن گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر آ رہی تھیں بادل صبح سے بار بار ایسی شکلیں بدل رہے تھے جیسے بھوتوں کی برات گزر رہی ہو۔ گاؤں کی گلیوں میں اس قدر پانی کھڑا تھا کہ شام کے وقت ہی باہر طرف رات کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

اچانک ایک چادر کی بکل مارے، خود کو ایک ہاتھ سے سنبھالتے [illegible] شراب شرابور ایک گوری

ن میں سے آوازیں دیتی لپکی چلی آئی "آپا ــ آپا!
سلم چلا گیا شہر، یا ابھی اِدھر ہی ہے؟ مگر
شں میں کہاں گیا ہوگا! میں اُس کے لئے یہ گیلا
ہوئی بستر کی چادر لائی تھی... دیکھو تو بھیگ گئی
" یہ کہتی ہوئی وہ بارش میں چھینٹے اُڑاتی پہلے
ا، پھر برآمدے' اور پھر میرے کمرے میں گھس
۔ اُس کے کپڑوں سے پانی ٹپک کر دری کو گیلا
ہا تھا۔ باہر تیز ہوا شور مچا رہی تھی۔ رات
ہ تھی اور اِس وقت یہ بے چین گوری آ گئی تھی۔
ہنے حیران سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اُس
ہرہ شبنم کے قطروں سے بھیگے گلاب کی طرح
سوم اور شگفتہ لگ رہا تھا۔ ننھی ننھی گھنگرو والی
یں اُس کے دو دو ایسے روشن ماتھے پر چپک سی
تھیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ موسم کے تیور دیکھ کر
لم کو وقت سے پہلے ہی اسٹیشن بھجوا چکی ہوں
اِس پاگل سی لڑکی کو کیا جواب دوں؟ وہ تصویر
یشہ بنی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی کیونکہ میں
اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

مجھے چپ دیکھ کر وہ پھر بول اُٹھی "آپا! آپ
اسلم کی طرح مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں! کیا بات
ے؟" پھر وہ اپنے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے کہنے لگی
ں! آج ذرا کپڑے نہیں بدلے" پھر چادر اُتار کر
ے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے وہ دوسرے کمرے
طرف مڑی "دیکھوں تو سہی تیار ہوا کہ نہیں!"

اُس کے سیاہ لمبے بال کمر پر بکھرے ہوئے تھے
پانی کے قطرے موتیوں کی لڑیوں کی طرح ایک ایک
کے ٹپک رہے تھے۔ خدا نے اِس بُت کو اتنا حسن
تھا تو کاش عقل بھی دی ہوتی۔ میں نے سوچا۔
اسی دوران میں وہ پلٹ آئی۔ اپنی پھیلی پھیلی
یشان نگاہوں سے اُس نے مجھے دیکھا پھر اپنے
ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے وہ چند لمحے کھڑی رہی' اور
"آپا چلا گیا نا وہ... لیکن وہ تو کہتا تھا اب
شہر سے کبھی واپس نہیں آؤں گا! تو پھر میں کس
ساتھ شہر جاؤں گی آپا؟"... آپا! یہ کہتی ہوئی وہ
ن کی طرح بھاگتی ہوئی رخصت ہو گئی۔
سفید رنگ کی کاٹن کی چادر پر بھگے پیازی رنگ

کے ننھے ننھے گلاب کے پھول اتنی نفاست سے کاڑھے
ہوئے تھے جیسے کہ سچ مچ پھول بکھرے ہوئے ہوں۔
گوری جو چادر اسلم کو دینے کے لئے لے کر آئی تھی
وہ جانے کب اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر وہاں گر گئی تھی۔
گوری کا جنونِ محبت آفاقی حدوں کو چھونے لگا تھا اور
میں اپنی خاندانی روایات اور اسلم کی پسند جاننے کے
سبب سوچوں کے بھنور میں ڈوبنے لگی تھی۔ میری
چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔
مجھے علم تھا کہ ایسے معصوم اور سادہ لوگ اپنے جذبوں سے
گو نا آشنا ہوتے ہیں مگر ہوتے سچے ہیں اپنے جذبوں
میں! آخر گوری کا یہ جنون کیا رنگ لائے گا؟ اس سوال
نے مجھے تمام رات سونے نہ دیا۔ اپنی امی کی کمی مجھے
بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ پھر امی کے خیال کے
ساتھ ہی اُن کی مظلومیت کی تصویریں میری آنکھوں
کے سامنے گھومنے لگیں۔ سیدھی گاؤں کی بھولی
بھالی سی دوشیزہ جسے میرے ابّو نے دل و جان سے
قبول کر لیا تھا اور پیار کے انمول موتیوں سے اُن کا
دامن بھر دیا تھا۔ مگر اِس حویلی اور اِس کی روایات نے
انھیں سانس لینا دوبھر کر دیا۔ میں اُن کی محبت کی
پہلی نشانی تھی۔ بالآخر تنگ آ کر ابّو انھیں اپنے ساتھ
یورپ لے گئے تھے۔ کئی سال بعد اسلم پیدا ہوا تھا
اپنی بیٹی سے دوری برداشت کرتے کرتے امی جان
نڈھال ہو چکی تھیں۔ پھر ایک دن وہ اتنی نڈھال سی
ہوئیں کہ بستر ہی سے نہ اٹھ سکیں۔ وہ زندگی بھر کی
ساری تھکن سمیٹ کر اپنے خالقِ حقیقی کے پاس چلی
گئیں' پھر کبھی نہ آنے کے لئے!

میں اُن دنوں ایف اے میں داخل ہوئی
تھی جب ابّو اسلم کی ننھی منّی مورت لے حویلی میں
آئے تھے اور چپ چاپ رخصت ہو گئے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ اسلم کو سنبھالنے والے کم زور
اور سیدھے سادے لوگوں پر ظلم کرنے والے جلدی
جلدی رخصت ہونے لگے۔ حویلی میں ایک طوفان سا
آ کر گزر گیا تو کچھ باقی نہ بچا۔ یوں یہ آٹھ نو سال کا ننھا
سا اسلم میرے پاس آ گیا۔ اب پھر شاید تاریخ خود
کو دُہرانا چاہتی تھی۔ شاید اسلم اسی لئے گوری کی
بڑھتی ہوئی چاہتوں سے خود کو بے نیاز اور دور رکھ

جا رہا تھا۔ اُس کے خیالات کی اُڑان اور ہی تھی اسی
قسم کے دردناک اور اُداس سے خیالات کی مالا بن کر
ٹوٹتی رہی اور میں ڈھلتی ہوئی رات کے ساتھ بکھرتی
رہی۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ میں نے جانے
کب بے دم سی ہو کر آنکھیں موند لیں۔

وقت پر لگا کر اُڑتا رہا۔ گاؤں کے تمام گلی کوچے
اسی طرح شاد و آباد تھے۔ ہر کوئی اپنے اپنے کاروبار میں
مصروف تھا۔ گوری بھی اب بہت حد تک سنبھل گئی تھی
وہ زیادہ تر خاموش رہنے لگی تھی جوانی اُس پر ٹوٹ
کر برسی تھی۔ حافظ جی فوت ہو چکے تھے اور اُس کی
خالہ اب اُس کے پاس رہنے لگی تھی۔ گوری کی خالہ اسے
گھر سے کم ہی نکلنے دیتی۔ اب گوری میرے پاس بھی
کم آتی مگر جب بھی آتی مجھ سے ایک ہی سوال کرتی۔

"اسلم کب آئے گا شہر سے؟"

میں اپنی لاعلمی کا اظہار کر کے خاموش ہو جاتی
پھر وہ ناامید سی ہو کر کئی کئی دن نہ آتی۔

اسلم بی۔ اے کر چکا تھا اِسی دوران میں
وہ ایک مرتبہ چند گھنٹوں کے لئے گھر آیا تو میں نے اس
سے گوری کے بارے میں بات کی' وہ چپ رہا۔ میں نے
اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھتے ہوئے ابتدائی
کارروائیاں شروع کر دیں۔ وہ دن کتنا سہانا ہوگا
جب میرا اسلم دولہا بنے گا' میں سوچتی۔ بس یہی
ایک دُھن میرے دل میں سمائی ہوئی تھی۔

آخر وہ دن بھی آ گیا۔ پورے گاؤں میں میرے
اسلم کے پاس ہونے کی خبر کے ساتھ ساتھ شادی
کی خبریں بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ شادی کی تیاریاں
آخری مراحل میں تھیں۔ ہر ایک زبان پر میرے اسلم کی
خوبصورتی' کامیابی اور شادی کے تذکرے تھے۔ میں
نے محسوس کیا کہ گوری نظر نہیں آ رہی۔ ایک دن اُس
کی ایک سہیلی نے بتایا کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار کی
شادی میں خالہ کے ساتھ شہر گئی ہے۔

کون سا رشتہ دار؟ میرا ماتھا ٹھنکا مگر شادی
کی مصروفیات میں یہ بات بھول ہی گئی۔ خدا نے میری
خوشیاں دوبالا کر دی تھیں کہ میرے ابّو بھی یورپ
سے پلٹ آئے تھے۔

باقی آئندہ

سرور تونسوی کی کتاب "بہ کوئے یار" پر
خامہ بگوش کی نکتہ آفرینی

پاکستانی شاعر ہندوستان جا کر بلانوش بن جاتے ہیں

[illegible]ر دیا پرکاش سرور تونسوی، رسالہ [illegible]ہند" دہلی کے ایڈیٹر ہیں۔ برسوں سردار [illegible] منظور کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں [illegible] سردار صاحب کی بہت سی خوبیاں (اور [illegible]بھی) ان میں پائی جاتی ہیں۔ سردار صاحب [illegible] کتاب "ناقابل فراموش" کے انداز میں [illegible]حب نے بھی اپنی یادداشتیں مرتب کی [illegible]تاب "بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر" کے [illegible]ال ہی میں دہلی سے شائع ہوئی ہے اس کتاب [illegible]ار ایسے عجیب اور عجیب الخلقت واقعات لکھے [illegible] عجیب و غریب [illegible] سکتے ہیں۔ [illegible] تونسوی بھی عجیب و غریب آدمی ہیں۔ خدا [illegible] الخلقت [illegible] سے [illegible]رت رکھتے ہیں اور [illegible] کے [illegible] اور [illegible] انہیں [illegible] قرار دیتے ہیں مسلمانوں [illegible] سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے دائرے میں

مسلمانوں کے سوا کسی کو کلام نہیں رکھتے اپنے آبائی وطن ملتان اور اس کے نواحی علاقوں کو بڑی محبت سے یاد کرتے ہیں۔ ان علاقوں کے ہی مسلمانوں سے بھی انہیں بے حد عقیدت ہے جنہوں نے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ہندو آبادی کی حفاظت کی۔ ان سب خوبیوں کے باوجود ہمیں سرور صاحب کی کتاب کے وہ حصے اچھے نہیں لگے جن میں بعض پاکستانی شاعروں کی "کردار کشی" کی گئی ہے۔ مثلاً اس کتاب کے صفحہ ۱۸۱ پر وہ لکھتے ہیں:۔

"پچھلے دنوں دہلی کلاتھ مل کے مشاعرہ میں ایک پاکستانی شاعر [illegible] تو۔۔۔ شراب نوشی کے باعث [illegible] ہزار داستان تو بن گئیں مگر افسوس کہ انہوں نے [illegible] قائم نہ رکھا۔ پاکستان کے شاعر [illegible] ماہ ہندوستان میں رہے اور انہوں نے مشاعرے پڑھنے کے لئے [illegible]

جب [illegible] کر کے [illegible] نے حاصل کئے اور جتنے [illegible] سے ہر مشاعرے میں [illegible] کے پاکستان میں ان کی [illegible] کوئی شاعر نہیں ہے۔ ——

—— مگر شراب نوشی کے [illegible] اُنہوں نے [illegible] بے شک اس [illegible] پاکستان [illegible] کوئی شاعروں کی [illegible] نہیں ہے۔ سرور تونسوی [illegible] پاکستانی شاعروں [illegible] [illegible] جو شاعر ہندوستان جاتے ہیں [illegible] ہیں کہ ان کی [illegible] کوئی شاعر پاکستان میں [illegible]

ہندوستان میں بھی مشکل سے لے گا۔ اسی لئے تو ہندوستانی شاعر ندا فاضلی نے کہا تھا کہ پاکستان والے اپنے اچھے شاعروں کو تو چھپا کر رکھتے ہیں البتہ گوڑا کرکٹ ہندوستان بھیج دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ پاکستان کی کرکٹ ٹیم ہندوستان میں کھیل رہی تھی انھیں دنوں کچھ پاکستانی شاعر بھی وہاں مشاعرے پڑھ رہے تھے۔ اس پر ندا فاضلی نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا تھا۔

"آج کل پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے ساتھ گوڑا کرکٹ ٹیم بھی ہندوستان کا دورہ کر رہی ہے۔"

جناب سرور نے شراب کے سلسلے میں پاکستانی شعرا کو سفلہ پن، بے غیرتی اور گداگری کا طعنہ دیا ہے۔ شاید موصوف کو یہ نہیں معلوم کہ یہ صفات ایسی نہیں ہیں جو شعرائے کرام کے لئے بدنامی کا باعث ہوں۔ ان صفات کی موجودگی پر ہمیشہ فخر کیا گیا ہے مثلاً میر سوز کا یہ شعر تو سبھی نے سنا ہوگا۔

"ساقی نے علم دے کے مجھے کر دیا خموش
آخر کو کام آ ہی گیا سفلہ پن مرا"

یہاں سفلہ پن عیب نہیں خوبی ہے، جس کا شاعر نے ذکر کیا ہے۔

مومن خاں مومن فرماتے ہیں ؎

لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

کیا اس سے زیادہ بے غیرتی کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ شبِ فراق میں مر جانے والا شاعر "شبِ وصلِ غیر" ہنسی خوشی سے گزار دے۔

غالب کا یہ شعر تو زبان زدِ خاص و عام ہے ؎

"گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے"

جب غالب جیسا بڑا شاعر اپنا حلیہ ایسا بنا سکتا ہے کہ اس پر گدا کا گمان گزرے تو بے چارے پاکستانی شاعروں نے کیا گناہ کیا ہے جو انھیں ہندوستان میں کشکولِ گدائی ہاتھ میں لینے سے روکا جائے۔

سرور تونسوی نے ایک جگہ (صفحہ ۲۲۱) اقبال سیمینار (۱۹۷۷ء) کے سلسلے میں لکھا ہے۔

"پاکستانی وفد کے اراکین کو خوب معلوم تھیں دی گئیں۔ جہاں شرابِ ناب کے جام پہ جام لنڈھائے جاتے ہے۔ بعض حضرات جناب کرشن موہن کی طرف سے دی گئی دعوت سے جاتے ہوئے اسکاچ وہسکی کی بوتلیں بھی چھپا کر ساتھ لے گئے۔ ایک صاحب تو بوتل کے منہ پر ڈھکنا لگانا بھی بھول گئے، جب شراب ان کے کوٹ کی جیب سے بہنے لگی تو کرشن موہن نے بوتل کا ڈھکنا دیتے ہوئے ان صاحب سے کہا "لیجئے بوتل کا منہ اس سے بند کر لیجئے ورنہ آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے"۔ ان دعوتوں کو دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ پاکستان کے شعراء اور ادیب، ادبی و ثقافتی وفود میں ہندوستان آنے کے لئے کیوں بے تاب ہوتے ہیں۔"

معلوم نہیں سرور تونسوی صاحب پاکستانی شاعروں کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہاتھ بھی شراب سے دھوئے ہیں کہ شراب ہی کے حوالے سے وہ پاکستانی شاعروں کی کردار کشی کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں تو مذکورہ واقعے میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو پاکستانی شاعروں کے خلاف جاتی ہو۔ ساری غلطی کرشن موہن کی ہے انھیں چاہئے تھا کہ پاکستانی مہمانوں کو وہسکی کی بوتلیں خود پیش کرتے، تاکہ وہ بغیر ڈھکنے کی بوتلیں جیب میں نہ رکھتے۔ جب ایک مہمان شاعر کے کوٹ کی جیب سے شراب بہہ نکلی تو کرشن موہن نے بوتل کا ڈھکنا پیش کر دیا تو کون سا تیر مارا۔ بہ حیثیتِ میزبان یہ ان کا فرض تھا کہ مہمان کے کپڑوں کو خراب ہونے سے بچاتے۔

سرور تونسوی نے اس پر بھی طنز کیا ہے کہ پاکستانی شعراء ہندوستان جانے والے وفود میں شمولیت کے لئے بے تاب ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں انھیں شراب بآسانی مل جاتی ہے۔

اطلاعاً عرض ہے کہ پاکستان میں شراب پر پابندی ضرور ہے لیکن آج تک شراب پینے والا کوئی پاکستانی پیاسا نہیں مرا۔ بلکہ آپ جتنی شراب چاہیں خرید سکتے ہیں۔ کسٹم والے بھی شراب کی جو بوتلوں کو تحفے میں کہتے ہیں، انھیں کاغذ پر تو ضائع کر دیا جاتا ہے لیکن بازار میں مہنگے داموں فروخت ہو جاتی ہیں لیکن پاکستانی شاعر ایسے گئے گزرے نہیں ہیں کہ شراب جیسی حرام چیز کو چور بازار سے خریدیں۔ اسی لئے وہ جب ہندوستان

نعت

پنڈت رتن پنڈوروی

آیا ہے لب پہ نام رسولِ کریمؐ کا
جلوہ تڑپ اٹھا ہے ریاضِ نعیم کا

برسا جو ابر آپ کے لطفِ عمیم کا
گلزار بن کے کھل گیا شعلہ جحیم کا

بحرِ عدن میں لاکھ ہوں لؤلوئے شاہوار
کچھ رنگ روپ اور ہے دُرِّ یتیم کا

اے اہلِ بزم جانبِ بطحا چلا ہوں میں
پیغام لے کے آیا ہے جھونکا نسیم کا

خلدِ بریں جچے مری نظروں میں کس طرح
دیکھا ہے ایک پھول ریاضِ نعیم کا

اللہ رے خاکِ بیتِ مقدس کا مرتبہ
مسجود ذرہ ذرہ ہے عرشِ عظیم کا

حسنِ ازل نے بھی شہِ والا کی داد دی
اعجاز جب عیاں ہوا ماہِ دو نیم کا

وحدت کو ناز کیوں نہ ہو احمد کی ذات پر
سمجھایا جس نے راز الف لام میم کا

شافع اگر حضورِ رسالت مآب ہوں
پھر کیوں نہ فیض عام ہو ربِ کریم کا

شاہد نہ ہو سکا کبھی مشہود سے الگ
نورِ خدا ہے نورِ رسولِ کریمؐ کا

کیونکر بیاں ہو مدحتِ خیر البشر رتن
ہے تنگ قافیہ مری طبعِ سلیم کا

...شتا ہیں تو دامن ترکر لیتے ہیں۔ مُفت کی شراب تو
...ضی کو بھی حلال ہوتی ہے تو پھر ہمارے شاعروں کو
...ن اس رعایت سے محروم کردیا جائے۔ امیر مینائی
...یسے پاکباز شاعر نے بھی مُفت کی پینے کو جائز قرار دیا کہ

"دگرہ سے کچھ نہیں جاتا ہے پی لے اے زاہد
ملے جو مُفت تو قاضی کو بھی حرام نہیں"

...ر پاکستانی شعراء اگر ہندوستان جاکر مُفت کی پیتے ہیں
...ہ کوئی جرم نہیں کرتے۔ البتہ ہندوستانی میزبانوں کی کم ظرفی
...ل افسوس ہے۔ پہلے تو ہمارے شاعروں کو مُفت کی
...تے ہیں اور پھر انھیں رسوا کرتے ہیں۔

...جو پاکستانی ادیب ہندوستان جاتے ہیں وہ
...مت سے باقاعدہ اجازت لیتے ہیں۔ اکادمی
...یات کی سفارش پر حکومت اُن کے لئے این۔
...سی جاری کرتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا
...اب تک جو شعرائے کرام ہندوستان کا سفر کر چکے
...ہ اُن کے اعمال کی ذمّہ داری حکومت پر ہے۔ جہاں
...ومت نے یہ ذمّہ داری اُٹھائی ہے وہاں اگر وہ ایک
...نت اور بھی اُٹھالے تو اچھا ہوگا کہ پاکستانی شاعروں
...مفت کی شراب کی فراہمی پاکستانی سفارت خانے
...طرف سے کی جائے۔ اِس سے یہ فائدہ ہوگا کہ
...روستانی میزبان جیب میں رکھی ہوئی کھلی بوتلوں
...ہ ڈھکنے پیش کرکے ہمارے جلیل القدر شاعروں
...ممنونِ احسان نہیں کرسکیں گے۔ اس مقصد کے
...ہ دہلی میں پاکستانی سفارت خانہ میں پریس سکریٹری
...رکمرشیل سیکریٹری کی طرح ایک عہدہ "بوتل سکریٹری"
...بھی ہونا چاہیئے۔

سرور تونسوی نے اپنی کتاب میں صرف پاکستانی
...اعروں کو دادِ سخن نہیں دی، ہندوستانی شاعروں
...ہ شراب نوشی کے بھی بہت سے واقعات بیان
...ئے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ اس شوق کو پورا کرنے کے
...کیا کیا جتن کرتے تھے یا کرتے ہیں۔ مشہور شاعر
...یش کمار شاد کے متعلق وہ لکھتے ہیں:۔

" نریش کمار شاد دانشوری کی مضبوط
قدروں کا مالک تھا مگر شراب نوشی کی لت کے
باعث اُسے خودکشی کرنی پڑی یا خودکشی کے
بڑھنے میں وہ موت سے ہمکنار کردیا گیا شاید

نعت

عبدالعزیز خالدؔ

ہیں جوانانِ چمن جس سروِ قد کے مقتدی
کس سخنور سے بیاں ہو اُس کی شانِ سروری

حُسنِ اعجازِ بیاں جس کے تکلّم سے عیاں
اُس کے وصفِ خلق سے عاجز ہے گویائی مری

جس نے یہ کہہ کر بڑھایا رُتبۂ شعر و بیاں
شعر میں حکمت بھی ہوتی ہے بیاں میں سحر بھی

جس کے دم سے سینکڑوں تازہ جہانوں کی نمود
جس کا ہر قول و عمل وجہِ فروغِ زندگی

ذوق و ادراک و تدبّر جس نے ذہنوں کو دیا
خضرِ راہِ فکر، میرِ کاروانِ آگہی

سب خصائل جس میں اپنے باپ ابراہیم کے
توڑے جس کی ضربِ حق نے سب بُتانِ آذری

جس کے آنے سے اُٹھی تحریکِ احیائے علوم
ہوگئی اوہام پر حاصل خرد کو برتری

خاک میں جس نے مِلایا کج کُلاہوں کا غرور
بے اثر جس نے بنایا ہر طلسمِ سامری

جس کی خاص و عام پر یکساں نگاہِ التفات
کی نہ جس نے اپنے بیگانے میں حد بندی کبھی

"جو ہر تطہیر ہے نام و نسب سے بے نیاز"
"کون ہے آلِ محمدؐ؟" "یا اَنس! ہر متّقی"

جس سے کہتی ہے خدیجہؓ "کر نہ غم اے ابنِ عم
یہ فرشتہ ہے خدا کا، تو خدا کا ہے نبی

یہ وُہی ناموسِ اکبر ہے وُہی رُوح القدس
جو رسُولوں کی طرف ہے کبریا کا ایلچی

تجھ سے پہلے موسیِٰ عمراں پہ جو آتا رہا
جس کے ذمّے ہے اَزل سے خدمتِ نامہ بری

وحی تجھ پر اُس نے کی اِلقا خدا کے حکم سے
آخری بارِ نبوّت ہے تری پیغمبری

تو جہانوں کے لئے رحمت ہے اے جانِ عزیز!
ابنِ نوفل پر ہو رحمت وہ بھی کہتا ہے یہی

میں کہ میں نے ہر طرح دیکھا ہے پرکھا ہے تجھے
میں کہ محرم ہوں تری، تیری شریکِ زندگی

میں صمیمِ قلب سے تصدیق کرتی ہوں تری
سب سے پہلی مُسلمہ ہوں سب سے پہلی اُمّتی"

ایک عورت قائدِ اَلسَّابِقُونَ الْاَوَّلُون
اب بھی کیا مشکوک ہے اُس کی سلیم الفطرتی

اپنی ماں بنتِ خویلد کی طرح خالدؔ مرے
لب پہ بھی آمَنتُ بِاللّٰہِ وَ آمَنتُ بِہٖ

ہی دِلّی کا کوئی ایسا کھاتا پیتا آدمی ہوگا
جس کے ہاں نریش کمار شاد نے یہ کہہ کر
روپیہ ادھار نہ لیا ہو کہ اس کا اکلوتا بیٹا موت
کا شکار ہوگیا ہے، لہٰذا اس کے کفن دفن
کے لئے مدد کی جائے۔ اور اس قابلِ نفرت
جھوٹ سے حاصل کیا ہوا روپیہ شراب

نوشی کی نذر ہوتا۔"

ہندوستان کے ایک گوکار شاعر آغا امیر قزلباش کے بارے
میں سرور تونسوی نے یہ واقعہ لکھا ہے:۔

"...... پیچھے سے آغا امیر قزلباش نے
ہانپتے ہوئے آواز دی۔ سرور صاحب
ایک منٹ کے لئے میری بات سنیئے۔ دیکھا

تو قزلباش سے کہا کہ ... پریشانیاں کا ذہن نہیں... عرض کیا کہ فرمائیے کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ سیکرٹری کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور ڈاکٹر اس کی ڈریسنگ کر رہا ہے اسی وقت دس روپے چاہئیں۔

اسی وقت دس روپے ان کی خدمت میں پیش کر دیے گئے۔ تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ ابھی تو اس کی شادی ہی نہیں ہوئی تو لڑکا کہاں سے آگیا۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ یہ ڈرامہ محض شراب کی لت

پوری کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آغا صاحب قزلباش گفتگو کار ہی نہیں اچھے خاصے اداکار بھی ہیں۔

غزلیں

قمر ایوبی بی۔ اے

چشمِ میخوار میں تابش کبھی ایسی تو نہ تھی
ساقیٔ وقت کی بخشش کبھی ایسی تو نہ تھی

موسمِ گل میں ہے ہر دل کی کلی افسردہ
باغباں! تیری نوازش کبھی ایسی تو نہ تھی

جل گیا آپ ہی کاشانۂ ہستی کا وجود
برقِ احساں! تری یورش کبھی ایسی تو نہ تھی

پھول ہی پھول کھلے دل کا گلستاں مہکا
لبِ خاموش کی جنبش کبھی ایسی تو نہ تھی

میکدہ کانپ اٹھا ساقی بھی ہے لرزیدہ
رندِ خود دار کی لغزش کبھی ایسی تو نہ تھی

کشتیٔ ہوش ابھی تک ہے بھنور میں یارو
ساغرِ وقت کی گردش کبھی ایسی تو نہ تھی

زندہ در گور بنا ڈالا ہے الفت سے قمر
لطفِ احباب کی سازش کبھی ایسی تو نہ تھی

محمد اسد اللہ خاں قرار میرٹھی

خدا رکھے اُسے کیا چیز ہے وہ کُھلے قاتل بھی
جہاں کام آگیا سر بھی جہاں کام آگیا دل بھی

میں جب تک تھا تری محفل میں قائم نظمِ محفل تھا
مرے اُٹھتے ہی محفل سے اُٹھے آدابِ محفل بھی

میں اپنے ہر نفس میں روشنی محسوس کرتا ہوں
کسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے شاید مرا دل بھی

وہ رہبر ہوں کہ جس کے سامنے جھکتے ہیں سب رہبر
قدم اٹھ اٹھ کے لیتا ہے غبارِ راہِ منزل بھی

طفیلِ تیز گامی بارہا گزرا ہوں منزل سے
مجھے رہبر بھی کہتے ہیں مجھے گم کردہ منزل بھی

تمہاری جلوہ گاہِ ناز سے اٹھ کر کہاں جائیں
یہیں کام آئی میں نظریں یہیں کام آگیا دل بھی

قرار اپنی غزل اربابِ فن میں شان رکھتی ہے
مجھے اب داد دینے میں مرے مدِ مقابل بھی

ڈاکٹر کے۔ کے۔ رشی

مختصر سی وہ ملاقات بہت اچھی تھی
چند لفظوں میں ڈھلی بات بہت اچھی تھی

لمحہ لمحہ کسی اُمید پہ جب گزرا تھا
دن بہت خوب تھا وہ، رات بہت اچھی تھی

کس لئے آج محبت ہوئی رسوائے جہاں
پہلے تو صورتِ حالات بہت اچھی تھی

بیقراری ہی میں جب دل کو قرار آتا تھا
ہائے وہ شدتِ جذبات بہت اچھی تھی

آنکھیں بھر آتی تھیں ملتے یا بچھڑتے ان سے
دونوں وقتوں کی وہ برسات بہت اچھی تھی

چاہنا بھی تمہیں اور منہ سے نہ کچھ بھی کہنا
دل کی خاموش مناجات بہت اچھی تھی

لب پہ آجاتی تو کچھ اور بھی اچھا تھا رشی
آپ کے دل میں جو تھی بات بہت اچھی تھی

سرور تونسوی

الائچی والا

دلی کے ایک زیرک اور ہوشیار قسم کے ھوں کی خرید و فروخت کا کام کیا کرتے تھے۔ جب نے اُنھیں چار پیسے دیے تو اُنھیں اپنے آپ کو ... گدھے والا کہلوانا ناگوار گزرنے لگا۔ ظالم میں کچھ ایسی خاصیت ہے کہ جب اُس کی فراوانی نے لگتی ہے تو اسے ناموری، تعریف، ذاتی ، خاندانی وجاہت (حالانکہ اُس کا کوسوں نام و نشان نہیں ہوتا) ذاتی فراخ دلی اور ن و شوکت کا شوق شدت سے پیدا ہوتا ہے۔ ان گدھے والے صاحب کو بھی ان سب صفات لی شوق دن رات ستانے لگا اور وہ اس فکر لگے رہتے کہ کسی طرح گدھے والا کا "معزز لقب" ن داغ مفارقت دے اور یہ بھی شرفا اور دلی باوقار اور باعزت لوگوں میں گنے جانے لگیں۔

دلی کے بلبلِ ہزار داستان، مرحوم مولانا سعید صاحب (خدا اُن کی قبر کو نور سے بھر دے) ہشت نہیں، صد پہلو خاصیت رکھتے تھے۔ یہ گدھے والے حضرت بھی کبھی کبھار مولانا مرحوم کے پاس سلام عرض کرنے چلے جاتے تھے۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ایک دن یہ گدھے والے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ حضرت تن تنہا تشریف رکھتے تھے۔ گدھے والے نے موقع غنیمت سمجھا اور بڑی سنجیدگی سے عرض پرداز ہوا کہ حضور میری ایک فکر اگر آپ دور کر دیں تو عمر بھر دعائیں دیتا رہوں گا۔

مولانا احمد سعیدؒ بڑے ہی خوش کلام شیریں بیان اور ہمدردانہ لہجے میں فرمانے لگے "کہو میاں کون ایسا مسئلہ ہے جس نے آپ کو اتنا فکر مند کر رکھا ہے، ہم بھی تو سنیں۔ شاید اللہ میاں کوئی راستہ نکال دیں اور تمہیں اس فکر سے نجات مل جائے۔"

گدھے والے نے نہایت عاجزانہ لہجے میں کہنا شروع کیا "حضور تو جانتے ہی ہیں کہ میرا خاندانی کاروبار گدھوں کی تجارت رہی ہے، اس لئے ہمارا خاندان "گدھے والوں" کے نام سے مشہور ہے۔ ادھر اللہ نے چند پیسے دے دیئے ہیں، شادی اچھے گھر میں ہو گئی ہے۔ محلے میں کچھ "عزت" بھی ہونے لگی ہے۔ بیٹی بیٹوں کے لئے اچھے کھاتے پیتے گھرانوں سے پیغامات آنے شروع ہو گئے ہیں لیکن یہ "گدھے والوں" القاب نے کچھ ایسا روڑا اٹکا رکھا ہے کہ سب بنے بنائے کام رہ جاتے ہیں اور یہ معزز کام ترک کرنے کے باوجود یہ القاب کچھ اس طرح ہمارے خاندان کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے جیسے انگریز کے زمانے میں "رائے بہادر" یا "خان صاحب" کے خطاب نام کا جزو بن جایا کرتے تھے۔

مولانا مرحوم نے متعدد قہقہے اپنی مروجہ خوش بیانی اور حاضر جوابی کے دائرے میں لگائے اور کچھ غور و خوض کرتے ہوئے وعدہ فرما لیا کہ اچھا ایک ماہ کے اندر اندر ایسی کارگر ترکیب بتا دی جائے گی کہ ملک تو کیا، ممالک غیر کے بھی بڑے بڑے مسلم گدھے آپ کی تعریف کریں اور گدھے والے "معزز" القاب بمبئی کے سمندر میں ایسا غرق

ہو جائے گا کہ بمبئی تو کیا، ملک بھر کے گدھے والے بھی ہندو کی خوشبو بکھیرنے والے کا کمال اٹھاتے ہوئے بھی تمہاری تعریف کریں گے۔

مولانا احمد سعید کی رسائی مہاتما گاندھی تک تھی۔ دلی کے کسی بھی مسلم تنازعہ یا کانگریس پارٹی کی دھڑا بندی کے متعدی مرض کا معاملہ ہوتا تو مہاتما گاندھی جہاں پنڈت جواہر لال نہرو جی، سردار پٹیل اور مولانا ابوالکلام آزاد ایسے سلجھے ہوئے سیاسی میدان کے مسلم اور آزمودہ کار جرنیلوں سے مشورہ فرماتے وہاں مولانا احمد سعید کی رائے بھی لینا ضروری سمجھتے تھے۔ اور مولانا مرحوم بھی اعلیٰ مسلم روایات کے پیش نظر مہاتما جی کو ایسا صحیح اور کارگر مشورہ دیتے کہ اکثر اوقات مولانا مرحوم کا مشورہ ہی ایسی مشکل کا بہترین حل ہوتا۔

مولانا مرحوم کی چھنی جس نے ایسا مشورہ اس گدھے والے کو دیا کہ واقعی اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

مولانا نے اس گدھے والے سے کہا کہ ایک ایسا کھدر کا کرتا سلواؤ جس میں آٹھ دس جیبیں ہوں اور ان سب میں گھٹیا سے لے کر ہانگ کانگ تک کی بہترین چھوٹی الائچیاں رکھیئے۔ اور آپ کو کوئی جانتا ہو یا نہ، یا آپ کسی کو جانتے ہوں یا نہ، آگے بڑھیے، خشوع و خضوع سے سلام علیک کیجئے اور مخاطب کے مرتبے کے مطابق دو چار الائچیاں پیش کیجئے۔ پھر دیکھیئے کچھ دنوں بعد کیا ہوتا ہے۔

گدھے والے نے ایسا ہی کیا اور یہ نسخہ اتنا کارگر ثابت ہوا کہ ان الائچیوں کے باعث یہ حضرت محترمہ اندرا گاندھی اور ملک بھر کے وزیروں، امیروں، سفیروں تک سے بے تکلف جاتے اور حسب مراتب کسی کو ہانگ کانگ کی لمبی الائچی، کسی کو صرف الائچی دانہ، کسی کو چاندی کا ورق چڑھا ہوا الائچی دانہ تو کسی کو سونے کا ورق چڑھا ہوا الائچی دانہ پیش کرنے لگے۔

جب انھیں خبر ملتی کہ کوئی غیر ملکی سربراہ حکومت نئی دہلی کے ہوائی اڈے پر آنے والا ہے تو یہ گاندھی ٹوپی لگائے، کھدر کا کرتا پہن، جس کی ہر جیب ہر قسم کی الائچیوں سے پنساری کی دوکان معلوم ہوتی، ہوائی اڈے پہنچ جاتے اور ہر کسی سے "سلام علیکم، نمستے، جے ہند" کہتے اور الائچی کی پیش کش فراخدلی سے کرتے۔

ہوتے ہوتے دو تین سال میں اُن کا نام ہی "الائچی والا" پڑ گیا، اور ان چھوٹی الائچیوں کے باعث آج یہ حالت ہے کہ ٹی۔ وی پر یہ ہر اُس گروپ میں نظر آئیں گے جہاں دو چار مسلمان بھی ہوں گے۔ کسی مجمع سرکاری یا غیر سرکاری حتیٰ کہ راشٹرپتی بھون اور وزیراعظم کے ہاں روزہ افطار کی پارٹیوں میں ان کا الائچی پیش کرنے کا ڈھنگ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چھوٹی الائچی کھلانے یا پیش کرنے میں دو تین سالوں میں اُن کے کئی ہزار روپے ٹھنڈے ہو گئے مگر مولانا احمد سعید مرحوم کے قول کے مطابق اس معزز لقب سے چھٹکارا پانے کے بعد یہ "الائچی والے" کہلاتے ہیں۔ کبھی آپ کا دہلی آنا ہو تو کسی رکشے والے سے، کسی تانگے والے سے یا ٹیکسی والے سے پوچھئے کہ ہمیں الائچی والے سے ملنا ہے، اور پھر دیکھئے وہ آپ کو بغیر کسی مزید پوچھ تاچھ کے، الائچی والے کے ہاں لے جائے گا۔ ویسے اب الائچی والے کنجوس ہو گئے ہیں۔

الائچیوں کی تقسیم میں بھی اب بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ وہ بھی کیا کریں! الائچی کا بھاؤ ہزاروں روپیہ کلو تک جا پہنچا ہے۔

ابوالکلام آزاد

توصیف علوی عاصی کیرانوی

فکر و دانش کا جہاں میں وہ نرالا اک خطیب — انقلاب و حریت کا وہ انوکھا اک نقیب
جس کو قدرت سے ملا تھا اک نیا انداز کلام — علم اور حکمت کی دنیا میں تھا جس کا اک مقام
جوشِ قوم رکھتا تھا منظر پیکر آزاد تھا — طالبانِ فکر اور دانش کا جو استاد تھا
جس کا جذبہ تھا حقیقت میں شعور و آگہی — جس کے ذہن و فکر سے جھلکتی تھی اک تابندگی
جس نے پائے تھے بڑے نکھرے ہوئے فکر و نظر — تھا زباں میں جس کی اک پُر زور جادو کا اثر
جس کا اک اک لفظ تھا ذوقِ تجسس کا نشاں — جس کا اک اک حرف تھا عزم و یقیں کی داستاں
جو مجاہد بھی تھا اور اک جسم کا دریا بھی تھا — جوش سے لبریز جس کا دل بھی تھا سینہ بھی تھا
جو محبِ وطن سے ہر طرح سرشار تھا — منزلِ قومی کا جو اک قافلہ سالار تھا
جس نے بھی دیش کی راہوں میں اکثر بیڑیاں — دیش کی خاطر گئی جس نے قفس کی تیلیاں
جس نے زندانوں میں رکھتے قوم کے پرچم بلند — جس نے ہر اک بام سے ڈالی ستاروں پر کمند
جس کی نظروں میں تھی یکساں عزت دیر و حرم — جو صحیح معنوں میں تھا اک صاحبِ سیف و قلم
باہمی میل و مروت کی جو اک تصویر تھا — خواب باہم کی حقیقت میں جو اک تعبیر تھا
جو کہ آزادی کے دیوانوں کا تھا اک پیشوا — جاں نثارانِ وطن کا جو کہ تھا اک رہنما
جو کہ باپو کا حقیقی اک رفیقِ کار تھا — جو جواہر لال جی کا سچا اک دلدار تھا

جس نے تاریخ وطن میں کچھ نئے جوڑے ہیں باب
جس سے عاصی رنگِ آزادی کو بخشی آب و تاب

باب انتقاد

۱۔ مجموعۂ کلام نورؔ اندوری

اشاعت ۱۹۸۳ء صفحات : ۱۴۴

ناشر مصنف خود۔ قیمت ۔/۲۵

ر اندور کے نام کو کرکٹ کے ایک مشہور
بعد نورؔ اندوری نے جو شہرت دی
ور کے تخلص کی مناسبت سے اندور
لئے ادب کے گوشے گوشے میں منوّر
۔ نورؔ اندوری کے استاد قبلہ حقیر
رحوم کا یہ قول بالکل برحق ہے کہ مجموعۂ کلام نورؔ اندوری کے ذریعہ آواز
کے ذریعے دل میں اُترتی رہی اب اُس
آنکھوں کے ذریعہ دل تک پہنچے گی۔
صدیقی لکھتے ہیں کہ کانپور میں ایک
شاعرہ جب بے کیفی کا شکار ہونے لگا
عرہ نے نورؔ اندوری کو مائک پر پہلی
یں پیش کیا نورؔ نے مطلع پڑھا ؎

میں بھی وفا کی نشانی نہیں ہے
یدوں کی بستی ہے پانی نہیں ہے

ہور نہ تو زیدوں کی بستی ہے اور نہ ہی
کی کچھ کمی ہے مگر اہلِ کانپور نے جو داد
یدی وہ یقیناً زیدوں کی بستی تک
ی ہوگی۔ نورؔ ساری محفل کو اپنی ترنم
وار آواز کے حلقۂ گرداب میں لے چکے تھے!
ی آواز کا سحر تھا مگر اندر کی سچی ہوئی
طرح ہے جو آپ واسطہ میں ابھی کال کی دی
میں بول رہی ہیں تھا مگر قریب دیش
ے جو قیامت کی نذر ہے
خورشید افسر بسوانی
شر بشیر بدر مشکل سے ہی کسی دوسرے
شاعر کی تعریف فرماتے ہیں مگر وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ نورؔ اندوری کی مقبولیت میں اضافہ ہی اضافہ ہو رہا ہے۔ نورؔ اندوری کی مترنم اور متفکرانہ غزلیں اپنے خوبصورت معنی خیز اور اشاریت سے بھرپور اشعار کی وجہ سے لاکھوں دلوں کی دھڑکن بننے کا امتیاز حاصل کر چکی ہیں۔

ملنے کا پتہ: شانِ ہند، نئی دہلی۔

خوشبو کا سفر: ڈاکٹر کیول دھیر

اشاعت: سنہ ۱۹۸۸ء۔ ڈیمائی سائز۔ صفحات: ۱۶۰۔

قیمت: ساٹھ روپے۔

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔

پاکستان کا یہ سفرنامہ روزنامہ "پنجاب کیسری" ہندی، جالندھر و نئی دہلی میں ہر ہفتہ قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ اب اسے اُردو میں کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر کیول دھیر پنجاب کے رہنے والے ہیں اور اچھے افسانے لکھنے والوں میں ان کا نام لیا جاتا ہے۔ اُن کے دو افسانوی مجموعے "بکھری ہوئی زندگی" اور "اپنا دامن اپنی آگ" شانِ ہند پبلی کیشنز کے اہتمام میں چھپ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ پچاس کے قریب اردو، ہندی، پنجابی، انگریزی کی ادبی، جنسی اور افسانوی کتابیں لکھ چکے ہیں۔

سفرنامہ لکھنا ایک بڑا مشکل فن ہے مگر ڈاکٹر کیول دھیر نے اُسے ایک منجھے ہوئے قلم کار کی جملہ خوبیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے لکھا ہے اور سفرنامہ میں جن لوازمات کا ہونا ضروری ہوتا ہے، وہ اس سفرنامہ میں موجود ہیں۔

سفرناموں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے "خوشبو کا سفر" واقعی قابلِ مطالعہ ہے۔ یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ اس سفرنامے میں پاکستان کی مشہور افسانہ نگار خاتون بشریٰ رحمٰن کا طویل ذکر کہیں کہیں بلاضرورت کیا گیا ہے۔

(ادارہ)

من کتوب الیہ

محترمی و مکرمی سرور صاحب' آداب و تسلیم!

اگست کا شمارہ پیش نظر ہے۔ آپکی جرأت اور حق پسندی کی بات ہے جو آپنے دھوتی زبان والے کا مدلل مضمون ایسے اہتمام سے شائع فرمایا۔ اگر ہندوستان کے ہندو مسلم صحافی اور مضمون نگار رائے اور سرور کا اتباع کریں' تو اس مسئلے کا حل خود بخود نکل آئے گا۔

خدا آپکو اور حوصلہ اور رائے صاحب کو اور ہمت دے اور دوسرے بھی آپکی تقلید کریں۔ سچ تو یہ ہے اٹھ گیا ہے۔ میں تو ہر روز رفتا رفتا اردو کو تباہ ہوتے اور ممبران اردو کو خاموش تماشائی اور ان میں سے بعض کو ہوا دیتے دیکھ رہا ہوں۔۔۔ اور سوچ رہا ہوں کہ جس قوم کے چند افراد ایک قومی سرمایہ کیساتھ جو صدیوں کا ورثہ ہے یہ سلوک کر رہے ہیں اس کی نظر میں ایک دو جانوں کی کیا پروا۔ زیادہ کیا لکھوں آپ کی خیریت کا طالب ہوں۔ کبھی بے وجہ بھی یاد کر لیا کیجئے۔

سنا ہے بہ کوئے یار" چھپ گئی ہے' زیارت بھی کبھی ہو ہی جائیگی۔ مبارک ہو' بہت مسرت ہوئی

عرشی زادہ

مکرمی سرور تونسوی' تسلیم!

وجو غالب نے کہا تھا ـــ

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست"

مصداق طاہر تونسوی سے آپ کا اتنا

ہے کہ بغیر دیکھے اور ملے آپ کے مزاج اور

طوار کا اندازہ ہو گیا ہے۔ یقیناً اس نے

کر کیا ہوگا اور آپ بھی غائبانہ طور سے

م سے واقف ہوں گے۔ کم از کم مجھے تو

ا فہمی ہے۔

خشتہ دنوں وہ ملتان سے لاہور آیا

ائع کردہ "انشائیہ کی بنیاد" بھی لایا۔

رت کے کسی پرچہ میں اس کا اشتہار

مجھے یہ معلوم تھا کہ اُسے کسی نے شائع کیا

اب دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ آپ ہی

ونکہ طاہر تونسوی کے دوست ہیں لہٰذا

دوست ہیں۔ اور خوشی ہوئی کہ کم از کم

ی دوست کے ہاتھوں چھپی۔ میری ج

نا بھر کتابیں مختلف شہروں کے ناشرین

ہیں مگر اُن کی صورت تک میں نہ دیکھ پایا

ہیں۔

آپ کرم کریں اور چند کاپیاں مجھے بھیج

کستان میں اس کا ایڈیشن ختم ہو گیا ہے

جارتی ایڈیشن احباب کے لئے تحفہ

ؤں کا مجموعہ پیش ہے۔ کیسا لگا؟

غالب سمینار میں شرکت کے لئے

ہے اگر ویزا اور N.O.C

طے کر پایا تو دسمبر میں دہلی میں

آپ سے ملاقات ہوگی۔ خط کا جواب ضرور دیں۔ طاہر تونسوی آپ کو الگ سے خط لکھ رہا ہے۔

مخلص

سلیم اختر

لاہور

پاکستان

محبی سرور تونسوی

تسلیمات!

گرامی نامہ موصول ہوا۔ اس سے قبل "شانِ ہند" کے دو پرچے بھی ملے۔ میں نے ایک پرچے پر تو اپنی رائے بھی پیش خدمت کی تھی شاید آپ تک نہیں پہنچی ہے۔

خوشی ہوئی کہ آپ نے میرا تبصرہ پسند کیا میں نے یہ کتاب دہلی میں ہی دیکھی تھی۔ لیکن آپ کے قلم کا جوہر تو "شانِ ہند" میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ میں آپ کی بے نیازی اور درویشی کا بھی معترف ہوں اور یہ اس کتاب کے لفظ لفظ سے مترشح ہے' ناقابل فراموش' میں نے پندرہ بیس سال قبل پڑھی تھی۔ اس کا تاثر ذہن میں موجود ہے۔ تبصرہ لکھتے وقت یہ تاثر ہی سامنے آیا۔ دوسرے آپ کی کتاب میں جو صداقت پسندانہ رویہ ابھرتا ہے' اس کی مثال دیوان سنگھ کی کتاب سے ہی تلاش کی جا سکتی تھی۔ آپ نے سردار صاحب کے ساتھ زندگی کا معتدبہ حصہ بسر کیا ہے۔ اس لئے اُن کے بارے میں آپ کی رائے پڑھ کر حیرت نہیں ہوئی بلکہ اُن کی شخصیت کا ایک نیا زاویہ سامنے آگیا۔ اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے کبھی موقع ملا تو میں اس پر مزید تفصیل سے لکھوں گا۔ کالم کی اپنی حدود ہیں۔ یہ تو آپ کی فراخدلی ہے کہ اسے پسند کیا۔ میری محنت ٹھکانے لگی۔

"حریت" کل آگیا تھا۔ کالم کی نقل ارسال خدمت ہے۔ میں آپ کو مہینے میں ایک منتخب کالم بھجواتا رہوں گا۔ اس کالم کی یہاں خاصی مخالفت ہوئی ہے' کچھ بغرض آپ تک بھی ضرور پہنچیں گے

میں ممنون ہوں کہ آپ نے میری کتاب کی اشاعت میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ تھوڑا سا وقت دیجئے کہ کتاب مرتب کر سکوں اور رسائل سے ایک مزاج کے مضامین تلاش کر سکوں۔ لیکن آپ نے اپنی صحت کا احوال تو لکھا ہی نہیں۔ پچھلے پرچے میں درج تھا کہ آپ علیل ہیں۔ خدا کرے اب آپ بعافیت ہوں۔

والسلام

مخلص

انور سدید۔

برادر مکرم

ایک مدت مدید کے بعد آپ سے شرفِ نیاز حاصل کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ جواب سے ضرور مشرف فرمائیں گے۔ آپ کی موقر تصنیف "بہ کوئے یار" پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اس کتاب میں آپ نے جو واقعات بیان کئے ہیں وہ تمام تر صداقت پر مبنی ہیں۔ اس کا اندازہ فیروزآباد کے قومی یکجہتی کے مشاعرہ کی روداد سے ہوا (صفحہ ۱۱۸) (اس سلسلے میں منتظم مشاعرہ کے ساتھ آپ کے دوست اور محسن کنور مہندر سنگھ بیدی نے جو کیا، اگر وہ اس لڑکے کے ایثار، جذبہ اور نیک نیتی اور سادہ لوحی سے واقف ہوتے تو کبھی بھی پولیس کے ذریعہ اسے زیربار نہ کرتے)

خیر!

پاکستان میں مہاجرین کی جو نسل کشی کی جا رہی ہے، اس کی بنا پر مجھے پاکستان اور پاکستانیوں سے ایک گونہ نفرت سی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن وہاں سے آپ نے اپنے دوستوں کے جو حالات محبت اور ایثار آفریں بیان کئے ہیں، انھیں پڑھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن "بوتل میں جن" کے عنوان سے آپ نے جو اپنی بہن کی روداد لکھی ہے، اسے باور کرنے کو جی نہیں چاہتا میں نے آپ کو یہ خط لکھا ہے کہ آپ مجھے یقین دلادیں کہ بہن کے یہ واقعات آپ کی آنکھوں کے سامنے گزرے تھے۔ [illegible]

آپ کا

عظیم فیروزآبادی۔

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 OCT 1988
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57 Delhi Postal

نومبر ۱۹۶۴ء

شانِ ہند
دہلی

تیری شائستہ لباسی کہ بدن
آج کی عریانیت کا پیرہن



اُن آنکھوں نے بدلنا نہیں سیکھا تھا،

مگر وہ بدل دی گئیں

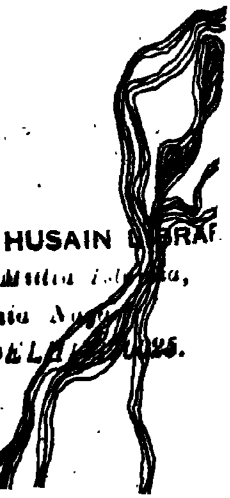
باوقار لوگوں کے لئے

نازک سی کہانی

اندر پڑھیے:۔

"لاوارث"

قدسیہ انصاری



شانِ ہند دہلی

نومبر ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹ — شمارہ ۱۱

چیف ایڈیٹر: سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر: مطرب صحرائی

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: ودّیا پرکاش سرور تونسوی۔
طباعت: خواجہ پریس، جامع مسجد دہلی۔ مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ "شانِ ہند" فلیٹ ۵، انصاری مارکیٹ، دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

خطاط: سبطین حسین، محمد عمران

حسن کار: مصطفیٰ آرٹسٹ

تعلیمِ جدید

تعلیم کا فیض سے ہے ہمہ گیر　　تہذیب نئی کی ہیں کشادہ راہیں
ہر سر میں ہے ارتقاء کا سودا　　معمور ہیں سب اُمیدگاہیں
شلوار کو ہے جنون سایہ　　کیں ہیٹ نے بر طرف کلاہیں
آباد ہیں شیخ ہوٹلوں میں　　ویران پڑی ہیں خانقاہیں
آنکھوں کو ہے شوقِ برق پاشی　　ہر سمت سے اٹھ رہی ہیں آہیں
تخریب کے واسطے کھلی ہیں　　اخلاق کی جملہ شاہراہیں،

اُٹھے اے کاش جلد پردہ
مشتاق ہیں دیر سے، نگاہیں!

احمق پھپھوندوی

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

افکار و واقعات | حالات حاضرہ | عصری مسائل | سیاسی تبصرے

ایڈیٹوریل

ٹیلیویژن اشتہارات

گھریلو بجٹ کو غیر متوازن کرنے کے موجب

اور مہنگائی کے ذمہ دار

گھریلو استعمال کی سینکڑوں اشیاء کی مہنگائی کے سبب کی ۸۰ فیصدی ذمہ دار ٹی۔ وی اشتہارات کی اُجرت ہے۔

ٹیلی ویژن پر اشتہارات کی بھرمار عوام کے گھریلو بجٹ کو غیر ارادی طور پر جس طرح غیر متوازن کر رہی ہے اُس کے بدترین اثرات گھریلو استعمال کی عام اشیاء کی روز افزوں مہنگائی کا سبب اور عوام کی مالی حالت کو ابتر بنانے میں نہایت اہم رول ادا کر رہے ہیں۔

اکثر ادارے اپنی مصنوعات کی پبلسٹی پر لاکھوں روپیہ ٹی۔ وی اشتہارات کی اُجرت کی ادائیگی کے لئے روز بروز گھریلو استعمال کی عام چیزوں کی قیمت میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں اور [illegible] اور مقدار میں کمی کرتے جا رہے ہیں۔

اکثر تو ٹیوبوں کی [illegible] میں [illegible] میں کمی کر دی گئی ہے اور [illegible] اور قیمتوں میں بھی [illegible] اضافہ کر دیا گیا [illegible]

سینکڑوں قسم کے واشنگ پاؤڈروں اور نہانے کے صابنوں کا بھی یہی معاملہ ہے کیونکہ ان اشیاء کے بنانے والوں کو ٹی۔ وی پر اشتہارات کی اجرت اس بات سے زیادہ دینی پڑتی ہے کہ جس کا تصور عام آدمی کر ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا یہ تمام پبلسٹی اخراجات بھی تو ان اشیاء کی قیمت میں سے ہی نکالنے ہوتے ہیں۔ اس لئے چیزوں کے دام بڑھانے کے لئے یہ لوگ مجبور ہیں۔

متعدد قسم کی کریموں، پاؤڈرز اور مچھروں کا انسداد کرنے والی اشیاء اور اسی قسم کے دیگر گھریلو استعمال کی سینکڑوں اشیاء کی مہنگائی کا سبب صرف اور صرف ذمہ دار ٹی۔ وی اشتہارات کی اجرت ہے۔

جوں ہی کسی نئی کریم یا نہانے کے صابن یا کسی اور چیز کا اشتہار ٹی۔ وی پر آتا ہے گھر کی مستورات، بچے سب اسے خریدنے کے لئے لپکتے ہیں۔ جس سے گھریلو بجٹ غیر متوازن ہو جاتا ہے اور اکثر و بیشتر گھرانوں میں ان فضول خرچیوں کے سبب کسی حد تک کافی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

فلموں، ٹی۔ وی اور ریڈیو نے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے دل خوش کن خواب کچھ اس طرح دکھانے شروع کئے ہیں کہ جس کے نتیجے میں مالی بربادی کے ساتھ ساتھ مہنگائی دن دن بڑھتی جا رہی ہے اور عیش و عشرت کے سامان خریدنے میں عوام مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔

راقم کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دفتر نشانِ ہند کے نیچے ایک جنرل اسٹور سے محلّہ کی ایک نوجوان لڑکی نے فیئر اینڈ لَولی فیس کریم اٹھارہ روپے میں خریدی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ فیس کریم تو کیا، اگر قدرت بھی چاہے تو شاید اس لڑکی کا کالا رنگ اب گورا نہیں کر سکتی۔ مگر وہ محض ٹیلی ویژن پر اس کریم کا اشتہار دیکھتے دیکھتے گورا رنگ کرنے کے اشتیاق میں اپنی انتہائی محنت کی مزدوری ایک فریب کی نذر کرنے پر مجبور تھی۔

فلموں، ٹی۔ وی اور ریڈیو نے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے دل خوش کن خواب کچھ اس طرح دکھانے شروع کئے ہیں کہ جس کے نتیجے میں مالی بربادی کے ساتھ ساتھ مہنگائی دن دن بڑھتی جا رہی ہے۔ اور عیش و عشرت کے سامان خریدنے میں عوام مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔

ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ اپنا معیارِ زندگی بلند کرے اور وہ اپنے سے زیادہ مالداروں کے اللّے تللّے دیکھ کر خود بھی اُن کی نقل کرنا چاہتا ہے اور اس نقل نقل میں وہ مالی طور پر نہ صرف کنگال ہو جاتا ہے بلکہ اپنے معیارِ زندگی کو اور بھی رُو بہ زوال کر لیتا ہے۔ گھروں کے بڑے بوڑھے اگر اس فضول خرچی پر روک لگانا چاہتے ہیں تو گھر کے نوجوان افراد بغاوت پر اتر آتے ہیں اور گھر والوں کو مجبور کر دیتے ہیں کہ ان کے یہ کافی حد تک ناجائز مطالبات کو پورا کریں۔

فضول خرچی کی اشیاء میں جہاں مالی زیاں ہوتا ہے، وہاں کچھ اشیاء انسانی صحت کے لئے مضر بھی ہیں مثلاً پان مسالے انسانی صحت کے لئے یقینی طور پر مضر ہیں۔ مگر ٹی۔ وی والے اپنی اشتہاری آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے اس قسم کی مضرِ صحت اشیاء کے اشتہارات بھی قبول کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے اور عوام کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کی نقصان دینے والی اشیاء کا استعمال کریں۔

عیش پرستی اور خود کو خوبصورت بنانے کے انسانی جذبے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، تجارتی ادارے اس قسم کی اشیاء کی مارکیٹ میں مہم کر رہے ہیں اور ٹی۔ وی پر ان اشیاء کا مظاہرہ اس دلکش اور دلفریب انداز میں کیا جاتا ہے کہ رسیدہ مرد اور عورتیں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مثال کے طور پر ایڈیٹر نشانِ ہند پینسٹھ (۶۵) سال سے فورہنز ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتا چلا آ رہا ہے مگر ٹی۔ وی پر دوسرے ٹوتھ پیسٹ کی تعریف و توصیف کا روزانہ سننے اور دیکھنے کے بعد بجائے فورہنز اس ٹوتھ پیسٹ کا استعمال شروع کیا تو ہفتے میں ہی مسوڑھے پھول گئے اور دانت ہلنے لگے۔ چنانچہ اس نئے ٹوتھ پیسٹ پر لعنت بھیج کر پھر سے فورہنز ٹوتھ پیسٹ استعمال کیا گیا۔ دنوں کے بعد دانت اور مسوڑھے اپنی اصلی حالت پر آئے۔

اس قسم کی کئی مثالیں دی جا سکتی

...ہتھا کا معائنہ بنانے والوں نے صابن کے
...امتی کو کمزور کرنے اور وزن کو کم کرنے کے
...نے اپنے صابن کی شکل و صورت ہی تبدیل
...ی اور ٹی۔ وی پر زور دار پبلسٹی کر کے اعلان
...بن نئی کھوج کے بعد، نئے انداز میں بنایا گیا ہے
...اصل یہ نیا انداز سابقہ انداز کے مقابلے میں
...ہکوں کے لئے مالی نقصان کا اور گھٹیا چیز سے

خریدنے کا باعث ثابت ہوتا ہے۔

ہم ٹی۔ وی اور ریڈیو پر اشتہارات قبول کرنے والوں سے یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ کسی چیز کا اشتہار قبول کرنے سے پہلے اُس چیز کی ماہرین سے تصدیق کرائی جائے کہ مشتہر کا اس چیز سے متعلق دعوےٰ صحیح بھی ہے یا محض عوام کی سُشر یفانہ اور محفوظ انداز میں

جیب تراشی ہے۔

امید ہے کہ دور درشن اور آکاش وا...
...کے ناخدا اس عوام لوٹ کی طرف دھیان...
...دیں گے۔ اور مہنگائی میں اضافہ کا موجب
نہیں گے۔

ہندوستانی اُردو مورچہ

ایک جائزہ

عالمی اُردو کانفرنس

...کے روحِ رواں مسٹر علی صدیقی نے محترمہ اندرا گاندھی
...کے یومِ پیدائش پر ہفت روزہ "ہندوستانی اُردو
...مورچہ" جاری کیا ہے، جس سے متعلق یہ کہا جاسکتا
...ہے کہ اِس وقت ہندوستان میں جتنے بھی، اُردو
...ہفت روزے شائع ہو رہے ہیں، اُن سب سے
...اس ہفت روزہ کی روِش الگ ہے اور چھپائی کاغذ
...طباعت، نیز چہار رنگ کی تصاویر کے لحاظ سے تو کوئی
...اُردو ہفت روزہ تو کیا، دُوسری زبانوں کے ہفت
...روزے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ علی صدیقی
...جس انداز سے عالمی اُردو کانفرنس کے لئے بے دریغ
روپیہ صرف کر رہے ہیں، اس ہفت روزے پر بھی روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا ہے جو اُن لوگوں کے لئے اور بھی دردِ سری کا باعث ہے جنھیں دن رات یہ فکر ستائے رہتی ہے کہ علی صدیقی کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آتا ہے جو اُردو کے نام پر بے دریغ لُٹا رہے ہیں۔

علی صدیقی کے ہاں کوئی دستِ غیب ہو یا دولت کی دیوی اُن پر مہربان ہو، اس مسئلے پر بے فائدہ بحث کرنے کی نسبت یہ کہیں بہتر ہے کہ اُردو حلقہ خدا کا شکر ادا کرے کہ اِس اُردو دشمن دَور میں ایک فردِ واحد عالمی اُردو کانفرنس اور اسی ادارے کے تحت عالمی اُردو مشاعرے منعقد کر کے اُردو کو دُنیا بھر میں روشناس کرانے میں لگا ہوا ہے اور اب اُس نے "ہندوستانی اُردو مورچہ" ایسا بے مثال اُردو ہفت روزہ جاری کر کے، اُردو صحافت کا سر بلند کیا ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی اُردو مورچہ کانگریس آئی کے لئے آنے والے الیکشن میں اہم رول ادا کرے گا اور ہندوستانی عوام کو یہ باور کرانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھے گا کہ ملک کی بہتری کے لئے راجیو گاندھی کی قیادت ہی موزوں اور مناسب ہے۔

فاروق ارگلی مُدیرِ معاون کی حیثیت سے "ہندوستانی اُردو مورچہ" کو ایک مثالی ہفت روزہ بنانے میں جو کوششیں کر رہے ہیں، وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

مدیرِ "نشانِ ہند" کی یہ تصنیف ہندوستان، پاکستان، نیز ممالکِ غیر میں، رہنے والے اُردو داں حضرات (ہندوستانی، پاکستانی) سے مشفقہ طور پر قبولیت کا یہ درجہ حاصل کر چکی ہے کہ واقعی اُردو زبان میں اس نوعیت کی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی تھی۔

اس کتاب کا ایڈیشن قریبِ اختتام ہے اب پچیس سے بھی کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ لہٰذا ہم یہ اعلان کرنے میں کوئی خدشہ محسوس نہیں کرتے کہ آپ اسے خریدیں اور اسے پڑھیں اور اگر آپ کے دل ودماغ کے کسی گوشے سے ہلکی سی بھی یہ آواز سُنائی دے کہ کتاب پسند نہیں ہے تو کتاب کو رجسٹرڈ بک پوسٹ سے واپس کر دیجئے اور رجسٹری محصول ڈاک اور ادا شدہ قیمت بذریعۂ منی آرڈر واپس لے لیجئے۔ اس کتاب کی قیمت ایک صد روپیہ ہے۔ "نشانِ ہند" کے مستقل خریداروں سے ۸۵ روپیہ "بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" کا دوسرا حصّہ "نکلے جو میکدے سے!....." نام سے اشاعت کے مرحلے کر رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ۱۹۸۹ء کے شروع میں ہی منصۂ شہود پر آ[ئے]۔ اس لئے وہ حضرات جو واقعی اپنی ذاتی لائبریری میں اس قسم کی کتابیں جمع کرنے کے شائق ہیں جو اُن کی آئندہ نسلوں کی دلچسپی کا موجب ہوں وہ "بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" کی ایک طلب کرنے میں توقف نہ فرمائیں۔ کیونکہ یہ کتاب نایاب ہو جائے گی۔

غزلیں

اِس دَور میں کیا نفس کو مارا ہے کسی نے
اعمال کو کیا اپنے نکھارا ہے کسی نے
ہر گام پہ چھالے مرے کہتے ہیں کہ شاید
دامن کو سرِ راہ پسارا ہے کسی نے
رس گھولتی ہے کان میں پیہم وہی آواز
شاید کہ مجھے آج پکارا ہے کسی نے
شانے سے لپٹ جاتی ہے کیوں ہر خوشبو
زُلفوں کو کہیں آج سنوارا ہے کسی نے
پانی کے میلے پن کو سبھی دیکھتے تو ہیں
لیکن کھلے کنول کو نہارا ہے کسی نے
ممنون ہوں پر اتنا ہے بس اتنا کہوں گا
مضموں کو مرے آج نکھارا ہے کسی نے
جس جیت پہ نازاں ہو تم اے مونس
اُس داؤ کو تو جان کے ہارا ہے کسی نے

نوشاد مونس اعظمی

کسے اب سناؤں میں اپنا فسانہ
نہ تم میرے اپنے نہ میرا زمانا
ارے آسماں تو نشیمن پہ میرے
سمجھ سوچ کر آج بجلی گرانا
وہ زرد رو کے میت پہ یہ کہہ رہا ہے
ذرا اپنے رُخ سے کفن کو ہٹانا
مجھے اپنی جو زندگی کہہ رہا تھا
وہ کیوں چاہتا ہے مجھے اب بھلانا
محبت میں بس تم سے یہ التجا ہے
مجھے بھول جانا مجھے بھول جانا
اگر اس کی محفل سے اُٹھ کر چلے ہم
سُنایا کرے گا ہمارا فسانہ
وہ آج اپنے شفقت سے یہ کہہ رہے ہیں
خدا کے لئے تم نہ مجھ کو بھلانا

شفقت علی وفا

جستجو میں رہوں روشنی کے لئے
زندگی چاہیئے زندگی کے لئے
بندگی میں جزا کا طلب گار ہو
یہ ضروری نہیں آدمی کے لئے
ساقیا میکدے کی ترے خیر ہو
ایک ساغر مری تشنگی کے لئے
دل کی دولت ہمارے لئے وقف ہے
یہ خزینہ نہیں ہر کسی کے لئے
دل کی گہرائیوں میں اُتر سے گئے
وہ جو مشہور تھے سادگی کے لئے
اپنے رُخ سے یہ زُلفیں ہٹا دیجئے
روشنی چاہیئے تیرگی کے لئے
میرے دل پہ وہ نشتر چلاتے رہے
اور میں چُپ رہا دوستی کے لئے

عبدالرب نشتر دیرہ دون

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

تمنائے وفا کرتے رہیں گے
خطا گر ہیں خطا کرتے رہیں گے

گُذر کر جان و دِل کی منزلوں سے
کسی کا حق ادا کرتے رہیں گے

ہمیں بھی ساتھ لے لو رہگذارو
کہ ہم منزل پہ کیا کرتے رہیں گے

مسیحائی اِدھر بکنے لگی ہے
یہ چرچا جا بجا کرتے رہیں گے

حقیر اب آ گئے ہیں تیرے آگے
تری مشکل کشا کرتے رہیں گے

۲۰۲، گولڈ کراؤن، ۳ جے پی روڈ،
اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۸

تپِ دق سے جنگ

۱. اگر آپ دو ہفتے سے زیادہ سے کھانسی میں مبتلا ہیں یا اپنے تھوک یا بلغم میں خون پاتے ہیں تو آپ پھیپھڑوں کی تپ دق کا شکار ہو سکتے ہیں۔

2. اپنا طبی معائنہ کرائیں، خاص طور پر بلغم کا۔ یہ معائنہ پرائمری ہیلتھ سینٹر، ڈسپنسری یا ٹی بی سینٹر میں کرا سکتے ہیں۔



3. تپ دق کا مکمل علاج ہو سکتا ہے بشرطیکہ ڈاکٹر کی تجویز کی ہوئی دوائیں پابندی سے متعینہ مدت تک کھائی جائیں۔

4. پرہیز علاج سے بہتر ہے، اس لئے اپنے بچے کو بی سی جی کا ٹیکہ لگوائیں۔

سینٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو (ڈی۔جی۔ایچ۔ایس)
وزارتِ صحت و خاندانی بہبود، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی 110002

davp 88/347 URDU

خانوادہ ہند۔

ستائیس سال پہلے

آنکھوں دیکھا کانوں سُنا

سرسنگار سمسد بمبئی کا کُل ہند مشاعرہ

۲

سرور تونسوی

کرکھڑے ہوکر، کھڑے ہوکر'۔ اِس پر اسد صاحب خود "تا در ماجس" ہوگئے ہیں اور غزل شروع کی ہے۔

ہراک فریبِ تمنا قبول کر لیجئے
جِس کے نام پہ ٹھہرا قبول کر لیجئے
جوانی آپ سے تنہا سنبھل نہیں سکتی
مری نظر کا سہارا قبول کر لیجئے۔

یہ مشاعرہ ہے۔ اِس میں اگر کوئی فلمی شاعر فلمی معیار کی غزل پیش کرتا ہے تو وہ کامیاب نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اسد صاحب کی یہ غزل داد حاصل نہیں کرسکی اور آپ جلدی جلدی پانچ اشعار سُنا کر واپس اپنی جگہ پر آگئے ہیں اور شکیل صاحب نے جاں نثار اختر سے کلام سُنانے کی درخواست کی ہے جاں نثار اختر صاحب نے اپنی پُرانی نظم "اندیشہ" سُنائی ہے اور سامعین نے اِس لئے سُن لی ہے کہ سُنانے والا جاں نثار اختر ہے۔ اب شکیل صاحب فرما رہے ہیں کہ اب شکیل بدایونی اپنا کلام پیش کر رہے ہیں۔ شکیل صاحب نے خلافِ توقع تحت میں ایک قطعہ سُنایا ہے۔ اس پر صبا افغانی فرمانے لگے "اب یہ تحت میں پڑھ کر تحت اللفظ پڑھنے والوں کے پیٹ پر لات مارنا چاہتے ہیں"۔ قطعے کے بعد شکیل صاحب نے غزل اپنے مخصوص ترنم میں شروع کی ہے ارشاد ہوا ہے ۔

سخت انجمن میں محبت کی پذیرائی ہے
اُن کو ہر گام پہ اندیشۂ رُسوائی ہے
ہم بھی دیکھیں گے کہاں تک غمِ تنہائی ہے
ہم نے بھی ترکِ محبت کی قسم کھائی ہے۔

داد ہے کہ مشاعرے میں نئی جان آگئی ہے۔ شکیل صاحب بڑے فنکارانہ انداز میں پڑھ رہے ہیں فرماتے ہیں ؂

جذبۂ عشق کہاں، ہستیِ ناچیز کہاں
تیری نظروں کی یہ سب حوصلہ افزائی ہے
مَیں تو ہُوں آج بھی وابستۂ دامانِ خزاں
لوگ کہتے ہیں مِرے گھر میں بہار آئی ہے۔

ہر شعر پر داد، شورِ قیامت کا سماں پیدا کر رہی ہے اور شکیل صاحب نغمہ سرا ہیں ؂

آپ رُسوائی کے ڈر سے نہیں ملتے ہیں تو کیا
مگر اب مِل کے نہ ملنے میں بھی رسوائی ہے

داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے اور شکیل صاحب مقطع فرما رہے ہیں ؂

میری جانب سے وہ منہ پھیر کے بیٹھے ہیں شکیل
کون سمجھے کہ کدُورت کی شناسائی ہے۔

شکیل صاحب غزل سُنا چکے تو داد و ستائش کی آوازوں میں اُنھوں نے اعلان فرمایا ہے کہ اب جناب اعجاز صدیقی صاحب اپنا کلام مرحمت فرما رہے ہیں۔ اعجاز صاحب نے بحرِ طویل میں غزل شروع فرمائی ہے اور اِس قدر جلدی سے پڑھ رہے ہیں کہ نقل کرنا دشوار ہوگیا ہے۔ مطلع کا پہلا مصرعہ نقل ہو سکا ہے ؂

"وہ کبھی سے آج تھوڑی دُور یوں چل کر ساتھ ساتھ نہیں"

اعجاز صاحب نے غزل پر مناسب موزوں داد پائی ہے۔ سنئے اب شکیل صاحب جناب خمار بارہ بنکوی سے کلام سُنانے کی درخواست کر رہے ہیں

جگر مختار صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور مطلع ارشاد فرمایا ہے ؎

وہ جو مست آنکھوں کو مَل کر رہ گئے
کچھ کچھ ڈور رخ بدل کر رہ گئے۔

داد ہے کہ مطلع مطلع انوار بن کر رہ گیا ہے سنئے مختار صاحب نغمہ سرا ہیں ؎

آہ جو اشکوں کو پی جانا پڑا
اُف وہ جو دریا رُخ بدل کر رہ گئے

ہم کہ جو آشیانے کا مرے
چند تنکے ہی تو جل کر رہ گئے

داد ہے کہ مشاعرہ گاہ حشر کا میدان نظر آ رہا ہے اور مختار صاحب یوں تڑپا رہے ہیں ؎

نور شمیں بے کیف سجدے بے مزہ
دل جو بدلا سب بدل کر رہ گئے

ہم تو بہکے عشق میں ناصح مگر!
ہائے رے وہ جو سنبھل کر رہ گئے

مسکرانے کے ارادے اے مختار
بارہا اشکوں میں ڈھل کر رہ گئے۔

مختار صاحب غزل سنانے اور خوب خوب داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں۔ اور شکیل صاحب نے جناب ساحر ہوشیارپوری سے کلام سنانے کی درخواست کی ہے۔ لیجئے ساحر صاحب ستم ڈھا رہے ہیں ؎

دعاؤں کو کچھ بند نہیں ہے اثر سے
یہ سبھی ہوئی ہیں تمہاری نظر سے

یہ کیا شعبدہ ہے کہ تیری نظر سے
کبھی آگ برسی کبھی پھول برسے

زباں کہہ نہ پائی جو دل کا فسانہ
حقیقت بیاں ہو گئی چشم تر سے

داد ہے کہ ساحر صاحب کو بھی یقین آ گیا ہے کہ اہل دہلی واقعی سخن فہم ہیں۔ سنئے ساحر صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

اسی در پہ اب سیکڑوں سجدے ہیں رُسوا
کہ جس در کو ٹھوکر بھی میرے سر سے

داد کا [illegible] رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہی اور ساحر صاحب فرط مسرت سے جھومتے ساحرین کے دلوں میں اُترتے جا رہے ہیں۔

کیا دل نے رُسوا تو مجبور کر کے
قیامت ہوا نکلے ہے اپنے ہی گھر سے

ترستا رہا شیخ دنیا میں ہر دم
مزا آئے جنت میں بھی جا کے ترسے

کہیں تم کو اپنی نظر لگ نہ جائے
جمال اپنا دیکھو ہماری نظر سے

غرض ایسے سجدوں سے ساحر کو کیا ہو
جو لے جائیں دُور آپ کے سنگ در سے

ساحر صاحب غزل سنا کر اپنی جگہ پر تشریف لانے لگے تو سامعین نے اصرار کیا ہے کہ ایک غزل اور مرحمت فرمائی جائے۔ سنئے ساحر صاحب دوسری غزل سنا رہے ہیں، مطلع اور ایک شعر آپ بھی سنئیے ؎

غم کے ماروں کا کیا بھروسہ ہے
بے قراروں کا کیا بھروسہ ہے

چاند تاروں کی ہے چمک شب بھر
ان ستاروں کا کیا بھروسہ ہے۔

ساحر ہوشیارپوری کو اس غزل پر بھی خوب خوب داد ملی ہے۔ اب شکیل صاحب نے نہایت موزوں الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے جناب دلاور فگار صاحب کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے۔ دلاور فگار صاحب نے برتھ کنٹرول، شاعروں کا داویلا، گدھے کی جانشینی، ایم حسین، نیلام، رشوت وغیرہ قطعات سنانے کے بعد "مُردوں کی ہڑتال" نظم سنائی ہے اور اتنی داد پائی ہے کہ اب تک شاید ہی بمبئی میں کسی شاعر کو اتنی داد ملی ہو۔ دلاور فگار کا یہ تمام کلام "شانِ ہند" میں وقتاً فوقتاً چھپ چکا ہے۔ اور اُن کے مجموعۂ کلام "ستم ظریفیاں" میں بھی کسی حد تک موجود ہے۔ آج کے مشاعرے کا ہیرو دلاور فگار ہی رہا ہے۔

دلاور فگار کے بعد جناب اختر الایمان صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں اور اپنی نظم "تماشہ" سنا کر خوب داد پائی ہے۔ نشہ بندی کے سلسلے میں جو بداحتیاطیاں ہو رہی ہیں اُن کا نقشہ اس نظم میں بڑے اچھے انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اختر الایمان صاحب کے بعد جناب علی سردار جعفری مائیک پر تشریف لائے ہیں اور اپنی ایک بہت پرانی غزل سنائی ہے جس کا مطلع ہے ؎

شکستِ شوق کو تکمیلِ آرزو کہیے
جو تشنگی ہو تو پیمانہ و سبُو کہیے

ایڈیٹر شانِ ہند سُر سنگار کے مشاعروں میں تین سال سے آ رہا ہے اور گذشتہ تین سال سُر سنگار کے مشاعروں میں علی سردار جعفری صاحب یہی غزل سُناتے ہیں۔ چیمسفورڈ کلب نئی دہلی کے مشاعرہ میں، نیز شری رام آف دہلی کلاتھ مِلز کے مشاعروں میں بھی جعفری صاحب یہی غزل سُناتے ہیں۔ نہ معلوم گذشتہ سات سال سے جعفری صاحب کو ہر مشاعرہ میں یہی غزل سُناتے سُناتے خود کو بوریت کیوں نہیں ہوتی۔

اب شکیل صاحب نے نہایت اچھے انداز میں محترمہ روحی دہلوی سے کلام سنانے کو کہا ہے۔ ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ روحی صاحبہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ کوئی ایسی غزل سنائیں جو اب تک وہ بمبئی نہ سنا چکی ہوں۔ صاحب صدر جناب دی تشنکوٹ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور دوسرے شعراء اور سامعین ہمہ تن گوش ہیں اور روحی نے مطلع پڑھا ہے ؎

پہلی سی مجھ پہ اُن کی عنایت نہیں رہی
گویا مرے نصیب میں راحت نہیں رہی

مطلع پر اتنی داد ملی ہے کہ مطلع مطلعِ انوار رہ گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

جب سے بدل گئی ہے تری چشمِ التفات
مجھ کو بھی زندگی سے محبت نہیں رہی۔

اس طرح ہم سے ترکِ وفا کر رہے ہیں وہ
جیسے کوئی نباہ کی صورت نہیں رہی

داد ہے کہ شاید ہی کسی ایک شعر پر اتنی ملی ہو۔ روحی یہ شعر کئی بار سُنانے کے بعد نغمہ سرا ہیں ؎

اپنوں نے دی ہے دادِ محبت کچھ اس طرح
اب دشمنوں سے کوئی شکایت نہیں رہی

داد کا پھر وہی عالم ہے اور روحی صاحبہ کو یہ شعر کئی بار سُنانا پڑا ہے۔ اب ارشاد ہوا ہے ؎

شاید ترا ستم ہی اُنہیں راس آ چکا
جن کو ترے کرم کی ضرورت نہیں رہی

دل میں تھی اک ذرا جو مسرت کی آرزو
اب وہ بھی تیرے غم کی بدولت نہیں رہی
رُوحی کسی کی یاد نے اپنا لیا مجھے
اب کوئی یادِ وجہ مسرت نہیں رہی

رُوحی صاحبہ غزل سُنانے اور بہت زیادہ داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے آئی ہیں اور اب جناب علّامہ ہنرؔ فن مائیک پر تشریف لائے ہیں اور روز نامہ "اُردو ٹائمز" بمبئی میں اُن کے جو قطعات شائع ہوتے ہیں اُن میں سے کچھ قطعات سُنائے ہیں اور مُناسب داد پائی ہے۔ ہنرؔ فن صاحب کے بعد ایک بزرگ شاعر جناب نظیرؔ مالیگانوی مائیک پر تشریف لائے ہیں اور ایک اچھی غزل سُنا کر مناسب داد پائی ہے۔ اب شکیل صاحب نے ۱۱ بجکر ۵۵ منٹ ...... پر نہایت ادب و احترام کے ساتھ حالی جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ سے کلام سُنانے کی درخواست کی ہے۔ جناب بیدی صاحب مائیک پر تشریف لائے تو جناب وی شنکر صاحب نے فقرہ کسا کہ شکیل صاحب نے بیدی صاحب کو پانچ منٹ پہلے بُلا لیا۔ اِس پر ایک قہقہہ بُلند ہوا ہے اور کنور صاحب بھی ہنستے ہوئے قطعات سُنا رہے ہیں اور ہر قطعہ پر بے حساب داد پا رہے ہیں۔ قطعات پر داد پانے کے بعد کنور صاحب نے ایک تازہ ترین غزل سُنانی شروع کی، ارشاد ہوا ہے ؎

کچھ ذکرِ حسن دل میں کچھ جلوۂ جانانہ
کعبے کا یہ کعبہ ہے بُتخانے کا بُتخانہ

مطلع پر بہت اچھی داد پانے کے بعد کنور صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

دو بانہ پیے ہے اب تو وہ جام بکف ساقی
اک اور قدم آگے اے لغزشِ مستانہ
آباد تصور بھی، بر بادِ تغافل بھی
یہ دل بھی عجب شے ہے، بستی ہے نہ ویرانہ
ہم دیر و حرم میں بھی ناکامِ تمنا ہیں
اب تیری دُہائی ہے اے جلوۂ جانانہ

کنور صاحب مُناسب داد پاتے ہوئے بہت اچھے انداز میں فرما رہے ہیں ؎

پھر درد نہ دے ساقی آنا کہ نہ آتا ہو
بھر دے مرے ساغر میں میخانے کا میخانہ

ہم چاہتے تھے کہ شکیں سمجھیے
تمہارے نہیں ورنہ ٹوٹا ہوا پیمانہ

اِسی شعر پر بہت زیادہ داد دی گئی ہے۔ کنور صاحب غزل سُنا کر اپنی جگہ پر آ رہے تھے کہ سامعین نے پُر زور اصرار کیا ہے کہ ابھی کچھ اور مرحمت فرمایا جائے۔ چنانچہ کنور صاحب نے چند قطعات سُنا کر خوب خوب داد پائی ہے۔ اب جناب کیفی اعظمی مائیک پر تشریف لائے ہیں اور وہی پرانی چیز جو شرِ سنگار کے مُشاعروں میں وہ ایک دو بار نہیں، بلکہ چار مرتبہ سُنا چکے ہیں ؎

اے ہمہ رنگ، ہمہ نور، ہمہ سوز و گداز
بزمِ مہتاب سے آنے کی ضرورت کیا تھی

نہ معلوم یہ ترقی پسند شعرا سالہا سال تک ایک ہی چیز کیوں سُناتے ہیں۔ کیفی کے بعد شکیل صاحب نے جناب شمیمؔ جے پوری کو کلام سُنانے کی تکلیف دی ہے۔ شمیمؔ صاحب کچھ مضمحل سے مائک پر تشریف لائے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

مَیں ساقی بے نظر میں پلاتا رہوں گا
اسی طرح جیتا پلاتا رہوں گا
غمِ دل کو دل میں چھپاتا رہوں گا
تمہارے لئے مُسکراتا رہوں گا
مٹا تو رہی ہے مجھے آج دُنیا
مگر مدتوں یاد آتا رہوں گا

ترنم تو خیر شمیمؔ صاحب کے سامنے پانی بھرتا ہے مگر آج.... انھوں نے غزل کچھ ایسی شروع کی ہے کہ جس پر داد بہت کم دی جا رہی ہے۔ سُنیئے شمیمؔ صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

زمانے نے جو زخم ہم کو دیئے ہیں
زمانے سے کب تک چھپاتا رہوں گا
ہزاروں سہی، راہِ منزل میں کانٹے
قدم سوئے منزل بڑھاتا رہوں گا
بہ ایں خستہ حالی، بہ ایں پائمالی
زمانے کو جینا سکھاتا رہوں گا
ابھی مجھ کو گمراہ رہنے دو یارو
نظر آئے جلوہ، مَیں بھی آتا رہوں گا

اِس شعر پر داد نے کچھ اکھل بچھل کی ہے اور شمیمؔ نغمہ سرا ہیں ؎

سلامت رہے دل میں داغِ محبت
یونہی عمر بھر جگمگاتا رہوں گا
زمانہ مٹاتا ہے مجھ کو لیکن
مَیں اپنا زمانہ بناتا رہوں گا

شمیمؔ صاحب غزل سُنا کر اللہ مناسب داد پا کر اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو شکیل صاحب نے جناب ماہر القادری الہ آبادی کو کلام سُنانے کی دعوت دی ہے۔ ماہرؔ صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں اور مطلع ارشاد فرمایا ہے ؎

کبھی سرِ حدِ مہر و ماہ سے کبھی کہکشاں سے گزر گیا
ترے نقشِ پا کی تلاش میں مَیں کہاں کہاں سے گزر گیا

ماہرؔ صاحب کی یہ غزل شانِ ہند میں متعدد بار مشاعروں کی رُوداد میں شائع ہو چکی ہے ماہرؔ صاحب بمبئی کے مشاعرے میں پہلی بار تشریف لائے ہیں لہٰذا اہلِ بمبئی کے لئے یہ غزل نئی ہی ہے بلکہ اِس غزل پر ماہرؔ صاحب کو اتنی داد ملی ہے کہ شاید اُنھیں کسی دوسرے مشاعرے میں نہ ملی ہو۔ ماہرؔ صاحب غزل سُنا کر جانے لگے تو سامعین نے ایک غزل اور سُنانے کی فرمائش کی ہے۔ شکیل صاحب نے ہر چند کوشش کی کہ ماہرؔ صاحب سے دوسرے دور میں جی بھر کر غزلیں سنیئے گا مگر سامعین کا اصرار اس حد تک بڑھ گیا کہ شکیل صاحب نے ماہرؔ صاحب سے کہا کہ چلو بھئی ایک غزل اور سُنا دو۔ ماہرؔ صاحب نے دوسری غزل کا مطلع ارشاد فرمایا ہے ؎

کبھی دشت و دَر میں تلاش کی کبھی شوقِ دَیر و حرم گئے
وہ مقام کون سا ہے جہاں تری جستجو میں نہ ہم گئے

ماہرؔ صاحب کی یہ غزل بھی شانِ ہند میں کئی بار شائع ہو چکی ہے مگر اہلِ بمبئی کے لئے نئی ہے بلکہ یہ غزل بھی خوب کامیاب رہی ہے اور ماہرؔ صاحب اپنے اندازے سے کہیں زیادہ داد ملی ہے۔

اب شکیل صاحب نے جناب جگن ناتھ آزاد سے کلام عنایت فرمانے کے لئے کہا ہے۔ جگن ناتھ بھی بمبئی میں پہلی بار تشریف لائے ہیں۔ [illegible] ناساز ہے۔ گلا بیٹھا ہُوا ہے۔ اِسی وجہ سے آپ لائل پور کے انڈو پاک مشاعرے میں تشریف نہ لے گئے۔ مگر راقم الحروف کی وجہ سے بمبئی کے

مشاعرے میں تشریف لائے ہیں تاکہ رئیس عالم امروہوی اپنی پوزیشن کا صحیح اندازہ لگا سکیں سنیئے، بیکل صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

نغمۂ کیف غزل حسنِ غزل جانِ غزل
آنچ گیت کا انداز ترنم دے دوں

بیکل صاحب کا یہ کلام شانِ ہند میں شائع ہو چکا ہے۔ خرابی طبع کے باوجود بیکل صاحب نے اہلِ بمبئی سے داد کا خراج وصول کر ہی لیا ہے اور انھیں اتنی داد ملی ہے کہ رئیس عالم امروہوی کے ماتھے پر پسینہ آگیا ہے۔ سامعین کے اصرار پر بیکل صاحب نے ایک اور گیت "اندیشے" سنایا ہے بیکل صاحب کلام سنانے اور خوب خوب داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں۔ جناب شکیل کہیں ضرورت سے گئے لہٰذا صاحب صدر نے جناب فنا نظامی کانپوری سے کلام سنانے کی استدعا کی ہے۔ فنا صاحب شانوں کو جھکائے ہوئے مائیک پر تشریف لائے ہیں اور مطلع ارشاد فرمایا ہے ؎

یوں انتقام تجھ سے فصلِ بہار لیں گے
پھولوں کے سامنے ہم کانٹوں کو پیار لیں گے

مشہور فلم ایکٹر مسٹر ڈیوڈ کہہ رہے ہیں۔ فنا صاحب، یہ ایرانی ذوق کب سے شروع کیا ہے۔ اس پر فنا صاحب نے ڈیوڈ صاحب کو قہر آلود نظروں سے دیکھا ہے۔ فنا صاحب کی یہ غزل بھی دو مختلف مشاعروں کی روداد کے تحت شانِ ہند میں چھپ چکی ہے۔ فنا صاحب نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے مگر داد نہیں مل رہی ہے۔ سنیئے اب جناب راز الٰہ آبادی مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ مطلع ارشاد ہوا ہے ؎

اُٹھی بیداد کی صیاد کی باغباں اپنے ہاتھوں کو ملنے لگا
ایسی گلشن کی اخبار پھر آج پھولوں کا دامن بھی جلنے لگا۔

راز صاحب تیر سنگار کے مشاعرہ سال گذشتہ میں بہت زیادہ کامیاب رہے تھے اور اسی وجہ سے انھیں اس مرتبہ بھی دعوت نامہ دیا گیا تھا مگر اس مرتبہ راز صاحب داد کا ایک لفظ بھی حاصل نہ کر سکے۔ ان کی یہ غزل بالکل نہ چل سکی۔ عوام کے پُرزور اصرار پر جناب دلاور فگار کو پھر کلام سنانے کی زحمت دی گئی ہے۔ شکیل صاحب نے اعلان کیا ہے کہ محترمہ بیگم منور چودھری صاحبہ نے ماہر القادری الٰہ آبادی صاحب کی خدمت میں پچاس روپے کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ دلاور فگار مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور انھوں نے "زندانی مشاعرہ بدایوں" "ٹیلیویژن کیبنٹ" "عشق کا پرچہ" "شاعروں کی کرکٹ" اقبال کی نظم پر پیروڈی کے علاوہ کچھ قطعات بھی سنائے ہیں۔ اور داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ دراصل آج کے مشاعرے کا ہیرو دلاور فگار ہی رہا ہے۔ محترمہ بیگم منور چودھری صاحبہ نے دلاور فگار صاحب کو پچاس روپے کا نذرانہ پیش کیا ہے جسے دلاور فگار صاحب نے شکریے کے ساتھ قبول کیا ہے۔ دلاور فگار نہ معلوم کس رَو میں شاعرات اور خواتین کے خلاف دو قطعات پڑھ گئے۔ دلاور فگار ایسے اچھے شاعر اور نیک انسان سے ایسے قطعات کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اُمید ہے کہ وہ آئندہ اس کا خیال کریں گے کہ خواتین کی عزت کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔

دلاور فگار کلام سناتے سناتے پسینہ میں شرابور ہو گئے تو کہنے لگے کہ اب تو رحم کرو۔ اس پر ایک قہقہہ لگا ہے اور دلاور فگار صاحب تالیوں کے شور میں اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں۔ سامعین کے اصرار پر اب جناب ماہر الٰہ آبادی کو کلام سنانے کی دوبارہ دعوت دی گئی ہے۔ مگر ماہر صاحب نے اب کی مرتبہ ایسی غزل شروع کی ہے کہ جس پر داد کا ایک حرف بھی نہیں مل سکا۔ اس وقت ڈیڑھ بج چکا ہے اور میں نے بھی روداد لکھنا بند کر دی ہے۔

غزل

چشمِ باطن نے یہ کیا کھیل انوکھا دیکھا
حُسن کے جبر پہ خود حُسن کا پردا دیکھا

ہم نے جلوے کی تمنا میں یہ جلوہ دیکھا
جس طرف آنکھ اُٹھی اپنا ہی چہرا دیکھا

کعبہ میں دَیر ملا، دَیر میں کعبہ دیکھا
دیکھنے والی نگاہوں نے یہ کیا کیا دیکھا

کُنجِ خلوت میں بھی انساں کو تنہا دیکھا
چھوٹے سے دل میں تمناؤں کا میلا دیکھا

حُسنِ مُطلق کی حقیقت کا تماشا دیکھا
ذرّے ذرّے میں سمانے پہ بھی یکتا دیکھا

عشقِ صادق نے شہادت پہ کمر باندھی ہے
یہ وہ عالم ہے جہاں حُسن کو رُسوا دیکھا

بے زبانی نے زباں ڈھونڈ نکالی آخر
محفلِ یار میں آنکھوں کو بھی گویا دیکھا

فصلِ گُل، جوشِ نمو، جوشِ جنوں، جوشِ خلش
گُل کدہ دشت میں، گلزار میں صحرا دیکھا

جھوٹ کا سکّہ، گناہوں کی حکومت دیکھی
ہم نے دل کھول کے دُنیا کا تماشا دیکھا

چھپنے پر بھی نہ چھپا حُسنِ حقیقت افروز
چشمِ بینا نے حجابوں میں ہویدا دیکھا

وُہ اُٹھیں آندھیاں صحرائے محبت میں رتنؔ
ہر طرف بہتا ہُوا ریت کا دریا دیکھا

پنڈت رتنؔ پنڈوروی

گذشتہ سے پیوستہ



گوری سوئے سیج پر

مس پرویز اختر تنہا

زمینداری کا تمام حساب کتاب دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے اور کہنے لگے۔ "مجھے تو آج احساس ہُوا کہ تم میری بیٹی نہیں بیٹے ہو! مگر تمہاری تنہا اور اداس زندگی دیکھتا ہوں تو خود کو مجرم محسوس کرنے لگتا ہوں کاش حساب کتاب میں سر کھپانے کی بجائے میری بیٹی کسی کے گھر میں حکومت کر رہی ہوتی۔" پھر ابو نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔

میں نے ان درد بھرے لمحوں میں سوچا کہ اپنی اُداسیوں کی ذمّہ دار میں خود ہوں۔ یہ جہانِ خراب میں نے خود اپنے لئے منتخب کیا ہے۔ میں تو ازلی سے بدنصیب ہوں۔ محبت و شفقت کی پیاسی میری رُوح نے جب زندگی میں ایک بار چاہت کی آرزو کی تو وہ میرا محبوب میرے ہی ہاتھوں موت کی سرد وادی میں اُتر گیا تھا۔ وہ میرا دیوتا، جس کے چرنوں پر اپنا جیون نچھاور کرنے کے لئے کئی بہاریں اپنی وفا کے پھول لئے پھرتی تھیں، اُسے مجھ ایسی تنہا، اُداس اور کمزور لڑکی میں جانے کیا نظر آیا کہ ایک دن اپنی آنچل کنز...

پھول میری مانگ میں سجانے میرے ساتھ ساتھ لانگ ڈرائیونگ پہ نکلا۔ چاہتوں کے وجود میں اور اس کی دھیمی دھیمی باتوں میں کچھ ایسا نشہ سا مجھ پر طاری تھا کہ سامنے سے آنے والی گاڑی کی تیز رفتاری کے سبب میں اسٹیئرنگ پر قابو نہ پا سکی۔ گاڑی بے قابو ہو کر دُور ایک کھڈ میں گر پڑی۔ کتنی بدنصیب تھی میں کہ اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں سسکتے، دم توڑتے دیکھ کر بھی زندہ رہی! پھر اسی جان لیوا احساس نے جیسے میرے دل کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے۔ اب کسی دستک پر یہ دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ اپنی تنہائیوں میں آباد میں پھر گاؤں ہی کی ہو کے رہ گئی۔

اس دن ابو سے بات کر کے میں جیسے رات بھر اپنے ماضی میں سفر کرتی رہی، اسی سفر میں صبح ہو گئی۔

اسی دن میرے اسلم کی "رسم مہندی" تھی۔ حویلی دُلہن کی طرح سج رہی تھی اور اسلم کی بھولی صورت پر ایک عجیب کیفیت تھی۔ وہ بیک وقت خوش بھی لگ رہا تھا اور اُداس بھی!

تمام رات لڑکیاں ڈھولک پر گیت گاتی رہیں۔

گوری کی سہیلی بانو بھی ذرا عجب عجب سی تھی۔ میں نے اُس سے گوری کے بارے میں پوچھا تو بولی "وہ کل شہر سے تو آ گئی ہے پر اُسے بہت تیز بخار چڑھا ہے، ہوش میں نہیں ہے۔ ہم اُسے بلانے بھی گئے تھے وہ آ نہیں سکی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آپا کو میرا سلام کہنا۔"

میں ایک دم گھبرا سی گئی اور پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ اپنی چاہت کے طوفان کو اُس نے دبا لیا ہوگا۔ اسی وجہ سے اُسے بخار ہو گیا ہے۔

اسی طرح دن چڑھ آیا۔ حویلی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ صبح کی سپیدی نئے سورج کے ساتھ میرے اسلم کے سہرے کی مہکتی ہوئی لڑیاں اور پھولوں کی خوشبو لے کر آئی۔ شام ڈھلے تک میری موٹا میرے سی دولہا بن کر حویلی میں آ گئی۔ خوشی کے مارے میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ موٹا اتنی خوبصورت لگ رہی تھی جیسے تمام کائنات کی خوبصورتی سمٹ کر اُس کے وجود میں ڈھل گئی ہو۔ جھکی جھکی آنکھوں والی سی موٹا آتشیں، گلابی غرارہ سوٹ میں ... لدی یوں بال کمرے میں بیٹھی تھی جیسے کوئی آسمان...

نکلوں کو زمین پر اُتر آئی ہو اور لوگ جوق در جوق اُس کی ایک جھلک دیکھنے کو دوڑے آ رہے ہوں۔ یہ کمرا سب سے بڑا تھا۔ اُس کے چاروں طرف لمبی راہداریاں اور کشادہ برآمدے تھے جن پر گلابی رنگ کے پردے جھلملا رہے تھے۔ مہمانوں کی یلغار تھی۔ خوشبوؤں کا طوفان تھا۔ شوخ اور جوان قہقہوں کا ایک سیلاب تھا جو سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ مَیں مونا کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ اسلم بھی تھوڑی دیر بعد اُس کے آگے جھک کر کوئی بات کہہ رہا تھا اور وہ مُسکرا رہی تھی۔ مَیں نے اسی دَوران میں سُنا ابّو کسی کو زور سے ڈانٹ رہے ہیں مَیں اپنے تجسّس کے زیرِ اثر فوراً باہر آ گئی۔ ابّو ملازموں پر برس رہے تھے کہ یہ اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہوئی پاگل لڑکی اندرونی کمروں تک کیسے پہنچ گئی؟"

مَیں نے دیکھا وہ گوری تھی۔ میلے ہوئے کپڑے گھٹاؤں ایسے سیاہ بال کسی بدنصیب کی تقدیر کی طرح اُلجھے ہوئے اُس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے وہ ایک ہاتھ میں کوئی چیز چھپائے اور اُسے سینہ سے لگائے دُوسرے ہاتھ سے دشمنوں کی راستہ بنا رہی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکی "آپا!... آپا! مجھے اسلم کے پاس لے چلو نا! یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے مَیں دُلھن کو تحفہ دینا چاہتی ہوں۔ یہ مجھے اندر نہیں جانے دیتے۔"

پھر وہ نڈھال سی ہو کر گر پڑنے کو تھی کہ مَیں نے اُس کے نازک جسم کو سنبھال لیا۔ وہ آگ کی طرح دہک رہی تھی۔ مَیں نے کہا "گوری۔! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ اِدھر آؤ!"

اِس میں کوئی شک نہیں کہ جب سے ابّو آئے تھے حویلی میں لوگوں کی آمدورفت پر پابندی لگ گئی تھی۔ گوری کی اِس جنونی کیفیت سے مَیں گھبرا سی گئی مَیں نے سرزنش کے لہجے میں کہا "گوری!" ہوش میں آؤ" یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے؟"

وہ بولی "مَیں تو بالکل ٹھیک ہوں!"

ابّو خفگی سے کچھ کہنے لگے۔ مَیں نے متانت کے ساتھ انہیں سمجھا دیا اور گوری کو لے کر اندر چلی آئی۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ بالکل سنجیدہ ہو گئی۔

اسلم پر ایک نظر ڈال کر وہ تھکی ہوئی سی مونا کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اُنسے بیٹی باندھ کر دیکھنے لگی پھر مونا کی ایک ایک چیز کو آہستہ آہستہ چھو کر دیکھتی رہی مونا کی نازک سی نفرت سے بھنچ رہی تھی اور وہ ڈری ڈری سی اس پاگل لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔

پھر نہ جانے گوری کو کیا ہُوا کہ وہ آہستہ آہستہ کھسکتی ہوئی اسلم کے قریب آ گئی اور اُس کے پاؤں پکڑ کر بولی "تو جھوٹ کہتا تھا کہ مَیں شہر میں تنہا رہتا ہُوں۔ مَیں تو تجھے سارے شہر میں ڈھونڈ آئی! تو کہیں نہیں مِلا۔ آپا!..... اسلم نے جھوٹ کہا تھا نا .... پر مَیں تو اب تھک سی گئی ہوں، چلتے چلتے سارا شہر چھان مارا..... تھک گئی ہوں مَیں.... تھک...."

یہ کہتے کہتے اُس نے ایک جنونی کیفیت میں اپنا سر آبنوسی تخت کے پائے دان پر دے مارا، پھر چیخنے لگی

"مجھے معاف کر دینا اچھے! مَیں پاگل تھی! تم مجھے پگلی کہتے تھے نا!" اِس دَوران میں وہ بار بار اپنا تخت سے سر پھوڑ رہی تھی اور وہاں موجود افراد کو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟ میری حالت بھی ایسی ہی تھی جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں۔ گوری اب بھی چیخے جا رہی تھی۔ "مَیں پاگل ہوں.... گوری پاگل ہے.... پاگل....!

پھر ایک دم جیسے سبھی وہ بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے جاگ اُٹھے گوری کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ لوگ اُسے پکڑنے جھپٹے مگر وہ کسی کے قابو میں نہ آئی۔

گوری اپنے ہی لہو میں اُنگلیاں ڈبو کر کہہ رہی تھی "یہ میری مانگ کا سیندور ہے! اسے میری مانگ میں بھر دو۔ یہ میرا سُہاگ ہے.... میرے اچھے کی نشانی!"

پھر یونہی تڑپتے تڑپتے اُس کی رُوح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اسلم کسی انجانی قوّت کے زیرِ اثر گوری کے جسم کو سنبھالنے جھپٹا جیسے ایک طویل بیہوشی سے چونکا ہو۔ گوری کے بھنچے ہوئے ہاتھ سے ننھے ننھے گھنگروؤں والا چاندی کا ایک کنگن لڑھک کر ہلکی سی جھنجھناہٹ کے بعد فرش پر گر گیا۔

اس دردناک واقعے کو کئی برس بیت چکے ہیں اور اب تو ہیر سیال کے قبرستان میں اس خاموش پجارن کا آخری نشان تک مٹ رہا ہے جس پر اسلم اور مونا کئی سال تک دیا جلاتے رہے۔ وہ دونوں میاں بیوی یورپ چلے گئے تو یہ سلسلہ ٹوٹ سا گیا۔ دُنیا کی تمام راحتیں پانے کے باوجود بھی آج تک اسلم زندہ ہے مگر بے اولاد۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ گوری کی بددُعا ہے۔ کاش! مَیں اُس محبت کی ماری کے لئے کچھ کر سکتی۔!



لاوارِث

قدسیہ انصاری

میں توہمات کی قائل نہیں۔ آواگون کے فلسفہ پر بھی میرا ایمان نہیں ہے، پھر بھی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ذہن اُن کو قبول نہ بھی کرے تو اُن پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ یوں بھی موجودہ سائنس نے بہت سے معجزے کا ظہور کر دیا ہے اور اب تو ہر چیز ہی ایک معجزہ ہو کر رہ گئی ہے۔ انسانی زندگی سے لے کر خلائی پرواز تک۔ اور پھر یہ تو مشرقی عورت کی دُنیا داری کا ادنیٰ سا واقعہ ہے جو معجزہ بن کر میرے ذہن میں امر ہو گیا ہے۔ آنکھیں بدلنا جو ماضی میں تلخ محاورہ تھا، اِس دَور میں اس محاورے کو ایک نئی شکل مل گئی ہے۔ مجھے آج بادامی کی مشرقی حیا میں ڈوبی آنکھیں بُری طرح یاد آ رہی ہیں جنھوں نے بدل جانا کبھی سیکھا ہی نہیں تھا، مگر وہ بدل دی گئی تھیں۔

پچھلے چند سال کی بات ہے جب میں ایک سہیلی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لئے دُلھن کے گھر گئی۔ شادی کا گھر عام طور سے بھرا ہُوا ہوتا ہے۔ بے ہنگم آوازوں سے گونجتا ہُوا، رنگین گوٹا کناری کے کپڑوں سے پٹا ہُوا، ہنسی مذاق اور زندگی سے بھرپور۔ میں تو اُس وقت پہنچی تھی جب آرسی مصحف کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دُلھن کے کمرے میں دُولھا کو شہ بالا بازو سے پکڑ کر تخت پر بٹھا چکا تھا۔ دُولھا کی آمد کا شور سُن کر دُلھن کا سَر اور بھی جھک گیا تھا۔ اُس کا سُرخ جھلملاتا ہُوا گھونگھٹ فرش کو چھُو رہا تھا۔ دُولھا کمخواب کی شیروانی اور ٹوپی پہنے، گلے میں پھُولوں کے ہار ڈالے نگاہ نیچی کئے کنکھیوں سے دُلھن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کی ماں کی بولتے بولتے آواز بیٹھ گئی تھی، وہ ہر ایک سے پکار پکار کہہ رہی تھی کہ ایک سُرخ چادر لا کر دُولھا دُلھن پر ڈال دو۔ اُس کے لہجہ میں جھنجھلاہٹ نُمایاں تھی۔ مَیں نے ایک اچٹتی سی نگاہ دُولھا دُلھن پر ڈالی۔ دُولھا کے پاس دو عورتیں قیمتی ساٹن کے غرارے میں ملبوس بیٹھی تھیں۔ مَیں نے سُن رکھا تھا کہ دُولھا کے باپ نے دو شادیاں کر رکھی ہیں۔ مَیں نے اندازہ لگا لیا کہ اِن میں دُوسری جوان عورت دُوسری بیوی ہے۔ گھر کے لوگ دُولھا دُلہن کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ کسی نے فوٹوگرافر کو اشارہ کر کے کہا۔ ”ذرا ایک تصویر دُولھا کی الگ سے کھینچ لو۔“

فوٹوگرافر نے دُولھا کو اشارہ کیا۔ وہ دُلھن سے دُور ہو کر بیٹھ گیا۔ دونوں عورتیں اُس کے آجو بازو آ کر بیٹھ گئیں۔ ”کلک“ فلیش لائٹ کا کوندا لپکا۔ دُولھا کی ماں کے چہرے پر فتحمندانہ مسکراہٹ تھی۔ جب کہ دُوسری عورت پژمُردہ سی بیٹھی تھی۔ مَیں جو اُن دونوں سے ذرا فاصلے پر تھی، چونک گئی۔ فلش لائٹ کی روشنی میں مَیں نے بادامی کو پہچان لیا تھا۔ فوٹوگرافر نے دُوسری تصویر کے بعد کے لئے دُولھا کو وقت دیا تھا۔ دُولھا نے پلٹ کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اُس کی ماں اپنے کپڑے دُرست کرنے لگی۔ غرارے کی چُنَت کو سامنے کی طرف پھیلا کر اُس نے دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا اور قمیص کی شکن دُرست کر کے مطمئن سی بیٹھ گئی۔ بادامی نے بھی احتیاط سے

ساری کا پلّو سر پر جمایا۔ دُولہا کے دل میں جانے کیا سمایا کہ اس نے دوسری عورت کے گلے میں باہیں ڈال کر فوٹو گرافر سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ایک تصویر چھوٹی امّی کے ساتھ بھی لے لو۔"

بادامی کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کیمرے کی آواز "کلِک" کے ساتھ فلش لائٹ چمکی۔ دُولہا کی ماں نے حیرت سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور تن کر کھڑی ہو گئی۔

"نیاز، یہ کیا حرکت تھی۔؟"

اُس کی گرجدار آواز سے ڈر کر سُرخ گٹھری کُلبلائی اور دُلہن نے دوپٹے کی آڑ سے دولہا کی ماں کو دیکھا جو غصّے میں بھری ہوئی تیزی سے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔

"جب تک یہ عورت گھر میں ہوگی، کوئی رسم وسم نہیں ہوگی۔!"

تب میں نے بادامی کو نگاہ بھر کر دیکھا۔ دس سال پُرانی یادیں جگمگانے لگیں۔ اپنے دوسرے بچّے کی پیدائش کے دنوں مجھے اسپتال میں داخل ہونا پڑا تھا۔ وہ بہت معمولی صورت شکل، گہرے سانولے رنگ کی ایک عام سی لڑکی تھی۔ لیکن ایسی معمولی شکل و صورت کے ساتھ اُس کی آنکھیں اس قدر حسین تھیں کہ اُنھیں دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی شاعرانہ تشبیہ ذہن میں گھوم جاتی تھی۔ یوں تو اُس کے بال بھی کافی خوبصورت اور لمبے تھے لیکن اُس کی بے پناہ کشش رکھتی تھیں۔ جو دیکھتا، اُن میں کھو جاتا تھا۔ بادامی اکثر و بیشتر میرے کمرے میں آ کر پہروں باتیں کرتی رہتی۔ ساس نندوں کی باتیں، اپنے والدین کی باتیں، جو اُسے پیدا کرتے ہی بے یار و مددگار تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اس دُنیا سے چلے گئے تھے۔ ٹھوکریں کھاتی بڑی ہوئی۔ شادی بھی جلدی کر دی مگر قسمت نے یہاں بھی نامہربانی کی۔ اس کا شوہر شادی کے کچھ عرصے بعد ہی روزگار کی تلاش میں ایران چلا گیا اور اب چھ سال ہونے کو آئے ابھی تک واپس نہیں آیا۔ شروع میں کچھ دن تو اُس نے خط باقاعدہ بھیجے لیکن اب چار سال سے کاغذ کا ایک پرزہ بھی نہیں آیا۔ پیسے بھیجنا تو در کنار، اُسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ایران میں ہے یا اور کہیں چلا گیا۔ جس کے ہاتھ میں ڈور تھی، اُس کا سب کچھ تھی۔ وہ بڑی بہو تھی۔ شروع میں تو ساس نندوں نے بہت خیال کیا کیونکہ اس کا شوہر پورے گھر کا پالن ہار تھا لیکن جب شوہر نے بھی منہ پھیر لیا تو ساس نندوں نے دھیرے دھیرے بے توجہی برتنی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ آیا جب اُنھوں نے اُسے گھر سے نکال باہر کر دیا، کیونکہ بقول اُس کی ساس کے وہ "آدھی عورت" تھی۔ اگر اُس کی شادی کے اس عرصے میں بچّے ہو جاتے تو میاں کبھی چھوڑ کر نہ جاتا اور جبکہ اُس نے قطع تعلق کر لیا ہے تو اس آدھی عورت کا گھر پہ کوئی حق نہیں ہے۔

اُس نے گھر سے باہر نکل کر مختلف کام کرنے چاہے لیکن کہیں اُس کی تعلیم کی کمی آڑے آئی، اور کہیں اُس کی شکل اور نو عمری۔ آخر کار نرسنگ کا پیشہ مُناسب معلوم ہُوا اور وہ نرسنگ کا کورس کر کے ایک اسپتال میں مُلازم ہو گئی۔ بادامی اپنی رام کہانی سُنانے کے بعد مجھ سے میرے بچّوں کے بارے میں ضرور پوچھتی اور گفتگو کے اختتام پر مجھے خوش قسمت ترین عورت ٹھہراتی، کیونکہ میں ایک بھرے پُرے گھر کی مالک تھی۔ اتنے پریشان کُن حالات میں بھی اُسکی باتیں بہت دلچسپ ہوتیں۔ ایک لمحے وہ اپنی ساس کے طعنوں تشنوں کی باتیں، سسرال کے سلوک کا دُکھڑا روتی اور دوسرے ہی لمحے وہ کچھ یاد کر کے ہنس پڑتی اور پھر اپنی ساتھی نرسوں کا قصّہ چھیڑ دیتی جن کو ڈیوٹی کے فوراً بعد ہی اپنے بوائے فرینڈ یاد آ جاتے تھے اور ڈیوٹی نمٹانے کے بعد بن ٹھن کر اُن کے ساتھ گھومنے پھرنے چل دیتی تھیں۔ کمبختوں کو ہوش نہیں کہ اُنھیں کے پیسے پر یہ سب کنگلے عیش کرتے ہیں۔ وہ اتنے دلچسپ انداز میں اپنی ساتھیوں کی باتیں سُناتی، ایسی ایسی نقلیں کرتی کہ مجھے بے اختیار ہنسی آ جاتی۔ غرضیکہ اس کے پاس دلچسپ باتوں کا پٹارا تھا کہ ختم ہی ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ جس دن اُس کی ڈیوٹی دوسرے کمرے میں ہوتی مجھے اپنا کمرہ عجیب، خالی خالی سا لگتا اور میں غیر محسوس طریقے پر اُس کا انتظار کرتی۔

وہ رات بڑی ہی اذیت ناک رات تھی جب میں تخلیقی عمل سے دوچار تھی۔ درد کی لہر کمر سے اُٹھتی اور میرے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ اُف خدایا، میں نے بشدّت تکلیف سے دانت بھینچ لئے اور آہستہ آہستہ سر پٹکنے لگی۔ کوئی نرم نرم ہاتھ میرے بالوں کو سہلانے لگا۔ سکون اور محبت کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"روتی کیوں ہیں بھلا، بس......"

شدید کرب سے میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایسا لگا جیسے جیتے جی کسی نے گھُپ اندھیری قبر میں اُتار دیا ہو۔

پھر جب میری آنکھ کھُلی تو وُہی ہتھیلی میرے ماتھے پر تھی۔

"مُبارک ہو! بڑا پیارا سا بیٹا ہے آپ کا۔"

اُس کی آواز میں ممتا کی گھلاوٹ تھی۔ "آپ دیکھیں گی اپنے بچّے کو؟"

وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بھاگتی ہوئی نرسری کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد بچہ میرے برابر لا کر لٹا دیا۔

"لو ایک نظر اپنے بیٹے کو بھی دیکھ لو، ڈاکٹر کو معلوم نہ ہو، وہ ابھی راؤنڈ پر نہیں ہے۔"

میں نے سوچا یہ کیسی نرس ہے۔ اسپتال کے اُصولوں سے بے بہرہ۔ بھلا چند گھنٹے کے بچّے کو نرسری سے نکالا جاتا ہے۔ مگر نیند اور تھکان نے مجھے کچھ سوچنے اور سمجھنے کی مُہلت نہیں دی۔

اور اب اس وقت، شادی کی محفل میں پورے مجمع کی نگاہیں بادامی کی طرف تھیں جس نے اپنے پہلے شوہر کی بے وفائی کا وار سہہ کر دوسری شادی، دُولہا کے باپ سے کر لی تھی۔ اور آج وہ مجرم بنی سر جھکائے کھڑی تھی۔ نیاز کی ماں اُسے صلواتیں سُنا رہی تھی کہ ایک دم سے غلغلہ ہُوا "دُولہا کا باپ آ گیا ہے۔"

ایک دُبلا پتلا منحنی سا آدمی کمرے کے باہر دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے بُلند آواز سے کہا۔

"کون کہتا ہے کہ یہ بادامی کا گھر نہیں ہے! وہ میری عزت ہے اور پورے گھر کی عزت!"

ادھر نیاز گڑگڑا کر اپنی ماں کو منانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اماں! میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا ۔ وہ بھی ...ی سی تھیں، میں نے اُنھیں ہنسانے کے لئے یہ کیا تھا۔ قسم کھا کر کہتا ہوں اماں، یہ وقتی جذبہ تھا۔ اور بس! ...ں تو اُن کے گھر جھانکتا بھی نہیں۔ آپ سلیم ماموں سے پوچھیے۔"

مگر نیاز کی ماں کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا۔

"معلوم ہوتا ہے تو نے تجھے بھی پھانس لیا ہے۔"

وہ گھبرا گھبرا کر اپنی ماں سے صفائی پیش کر رہا تھا۔

"آخر آپ لوگوں نے اِس عورت کو شادی میں بلایا کیوں! صرف ہنگامہ کروانے کے لئے؟" کسی نے ...یز لہجے میں پوچھا۔ نیاز کی ماں نے چِڑ کر جواب دیا۔

"ارے میں نے کہاں بلایا تھا۔ اِس کلموہی نے ...نہ معلوم کیا جادو کر دیا۔ ساری عمر تو اس کی بدولت ...روتے سسکتے گزری۔ جب بیٹے کی شادی کا معاملہ آیا میں نے نیاز کے باپ کو کہلا بھیجا کہ بیٹے کے بیاہ میں آجاؤ۔ جواب یہ آیا کہ بادامی کے بغیر شادی میں شرکت نہیں کروں گا۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی دولہا ...یسے ہی سنوارا جائے یہ مجھے گوارا نہ ہوا۔ کہلوانا پڑا کہ لے آنا کلموہی کو بھی۔"

بات اور بگڑ جاتی، مگر لوگ باگ نیاز کے باپ ...و سمجھا بجھا کر باہر لے گئے۔ بادامی بھی چپکے سے پچھلے ...روازے سے کھسک گئی۔ کمرہ خالی پا کر محفل کی کسی ...ورت نے نیاز کی ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔

"بس اب غصہ تھوک دو بہن آپا! اُس کو بہت سزا مل گئی۔"

نیاز کی ماں بےساختہ مسکرا دی۔ رشک و حسد کا ...لاوا تھوڑی دیر پہلے آتش فشاں بن کر اُبل پڑا تھا، بادامی کو ذلیل کرنے کے بعد ایک لمحے میں ہی بجھ گیا اور ...ب وہ بڑی طمانیت سے عورتوں کے بیچ میں بیٹھی پان ...بار رہی تھی۔ کسی نے دبے دبے پوچھ لیا کہ نیاز کے باپ نے دوسری شادی کیسے کی تھی؟ وہ یہ قصّہ دہرانے بیٹھ گئی کہ بارہ برس پہلے وہ اپنی بہن کے ساتھ ایک سرکاری ...سپتال گئی تھی۔ اُس کی بہن کا اپینڈکس کا آپریشن ہُوا تھا۔ اسپتال میں بادامی نے اُس کی اور اُس کی بہن کی بڑی خدمت کی تھی۔ ڈیوٹی کے بعد جب بھی وقت ملتا، آ کر اپنی باتوں سے اُن کا دل بہلاتی۔ اُس وقت تو خود مجھے بادامی کی بڑی قدر تھی۔ ارے مجھے کیا معلوم کہ اِس مُردار کے دل میں کھوٹ ہے۔ نیاز کے ابا بھی کمرے میں گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے اور اکثر ایسے وقت آتے جب بادامی کمرے میں ہوتی۔ اُس وقت بہن میرا نیاز قریب قریب گیارہ برس کا تھا۔ سفینہ چار سال اور سُلطان دو سال کا۔ اے بہن شادی کو پورے بارہ سال بھی نہیں ہوئے تھے۔ حساب لگا لو! رجب ایک، رمضان دو...... ہاں عید گزار کر دو ماہ پیچھے میری شادی ہوئی تھی..."

دلچسپ موضوع سے ہٹ کر نیاز کی ماں دُوسری باتیں کرنے لگی تو عورتوں نے اُکتا کر پھر بات کا رُخ بدل دیا۔

"ارے یہ بتاؤ تمہارے میاں نے بادامی سے کب نکاح کیا؟"

نیاز کی ماں نفرت سے بولی۔

"اے نکاح بیاہ کیا۔ پتہ نہیں ہُوا بھی ہے یا یوں ہی رہ رہی ہے۔ مجھ بدنصیب کو تو کچھ خبر بھی نہیں تھی۔ شروع شروع میں تو یہی ہوتا رہا کہ بادامی کی باتوں پر ہم سب ہنسا کرتے تھے، یہ بھی ہنسی مذاق میں شریک ہوتے تھے۔ پھر سپتال سے آنے کے بعد جب اس کلموہی کا ذکر نکلتا تو یہ کھو جاتے۔ اے بہن مجھے کیا پتہ تھا کہ اُس سے چھپکے چھپکے ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ پھر اچانک کسی نے بتایا کہ بادامی کو وہ ایک علاحدہ گھر میں رکھے ہوئے ہیں۔ ایک دن میرے بھائی نے اُن کو بادامی کے ساتھ نکلتے ہوئے دیکھ لیا تو بات کھُلی۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اب عمر بھر ان کی شکل نہیں دیکھوں گی۔ مگر بیٹے کی شادی تھی، کیسے نہیں بُلاتی۔ نیاز کے باپ کو بُلوا دیا تو یہ بھی ساتھ میں لگ گئی۔ ارے ایسی عورتوں میں شرم و حیا تھوڑی ہوتی ہے" اِس وقت پوری محفل کی ہمدردی نیاز کی ماں کے ساتھ تھی۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہُوا تو نیاز کا باپ بادامی کے ساتھ گھر جانے کے لئے تیار ہُوا۔ مگر باہر مردانے میں اُس کے دوست احباب تھے۔ اُس کی تھوڑی میں ہاتھ دے کر محبت بھرے لہجے میں سمجھانے لگے کہ وہ کیوں اپنا بڑھاپا خوار کرتا ہے۔ جوان بیٹے ہیں کسی نے کچھ کر دیا تو کیا عزت رہ جائے گی۔ وقت بے وقت اُن کو اولاد کی ضرورت پڑے گی تو کیا منہ لے کر جاؤ گے۔ جوانی تو جیسی کٹنی سو کٹی۔ پھر ایسی عورتوں کا کیا اعتبار، کیوں ان کے پیچھے اپنا بڑھاپا اور اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔ تمہارے جیسے صاحبِ حیثیت ہیں، اُن کے ساتھ رہو۔ اللہ اللہ کرو۔ اپنی خاندانی بیوی کا ساتھ دو، شریف عورت چاہے کتنی ہی مصیبت کی ماری ہو، شوہر کا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔

اس وقت تو نیاز کا باپ سب سے دامن چھڑا کر بادامی کو ساتھ لے کر چلا گیا مگر جب ٹھنڈے دل سے ان باتوں پر غور کیا تو اس کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی کہ اب وہ مزید محنت مزدوری کے قابل نہیں رہا ہے۔ بچپن سے دمہ کا مریض تھا۔ عمر کے ساتھ مرض بڑھتا گیا اور اب اُسے ایک منٹ کے لئے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ بادامی ابھی جوان ہی تھی اور جوان عورت کو گھر سے باہر نکلتے ہوئے وہ دیکھتا تھا۔ حالانکہ وہ اکثر کہتی تھی "اگر تم اجازت دو تو سپتال میں نوکری کر لوں، بڑی ڈاکٹر مجھے بلا رہی ہے" مگر اُس نے اجازت کبھی نہ دی۔ مگر بیٹے کے گھر جانے کے بعد اُس کی سوچیں بدلنے لگیں۔ اُسے اپنی دُوسری شادی ایک بھول لگنے لگی تھی جس کا خمیازہ پورے دس سال بھگتنا پڑا تھا۔ جوان اولاد کو چھوڑ کر وہ ایک جوان عورت کی رکھوالی کرتا رہے، اُسے یہ منظور نہیں تھا۔ یہ عورت تو پھر ملازمت کر کے پیٹ پال سکتی ہے مگر مجھے اولاد کا سُکھ پھر نصیب نہ ہوگا۔ اس میں اب کیا رہ گیا تھا، پھولی سانس، سر کے بال مٹیالے رنگ کے، جیسے کسی نے راکھ مَل دی ہو۔ پچکے ہوئے گال، سوکھی بانس کی کھپچوں جیسا جسم جو موت کی جانب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اُس کے تصوّر میں اپنے بیٹے کا گھر بار آنے لگا جیسے وہ حُقّے کی نَے سے منہ لگائے، صاف ستھرے رنگین پایوں کے اونچے نواڑی پلنگ پر بیٹھا حُقّہ گڑگڑا رہا ہے۔ اس کی بہو گھونگھٹ کاڑھے، اُس کے لئے چائے کا پیالہ گرم کر کے آ رہی

ہے۔ اُس کی بہو تو پوتے کو کمر پر لٹکائے اُس کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے اللہ بیار بھرے شاکی لہجہ میں اُس چھوٹے شیطان کی شکایت کرنے لگتی ہے۔ وہ چمکار کر بچّے کو گود میں اُٹھا لیتا ہے۔ بچّے کو پیار کرنے کے احساس نے اُس کا منہ میٹھا کر دیا۔ جس کو وہ کڑوا کسیلا کھانے کے بجائے پچھتا رہا تھا کہ خدا معلوم اس وقت کیا مت ماری گئی تھی کہ اتنی آسودہ زندگی چھوڑ کر وہ محنت مزدوری کے لئے در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جوان بیوی کو رکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ کوئی اس کے دل سے پوچھے کہ بادامی نے کبھی اُسے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا لیکن شک کا ناگ ہمیشہ اُسے ڈستا رہتا تھا۔ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر گھر کے کمرے کی دروازوں کو ٹٹول کر دیکھتا تھا۔ وقت بے وقت گھر آکر دیکھتا تھا کہ بادامی حسبِ معمول گھر کے کاموں میں لگی ہوئی ہے یا نہیں۔ مگر وہ اپنے کاموں سے اُکتا کر تھک چکا تھا۔

شادی کے ایک مہینے بعد جب نیاز نئی نویلی دُلھن کو لے کر پنڈی جانے لگا جہاں اُس کی ملازمت تھی تو اُس کی ماں نے بلند آواز سے برادری کے سامنے ایک بار پھر یہ بات دُہرائی۔

" نیاز اور اس کی بیوی کے ساتھ کوئی بڑا بوڑھا ہوتا تو ٹھیک رہتا۔ مَیں کہاں اتنی جانوں کو ساتھ لے کر جا سکتی ہوں۔ نیاز کے بادا کو اپنی جوان بیوی کے نخروں سے فرصت نہیں۔ یہ عورت ایک دن اِن کا خون چوس کر دم لے گی۔ غضب خدا کا اتنے بڑھاپے میں اتنی محنت اور وہ بھی ایسی حالت میں" اُس نے نیاز کے باپ کو آتے دیکھ بات پلٹ دی مگر نیاز کے باپ کو خوب معلوم تھا کہ اُس سے بلاواسطہ کچھ نہیں کہا جا رہا ہے لیکن مخاطب وُہی ہے۔ گویا اب بھی وہ شوہر کی منتظر ہے۔ اس اولاد نے اُسے موہ لیا اور وہ ایک رات بادامی سے پوچھے بغیر کپڑے بکس میں بھر کر نیاز کے پاس آ گیا۔

" بیٹا! مَیں تیرے ساتھ رہوں گا!"

نیاز نے آنکھیں پھاڑ کر باپ کی طرف دیکھا نیاز کی ماں کے چہرے پر فتح مندانہ مسکراہٹ تھی جیسے وہ اپنے شوہر سے چھپانے کے لئے پھیر کر اپنے سونے میں چھپایا دبا کر کشاکش کاٹ رہی تھی۔

بادامی نے چند ہفتے تو نیاز کے باپ کا انتظار کیا۔ اُسے لوگوں کے کہے کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ نیاز کا باپ اُسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اپنے بیٹے کے پاس چلا گیا ہے۔ گو کہ تجربہ اُسے بتا رہا تھا کہ مرد جب چوروں کی طرح گھر سے بھاگتا ہے تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ اُس کا پہلا شوہر تو بنتے بولتے گھر سے گیا تھا، وہ بھی لوٹ کر نہیں آیا۔ اور اب نیاز کا باپ اُسے چھوڑ کر، اپنے سامان لے کر چپکے سے فرار ہو گیا تھا۔ بھلا اُس کی واپسی کی وہ کیا اُمید رکھتی۔

گھر میں تالا ڈال کر اسپتال کی بڑی ڈاکٹر کے پاس آ گئی۔ بڑی ڈاکٹر اس پر ہمیشہ سے مہربان رہی تھی، اُس نے اُس کی پوری رُوداد سُنی، اور تاسُف اور محبت بھرے لہجے میں اُس کی پیٹھ تھپتھپائی اور دَم دلاسا دیا کہ وہ اپنی پُرانی نوکری کو بحال سمجھے۔ اب اُسے رہنے کے لئے دُوسرا ٹھکانہ تلاش نہیں کرنا پڑا۔ اسپتال ہی میں نرسوں کے کوارٹر میں اُسے ایک کمرہ مل گیا تھا۔

ایک طویل عرصے بعد نیاز اور اُس کے بیوی بچّوں سے بوہری بازار میں میری مُلاقات ہو گئی۔ باتوں میں پتہ چلا کہ نیاز کا باپ ہسپتال میں داخل ہے جہاں اُس کی آنکھ آپریشن ہو گا۔ نیاز کی بیوی بتانے لگی کہ چار سال پہلے پوتے کے ساتھ چھت پر آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے نیاز کا باپ پھسل کے زمین پر نیچے گر پڑا تھا اور ایک نوکیلا پتھر اُس کے دماغ میں گھُس گیا تھا جس کی وجہ سے اُس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔ اب وہ اُسے کراچی لایا ہے یہاں اُسے ہسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ وہ تین ہفتے سے آئی بینک کے فیصلے کے منتظر تھے جو اتفاق سے آج ہی آیا ہے۔ آئی بینک کی طرف سے آنکھوں کا عطیہ آنے لگا، وہ آپریشن کر کے اس کی بینائی کو بحال کر دیں گے۔ نیاز بہت خوش تھا۔

" بابا کو نئی روشنی مل رہی ہے ورنہ ساری عمر صدمہ رہتا کہ مُجھ کی وجہ سے بابا اندھے ہو گئے ہیں۔"

اُس نے اپنے آٹھ سالہ بیٹے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ وُہ مجھ سے بھی ہسپتال چلنے کے لئے کہنے لگا۔

" چاچی، تُم اسپتال چل کر بابا کو دیکھو۔ کتنا خوش ہے۔ وہ ہر چیز کو چھو کر پوچھتا ہے مَیں اسے دیکھ سکوں گا۔"

نیاز کی بیوی تریا نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"چاچی، تُم تو میرے میکے کی ہو، ابھی میرے میکے سے کوئی نہیں آیا ہے، تم ہی چل کر بابا کو مُبارکباد دے دو۔ چاچی، وہ نرس ہمارے لئے فرشتہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب بتا رہے تھے کہ اسپتال کی ایک نرس نے اپنی آنکھوں کا عطیہ دیا ہے۔ ابھی تو بیچاری کا انتقال ہوا ہے۔ لاوارث تھی بیچاری۔ اس اسپتال کی بڑی ڈاکٹر نے آنکھوں کے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا کہ اُس بیچاری کی موت ہو گئی۔ اور ہمارے بابا کو زندگی ملی۔"

" اس کی خواہش تھی کہ مرنے کے بعد اُس کی آنکھیں آئی بینک کو دے دی جائیں۔ ہم نے تو اُس غریب کو دیکھا تک نہیں۔ بابا کہتے ہیں کہ اُس بیچاری کی رُوح کو ثواب پہنچانے کے لئے ہم ہر سال قرآن خوانی کیا کریں گے۔ لاوارث جو تھی بیچاری، ہم اُس کے معاوضے میں اور کیا دے سکتے ہیں۔"

مَیں نے آنکھیں پھاڑ کر نیاز کی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی بڑی پلکوں والی خوبصورت، بادامی آنکھوں نے میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ لاوارث عورت معجزاتی طور پر اپنوں تک پہنچ چکی تھی، مگر وہ سب کے سب بے خبر تھے۔ لبوں پر اس کا نام آتے آتے رُک گیا اور مَیں تو معذرت کر کے بُجھے دل کے ساتھ گھر واپس آ گئی۔

ضربِ کاری



راجپوت اقبال احمد

"آج رات ہمیں کسی کو قتل کرنا چاہیے"۔ ہربی بجی ہوئی ٹانگ کو دانتوں سے کپکپا کر اسے نگلتا ہوا بولا۔ اُس نے اپنے دوست رونی کو مخاطب کیا تھا۔ وہ زرد چہرے والا ایک کھلنڈرا نوجوان تھا، وہ سرخ جیکٹ پہنے کاؤچ پر پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے دوست نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ پھر کھلی کھڑکی میں سے چاند نے اندر اُتر آئی۔ دیواروں پر سجی ہوئی نقلی کھوپڑیاں اور افریقی ماسک زیادہ خوف ناک دکھائی دینے لگے۔

ہربی اُٹھا۔ اور مٹی کی ایک کھوپڑی پر ایک موم بتی رکھ کر اسے روشن کر دیا۔ "پھر کیا خیال ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"کس بارے میں؟"

"کسی کو قتل کرنے کے بارے میں"۔

رونی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "کوئی آدمی ہے تمہارے ذہن میں؟" اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں، میں نے خود ابھی اس بارے میں سوچا ہے۔ خاصی دلچسپ بات ہے تفنن کی تفریح۔ مگر میں تمہیں بتا دوں کہ اس کام میں بے انتہا جرأت اور حوصلے کی ضرورت ہے!"

"کیسی رومانٹک بات ہے، ہے نا۔! مگر ہربی، کیا تم سنجیدہ ہو؟"

"بے حد سنجیدہ!" ہربی اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا "کیا خیال ہے تمہارا؟"

"ٹھیک ہے! کب ارادہ ہے؟"

ہربی کمرے کے وسط میں آ کھڑا ہوا۔ "آج رات" اُس نے کہا۔ "جب کرنا ہی ہے تو پھر آج ہی رات کیوں نہیں!"

رونی نے اُٹھ کر گراموفون پر ایک ریکارڈ لگایا، پھر آواز کم کر کے کھڑکی میں کھڑا ہو گیا "کیا منصوبہ ہے؟" اُس نے پوچھا۔

ہربی نے میز کے ایک ڈبے سے پائپ کو بھر کر اسے سلگایا اور چند ثانیوں تک دھواں اُڑاتا رہا۔

"ہمیں یہ کام بے حد احتیاط اور منصوبہ بندی سے کرنا ہے" وہ سوچتا ہوا بولا۔ "آج کل زیادہ تر جرائم بغیر سوچے سمجھے بغیر کسی پیش بندی یا منصوبے کے کئے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے پولیس انھیں ناکام بنا دیتی ہے، اور آخر مجرم کال کوٹھری تک پہنچ جاتا ہے۔ مقاصد بھی قطعی سطحی اور بورژوا قسم کے ہوتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"سو فیصد متفق ہوں تم سے!"

"ہمارا کام ان سب سے مختلف ہے۔ ہمیں ابھی تک اپنے شکار کا بھی علم نہیں ہے" ہربی نے کہا۔

رونی تیزی سے اُٹھا اور باورچی خانے میں دوڑ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ ایک بوتل اور دو گلاس اُٹھائے واپس آ گیا۔

"ہمارے اُس دوست کے نام۔۔۔" وہ چیزیں میز پر رکھتا ہوا بولا۔ "جو ابھی تک ہمارے لئے بھی گم نام ہے!"

دونوں دوستوں نے جام بنا لئے۔ اور آتش دان کے قریب کھڑے ہو کر گھونٹ چڑھانے لگے۔ موم بتی کی روشنی میں ہربی کے سرخ بال سے چمک رہے تھے۔

"کتنی شاندار بات ہے!" وہ بولا "تین ماہ بعد آج میری بیزاری ختم ہوئی ہے۔ ایک عرصے بعد میں جوش و مسرت محسوس کر رہا ہوں، بے مزہ زندگی تھی۔"

کھلی کھڑکی سے آتے ہوئے ہوا کے جھونکے نے موم بتی کے شعلے کو لہرا دیا۔

"تو پھر تم تیار ہو؟" ہربی نے پوچھا۔

"بالکل تیار! اب انتظار مشکل ہو رہا ہے۔"

"آج رات؟"

"فوراً!" رونی جوشیلے لہجے میں بولا۔ "ابھی اسی وقت!"

"ٹھیک ہے! میں نے کام کا ایک خاکہ بنا لیا ہے، ذرا دھیان سے سنو۔" ہربی اس کی طرف جھک گیا۔ پھر سرگوشی میں اسے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا۔

ہیگاس اسکوائر میں رات بھیگ جانے کی وجہ سے زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ کسی کسی بنچ پر بوڑھے مرد اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک نوجوان لڑکی ایک مرد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پارک سے باہر نکل رہی تھی۔ ایک پستہ قد نیگرو بتھر کے مجسمے کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ سڑک پر سے گزرتے ہوئے ٹریفک کے سوا ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

"کیا خیال ہے؟" رونی نے بے چینی سے کہا، پھر سگریٹ کو رگڑ کر بجھا دیا۔ "کہیں اور چلیں؟ گھر ہی چلے چلیں؟ سردی کے مارے میری تو قلفی جم رہی ہے۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔"

"اتنی مصیبت برداشت کرنے کے بعد اب تم اس کام کو ادھورا چھوڑ کر بھاگ رہے ہو؟" ہربی خفگی سے بولا۔

"مگر ہمیں دو گھنٹے تو ہو گئے یہاں آئے ہوئے۔" رونی نے احتجاج کیا۔ "آخر ان میں سے کسی ایک کو مارنے میں کیا حرج ہے؟" اس نے بنچوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔

"آہستہ بولو!" ہربی نے ڈانٹ پلائی۔ "یہ لوگ مجھے ذرا پسند نہیں ہیں۔ یہ سب یہیں کے رہنے والے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی گم ہو گیا تو اُن کے عزیز و اقارب طوفان کھڑا کر دیں گے۔ ہمیں کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو قطعی اجنبی ہو جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ نہ دوست، نہ رشتے دار! یہ ہے میرا منصوبہ! سمجھے!"

"ٹھیک ہے!" رونی نے ہتھیار ڈال دیے۔ "مگر رات زیادہ ہو رہی ہے۔"

"خاموش رہو، اور اگر جانا چاہو تو تم چلے جاؤ، بزدل کہیں کے! میں اکیلا ہی یہ کام کر لوں گا یا اگر ٹھہرنا ہے تو پھر خاموش رہو۔"

"تو اتنے ناراض کیوں ہو رہے ہو؟" رونی منہ پھلا کر بولا۔

دونوں بنچ پر خاموش بیٹھے لوگوں کو ایک ایک کر کے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

"ٹھیک ہے۔" آخر ہربی نے کہا۔ "شاید آج کی رات قسمت یاوری نہ کرے۔ بس دس منٹ اور... اگر اس دوران میں کوئی ڈھنگ کا شکار نہیں ملا تو ہم چلے چلیں گے۔"

دس منٹ بھی گزر گئے۔ رات کچھ اور سرد ہو گئی۔ وہ اٹھے اور مردہ قدموں سے پارک کے گیٹ کی طرف چل دیے۔ فوارے کے پاس سے گزرتے وقت انھوں نے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

"ششش!" ہربی بولا۔ "ٹھہرو۔"

آدمی قریب آ گیا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا مگر اس کی آنکھوں میں جوانوں کی سی چمک تھی۔ اس کے دانتوں میں سگار دبا ہوا تھا اور جسم پر پھٹے پرانے کپڑے جھول رہے تھے۔

ہربی نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا مگر آس پاس کوئی نہیں تھا۔

"گڈ ایوننگ جناب!" وہ بولا۔

"ایوننگ لڑکو!"

"خاصی رات گزر گئی ہے! ہے نا جناب!"

"شاید!" بڈھا اپنی ناک کھجاتا ہوا بولا۔ "کسی کے لئے خاصی گزر گئی ہے، کسی کے لئے ابھی شروع ہوئی ہے۔"

ہربی ہنسا۔ "خوب بات کہی جناب!"

بڈھے نے سر ایک جانب جھکا کر دونوں کو گہری نظروں سے دیکھا۔

"لڑکو! کیا جیب میں کچھ رقم ہے؟" وہ بولا۔ "مجھے ایک دو پیگ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

ہربی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "کیا رات گزارنے کا ٹھکانا بھی نہیں ہے جناب؟" اس نے پوچھا۔

"ہوتا تو کیا میں سردی میں سرگشت کرتا نظر آتا؟ اگر چہ دو چار ڈالر ہوتے تو یقیناً رات گزارنے کا آسرا ہو جاتا۔"

"کیا کوئی دوست بھی نہیں ہے؟"

"نہیں!" بڈھے نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "سارے ہی قبروں میں جا سوئے۔ اس طرح کم از کم انھیں ایک مستقل ٹھکانا تو مل گیا۔"

ہربی نے بڈھے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بہت افسوس ہوا یہ سن کر! کیا زمانہ آ گیا ہے!" وہ بولا۔

"اگر الزام ہی دینا ہے تو اس عورت کو دو جو مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ گئی۔" بڈھے نے منہ بنا کر کہا۔

"کیا کوئی رشتے دار تھی؟" رونی نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں نہیں! بیوی تھی مری۔ یا یوں سمجھو کہ ہونے والی تھی۔ میں ایک سفری سیلزمین تھا اور اپنی بیمار ماں کی خدمت کر رہا تھا کہ..... خیر اب یہ تو پرانی داستان ہو گئی ہے۔ تم کہو، دو ڈالر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

ہربی نے معنی خیز نظروں سے رونی کی طرف دیکھا۔ "سنو!" وہ بڈھے سے بولا۔ "ہمارے پاس فی الحال تو کچھ بھی نہیں ہے، لیکن رات گزارنا چاہو تو ہمارے گھر چل سکتے ہو، ہمیں بے حد خوشی ہو گی۔ بہتر ہو گا کہ میں اپنا تعارف کرا دوں مسٹر....."

وہ کار کی طرف بڑھنے لگے جو سنسان سڑک کے کنارے اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی۔

"فیگارنی" بڈھے نے اپنا نام بتایا جو وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے پہلی بار اپنا نام بتا رہا ہو۔

"میں آرتھر شو بہار ہوں۔" ہربی نے کہا۔ "اور یہ میرا دوست فریڈ بیلفے ہے۔"

"تم سے مل کر مجھے خوشی ہوئی لڑکو۔"

وہ تینوں کار میں بیٹھے ہوئے تاریک کالونی پرانے مکانوں اور ویران ہوٹلوں کے سامنے سے گزرتے رہے۔ انھیں ایک بھی آدمی نظر نہیں آیا۔

"اگر ہم تمہیں یہیں چھوڑ جاتے مسٹر فیگارنی، تو ہمیں ہرگز نیند نہ آتی۔" ہربی نے کہا۔ "ہمیں رات بھر تمہاری تنہائی اور بے سر و سامانی کا خیال ستاتا رہتا۔" اس نے رونی کو کہنی ماری۔

"تم بہت اچھے لڑکے ہو۔" بڈھا بولا۔ "بہت مہربان۔ ویسے کیا تمہارے گھر پر کھانے پینے کے لئے بھی کچھ ہوگا؟"

"یقیناً! ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ ہم تمہیں بھوکا نہیں سونے دیں گے۔" ہربی جلدی سے بولا۔

کار تاریک راستوں سے گزرتی ہوئی آخر ایک جگہ رک گئی۔

"یہ تو بڑی اچھی جگہ ہے۔" بڈھا کار سے اتر کر چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ مکان تک جانے والے راستے پر دونوں جانب نوکدار پتوں والے درخت چاندنی رات میں کھڑے جھوم رہے تھے۔ درختوں کے بعد دور تک جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

"تمہیں یہ جگہ پسند ہے؟" ہربی نے پوچھا۔ "کسی زمانے میں یہ جگہ ایک مذہبی فرقے کی جاگیر تھی آج کل یہ خالی پڑی ہے۔ اسے "موت کا راستہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ لوگ یہاں اپنے مردہ رشتہ داروں کی روحوں سے باتیں کرنے آیا کرتے تھے۔"

"تم.... تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟" بڈھا گھبرا کر بولا۔ "یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟"

"ہم یہیں رہتے ہیں۔"

ایک موڑ سے گزرتے ہی وہ ایک بھاری دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ اس کے اوپر شیشے کی کھڑکی تھی جس پر ایک عجیب سا نشان بنا ہوا تھا۔ وہ ہال میں آ گئے۔ پھر راہداری میں کئی چھوٹے چھوٹے دروازوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ایک کمرے میں پہنچ گئے۔

"یہ ہے ہمارا گھر۔" ہربی نے کہا۔ "بڈھا حیرت بھری نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا

"کیا پیو گے؟" مارٹینی؟ جن؟ اسکاچ؟" ہربی قدرے توقف سے بولا۔

"کتنے حسین نام ہیں!" بڈھا ہونٹ چاٹنے لگا۔ "مگر کیا پہلے کچھ سینڈوچز یا کھانے کی کوئی اور چیز نہیں مل سکتی؟"

"ضرور" ہربی نے کہا اور رونی کو اشارہ کیا دونوں باورچی خانے میں آ گئے۔

"دیکھو رونی، ایک مکمل جرم کے لئے بے حد احتیاط اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب تم سینڈوچز لے کر آؤ میں اسے شراب پلاتا ہوں۔"

بڈھا ایک کرسی پر ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ پیٹ پر باندھ رکھے تھے۔ "شکریہ اچھے لڑکے" اس نے ہربی کے ہاتھ سے وہ جام لیتے ہوئے کہا اور پھر ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

"اور لو! جتنی چاہو لو۔"

"اوہ، شکریہ۔"

رونی ٹرے لے کر آیا اور بڈھے کے سامنے رکھ دی۔ "یہ کھا کر تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے کہا۔

بڈھا فوراً ہی سینڈوچز پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

"ہمیں باورچی خانے میں کچھ کام ہے۔" ہربی بولا۔ "ہم کچھ دیر کے لئے معذرت چاہتے ہیں۔"

دونوں باورچی خانے میں آ گئے اور دروازہ بند کر لیا۔

"پہلے اس خوشی میں ایک ایک جام ہو جائے۔" رونی جوش میں بولا۔ پھر الماری میں سے ایک بوتل اور دو گلاس نکال لئے۔ "فیگارنی کے نام۔"

ہربی نے مسکرا کر گلاس اٹھا لیا۔

"دیکھو ہربی، تم نے ابھی تک یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ہم اسے کیسے قتل کریں گے!" رونی نے کہا۔

ہربی نے خالی خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر گلاس میز پر رکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں!" وہ بڑبڑایا۔ "یہ سوچنے کی بات ہے۔ ہم اسے شوٹ کیوں نہ کر دیں؟ کیا خیال ہے؟"

"اوہ نہیں ہربی، آج کل قتل کا یہ طریقہ بہت عام ہے۔ اس کے علاوہ اس سے شور بھی ہوگا۔ کوئی بھی ادھر متوجہ ہو سکتا ہے۔"

یہ جواب سن کر ہربی نے ایک دراز کھولی اور گوشت کاٹنے کی چھری نکالی۔ رونی کانپ گیا۔ "کیا خیال ہے؟" ہربی اس کی طرف دیکھ کر

"ٹھیک ہے مگر..... مگر اس طرح بہت خون نکلے گا اور ہم اسے صاف بھی نہیں کر سکیں گے۔ پولیس کسی نہ کسی طرح دھبے ڈھونڈ ہی لے گی۔"

ہربی نے ناگواری سے منہ بنایا اور چھری دراز میں رکھ دی۔ پھر اس نے دوبارہ دونوں گلاسوں میں شراب انڈیلی۔ کمرے سے کھانا کھانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"ہربی میری سمجھ میں ایک ترکیب آ گئی ہے۔"

"آہستہ بولو، کیا ترکیب؟"

رونی دھیرے سے بولا۔ "تمہیں وہ مجسمہ یاد ہے جو ہم نے چند ماہ پہلے خریدا تھا؟"

"کون سا؟ کیوپڈ والا؟"

"ہاں! اور تمہیں یاد ہے کہ وہ کتنا وزنی ہے"

ہربی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "اوہ ہاں! ہم بڈھے کا سر پھاڑ دیں گے۔"

"کیوپڈ کے مجسمے سے سر پھاڑنا" وہ ہنس اٹھا۔ "کیسی مزے کی بات ہے، ہے نا؟"

انھوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور دوبارہ کمرے میں آ گئے۔

بڈھے نے ایک زور دار ڈکار لیا اور کہنے لگا۔ "ایک بوڑھے آدمی کا دلی شکریہ قبول کرو۔ میں واقعی اس پرلطف دعوت کے لئے شکر گزار ہوں۔ اب مزید کچھ پینے پلانے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یقیناً مسٹر فیگارلی!" ہربی نے نئی بوتل کھولی اور تین گلاس بھر دیئے۔

"بد قسمتی امریکی لڑکوں کے نام!" بڈھے نے گلاس اُٹھا کر کہا اور اسے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس نے گلاس خالی کر کے اسے دوبارہ بھر لیا۔

"ایک عرصے بعد اتنی شاندار چیز پینے کو ملی ہے" وہ بولا۔ "سنو' بے حد شاندار مکان ہے تمہارا' یہ تصویریں' یہ فوارے' یہ پردے' یقیناً یہ چیزیں بے حد قیمتی ہوں گی۔"

"ہاں!" ہربی نے ناگواری سے کہا۔ "میرے والدین امریکہ کے بڑے سرمایہ داروں میں سے تھے: مجھ سے دولت مند! مجھے بھی کبھی کبھی ایک ہاتھی جیسا لگتے ہیں۔"

"اس کے عوض یقیناً تم اُن سے محبت کرتے ہوگے!"

"یہ اُن سے نفرت کرتا ہے!" رونی نے کہا۔ بڈھے نے گلاس حلق میں انڈیل کر ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ تصویر میں ایک گنجا آدمی ترچھی نظروں سے دائیں طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیسی مزاحیہ تصویر ہے!" وہ بولا۔

"پکاسو کی ہے۔ اصلی تصویر۔ اور ہیوڈ!" ہربی نے کہا اور کونے میں سجے ہوئے بھاری مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے مزید بولا۔ "مسٹر فیگارنی' ایک بار ہم پھر معذرت خواہ ہیں' ذرا ان برتنوں کو دھو لیں' پھر تمہیں تمہارا بستر دکھا دیں گے۔ نہیں تم بیٹھے رہو' ہم ابھی آئے۔"

باورچی خانے میں آتے ہی ہربی نے سرگوشی کی۔ "اب؟"

"اب کیا؟"

"میرا مطلب ہے کہ اب ہمیں کس بات کا انتظار ہے؟"

"اوہ!" رونی بولا۔ پھر باورچی خانے کی میز پر رکھی ہوئی بوتل سے ایک گلاس میں شراب انڈیلی جس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ "تم اسے ابھی مارنا چاہتے ہو؟"

"اور کیا؟" اس نے کہا پھر کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کی مگر پیچھے پھسل گیا۔

"وہ نشے میں دُھت ہے" اس نے نیچے ہو کر کہا۔ "اُسے احساس بھی نہیں ہوگا کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے"

کمرے سے بوڑھے کی بھاری آواز سُنائی دی۔ وہ کوئی گیت گا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے" رونی نے کہا۔ "مگر ذرا ایک ایک جام اور پی لیں۔"

"ہاں ایک ایک جام اور" ہربی نے تائید کی۔ "فیگارنی کی موت کے نام!"

جن کی بوتل خالی ہو چکی تھی۔ رونی اسکاچ کی نئی بوتل نکال لایا۔

"کیا تم ٹھیک ہو مسٹر فیگارلی؟" ہربی نے پکار کر پوچھا۔

"بہت مزے کی رات ہے.... بہت مزے کی رات ہے" بڈھا نشے میں چُور گانے میں مست تھا۔

"بے چارہ بڈھا!" رونی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اُسے علم ہی نہیں ہے کہ اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے"

"رونی' بدصورت!" ہربی نے ڈانٹا۔ "آخر تم ایک آدمی کو قتل کرنے والے ہو!"

رونی کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ "کون؟" اُس نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

"تم' اور کون؟"

رونی نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا۔ "سنو ہربی ایک منٹ!"

"کیا بات ہے؟ اب مجھ سے یہ نہ کہنا کہ تم آخری وقت میں اِس کام سے ہاتھ اُٹھا رہے ہو۔"

"یہ کون کہہ رہا ہے؟"

"آہستہ بولو پاگل بندر' وہ سُن لے گا۔ بہتر ہوگا کہ تم جا کر اِس کام کو تمام کر دو۔ آخر اتنا کام تو میں نے کر ہی دیا ہے۔ اب کیا تم میرے شریک کار بننا نہیں چاہتے؟ کیا تمہارے دل میں بے ایمانی آ گئی ہے؟"

"اوہ نہیں تو.... نہیں تو ہربی!"

"پھر کیا بات ہے؟"

"ہم تھوڑی دیر اور انتظار کر لیں۔"

"ناممکن!" ہربی بولا۔ "صبح کے چار بجے والے ہیں اور ہمیں لاش کو ٹھکانے لگانے کے لئے بھی وقت درکار ہوگا۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ بس ایک جام اور....!"

ہربی نے اُس کے گلاس میں اسکاچ انڈیلی' اور بڈھے کو دیکھنے کمرے میں چلا گیا۔ رونی نے جلدی سے گلاس خالی کر دیا۔

"کیا بات ہے؟" ہربی کو دوبارہ اپنے قریب پا کر اس نے پوچھا "اُس کی آواز کیوں نہیں آ رہی؟"

ہربی مُسکرایا۔ اُس کے ہاتھ میں بھاری مجسمہ تھا "گیا کام سے!"

"کیا.... کیا مطلب؟ کیا تم نے اُسے....؟"

"رونی میرے دوست' یہ تمہارا کام ہے کیا میں تمہیں دھوکا دے سکتا ہوں؟"

"ہربی! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں!"

"ضرور کہو دوست!"

"میں تمہیں اِس تجربے سے محروم نہیں کرنا چاہتا ہربی! تم قتل کر دو اسے!"

"ایسی قربانی مجھے متاثر نہیں کر سکتی دوست! اپنا اپنا کام خود کرو یہ بات طے ہو چکی ہے۔ یہ لو مجسمہ! اگر تم نے زوردار چوٹ ماری تو بس ایک ہی ضرب میں کام تمام ہو جائے گا بڈھے کا!"

رونی نے تھوک نگلا۔ "پھر ایک جام اور!" وہ بولا۔

"ہاں اِس نئے تجربے کے نام پر!"

"نئے تجربے کے نام پر!"

اسکاچ کی بوتل آدھی خالی ہو گئی۔ رونی نے مجسمہ اٹھایا اور مارنے کے سے انداز میں دو تین بار فضا میں لہرایا' پھر اِس کا توازن بگڑ گیا اور وہ باورچی خانے کے فرش پر دھپ سے بیٹھ گیا۔

"ہربی!" رونی ذرا دیر بعد ہانپتا ہوا بولا۔ "میں نے ابھی ابھی ایک بات سوچی ہے۔ میں اُسے قتل نہیں کر سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں ابھی تک اکیس برس کا نہیں ہوا!"

"بزدل!" ہربی چلّایا اور اس کے ہاتھ سے مجسمہ چھین لیا۔ "دھوکے باز بزدل!"

(باقی آئندہ)

مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات

کے موقع پر

اُتر پردیش اُردو اکادمی کی عظیم پیشکش

چار ہزار سے زیادہ صفحات پر مُشتمل

مولانا آزاد کے مَشہورِ زمانہ جریدے

الہلال

کی مکمل فائلوں کا عکسی ایڈیشن

جلد منظرِ عام پر آرہا ہے

(اس میں "البلاغ" کی جلد بھی شامل ہے۔)

مُقدمہ

ڈاکٹر محمود الٰہی

سائز ۳۰×۲۰/۴   رنگین کی پختہ جلد   نفیس کاغذ

قیمت مکمل سیٹ تین حصّوں میں ۔/۶۰۰ روپے

हिन्दी अकादमी, दिल्ली

ہندی اکادمی دِلی

مقاصد

دِلی کی ادبی و ثقافتی ترقی کے ضمن میں ہندی زبان و ادب کی ترتیب و تہذیب ادبی اور تعلیمی اہمیت کی بُنیادی ہندی تخلیقات کی اشاعت اور ایسے اہم ترین ادب کو فروغ دینا جو اب تک شائع نہ ہو سکا ہو۔ اہم اور مُفید ادب، نیز سائنسی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ۔ اس کے تحت اُن تخلیقات کو شامل کیا جائیگا جو ثقافتی ہم آہنگی اور قومی جذباتی ہم آہنگی کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ ترین ادب کی صف میں آتی ہوں۔ ہندی میں حوالہ جاتی ادب تیار کرنے کے ساتھ ساتھ، ضرورت پڑنے پر درسی کُتُب کی ترتیب و اشاعت کا انتظام۔ دِلی میں دستیاب ہندی کے بہترین ادب کی ترتیب جو عدم تحقیق کے باعث دستیاب نہ ہو سکا، پامالی کی کے سبب عرصۂ التوا میں پڑا ہو، اس کے تحت ہندی کے قدیم مسوّدات کی تلاش اور اُن کی اشاعت کا انتظام بھی شامل ہوگا۔ دِلی کی عام زندگی سے مُتعلق ادب کی ترتیب و تہذیب و اشاعت جس میں لوک ادب بھی شامل ہوگا۔

دِلی کی تاریخی، سماجی اور ثقافتی اہمیت کے پس منظر میں پنجابی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی اچھی تخلیقات کا ہندی میں ترجمہ، اس کے تحت فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے مُتعلق مختلف زبانوں کا ادب بھی شامل ہوگا۔ بہترین تخلیقات کی اشاعت کے لئے ایسے ادیبوں کو مالی امداد فراہم کرنا جو خود اشاعت کا انتظام کرنے کے اہل نہ ہوں۔ ہندی کی بہترین تخلیق کے لئے ہر سال ایوارڈ کا انتظام کرنا۔ دِلی کے بزرگ ہندی کے بلند پایہ ادیبوں اور مُعزز عالموں کی خدمات کا اعتراف۔ ہندی کے میدان میں تحقیق کرنے والے اور تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کو مُراعات فراہم کرنا۔ ضرورت پڑنے پر رسالہ یا جریدہ کی اشاعت کرنا۔ ہندی زبان کے اعلیٰ پایہ کے مرحوم ادیبوں کی جینتیوں کا انعقاد کر اُن کی تخلیقات کے بقاء و تحفظ اور تشہیر کا انتظام کرنا۔ ہندی زبان اور ادب کی ترقی کے لئے وقت وقت پر بھاشا سمیلن اور وچار گوشٹی وغیرہ کا انعقاد۔ ہندی کی ترقی کی مختلف کارگزاریوں سے مُتعلق کام کرنا، راج بھاشا کی شکل میں ہندی کی ترقی اور عوام کے استعمال کے لئے تکنیکی ڈکشنری اور ہندی کی نشر و اشاعت سے مُتعلق ادب کے لئے مُناسب و موزوں اقدامات کرنا۔ دِلی کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں ہندی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طلباء کے لئے وظیفہ وغیرہ کا انتظام کرنا۔ ایک ایسی لائبریری کا قیام عمل میں لانا، جس میں ہندی ادب کی بُنیادی تخلیقات، حوالہ جاتی کُتُب، ڈکشنریز اور ہندی ادب کی تنقیدی کُتُب دستیاب ہوں۔ ہندی کی نشر و اشاعت کے لئے کام کر رہے ایسے خود کار اداروں کو امداد فراہم کرنا جن کی خدمات واقعی میں ہندی ادب کی ترقی کے نقطۂ نظر سے اہم ہوں۔ عوام خاص کر بالغان کے لئے ایسے ادب کی تخلیق جو سماجی، ثقافتی اور تاریخی روایات کا حامل ہو۔ ہندی زبان کی تعلیم اور ترجمہ اور دفتری انتظامیہ کی تربیت کی سمت میں مُناسب کارروائی کرنا۔ ہندی زبان اور ادب کی خدمات میں وسائل، رُسوخ اور زندگی کے شعبہ ہائے جات کو لگانے والے ادیبوں کے لئے ساہتیہ کار پینشن کا انتظام کرنا۔

ڈاکٹر نارائن دت پالیوال
سکریٹری ہندی اکادمی دِلی :
۷۶/۷۷۔ اے، سلائٹ انشورنس بلڈنگ
آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰۔

فون نمبر: ۷۳۳۹۵۰۔

مستقل کالم

شخصیات، واقعات، تاثرات،

سرور تونسوی

ہوشیار پور کا پرنس آف ویلز

ساحرؔ ہوشیار پوری خدا کے فضل و کرم سے اس وقت عمر کی ۷۷ ویں منزل بخیر و خوبی طے کر رہے ہیں۔ اور جس رکھ رکھاؤ کے ساتھ وہ محتاط زندگی گزار رہے ہیں، وہ سو سال تک زندہ رہنے کا یقینی طریقہ ہے۔

ساحرؔ ہوشیار پوری جب کالج میں پڑھتے تھے تبھی اُن کی زندگی میں ہر قسم کی ہنگامی صورتِ حال عُود کر آئی تھی۔ شاعری ہو یا تعلیم، حُسن و عشق کا معاملہ ہو یا ازدواجی زندگی کا حسبِ منشا فیصلہ، دوستی ہو یا دوست نوازی، انہوں نے ہر معاملے کو انتہائی مقام تک پہنچایا اور پچیس سال کی عمر تک زندگی کا ہر کھیل نہایت خوش سلیقگی اور خوش معاملگی نیز دلبرانہ انداز میں کھیلا۔

ایڈورڈ ہشتم کا من پسند شادی کے باعث تخت و تاج کو تلانجلی دینا تمام دُنیا میں حُسن و عشق کی کامیابی و کامرانی کا مژدہ سُنانے کا باعث ہُوا۔ چونکہ ایڈورڈ ہشتم نے سلطنتِ برطانیہ ایسی بادشاہت کی بجائے اپنی دلی خوشی کو مقدم سمجھا۔ چنانچہ ایک بادشاہ کے اس اقدام کو لازوال شہرت ملی، مگر نہ معلوم کتنے غریب اپنے دل کی خوشی کے باعث حُسن و عشق کی راہ میں گردِ راہ بن گئے، چونکہ ایڈورڈ ہشتم کی طرح عالی مرتبت ہستی نہیں رکھتے تھے، اس لئے اُن کے حُسن و عشق کے جانفزا قصّے محض اُن کی اپنی ذات تک ہی ختم ہو کر رہ گئے۔

ہمارے ساحرؔ ہوشیار پوری بھی ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو ہوشیار پور میں آج بھی اوہری خاندان کے نام سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ آج سے نصف صدی پہلے اس خاندان کا جو جاہ و جلال ہوگا، اُس کا اندازہ ہوشیار پور میں اس خاندان کی جائیداد دیکھ کر اب بھی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

ساحرؔ ہوشیار پوری اپنے والد کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں اور اپنے باپ کے اس پرنس آف ہوشیار پور نے بھی اوہری خاندان کی شان و شوکت، لاکھوں کروڑوں کی جائیداد، وسیع کاروبار کی سربراہی، خاندانی وجاہت، شہرت اور عام اخلاقی قدروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے دل کی خوشی پر اِن سب کو قربان کر دیا اور حُسن و عشق کی لازوال قدروں کو وہ جلا دی کہ ان کی دُنیائے واقعیت کے حُسن و عشق کے دیوانے نعرۂ تحسین بلند کرنے پر مجبور ہو گئے۔

کونسی آفت تھی جس نے ساحرؔ ہوشیار پوری پر یورش نہیں کی۔ کونسا اخلاقی پہلو تھا جسے یار لوگوں نے شمشیر و سناں کے طور پر استعمال نہ کیا۔ کونسی افواہیں تھیں جو ساحرؔ پر طوفانِ بدتمیزی برپا کرنے جیسی ہوں۔ کونسا عزیز و رشتہ دار تھا جس نے پند و نصائح کے پردے میں اپنے خبثِ باطن کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔

مگر اس دُھن کے پکّے، دھیو نے اپنے دل کی آرزو میں ان سب مناسب یا نامناسب کو نظر

اور اس طرح فرق کر دیا کہ سب اپنا سامنہ لے کر رہ گئے اور خصوصاً تقسیم ملک کے ساتھ ساتھ ساحر ہوشیارپوری کو بھی اپنے وطن مالوف ہوشیارپور کو خیرباد کہہ کر اپنے ملک میں ہی بے سروسامانی میں ادھر سے اُدھر بھٹکنا پڑا۔

شہزادوں کی طرح زندگی گزارنے والا یہ نوجوان کسمپرسی کے عالم میں بھی پرخلوص اس کو قائم رکھے ہوئے کبھی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کر سکا۔ بقول ؎

آگے کسی کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

اور کبھی نہ کسی طرح کا شکوہ نہ گزارش کی۔ ارشاد کو ساتھ لے کر ماہنامہ "چندن" جاری کرنے میں کامیاب ہو گیا اور "چندن" اپنے معیار کے اعتبار سے اشاعت کے بیشتر ماہناموں میں ممتاز تھا۔ کچھ عرصہ بعد نامساعد حالات کے پیشِ نظر اُنھیں یہ دلّی کو مسکن بنانا پڑا۔ اور دلّی کی ادبی مجلسی اور شعری دنیا میں ایسی پہچان کے ساتھ اُبھرے کہ رہتی دنیا تک اُردو اُنھیں نہ بھلا سکے گی۔

- - - - - - - - - - -

شعر و ادب کی جو خدمت ساحر ہوشیارپوری نے کی، اس کی داد بھی اُنھیں بھی بھر کر ملی۔ متعدد ایوارڈز اور توصیفی اسناد، جو ساحر صاحب کو مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرف سے دیئے گئے، اُن کی تفصیل میں اگر جایا جائے تو اس طویل فہرست کے لئے وقت درکار ہوگا۔

ان کے کئی مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں، جو شائقین میں بے حد پسند کئے گئے۔

مشاعروں میں تحت اللفظ کلام سنانے کے باوجود جو داد اُنہیں ملتی ہے، وہ گلے باز شاعروں کو بھی نہیں ملتی۔

ساحر صاحب نے زندگی میں جن کسی سے تعلقات بنائے، وہ اب تک اُنہیں اسی طرح نبھا رہے ہیں۔ آج تک اُنہوں نے کسی کو شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ بلکہ اُن کے فرضی دشمن بھی اُن کے اخلاق اور شیریں بیانی کی تعریف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

آجکل ساحر صاحب فرید آباد میں مقیم ہیں، قریب قریب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں ——

دُعا ہے کہ خدا اُنہیں عمرِ طویل دے، تا۔ یہ اسی طرح اُردو شاعری کو مالامال کرتے رہیں

غزلیں

مشغلِ حسنِ صنم دل میں اگر ہو
کہکشاں اپنی راہِ سفر ہو

منزلوں سے جو خود بے خبر ہو
راہبر کیسے وہ معتبر ہو

کس میں دم ہے جو پرواز رکھے
ہاں مگر قوتِ بال و پر ہو

زخمِ دل کس طرح مندمل ہوں
جبکہ ظالم ہی خود چارہ گر ہو

درحقیقت وہی ہے مسافر
جس کو لٹنے نہ مرنے کا ڈر ہو

زندگی کا وہی مستحق ہے
جس کی دونوں جہاں پر نظر ہو

فخرؔ ممکن ہے سوزِ عمل سے
ذرّۂ خاک مثلِ قمر ہو

فخرؔ واسدی قنوجی

کیا مجھ سے ہوئی یا اب وہ لغزشِ مستانہ
دنیا مجھے کہتی ہے دیوانہ ہے دیوانہ

کیوں منبر و مسجد میں ہر وقت تنازع ہے
میخانے میں ہر سو ہے یارانہ ہی یارانہ

دل والے نکل آئے سر لے کے ہتھیلی پر
کیا جانیے سُولی پر کیا کہہ گیا مستانہ

یوں ہی نگاہوں سے دیکھے نہ سمجھے کوئی
ہے تنگ نظر دنیا بن جائے گا افسانہ

کیا فرق ہے دونوں میں سجدہ ہی تو کرنا ہے
مسجد میں ہے سناٹا، رونق پہ ہے میخانہ

گر جلتی رہی یوں ہی ہر شاخ نشیمن کی
اک روز چمن سارا ہو جائے گا ویرانہ

کہتا ہے "محبت کا" میں نام نہیں لوں گا
قرباںؔ وفاؤں سے اب ہو گیا بیگانہ؟

ڈی۔ اے۔ یسین قرباںؔ

اب بھی تم خود کو بُرائی سے بچا لو یارو
نیکیاں کچھ تو زمانے میں کما لو یارو

گردشِ وقت نے کھایا نہیں مجھ پہ تو ترس
تم ہی بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لو یارو

مفلسی زیر و زبر جس سے ادب کی ہو جائیں
ایسی تہذیب کی بنیاد نہ ڈالو، یارو

دوستی چمکے گی اور رنگِ وفا نکھرے گا
پہلے سینے سے کدورت تو نکالو یارو

چاک داماں تو نظر آتا ہے غیروں کا تمہیں
اک نظر اپنے گریباں پہ بھی ڈالو یارو

فیض پہنچا نہیں سکتے ہو اگر تم اُن کو
بددعائیں بھی غریبوں کی تو نہ لو یارو

یاد گے مجھ کو ہر اک حال میں صابر ہی عروجؔ
حسرتیں خوب تم جی بھر کے نکالو یارو

عروجؔ نفیسی جہانسوی

بابِ انتقاد

تصویرِ غالب: ڈی۔ اے۔ ہیرسن قربان
۱۹۸۸ء۔ سائز: ۲۰×۳۰/۱۶۔ صفحات: ۱۶۸۔
قیمت: ۲۰ر روپیہ۔

مسیحی شعراء اور اُدباء میں مسٹر ڈی۔ اے۔ ہیرسن قربان کا ایک الگ ہی مقام ہے اور یہ متعدد شعری اور نثری مجموعوں کے مصنف اور مرتب ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے "تصویرِ غالب" عنوان سے ایک ڈراما تصنیف کیا ہے جو مرزا غالب کی زندگی کی عکاسی بخوبی کرتا ہے۔ اور غالب پر یہ ڈرامہ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے منصۂ شہود پر آیا ہے۔

غالب اور اقبال پر اتنا لکھا گیا ہے کہ اب کوئی گوشہ ایسا دکھائی نہیں دیتا کہ ان دونوں حضرات پر کچھ لکھا جائے، مگر قربان صاحب نے غالب پر یہ ڈرامہ لکھ کر ایک نئی راہ نکالی ہے جس پر چلتے ہوئے انہوں نے غالب کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

تحقیقی مباحث: پنڈت رتن پنڈوروی۔
۱۹۸۸ء۔ ڈیمائی سائز۔ صفحات: ۱۹۲۔
قیمت: ۷۵ر روپیہ۔
ناشر: ہندوستان پبلی کیشنز

ہندوستانِ قدیم اور فنونِ جنگ۔ چندر بھان رائے برہمن۔ افتخار الملک حضرت دِل شاہجہانپوری کا رنگِ تغزل۔ ادبیاتِ سنسکرت اُردو تغزل۔ ہندی اور اُردو۔ ہندی اور مسلمان۔ ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی کی نظم گوئی۔ فنِ تاریخ گوئی میں حروف کے عدد۔ خزینۂ لغاتِ اُردو زائد۔ میں شعر کیونکر کہتا ہوں۔ حیرت کدہ وغیرہ

ایسے انتہائی علمی، ادبی اور تعلیمی مسائل پر جس عالمانہ انداز سے تحقیقی بحث کی گئی ہے، وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

ہر اچھی لائبریری، خواہ وہ پبلک لائبریری ہو، یا یونیورسٹی یا کالج کی، اُس میں اس کتاب کا ہونا جہاں ایک نہایت ہی بلند پایہ کتاب کا اضافہ ہوگا، وہاں اسکالروں اور بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلباء کے لئے بھی یہ کتاب ایک نعمت سے کم نہیں ہے، کیونکہ ایسی مفید اور کارآمد کتابیں کبھی کبھی ہی شائع ہوتی ہیں۔

اعلیٰ ادبی، علمی ذوق رکھنے والوں کی ذاتی لائبریری کے لئے بھی یہ کتاب ایک عطیۂ خداوندی کا درجہ رکھتی ہے

"ایوانِ اُردو" مولانا آزاد نمبر

دِلّی اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے ماہنامہ "ایوانِ اُردو" کا مولانا ابوالکلام آزاد نمبر شائع ہوا ہے۔ اس میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ اس وقت تک جن رسائل و جرائد نے مولانا آزاد پر خصوصی شمارے پیش کئے ہیں ان میں "ایوانِ اُردو" کا "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر" ہر لحاظ سے بہترین، قابلِ تعریف اور قابلِ مطالعہ ہے۔ مولانا کے تحریر کردہ تیس صفحات حال ہی میں جو ریلیز ہوئے ہیں، ان پر سیر حاصل تبصرہ پڑھنے کی چیز ہے اور دیگر مضامین بھی اپنی اپنی جگہ نہایت موزوں اور مولانا کے شایانِ شان ہیں۔

اِن جملہ صفات کے باوجود اِس نمبر کی قیمت صرف چھ روپیہ ہے، جبکہ اِس خصوصی نمبر کی ایک کاپی پر نصف کیلو سے زائد وزن کا کاغذ بھی استعمال ہوا ہے۔ اگر کوئی غیر سرکاری ادارہ ایسے خصوصی نمبر کی اشاعت کا حوصلہ کرتا تو اس شمارہ کی قیمت کم از کم پچیس روپیہ ہوتی۔ مگر دِلّی اُردو اکادمی نے اِس خصوصی نمبر کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچانے کے لئے اصل لاگت سے بہت کم قیمت رکھ کر اپنے فرائض کی ادائیگی بڑی خوش اسلوبی سے کی ہے۔ (ادارہ)

مَن کُنتُ مکتوب الیہ

محترم جناب سرور تونسوی صاحب۔
السلام علیکم!

"یہ کیسے یار......" بلی۔ میں نے پڑھی اور میرے علاوہ ریاض میں اُسے متعدد صاحبِ ذوق حضرات نے پڑھا۔ سب کی متفقہ رائے ہے کہ یہ کتاب ایک منفرد کتاب ہے' اور آپ کا اسلوب بالکل انوکھا اور بہت جاندار ہے۔ میں نے تو اس سے پہلے ایسی کتاب نہیں پڑھی۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس خط کے ساتھ کتاب کے لئے معمولی سا ہدیہ ارسال ہے' قبول کریں۔ میرے لئے دُعا کریں۔ میں آپ کے لئے ہمہ وقت حاضر ہوں۔ فقط۔!

آپ کا بھائی
صلاح الدین پرویز

مکرمی ایڈیٹر صاحب شانِ ہند!

اس وقت پاکستان کی قوم کا ایک اہم گمبھیر مسئلہ میری نظر میں ہے۔ میں نے اس مسئلے پر باقاعدہ سروے کیا ہے اور لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مراسلہ ارسال کر رہا ہوں۔ سماجی بہبود کے پیش نظر اپنے کالم کی زینت بنا کر پاکستان میں مقیم پاکستانیوں اور بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کو اس گمبھیر مسئلے سے نجات دلانے میں معاونت فرمائیں۔ اس سے کون جانے کتنے والدین کا فائدہ ہو جائے۔ قوم کا کوئی نوجوان اپنی سوچ کا رُخ بدل لے' اس کالم کو پڑھنے کے بعد جہیز اور شادی کا تعین نہایت سادگی سے کرے تو میں کہوں گا میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ حق ادا ہو گیا۔

ہزاروں والدین مجبوری کے عالم میں ہیں کہ اُن کے بیٹے بیٹیوں کے لئے مناسب رشتہ کی تلاش دن بدن مشکلات پیدا کر رہی ہے۔ بے بس والدین اور نوجوانوں کے لالچ نے دُنیا بدل کر رکھ دی ہے۔ شادی کا مسئلہ آج کل بہت اہم ہے۔ پاکستان میں مناسب رشتے کی تلاش کے لئے والدین سخت پریشان ہیں۔ ماحول بہت بدل چکا ہے۔ لوگوں میں بے حسی اور لالچ بڑھ گیا ہے۔ شادی کی رسومات میں بھی فرق آگیا ہے۔ لوگ زبان سے کہتے کچھ اور کرتے کچھ اور ہیں شادی بیاہ کے سلسلے میں بیرونِ ملک سے آئے ہوئے لوگوں کے وقت کا احساس نہ کرتے ہوئے کئی پیچیدہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ لڑکی والے تو لوگوں کا انتظار کرنے کا بہانہ کرتے ہیں کہ فلاں بیٹا کویت سے آئے گا۔ فلاں امریکہ سے آئے گا' جب تک سب نہیں آئیں گے شادی کی رسم نہیں ہو گی۔ وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے جو کام جلد پایہ تکمیل تک پہنچ جائے اچھا ہوتا ہے۔ اب پاکستان میں "حق مہر" شادی سے پہلے طے پایا جاتا ہے۔ یہ اِسلام کا زمانہ ہے۔ لڑکی والے لڑکے والے کے گھر پیغام بھجواتے ہیں کہ آکر تمام بات مکمل کر لیں۔ لڑکی کا حق مہر تعلیم کے حساب سے ہے۔ بی۔ اے پاس لڑکی کا ۵۰ ہزار اور ایم اے۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ ایم۔ ایڈ لیڈی ڈاکٹر کا ایک لاکھ تک ہے اور جو سونا لڑکا لڑکی کو پہنائے گا' وہ بھی حق مہر میں شامل ہو گا۔ آج لڑکیاں بیاہی نہیں جا رہی ہیں' بلکہ اُن کی تعلیم کی قیمت وصول کی جا رہی ہے۔ آج لڑکیوں کی تعلیم عام ہے۔ زیادہ تعلیم نے لڑکیوں کے دماغ خراب کر کے رکھ دیئے ہیں' سوچ کا انداز بدل دیا ہے۔ اچھی سیرت اچھے کردار کی قدر کم ہے۔ زیادہ لوگوں کا مقصد لالچ ہوتا ہے۔ شادی میں ایک رُکاوٹ لین دین اور رشتہ داروں کا انتظار بھی ہے۔ ڈیوں کی شکل میں رشتہ داروں کا آنا جانا رہتا ہے۔ ٹیلی فون پر اطلاع دی جاتی ہے' آج ہم اتنے لوگ آ رہے ہیں۔ رسومات نے کافی بدل کر رکھ دیا ہے۔ کافی نوجوان اس وقت مُلک میں بیرونِ مُلک جوانی کی حدود پھلانگ رہے ہیں لیکن لالچی قسم کے والدین نہیں چاہتے کہ اُن کی بیٹی کے ہاتھ پیلے ہوں کیونکہ تعلیم کی اہمیت کیا ہے۔ تعلیم انسان اس لئے لیتا ہے کہ عقل آئے۔ جب پڑھے لکھے بے وقوف بن جائیں ایسی تعلیم کا کیا فائدہ جس سے معاشرے میں بُرائیاں پیدا ہوں۔

شادی کے لئے اہم خوشی دو دلوں کے ملاپ سے ہوتی ہے۔ آج ہی لوگ اپنی سوچ کو بدل لیں تو کئی مسائل حل ہو جائیں گے۔ شادی بیاہ کا مسئلہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک پاکستانیوں کے لئے اہم بنتا جا رہا ہے۔ شادی کے معاملے میں آج کے والدین اور نوجوان تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ جب تک لڑکی لڑکے سے برابر تعاون نہ ہو یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا رشتہ کی تلاش کے وقت والدین کافی سوچ بچار کرتے ہیں صرف ایک جملہ بولتے ہیں "جو خدا کو منظور" والدین چاہتے ہیں کہ جو لڑکا ملے' وہ امیر کبیر ملنا چاہیے اس کے انتظار میں بیٹی گھر کی دہلیز پر ہی جوانی گنوا دے

امید ہے کہ آپ کے جیسے جواب دہ ہوں گے۔ رشتے کی تلاش میں خاندان کے افراد پر توجہ دی جاتی ہے۔ زیادہ لوگ [illegible] کو پسند کرتے ہیں۔ کتنے گھرانے پریشان [illegible]۔ لیکن مجبوری انھیں مجبور کر رہی ہے۔ رشتے کی تلاش میں لڑکے کے کام اور سیرت پر نظر رکھیں۔ تعلیم یافتہ لڑکا تلاش کرنے کرتے لڑکی کی عمر بیت جانے والا حساب نہ ہو۔ سیرت کا رنگ ہی اصل رنگ ہوتا ہے۔ پاکستانیوں کو چاہیے کہ وہ مل کر ایک تنظیم کی اس مسئلہ میں مدد کریں۔ کئی نوجوان لڑکیاں جو پریشان ہو رہی ہیں کوشش کریں تو وہ بھی دلہن بن کر جلد اپنے پیا کے گھر جا بسیں۔ امید ہے کہ ملک میں رہنے والے پاکستانی ملک میں اور بیرون ملک پاکستانی اپنے اپنے حلقہ میں اس مسئلہ کو اہم سمجھتے ہوئے کچھ نہ کچھ سماجی اخلاقی مدد ضرور کریں گے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ شادی جیسے اہم مسئلے کے حل کے لئے فلاح و بہبود کی وزارت قائم کرے۔ شادی بیاہ کی رسوم سرکاری نگرانی میں ادا کی جائیں تاکہ لوگ شکر

اور مہمان کے ساتھ اس فریضہ سے سبکدوش ہو سکیں۔

محبت وطن

زاہد سعید گل

نوٹ: سعید گل صاحب ہندوستان میں بھی ہو آئے ہیں۔

(ایڈیٹر)

محترم مدیر صاحب، تسلیم!

"بہ کوئے یار..." شروع سے آخر تک پڑھی۔ کتاب کیا ہے ایک سمندر ہے جس سے ہر کوئی اپنے مطلب کے موتی نکال سکتا ہے۔ میں خوشامد کو گناہ سمجھتا ہوں۔ جس انداز سے آپ نے ڈاڑھی کی آڑ میں شکار کرنے والوں کو ننگا کیا ہے اور سچے اور باا خلاص اشخاص کا احترام کیا ہے، وہ قابلِ مطالعہ ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی کتاب اب تک نہ پڑھی تھی۔ یہ کتاب آنے والی نسلوں کے لئے ایک ایسی مشعلِ راہ ہے جو انہیں ایک اچھا انسان بننے کے لئے راہ متعین کرنے میں مدد دے گی۔ آج کل کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی جو اصلیت بیان کی ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

خیراندیش۔

ماہر قادری و دُھوا اینڈ سنز

دانے دال

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 NOV 1988
Regd. with the Registrar of Newspaper at R.NO. 644/57 Delhi Postal

NOOR MOHAMMADI HOTEL

جب فلمی ستارے مدّاح بن گئے



● اداکار سنجے دت اور اُن کے مہمان نورمحمدی ہوٹل کے کھانے سے لُطف اندوز ہو رہے ہیں

فلمی ستارے جو ہر دم مدّاحوں میں گھِرے رہتے ہیں، جب خود کسی کے مدّاح بن جائیں تو یہ حیرت کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ نورمحمدی ہوٹل کی نلی نہاری کا ایک بار ذائقہ لے لیں تو پھر آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ یہ ہے ہی اتنی عمدہ، لذیذ اور صحت مند کہ پہلے ہی نوالے میں خواص و عوام کا دل موہ لیتی ہے۔ اسی لئے نورمحمدی ہوٹل کے مستقل گاہکوں میں بڑی بڑی ہستیاں، مشہور فلمی ستارے شامل ہیں۔ یہاں کی نلی، نہاری، بھیجہ، پائے، ماش کی دال اور دیگر کھانوں کے پیچھے ۶۰ سال کا تجربہ اور جناب عبدالحکیم مالک نورمحمدی ہوٹل اور اُن کے فرزند خالد حکیم کی ذاتی نگرانی شامل ہے، جس نے اُسے ممتاز بنا دیا ہے، آپ یہاں تشریف لا کر شوق فرمائیں، اپنے احباب کے لئے گھر لے جائیں یا پارٹی کے لئے لے جائیں۔ آپ اور آپ کے مہمان ذائقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

نورمحمّدی ہوٹل، وزیر بلڈنگ 181/183 ای۔ آر۔ روڈ، بھنڈی بازار، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

فون ہوٹل: 8511008 فون دفتر: 8516115

شانِ ہند

اولڈ جنریشن

شکیلہ فاروق

اندر پڑھیے۔
گزرتے وقت اور بدلتے زمانوں کی
ایسی عبرتناک کہانی جو آج کے
انسان کو فکر کے لمحات مہیا کرتی ہے۔



شانِ ہند
دہلی

دسمبر ۱۹۸۸ء

جلد ۴۹ — شمارہ ۱۲

چیف ایڈیٹر: سرور تونسوی

جوائنٹ ایڈیٹر: مطرب صحرائی

پرنٹر پبلشر پروپرائٹر: وِدّیا پرکاش سرور تونسوی ۔ طباعت: خواجہ پریس جامع مسجد دہلی۔ مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خطاط: سبطین صدیقی، محمد عمران

حسن کار: مصطفیٰ آرٹسٹ

بادۂ عرفاں

جی میں آتا ہے کہ نظمِ دہر برہم کیجیے
اضطرابِ دل سے پیدا اور عالم کیجیے

روئیے خونِ جگر یا آہ پیہم کیجیے
دل کی بربادی کا کس عنواں سے ماتم کیجیے

وسعتِ کون و مکاں بھی تنگ آئی نظر
عشق کے گر ایک سجدے کو مجسّم کیجیے

بزمِ ہستی ایک ہی جنبش میں برہم ہو گئی
آپ سے کس نے کہا تھا زلف برہم کیجیے

دیکھیے! اچھی نہیں ہے گلرخوں سے دوستی
حضرت ماہرؔ ذرا اس شوق کو کم کیجیے

ماہر القادری

کیا مولانا آزاد شراب کے رسیا تھے؟



اگر مولانا آزاد اس شغل سے قطعی بے بہرہ تھے، تو پھر یہ ناممکنات میں سے تھا کہ عوام میں یہ مشہور ہوتا کہ مولانا دُختِ رز کے رسیا تھے۔

حال ہی میں دلّی اردو اکادمی کے آرگن ماہنامہ "ایوانِ اردو" نے مولانا ابوالکلام آزاد نمبر شائع کیا ہے جو اپنی افادیت، انفرادیت اور اہمیت کے لحاظ سے اپنا جواب آپ ہے۔

اس خصوصی شمارہ میں جناب م.م. راجند کا ایک مضمون "مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت" بعنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ م.م. راجند صاحب نے بذاتِ خود مولانا کے بارے میں ذاتی طور پر کچھ دیکھا کی نسبت، اپنے حاصلِ مطالعہ کے نتیجہ میں ہی مولانا پر خامہ فرسائی کی ہے اور جس کا ثبوت یہ ہے انہوں نے اپنے مضمون کے آخر میں اُن پانچ کتا کا حوالہ دیا ہے جن سے اُنہوں نے استفادہ کیا ہے۔ اس مضمون میں حسبِ ذیل عبارت کو ملاحظہ فرمائیے:-

بھولا بھائی ڈیسائی اور مولانا آزاد گاندھی جی کے بہت قریب تھے۔ گاندھی جی شراب نوشی کے سخت خلاف تھے۔ ایک دن راجکماری امرت کور نے انھیں بتایا کہ اُنھوں نے بھولا بھائی ڈیسائی کو ایک پارٹی میں شراب پیتے دیکھا۔ گاندھی جی کے سیکریٹری مہادیو ڈیسائی نے گاندھی جی کے کہنے پر بھولا بھائی ڈیسائی کو ایک خط لکھ کر ان سے پوچھا کہ کیا وہ شراب پیتے ہیں؟ بھولا بھائی ڈیسائی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر گاندھی جی تو اپنے خاص آدمیوں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ایک مثالی زندگی گزاریں۔ اُنہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ میں جو ایگزیکیٹو کونسل کے لئے کانگریسی اُمیدواروں کے انتخاب کے لئے بُلائی گئی تھی، راجکماری امرت کور کے اس الزام کا ذکر کر دیا، اور اچانک مولانا آزاد کی طرف مُنہ کر کے یہ سوال داغ دیا "کیا آپ شراب پیتے ہیں؟" مولانا سٹپٹا گئے کیونکہ اس موقعہ پر اس قسم کا سوال کئے جانے کی کوئی توقع نہیں تھی، اور پھر سوال کُنندہ بھی مہاتما گاندھی۔ انہوں نے اپنے حواس مجتمع کئے اور بے خوفی سے قبُول کیا "ہاں، پہلے پیتا تھا۔" گاندھی جی نے فوراً سوال کر دیا "آپ نے شراب پینی کب چھوڑی؟" معاملے کو سنجیدہ ہوتے دیکھ کر جواہر لال مسکرا کر بولے "میں نے کل شام ہی وہسکی پی ہے میرے خیال میں اس معاملہ کو یہیں ختم کر دیا جائے" اس پر ایک قہقہہ لگا اور گاندھی جی چُپ ہو گئے مگر بھولا بھائی ڈیسائی کی اُمیدوں پر اُنھوں نے خط رے ڈالی۔"

کسی زمانے میں سول لائنز دہلی میں ایک آرمی ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ سردار صاحب بھی اس ہوٹل میں کبھی کبھار تھری اسٹار برانڈی کے دو چھوٹے پیگ نوش کرنے تشریف لے جاتے تھے۔ سردار صاحب فرماتے تھے کہ ایک شام اُنہوں نے ایک کیبن کا پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہونا چاہا تو وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ اُس کیبن میں مولانا آزاد تشریف فرما تھے اور میز پر شراب کا گلاس رکھا تھا۔ سردار صاحب کہتے تھے کہ اُنھوں نے مولانا کو سلام کیا اور اس کیبن سے آگے بڑھ گئے۔

مندرجہ بالا اقتباسِ عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبِ مضمون نے یہ واقعہ کسی حوالہ جاتی کتاب سے لیا ہے۔ کیونکہ یہ ناممکنات میں سے ہے کہ م۔م۔ راجندر صاحب اُس وقت کی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں بذاتِ خود موجود ہوں۔ لہٰذا اُنھیں عینی شاہد نہیں کہا جا سکتا۔

م۔م۔ راجندر صاحب کی محولہ بالا تحریر، جو کہ اُنہوں نے یقیناً کسی حوالہ جاتی کتاب سے ہی لی ہے، کو نشانہ بنا کر اُن کے خلاف اور اُردو اکادمی دہلی کے خلاف جناب ناز انصاری صاحب کا ایک مُراسلہ "قومی آواز" میں "مولینا آزاد پر شرمناک الزام" بعنوان سے شائع ہُوا ہے، جس میں اُنہوں نے مشورہ ہی نہیں بلکہ کسی حد تک اصرار کر دیا ہے کہ اس تحریر کی پاداش میں نہ صرف اکادمی کے سکریٹری جناب شریف الحسن نقوی اور مجلّہ "ایوانِ اُردو" کے مدیر جناب مخمور سعیدی کو ملازمت سے برطرف کر دیا جائے بلکہ ساری اُردو اکادمی کے ممبران کی جگہ نئے ممبران سے اکادمی کی سرے سے تشکیل کی جائے۔

ہم نہیں جانتے کہ لیفٹننٹ گورنر نے ناز انصاری صاحب کے اس حکم نامے پر کوئی ایکشن لیا یا نہیں، مگر ہم جناب ناز انصاری صاحب کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش کریں گے کہ انھیں اپنے مُراسلے میں بجائے یہ اصرار دینے کے، صاحبِ مضمون دریافت کرنا چاہئے تھا کہ اُنھوں نے یہ واقعہ نقل کیا ہے؟ اور کیا وہ حوالہ جاتی کتاب کسی مصنّف کی تصنیف ہے جن کے بارے میں کسی شک و شبہ نہ کیا جا سکے، یا اُنھوں نے یہ واقعہ کسی سے سُن کر مضمون میں شامل کیا ہے۔

بہرکیف م۔م۔ راجندر صاحب نے یہ کسی طور بھی اپنے مضمون میں شامل کیا ہو، ناز انصاری صاحب کی خدمت میں نہایت ادب سے گذارش کریں گے کہ جس قدر انھیں مولانا کا احترام مقدم ہے، اُن سے کہیں زیادہ ہم مولانا کے مدّاح اور پیروکار ہونے کے ساتھ ساتھ صرف ایک عظیم لیڈر ہی تسلیم کرنے میں، ملک کو آزاد کرانے میں اُن کا بہت بڑا حصّہ بھی سمجھتے ہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ مولانا آزاد شراب پیتے تھے یا نہیں، اس سلسلہ میں مختلف روایات ہیں مگر روایات سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ مولانا آزاد کے رسیا تھے۔

اگر ناز انصاری کو یاد ہو تو شاید وہ اس سے انکار نہیں کریں گے کہ جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اقتدار حکومتِ ہندوستان کے لیڈروں کے سپرد کیا تو اُن دِنوں یہ خبر بڑی گرم تھی کہ وائسرائے کے محل کے تمام تر انگریزی شراب مولانا آزاد نے خرید لی ہے اور اس خبر یا افواہ کو عوام میں پھیلانے والے وہ خادم یا بیرے تھے جو وائسرائے ہاؤس میں کام کرتے تھے۔ ان لوگوں میں اب بھی کچھ حضرات زندہ ہیں اگر ناز صاحب چاہیں تو اُن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔

اور تو اور جب مولانا آزاد غسل خانے میں پھسل کر گرے اور یہ گرنا اُن کی موت کا باعث بنا اُس وقت بھی یہ خبر عوام کی زبان پر تھی کہ مولینا شراب کے نشے میں پھسلے (دروغ بر گردنِ راوی)

مرحوم سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" نے اپنے کئی دوستوں کو یہ واقعہ سُنایا کہ کسی زمانے میں سیول لائنز دہلی میں ایک آدمی ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ سردار صاحب بھی اِس ہوٹل میں کبھی کبھار ہنسری تھری اسٹار برانڈی کے دو چھوٹے پیگ نوش کرنے تشریف لے جاتے تھے۔ سردار صاحب فرماتے تھے کہ ایک شام اُنہوں نے ایک کیبن کا پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہونا چاہا تو وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ اس کیبن میں مولینا آزاد تشریف فرما تھے اور میز پر شراب کا گلاس رکھا تھا۔ سردار صاحب کہتے تھے کہ اُنھوں نے مولانا کو سلام کیا اور اُس کیبن سے آگے بڑھ گئے۔ یہ واقعہ سردار صاحب سے راقم الحروف نے متعدد بار سُنا۔

راقم الحروف نے اُردو اکادمی دہلی کے منعقد کردہ سیمنار "دِلّی والے" میں دیوان آنند کمار کا خاکہ سُناتے وقت عرض کیا تھا کہ جب مولانا آزاد لاہور میں دیوان آنند کمار کے والدِ محترم جناب راجہ نریندر ناتھ کے ہاں مہمان ہوئے تو دیوان آنند کمار نے مولانا اجمل خان کو بُلا کر کھانے کے کمرے میں ایک الماری میں انگریزی شراب کے درجنوں برانڈز کی بوتلیں دکھاتے ہوئے کہا کہ اجمل صاحب ان میں سے جو بھی شراب مولانا صاحب کو پسند ہو آپ بلا تکلّف یہاں سے لے سکتے ہیں۔ اس پر مولانا اجمل خاں نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ آپ نے غلط سُنا ہے مولانا تو پیتے ہی نہیں۔ اس مکالمے سے صاف ظاہر ہے کہ دیوان آنند کمار اور اُن کے والدِ محترم راجہ نریندر ناتھ کو بھی اس کا علم تھا کہ مولانا آزاد دُختِ رز کے رسیا ہیں ورنہ دیوان آنند کمار یہ گستاخی کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے تھے اور پھر اجمل خاں صاحب نے "مسکرا کر کہا" صاف چغلی کھا رہا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور تھا مگر اجمل خاں صاحب اِس راز کا انکشاف از بام نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ناز انصاری صاحب اب حد سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ رائی کو ڈاچی (اونٹنی) بنا لیا جائے مگر یہ ناممکن ہے کہ کسی بات کا وجود ہی نہ ہو اور اُسے اِس قدر شہرت مل جائے۔ اگر مولانا اِس شغل سے قطعی بے بہرہ تھے تو پھر یہ ناممکنات میں سے تھا کہ عوام میں یہ مشہور ہوتا کہ مولانا دُختِ رز کے رسیا تھے۔ اور راقم الحروف بھی اِس افواہ یا سچائی پر یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ مولانا شراب پیتے تھے حالانکہ یہ اُن کا ذاتی فعل تھا اور کسی کو بھی یہ اختیار نہیں کہ مولانا کے کسی ذاتی فعل پر کوئی اعتراض کرے۔

م۔م راجندر صاحب نے تو کہیں سے پڑھی ہوئی یا سُنی ہوئی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے اور ناز انصاری منت میں اُن پر نزلہ گرا رہے ہیں۔

ناز صاحب کو یہ قبول کرنا ہی ہوگا کہ تاریخ کو مسخ نہیں کرنا چاہیئے اور اس روایت کا بھی بائیکاٹ کرنا چاہیئے کہ کسی کی موت کے بعد اُس کے گُن ہی گائے جائیں اور اُس کی کمزوریوں یا عیوب کا ذکر نہ کیا جائے۔ بلکہ تاریخ کا اصل مقصد یہ ہے کہ آنے والی نسلوں کو اپنے آباؤ اجداد کی حقیقی زندگی کا علم ہو تاکہ وہ اپنے بڑوں کے اوصاف کو اپنائیں اور اُن کی کمزوریوں یا عیوب سے بچیں۔

ایوانِ اردو کا مولانا آزاد نمبر اس لحاظ سے واقعی قابلِ تعریف ہے کہ مولانا آزاد کی زندگی کے ہر پہلو پر اس میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ایسا بامقصد خصوصی شمارہ جہاں ایوانِ اُردو کی شہرت کا سبب ہوگا وہاں اس کے مدیران کرام کے صحیح صحافی ہونے کا دعویدار بھی۔

زیادہ روایات سے یہ ما
ہے کہ مولانا آزاد دُختِ رز کے

ابوالکلام آزاد اسٹڈی فورم کروہ عوام کو مولانا آزاد کے کردار او روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ ا ہر پہلو سے واقفیت بہم پہنچائے : فرشتے کا درجہ دے کر عوام کو گمراہ کا اِس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزا صدیوں کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔

جناب ناز انصاری صاحب ایسا ثبوت ہو کہ مولانا شراب نوش نہ اس سلسلے میں کچھ لکھنا چاہیں تو شا پیش کردہ ثبوت اور اُن کی ہر تحریر شائع ہے۔

محترم ناز صاحب! آپ ایک ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نا اُن کے اخبار "صدق" سے آپ ناواقف اُنہیں مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے کے والہانہ حد تک دیوانے تھے" اپنے " میں کچی باتوں میں مولانا آزاد کی شراب ترک کرتے وقت مولانا آزاد کے پیر بھائی اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے شہرۂ آفاق سربراہ سید سلیمان ندوی کے نام مولانا آزاد کے ایک خط کا اقتباس تھا کہ "میں شراب پیتا تھا ..... اور شراب موقوف ہے" میں نے ہر طرح کی سیاہ کاری کی لیکن الحمد للہ کہ خدا نے مجھے توفیق دی اور

اگر آپ چاہیں تو "صدق" کی فائل دیکھ سکتے ہیں۔ یا دار المصنفین اعظم گڑھ کو خط لکھ کر تصدیق کر سکتے ہیں۔ "مولانا آزاد کی تحریر" آخر میں آپ کسی ذاتی عناد کے زیرِ اثر اور حرف گیری کرنا چاہتے ہوں تو دوسری بات ورنہ "ایوانِ اُردو" میں م۔م راجندر صاحب اِس تحریر پر اس قدر سیخ پا ہونے کی نہیں تھی۔

دِلّی اُردو اکادمی کی نامناسب کارروائی

اس سال مسودات پر مالی امداد دینے والی اُردو اکادمی کی متعلقہ کمیٹی نے دو عجیب و غریب فیصلے کئے ہیں۔ پہلا یہ کہ نثری مسودہ تین سو صفحات سے زیادہ اور شعری مجموعہ ۱۵۰ صفحات سے زائد منظور نہیں کیا جائے گا۔ اور دوسرا یہ کہ ہر وہ کتاب جس کی اشاعت کے لئے اکادمی جزوی مالی امداد دے گی اس کی ایک سو آٹھ جلدیں اکادمی کو بغیر کسی قیمت کے دینی ہوں گی۔

یہ فیصلہ کرنے والے ان حضرات کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ اُردو اکادمی کی ممبری کا اعزاز ملنے کی خوشی میں یا تو وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں اور یا پھر وہ دلّی کے مصنفین اور شعراء سے کسی ذاتی دشمنی کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس طرح دلّی کے سابق لیفٹننٹ گورنر جناب کپور صاحب نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اُردو پڑھانے والے لیکچروں کا طائفہ اُردو اکادمی پر جس بُری طرح سے مسلط کیا ہے اُس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ لیکچرر خواہ وہ پروفیسر، لیکچرار یا ریڈر ہو ہوتا لیکچرر ہی ہے اور دُنیا میں آج تک کوئی بھی لیکچرر فراخ دل نہیں ہوا خواہ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین ہوں یا ڈاکٹر رادھا کرشنن۔ لہٰذا ان لیکچروں کی ذہنیات نے مذکورہ بالا فیصلے کرکے اس کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ ان کی ذہنی کنجوسی اور تنگ دلی ہر جگہ اپنا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اس احمقانہ یا دوسرے الفاظ میں جاہلانہ فیصلے سے تو کہیں بہتر تھا کہ یہ کمیٹی یہ شرط عائد کرتی کہ اکادمی کی جزوی امداد سے چھپنے والی کتاب کی قیمت اس کمیٹی کے مشورہ سے مقرر کی جائے گی۔ مثال کے طور پر اگر کسی کتاب پر لاگت دس روپیہ آتی ہو تو اس کی قیمت زیادہ سے زیادہ پچیس روپے مقرر کی جاتی۔ کیوں کہ چالیس فیصد کمیشن دکانداروں کو دینا ہوتا ہے اور یا پھر جزوی مالی امداد کی بجائے کتاب کی ایک سو آٹھ جلدیں خرید لی جاتیں۔ مگر اس حالت میں قیمت کا تقرر مصنف کی اپنی مرضی پر ہونا ضروری ہوتا۔

نہ معلوم شریف الحسن نقوی صاحب ایسے ذی فہم سکریٹری کی موجودگی میں کمیٹی کے ارکان نے یہ مضحکہ خیز اور ناجائز فیصلہ کیسے منظور کر لیا اور اگر کسی وجہ سے کمیٹی کے ممبران نے اُن کی رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا تو اُنہیں چاہیئے تھا کہ لیفٹننٹ گورنر سے سفارش کرتے کہ یہ فیصلہ نامناسب ہے اسے منظور نہ کیا جائے۔

ہم اُمید رکھتے ہیں کہ اب بھی یہ کمیٹی اپنے اس احمقانہ فیصلہ پر نظر ثانی کرے گی اور عوام میں اپنے آپ کو اور اُردو اکادمی کو مضحکہ کا مضمون نہ بننے دے گی۔

جب یہ طے شدہ امر ہے کہ دس ہزار روپیہ سے زائد جزوی مالی امداد کسی کو نہیں دی جائے گی تو پھر صفحات کی حد مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہتر یہ تھا کہ سفارشی لوگوں سے رطب و یابس کے پلندے منظور کرنے کی بجائے صرف وہی مسودے منظور کئے جاتے جو اُس کے حقدار ہوتے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس قسم کی احمقانہ شرائط عائد کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

صبح مانا بہت تیرے کام آئے گی
دیکھنا راستے ہی میں شام آئے گی

وقت کے آسماں پہ یہ واضح رہے
اونچی پرواز بھی زیرِ دام آئے گی

تابکے اس سے دامن بچاؤ گے تم
جو اداسی ہے وہ صبح و شام آئے گی

یہ "صداقت" ہے "تنہائی" ہے "فکر" ہے
ساتھ لے لو اسے یُونہی کام آئے گی

جا رہے ہیں حقیر آستانی کے ہاں
آپ کی ذات محوِ خرام آئے گی

آنکھوں دیکھا کانوں سنا

خلیل انجم کاشمی

کُل ہند مشاعرہ

ڈوڈہ (کشمیر)

ضلع ڈوڈہ تواریخی جغرافیائی اعتبار سے جموں کشمیر کے اہم ترین اضلاع میں شمار کیا جاتا ہے۔ فلک بوس اور خوبصورت پہاڑوں کی آغوش میں پھیلا ہوا یہ ضلع سات تحصیلوں میں منقسم ہے۔ اور موجودہ اعداد و شمار کے مطابق ۵,۱۰ لاکھ ۳۷ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ دریائے چناب اس ضلع کی جغرافیائی تقسیم میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے جو ہماچل پردیش کے لاہول علاقے میں "چندر" اور "بھاگا" نامی دریاؤں کے سنگم کے مقام پر ملنے سے وجود میں آتا ہے۔

ضلع ڈوڈہ جس قدر حُسن اور حُسن کی دولت سے مالا مال ہے اُسی قدر اِس ضلع کے لوگ بڑے لمبے عرصے ہی سے علم و ادب کے زبردست شوقین رہے ہیں۔

خالص شہر کی آبادی کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے مگر متواتر تین سال سے یہاں "بزم ادب" کی جانب سے اعلیٰ سطح پر کُل ہند مشاعرہ کا اہتمام یہاں کے عوام کے شعری ذوق و شوق سے وابستگی کا پتہ دیتا ہے —

آج ۱۲ ستمبر ۱۹۸۶ء سے یکشنر آفس ڈوڈہ کا وسیع و عریض کمپاؤنڈ شامیانوں سے گھیر دیا گیا ہے۔ اسٹیج کو شاندار طریقے سے سجایا گیا ہے جس پر بیرونی و مقامی شعرا و شاعرات کے علاوہ چند معزز مہمان بھی رونق افروز ہیں۔ اسٹیج کے دائیں جانب دُور درشن کشمیر کا عملہ مشاعرے کو اپنے کیمرے میں اُتارنے کے جتن کر رہا ہے اور بائیں طرف خواتین سامعین ہیں جن کے لئے پردے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تاہم یہ نہ معلوم ہو سکا کہ خواتین کی تعداد کیا ہے۔ مگر سامعین حضرات سے کمپاؤنڈ کھچا کھچ بھرا ہے۔ اِس مشاعرے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ مشاعرہ مقررہ وقت پر شروع ہو گیا ہے۔

پچھلی رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں اور مشاعرہ کمیٹی کی جانب سے مہمانِ خصوصی اور شاعروں کی گلپوشی کی جا رہی ہے..... مشاعرہ کے مہمانِ خصوصی ہیں ڈوڈہ کے ڈپٹی کمشنر عالی جناب [illegible] احمد کانٹی... اور صدرِ مشاعرہ ہیں ہندوستان کے مشہور و معروف شاعر عالی جناب مظہر امام صاحب۔

نقیبِ مشاعرہ خالد آفریدی اب [illegible] اسٹیج سکریٹری سے گذارش کر رہے ہیں کہ وہ استقبالیہ تقریر سے نوازیں۔ اسٹیج سکریٹری [illegible] تقریر میں مشاعرے کے اغراض و مقاصد پر [illegible] ڈالتے ہوئے چند قابلِ قبول باتیں کہہ [illegible] تمام اہلِ ذوق توجہ کے ساتھ سماعت [illegible] اسٹیج سکریٹری صاحب مائک سے ہٹے تو مہمانِ خصوصی سے درخواست کی جا رہی ہے کہ وہ مشاعرے کا [illegible] فرمائیں — مہمانِ خصوصی عالی جناب [illegible] کانٹی ڈپٹی کمشنر [illegible] مائک پر آ رہے ہیں [illegible] مائک سے رُخصت ہو گئے ہیں [illegible] آغاز ہو رہا ہے۔

[illegible] مشاعرے کے لحاظ سے پہلے
[illegible] زبان کے شعرا کو زحمت دی جارہی ہے۔ [illegible] فریدی [illegible] الفت کشتواڑی، [illegible] کشمیری، غلام قادر کشتواڑی، پروفیسر منشور [illegible] غلام رسول کھوڈک، جانباز کشتواڑی [illegible] صاحب، اور مرحوب بانہالی بالترتیب اپنے کلام سُنا کر سامعین سے داد حاصل کر کے [illegible] ہوئے۔

پنجابی زبان کے شعرا میں مشتاق وارثی اور محترمہ سرجیت سکھی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ سب سے پہلے مشتاق وارثی کو زحمت دی جارہی ہے۔ مشتاق وارثی نوجوان شاعر ہیں۔ پنجابی کے [illegible] اُردو میں بھی اچھی خاصی شاعری کر لیتے ہیں۔ تحت [illegible] پڑھتے ہیں۔ اُن کے لہجے میں بڑی سنجیدگی ہے [illegible] پہلے پنجابی میں اپنا کلام سُنایا ہے اور داد وصول کرنے کے بعد اب اُردو میں غزل سنائی ہے۔ دو شعر آپ بھی سُنئے ؎

گلی کوچوں کا مقدر ہوں تیرِ خزاں کی طرح
لگائے سینے سے اے کاش کوئی ماں کی طرح
سجائے رکھنا ستارے وفا کی پلکوں پر
نہ جانے کب کون آجائے پاسباں کی طرح

مشتاق وارثی غزل مکمل کر کے تالیوں کے شور میں مائیک سے لوٹ رہے ہیں اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ پنجابی شاعرہ محترمہ سرجیت سکھی صاحبہ کو زحمت دی گئی ہے۔ اُن کا نام سنتے ہی تالیوں سے اُن کا استقبال کیا گیا۔ سرجیت سکھی متواتر تین سالوں سے اِس مشاعرے میں شرکت فرما رہی ہیں۔ اُن کی شاعری میں پنجاب و گرد و نواح کے سیاسی سماجی حالات کی بھرپور عکاسی نمایاں ہے۔ انتہے پورے قد کی قبول صورت یہ شاعرہ مشاعروں کی آبرو خیال کی جاتی ہے۔ مائیک پر آکر پہلے چند مصرعے تحت میں سُناتے ہیں، مگر افسوس کہ میں اُن کا کوئی شعر نوٹ نہیں کر سکا۔ بہر حال! اپنی مترنم آواز اور پُر اثر کلام سے مشاعرے کو ایک خوشگوار ماحول میں پہنچا کر سرجیت سکھی تالیوں کی گونج اور گڑگڑاہٹ میں اپنی جگہ پر آگئی ہیں۔

اِس طرح کشمیری اور پنجابی زبانوں کے شعرائے کرام کا دَور ختم ہوا تو نقیبِ مشاعرہ نے اُردو مشاعرے کے آغاز کے لئے مقامی شاعر مشتاق فریدی کو آواز دی۔ مشتاق فریدی نوجوان شاعر ہیں اور جدید انداز میں اپنی غزل تحت میں سُنا رہے ہیں۔ اُن کا یہ شعر خاص طور سے پسند کیا گیا ؎

ہر شاخ پہ ہیں آج بھی پتے اُگے ہوئے
مانا کہ شہر کی ہوا اب سازگار ہے

مشاعرہ اپنے ابتدائی دَور سے ہی کامیابی کی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اب مالیر کوٹلہ سے آئے ہوئے نوجوان شاعر رمضان سعید کو آواز دی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مائیک پر نئے نئے آئے ہیں۔ بہر حال! اچھی شاعری کر لیتے ہیں۔ دو شعر آپ بھی مُلاحظہ فرمائیں ؎

ذہن جناب خیالوں کی فراوانی سے
لفظ مجبور کر اشعار میں کیا کیا رکھیے
نقش گہرا ہو لفظ فن کی یہی ہے اک شرط
رنگ کوئی بھی ہو بس ایک سلیقہ رکھیے

اب عاصم فریدی کو زحمت دی جارہی ہے۔ عاصم فریدی جموں میں محکمۂ اطلاعات کے ذمہ دار رُکن ہیں۔ مائیک پر آکر تحت میں ایک غزل نما نظم بعنوان "قومی ایکتا کے حوالے سے" سُنائی اور داد پائی ہے۔ اُن کے چند شعر جنھیں پسند کیا گیا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

محفلیں کچھ سجانے کا ساماں کرو
اک نیا دَور لانے کا ساماں کرو
پھیلتی جارہی ہیں یہ تاریکیاں
اب ذرا لَو بڑھانے کا ساماں کرو
بیج نفرت کے بونا تو شیوہ نہیں
کچھ دلوں کو ملانے کا ساماں کرو
غفلتوں کے بھنور میں ہیں اہلِ وطن
اُن کی قسمت جگانے کا ساماں کرو

عاصم فریدی کے بعد ایک اور مقامی شاعر سعید احمد فریدی کو آواز دی گئی۔ سعید صاحب کا یہ شعر آپ بھی سُن لیں ؎

دل کی تجھ سے زمینوں کے قصے عجب

[illegible] سے پڑی [illegible]

مشاعرہ تو کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہے مگر نقیبِ مشاعرہ اپنے رول کو بخوبی انجام دینے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ اب پروفیسر محمد اسداللہ وانی کو زحمت دی جارہی ہے۔ اسداللہ وانی مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ اور غزل سُنا کر اور داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں۔

اب مہمان شاعر عزیز مُرادآبادی صاحب سے کلام سُنانے کی درخواست کی گئی ہے۔ عزیز مُرادآبادی نے مائیک پر آکر پہلے حسبِ موقع قومی یکجہتی پر ایک مختصر سی نظم سُنانے کے بعد غزل شروع کی ہے۔ فرما رہے ہیں ؎

ہمارا فرض ہے گلشن کو خون سے سینچیں
حسین پھولوں کا حقدار صرف تو ہی سہی۔

اس شعر کو خوب پسند کیا گیا ہے۔ 'آہ' اور 'واہ' کی صدائیں ہر طرف سے گونج رہی ہیں اور شعر بار بار دُہرانے کے بعد عزیز مُرادآبادی فرما رہے ہیں ؎

عزیز فصلِ بہاراں قریب آنے تک
دریدہ جیب و گریباں کا کچھ رفو ہی سہی

عزیز مُرادآبادی داد و تحسین دامن میں سمیٹے ہوئے مائیک سے رخصت ہوئے تو مالیر کوٹلہ سے تشریف لائے ایک اور مہمان شاعر خالد کفایت کا تالیوں سے استقبال کیا جارہا ہے۔ خالد کفایت پنجاب کے نوجوان شاعر ہیں۔

تحت میں بڑے اچھے انداز سے پڑھتے ہیں حمد کے دو شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

پھول پھولوں سے بکھیرا کس نے فرشِ خاک پر
ماہ و انجم سے مزین آسماں کس نے کیا!
دہر میں کس نے کیا اسمِ محمدؐ تابناک
اور کدّابوں کو بے نام و نشاں کس نے کیا؟

حمد کے بعد غزل سُنائی ہے اور اہلِ ذوق سے داد پائی ہے۔ غزل کے چند شعر آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

بستی بستی صحرا صحرا در بدر لے جائے گا
جانے کس منزل مجھے کتنا سفر لے جائے گا
وہ مکاں [illegible] ہیں کہ جن کو چھین کر [illegible]

کھڑکیاں بند ان کیلئے باہر سے جائیگا
جسم نمیر اُترتا پھوڑ دے گا ریت پر
اور نمیکھ پر شکستگی میں سر لے جائے گا

خالد کفایت مناسب داد لے کر مائیک سے رخصت ہو رہے ہیں اور ادھر راقم الحروف کو آواز دی جا رہی ہے۔ صدرِ محترم کی اجازت لے کر میں اپنی ایک تازہ غزل کے دو چھوٹے شعر نذرِ سامعین اہلِ علم و ذوق کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ سامعین نے حوصلہ افزائی کے طور پر جو شعر پسند فرمائے اُن کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ کی خدمت میں بھی عرض کر رہا ہوں ؎

جب سارے لوگ معرکۂ خیر و شر میں تھے
آرام سے پڑے ہوئے ہم اپنے گھر میں تھے
میری شکست میں تھا مرے دوستوں کا ہاتھ
جب کہ مرے رقیب کے میری نظر میں تھے

ارشادِ احباب کی تعمیل میں دوسری غزل کے چند شعر ترنم میں بھی سنائے۔ دو شعر آپ بھی سنیں ؎

کس کو مہرباں کہیئے کس کو جانئے قاتل
شہر میں یہاں سب کے ایک جیسے چہرے ہیں
آپ اپنے خنجر کی نوک پر نظر رکھیئے
یہ تو چارہ گر جانے زخم کتنے گہرے ہیں

نقیبِ مشاعرہ کا تلفظ درست نہیں ہے مثلاً خلیل انجم کو "کھلیل انجم" کہہ رہے ہیں اور دوسری کمزوری یہ ہے کہ شعر کو ٹھیک سے پڑھ نہیں پا رہے ہیں۔

اب نقیبِ مشاعرہ نے کشمیری شاعرہ نسرین نقاش کو آواز دی ہے۔ بیشتر نوجوان کشمیری شعراء و شاعرات کی طرح اِن کا تلفظ بھی درست نہیں ہے شعر تحت اللفظ میں پڑھ رہی ہیں مگر اہلِ علم و فن خاص طور سے جو اسٹیج پر رونق افروز ہیں کروٹ بدل بدل کر انھیں سن رہے ہیں۔ تاہم غزل کے چند شعر اچھے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں

اب کے ساون میں برستے بادلوں کے باوجود
خلاؤں میں جلے ہم بارشوں کے باوجود
ہم نے بھی قتل تو احساس کی دہلیز پر
شہر میں لوجود کتنے مقتلوں کے باوجود

مجھ سے آگے آگے چلتی ہیں مری تنہائیاں
شہر ویراں لگے ہے رونقوں کے باوجود
اس نے دی ہے پھر مجھے ترکِ جینے کی دعا
بن لیا پھر ہرن نے قاتلوں کے باوجود

اب ڈاکٹر اسرار سلطانپوری مائیک پر آ گئے ہیں۔ یہ مجروحؔ سلطانپوری والا سلطانپور نہیں ہے بلکہ وادیٔ کشمیر کا سلطانپور ہے۔ اسرار مائیک پر آ کر عنایت کر رہے ہیں ؎

احساس کی رگ رگ میں سما جائے ہے کوئی
اس دل میں دبے پاؤں اُتر آئے ہے کوئی
اس شہر میں بھرا رہے عیار بتوں کی
گر جائے ہے کوئی تو سنبھل جائے ہے کوئی

ڈاکٹر اسرار تحت میں پڑھ رہے ہیں اور بڑے اچھے انداز میں پڑھ رہے ہیں۔ دوسری غزل کے بھی دو شعر سماعت فرمائیں جنھیں سامعین نے بیحد پسند فرمایا ؎

تیر ہم پر بھی چلے تھے رائیگاں کوئی نہ تھا
پھر نشانہ اندرونِ کارواں کوئی نہ تھا
اجنبی پن آشکارا تھا ہر اک شے سے یہاں
واسطہ دینے کو بھی رشتہ یہاں کوئی نہ تھا

ڈاکٹر اسرار سلطانپوری اپنی غزل ختم کر کے رخصت ہی ہوئے تھے کہ بیرونی شاعر حضرت دلکش آفریدی کو زحمت دی گئی۔ دلکش صاحب اپنے نام ہی کی طرح دلکش بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں رنگوں میں شاعری کرتے ہیں۔ چونکہ آج ہنسانے کے موڈ میں ہیں اس لئے مزاحیہ قطعات سنا کر ماحول کو قہقہہ بار بنا رہے ہیں۔ اُن کے پڑھنے کا اسٹائل بھی کچھ یوں ہے کہ سامعین بے اختیار داد دیئے چلے جا رہے ہیں۔ میں بھی سامعین کا ساتھ دیتا رہا، اس لئے ایک قطعہ سے زیادہ نوٹ نہیں کر سکا جو آپ کی نذر ہے ؎

صرف سائنس پر نہیں موقوف
شاعری کا مظاہرہ ہوگا
فکرِ شاعر اگر سلامت ہے
چاند پر بھی مشاعرہ ہوگا

دلکش آفریدی نے مشاعرے کو سنجیدگی سے مزاح کی طرف موڑ دیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اب جس شاعر کی باری آئے گی سمجھ لیجئے کہ اُس کا امتحان ہے۔ نقیبِ مشاعرہ کی نگاہِ انتخاب نادرِ شگفتہ محترم غلام رسول نازکی صاحب کے فرزندِ ارجمند فاروق نازکی صاحب، جو آج کل جموں ریڈیو کے ڈائریکٹر ہیں، پر پڑی۔ فاروق نازکی صاحب مائیک پر آ کر ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے تحت میں فرما رہے ہیں ؎

ہم کونسی منزل سے گزرے تھے بتا دینا
ہم کتنے ہی زینوں سے اُترے تھے بتا دینا

داد کا شور کم ہوا تو فرما رہے ہیں ؎

چمکے تھے گلستاں میں شبنم کی طرح کب ہم
خوشبو کی طرح کب ہم گزرے تھے بتا دینا

فاروق نازکی صاحب کے پڑھنے کا انداز بہت اچھا ہے، اور شعر بھی خوب کہہ رہے ہیں۔ سنیئے! عنایت کر رہے ہیں ؎

ہر موڑ گلی ترمیں تنویر کے دھارے تھے
کس نور کی وادی میں اُترے تھے بتا دینا
ہم خانہ بدوشوں سے آبادی تھے دیر لئے
کب شہرِ تمنا سے گزرے تھے بتا دینا

فاروق نازکی نے اچھی غزل سنا کر مشاعرے میں مزید جان ڈال دی ہے۔ غزل ختم کر کے رخصت ہوا ہی چاہتے تھے کہ سامعین کے پُرزور اصرار پر رُک گئے ہیں اور حسبِ فرمائش ایک نظم سنا رہے ہیں جس کا عنوان ہے "تم کیا جانو کب کیا ہوگا" نظم میں بھی وہ کامیاب ہیں۔ اپنا فرض ادا کر کے فاروق نازکی تالیوں کی آواز میں مائیک سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اب محترم نور زماں نورؔ سے کلام سنانے کی درخواست کی گئی ہے۔ نورؔ صاحب اپنے مخصوص ترنم میں غزل سرا ہیں۔ اُن کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

سوال یہ نہیں میں دوستوں کو کیوں ترسا
سوال یہ ہے انھیں میں نے آزمایا کیوں؟

اور جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

سوال یہ نہیں سڑکوں پہ کیوں ہے سناٹا
سوال یہ ہے تو ایسے میں گھر سے نکلا کیوں؟

تو ایسا لگا جیسے مشاعرہ گاہ میں کوئی بم پھٹ پڑا ہے۔ داد و تحسین کا شور کم ہوا تو فرما رہے ہیں ؎

سوال [illegible] دلیل ہے یا [illegible] بخشش
سوال یہ ہے کہ گیا [illegible] خواب دیکھا کیوں؟

دو منزل تو وہ نہایت کامیاب ہو کر مائیک سے پلٹ رہے ہیں۔ اب مختصر سے تعارف کے بعد عابد مناوری کو زحمت دی جا رہی ہے۔ عابد مناوری ماحول کا جائزہ لے کر ایک رباعی سے نواز رہے ہیں ؎

ضو پر کا مُنھ بھی چلتا ہے کہیں
کاغذ کا بجوکا بھی ہمکتا ہے کہیں
کس [illegible] پہ تم آئے ہو سوالی بن کر
خالی پیمانہ بھی چھلکتا ہے کہیں

داد ملی تو کسی کی فرمائش پر اپنی ایک بہت پرانی غزل سنا رہے ہیں۔ تین چار شعر سنانے کے بعد ایک تازہ غزل پیش کر رہے ہیں۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

کیوں نہ اپنی خوش قسمت پہ اترائی ہوا
چاند جیسے اک بدن کو چھو کے آئی تھی ہوا
ہم بھی اک جھونکے سے لطف اندوز ہو لیتے کبھی
جھوٹے بھٹکے اس گلی میں بھی چلی آتی ہوا
اس نے لکھ بھیجا ہے پیپل کے پتّے پر مجھے
کیا تجھے راس آ گئی بجلی کے پنکھے کی ہوا
کیا کہوں اے عابد بجھا پاتا میں اپنی تشنگی
گھونٹ آنے سے ہی پہلے ہو گیا پانی ہوا

عابد مناوری بھی بے حد کامیاب ہو کر مسکراتے ہوئے لوٹ رہے ہیں۔ اور اب ڈوڈہ کے نامور بزرگ شاعر حضرت شوکت فریدی صاحب کو زحمتِ سخن دی جا رہی ہے۔ شوکت فریدی بھی اپنے اشعار پر مناسب داد وصول کر رہے ہیں، مگر افسوس کہ میں ان کا ایک بھی شعر نوٹ نہیں کر سکا۔

اب جموں یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر منظر اعظمی سے کلام سنانے کی درخواست کی گئی ہے۔ ڈاکٹر منظر اعظمی اپنی وضع قطع سے بھی شاعر لگتے ہیں۔ مائیک پر آ کر عنایت کر رہے ہیں ؎

گھر سے باہر رہا کہ گھر میں رہا
تُم سدا لذّتِ سفر میں رہا

داد اس مطلع کا حق ہے۔ مطلع کو دُہرا کر منظر اعظمی آگے فرما رہے ہیں ؎

[illegible] پا گیا جب [illegible]
تنگ بن کر نظر نظر میں رہا
جگنو بولے کہ تم پہ ہو قرباں
ہر گھڑی وہ اگر سفر میں رہا
مجھ سے کیا خود سے بھی بلا نہ کبھی
جانے وہ محو کس سفر میں رہا
چھوڑ کر شہرِ رنگ کیوں منظر
ایک اُجڑے ہوئے نگر میں رہا

غزل ختم کر کے منظر اعظمی "واہ، واہ" اور "سبحان اللہ" کی صداؤں میں مائیک سے لوٹ رہے ہیں۔

دوردرشن سرینگر کے ایڈمن آفیسر جناب عرش صہبائی جانے پہچانے شاعر ہیں اور مختصر بحر میں اچھی اور جاندار شاعری کرتے ہیں۔ دو تین قطعات پیش کرنے کے بعد ایک مرصّع غزل اپنے مخصوص انداز میں سنا رہے ہیں ؎

کوئی مسکن نہ کوئی گھر میرا
غیر محدود ہے سفر میرا
میں ہوں اک لفظ اور وہ معنی
ہے تعارف یہ مختصر میرا
اس کا ہر قول مستند لیکن
ہر سخن غیر معتبر میرا
کیا ستم ہے کہ خشک ہیں آنکھیں
پھر بھی دامن ہے تر بتر میرا
حادثوں نے اسے سنوارا ہے
ورنہ ویران تھا یہ گھر میرا
میں نے چاہا ہے ٹوٹ کر تجھ کو
زندگی اعتبار کر میرا
آپ کا یہ کرم کہ یاد کیا
ورنہ کیا حق ہے آپ پر میرا

عرش صہبائی داد و تحسین کو اپنے دامن میں سمیٹے مائیک سے رخصت ہوئے تو سردار پنچھی صاحب کو زحمت دی جا رہی ہے۔ مائیک پر آ کر پہلے اردو زبان کی شیرینی اور لطافت کی تعریف کرتے ہوئے فرما رہے ہیں:-

"اردو دنیا کی سب سے خوبصورت زبان ہے۔ یہ بدقسمتی [illegible] ہے کہ اس کو نہایت تنگ نظر حکومت ملی ہے جو اردو زبان کو بالکل ختم کرنے کے لئے کمر کسے ہوئے ہے۔ مگر حکومت کی ہزار کوششوں کے باوجود بھی یہ زبان عوام میں مقبول ہے۔"

سردار پنچھی کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے سامعین انھیں صدائے تحسین سے نواز رہے ہیں۔ سردار پنچھی پہلے متفرق اشعار سنا رہے ہیں۔ تحت میں پڑھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ آواز اور انداز دونوں خوب ہیں۔ متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

ابھی تک بھی دھوئیں کی اک لکیر اٹھتی ہے اس گھر سے
کہیں ملبے کے نیچے دب گیا جلتا دیا میرا

ایک ہی پتہ ہے جب تک کوئی کیوں مایوس ہو
ٹہنیو ملتی رہو جب تک ہوا چلتی رہے

گزاری زندگانی ہم نے تیکھی دھار کے نیچے
کبھی اقرار کے نیچے کبھی انکار کے نیچے

سامعین سے ہر شعر پر داد پانے کے بعد اب غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

اندھیروں نے تو دنیا کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا
اُجالوں نے بھی ان کا آج تک پیچھا نہیں چھوڑا

داد مطلع سے ہی عروج پر ہے۔ مطلع دہرا کر سردار پنچھی پھر محفل کو گرمانے چلے ہیں ؎

ہواؤں نے نشیمن کا کوئی تنکا نہیں چھوڑا
مگر ہم نے کبھی تعمیر کا جذبہ نہیں چھوڑا

حسنِ مطلع بار بار پڑھوایا گیا۔ اور اب وہ شعر سنئے جس نے محفل میں اک حشر برپا کر دیا ہے ؎

بڑا ہی خوبصورت گھر بنایا آپ نے ہم نے
مگر اک روشنی کے واسطے رستہ نہیں چھوڑا

"آہ" اور "واہ" کا شور کم ہوا تو فرما رہے ہیں ؎

چھپی ہے آج بھی یادوں ہمارے گھر کے کونے میں
وہ آندھی جس نے کوئی بھی دیا جلتا نہیں چھوڑا
خزاں کی تو یہ خصلت ہے خزاں سے کیا گلہ کیجے
بہاروں نے بھی اپنی شاخ پر پتّہ نہیں چھوڑا

سردار پنچھی اپنا کلام ختم کر کے مائیک سے نہایت کامیاب لوٹ رہے ہیں اور [illegible] مشاعرہ

حضرتی صاحب سے کلام سنانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ سامعین نے اُن کے ہر اچھے شعر پہ داد دی ہے مگر افسوس کہ میں اُن کا کوئی شعر بھی نوٹ نہیں کر سکا۔

اب صرف تین ماہرِ سخن باقی رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر منشاءُالرحمٰن خاں منشاؔ۔ پورن سنگھ ہُنر اور صدرِ مشاعرہ جناب مظہرامام۔ اور جوں ہی نقیبِ مشاعرہ نے ڈاکٹر منشاءُالرحمٰن منشاؔ کا نام لیا، سامعین میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ منشا صاحب مائیک پر آتے ہی فرما رہے ہیں ؎

ہے پرِ سیلابِ رنگ و بُو ہم سے
فصلِ گُل کی ہے آبرُو ہم سے
حُسنِ فطرت کے رازدار ہیں ہم
بلبلیں کرتی ہیں گفتگو ہم سے
صحنِ گلشن میں وقتِ صبح نسیم
آ کے ملتی ہے باوضو ہم سے
نام ساقی کا ہو گیا ورنہ!
میکدے کی ہے آبرُو ہم سے

منشاؔ صاحب خوب جم کر پڑھ رہے ہیں۔ سامعین بھی برابر لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ محفل اسی طرح گرما کر ڈاکٹر منشاؔ صاحب مائیک سے یوں کی گرانبار انجمن میں رخصت ہوئے تو پنجاب کے شاعرِ محترم پورن سنگھ ہُنر سے درخواست کی گئی ہے۔ پورن سنگھ ہُنر ایک ناصحانہ کلام سنا کر اپنی مشہور زمانی غزل پیش کر رہے ہیں۔ چند شعر آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے حاضر ہیں ؎

اس طرح قصے میں لڑکیاں مہکتی ہیں
جیسے کسی گلشن میں تتلیاں مہکتی ہیں
جب نسیم چلتی ہے جھٹکے اُن کی زلفوں کو
چنچل مُسکراتے ہیں ڈالیاں مہکتی ہیں
اب وہ اپنے گھر سے جا سکتا نہیں لیکن
اب بھی اُس کی خوشبو سے کھڑکیاں مہکتی ہیں۔

اب سامعین سنبھل کر بیٹھ رہے ہیں۔ نقیب نے ادب و احترام کے ساتھ صدرِ مشاعرہ جناب مظہرامام صاحب سے گزارش کی ہے کہ وہ اپنے کلام سے نوازیں۔ اس وقت رات کے تین بج چکے ہیں۔ مشاعرہ اپنی آخری منزل میں ہے مگر سامعین کا جوش و خروش باقی ہے۔ صدرِ مشاعرہ مائیک پر آ کر مشاعرے کے نظم و نسق پر اپنا تأثر بیان کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ اگرچہ آج کل مشاعرے غیر معیاری ہونے لگے ہیں لیکن ڈلہوزی کا یہ مشاعرہ اس اعتبار سے مثالی ہے کہ یہاں کے سامعین صاف ستھری شاعری کے دلدادہ ہیں اور اچھے شعر کی کھل کر داد دیتے ہیں۔

ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے صدرِ محترم پہلے ایک نظم پیش کر رہے ہیں جس کا عنوان ہے "نیند" نظم مختصر سی ہے مگر خوب ہے۔ سامعین اپنی بیداری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ نظم ختم کر کے کچھ متفرق اشعار سنائے ہیں۔ دو شعر آپ کی خدمت میں پیش ہیں ؎

موسم کے بدلنے کا کچھ اندازہ بھی ہوتا
جب گھر ہی بنایا تھا تو دروازہ بھی ہوتا
ہونٹوں پہ درختوں کے مناجات نہیں تھی
اب کے ترے صحراؤں میں وہ بات نہیں تھی

اس کے بعد غزل سے نواز رہے ہیں ؎

جیسے کسی طوفان کا خدشہ بھی نہیں تھا
کیا لوگ تھے اندیشۂ فردا بھی نہیں تھا
درویش صفت لوگ تھے بےزادِ سفر تھے
ذہنوں پہ کوئی بارِ تمنا بھی نہیں تھا
کس باغِ طلسمات میں گم ہو گئیں آنکھیں
میں نے تری جانب ابھی دیکھا بھی نہیں تھا
گرتی ہوئی دیوار کو سب دیکھ رہے تھے
اس شہر میں کچھ لوگ تماشا بھی نہیں تھا

مشاعرہ گاہ "واہ واہ" اور "سبحان اللہ" کے نعروں سے گونج رہی ہے۔ مظہرامام صاحب رخصت ہونا چاہتے تھے مگر "ایک اور، ایک اور" کی صداؤں نے اُن کو مجبور کر دیا ہے۔ لہٰذا ایک اور غزل سے نواز رہے ہیں، دو شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

آج کی رات کوئی وار نہ خالی جائے
جنگ دامن سے بھی ایک ہزار کی جائے
آخرِ شب ہے مگر جاگ رہے ہیں تارے
شب کو بستر پہ تری نیند اُچھالی جائے

صدرِ مشاعرہ جناب مظہرامام صاحب تالیوں کی گونج میں مائیک سے واپس ہو رہے ہیں ———
اس طرح یہ مشاعرہ رات کے تقریباً ڈھائی بجے اختتام کو پہنچا۔

اِس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ ڈلہوزی کا یہ تیسرا سالانہ مشاعرہ گزشتہ دو مشاعروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور کامیاب رہا۔ یہاں کے سامعین صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ اچھے شعر پر کھل کر داد دیتے ہیں اور جو شعر انہیں ناگوار گزرتا ہے اُسے برداشت کر لیتے ہیں۔ مجموعی طور پر تمام شعرائے کرام نے اپنی پوری وجاہت کے ساتھ اپنا کلام پیش کیا ہے اور جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے کہ ڈلہوزی کی مجموعی آبادی دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور یہ چھوٹا سا شہر پہاڑوں کے درمیان بسا ہوا ہے، یہاں اتنے اعلیٰ پیمانے پر مشاعرے کا انعقاد اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اُردو شاعری زندۂ جاوید ہے اور مبارک ہیں وہ لوگ جو پہاڑوں پر بھی محفلِ شعر و سخن کا لائقِ تحسین انعقاد و اہتمام کرتے ہیں ———

اسحاق زرگر۔ شاہین فردوسی۔ اسیر کشتواڑی۔ خالد حسین۔ سعد اللہ شاہ۔ بشیر بھدرواہی۔ پروفیسر اسد اللہ وانی۔ منشور بانہالی وغیرہ بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں جن پر حفیظ میرٹھی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

اسی کی راہ میں آنکھیں بچھانے کی منزل
وہ حسنِ نام جو نہیں محتاجِ تہمت افزائی

مینارۂ فلک بوس

[illegible]
[illegible]

ہندی و اُردو افسانہ نگاری میں عالمی شہرت کے مالک

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

جن کے اُردو افسانوں کے دو مجموعے "مان سروور" اور "دھڑ بار کھادل نے" کو بہار اور اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ نے انعامات سے نوازا۔ اور جنھیں نیشنل لٹریری سرکل مُرادآباد کی طرف سے ۵۱ سو روپے کا چیک اُن کی چالیس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں پیش کیا گیا۔ اب

کِرنوں کے پدچِن

کے رُوپ میں ایک نرالے انداز سے ہندی ساہتیہ میں قابلِ فخر اور یادگاری اضافہ کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔

اِس نادرۂ روزگار تصنیف کے باعث ڈاکٹر اودے سرن ارمان کا نام نامی ہندی ساہتیہ میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور کوئی بھی ہندی ساہتیہ کا مؤرخ "کرنوں کے پدچن" اور "ڈاکٹر اودے سرن ارمان" کے ذکر کے بغیر اپنی ریسرچ کو مکمل نہ کہہ سکے گا۔

ایک انقلابی ذہن، جو خدا کے وجود کو سائنس کی روشنی کے ساتھ ساتھ تسلیم کرتا ہے مگر اندھ وشواس کے گورکھ دھندے سے پورے انہماک کے ساتھ بغاوت کرتا ہے۔ قدامت اور جدیدیت کا یہ سنگم "کرنوں کے پدچن" میں انتہائی اہم موضوعات پر زندگی میں پیش آئے واقعات کی روشنی میں ایسے ایسے مسائل پر مُدلّل بحث کرتا ہوا قاری کے دِل و دماغ پر اپنے نقوش اس سُبک روی سے چھوڑتا ہے کہ قاری بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ ع۔ جو کہا تو نے وہ میرے دِل میں تھا۔

"کرنوں کے پدچن" میں آپ ارمان صاحب کی یادداشتوں میں بڑی انمول باتیں پائیں گے۔ ہندی رسم الخط میں اپنی طرز کی یہ واحد کتاب پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔

تقسیم کار:- **شانِ ہند پبلی کیشنز**

فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲



اولڈ جنریشن

شکیلہ رفیق

مینو ابھی ابھی اپنے دیور اشعر کے ساتھ موٹر سائیکل پر گئی ہے۔ بغیر دوپٹے کے رنگ برنگ شوخ سوٹ میں وہ دہکتے ہوئے انگارے کی طرح اشعر کی پیٹھ سے لگی بیٹھی تھی اور جب یہ انگارہ دور کسی کار کی پچھلی ہیڈ لائٹس کے جھنار رہ گیا تو میں کھڑکی سے ہٹ کر آئینے کے سامنے خود کو دیکھنے لگی ہوں۔

میں ـــ اپنے زمانے کی نوشی جلال! وقت کی انتہائی موڈی لڑکی جو پرانے اصولوں کے ساتھ ساتھ پرانے لوگوں سے بھی بے حد بیزار رہتی۔ مجھے بزرگوں کی روک ٹوک بالخصوص بار بار بے حد بُری لگتی تھی۔ برتھ ڈے پارٹیز یا ایسی ہی اور پارٹی میں جب ہم لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں ساتھ انگلش میوزک پر تھرکتیں تو بہت سے ...ں اور بچیوں کے منہ بن جایا کرتے۔ اسی لیے پانی عمر کے اس دور میں داخل ہوئی جب بزرگ نصیحت دیتے ہوئے چند لمحے سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ منہ پھٹ لڑکی ہے، خدا جانے کیا جواب دیدے۔

تب میں نے ہی اپنا رویہ یکسر تبدیل کر لیا تھا۔ اب میں کسی کو زیادہ منہ نہ لگاتی تھی اور وہی کرتی تھی جو میرا جی چاہتا تھا۔ اس خود سری کو شہ دینے میں ممی آگے آگے تھیں۔ اگرچہ پاپا کو کبھی کبھار ٹوک دینے کا خیال آ بھی جاتا تو ممی don 'T be silly darling کہہ کر پاپا کو ٹیک روکنے سے باز رکھتیں اور وہ مسکرا کر چپ ہو جاتے۔ ہمارے پاس بے شمار دولت تھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ فارورڈ وہی انسان بن سکتا ہے جس کے پاس دولت کی کمی نہ ہو۔ یوں میں نت نئے فیشن اور بدلتے زمانے کا ساتھ دینے میں سب سے آگے رہتی تھی۔

میں بڑی موڈی لڑکی تھی۔ بس ایک دم ہی کسی بات کی دھن سوار ہو جاتی اور پھر اُسے کر کے ہی دم لیتی۔ اسی طرح ایک بار یہ جنون سوار ہو گیا کہ بس سال پڑھائی کی جائے اور خوب اچھی طرح کی جائے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کتابوں کے ڈھیر میں گم ہو گئی۔ اس نے قبل بھی اچھے ہی نمبروں سے پاس ہوا کرتی تھی مگر وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے انٹر میں لڑکیوں میں تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ وہ دن اس وجہ سے بھی نہیں بھلایا جا سکتا کہ اس کے بعد ایسا کبھی نہ ہُوا اور میں دوبارہ نچلے گڑھے میں لگ گئی۔

اسی ہنگامے میں ایک روز مجھے حامی مل گیا اور پھر جلد ہی ہماری شادی ہو گئی۔ ہاں! تو میں اُسی روز کو یاد کر رہی تھی جب میں نے ٹاپ کیا تھا ممی اور پاپا بے انتہا خوش تھے۔ خوش تو میرے بہن بھائی بھی تھے مگر اس کامیابی سے جو شخصیت ان سب سے بھی زیادہ مسرور تھی وہ ممی کی بہن آنٹی بینا وہ بچپن سے ہی مجھے بہت پیار کیا کرتی تھیں اور اکثر میری تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیا کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا "اس لڑکی کی آنکھیں خطرناک حد تک ذہین ہیں، ان آنکھوں میں مجھے بلند منزلوں کا نشان ملتا ہے اور یہ بڑی ہو کر ضرور اپنے آپ کو منوا لے گی" جبکہ میں دل ہی دل میں ان کی اس خوش فہمی پہ ہنسا

گر فرق ... مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ میں کچھ بھی دیکھ نہ سکوں گی۔ ان آنکھوں کے سحر سے تو کئی دامِ اُلفت میں گرفتار ہو جائیں، یہ [illegible] ہے، مگر میں ان سے یہ سب نہ کہتی اور اُن کے سینے میں منہ چھپا کر مزے سے جھوٹ بولتی۔

"آنٹی، ضرور، ضرور...... آپ دیکھئے گا میں بالکل بوڑھی ہو کر کیا لگتی ہوں۔" [illegible] محبت سے میری آنکھیں چومنے لگتیں۔

رزلٹ کے بعد سے میرے فرینڈز کا مستقل ہنگامہ رہتا اور روز ایک نیا ہنگامہ ہوتا۔ کبھی پکنک کبھی مووی، مگر ابھی تک وہ نہ ہو سکا تھا جو سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا، یعنی ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیونکہ اس سلسلے میں پپا اور ممی سے میرے چند اختلافات ہو گئے تھے اور میرا منہ یہ سوچ کر ہی کڑوا ہو رہا تھا کہ طرح طرح کے نمونے آکر بور کریں گے۔ سارا مزا کرکرا ہو جائیگا۔ کوئی لڑکوں سے بات کرنے پر معترض ہو گا اور کسی کو ڈانس سے اخلاق بگڑتا نظر آئے گا۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ ہمارے پورے خاندان میں ہمارا گھرانا سب سے ایڈوانس تھا۔ ورنہ ہمارے گھرانوں کے علاوہ سب ہی نئے زمانے کی باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں اکثر ہم پر اور خصوصیت سے مجھ پر بڑے اعتراضات ہوتے تھے اور میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس خوشی کے موقع پر بزرگ بور اور ذرا سا بھی ڈکو ہیں۔ تھوڑی سی بحث کے بعد ممی اور پپا ہار گئے۔ یوں بھی اکلوتی بیٹی ہونے کے ناطے اکثر فتح میری ہی ہوتی تھی۔

پھر یہ طے ہو گیا کہ میری پارٹی میں صرف ینگ جنریشن اور میرے دوست آئیں گے۔ ممی کا خیال تھا کہ وہ اپنے ملنے والوں کی دعوت بعد میں کرلیں گی۔ اور بہتر بھی یہی تھا کیونکہ میں نے ممی سے کہہ دیا تھا کہ یہ بہت اچھا پروگرام رہے گا اور اس ہنگامے میں اس روز میں گھر سے سارے دن کے لئے غائب ہو جاؤں گی، اور ممی نے مجھے خوب پیار بھرے گھونسے لگائے تھے۔

میں اپنی کار لے کر اپنی بیسٹ فرینڈ زوبی کے ساتھ اپنے تمام دوست لڑکوں، لڑکیوں کو انوائٹ کرنے چل دی۔ رشتہ داروں میں سے صرف وہ لوگ منتخب ہوئے جو ہمارا ساتھ دے سکتے تھے۔

آنٹی ربینا کا بیٹا راجو جو عمر میں میرا ہم عمر تھا اور جسے میں پیار سے راجو کہتی تھی، وہ میری لسٹ میں سب سے اوپر تھا کیونکہ وہ سویٹ آنٹی ربینا کا بیٹا جو تھا۔ میں نے آنٹی ربینا کے گھر کے سامنے گاڑی روکی اور بغیر بیل بجائے زوبی کا ہاتھ تھامے آنٹی آنٹی پکارتی دندناتی ہوئی اندر پہنچ گئی۔ آنٹی ربینا اپنے کمرے سے نکل آئیں، مجھے خوب پیار کیا۔ جب سے میں نے نمایاں کامیابی حاصل کی تھی، وہ مجھے مزید پیار کرنے لگی تھیں۔ میں نے زوبی کا تعارف کرایا اور راجو کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ راجو کہیں باہر گیا ہوا ہے۔

"اچھا مائی سویٹ آنٹی! تو آپ ہی سن لیں کہ ہفتے کی شام میری کامیابی کی خوشی میں ایک شاندار پارٹی ہے۔ ہم رات دیر تک ہنگامے کریں گے اور راجو کو تو شاید وہیں روک لوں، کیونکہ فکس روز تو چھٹی ہو گی نا" میں نے آنٹی کو سب کچھ تفصیل سے خوش ہو کر بتایا۔ آنٹی شفقت سے مسکرائیں، پھر بولیں۔

"ہاں راجو رکنا چاہے تو شوق سے رک جائے مگر ڈارلنگ میں تو واپس آجاؤں گی، کیونکہ مجھے اپنے بستر کے علاوہ کہیں اور نیند نہیں آتی۔"

"مگر آپ کا...... ہی کب ہے آنٹی جان! آپ آرام سے گھر میں سوئیے گا۔" میں نے اُن کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"کیا مطلب۔!؟" اُن کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"دراصل.... پلیز آپ مائنڈ نہ کیجئے گا آنٹی! بات یہ ہے کہ اس پارٹی میں میں نے اولڈ جنریشن کو نہیں بُلایا ہے۔" میں نے کہا۔

اُن کا چہرہ دُکھ سے یا پھر جانے کس کیفیت سے ایک دم سفید ہو گیا مگر اس وقت میری سوچ میں اتنی گہرائی نہ تھی کہ میں اُن کے اندر جھانک سکتی۔ لہٰذا میں نے ایک بار پھر راجو کو جلد بھیجنے کی ہدایت کی اور اُن کے گال چوم کر چلی آئی۔

پارٹی میں ہم نے رات گئے تک خوب ہنگامہ کیا اور مجھے آنٹی ربینا کا خیال تک نہ آیا۔ ڈھائی تین بجے رات جب سب اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر گھروں کو چلے گئے، تب راجو نے بتایا کہ [illegible] میری اور زوبی کی واپسی کے بعد روئی تھیں۔ انھیں اس دن کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ میں خوب ہنسی اور میں نے راجو سے کہا۔

"راجو ڈیئر! مجھے آنسو بہانے سے بڑی چڑ ہے۔ مجھے آنٹی سے یہ اُمید نہ تھی۔ اور پھر آنٹی بہت بھولی ہیں۔ تم خود ہی بتاؤ، وہ یہاں آکر کیا کرتیں؟"

راجو خود بھی ان باتوں کا قائل نہ تھا، مگر اس وقت معاملہ چونکہ اس کی ماں کا تھا، اسی لئے شاید وہ بھی کچھ جذباتی ہو رہا تھا۔ بولا۔

"وہ خوش ہوتیں نوشی، بہت خوش ہوتیں" میں ایک بار پھر قہقہے لگانے لگی۔

"تو کیا تمہارے خیال میں ابھی یہاں سے جو یہ سب لوگ گئے ہیں، رونے کے لئے آئے تھے؟" میں نے کہا، اور راجو کو بھی ہنسی آگئی۔

یہ سب باتیں اب خواب و خیال ہو چکی ہیں۔

اب میرے دو بچے ہیں، شیراز جسے ہم پیار سے "رازی" کہتے ہیں اور بیٹی مینو الاجبین کا پیار کا نام میرے شوہر حاجی کی پسند سے مینو ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں حاجی سے ملاقات ہوئی اور پھر جلد ہی ہم نے شادی کرلی۔ حاجی کے اور میرے خیالات میں بے حد یکسانیت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے جھگڑے بہت کم ہوتے تھے خصوصاً بچوں کی پرورش و تربیت کے سلسلے میں ہم بالکل ہم خیال تھے۔ اسی لئے جب ہمارے بچوں نے اپنی اپنی پسند سے زندگی کے ساتھی چنے تو ہم دونوں خوش ہو کر ان کی مسرتوں میں شامل ہو گئے۔

دو سال قبل رازی نے گوشو سے شادی کی تھی اور اب ایک چھوٹی سی بچی ڈولی کا باپ تھا۔ اُس سے اگلے برس مینو نے آفو کو پسند کیا۔ اب دونوں بہن بھائی خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔

ابھی کچھ دیر قبل مینو اپنے دولہا اظہر کے ساتھ آئی تھی اور سوچتی تھی کہ [illegible]

"میں جانتی ہوں تو کیا کہنے آئی ہے۔" میری مسکراہٹ معنی خیز تھی۔

"ہائے کیا چیز ہوتی ہے Mother [illegible] ممی!" وہ اظہر سے جھک کر بولی۔ دیکھا ظفر نے تھا کو بادِ [illegible]

کہ پرسوں میری [illegible]

"ہاں!" میں نے بھی اسی طرح کہتے ہوئے اُسے سینے سے چمٹا لیا۔ مجھے تو پچھلے ماہ ہی یاد آگیا تھا کہ نومبر کی دس کو مینو کی شادی کو ایک سال ہو جائے گا اور میں نے حاجی اور رازی کو دانستہ نہیں بتایا تھا اور آزمانا مقصود تھا کہ کیسے کسے خود یاد آتا ہے۔ رازی کو تو پرسوں یاد آگیا تھا اور پھر اسی نے حاجی اور گوشو کو بھی بتا دیا تھا۔

جونہی مجھے یاد آیا تھا، میں نے بازار جا کر مینو کے لئے ایک کاسنی رنگ کی قیمتی ساڑھی اور گارنٹ کا ایک ہلکا سونے کا سیٹ خرید لیا تھا اور آفو کے لئے سوٹ کا کپڑا مع ایک خوبصورت رسٹ واچ، ان تحفوں کی بابت میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ میں مینو کو سرپرائز دینا چاہتی تھی۔

"گوشو کہاں ہے؟" مینو نے پوچھا۔ اُس کی خوشی سے خوب کھلتی تھی اور دونوں نند بھاوج کی بے تکلف سہیلیاں زیادہ لگتی تھیں۔۔

"ڈولی کو نہلا رہی تھی" "آؤ وہیں آ جاؤ تم دونوں" ... نے کہا۔ پھر ہم تینوں ڈولی کے کمرے میں آگئے جہاں ڈولی کو نہلانے کے بعد اُسے کپڑے تبدیل کروا رہی تھی۔ مینو نے جب اُسے بتایا تو گوشو بولی۔

"ہاں، پرسوں رازی نے یاد دلایا۔ مما کو یاد تھا انہوں نے ہم میں سے کسی کو نہیں بتایا" گوشو کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"آفو نہیں آیا؟" میں نے مینو سے پوچھا۔

"وہ حضرت گاڑی لے کر دوستوں کو انوائٹ کرنے نکل گئے اسی لئے مجھے اعتو کے ساتھ موٹر سائیکل پر آنا پڑا۔ وقت کم ہے اور ابھی بہت سے لوگوں کو انوائٹ کرنا تھا!" مینو نے کہا، پھر ساتھ کھڑی گوشو کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"گوشو ڈیئر! بس آ جانا تو خوب enjoy کرو گی۔ آفو کے بچپنے ایسے ایسے اور کیے پیر اور پروگرام ہیں کہ بتاؤں کیا، بس آ کر دیکھ لینا۔" مینو بے حد خوش ہو رہی تھی، پھر اُس نے گوشو سے کہا۔

"یار پلیز! تم صبح سے آ جانا، کچھ ہاتھ وغیرہ بٹانا"

گوشو نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ میں بولی۔

"گوشو تم بھی اپنی سی ڈولی کے ساتھ بھلا تمہاری کیا ہیلپ کر سکو گی؟ ہاں... ایسا کریں گے کہ میں شام کی بجائے صبح ہی سے آ جاؤں گی۔"

مینو نے ایک ہلکی سی پُر مسرت چیخ ماری، پھر خوب ہنسی۔

"ہائے مما! How sweet you are مما جان! اس پارٹی میں اولڈ جنریشن کا داخلہ قطعی بند ہے۔ یہ کہتے ہوئے مینو نے اعتو کو آنکھ ماری۔

"اچھا" میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"مگر مما آپ فکر نہ کریں، جب گوشو واپس آنے لگے گی تو میں اُس کے ہاتھ آپ کو سب چیزیں بھجواؤں گی" اُس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور پھر مجھے اور گوشو کو بائے بائے کہہ کر ہرانی چلی گئی۔

مینو واپس جا چکی ہے..... میں خود کو آئینے میں دیکھ رہی ہوں ..... جدید انداز میں بندھی ہوئی ساڑھی ..... کانوں اونچے تراشیدہ بال ..... میں نے ہر دَور میں مینو کا ساتھ دیا ہے ..... پھر آج! ..... یہ آج میرا شمار اولڈ جنریشن میں کیونکر ہو گیا ..... ؟ میں، جو آنسو بہانے سے چڑتی تھی ... میری آنکھوں میں پانی کیوں ہے؟ مینو کہتی ہے وہ اپنے پارٹی میں بچا ہوا کیک اور دیگر اشیاء بھیجے گی۔ وہ سمجھتی ہے کہ یہ چیزیں کھا کر مجھے وہ مسرت حاصل ہو جائے گی جو پارٹی میں شرکت کر کے ہوتی .....

کتنی نادان ہے ..... یہ نہیں سمجھتی کہ اس موقعہ پر ماں کی خوشی میں جو وسعت ہو گی، اُس کی سہیلیوں، دوستوں اور تمام لوگوں کی خوشیاں اُس وسعت میں سما جائیں گی۔

بس چند گھنٹے ہا! ہا ہو مچا کر، اپنے گھروں میں جا کر تھک کر سو جائیں گے، مگر ماں جاگتی رہے گی، اُس کی آئندہ زندگی کے لئے دُعا کرتی رہے گی۔

یہ ..... یہ کیا؟ اچانک کوئی جیسے جسم سے میرے وجود میں آ گھسا ہے ..... مجھے اپنے چہرے کے نقش کچھ بدلے بدلے سے لگے ہیں ..... میں دو قدم آگے بڑھ آئی ہوں ..... خود کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں ..... یہ ..... یہ میرے نقوش آنٹی رینا سے کس قدر مل رہے ہیں ..... کمال ہے ..... ! میں نے تو کبھی غور ہی نہیں کیا کہ میں اُن سے کتنی مشابہ ہوں۔

غزلیں

ہم بُھلاتے رہے مگر یاد آیا
آج وہ رشکِ قمر یاد آیا
جس نے مجھ کو بُھلا دیا تھا ذہن
رفتہ و شب شام و سحر یاد آیا
اُن کی محفل سے جو آئے اُٹھ کر
دل کبھی اور جگر یاد آیا
چھوڑ دیں دیدۂ حسرت کی راہیں
جس گھڑی آپ کا در یاد آیا
حُسن پابند نہیں ہے انجمؔ
عشق پابندِ نظر یاد آیا

مجید انجم ساگری

چلتا ہوں سر اُٹھا کے مخالف ہوا ہے
غش غش ہے کائنات مرے رکھ رکھاؤ پہ
تعمیرِ حیات کرنے ہیں تعمیر کم سواد
انساں کی ہڈیوں کے دہکتے الاؤ پہ
کل پھر یہاں نہ ہو گی تماشائیوں کی بھیڑ
ہر شخص لوٹ جائے گا اپنے پڑاؤ پہ
میں نے زمینِ دل سے اُگا کر نئی حیات
باندھا ہے بادبان وقت کے چنچل بہاؤ پہ
انکارِ جرم کرنے سے پہلے یہ سوچ لو
مُہرِ ستم لگی ہے مرے گھاؤ گھاؤ پہ
یک ایک کر کے چھوڑ گئے سارے ہم سفر
بسملؔ رہ حیات کے مشکل گھماؤ پہ

صوفی بسمل نقشبندی رتالی

ماہنامہ "اِنشاء" کا خاص شمارہ

ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ

مطالعہ کا ایک نیا پسِ منظر

ہم آپ کے مؤقر وسیلے سے ایک بہت اہم اعلان شائقینِ علم و ادب تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

ادارہ "اِنشاء" بہت جلد" ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ" کے عنوان سے ایک خاص نمبر شائع کرنے والا ہے جس میں پہلی بار منتخب اردو و غیر اُردو شاعروں اور ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ کو یکجا پیش کیا جارہا ہے۔

یہ خاص نمبر "اِنشاء" کی ایک بہت اہم اور منفرد کوشش ہوگی۔ یقیناً شائقینِ علم و ادب اِس میں دلچسپی رکھتے ہوں گے کہ جن قلمکاروں نے محبت کے اُن کے خیالات اور کرداروں کو جنم دیا خود اُنھوں نے کس طرح اور کیسی محبت کی ہوگی۔ اِس شمارے کے چالیس پچاس مضامین بیک وقت سنجیدہ و دلچسپ، پُرتجسس اور تحریک سے بھرپور ہیں، جو علمی و نفسیاتی پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔

اِس خاص شمارے میں ایک نیا، تازہ، جوان اور پُرشباب ادب پیش کیا جارہا ہے جو تکنیکی اور خالص ادب ہونے کے باوجود پڑھنے والوں کو مسرور اور شاداب کرے گا۔ قارئین اپنے کئی چہیتے افسانہ نگاروں، ناول نویسوں، مفکر ادیبوں اور فلم رائٹروں کی ذاتی زندگی کے تجربات سے محظوظ ہو سکیں گے۔ اِس شمارے کے بعد کسی فن پارے کے مطالعہ اور تجزیہ کا ایک نیا طریقہ جنم لے گا۔ یعنی بیشتر پڑھے ہوئے شعری و افسانوی ادب کے مطالعہ کے لئے بھی ایک نیا پسِ منظر فراہم ہو سکے گا۔ پہلی بار قارئین کسی تخلیق کار کے ذہن میں براہِ راست اُتر سکیں گے اور اُن کی فنی تجزیہ کی صلاحیت میں اضافہ ہو سکے گا۔ ادیبوں کی زندگی کی صاف، متحرک اور بولتی ہوئی رُومانی سچائیاں اُردو قاری کے سامنے پہلی بار بے نقاب ہوں گی۔ یہ نمبر کافی ضخیم ہوگا جو عام شماروں سے الگ پیش کیا جائیگا۔ کسی بھی لائبریری کے لئے یہ ایک اہم اور تاریخی دستاویز ہوگا۔

اِس شمارے میں جن ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ مرتب کی گئی ہے اُن میں سے بعض نام یہ ہیں:۔

رابندر ناتھ ٹیگور، اقبال، شبلی نعمانی، مومن، داغ، قلی قطب شاہ، فانی، پریم چند، اختر شیرانی، سعادت حسن منٹو، شاد عارفی، مجاز، بلراج ورما، خالد سُہیل، آغا جانی کاشمیری، جوش، فیض، جگر، میراجی، ساحر، غالب، جواہر لعل نہرو، پشکن، بائرن، کارل گستوینگ، شوپنہار، روسو، کارل مارکس، ٹالسٹائی، ہمت رائے شرما، ایچ۔ جی۔ ویلز، پی۔ بی شیلے، ایڈگر ایلن پو، آسکر وائلڈ، میر درد، مانی جائسی، ذکا وغیرہ۔

خاص قلمکاروں کے نام فی الوقت یہ ہیں:۔ ڈاکٹر قمر رئیس، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، سید منیر نیازی، فرمان فتحپوری، جگدیش چندر ودھاوان، مظفر حنفی، جوش ملیح آبادی، رئیس الدین فریدی، ظ۔ انصاری، اوم کرشن راحت، سید شہاب الدین دسنوی، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر عبد الحق، مناظر عاشق ہرگانوی، ایش کمار، ہمت رائے شرما، بلراج ورما، آغا جانی کاشمیری، خالد سُہیل، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، ڈاکٹر وہاب قیصر، تسنیم اور ف۔ س۔ اعجاز وغیرہ۔

دیگر معلومات کے لئے اِس پتہ پر خط و کتابت کریں

مدیر ماہنامہ انشاء۔ انشاء پبلی کیشنز ۶۔ اے کنائی سیل اسٹریٹ کلکتہ ۷۳

گزشتہ سے پیوستہ

ضربِ کاری



راجپوت اقبال احمد

مجسمہ ہاتھ میں اُٹھائے وہ دوڑتا ہُوا دروازے سے نکل کر کمرے میں آیا اور بوڑھے کی طرف بڑھا جو کُرسی پہ لیٹا ہُوا خرّاٹے لے رہا تھا۔

"خدا حافظ!" اُس نے کہا اور مجسمہ سر سے بلند کیا۔ پھر اُس کا ہاتھ نیچے آگیا، مگر نشانہ بڈھے کا سر نہیں تھا۔ مجسمہ میز سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ اُس کے ساتھ ہی ہربی بھی فرش پر لمبا ہوگیا۔

"ہش۔ ششش!" اُس نے جانے کس سے کہا۔ پھر ٹینگارنی کی طرف دیکھا جو بدستور گہری نیند میں ڈوبا ہُوا تھا۔ پھر وہ رینگتا ہُوا باورچی خانے میں آگیا جہاں رونی ایک نئی بوتل کا کارک دانت سے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں اچانک ہی گر پڑا تھا" اُس نے رونی سے کہا، پھر اُٹھ کر اسکاچ کا گلاس بھرا اور اُسے حلق میں اُنڈیل کر مسکرایا۔ "میرے ذہن میں ایک خیال آگیا تھا، بتاؤں کیا خیال تھا؟ حالانکہ اُسے قتل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے، تاہم ہمیں ذہانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

رونی نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر بوتل سے اُلجھ گیا۔

"اب چونکہ میں قانونی عمر کو پہنچ چکا ہُوں" ہربی کہہ رہا تھا "اس لئے ہمارا یہ وحشی اور ظالم معاشرہ مجھے سزا دے سکتا ہے، جبکہ تمہارے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ ہمیں بہرحال اپنی حفاظت کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔"

"یقیناً"

"ٹھیک! اس لئے اب جلّاد کا یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ اگر تم پکڑے بھی گئے تو چھوٹے ہونے کی وجہ سے تمہاری جان بخشی ہو سکتی ہے۔"

رونی چند ثانیوں تک ہربی کی صورت دیکھتا رہا، پھر بوتل کو منہ سے لگا کر دو گھونٹ بھرے۔ "نہیں" وہ بولا۔ "کیا تم اپنے پیارے اور مخلص دوست کو برقی کرسی پر تڑپتا دیکھنا چاہتے ہو رونی؟ کیا یہی چاہتے ہو تم؟"

"نہیں ہربی! میں یہ نہیں چاہتا، ہرگز نہیں، قسم لے لو مجھ سے!"

دونوں چُپ ہو گئے۔ نشے کی وجہ سے ہربی کو ہچکیاں آنے لگیں۔

"سنو" ہربی نے پاگلوں کی طرح سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "ہم بالکل بچوں کی سی حرکتیں کر رہے ہیں، بچوں کی سی! ہمیں عقل سے کام لینا چاہیئے۔ کیا ہم عام لوگوں کی طرح بے ہودہ اخلاق کا مظاہرہ کریں گے؟"

"ہرگز نہیں!"

"بالکل ٹھیک! اوہ رونی، اگر ہم اِس وقت اپنے مشن میں ناکام ہو گئے، اگر ہم نے اِس موقعہ کو ضائع کر دیا، تو ہم اِس بوجھ کو ذہن پہ لئے کیسے جی سکیں گے؟ ہم ان بوڑھے لوگوں سے بھی بدتر ہو جائیں گے ہم بالکل عام آدمی بن کر رہ جائیں گے۔ ہمیں ہمت سے کام لینا چاہیئے رونی! ایک طرف آزادی کا قلزم ہے اور دُوسری طرف ہمیشہ کی تقلید اور غلامی!"

"غلامی؟" رونی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"ہاں میرے عزیز ترین دوست، بڈھے کی کھوپڑی پر مجسمہ لٹک رہا ہے۔ اس کے گرنے اور نہ گرنے پہ ہماری آزادی اور غلامی کا دارومدار ہے۔ تمہیں کیا چیز پسند ہے؟"

"اور شراب؟"

فیصلہ کرلو! ابھی اتنا وقت تم سنبھالا
سہ تمہیں فوری طور پر فیصلہ کرنا ہے۔"
"ٹھیک ہے ... نے سرہلا کر کہا۔" مجھے
منظور ہے۔ مجھ ... میں کرنا پڑے گا ہیری۔!
پھر اس سر جھکا لیا

ہیری نے نفرت بھری نگاہوں سے روڈنی کو گھورا۔ "بزدل!" وہ چلایا۔ "آج سے تمہارے میرے تعلقات ختم! یہ کام اب میں خود کروں گا اگر میں پکڑا گیا تو خود برقی کرسی پر جا کر بیٹھ جاؤں گا تم سے کہیں زیادہ آزاد آدمی کی حیثیت سے اور اسی آزادی سے میں مر جاؤں گا' اکیلا! تم اب گندی شراب پیتے رہو"

ہیری کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں پھر اس نے روڈنی کی آنکھوں کے سامنے انگلیاں نچائیں اور لڑکھڑاتا ہوا دوبارہ لونگ روم میں آ گیا۔ بڈھا فینگارنی ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ ہیری کے جسم کا ارتعاش تھم گیا۔ وہ فرش پر پڑے ہوئے مجسمے کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے مجسمہ اٹھایا اور اپنے ہاتھوں پر تولنے لگا۔ وہ بہت بھاری تھا اور اس سے یقیناً کسی آدمی کا سر آسانی سے توڑا جا سکتا تھا۔ اسکی ایک ہی بھرپور ضرب آدمی کو فوری طور پر موت کی آغوش میں دھکیل سکتی تھی۔ ہیری کا جسم تن گیا۔ پھر اس نے خراٹے نشر کرتے ہوئے بڈھے کے گرد ایک چکر لگایا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر میز پر رکھے ہوئے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ گلاس میں اسکاچ جھلملا رہی تھی اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ اسے کھانسی آ گئی۔ اس نے باورچی خانے کی طرف دیکھا۔ کھلے ہوئے دروازے سے روڈنی فرش پر کسی بھیگی ہوئی گڑیا کی طرح ساکت پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے گلاس اپنی آنکھوں کے سامنے گھمایا، پھر کرسی پر سوئے ہوئے بڈھے کو گھورنے لگا۔

لونگ روم کی کھلی کھڑکی سے دھوپ اندر گھس آئی۔ سنہری دیواروں، سیاہ چھت، کتابوں' اور

نعت

عبدالعزیز خالد



ذات مستجمع الصفات تری
از ازل تا ابد حیات تری
تیرے پرتو سے رونقِ ارض و سما
جلوہ گہ ہے یہ کائنات تری
یا نبی! یا خیارِ خلق اللہ
شہریاری ہے شش جہات تری
دین و دانش کا ست تیرے کلمے
لاکھ باتوں کی ایک بات تری
تیرے اقوال ثابت و محکم
برحق آیاتِ باہرات تری
تیرے طرزِ کلام میں ترسیل
جانِ ابلاغ ہے لغات تری
شان ہر آن اک نئی آن کی
ابھرتی ہے واردات تری
دلِ بیدار ہے دلِ پُر درد
کیسے معلوم مشکلات تری
سود بہبودِ آدمی کے لئے
ہر صلا تیرا' ہر صلاۃ تری
لیلۃ القدر سے کہیں بڑھ کر
جاگرن کی ہر ایک رات تری
میں کہ تیرا غلام خاص الخاص
مجھ پہ ہے چشمِ التفات تری
مجھ سے ہاتف نے یہ کہا' خالد!
ذکرِ احمد میں ہے نجات تری
عشق اس کا ہے پاسباں تیرا
شاخِ آہو پہ ہے برات تری

خوش ہو نقشِ دوام عظمت پر
ڈھل گئی عمرِ بے ثبات تری

ریکارڈوں کے ڈھیر اور بے گنتی خنزیدہ پانڈنٹ دن کی روشنی میں بالکل مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ بچھے ہوئے قالین پر کئی گلاس اور خالی بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں۔ کمرے کی فضا شراب کی بدبو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ہرلی کے چہرے پر دھوپ پڑی تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور پھر کمرہ خالی دیکھ کر اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

روبی اُس کی چیخ سن کر اُچھل پڑا۔ اُس نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ دونوں کی حیرت زدہ نگاہیں کمرے میں چکرانے لگیں۔ پھر دونوں بھاگ کر اوپر خواب گاہ میں جا گھسے۔ اُنھوں نے بستر پر، بستر کے نیچے اور الماری میں دیکھا، پھر نیچے آکر باورچی خانے اور نعمت خانے میں جھانکا۔ ہال کی الماری دیکھی، غسل خانے میں دیکھا۔ پھر ذرا ہچکچاہٹ کے بعد شاور کا پردہ ہٹایا، مگر کہیں کچھ نہیں تھا۔

"آؤ کار میں دیکھیں، کار کو چیک کریں، شاید وہ سب"

"آؤ چلو!"

دونوں باہر آئے، پھر کشش پیدا ہوتے ہوئے گیراج کی طرف بڑھے۔ گھوڑے کے درخت صبح کی ہوا میں جھوم رہے تھے، مگر اُنھیں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ گیراج میں آئے رات ہرلی نے کار یہیں کھڑی کی تھی۔ گیراج کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اُنھوں نے خالی گیراج کو گھورا، پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دوبارہ خالی گیراج کو گھورنے لگے۔

"میری جیگوار؟" ہرلی نے بچوں کی طرح رونی صورت بنا کر کہا۔ "چلی گئی۔"

دونوں پھر دوڑتے ہوئے لونگ روم میں آئے۔ اور ساکت کھڑے ہو گئے۔ پھر اُن کے جسم لرزنے لگے۔

"تصویریں" ہرلی چلّایا۔ "تمام قیمتی تصویریں غائب ہیں۔"

کمرے میں جیسے زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ ساری درازیں کھلی ہوئی تھیں، کئی فرش پر پڑی ہوئی تھیں۔

"اوہ! میری ماں کے زیورات!" ہرلی روہانسی آواز میں چلّایا۔

پھر وہ خواب زدگی کے سے عالم میں پورے اپارٹمنٹ میں گھوم گئے۔ دفعتاً اُن کی خوف و دہشت بھری آوازیں سناٹے کو چیرنے لگیں۔

"ہمارے کپڑے... ہمارے سارے کپڑے"

"ڈیڈی کا سامان!"

"میری انگوٹھی۔ منیب کے ہیرے کا" مہاتما بدھ کا ایک بڑا سا مجسمہ اپنا پیٹ [illegible] ہوئے اُن پر مسکرا رہا تھا۔ اُس کے پیٹ میں [illegible] سی تجوری تھی۔

"ہرلی! میرے تحفے! میرے قیمتی تحفے! پرنسس شارلی نے دیے تھے، وہ بھی غائب!"

پھر ہرلی اور روبی نے اپنی تلاش ختم [کی]۔ لونگ روم میں آکر وہ فرش پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر اُس خالی کرسی کو دیکھتے رہے جس پر رات کو اُن کا [مہمان] بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اُنھوں نے گھٹنے اوپر کر کے اپنا [illegible] میں سر چھپایا اور ایک ساتھ سسک اُٹھے۔

غزلیں

اللہ کرے جھوٹ ہو جو ہم نے سنا ہے
دنیا کی زبانی ہے کہ یہ تم نے کہا ہے
جو آئینے سے میری طرف جھانک رہا ہے
میں نے تو کئی بار اُسے قتل کیا ہے
شبنم سی مری پلکوں پہ کیوں تیر گئی ہے
جس وقت سرِ شاخ کوئی پھول کھلا ہے
تم جس کو جلا کر ابھی آئے تھے چتا میں
وہ شخص تو بت بن کے مرے گھر میں کھڑا ہے
ماضی کے شبستاں میں ہم بیٹھے ہیں تنہا
یادوں کے جھروکوں سے کوئی جھانک رہا ہے
کانٹے ہی فقط اپنا مقدر ہیں چمن میں
ہر برگِ گلِ نو پہ ترا نام لکھا ہے

جگت راج کنول گوڑ اسپوری

فریب دینے لگے راستے کے موڑ مجھے
جنونِ شوقِ سفر تو ہی گھر پہ چھوڑ مجھے
بھٹک نہ جاؤں اسے امیر راہوں سے
ابھی تو دور ہے منزل ابھی نہ چھوڑ مجھے
کسی مزار کی زینت بنوں تو بات بھی ہے
ابھی تو غنچہ ہوں ظالم ابھی نہ توڑ مجھے
میں آئینہ تھا جو ٹوٹا تو بال آ ہی گیا
یہ بال جا نہ سکے گا ہزار جوڑ مجھے
ہر ایک ظلم کی اک انتہا بھی ہوتی ہے
کہیں نہ باغی بنا دے یہ سخت موڑ مجھے
امیرؔ کا ارماں بس اتنی التجا ہے مری
جہاں پہ مات ہو منزل وہیں پہ چھوڑ مجھے

امیر جھانسوی

دل جلے کو وہ کیوں جلاتے ہیں
کیا مرا صبر آزماتے ہیں
دشمنوں کو گلے لگاتے ہیں
دوستوں سے فریب کھاتے ہیں
ہیں کچھ ایسے جو بچ کے طوفاں سے
آکے ساحل پہ ڈوب جاتے ہیں
مستقل عزم رکھنے والے ہی
اپنی منزل جہاں میں پاتے ہیں
سجدہ کرتی ہیں بجلیاں آکر
ہم نشیمن جہاں بناتے ہیں
دل کا عالم عجیب ہوتا ہے
جب وہ رخ سے نقاب اٹھاتے ہیں
ان کی زلفوں کے سائے میں اکثر
ہم ہر اک غم کو بھول جاتے ہیں
جب سے آپ ایسے حریفِ حسن ملے
نفیسیؔ اشعار گنگناتے ہیں

محمد تقی نفیسی جھانسوی

نیاز قومی علیگ

کہ بہ چراغ دارد

مکرمی سرور صاحب   آداب و تسلیمات!

"یہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر" کے آپ نقیب ہیں ___ اس لئے آپ کے اجلاس میں ایک ایسے مضمون پر نالش پیش کر رہا ہوں جس میں ایک معاصر صحافی نے اس راہ سے انحراف کیا ہے۔

ماہنامہ "تہذیب و تربیت" (لکھنؤ) کے دسمبر شمارے میں، نقد و نظر کے ضمن میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ___ "مہتاب چہرہ قمر قد پری اندام"
(اردو ادب کی ایک نمو آمادہ ڈالی)

مذکورہ بالا مضمون پر ایک مختصر تبصرہ "شانِ ہند" کے مؤقر صفحات میں اشاعت کے لئے آپ کو نذر کر رہا ہوں کیونکہ آپ ___

"پاسبانِ کوئے یار" بھی ہیں ___ اور "پیشوائے اندازِ محرمانہ" بھی ___!

___ نیاز قومی

ماہنامہ "تہذیب و تربیت" کے شمارہ نمبر ۱۲ (دسمبر ۱۹۸۱ء) کے صفحہ ۲۲ پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس پر مضمون نگار کا نام نہیں ہے۔ ایسے گمنام مضامین عموماً مدیر سے ہی منسوب ہوتے ہیں، مگر اس طرز کے مضامین میں لوگ اپنے نام کا انکشاف کرنے کی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے۔ فاضل مضمون نگار کی نیت پر اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ کسی ادیب یا شاعرہ کے فنِ نگارش پر تبصرہ کرنے کے لئے "مہتاب چہرہ" یا "تاریک جبیں" کی صفات کا تذکرہ غیر ضروری ہے۔ اصل صفت وہ ہے جو ضمنی عنوان میں مابین قوسین درج ہے (اردو ادب کی نمو آمادہ ڈالی)

احساسِ جرم پہلے سے ہی چٹکیاں لے رہا ہے ___ "اس کو کبھی آنکھیں یا تھوڑا اٹھا نا خالی از خطرہ نہیں ہے" فاضل مضمون نگار کو آگ سے خوف بھی لاحق ہے اور ستم ظریفی یہ کہ "نسبتِ میخانہ" کا اعتراف بھی ہے۔ تقاضائے نسبت تو یہ تھا کہ ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق۔

اظہارِ نسبت کے لئے جگر صاحب کا مصرعہ پڑھا تھا، بھی لغزش کا شکار! جگر

کہا تھا۔
کم کم ہی سہی نسبت ہیا شدہ ہی ہے۔
محترمہ قمر قدیر ارَم کو موضوعِ تحریر بنانے کے لئے مضمون نگار نے سہارا لیا اُن کی تالیف کا "چراغِ شہرِ جگر کے"
مگر آفاقی ضرب المثل ہے "چراغ تلے اندھیرا"
معدودے چند سطور میں سرسری طور سے اس کتاب کا ذکر کر کے، ارَم کا سراپا رقم کرنے میں اپنی ساری قوت صرف کر دی، بلکہ یوں کہئے کہ قلم توڑ دیا مگر ارَم کی ادبی اور فنی صلاحیتوں کو اندھیرے میں رکھا۔
بفرضِ محال اگر کہیں ارَم کی شاعری — انشائیہ — افسانے کا ذکر سرزد ہو گیا تو معاً چونک کر مضمون نگار کا قلم رُخِ تاباں کی طرف مُڑ جاتا۔
اسی شمارے میں دوسرے ادیبوں اور انشا پردازوں پر بھی مضمون ہے۔ جس میں اُن کی نگارشات کے اقتباسات کا حوالہ دے کر اُن کی ادبی اور فنی عظمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن ارَم کی "غزل گوئی کے معترف" ہونے کا دعویٰ کرنے والے کو ارَم کا کوئی شعر پیش کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اُس کے انشائیہ، افسانوں، اور تبصروں پر تنقیدی روشنی ڈالنے کا حوصلہ نہیں پیدا ہوا —
اس کے برعکس، ارَم کی اداکاری کے "طنطنے" سے "نظروں خیرہ" کر بیٹھے اور اُس کی اداؤں پر مر مٹے۔
"بٹیا کے ہاتھ پیلے کرنے" کی داستان میں مضمون نگار کے دل پر لگی کسی گہری چوٹ کا درد جھلکتا ہے جس کو اس نے "ڈھولک کی تھاپ" میں گم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اسی کاریگری میں وہ اصل موضوع سے بہک گئے۔ سراپا کا جادو ایسا چڑھا سر پر کہ "گھنے سیاہ جادو جگاتے ہوئے بال" میں اپنے آپ کو اُلجھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ یہاں زُلفیں بُریدہ ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ صاحبِ موضوع پر مضمون نگار کی جانب کوئی مثبت ردِ عمل ہوا ہو کیونکہ اپنی مدح و ستائش سے خوش ہونا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ لیکن صفحۂ اوّل پر — "ادبی قدروں کا ترجمان" ہونے کا دعویٰ کرنے والا جریدہ یقیناً تنقید و تبصرہ کے میدان میں ادبی بددیانتی کا مرتکب قرار پائے گا جب وہ کسی شاعر یا ادیب پر رقم طرازی کرتے ہوئے، خواہ اس کے حُسن و جمال کی دلبری کو آشکار کرے، یا اُس کی کردار کُشی کی کاوش کرے۔
یک طرفہ تماشا یہ بھی ہے کہ مضمون نگار نے آخری سطور میں اپنی "سرخروئی" کی سند ستائش بھی قارئین سے طلب کی ہے۔
جناب! "سرخروئی" تو ایسی ہوئی کہ آپ نے کہ نقد و نظر کی ادبی اقدار کا بھی لہولہان کر دیا — آپ کی آستینوں کا لہو پکار پکار کر خود ہی اس کی شہادت دے رہا ہے۔
اور اسی کے ساتھ مضمون میں اُٹھائے گئے اس عُقدہ کا حل بھی مضمر ہے کہ ہم زندہ شخصیتوں کی تنقید و تنقیص لکھنے کی روایت نہیں رہی ہے — کہ قلم "سُرخروئی" کے جذبے سے سرشار، خود غرضیوں کے تابع ہو جاتے ہیں اور ادبی اقدار و شعور کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

غزلیں

اہلِ سیاست ہوں ہُشیار
تخت کبھی تو کبھی ہے دار
ایک ہی جھٹکا ایک ہی وار
موت ہماری پہرے دار
اِک صُوفی، اِک بادہ خوار
اپنا اپنا کاروبار
ہر اِک عنبر مُہذب بغل
اب تہذیب کا دعویدار
ایٹم بم، زہریلی گیس
ہم سب اِس میں جیتے دار
پتھر یلا انسان کا دِل
ذہن میں شیشے کی دیوار
کٹیں جہاں احساس کے پر
دُنیا وہ تلوار کی دھار
سوچا ہوگا آخر کیوں؟
دُنیا کا انسان بیزار

وہ ہیں مغرور ہمیں ناز سے ڈر لگتا ہے
اُن کے بگڑے ہوئے انداز سے ڈر لگتا ہے
ٹوٹ جائے نہ کہیں تارِ محبت، سنبھلو!
مجھ کو ہر ٹوٹنے والے ساز سے ڈر لگتا ہے
چیخ اِک میں نے سُنی تھی یہ زمانہ بیتا
یاد آتی ہے تو آواز سے ڈر لگتا ہے
میں نے بھی چاند ستاروں کو کئی بار چھُوا
آج کچھ بات ہے پرواز سے ڈر لگتا ہے
مجھ کو انجامِ محبت سے ڈراتے ہیں وہی
وہ جنہیں پیار کے آغاز سے ڈر لگتا ہے
زندگی درد کے ماحول میں ہے سہمی ہوئی
پھر سے اپنے کسی ہمراز سے ڈر لگتا ہے

جناب وید ورما راز، پنجاب کے ایسے مشہور شاعروں میں اوّلین مقام رکھتے ہیں جن کی شہرت ملک بھر میں ہے۔ مگر وید ورما راز ایسا اچھا شاعر لدھیانہ میں گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کو جس طرح مالا مال کر رہا ہے اُس کے لئے اُردو شاعری اُن کی ممنونِ احسان رہے گی۔ ہم جناب کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی صاحب کے ممنون ہیں جنہوں نے راز صاحب کو اس گوشہ نشینی سے جلوۂ عام میں لانے کی سعی فرمائی ہے۔ (ادارہ)

رُوحی جاد دِہلوی

حاصلِ مُطالعہ

فلسفی بقراط کہتا ہے "ایک شام ڈھلے میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ روشن دیئے جا رہا ہے۔ میں نے اُسے روک کر پوچھا "کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے؟" بچے نے میرا سوال سُنتے ہی ایک لمحہ بھی نہ لیا، فوراً پھونک مار کر شمع گُل کر دی، اور مجھ سے کہنے لگا کہ آپ مجھے یہ بتا دیں کہ روشنی کہاں چلی گئی، تو میں آپ کو بتا دوں گا کہ یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔"

شیخ سعدی اپنے ایک دوست کے ساتھ گھوڑوں پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ اچانک زور سے بادل کڑکا۔ شیخ کا دوست ڈر سے زمین پر جھک گیا اور اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ شیخ نے کہا۔ "یہ تو صدائے رحمت تھی، سوچو تو صدائے قہر کیا ہو گی؟"

نادر شاہ کو کسی اہلکار نے اِطلاع دی کہ ایک شخص لوگوں کو قرض دیتا اور آپ کی موت کے بعد ادا کرنے کا وعدہ لیتا ہے۔ بادشاہ نے اُسے دربار میں بُلوا بھیجا اور اُس کی اِس حرکت کی وجہ دریافت کی۔ وہ شخص کہنے لگا "میری بس یہ تدبیر ہے کہ ہزاروں قرض دار شب و روز آپ کی درازیٔ عمر کے لئے دُعائیں مانگتے ہیں۔"

دیارِ غیر میں، کوئی آدمی، ایک اُمیر کے گھر مہمان ٹھہرا۔ ایک رات اُس اُمیر نے اجنبی کو کہا کہ خدا نے مجھے مال و دولت کے علاوہ ایک خوبصورت بچہ بھی دیا ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میرے گھر یہ بیٹا ایک مُدت کی دُعا اور تمنا کے بعد پیدا ہوا ہے۔ یہاں ایک مقام پر بابرکت درخت ہے۔ لوگ اُس کے قریب جا کر دُعائیں مانگتے ہیں اور بامُراد لوٹتے ہیں۔ میں نے بھی وہاں جا کر دُعا مانگی اور پرماتما نے میری مُراد پُوری کر دی۔

جس وقت وہ امیر باپ اپنے بیٹے کے بارے میں اِن نیک جذبات کا اظہار کر رہا تھا ــــ تو بیٹا اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھا ہُوا یہ کہہ رہا تھا کہ ـــ کاش! مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ بابرکت درخت کس جگہ ہے تو میں آج ہی وہاں جاؤں اور یہ دُعا مانگوں کہ میرا باپ مر جائے تا کہ سارا مال اور جائیداد میرے قبضے میں آ جائے۔

سوامی رام تیرتھ کہیں جا رہے تھے کہ پہنی ہوئی پوستین پر کچھ بوجھ محسوس ہوا۔ اُسے اُتارا اور راہ میں ہی پھینک دیا اور خود آگے نکل گئے۔ اتفاق سے تھوڑی دیر کے بعد اُن کے ایک شاگرد کا اُدھر سے گُذر ہُوا۔ وہ پوستین کو پہچان کر وہیں ٹھہر گئے کہ کوئی اُٹھا نہ لے۔ کچھ دیر بعد سوامی رام تیرتھ واپس آئے تو اُن کے شاگرد نے پُوچھا "سوامی جی آپ کس کے بھروسے پر اپنی پوستین یہاں پھینک گئے تھے؟" کہا "اُسی کے بھروسے پر، جس نے آپ کو دو گھنٹے یہاں کھڑے رکھا"۔

رابرٹ فراسٹ بہت مہمان نواز اور شاہ خرچ بھی۔ اپنے وقت کا بے پناہ وہ لوگوں کی مالی مدد بھی کیا کرتا۔ ایک بار اُس ایک دوست نے اُسے کہا "رابرٹ! تم لوگوں کی اِتنی مدد کیوں کرتے ہو؟"

"اِس لئے کہ یہ میرا اِستحقاق ہے" فراسٹ نے جواب دیا۔

"لیکن تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے پیٹھ پیچھے ہی وہ تمہاری ہنسی اُڑانے لگتے ہیں" دوست۔

"یہ اُن کا اِستحقاق ہے" فراسٹ نے جواب دیا۔

سوامی رام تیرتھ کسی جنگل میں رہے تھے کہ راستے میں راہزن مِل گئے۔ انہیں کچھ نہ مِلا، آپ کی کتابوں کا بستہ ہی چھین لیا۔ سوامی جی کو بہت افسوس ہُوا۔ ڈاکوؤں سے کہا میرا بستہ مجھے دے دو۔ یہ آپ لوگوں کے کسی کام نہ آئے گا لیکن اِس کے بغیر میرا کام نہیں چل سکتا۔ ڈاکوؤں نے آپ کی عاجزی سے مُتاثر ہو کر آپ کا بستہ واپس کر دیا لیکن چلتے چلتے کہنے لگے۔ "ایسے علم سے کیا فائدہ کہ جب کتابیں نہ رہیں تو آدمی کو کچھ یاد نہ رہے۔" یہ بات سوامی جی کے دل میں کھُب گئی اور آئندہ کے لئے عہد کیا کہ آئندہ وہ کتابیں ساتھ نہ رکھیں گے بلکہ اُن کو یاد کریں گے۔

سرور تونسوی

فکر تونسوی

فکر تونسوی پر مجھے بہت پہلے لکھنا چاہئے تھا۔ مگر یار لوگوں نے اُن کے انتقال پر جس شدت سے اپنے غم کا اظہار فرمایا یا اُن کے حالاتِ زندگی کو غلط انداز میں پیش کیا، اسے دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ فکر تونسوی کے غم گساروں کی اِس بھیڑ میں کھو جانے کی نسبت اچھا ہے کہ کچھ دنوں بعد فکر تونسوی پر کچھ لکھا جائے۔

اس وقت تک فکر تونسوی پر جس قدر بھی مضامین لکھے گئے اُن میں سے صرف سردار دلیپ سنگھ کا مضمون مطبوعہ رسالہ اکادمی لکھنؤ ہی کافی حد تک صداقت پر مبنی تھا۔ وہ اِس لئے کہ دلیپ سنگھ صاحب نے فکر تونسوی کے حسب نسب پر نہیں، بلکہ اُن کے طنز و مزاح پر لکھا۔ مسٹر چندن ہی صرف ایک ایسے لکھنے والے تھے جنھوں نے فکر تونسوی کا اصل نام رام نارائن لکھا۔ ورنہ سب لکھنے والوں نے اُن کا نام رام لال ہی لکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک بھر میں صرف دو ہی ایسے لکھنے والے ہیں جو فکر تونسوی کی ابتدائی زندگی پر صحیح طور پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ایک جناب دیوان منظر داس آہوجہ فرحت ریٹائرڈ پی۔ سی۔ ایس اور دوسرے راقم الحروف۔

ٹی۔ وی کے اردو پروگرام والوں نے بھی رسمی طور پر فکر تونسوی کے انتقال پر اپنا فرض نبھایا۔ اور اُنھوں نے بھی فکر کا نام رام لال ہی نشر کیا۔ جناب ظفر پیامی نے فکر صاحب کے اعزاز میں ایک بہت اچھی تقریب کی تھی جسے ٹی۔ وی والوں نے ریکارڈ کر لیا تھا۔ لہٰذا اس تقریب کو دوبارہ دکھا کر ٹی۔ وی والے فکر کے تئیں سبکدوش ہو گئے۔

رام نارائن فکر تونسوی موضع منگڑوٹھہ جو تونسہ شریف سے قریباً تین میل کے فاصلے پر دامنِ کوہِ سلیمان میں واقع ہے، میں پیدا ہوئے۔ اور انھوں نے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ ضلع ڈیرہ غازی خان میں انگریزی کی تعلیم، ضلع کے صدر مقام کے علاوہ صرف تونسہ شریف، دہوا، راجن پور، داجل کے علاوہ دو ایک دیگر مقامات میں صرف میٹرک تک ہی تھی۔ میٹرک کے بعد طلباء کو ملتان کے کالجوں میں داخلہ لینا ہوتا تھا۔ جناب فکر تونسوی پر اکثر و بیشتر لکھنے والوں نے تحریر فرمایا ہے کہ فکر نے ایمرسن کالج ملتان سے تعلیم حاصل کی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فکر مرحوم کو پتہ بھی نہ تھا کہ ملتان میں ایمرسن کالج کا محلِ وقوع کہاں تھا۔

بیکاری اُن دنوں بھی تھی اور خصوصاً ضلع ڈیرہ غازی خان ایسے پسماندہ علاقہ میں تو اس کا دور دورہ تھا۔ فکر نے بھی بیکاری کے ہاتھوں تنگ آ کر میٹرک پاس کرنے کی کوشش کی مگر اُن کی بدقسمتی نے انھیں اس مہم میں بھی کامیاب نہ ہونے دیا۔ اور پھر منگڑوٹھہ ایسے ایک خالص دیہاتی گاؤں میں پیدا ہونے والا [illegible]

میری پہچان کا آغاز جناب منظر داس آہوجہ فرحت کے چچا زاد بھائی شری لکھمی چند سے ہوا جو ضلع منٹگمری میں چک بیدی (یہ گاؤں [illegible] بیدی تحریک کی خاندانی ملکیت تھا) میں [illegible]

ان دنوں میں جالندھر سے ماہنامہ [illegible] کی ادارت سے مستعفی ہو کر اپنا ماہنامہ "حشر" جاری کر چکا تھا۔ اپنی [illegible] کی شادی کے موقعہ پر اور اس کے بعد چند روز [illegible] صاحب کے باعث فکر صاحب کے بڑے بھائی ماسٹر نانک چند سے علیک سلیک ہوئی جو میرے بہنوئی کے بڑے بھائی ماسٹر بھدرام داس کے یار غار تھے۔

میں جالندھر سے اپنے وطن موضع بھیرو غربی جو قصبہ خرم چند سے تین میل کے فاصلے پر ہے گیا تو اپنی بہن کو اپنے ہاں لانے کے لئے منٹگمری گیا تاکہ جتنے دن میں اپنے وطن میں رہوں تب تک میری بہن بھی میرے ساتھ ہی رہے۔ تو ماسٹر نانک چند نے فرمایا "تشنہ صاحب آپ رام نارائن کو اپنے ہمراہ لے جائیے یہ کچھ کتابت بھی جانتا ہے اور کچھ اردو نویسی بھی۔ جالندھر میں یہ ان دونوں فنون میں کچھ نہ کچھ ترقی کر سکے گا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا۔"

میں نے اس لالچ میں کہ رام نارائن کتابت جانتا ہے فوراً اُسے اپنے ہمراہ جالندھر لے جانے پر رضامندی کا اظہار کر دیا کیونکہ مجھے "حشر" کے لئے ایک کاتب کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میری واپسی پر رام نارائن بھی میرے ہمراہ تھے۔ اُن دنوں میری رہائش محلہ کشن چند جالندھر اور دفتر ریلوے روڈ پر تھا۔ چنانچہ رام نارائن کی رہائش کا انتظام "حشر" کے دفتر میں کر دیا گیا اور کھانا وغیرہ دونوں وقت یہ میرے ساتھ ہی گھر پر کھاتے۔

رام نارائن نے "حشر" کا ایک شمارہ کتابت کیا (یہ شمارہ اب بھی دفتر شانِ ہند میں موجود ہے) کتابت صرف نام کی ہی کتابت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے قلم سے نہیں دیا سلائی سے لکھا گیا ہو۔ ریلوے روڈ جالندھر پر جالندھر کے مشہور کاتب غلام جیلانی صاحب کی بیٹھک تھی۔ لہٰذا اُن سے گزارش کی گئی کہ رام نارائن صاحب کو کتابت کے بارے میں ہدایات دے دیا کریں جو اُنھوں نے بخوشی منظور فرمایا۔

اُن دنوں دیوان متھرا داس آہوجہ فرحت غالباً شیخوپورہ میں مجسٹریٹ تھے۔ اور ڈسٹرکٹ بورڈ شیخوپورہ کے تحت ایک ہفت روزہ شائع ہوتا تھا۔ اس سرکاری اخبار کے نگران جناب متھرا داس آہوجہ فرحت تھے اور ایڈیٹر غالباً خضر صاحب یا کوئی اور صاحب تھے۔

دیوان متھرا داس صاحب فرحت اپنے وطن منٹگمری تشریف لے گئے تو رام نارائن کے بھائی نانک چند نے اُن سے عرض معروض کی کہ آپ مجسٹریٹ ہیں اور آپ کی نگرانی میں ایک سرکاری ہفت روزہ بھی شائع ہوتا ہے لہٰذا رام نارائن کو آپ اپنی سرپرستی میں لے لیں تو اُس کی زندگی سنور جائے گی۔ چنانچہ دیوان متھرا داس صاحب نے ماسٹر نانک چند سے فرمایا کہ اچھا رام نارائن کو کہہ دو کہ وہ مجھ سے شیخوپورہ میں ملے۔ اس پر ماسٹر نانک چند نے رام نارائن کو خط لکھا اور اُسے ہدایت کی کہ وہ فوراً شیخوپورہ جا کر دیوان صاحب سے ملے۔

ایک دن جب میں دفتر آیا تو دفتر کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے اور رام نارائن معہ اپنے تھیلے کے غائب تھے۔ کچھ دیر انتظار کرنے پر بھی جب اُن کا کچھ پتہ نہ چلا تو اڑوس پڑوس کے دوکانداروں سے دریافت کیا کچھ پتہ نہ چلا تو چوکیدار کو بلوایا گیا جو دائل ٹاکیز کے احاطے میں سوتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ آپ کے منشی جی یعنی رام نارائن صبح چار بجے اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے اور تھیلا اُن کے ہاتھ میں تھا۔

اسی وقت منٹگمری ماسٹر نانک چند کو خط لکھا گیا۔ آٹھ نو دن بعد جواب آیا کہ رام نارائن جالندھر سے شیخوپورہ جناب دیوان متھرا داس صاحب آہوجہ کے ہاں پہنچ گئے ہیں اور اُنہوں نے اُسے ڈسٹرکٹ بورڈ کے ہفتہ وار اخبار میں بطور کاتب مُلازم رکھ لیا ہے۔

بات آئی گئی ہوئی۔ کچھ دنوں بعد دیوان متھرا داس آہوجہ لائل پور میں تبدیل ہو کر تشریف لائے۔ اُن دنوں جناب مرلی دھر شاد لائل پور کاٹن ملز جو دلی کلاتھ ملز کی ہی ملکیت تھی کے کرتا دھرتا تھے اور میرے کرم فرما شاد صاحب نے مجھے لائل پور بلایا تو میں نے دیوان [illegible] صاحب آہوجہ کے ہاں بھی حاضری د[illegible] نے فرمایا کہ شیخوپورہ میں ایک دن اخبا[illegible] ایک غزل میرے پاس لائے اور کہنے [illegible] آپ بھی شاعر ہیں۔ ذرا اس غزل [illegible] اپنی رائے گرامی سے ممنون فرمائیے۔ د[illegible] کا کہنا ہے کہ اُنہوں نے غزل پڑھی تو [illegible] تھی اور اُنھوں نے ایڈیٹر کو حکم دیا [illegible] کے صفحۂ اوّل پر پورے صفحے پر شائع [illegible] اس پر ایڈیٹر صاحب نے بتایا کہ حضور [illegible] ہمارے کاتب مسٹر رام نارائن کی [illegible] فکر ہو گئے ہیں۔

دیوان صاحب نے بتایا کچھ عرصہ [illegible] نارائن صاحب لاہور چلے گئے۔ شیخوپورہ [illegible] لاہور زیادہ دور نہیں ہے۔ اور لاہور [illegible] نارائن کے اندر جو فکر چھپا ہوا تھا وہ [illegible] تہ کے ساتھ باہر آگیا اور "ادب لطیف" میں اُنھیں جگہ مل گئی۔ وہاں سے فکر [illegible] کے بارے میں کچھ لکھنا وقت کو ضائع کر[illegible] ہاں، طنز و مزاح میں فکر نے [illegible] حاصل کیا وہ اپنی طرز کا واحد مقام [illegible] ہے کہ کچھ لوگ رشید احمد صدیقی اور [illegible] مشہور طنز نگاروں کو فکر صاحب سے [illegible] دیں، وہ یقیناً جھوٹ نہیں کہتے ہوں [illegible] نارائن فکر تونسوی کے طنز میں جو بار[illegible] دوسروں کے طنز میں نہیں ہوتی [illegible] دوسرے طنز نگاروں کی تخلیقات پر [illegible] کی واحد مثال ہوا کرتی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ [illegible] کی زندگی میں اُن کی قدر نہیں کی [illegible] انسٹی ٹیوٹ کا غالب ایوارڈ بھی "شا[illegible] پر زور احتجاج پر اُنھیں دیا گیا [illegible] حق تلفی کر کے یہ انعام ایسے طنز نگار [illegible] گیا جو فکر صاحب کی گرد کو نہ پا سکے۔ یہ [illegible] کا مقام ہے کہ اُن کی تصانیف ایسے [illegible] شائع ہو رہی ہیں جو فکر کے مقام کو پہچانتے

یہی کمائی کو ختم سمجھتے تھے۔ انجمن ترقی اُردو ہند نے فکر صاحب کا ایک مجموعہ "فکر نامہ" شائع کر کے ضرور ان کی اشک شوئی کی، مگر نہ کسی اُردو اکادمی، ترقی اُردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ' یا ساہتیہ اکادمی ایسے کسی ادارے کو یہ عزت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ملک کے عظیم طنز نگار کو نوازتا۔ اگر ہمارے دوستوں کو بُرا نہ لگے تو اس ناانصافی میں اُن کا ہندو ہونا بھی ایک بڑا جُرم تھا۔

اب فکر صاحب کے انتقال کے بعد کوئی تنہا ایسا ادارہ ہے جو فکر کی بیوہ کو کسی قسم کی مالی امداد سے نواز رہا ہو۔ اُردو اکادمی دلّی کے کارکنان سے اس کی اُمید نہ تھی کہ وہ فکر صاحب کی بیوہ کی درخواست کا انتظار کرتے، بلکہ اُنھیں چاہیئے تھا کہ جس طرح اُنھوں نے نریش کمار شاد کی بیوہ۔ (جن کا تلاش کرنے پر بھی پتہ نہ چل سکا) کے لئے مالی امداد جاری کرنا منظور کیا اُسی طرح فکر صاحب کی بیوہ کی بھی مالی امداد جاری کرتے جبکہ فکر صاحب کے بہت بڑے قدر دان بریندر ناتھ تفتہ بھی اُردو اکادمی کے عظیم ترین رکن ہیں۔ گو ایگزیکیٹیو میں وہ نہیں ہیں، مگر وہ اپنے ساتھیوں کو صاحب کی یاد دلا سکتے تھے۔

فکر تونسوی ایسا طنز نگار بیسویں صدی شاید آئندہ کئی صدیوں تک پیدا نہ ہو سکے گا۔ یہ دکھ کی بات ہے کہ بیسویں صدی کے با اختیار لوگوں نے اُس کی قدر نہ کی۔

غزلیں

یاد آئی کہ مرا درد بڑھانے آئے
کیسے بے درد ہیں اس طور ستانے آئے
کیا کہوں کیا نہ کہوں میں ہوں اسی چکر میں
حالِ دل پوچھا تو اُلفت کے فسانے آئے
کوک کوئل کی پپیہا کی پکاریں گونجیں
فصلِ گل آئی ترانوں پہ ترانے آئے
اس سے بہتر تھا ہمیں کلبۂ احزاں ساقی
تیری محفل میں کہاں ہم تو بتا سنانے آئے
اصطلاحاً ہے یہی ظاہر و باطن کا شکوف
اپنے مقتول کو قاتل جو اُٹھانے آئے
کیسے جانوں وہ مرے بعد مجھے یاد کریں
جیتے جی جو نہ خبر لینے سرہانے آئے
کون ہمدرد ہے دیکھے جو مرا حالِ زبوں
گھر کی گرتی ہوئی دیوار اُٹھانے آئے
جلنے والوں کا وطیرہ ہے بڑا ناموزوں
شان و شوکت سے اگر ہم بھی بتانے آئے
بے دیا طرزِ عمل اپنا ہے اس کے باوصف
وسوسے سیکڑوں کیوں دل میں نہ جانے آئے

ساقی تونڈیوی

ہر چند قدم راہِ ہوس میں نہ بڑھا اور
یہ آگ ہے اس آگ کے نزدیک نہ جا اور
جیتا ہی رہوں 'لعد بلا' اور 'بلا' اور
بڑھتی ہے تو بڑھ جائے مری لغزشِ پا اور
بیا کی مجذوبِ حق پہلے ہی سے مشہور
اشعار سے عشق کے وہ بیباک ہوا اور
مصروف ہے کچھ لوگ تعاقب میں کسی کے
میں کانٹوں میں اُلجھا تو اُلجھتا ہی رہا اور
احساسِ جنوں بڑھنے کے بہکنے کی طرف ہے
سُورج کی تمازت سے جھلستا ہی گیا اور
انسان کی گرتی ہوئی قدروں کے سبب آج
مجروح نہ ہو جائے یہ احساسِ انا اور
جھکتا ہے کہیں دل پر جھکتا ہے کہیں سر
آئینِ خدا اور ہے آدابِ وفا اور
جاتی تو کہاں جاتی مجھے چھوڑ کے یہ درد
جو مجھ سے یہ خب غم کا سہارا نہ تھا اور

پریم سوشیل درد

جب ہمیں آپ یاد آتے ہیں
ہم زمانے کو بھول جاتے ہیں
تجھ کو خوش دیکھنے کی خاطر ہم
اپنے ہر غم کو بھول جاتے ہیں
جب چراغِ وفا جلاتا ہوں
تیز جھونکے ہوا کے آتے ہیں
جن کو سمجھا جنوں بچارہ گر اپنا
زہر اکثر وہی پلاتے ہیں
شمعِ دل کو وہ اپنے دامن سے
جلتے جلتے بجھا کے جاتے ہیں
بجلیاں گرتی ہیں جہاں اکثر
ہم وہیں آشیاں بناتے ہیں
میرے احباب ہیں وہی شفقت
رات دن جو مجھے ستاتے ہیں

شفقت علی وفا فیروزآبادی

بابِ انتقاد

خبط و ضبط
ڈاکٹر حقیر آستانی

۱۹۸۸ء ۔ ڈیمائی سائز ۔ صفحات ۲۵۶ ۔
قیمت :- ۷۵ ، روپے

کاغذ گراں قیمت سن خانی عمدہ اور دبیز، کتابت شہرۂ آفاق خوش نویس جمال گیاوی کی فنکارانہ عظمت کا بہترین نمونہ۔ پختہ ریکسین کی جلد۔ گرد پوش اپنی نظیر آپ۔ طباعت روشن۔

شانِ ہند پبلی کیشنز نے دسمبر ۱۹۸۸ء میں دو شعری مجموعے شائع کئے ہیں۔ جن میں سے "خبط و ضبط" جو کہ ڈاکٹر حقیر آستانی کا نقشِ ثانی ہے، اس وقت زیرِ نظر ہے۔ "خبط و ضبط" مجموعے کا نام ایسا ہے کہ شاید ہی اس صدی میں کسی شاعر نے اپنے مجموعہ کا اس قدر بامعنی اور عام روش سے ہٹ کر نام رکھا ہو کہ جس کے سنتے ہی کوئی بھی ذوقِ سلیم کا مالک بیقرار ہو جائے کہ جیسے بھی ہو "خبط و ضبط" کو دیکھے اور پڑھے۔ اور جب یہ نام ڈاکٹر حقیر آستانی ایسے باشعور، ذی فہم اور باوقار شاعر نے رکھا ہو، تو کوئی بھی قاری اس مجموعہ کو پڑھنے کے لئے بیقرار ہوگا۔

ڈاکٹر حقیر صاحب نے اپنے نقشِ اول "افکارِ گریزاں" کو غزلیات اور نظموں پر ہی مشتمل رکھا تھا، مگر "خبط و ضبط" میں نظموں اور غزلوں کے علاوہ رُباعیات اور قطعات بھی "چہار مصرع" عنوان سے حقیر صاحب کے پختہ گو شاعر ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ اور نثری نظمیں تو جدید شاعری کے سکہ بند شاعروں سے بھی اپنا لوہا منوانے والی ہیں۔
ڈاکٹر حقیر کی شاعری عام روش سے ہٹ کر جو اثرات قاری کے دل و دماغ پر مرتسم کرتی ہے، اس کا لطف قاری ہی اٹھا سکتا ہے۔

عام طور پر تبصرہ نگار شاعر کے کچھ اشعار پیش کر کے اپنی رائے کو صائب ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ ہر قاری کی پسند اپنی ہوتی ہے اور اکثر اوقات تبصرہ نگار کے انتخاب کردہ اشعار کو قاری پسند نہیں کرتے۔ مگر خبط و ضبط کے بارے میں تو تبصرہ نگار کو حقیر صاحب کے چند اشعار پیش کر کے اپنی رائے کو استقامت بخشنی ہے اور نہ ہی اُسے یہ فکر ہے کہ یہ تبصرہ پڑھنے کے بعد آپ اُس کی رائے پر اعتماد کریں، بلکہ "خبط و ضبط" کو ایک نظر دیکھ لیجئے اور صرف پانچ منٹ اُس کی ورق گردانی کر لیجئے، آپ کے اندر کا ذوقِ سلیم خود بخود آپ کو مجبور کر دے گا کہ "خبط و ضبط" کو پڑھئے۔

ارتعاش : مضطر صدیقی

۱۹۸۸ء ۔ ڈیمائی سائز ۔ صفحات : ۱۷۶ ۔
قیمت : ۴۰ ، روپیہ ۔

کاغذ گراں قدر سن ن، عمدہ اور بہترین کتابت، طباعت روشن ۔ گرد پوش کسی چابک دست آرٹسٹ کی کاریگری کا اچھا نمونہ ۔

شانِ ہند پبلی کیشنز کی ماہِ دسمبر ۸۸ء کی یہ دوسری پیش کش، مضطر صدیقی کا مجموعۂ کلام "ارتعاش" جو شانِ ہند پبلی کیشنز کی روایت کے مطابق ہر انداز سے قابلِ تعریف ہے۔
مضطر صدیقی راجستھان کے شاعروں میں ایک اچھا مقام رکھتے ہیں۔ "ارتعاش" ان کی پہلی پیش کش ہے، جس میں قریب قریب فنِ شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ ا[...] شک نہیں کہ مضطر صدیقی کو ابھی ملک[...] کہلوانے کے لئے بہت سی منزلیں [...] مگر ارتعاش میں انھوں نے اپنے شع[...] جس اچھے انداز سے پیش کئے ہیں، ان [...] کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب ہی [...] قابلِ ذکر شعرا میں شمار ہونے لگیں گے [...] اشعار تو واقعی بے حد تعریف کے قابل [...]

رُوحی دا[...]

من کہ مکتوب الیہ

محترم سرور تونسوی صاحب' آداب!
آپ کا محبت نامہ ملا۔ کن الفاظ میں آپ
ریہ ادا کروں۔ آپ نے میرا غم بانٹ کر مجھ
ان کیا ہے۔ حقیقتاً پچھلے کئی مہینوں سے ہمارا
سا خاندان ایک عجیب سے کربناک عالم میں
ر رہا ہے۔ اب کہیں طبیعت سنبھلنا شروع ہوئی
میں خود بھی بہت بیمار ہو گیا تھا۔ یرقان کا حملہ
لہٰذا اب میں ایک بڑی حد تک ٹھیک ہوں ــــ
ت خواہ ہوں کہ آپ کے خط کا جواب تحریر
سکا اور نہ کتاب کے بارے میں اپنے تأثرات
اسکا۔ تاہم اتنا قیمتی تحفہ بھیجنے پر آپ کا
سے تشکر گزار ہوں۔

میں اور انور سدید فروری میں آپ کے
نے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ تب آپ سے انشاء اللہ
ہو گی۔ خدا کرے آپ کی صحت اب بالکل ٹھیک ہو۔
پچھلے دنوں میری کتاب "غزلیں" کا تیسرا
شائع ہوا ہے۔ میں نے اس میں اپنی تمام
یکجا کر دی ہیں۔ اس کا ایک نسخہ آپ
العہ کے لئے جلد ہی بھجواؤں گا۔

درمیان میں اوراق کی ترسیل کا سلسلہ
ہو گیا تھا۔ میں نے دفتر "اوراق" کو اِس
یں لکھا تھا کہ ترسیل دوبارہ شروع کریں۔ اِد
مطلع کریں کہ کیا پرچہ آپ کو مل رہا ہے؟

والسّلام۔ مخلص
وزیر آغا

محبّی تسلیمات!

آپ سے مُلاقات کی صُورت پیدا ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور یہ ناچیز انور سدید چار فروری ۱۹۸۹ء کو بھارت آپ کی مُلاقات کے لئے حاضر ہو رہے ہیں۔ ویزا دہلی' اورنگ آباد' مالیگاؤں اور بمبئی کا ملا ہے۔ چار فروری کی شام کو دلّی پہنچیں گے اور مزید پروگرام وہاں پہنچنے پر طے ہوگا۔ دلّی میں رابطے کے پتے حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ ظفر پیامی۔
۲۔ جوگندر پال صاحب۔

آپ سے مُلاقات اِس دَورے کی اوّلین خواہش ہے ـــــ سو اِس کا راستہ بتائیے۔ خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

انور سدید

ہوا۔ جس کے لئے میں آپ کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔
اُتر پردیش اُردو اکادمی اور مغربی بنگال اُردو اکادمی سے جو انعامات مجھے حاصل ہوئے ہیں وہ صرف آپ جیسے ہی خواہ بزرگوں کی دُعاؤں اور کرم فرمائی کے طفیل ہی ممکن ہو سکا ہے' ورنہ یہ خاکسار کس قابل ہے؟ نئے سال کے لئے اِس سے بہتر مبارک خبر اور کون دے سکتا تھا۔ میں آپ کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔

اِس متبرک موقع پر چند اشعار ذہن میں اُبھر آئے ہیں۔ انھیں قلمبند کر کے خلوص و احترام اور عقیدت کے ساتھ آپ کی نذر کرتا ہوں۔

"گر قبول افتد زہے عزّ و شرف"

نظم

سال آتے رہیں' سال جاتے رہیں
آپ خوشیوں کی محفل سجاتے رہیں
زندگی میں کبھی دخل غم کا نہ ہو
آپ ہر بزم میں مُسکراتے رہیں
کامرانی رہے ساتھ ہر گام پر
کوہ و دریا بھی آنکھیں بچھاتے رہیں
منزلیں دست بستہ رہیں سامنے
راستے مجھ کو سر جُھکاتے رہیں
چشمہ جاری رہے آپ کے فیض کا
تشنہ لب پیاس اپنی بجھاتے رہیں
نام زندہ رہے آپ کا تا ابد
مثلِ شمس و قمر جگمگاتے رہیں
صدقِ دل سے دُعا ہے یہی سحر کی
حشر تک آپ ہنستے ہنساتے رہیں

نیاز مند
سحر ہمی

قابلِ صد احترام مکرمی سرور صاحب'
آداب و تسلیمات!
کل ہی آپ کا گرامی قدر شفقت نامہ باعثِ سرفراز

کرمی سرور تونسوی صاحب' آداب و تسلیمات!
"یہ کیسا پیار....." سے متعلق مختلف حضرات کی آرا بڑی گرامی "خانوادہ" میں متواتر شائع ہو رہی ہیں۔ کتاب مشاکر پڑھی تو بے ساختہ یاد

بے تکلف کر اس کتاب کی تعریف کرنے والوں نے بخل سے کام لیا ہے۔ [illegible] کتاب اس سے زیادہ تعریف کی مستحق ہے [illegible] یہ ہے کہ میں نے واقعی اردو میں ایسی دلچسپ اور بے باکانہ تحریر کی حامل کتاب اب تک نہیں پڑھی تھی۔ کتاب ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے

خیر اندیش
ایم۔ اے۔ جی ساقی تونڈلوی

محترم، السلام علیکم!
خدا کرے آپ بخیر ہوں۔
"شانِ ہند" موصول ہوا۔ شکریہ۔ !
مشمولات نے طبیعت خوش کر دی۔ "ایلیفینٹ سپلائز" نے آپ کی کتاب "بہ کوئے یار" بہ انداز محرمانہ گزر" سے بہت حد تک متعارف کرا دیا۔ آپ کا شگفتہ طرزِ بیان، پڑھنے والوں کو مسحور کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔

آپ نے اداریے میں دلچسپ تاریخی رائے کا مضمون چھاپ کر متعصب فرقہ پرستوں کے منہ پر زبردست طمانچہ مارا ہے۔ لیکن شاید ایسے لوگوں پر قلم کی کاٹ اثر نہیں کرتی۔ انہیں ہر سطح پر سزا دینے کی ضرورت ہے۔
آپ اتنی کم قیمتوں پر جتنی خوبصورت کتابیں شائع کرتے ہیں، اُس کی تعریف نہ کرنا بددیانتی ہوگی۔

خاکسار
نعمان شوق

برادرِ محترم شرر دتونسوی، دام لطفہٗ
خدا کرے نیا سال نئی مسرتیں اور نئی کامیابیاں اپنے دامن میں لائے اور صحتمندی اور خوشحالی کا سال ثابت ہو۔
میری جانب سے آنیوالے نئے سال کی مبارکباد قبول کیجئے۔
آپ کے موقر جریدے شانِ ہند سے جہاں اہم معلومات میں اضافہ ہوتا ہے وہاں آپ کی صحت و تندرستی کا حال بھی معلوم

رہتا ہے۔ اس لئے میں ہر ماہ اس کا منتظر رہتا ہوں
خدا کرے آپ مع متعلقین بعافیت ہوں
ڈاکٹر محمد علی زیدی

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

AN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 DEC 1988
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57 Delhi Postal

